تذکرہ خانوادۂ ولی اللہی

تصنیف
سر سیّد احمد خاں

تحقیق وتدوین
ابوسلمان شاہجہان پوری

زیرِ نگرانی
پروفیسر ڈاکٹر سیّد سخی احمد ہاشمی

سندھ یونیورسٹی (جام شورو)
حیدرآباد (سندھ)

ان ھذہ تذکرہ

تذکرہ

خانوادہ ولی اللہی

تصنیف

سرسید احمد خان

تحقیق و تدوین

ابوسلمان شاہجہان پوری

زیر نگرانی

پروفیسر ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی صاحب

سندھ یونی ورسٹی (جام شورو) حیدرآباد

تذکرہ خانوادہ ولی اللہی

فہرست مضامین

صفحات	تفصیل مندرجات مقالہ

باب - چہارم

باب - پنجم

کتابیات

پیش لفظ

" شاہجہان آباد کے لوگوں کا بیان" سرسید احمد خان کا ایک مستقل تذکرہ تھا جو اب تو اپنی مستقل حیثیت میں " تذکرہ اہل دہلی" کے نام سے بھی شائع ہوگیا ہے لیکن پہلی مرتبہ وہ چوں کہ " آثار الصنادید" کے ساتھ شائع ہوا تھا اس لیے عام طور پر اسے " آثارالصنادید" کے ایک باب کی حیثیت سے جانا گیا ـ حالاں کہ " آثارالصنادید" کے موضوع اور اس کے دائرۂ بحث سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ وہ شروع ہی سے ایک الگ صنف اور مستقل موضوع کی حیثیت سے اپنی اہمیت رکھتا ہے اور تذکرہ نگاری کی تاریخ میں شاہکار اور انیسویں صدی کی علمی شخصیات کا نہایت اہم ماخذ ہے ـ لیکن اس کی علمی و ادبی اہمیت کا قرار واقعی اعتراف اور اردو ادب اور تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اس کے مقام کا تعین باقی تھا۔

راقم کو خوشی ہے کہ اسے اپنے بلند پایہ اور محقق استاد کی رہنمائی میں اللہ تعالی نے اس کی تدوین کی توفیق ارزانی فرمائی استاذی المکرم پروفیسر ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی صاحب نے تحقیقِ مواد ، تدوینِ افکار اور تزئینِ زبان و اسلوبِ بیان کے ہر مرحلے میں رہنمائی کی اور حضرت استاذ الاساتذہ مخدومی پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفی خان صاحب مدظلہٗ کی تربیت و فیضانِ نظر نے معیار و جامعیت میں خوب سے خوب ترکی جستجو میں ہمیشہ سرگرم اور مصروف رکھا۔

راقم اپنے دوستوں کے تعاون کا بھی معترف ہے جن کے کتب خانوں سے ہر مفید مطلب کتاب اور ضروری مواد فوراً مل گیا۔ مشفق خواجہ ، محمد ایوب قادری، ڈاکٹر یونس حسنی، ڈاکٹر معین الدین عقیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں ـ ایک نہایت اہم اور نایاب کتاب ڈاکٹر وحید قریشی(لاہور) نے اپنے ذاتی کتب خانے سے فراہم کی ـ

راقم اس رہنمائی ، سرپرستی اور تعاون کے لیے اپنے استاذ ، مربی، احباب اور کرم فرما کا بہ صمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہے ـ

خاکسار

ابوسلمان شاہجہان پوری

تذکرہ خانوادہ ولی اللہی (تلخیص) تقریباً ایک ہزار الفاظ

(تعارف)

اسلامی ھند کی تاریخ میں اٹھارھویں صدی عیسوی کا تعلق ھندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال سے ھے ۔ انیسویں صدی میں یہ زوال پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ۔ لیکن اٹھارھویں صدی ھی میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کی پیدائش سے علوم و معارف کے ایک نئے دور کا آغاز بھی ھوچکا تھا جو انیسویں صدی کے اوائل میں اپنے عروج و فروغ کا نقطۂ کمال بن گیا ۔ بقول حالی اس دور کی صحبتیں اور جلسے اکبر و شاھجہانی عہد کی یاد دلاتے تھے ۔ اس عہد میں اھل علم و ھنر، علمائے دین، مشائخ عظام ، اطبائے کرام ، ادیب و شاعر اور اصحاب فضل و دانش کے ایسے ایسے مجمع تھے کہ پھر چشم فلک نے اس سر زمین پر نہیں دیکھے ۔ اگر اس دور کے تمام ارباب کمال اور اصحاب علم و دانش کو کسی ایک خانوادہ علمی کا نام دیا جائے تو "خانوادۂ ولی اللہی" عنوان قرار پائے گا ۔ اور اگر طبقہ وار مرتب کیا جائے تو سب سے پہلے شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کے تلامذہ کا طبقہ علیا ھمارے سامنے نمودار ھوگا ۔ شاہ صاحب کے یہ تلامذہ ان کے ابنائے عظام بھی ھیں ۔ بلاشبہ علوم و معارف کے اس دور کے بانی اور فاتح باب تو حضرت شاہ صاحب ھیں لیکن اس دور کی وسعت ، ترقی اور استحکام اور تعرّف و شہرت کے باعث ان کے صاحب زادگان شاہ عبدالعزیز ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر ھیں ۔ یہ حضرات ثلاثہ جامع علوم و فنون تھے اور ان تینوں کی شخصیات میں کئی جہان فضل و دانش جمع ھوگئے تھے ۔ دوسرا طبقہ اصحاب ثلاثہ کے تلامذہ کا ھے ۔ اس میں مختلف علوم و فنون کے متخصصین سربلند نظر آتے ھیں ۔ اس میں اچھے بڑے بڑے مفسر، محدث ، فقیہہ ، مفتی، مدرس ، مجاھد ، واعظ ، مصلح ، شیخ طریقت ، عارف باللہ ، طبیب ، شاعر، ادیب ، انشا پرداز ، فلسفی، حکیم، موجود ھیں اور ان کی فتوحات کا دائرہ اتنا وسیع ھے کہ موجودہ دور میں علوم عالیہ

کا کوئی گوشہ اور اہل علم اور ارباب فضل و کمال کا کوئی سلسلہ اس سے باہر نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد خانوادۂ ولی اللہی کے تیسرے طبقے کے اصحاب علوم و معارف کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ دور بھی گویا دوسرے دور کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ دور بھی گویا دوسرے دور کا ایک جزو تھا، اس لیے اپنے خصائص و امتیازات کے لحاظ سے دور ماقبل سے ملحق تھا۔ اس دور میں شاہ عبدالغنی، مولوی احمد علی، میاں نذیر حسین، نواب قطب الدین خان جیسے عالم، محدث اور اہل قلم تھے۔ اس طبقے کے تمام حضرات بہ یک واسطہ اصحاب ثلاثہ سے رشتہ تلمذ میں منسلک تھے۔ اب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خانوادۂ علمی کا چوتھا طبقہ نمودار ہوتا ہے۔ اس دور کے اہل علم اور اصحاب کمال عام طور پر بہ دو واسطہ اصحاب ثلاثہ سے شاگردی کا رشتہ انسلاک رکھتے ہیں۔ اس دور کے یہ ارکان خانوادۂ ولی اللہی مختلف علوم و فنون میں اپنے تبحر و تخصص کی بنا پر کئی فصول میں گنائے جاسکتے ہیں۔ اس میں نامور علمائے دین ہیں، شعرا عظام اور علمائے ادب و لسان ہیں۔ ف فن طب کے علم و عمل کے ماہرین ہیں جن کی جلالت علم اور حذاقت فن کا ہندوستان کے دشت و جبل میں ڈنکا بج رہا تھا اور وہ عظیم مصنف اور اہل قلم ہیں جن کے علم و فن اور اسلوب کا سکہ آج بھی روز بازار علم میں چلتا ہے۔

ان طبقات کے تمام اصحاب علم و فضل کا تعلق دہلی یا دہلی کے قرب و جوار سے تھا۔ سرسید احمد خان ۱۸۱۷ء میں اسی معمورۂ علم و دانش ـــ دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اصحاب ثلاثہ کی استادی اور فضیلت علمی کا ڈنکہ چار دانگ عالم میں بج رہا تھا۔ ان میں دو بزرگ شاہ رفیع الدین (ف ۱۸۱۸ء) اور شاہ عبدالعزیز (ف ۱۸۲۴ء) حیات تھے۔ سرسید نے آنکھ کھولی تو ان کا گھرانہ اور دلی کے کوچہ و بازار شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں کے تذکار سے معمور تھے۔ سرسید کے

خاندان کی دونوں شاخوں دادھیال اور ننھیال کے تمام بزرگ و خورد اسی خاندان علم و فضل سے عقیدت و ارادت رکھتے تھے - سرسید نے جن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا وہ اسی خانوادے کے مائدہ علم و فضل کے ریزہ چین تھے۔ وہ جن دوستوں سے علاقۂ رفق و محبت رکھتے تھے وہ سب اسی خاندان کے حلقہ بگوش ارادت تھے۔ علمی زندگی کے آغاز میں جن دینی ، فکری اور اصلاحی کتابوں کے مطالعے میں ان کے شب و روز بسر ہوئے وہ اسی خانوادۂ علمی کے اہل نظر و اصحاب قلم عزیز کی لکھی ہوئی تھیں ، پھر جن افکار نے سب سے پہلے ان کے قلب و دماغ کو اپنا آشیانہ بنایا وہ تمام علوم و معارف ولی اللہی تھے اور کتب جن مباحث علم و فکر کا ذوق تالیف و تصنیف ان کی طبیعت میں ودیعت ہوا تھا وہ در حقیقت ولی اللہی سرچشمہ علوم و معارف کے چھینٹے تھے جنھیں سرسید کے ذوق سلیم نے اپنے دامن میں جذب کرلیا تھا۔ سرسید کی تمام ابتدائی اور پہلی تالیفات اور تراجم کا ماخذ اصحاب ولی اللہی کی تصانیف ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی کے دور آخر میں بھی جب کہ ان کے خیالات میں بڑا انقلاب واقع ہوگیا تھا ، شاہ ولی اللہ محدث دھلوی اور شاہ عبدالعزیز کے افکار اور ان کی تحقیقات سے اپنی تصنیفات میں سب سے زیادہ تزئین و استدلال کا کام لیا ہے - پھر جن اعمال حقہ نے سرسید کے ذوق اصلاح کی تربیت کی تھی اور سمند شوق کو مہمیز لگائی تھی - وہ اسی خاندان کی تحریک اصلاح کے شجر طیبہ کے گلگشت برگ و بار تھے اور پھر جب سرسید نے عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو ان کے یمین و یسار اور ان کی تحریک کے تمام اعضا و جوارح شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کے خانوادۂ علمی کے ارکان تھے - حتی کہ ان کے سب سے بڑے اور مہتم بالشان کارنامے یعنی ان کی تعلیمی و اصلاحی خدمات میں شاہ ولی اللہ کی اصلاحی ، تعلیمی اور سیاسی تحریک

کی روح سعید و صالح ساری و روان تھی۔ اس طرح سرسید اپنے خاندان (کی دونوں اصلوں) ، اپنے اساتذہ، اپنے احباب ، اپنی تعلیمی، ادبی اور اصلاحی تحریک کے اعضا و جوارح اپنی علمی خدمات ، اپنے مطالعے ، اپنے افکار و معتقدات غرض کہ اپنی فکر و روح اور ذوق علم و دین سے لے کر اپنے عمل اور اپنی تمام تر خدمات اصلاح و تعلیم تک ہر لحاظ سے ولی اللہی تھے یا اسی شجر طیبہ کے ایک برگ و بار تھے - اور سب سے آخر میں سرسید کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ اور تذکرہ نگاری کا شاہ کار " شاہجہان آباد کے لوگوں کا بیان" یا بعنوان دیگر " تذکرہ اہل دہلی" کا بیشتر مواد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خانوادۂ علمی کے ارکان، ان کے علم و عمل ، تصنیف و تالیف اوردرس و تدریس کی خدمات کے تذکرے، اصلاح و جہاد کے محرکوں کے بیان اور ان کی سیرتوں کے محاسن کے تذکار مقدس پر مشتمل ہے -

تذکرہ اہل دہلی کا مطالعہ صرف سرسید کی سیرت‌وافکار کے مطالعہ کے نقطۂ نظر سے بھی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ یہ تذکرہ بذاتہ ادب کا شاہ کار اور اس دور کے اور اس سلسلے کے تمام تذکروں کا پہلا ماخذ ہے - یہ شخصیات جس دور سے تعلق رکھتی ہیں - سرسید خود بھی اسی دور کے انسان تھے - سرسید کی معلومات کتابی مطالعے پر نہیں بلکہ ذاتی مشاہدے اور واقفیت پر مبنی ہیں - اس تذکرے کی صرف ایک شخصیت شاہ عبدالقادر کی ایسی ہے جو سرسید کی ولادت سے تین سال قبل (۱۸۱۴ع میں) اس دنیا سے رخصت ہوچکی تھی یا ایک شخصیت (شاہ رفیع الدین) نے ان کی ولادت کے ایک سال بعد رحلت کی - ظاہر ہے کہ ان کے بارے میں تو سرسید کی معلومات ذاتی نہیں ہوسکتیں لیکن دوسرے تذکرہ نویسوں کے مقابلے میں سرسید کی معلومات کا ماخذ وہی دور اور اسی دور بلکہ اس گرد و پیش کی شخصیتیں ہیں، اس لیے ان دونوں بزرگوں کے بارے میں بھی سرسید کے

بیان کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔ اس دور کی دو اور بڑی شخصیتیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (ف جون، ۱۹۲۳ع) اور شاہ غلام علی مجددی (ف اکتوبر، ۱۸۲۳ع) کے انتقال کے وقت سرسید کی عمر سات سال کی تھی اور یہ عمر بلاشبہ ایسی ہوتی ہے کہ شعور کی آنکھ کھلنے لگتی ہے اور عظمتوں اور پستیوں کے احساسات کے نقوش دل پر ثبت ہوجاتے ہیں ۔ اس لیے ان دونوں بزرگوں کے بارے میں سرسید کی معلومات کی حیثیت ذاتی مشاہدے کی ہے اور ان عہد و اکابر کے بارے میں سرسید کے تاثرات براہ راست شخصیت کے مطالعے اور ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں۔ اور جہاں تک دیگر شخصیات کا تعلق ہے تو ان میں سے بعض شخصیات سے سرسید کا نیازمندانہ ، بعض سے شاگردانہ اور بعض سے دوستانہ علاقہ و تعلق تھا اور بعض ان کے لیے خورد کی حیثیت رکھتے تھے ۔ اس لیے واقعات کی صحت کے باب میں تو سرسید بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ اس خصوصیت میں سرسید کے اس تذکرے کا مقابلہ اور برابری کوئی دوسرا تذکرہ نہیں کرسکتا۔ اس کی حیثیت اصحاب تذکرہ کے باب میں بنیادی ماخذ کی ہے ۔ تذکرے کی اہمیت اس کی جامعیت میں بھی دیکھی جاسکتی ہے ۔ سرسید نے اس دور کی کسی قابل ذکر شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا۔

اس تذکرے کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہے ۔ ابتدائی تراجم اور تالیفات کے بعد ان کے قلم کا یہی شاہ کار ہے جس میں سرسید کی زبان میں پختگی اور قلم میں ٹھہراؤ نظر آتا ہے ۔ اور زبان کے ارتقا اور ترقی مدارج اسلوب کا وہ عمل جو آغاز تالیف و ترجمہ سے جاری تھا یہاں پہنچ کر محکم و مستحکم ہوگیا ہے ۔ تراجم کی ابتدائی تمہیدی سطروں کو چھوڑ کر زبان آسان ، سلیس اور عام فہم ہے، تحریر میں صفائی اور سادگی ہے ، خیال آرائی کی جگہ عام طور پر حقیقت نگاری پر نظر مرتکز رہی ہے اور وقت کے عام پسندیدہ رجحان

مقفا اور مسجع عبارت آرائی اور شاعرانہ اسلوب بیان کے مقابلے میں تاریخی نقطۂ نظر اور انداز بیان پیش نظر اور مرغوب قلم رہا ہے ۔

اس کی تاریخی ، سوانحی ، علمی اور ادبی اہمیت اور تذکرہ نگاری کا شاہ کار ہونے کے باوجود اس میں بعض خامیاں بھی تھیں۔ بعض بیانات غلط تھے ، بعض بیانات نہایت مجمل تھے کہ گوہر مقصود کا ہاتھ آنا دشوار اور حقیقت کا پتا چلانا مشکل تھا ، بعض تراجم میں صاحب ترجمہ کی زندگی کے بعض گوشے پردۂ خفا میں رہ گئے تھے مثلاً

شاہ غلام علی مجددی کا ترجمہ ان کی ولادت سے وفات تک ان کی پوری شخصیت کا نہایت دل فریب تذکرہ ہے لیکن ان کے اساتذہ، ان کے تلامذہ اور ان کی تالیفات و ملفوظات کے بارے میں اس سے کچھ معلوم نہیں ہوتا ۔ اسی طرح مفتی صدرالدین آزردہ ، مولوی امام بخش صہبائی، علامہ فضل حق وغیرہم کے تراجم میں ان کے سوانح کا حصہ بہت کم ہے ۔ بعض شخصیات کے ذیل میں ان کی معلومات ناقص یا غلط تھیں مثلاً حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسمعیل شہید کی تحریک جہاد کے پس منظر اور مقصد جہاد یا اصل حریف سکھ یا انگریز ؟ کے بارے میں سرسید کی معلومات درست ثابت نہیں ہوتی ہیں۔ بعض بیانات نہایت مجمل یا محض اشارات تھے مثلاً مولوی سید محبوب علی کے ترجمے میں ان کی ایک خوبی " سفر کردہ " بیان کی ہے ۔ ترجمہ کے مطالعے سے پتا نہیں چلتا کہ سرسید کا اشارہ کن سفروں کی طرف ہے ۔ محبوب علی نے یہ سفر کب، کہاں کے اور کیوں کیے تھے ۔ بعض شخصیات کے بہت سے سوانح ۱۸۴۵ء کے بعد ظہور پذیر ہوئے مثلاً میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے درس و تدریس کی شہنشاہیت کا قیام تذکرے کی تالیف کے بعد عمل میں آیا ۔ کئی شخصیات کی علمی فتوحات کا دور بھی اس کے بعد کا ہے ۔ بعض اصحاب تراجم کی تواریخ

ولادت یا وفات درج نہیں تھیں یا درست نہ تھیں۔ ان دقائق اور ان کی درستگی کو تصحیح ، تشریح اور تکمیل کے تین درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے - اس سلسلے کی ایک کوشش " اضافہ" ہے یعنی بعض تراجم جو اصل کتاب میں نہ تھے بلکہ بعد میں سرسید کے قلم سے نکلے تھے مثلاً حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم ، مولانا محمد مظہر وغیرہم انہیں بھی خانوادۂ ولی اللہی سے نسبت کی بنا پر دائرہ تحقیق میں شامل کرلیا ہے -

تذکرہ خانوادۂ ولی اللہی کی بنیاد اگرچہ " تذکرہ اہل دہلی" پر ہے لیکن اس میں چوں کہ بعض مشائخ کے علاوہ مجاذیب ، حفاظ و قراء، خوش نویسوں اور مصوروں کو شامل نہیں کیا گیا ہے اور متعدد ایسی شخصیات کا اضافہ کیا گیا ہے جو" تذکرہ اہل دہلی" میں شامل نہیں تھیں، نیز کئی شخصیات مثلاً فضل حق، نوازش علی، مفتی، محمد قاسم ، محمد مظہر وغیرہم کا تعلق دہلی سے نہیں تھا - اس لیے اس کا نام " تذکرہ خانوادۂ ولی اللہی" تجویز کیا گیا اور یونی ورسٹی نے اس نام سے تحقیق و تدوین کی اجازت بھی دے دی - اس طرح ایک بالکل نیا تذکرہ وجود میں آگیا۔

***

باب ـ اول

فکری و تہذیبی جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب ـ اول

فکری و تہذیبی جائزہ

ہند و پاکستان میں مسلمانوں کا زوال اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ع) سے شروع ہوتا ہے ـ لیکن اس کی وفات سے تقریباً چار سال قبل اسی کے عہد کے ایک عالم دین شاہ عبدالرحیم کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے جو آگے چل کر ایک نئے دور علم و حکمت کا آغاز کرتا ہے ـ اور جس کے افکار و معارف کی بدولت مسلمانوں کی نشأت ثانیہ کی بنیاد پڑتی ہے ـ یہ بچہ جو اس عہد کا فاتح ہوا، اس کا تاریخی نام عظیم الدین تھا (۱) اور بشارتی نام خواجہ بختیار کاکی کے نام پر قطب الدین احمد رکھا گیا تھا ـ (۲) لیکن دنیا اسے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نام سے جانتی ہے ـ

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی:

شاہ ولی اللہ ۴ شوال ، ۱۱۱۴ھ مطابق ۱۰ فروری، ۱۷۰۳ع بروز چہار شنبہ، صبح کے وقت پیدا ہوئے ـ (۳) اللہ تعالی نے انہیں خلعت فاتحیت سے سرفراز فرمایا تھا اور دورۂ آخر کی امامت کے منصب پر فائز کیا اور فقہ میں "الطریقۃ المرضیۃ" (پسندیدہ طریقہ) کی طرف رہنمائی فرمائی اور فقہ الحدیث کے فن کی معرفت کی توثیق اور ارزانی فرمائی ـ نیز سنن نبوی کے اسرار، احکام خداوندی کے مصالح و حکم اور ترغیبات اعمال اسلامی کے بھیدوں (یعنی مقاصد و ذرائع کے امتیاز) کی بصیرت عطا فرمائی ـ غرض کہ دین و شریعت کی ان تمام باتوں کے علم اور ان کے اسرار و حکم سے ان کے سمجھے کو

---

(۱) عطا اللہ حنیف بن حسین سلفی بھوجیانی (مرتب و مترجم)، "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" از شاہ ولی اللہ دہلوی، (ملحقہ "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر")، لاہور: مکتبہ سلفیہ، ۱۹۵۱ع، ص ۱

(۲) غلام مصطفی قاسمی، "التفہیمات الالہیۃ" از شاہ ولی اللہ دہلوی، حیدرآباد: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۹۶۷ع، ص ۱۸۲-۱۸۵

(۳) الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف"، محولہ بالا، ص ۱

معمور کردیا تھا - یہ اللہ تعالی کا ایسا فضل اور احسان تھا کہ ان سے پہلے اس خاص اور جلیل الشان فن میں کسی عالم دین نے نہ تو اپنے سمندر فکر کو مہمیز لگائی تھی اور نہ راہوار قلم کو اقدام و سعی کے لیے جنبش دی تھی - عزالدین عبدالسلام نے بلا شبہ اس فن کے قواعد کبری کی طرف اشارہ کیا ہے - لیکن اس فن کی حقیقت تک ان کی بھی رسائی نہیں ہوئی ۔ "حجۃ اللہ البالغۃ" جو احکام خداوندی کے اسرار و حکم میں اسلامی ادب کے ایک شاہکار اور زندہ جاوید کتاب کی حیثیت رکھتی ہے ، حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ پر اللہ تعالی کے اس فضل و احسان کا منہ بولتا ثبوت ہے - اس نعمت عظمی اور حقیقت عالیہ کی طرف خود شاہ صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

" و منۃ اللہ العظمی علی العبد الضعیف ہی انہ تعالی اولاہ خلعۃ الفاتحیۃ والدورۃ الاخیرۃ علی یدہ والجمع الطریقۃ المرضیۃ فی الفقہ او و فقہ تدرس فی فقہ الحدیث و اسرار السنن و اصالح الاحکام و الترغیبات و سائر ماجاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ربہ عز وجل و کام بتعلیمہ والحق ان ہذا فن لم اسبق الیہ فی تدوینہ ولم یحکم الکلا فیہ اخدما الحکمۃ القفیر مع انہ فن جلیل الشان - وان ارتاب احد فی ہذا القول فلینظر حظ القواعد الکبری للشیخ عزالدین عبدالسلام - فانہ رحمۃ اللہ تعالی مع ما بذل فیہ غایۃ جہدہ و لم یظفر فیہ بعشر البحوث -" (۱)

علوم و معارف کا دور ناگفتہ:

جس طرح مسلمانوں کا زوال ۱۹ ویں صدی کے آغاز میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ

---

(۱) " الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف "، محولہ بالا ، ص ۲-۵

گیا تھا اسی طرح شاہ ولی اللہ کے علوم و معارف اور دور فاتحیت کا نقطہ کمال بھی ۱۹ویں صدی کا آغاز تھا، جب کہ نہ صرف ان کے تین عظیم المرتبت صاحب زادگان شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر اور خاندان کے متعدد جلیل القدر ارکان شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ محمد اسماعیل ابن شاہ عبدالغنی اور شاہ محمد مخصوص اللہ ابن شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز کے نواسے مولانا شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب اور داماد مولانا عبدالحئی درس و تدریس اور دعوت و ارشاد میں مصروف تھے خانوادہ ولی اللہی کے دیگر وابستگان بھی علمی، تعلیمی، تہذیبی زندگی میں اور اصحاب درس و تدریس اور اہل سلوک و ارشاد میں سربرآوردہ تھے ۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے اہل کمال کے ان مجمع کے بارے میں لکھا ہے :

"تیرھویں صدی ہجری میں جب مسلمانوں کا تنزل درجہ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہوچکے تھے ۔ حسن اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہوگئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں۔" (۱)

اس اجمال کی شرح حالی کی ایک مشہور غزل میں ملتی ہے، جس کا مطلع یہ ہے :

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز

دوستو! دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

---

(۱) حالی، الطاف حسین، " یادگار غالب "، لاہور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء
ص ۱

اس غزل کے چند شعر یہ ہیں :

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی، مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دل چسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خوں کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تونے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ھوئے ھیں بہت جاگ کے اے دور زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سوئیں کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کردیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھوگے کبھی لطف شبانہ ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز " (۱)

حالی نے اس غزل میں جن حالات، شخصیات اور دلی کی علمی و تہذیبی زندگی کی طرف لطیف اشارات کیے ہیں اور بلیغ کنایوں سے کام لیا ہے اس کی تفصیل حکیم محمود خان کے مرثیے میں ملتی ہے جو فی الحقیقت محمود خان کے مرثیے سے زیادہ اس معمورۂ فضل و دانش ـــ دہلی کے اجڑنے کا ماتم ہے - یہ صرف شاعری نہیں ہندوستان میں

---

(۱) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، (مرتب) "کلیات نظم حالی"، لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی، ۱۹۶۸ء، ج اول، (غزل نمبر ۳۸)، صص ۱۲۰+۱۲۱

مسلمانوں کی علمی و تہذیبی تاریخ ہے ۔ بقول مولانا آزاد :" خواجہ حالی مرحوم نے حکیم محمود خاں کے مرثیے میں جو کچھ کہا ہے اسے ان علمی، ادبی اور تہذیبی مجلسوں اور صحبتوں کی یاد میں پڑھنا چاہئیے ۔" (۱) اس مرثیے کے چند ابتدائی بندوں پر نظر ڈال لینا چاہئیے تاکہ دہلی مرحوم کی ان برگزیدہ علم و فضل شخصیات کے ماحول کا اندازہ ہوسکے، جن کا یہ تذکرہ ہے ۔ ذیلی عنوان اس لیے قائم کیے گئے ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو :۔

" اہل علم و ہنر :

اے جہان آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیری اک عالم میں دھوم
تھے ہنر ور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

علمائے دین :

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاق علم و دین
جیسے اب تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں
ہند میں جو تھا محدث، تھا وہ تیرا خوشہ چیں
تھی محدث خیز اے پایتخت تیری سر زمیں
تھا فقہ بھی مسلم تیری خاک پاک کا
بیہقی وقت تھا ایک اک فقیہہ اس خاک کا

مشائخ اعظام :

شاذ و نادر تھا تصوف میں کوئی تیرا نظیر
آب و گل کا تیری تھا گویا تصوف سے خمیر

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول (مرتبہ) " نقش آزاد "، از مولانا ابوالکلام آزاد، لاہور : کتاب منزل، ۱۹۵۹ء، ص ۲۱۷

تیری کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ مہر منیر
تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مستنیر
آج جس دولت کا بازار جہاں میں کال ہے
تیرا قبرستان اس دولت سے مالا مال ہے

اطباء کرام :

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آن کر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغ ارم
بھرتے تھے تیری اطبا بھی مسیحائی کا دم
ھند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی ہاں تجھ سے ارزانی ہوئی

ادیب و شاعر :

خاک سے اٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور
اک جہاں شعلہ بیانی سے ہے ان کی باخبر
راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سرو کو ہوگی نہ راس اتنی ہوائے کاشغر
حسن صورت میں اگر ضرب المثل نوشاد تھا
حسن معنی تیرا حصہ اے جہاں آباد تھا

سلطان فاتح :

لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم
جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم
دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم
کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے ان کے جھوم جھوم
آئی گلشن میں نہ تیری بھول کر فصل خزاں
تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

دھلی : معمورۂ فضل و دانش :

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام
تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہور انام
آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام
شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام
رسم میں، آئین میں، اوضاع میں، اطوار میں
طرز میں، انداز میں، رفتار میں، گفتار میں" (۱)

اسی بات کو مولوی ذکاء اللہ نے اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے :

" قاعدہ ہے کہ جب چراغ بجھنے کو ہوتا ہے تو لو بھڑک اٹھتی ہے - اسی طرح سلطنت تیموریہ کا چراغ گل ہونے کو ہوا تو اس نے اپنی وہ روشنی چمکائی اور ایسا سنبھالا لیا کہ اس کی نظیر مشکل سے تاریخ میں ملے گی -" (۲)

باکمالوں کا تذکرہ :

پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے اپنے ایک مقالے میں نہایت تفصیل اور جامعیت کے ساتھ اس عہد کا سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی جائزہ لیا ہے - اس سلسلے میں سرسید سے انھوں نے خاص طور پر استفادہ کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" سرسید نے ان باکمالوں کا ایک تذکرہ جو مغلوں کے دور آخر میں دھلی میں جمع تھے اپنی تالیف " آثار الصنادید" میں شامل کیا تھا - اس تذکرے پر نظر ڈالنے سے حالی اور ذکاء اللہ کے بیانات کی بھی پوری توثیق ہوجاتی ہے - اس تذکرے میں سرسید نے ۱۱۵ ممتاز ہستیوں کا حال لکھا ہے، (۳) جن میں مشائخ و صوفیا ، اولیا، علمائے علوم دینی و دنیوی، شعرا و ادبا، قرا و حفاظ ، خوش نویس ، مصور اور ماہرین موسیقی شامل ہیں - اس زمانے کی

---

(۱) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتب) ، " کلیات نظم حالی"، محولہ بالا ، ص ۳۹-۳۳۷

(۲) ذکاء اللہ ، " تاریخ اسلامیان ہند" ص ۳۶۰ بحوالہ " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، لاہور : پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۱ع ، ج ۸ (اردو ادب ، حصہ سوم) ، ص ۹

(۳) تذکرے میں شامل شخصیات کی صحیح تعداد ۱۱۸ ہے - تفصیل آگے آئے گی - (راقم)
(ابوسلمان شاہجہانپوری)

دلّی کی روحانی، علمی، فکری، فنی و ثقافتی زندگی کس قدر بھر پور ہوگی، جہاں باکمالوں کی اتنی بڑی تعداد موجود تھی!

بادشاہ وقت بہادر شاہ کو شعر و شاعری سے خاص دل چسپی تھی - وہ خود بھی شعر کہتے تھے اور ظفر تخلص کرتے تھے - قلعے میں باقاعدگی سے مشاعرے ہوتے تھے - قلعے سے باہر بھی شہر میں مختلف جگہوں پر شعر و شاعری کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ غالب، مومن، ذوق ، ظفر، شاہ نصیر، تپّر و رخشاں، شیفتہ ، ممنون ، صہبائی ، عیش ، بیخبر ، نثار، مجروح ، عارف ، ظہیر، احسان، سالک وغیرہ کے فارسی اور اردو نغموں سے دلّی کی ساری فضا گونج رہی تھی - مصوری سے بھی بادشاہ کو دل چسپی تھی اور بقول پرسیول اسپیئر "اس دور نے کم سے کم دو اہم مصور راجہ جیون رام اور حسین نظیر پیدا کیے ، جنھوں نے دہلی کے دبستان مصوری کو زندہ رکھا -(۱) سرسید نے غلام علی خاں، فیض علی خاں، مرزا شاہرخ بیگ اور محمد عالم کی مصورانہ مہارت کی بھی داد دی ہے -(۲) اکبر شاہ ثانی اور ظفر دونوں موسیقی سے بھی شغف رکھتے تھے اور ان کے زمانے میں لال قلعہ موسیقی کا بھی اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا۔ موسیقی کی باقاعدہ محفلیں منعقد ہوتی تھیں، جن میں اس زمانے کے نامور موسیقار حصہ لیتے تھے۔ سرسید نے اس دور کے نامور ارباب موسیقی میں ہمت خاں دھرپدسرا، راگ رس خاں بین نواز، میر ناصر احمد نغمہ سرا و بین نواز، بہادر خاں ستار زن، رحیم سین ستار زن، غلام خاں کلو اور قائم خاں دھرپدسرا، گلاب سنگھ پکھاوجی اور مکھو پکھاوجی کے نام گنائے ہیں اور ہر ایک کے کمال فن پر تبصرہ کیا ہے -(۳) فن خوش نویسی کے ماہروں میں خط نستعلیق میں سید محمد امیر، سید آغا، مرزا عبداللہ بیگ ، امام الدین احمد خاں، اخوند عبدالرسول اور بدرالدین علی خاں ممتاز تھے اور خط نسخ میں حافظ کلوخاں، میر امام الدین، خط شکستہ میں

---

(۱) اسپیئر، پرسیول، ص: ۸

(۲) اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں(مرتبہ) "تذکرہ اہل دہلی"، از سرسید احمد خاں، کراچی : انجمن ترقی اردو(پاکستان)، ۱۹۶۵ء ، ص: ۵۷-۲۵۵

(۳) ایضاً ، ص: ۶۱-۲۵۷

مولوی حیات علی اور پنڈت شنکر ناتھ کا ذکر سرسید نے کیا ہے -(١)

فنون لطیفہ کے ماہرین کے علاوہ فنون مفیدہ کے ماہر بھی دھلی کی رونق بڑھا رہے تھے - طب کی اہمیت انسانی زندگی میں روز روشن کی طرح عیاں ہے - اس فن کو بھی اس دور میں بڑے بڑے باکمال ملے - حکیم احسن اللہ کا نام اس سلسلے میں نمایاں ہے جو شاہی معالج بھی تھے وہ اپنے وقت کے بڑے عالم فاضل تھے - نہ صرف طب بلکہ ھندسہ و ھئیت سے بھی خوب واقف تھے - اور تدبیر و سیاست میں بھی ممتاز تھے- حکیم غلام نجف خان بھی مشہور طبیب تھے اور ایک زمانے تک طبیب کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم رہے - ان کے علاوہ حکیم غلام حیدر خان، حکیم غلام حسن خان، حکیم امام الدین ، حکیم فتح اللہ خان، حکیم پیر بخش، حکیم حسن بخش خان، حکیم محمد یوسف خان، حکیم محمود خان(٢) وغیرہ بھی نہ صرف علاج میں استاد تھے بلکہ دوسرے علوم قدیمہ کے بھی عالم تھے -

جسمانی صحت کی طرح روحانی صحت بخشنے والوں کی بھی اس دور میں کمی نہ تھی - کئی صاحب دل اولیاءومشائخ دھلی میں موجود تھے جنھوں نے صرف ریاضت و عبادت ھی میں کمال حاصل نہیں کیا تھا بلکہ جو اخوت اور انسانی محبت کے خیالات بھی عام کرتے تھے اور اپنی تعلیمات و مواعظ کو درس و تدریس ، کشف و کرامات ، اور تصنیف و تالیف کے واسطوں سے عوام تک پہنچاتے تھے- حضرت شاہ غلام علی اس زمانے کے بہت بڑے بزرگ تھے جن کی تعریف کرتے ہوئے سرسید کی زبان خشک ہوتی ہے - ان کی " خانقاہ میں پانچ سو سے کم فقیر نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمے تھا اور باوجودے کہ کہیں سے ایک حبہ مقرر نہ تھا، اللہ تعالی غیب الغیب سے سب کام چلاتا تھا- (٣) شاہ غلام علی کے خلیفہ شاہ ابوسعید تھے اور ان کے بڑے بیٹے شاہ سعید احمد، سب علم حدیث و فقہ ، تفسیر و قرات کا عالم اور ساتھ ھی صاحب دل و اھل باطن تھے- اسی طرح شاہ عبدالغنی ، شاہ محمد آفاق، حاجی علاء الدین احمد، اور مولانا محمد فخرالدین بھی تھے،

---

(١) اختر جوناگڑھی، (مرتبہ) ، " تذکرہ اھل دھلی"، محولہ بالا، ص ٥٥-٢٥٢

(٢) حکیم محمود خان کی باکمال شخصیت اس تذکرے میں شامل نہیں -(راقم)

(٣) اختر جوناگڑھی(مرتبہ) ، " تذکرہ اھل دھلی"، محولہ بالا، ص ٢٦

خواجہ محمدنصیر رنج جو خواجہ میر درد کے نواسے تھے علاوہ علوم دینی و باطنی کے ریاضیات اور موسیقی کے بھی بڑے ماہر تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ میر محمدی ، مولانا قطب الدین، حاجی غلام نصیرالدین، مولوی یوسف علی، حضرت شاہ غیاث الدین، حضرت شاہ صابر بخش میران شاہ دائو، حضرت جلال، مولانا محمد حیات وغیرہ اس دور کے ممتاز مشائخین و صوفیہ میں سے تھے جن کا ذکر سرسید نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔

ان علمائے کرام کا ایک وسیع طبقہ بھی دھلی میں موجود تھا جنھوں نے دین اسلام کے مختلف پہلوؤں کو مفکرانہ انداز میں پیش کیا۔ اپنی تحریر و تقریر میں، دینی معاملات و مسائل کے سمجھانے میں ایک اجتہادی شان پیدا کی اور اپنے زمانے کے معاشرے کو پاکیزہ بنانے کی حتی المقدور کوششیں کیں۔ بعضوں نے تحریر و تقریر سے آگے بڑھ کرعملی طور پر جہاد اور آزادی کی تحریکیں چلائیں اور مسلم اقتدار کے احیا کی تدبیریں کیں۔ سرسید نے اپنے تذکرے میں جن علمائے دین کے حالات لکھے ہیں ان کے نام یہ ہیں :

شاہ عبدالعزیز ، مولانا صدرالدین خاں، مولوی رشیدالدین خاں ، شاہ رفیع الدین، مولوی منصور اللہ ، مولوی عبدالقادر، مولانا عبدالحئی، مولانا محمد اسمعیل شہید ، مولانا محمد اسحاق ، مولانا محمد یعقوب، مولاناقطب الدین خاں، مولوی عبدالخالق ، مولوی نذیر حسین، مولوی محبوب علی، مولوی نصیرالدین، مولوی کریم اللہ ، مولانا فضل امام ، مولانا فضل حق، مولوی نورالحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک علی، مفتی سید رحمت علی خاں، اخوند شیر محمد ، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، مولوی نوازش علی، مولوی محمد رستم علی، مولوی حاجی محمد ، ملا سرفراز ۔

ان کے علاوہ مولانا سید احمد شہید کا ذکر سرسید نے مشائخین میں اور مولوی امام بخش صہبائی کا بلبل نوایان شاہجہاں آباد کے تحت کیا ہے ۔

شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبدالعزیز سترہ سال کی عمر ہی میں والد کے انتقال پر ان کے جانشین بنے اور ساٹھ سال تک انھوں نے اپنے والد کے کام کو جاری رکھا ۔ علم حدیث کے درس کی طرف انھوں نے خاص طور پر توجہ کی

چناں چہ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلہ آپ سے ملتا ہے ۔ آپ کا زیادہ وقت درس و تدریس میں گزرتا تھا تاہم مسلمانان ہند کی سیاسی و اخلاقی ترقی سے بھی آپ غافل نہ تھے ۔ شاہ عبدالعزیز نہ صرف اسلامی علوم کے بلکہ زبان و ادب کے بھی بڑے ماہر تھے اور دوسرے علوم و فنون پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ اس زمانے کے بیشتر علما نے آپ سے فیض حاصل کیا۔

شاہ ولی اللہ کے دوسرے بیٹوں شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی نے بھی والد کے مشن کی تکمیل میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا اور اپنے علم و فضل، درس و تدریس، تحریر و تقریر سے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی اور ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ۔ شاہ رفیع الدین کا سب سے اہم کارنامہ قرآن مجید کا تحت اللفظ اردو ترجمہ ہے ۔ شاہ عبدالقادر نے بھی قرآن مجید کا ایک ترجمہ کیا اور اس میں اردو محاورے کا خیال رکھا۔ ان ترجموں سے عام مسلمانوں کو اپنے دین کے منبع سے براہ راست آگاہی ہوئی۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمعیل شہید نے خاندان ولی اللہی سے فیض حاصل کرکے جو مجاہدانہ کارنامے انجام دیے ان کا ذکر آگے تفصیل سے آتا ہے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی علوم معقولہ و منقولہ دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے ، فاضل ادب بھی تھے اور عربی و فارسی تحریر پر یکساں مہارت رکھتے تھے ۔ مولف " تذکرہ علمائے ہند" نے لکھا ہے کہ ان کی نظم چار ہزار اشعار سے زیادہ پر مشتمل ہوگی ۔(۱) مولانا امام بخش صہبائی جو دہلی کالج میں صدر مدرس فارسی مقرر ہوئے تھے عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے، فارسی و عربی میں شعر بھی کہتے تھے اور نثر بھی لکھتے تھے ۔ مولانا مملوک علی جو دہلی کالج میں مدرس اول تھے عربی و فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں کمال رکھتے تھے ۔ علوم منقولہ و معقولہ کے ماہر تھے اور بلا کا حافظہ رکھتے تھے ۔ صدرالصدور مفتی صدرالدین آزردہ اعلا پائے کے شاعر، عالم اور بلند فطرت انسان تھے جو اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے بعد زیادہ تر

---

(۱) ایوب قادری، محمد (مرتبہ) "تذکرہ علمائے ہند"، از مولوی رحمان علی، کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۱ء، ص ۸۳-۳۸۲

وقت درس و تدریس میں صرف کرتے تھے ۔ انھوں نے مدرسۂ دارالبقا کو از سرنو تعمیر کرایا اور تدریس علوم کا انتظام کیا۔

دہلی — علم و تہذیب کا مرکز :

غرض یہ کہ دہلی انیسویں صدی کے نصف اول میں مشرقی تہذیب و تمدن علوم دینی و دنیوی اور فنون لطیفہ و مفیدہ کا بہت بڑا مرکز تھی مگر جیسے جیسے انگریزوں کے قدم جمتے گئے مغربی اثرات بھی آہستہ آہستہ نفوذ کرنے لگے۔ حتی کہ لال قلعہ میں بھی انگریزی اثرات بعض شہزادوں کے رہن سہن ، پہننے اوڑھنے اور تعمیر مکانات کے سلسلے میں ظاہر ہوئے ۔ اکبر شاہ ثانی کا دوسرا بیٹا مرزا بابر تھا جس نے لال قلعہ میں دیوان عام کی پشت پر رنگ محل کے احاطے میں مغربی طرز کا ایک مکان تعمیر کرایا وہ مغربی طرز کا لباس بھی پہنتا تھا اس کے پاؤں پتلون میں بھاری بوٹ اور ہاتھوں میں ایک بھاری سی چھڑی ہوتی تھی ۔ اس انداز سے وہ چند گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر شہر میں نکلتا تھا۔

دہلی میں انگریزی اثرات کا سب سے بڑا منبع دہلی کالج تھا جو بہت تھوڑے عرصے میں ایک علمی اور تعلیمی ادارے سے بڑھ کر ایک تہذیبی و ثقافتی مرکز بن گیا ۔ ایسا مرکز جہاں مشرق و مغرب کا سنگم ہوا۔" (۱)

اس عہد کے تہذیبی و ادبی ماحول کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :

" اٹھارہویں صدی میں پیرس اور لندن کے علم دوست امرا کے سیلون اور ڈرائنگ روز کے جو حالات ہم پڑھتے ہیں ہو بہو یہی حال دہلی کے دیوان خانوں کی مجلسوں کا بھی تھا۔ ہر حلقے میں کسی نہ کسی امیر کا دیوان خانہ شب کے اجتماع و انس کا مرکز بن جاتا تھا اور اس حلقے کے لیے ٹھیک ٹھیک ایک علمی ، ادبی اور تفریحی کلب کا کام دیتا تھا۔ والد مرحوم (۲) ان دیوان خانوں کی مجالس کے جو افسانے سنایا کرتے تھے ، کاش وہ قلم بند

---

(۱) شمس الدین صدیقی ، ڈاکٹر ، " سیاسی ، فکری ، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر" ، (مقالہ) ، " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" ، محولہ بالا ، ج ۸ (اردو ادب ، حصہ سوم) ، ص ۱۳-۹

(۲) مولانا آزاد کے والد مولوی خیرالدین جنھوں نے علامہ فضل حق خیرآبادی کی خدمت میں منقولات کی تکمیل کی تھی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ (" نقش آزاد" محولہ بالا ، ص ۳۰۸-۱۲)

کیے جاسکتے کہ بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اجالا تھا ۔ دھلی مرحوم کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔ گوشان وشکوہ کے سارے پچھلے نقوش مٹ چکے تھے لیکن مٹتے ہوئے رنگ و روغن میں بھی عہد ماضی کے مرقعوں کی بہار دیکھی جاسکتی تھی ۔ خواجہ حالی مرحوم نے حکیم محمود خان کے مرثیے میں جو کچھ کہا ہے اسے ان صحبتوں کی یاد میں پڑھنا چاہئے:

قوم کے اجداد رفتہ خواب کی تعبیر تھی
عہد عالم گیر و اکبر شاہ کی تصویر تھی

والد مرحوم کی نشستوں میں جب کبھی اس عہد کی صحبتوں کا ذکر کرتے تھے تو بار بار یہ شعر پڑھتے اور آب دیدہ ہوجاتے :

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیة من عرار

فرماتے تھے کہ مفتی صاحب (۱) کا دیوان خانہ دھلی کے تمام منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو، لیکن شب کی یہ مجلس کبھی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جاسکتا تھا ۔ اگر کوئی نووارد دھلی آتا اور چاہتا کہ دھلی کے سارے فضل و کمال کو بیک وقت و بہ یک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانے کا رخ کرتا ۔" (۲)

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے قدرے تفصیل کے ساتھ اس دور کی دلی کے ادبی ماحول کی عکاسی کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" مغلیہ دلی کے آخری دور میں مشاعرے سماجی زندگی کی جان بن گئے تھے۔ اس سلسلے میں قلعہ معلی کی روایات نے تمام دلی کو متاثر کیا تھا اور ہر امیر کا دیوان خانہ اور چاندنی چوک اور چوک سعد اللہ کا ہر قہوہ خانہ علم و ادب کی محفل بن گیا تھا۔ شعرا کی آپس کی صحبتیں

---

(۱) صدرالصدور مفتی صدرالدین آزردہ ۔

(۲) مہر، مولانا غلام رسول (مرتب)، " نقش آزاد"، محولہ بالا، ص ۱۷-۳۱۶

بڑی دل چسپ اور رنگین ہوتی تھیں ۔ ان میں حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی شاعرانہ کمالات کی معراج سمجھی جاتی تھیں ...... شاعروں میں آپس کی رقابتیں اور معاصرانہ چشمکیں بعض اوقات ان مجلسوں میں گرمی پیدا کردیتی تھیں زمانے کے نامساعد حالات کا سایہ بھی ان مجلسوں پر پڑ جاتا تھا۔" (۱)

آخر دور مغلیہ میں بڑے بڑے صاحب کمال اور بلند پایہ شاعر جمع ہوگئے تھے۔ مختلف ادوار میں ایک ایک دو دو اصحاب کمال کی نشان دہی کی جاسکتی ہے لیکن ایک وقت میں اتنے بڑے شاعروں کا جمع ہوجانا تاریخ کا کوئی معجزہ ہے ، ذوق ، مومن ، علوی ، صہبائی ، شیفتہ ، آزردہ ، وغیرہ تو اس تذکرے کے شخصیات ہیں ۔ ظفر و غالب بھی اس عہد کی دلی کی سربرآوردہ شخصیات تھیں ۔ غالب کے اور دلی کے تعلق سے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے کیا خوب لکھا ہے :

" آخری مغلیہ دور کی دلی میں اگر غالب سے نہ ملنا ایک علمی جرم ہوگا۔ غالب نے تو یہ کہا تھا :

دم از ریاست دھلی نمی زدم غالب
مم ز خاک نشیمان آں دیار یکے

لیکن حقیقت میں غالب دلی تھے اور دلی غالب ۔ ان کا رھن سہن ، ان کی دل چسپیاں، ان کی انسانیت سب میں دھلی کی روح سما گئی تھی۔" (۲)

اگرچہ مقالے کے آغاز میں " یادگار غالب " سے حالی کی تحریر کی چند سطریں نقل کی گئی ہیں لیکن مناسب ہوگا کہ اس موقع پر کسی بھی تحریر پر ایک نظر ڈال لی جائے اس سے اس زمانے کی دلی کی بعض علمی، ادبی اور تہذیبی شخصیتوں پر روشنی پڑتی ہے اور اس ادبی و تہذیبی ماحول کا اندازہ ہوتا ہے جو ہمارا موضوع سخن ہے ۔ حالی

---

(۱) خلیق احمد نظامی، "ادوار و عصر" — عہد وسطیٰ کی دلی" دہلی: شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء، صفحہ ۱۵-۱۱۲

(۲) ایضاً، ص ۱۱۶-۱۱۵

لکھتے ھیں :

" تیرھویں صدی ھجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجہ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ھوچکے تھے، حسن اتفاق سے دارالخلافہ دھلی میں چند اھل کمال ایسے جمع ھوگئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاھجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم کلکتہ فرماتے ھیں :

ھندرا خوش نفسانند سخن ور کہ بود
باد درخلوت شان مشک فشان از دم شان
مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شان

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ھی بار راقم کا دلی جانا ھوا ، اس باغ میں پت جھڑ شروع ھوگئی تھی ۔ کچھ لوگ دلی سے باھر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ھوچکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھ کو ھمیشہ فخر رھے گا ، وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے، بلکہ ھندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا کیوں کہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا اور جس ھوا میں لوگوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ھوا پلٹ گئی :

زمانہ دگر گو نہ آئین نہاد
شد آن مرغ کو بیضہ زرین نہاد

علی الخصوص مرزا اسد اللہ خان غالب جن کی عظمت و شان اس سے بالا تر تھی کہ ان کو بارھویں یا تیرھویں صدی ھجری کے شاعروں اور انشاپردازوں میں شمار کیا جائے ۔" (۱)

---

(۱) حالی، مولانا الطاف حسین، " یادگار غالب "، محولہ بالا ، ص ۲-۱

مدرسے اور خانقاہیں :

اسلامیان ہند کی تاریخ میں دہلی کو جوں جوں سیاسی مرکزیت حاصل ہوتی گئی علمی، ادبی، تہذیبی مرکزیت بھی اسے حاصل ہوتی گئی ۔ دہلی میں مشائخ ، علما، شعرا، ارباب فن وغیرہ کے جمگھٹے رہنے لگے ۔ چشتیہ و نقشبندیہ سلسلے کی دو خانقاہیں تعلیم و تربیت کے دو عظیم الشان مراکز تھے پہلا مرکز خواجہ باقی باللہ نے نقشبندیہ سلسلے کا قائم کیا ۔ ان کے مریدین میں شیخ سرہندی، مجدد الف ثانی، اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے عالم گیر شہرت حاصل کی اور حضرت شیخ نصیرالدین دہلوی نے چشتیہ سلسلے کے قیام میں سعی کی تھی ۔ ان کے بعد حضرت شیخ کلیم اللہ نے اپنے زمانے میں اس سلسلے کا احیاء کیا۔ نقشبندی سلسلے کا احیا و استحکام مرزا مظہر جان جاناں کی بدولت ہوا لیکن اس کی ترقی اور عروج کا دور حضرت شاہ غلام علی کا عہد یمن و سعادت تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :

> " مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ اپنے زمانے میں دلی کی نہایت مشہور خانقاہ تھی اور کئی اعتبار سے مرزا مظہر جان جاناں کی خانقاہ سے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کے ایک ہزار خلیفہ اور لاکھوں مرید تھے۔ عقیدت مندوں کا سلسلہ دور دور تک ملکوں میں پھیلا ہوا تھا۔" (۱)

ان کے علاوہ شاہجہاں آباد میں قدم قدم پر خانقاہیں تھیں۔ کہیں چشتیوں کے جماعت خانے، کہیں قادریوں کے مرکز ، کہیں رسول شاہیوں کا زاویہ ، کہیں نقشبندیوں کی خانقاہیں ۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان ہے کہ محمد شاہ کے زمانے میں دہلی میں بائیس صاحب ارشاد بزرگ ہر خانوادے کے موجود تھے۔ (۲)

دلی میں مدرسوں کی بھی کمی نہ تھی ۔ مسجدوں ، خانقاہوں اور امرا کی حویلیوں میں مدرسے قائم تھے۔ کچھ مدرسوں کی سرپرستی بادشاہ اور امرا کرتے تھے، کچھ مدرسوں کے لیے اوقاف موجود تھے اور کتنے ہی علماء بغیر کسی دنیاوی سہارے اور سرپرستی

---

(۱) خلیق احمد نظامی، " اوراق مصور"— " عہد وسطی کی دلی"، محولہ بالا، ص ۱۰۳

(۲) ایضاً، صص ۲-۱۰۰

کے توکلاً علی اللہ خدمات درس و تدریس انجام دیتے تھے۔ خاص اس عہد میں شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم کا قائم کردہ مدرسہ ، " مدرسہ رحیمیہ " موجود تھا۔ جو اب اورنگ آبادی مسجد میں تھا۔ غازی الدین کا قائم کردہ مدرسہ موجود تھا جو اس زمانے میں " دھلی کالج " کے نام سے معروف تھا۔ " دارالبقا" کا تاریخی مدرسہ موجود تھا۔ جس کا احیا مفتی صدرالدین نے کیا تھا پنجابی کٹرہ کی مسجد کا مدرسہ تھا جس کے صدر نشین مولوی عبدالخالق تھے اور بعد میں جس میں مولانا نذیر حسین محدث نے اپنی مسند درس و تدریس حدیث بچھائی تھی۔ فتح پوری مسجد کا مدرسہ تھا جس سے اخوند شیر محمد کا بھی تعلق تھا۔ مدرسہ حسین بخش تھا جس میں حالی نے بھی پڑھا تھا۔ خانقاہوں میں مرزا مظہر جان جاناں کی خانقاہ میں ان کے خلیفہ شاہ غلام علی تزکیہ باطن کے علاوہ تعلیم کتاب و سنت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اور بھی کئی مدرسے تھے جنھوں نے دلی کو علمی وقار اور مرکزیت عطا کی تھی۔ لیکن ان تمام مدارس میں شاہ ولی اللہ کا مدرسہ " رحیمیہ " سب سے سربلند تھا۔ اٹھارویں صدی اور اس کے بعد کے ھند و پاکستان کی تاریخ میں اس کا فیضان زندگی کے ہرگوشے میں نظر آتا ہے ۔ مدرسہ " رحیمیہ " جو بعد کو مدرسہ " عزیزیہ " اور پھر مدرسہ " شاہ محمد اسحاق" کے نام سے مشہور ہوا، صرف تعلیم کتاب و سنت ہی کا مرکز نہ تھا بلکہ اس سرچشمہ سے علم و حکمت و سیاست کی تحریکیں اٹھیں ۔ اگر ھندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کی دینی ، علمی، سیاسی اور ثقافتی تاریخ مرتب کی جائے تو اس مدرسے کے فیض یافتگان قومی اور ملی تاریخ کے ہر گوشے میں نمایاں نظر آئیں گے ۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :

" دلی کے علمی وقار کو قائم کرنے والے مدرسے مدرسہ شیخ عبدالحق ، مدرسہ رحیمیہ اور بازار خانم کا مدرسہ اور اجمیری دروازے کا مدرسہ تھا۔" (۱)

---

(۱) خلیق احمد نظامی ، " تاریخ مشائخ چشت"، اسلام آباد : دارالمولفین، ۱۹۷۵ء، ص ۷۷-۳۷۳

معین الحق ، ڈاکٹر، " آثارالصنادید "، کراچی : پاکستان ھسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۶ء ص ۱۶۸، ۱۷۱، ۱۷۸، ۱۸۸، و ۱۹۳

بشیرالدین احمد دھلوی ، " واقعات دارالحکومت دھلی"، آگرہ : شمسی مشین پریس ،

خلیق احمد نظامی، ... دلی"، محولہ بالا ، ص ۸-۱۰۳

ان مدرسوں نے دلی کو ہندوستان کا مرکز بنادیا تھا اور ملک کے گوشے گوشے سے لوگ یہاں آتے تھے اور فیض یاب ہوتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مدرسے سے علم حدیث کے احیاء کی تحریک اٹھی تھی۔۔۔۔۔ مدرسہ رحیمیہ سے وہ چشمہ فیض جاری ہوا، جس سے ہندوستان کی ہر درس گاہ سیراب ہوئی اور دینی فکر میں توانائی کی وہ جد و جہد کی گئی جس کے اثرات عرصے تک ہندوستان کی زندگی میں کام کرتے رہے۔ شاہ عبدالرحیم اور ان کے عظیم المرتبت بیٹے شاہ ولی اللہ دہلوی نے دلی کا علمی وقار بڑھادیا۔ شاہ ولی اللہ نے ایک نئے انداز فکر کی بنیاد ڈالی ۔ ان کی مشہور کتاب " حجۃ اللہ البالغہ " کو ساری اسلامی دنیا میں عزت کی نظر سے دیکھا گیا اور جدید علم کلام کی بنیاد اس پر رکھی گئی ۔ ان کے تینوں بیٹے شاہ عبدالعزیز ، شاہ عبدالقادر ، شاہ رفیع الدین اپنے اپنے فن کے امام تھے ۔ شاہ ولی اللہ نے فارسی میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا تھا ان کے بیٹے شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے قرآن کے اردو ترجمے کیے ۔ شاہ عبدالعزیز کے داماد شاہ عبدالحئی نے لغات القرآن لکھی، مولانا شاہ محمد اسحاق (شاہ عبدالعزیز کے نواسے) نے مشکوۃ کا ہندی ترجمہ کیا۔ اس طرح علوم دینی کو عوام تک پہنچانے کا سامان کیا گیا۔ اور یہ قدم مذہبی فکر کی تاریخ میں انقلابی اہمیت رکھتا تھا شاہ عبدالعزیز متعدد زبانوں کے عالم تھے ۔ ان کے تبحر علمی کے متعلق ایک معاصر مؤلف مولوی عبدالقادر خان کا بیان ہے :

> " علم تفسیر، حدیث ، فقہ ، سیرت اور تاریخ میں شہرہ آفاق تھے اور ہئیت ، ہندسہ ، مجسطی ، مناظر، اصطرلاب ، جرثقیل ، طبیعات ، الہیات، منطق ، مناظرہ ، اتفاق ، اختلاف ، ملل ، نحل ، قیافہ ، تاویل ، تطبیق ، مختلف اور تفریق مشتبہ میں یکتائے زمانہ تھے ۔ فن ادب اور فہم ارشاد میں بلند مرتبہ

رکھتے تھے ۔" (۱)

ان کا خیال تھا کہ" اللہ کو " پرمیشور" نام سے یاد کرنے میں کوئی ھرج نہیں ھے۔ انھوں نے مغرب کی صنعت پہ کی تعریف کی اور انگریزی سیکھنے کی ترغیب دلائی۔ لیکن ساتھ ھی ساتھ غیر ملکی تسلط کے خلاف ذھن کو تیار کیا ۔

شاہ عبدالعزیز کا دائرہ اثر و نفوذ بہت وسیع تھا۔ ان کے خرمن کمال کے ھزاروں خوشہ چیں تھے جو ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے تھے ۔ ایک عالم نے سارے ھندوستان کی سیاحت کی اور اسے پورے ملک میں علم حدیث کا کوئی بھی ایسا استاد نہ ملا جو شاہ عبدالعزیز کا شاگرد نہ ھو ۔

تحریک آزادی کی چنگاری بھی مدرسہ " رحیمیہ " ھی میں پہلے روشن کی گئی تھی اور انگریزوں کے خلاف جد و جہد کا آغاز یہیں سے ھوا تھا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمعیل شہید کی تحریکوں کی داغ بیل مدرسہ ولی اللہی میں پڑی تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں نے ایسے تمام مرکزوں کو تباہ کرنے کا بیڑا اٹھایا، جہاں آزادی فکر و نظر کے درس دیے جاتے تھے تو انھوں نے ان تمام مدرسوں کو جو خاندان ولی اللہی سے متعلق تھے اور دھلی میں علمی تحریکوں کا مرکز بن گئے تھے، نیست و نابود کردیا۔" (۲)

علمی و تہذیبی تاریخ پر مجموعی نظر

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے دھلی کی علمی، ادبی، تہذیبی و ثقافتی تاریخ پر مجموعی حیثیت سے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ھے :

" دھلی کی ذھنی اور تمدنی تاریخ پر اگر مجموعی حیثیت سے غور کیا

---

(۱) ایوب قادری، محمد (مرتب)، " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)" از مولوی عبدالقادر، کراچی: پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۰ء، ج اول، ص: ۲۳۲

(۲) خلیق احمد نظامی، " اوراق مصور ـــــ عہد وسطی کی دلی"، محولہ بالا، ص: ۷-۱۰۶

جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ سیاسی انحطاط کا دور اس کے تمدن کا عہد زریں تھا۔ جوں جوں سلطنت مغلیہ پر پژمردگی چھاتی گئی اس کا تمدنی رنگ اور نکھرتا گیا۔ دلی کے بیشتر علمی اور تمدنی کارنامے اس کے سیاسی زوال کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر مورخین نے کبھی سیاسی عروج و زوال کے پیمانوں کو چھوڑ کر علمی اور تمدنی ترقیوں کی روشنی میں دلی کا تاریخی جائزہ لیا تو انہیں عروج و زوال کی تقسیم بدل دینی پڑے گی - زبان و ادب، شعر و سخن، علم کلام، تصوف ، جس حیثیت سے دیکھیے ۱۸ ویں صدی کی دلی ایک منارے کی طرح اٹھتی ہوئی نظر آتی ہے - اس زمانے میں گیسوئے اردو سنوارے گئے - مذہبی فکر میں آزادی اور توانائی پیدا کی گئی - شعر و ادب کی مختلف اصناف میں ترقی ہوئی اور فکر و نظر کی وہ راہیں کھل گئیں جن سے عرصے تک روشنی حاصل کی جاتی رہی۔" (۱)

نظامی صاحب نے یہ رائے اٹھارویں صدی کی دلی کے بارے میں دی ہے - لیکن ۱۹ ویں صدی کے نصف اول کی دلی کی تاریخ اور علمی، فکری اور تمدنی تاریخ میں بھی دلی کا ٹھیک ٹھیک یہی مقام ہے - اس لیے کہ اس تذکرے میں جس سلسلے کی شخصیات شامل ہیں اس سلسلے کا آغاز اٹھارویں صدی سے ہوتا ہے اور اس کے بعد مختلف ادوار گزرتا ہوا یہ سلسلہ بیسویں صدی تک چلا آیا ہے - اٹھارویں صدی کی مسلمانوں کی ذہنی و فکری تاریخ پر پروفیسر نظامی نے جو بلیغ تبصرہ کیا ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دہلی کے جن اساطین تصوف ، اصحاب علم و فضل اور اہل فن کا یہ مرقع ہے وہ ہماری جدید ذہنی، فکری، علمی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کے اولین رہنما ہیں اور صاحب مرقع —— یعنی سرسید علیہ الرحمۃ کی حیثیت اس کے نقاش ہی کی نہیں بلکہ وہ خود بھی اسی سلسلۃ الذھب کی ایک کڑی ہیں۔ اس دور کو یاد کرتے ہوئے سرسید نے

---

(۱) خلیق احمد نظامی، "اوراق مصور — عہد وسطی کی دلی"، محولہ بالا، ص ۸-۱۰۷

ایک جگہ لکھا ہے :

" یہ باتیں تو ایسی صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں ۔ کجاوہ صحبتیں اور کجاوہ مجلسیں۔ کہاں وہ آزردہ اور کہاں وہ شیفتہ اور کہاں وہ صہبائی، کہاں وہ علما اور کہاں وہ صلحا ، صرف یاد ہی یاد ہے۔"(۱)

سرسید کا گرد و پیش :

یہ دلی تھی جس کی خاک سے سرسید کی شخصیت کا خمیر تیار ہوا تھا اور دلی کا یہ علمی، تہذیبی اور مذہبی و تعلیمی ماحول تھا جس کے سانچے میں سرسید کی فکر و سیرت کے نقوش ڈھلے تھے لیکن یہ جائزہ مجموعی طور پر زیادہ وسیع دائرے میں لیا گیا ہے ۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اس دائرے کو تنگ کرکے سرسید کے گرد و پیش کے حالات اور خاندان کے مذہبی ماحول پر ایک سرسری نظر ڈال لیں جائے لینی چاہیے ۔ تاکہ سرسید کی شخصیت پر ان کے خاندان اور مذہبی ماحول کے اثرات کا اندازہ ہوسکے ۔خواجہ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں :

" سرسید کا خمیر اس شہر کی خاک سے (تیار) ہوا تھا جو کبھی ہندوستان میں اسلام کا مرکز اور مسلمانوں کا ملجا و ماوی تھا اور جس زمانے میں پیدا ہوئے یہ وہ زمانہ تھا کہ دھلی کے مسلمانوں کے پاس کوئی چیز جس پر وہ فخر کرسکیں دین اسلام کے سوا باقی نہ رہی تھی اور اس لیے وہاں کے شریف مسلمان خاندان مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً سرسید کا خاندان اس بات میں کسی قدر امتیاز رکھتا تھا۔ اس کو ایسے تین مقدس گھرانوں سے قوی تعلق تھا جو نہ صرف دلی میں بلکہ ہندوستان کے دور دراز حصوں میں مذہبی معتقد اور پیشوا سمجھے جاتے تھے ۔ ان کے باپ کی ننھیال خواجہ میر درد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی ۔ خود سرسید کی ننھیال کے تمام زن و مرد شاہ عبدالعزیز کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور

---

(۱) اسماعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید "، لاہور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء ، حصہ پنجم ، ص ۲۲۸

ان کے باپ سید متقی شاہ غلام علی صاحب کے نہایت مقرب اور مخصوص ارادت مندوں میں سے تھے ۔ شاہ صاحب ان کو اپنا فرزند اور ان کی اولاد کو اپنے پوتا پوتی سمجھتے تھے ۔ سرسید کی والدہ جن کی آغوش تربیت میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی نہایت دین دار اور شاہ غلام علی صاحب کی مرید تھیں اور ان کے خاندان کے چھوٹے بڑے عموماً فرائض مذہبی کے پابند تھے پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے دائیں بائیں مذہب ہی کا جلوہ دیکھا تھا اور چوں کہ ان کے خاندان کو ایسے گھرانوں سے جو جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے ارادت مندانہ تعلق تھا ۔ اور ان کے گھر میں ہر ایک کام ان بزرگوں کی ہدایت اور ارشاد کے موافق ہوتا تھا ۔ اس لیے ان کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور بے ہودہ اوہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں۔ گویا سرسید کو ہوش سنبھالتے ہی اسلام کا وہ نقشہ نظر پڑا تھا جو عامیانہ خیالات اور جاہلانہ رسوم اور بدعات کے میل کچیل سے بالکل صاف تھا ۔ پھر حسن اتفاق سے چند ایسے اسباب جمع ہوگئے کہ ان کو مولانا اسمعیل شہید کی تصنیفات سے جن میں آزادی کی روح موجود تھی ، زیادہ دل چسپی ہوگئی اور اس طرح وہ تقلید کی بندشوں سے رفتہ رفتہ آزاد ہوتے گئے ۔ مگر غدر کے زمانے تک ان کے مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔" (۱)

===XXX===

خاندان

(الف) سرسید کا ددھیال :

یہی زمانہ تھا کہ قدرت نے مسلمانوں کی سلطنت و بادشاہت کے خاتمے پر عہد انقلاب و تغیر میں رہنمائی کے لیے ایک شخصیت کو کتمان عدم سے عالم وجود میں بھیجا

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین ، " مقالات حالی"، کراچی : انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۷ء ، ص، ۲۰۸-۱۰

دور جدید کی اس رہنما شخصیت کا نام احمد تھا۔ لیکن دنیا نے اسے سرسید احمد خاں یا صرف سرسید کے عرف سے جانا۔ سرسید ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ۔ وہ اپنے والد کی طرف سے حسینی سید تھے ۔ ان کا سلسلہ نسب ۳۶ واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے ۔ چوں کہ ان کے سلسلہ نسب میں سب سے اخیر امام حضرت امام محمد تقی ابن امام موسی رضا ہیں اس لیے سرسید اپنے آپ کو تقی سید لکھتے تھے ۔

بنوامیہ اور بنو عباس کے زمانے میں بنو فاطمہ کے لیے عرب و عراق کی زمین تنگ ہوگئی تو بہت سے سادات خاندانوں نے وطن مالوف کو چھوڑ کر ایران کا رخ کیا۔ سرسید کے اجداد بھی اسی زمانے میں وطن مالوف سے نکلے ، پہلے ایران کے شہر دامغان میں پہنچے اور آخرکار ہرات میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی۔ برصغیر ہند و پاکستان میں ان کے بزرگ شاہجہاں کے عہد میں آئے ۔ سرسید سے پانچ پشت اوپر ایک بزرگ سید محمد دوست تھے جو اورنگ زیب عالم گیر کے ساتھ دکن کی مہم میں ایک مورچے پر متعین تھے۔ انھوں نے اس مورچے کو کسی دوسرے آفیسر کی مدد کے بغیر فتح کرلیا تو اورنگ زیب نے انھیں یکہ بہادر کا خطاب دیا تھا اس کے بعد سید محمد دوست اپنے وطن ہرات چلے گئے ۔ پھر وہ تو ہندوستان نہیں آئے مگر ان کے بیٹے سید برہان نے وہاں سے آکر دلّی میں سکونت اختیار کی ۔ سید برہان کے بیٹے سید عماد تھے اور ان کے سید محمد ہادی اور محمد مہدی دو بیٹے تھے ۔ سید ہادی کے بیٹے سید محمد تقی تھے جو سرسید کے والد تھے ۔ (۱)

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، کان پور: نامی پریس ، ۱۹۰۱ء (ملخصاً) ، ح اول، ص ۱۶-۱۵

سرسید کے والد :

سید محمد متقی کو عالم گیر ثانی اور شاہ عالم کے زمانے میں دربار میں رسوخ حاصل تھا ۔ عالم گیر ثانی نے ۱۱۶۸ھ میں انھیں جواد علی خان کے خطاب سے اور ہزاری ذات و پانصد سوار دو اسپہ و سہ اسپہ کے منصب سے اور شاہ عالم نے جوادالدولہ کے خطاب سے نوازا تھا۔ پہلے انھیں عہدہ احتساب و کروڑ صوبہ شاہجہان آباد اور ۱۱۸۸ھ میں عہدہ قضائے لشکر عنایت ہوا تھا۔ ۱۸ شعبان ، ۱۱۸۸ھ کو دہلی میں انتقال ہوا۔ فارسی کے شاعر تھے اور ان کا قلمی دیوان سرسید کے پاس موجود تھا جو ۱۸۵۷ء میں ضائع ہوگیا۔

سرسید کے والد سید متقی ایک آزاد طبیعت آدمی تھے ۔ شاہ عالم اور ان کے بعد اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں دربار عام اور خاص میں جو درجہ ان کے والد سید ہادی کا تھا وہی ان کا تھا لیکن جب انھیں خطاب اور منصب دیا جانا تجویز ہوا تو انھوں نے اس کو قبول کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے بیٹے سرسید کو دلوادیا۔ ان کی ننھیال خواجہ میر درد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی ۔(۱)

اس زمانے میں شرفائے دہلی تیراکی اور تیراندازی کو ایک جوہر شرافت جانتے تھے ۔ میر متقی کو ان دونوں فنون میں کمال حاصل تھا ۔ اکثر مرشد زادے اور شریف زادے ان دونوں فنون میں ان کے شاگرد تھے ۔ خود سرسید نے بھی تیراکی اور تیر اندازی ان سے سیکھی تھی ۔ (۲)

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا ، ج اول ، ص ۱۷-۱۶

(۲) ایضاً ، ج اول ، ص ۱۸

گرمی اور برسات کے موسم میں دلی کے اکثر باشندے سہ پہر کو جمنا پر جاکر پانی کی سیر دیکھتے تھے اور تیرنے والے تیرتے تھے ۔ مگر سرسید کے بچپن میں وہاں اشراف تیرنے والوں کے بہت دل چسپ جلسے ہوتے تھے ۔ حالی نے سرسید کی روایت نقل کی ہے ۔ سرسید کہتے تھے :

" میں اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا ۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا جس میں مرزا مغل اور مرزا طغل بہت سربرآوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سواسو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی باٹین تک یہ سارا گروہ ہوتا تھا ۔ پھر جب تک ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے ۔ اس زمانے میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے ۔ زینت المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینت المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔" (۱)

تیر اندازی کی صحبتیں بھی سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں ۔ وہ کہتے تھے :

" مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیراندازی ہوتی تھی یاد نہیں ~~مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا~~ مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا ہوا، وہ بخوبی یاد ہے ۔ اس زمانے میں دریا کا جانا موقوف ہوگیا تھا ۔ ظہر کی نماز کے بعد تیراندازی شروع ہوتی

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، محولہ بالا، ج اول، ص ۳۸-۳۷

تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں، نواب سید عظمت اللہ خاں، نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پور جھرکہ جب دلی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اسی زمانے میں تیراندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہوگئی تھی ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جاکر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا "مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے" یہ جلسہ برسوں تک رہا پھر موقوف ہوگیا۔" (۱)

میر متقی کے والد سید ہادی اور خواجہ فرید الدین سے بہت رسم و راہ تھی۔ میر متقی بھی والد کے انتقال کے بعد خواجہ فرید سے نہایت ادب کے ساتھ ملتے تھے۔ انھوں نے اپنی بیٹی عزیز النساء بیگم کی شادی میر متقی سے کردی تھی۔ (۲)

میر متقی نہایت وضع دار اور راست باز آدمی تھے ۔ وہ ایک آزاد منش آدمی تھے ۔ وہ اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے ۔ جس کا اثر سرسید اور ان کی اولاد میں اب تک موجود تھا ۔ ان کو حضرت شاہ غلام علی سے جن کی خانقاہ دلی میں مشہور ہے بیعت تھی اور شاہ صاحب ان پر پدرانہ شفقت رکھتے تھے۔ (۳) جب شاہ غلام علی صاحب کے مرید ہوگئے تھے، ان کی طبیعت میں اور بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہوگئی تھی اولاد کی تعلیم و تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا۔ (۴) سرسید کہتے تھے :

" شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۳۸
(۲) ایضاً، ج ۱، ص ۱۹
(۳) ایضاً، ج ۱، صص ۱۹-۱۸
(۴) ایضاً، ج ۱، ص ۲۶

جاتے تھے ۔ الا ماشاء اللہ صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے ۔" (۱)

سرسید نے شاہ صاحب سے اپنے والد کی عقیدت اور شاہ صاحب کی شفقت کا ایک واقعہ بیان کیا ہے ۔ چوں کہ سرسید کی تربیت میں روایات اور ماحول کا خاص حصہ تھا اور اپنی زندگی کے دوسرے دور میں جب کہ ان کے دینی معتقدات کی تمام بنیادیں ہل گئی تھیں اور انھوں نے فلاسفہ اور معتزلہ سے متاثر ہوکر جدید علمی و سائنسی نظریوں کے مطابق ایک نیا نظام فکر مرتب کرلیا تھا اس وقت بھی وہ ابتدائی ماحول اور تربیت کے اثرات سے نہ نکل سکے تھے ۔ اس لیے اس واقعہ کا بیان برمحل اور موقع کے عین مطابق ہے ۔ حالی کی روایت کے مطابق سرسید کہتے تھے :

"مرزا صاحب کے عرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ ان کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اس روپیہ کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو ۔ میرے والد کو بھی خبر ہوگئی ۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت! میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ اوروں کو لینے کی اجازت دیتے ہیں ؟ شاہ صاحب نے فرمایا! نہیں نہیں ، تمہارے سوا کوئی نہیں لے سکتا ۔ میں اس وقت صغیر سن تھا ۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا والد نے مجھ سے کہا جاؤ! روپیہ اٹھالو۔ میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھالیا۔" (۲)

شاہ صاحب کو خاص عنایت میر متقی کے حال پر تھی اس کا ایک اور بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب شاہ صاحب نے شدت مرض میں مرزا صاحب کی قبر کے پاس اپنی قبر کھودنے کا حکم دیا تو میر متقی نے عرض کیا کہ میری آرزو یہ ہے کہ ٹھیک آپ کی پائنتی میں قبرہو۔

---

(۱) حالی،خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۳۱

(۲) ایضاً ، ج ۱ ، ص ۳۹

چناں چہ ان کے لیے کلکتے بھی سرد ابہ تیار ہوا اور بعد انتقال کے جو کہ ۱۵ رجب، ۱۲۵۳ھ مطابق ۵ اکتوبر، ۱۸۳۸ء میں واقع ہوا اسی سرد ابہ میں شاہ صاحب کی پائنتی مدفون ہوئے -(۱)

شاہ غلام علی کی خانقاہ کا نظام تعلیم و تربیت خانوادہ ولی اللہی کے مدرسے اور نظام تعلیم و تربیت سے بالکل الگ اور ایک مستقل نظام تھا لیکن چوں کہ شاہ غلام علی اور ان کے خلفائے نظام و سجادہ نشیں شاہ ابو سعید ، شاہ احمد سعید اور شاہ عبدالغنی ، شاہ عبدالعزیز اور ان کے اخوان کے فیض تعلیم و تربیت سے آراستہ تھے اس لیے خانقاہ کا ماحول بھی اپنے خصائص و امتیازات کے باوجود انھیں فیوض تعلیمی سے معمور اور قال اللہ اور قال الرسول کے برکت نشیں سے گونجتا تھا جو مدرسہ عزیزیہ کے در و دیوار میں رچے بسے ہوئے تھے ۔ اگرچہ اہل خانقاہ کے خانوادہ ولی اللہی سے روابط پر ہم ان حضرات کے تراجم کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے لیکن اتنا بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاہ غلام علی اصحاب ثلاثہ کے تربیت یافتہ تھے، ان کے خلیفہ شاہ ابوسعید نے بھی شاہ عبدالعزیز سے حدیث کی سند حاصل کی تھی اور ایک روایت کے مطابق شاہ اسحاق سے بھی استفادہ کیا تھا۔ شاہ ابوسعید کے بیٹے اور جانشیں شاہ احمد سعید کو بھی اصحاب ثلاثہ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ شاہ احمد سعید کے بھائی شاہ عبدالغنی نے اصحاب ثلاثہ کے شاگردوں سے تحصیل علوم و فنون کی تھی۔ ان کے ~~خلفشہ~~ اساتذہ میں ان کے اپنے والد شاہ ابوسعید ، شاہ رفیع الدین کے صاحب زادے شاہ مخصوص اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے نواسے شاہ محمد اسحاق شامل ہیں۔

اس طرح میر منتی اپنے مرشد شاہ غلام علی اور اکابر " خانقاہ" کے واسطے سے خانوادہ ولی اللہی کے فیض یافتگان میں شمار ہوتے ہیں۔

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۱۸

سرسید کی والدہ :

سرسید کی والدہ عزیز النسا بیگم خواجہ فرید الدین احمد کی تین بیٹیوں میں سے سب سے بڑی تھیں۔ اور نہ صرف اس وجہ سے کہ ماں کی شخصیت ہر انسان کی پہلی معلم اور اس کی آغوش انسان کی تعلیم و تربیت کا پہلا گہوارہ ہوتی ہے ، وہ واقعی سرسید کی استاد بھی تھیں سرسید کو انھوں نے فارسی کے کچھ سبق پڑھائے بھی تھے اور ان کی تعلیم کی باقاعدہ نگراں تھیں۔ سرسید لکھتے ہیں :

" عزیز النسا بیگم نہایت لائق ، ذہین ، قدرتی نہایت عالی دماغ تھیں۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور کسی زمانے میں فارسی کی بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ میں نے خود گلستان کے چند سبق ان سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ جب میں ان کو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتی تھیں ۔ اگرچہ وہ خفا تو کئی دفعہ ہوئی ہوں گی ۔ مگر ان سوت کی لڑوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی ۔ ان کی تعلیم اور ان کی نصیحتیں نہایت ہی حکیمانہ اور دل پر اثر کرنے والی تھیں۔"(۱)

ان کی مذہبی فکر اور عمل کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں :

" کبھی کوئی منت و نذر و نیاز کسی امر کے لیے انھوں نے نہیں مانی۔ گنڈے تعویز پر اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر ان کو مطلق اعتقاد نہ تھا لیکن اگر کوئی کرتا تو اس کو منع نہ کرتیں اور کہتیں کہ اگر ان لوگوں کو اس سے منع کیا جائے اور نہ کرنے دیا جاوے اور اتفاق سے وہ امر پیش آجاوے

---

(۱) محمود احمد برکاتی ، حکیم (مرتبہ) ، " سیرت فریدیہ " از سرسید احمد خاں ، کراچی : پاک اکیڈمی ، ۱۹۶۴ء ، ص: ۳۵-۱۳۴
حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص: ۲۷-۳۶

جس کے خون سے گنڈا تعویز کرتے ہیں یا سعادت و نحوست دیکھتے ہیں تو ان کے ایمان میں زیادہ خلل آجاتا ہے ۔ اور وہ یقین کریں کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا اور اگر ایسا کیا جاتا تو یہ نہ ہوتا ۔ ان کا قول تھا کہ " ہر بات کے لیے صرف خدا سے دعا کی جائے پھر وہ جو چاہے گا کرے گا ۔ وہ کہتی تھیں کہ مصیبتیں جو انسان پر پڑتی ہیں اس میں بھی خدا کی حکمت ہوتی ہے مگر بندے اس حکمت کو نہیں سمجھتے ۔" (۱)

سرسید نے اپنی والدہ کی مذہبی زندگی اور افکار کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اس سے ان کے ابتدائی ماحول کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

" میری ننھیال کو شاہ عبدالعزیز سے اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت تھی۔ مگر میری والدہ کو حضرت شاہ غلام علی سے بہت و عقیدت تھی اور شاہ صاحب کے ہاں اس قسم کی باتوں کا پتا بھی نہ تھا۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی ان کے پاس کوئی حاجت لے جاتا تو وہ اسی وقت ہاتھ اٹھاتے اور سب حاضرین سے کہتے کہ دعا کرو کہ خدا اس کی آرزو پوری کرے ۔" یہی عقیدہ میری والدہ کو بھی مستحکم تھا۔

میری ننھیال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے اور شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک گنڈہ دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویز ہوتا تھا اور اس تعویز میں ایک حرف یا عدد سفید مرغ کو ذبح کرکے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کا اس کو امتناع ہوتا تھا۔"

سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کی ننھیال والوں

---

(۱) محمود احمد برکاتی (مرتبہ) ، " سیرت فریدیہ "، محولہ بالا ، ص ۳۰-۱۳۹
حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید "، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۳۹

نے وہ کھانا پہنچایا۔ مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس کھانے کے سبب سے لڑکا یا مرغی نہ کھاتا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھاویں گے تو کوئی آفت آوے گی خدا پر ایمان رکھنے کے برخلاف ہے ۔ وہ ان دونوں لڑکوں کو جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی جس میں لڑکا پڑا ہوا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلادیتیں۔"(۱)

اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

" اس زمانے میں کہ میرے خیالات مذہبی ، محققانہ اصول پر ہیں ۔ اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہوسکے ، نہیں پاتا بجز ایک عقیدے کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادت بدنی یعنی قرآن مجید پڑھنے کو بخشنے کا یا فاتحہ دےکر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے ۔ میں ان دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔" (۲)

سرسید نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں ان کے بڑے بھائی سید محمد کا انتقال ہوا اسی زمانے میں رشتہ داروں میں ایک لڑکی کی شادی تھی لیکن سید محمد کے انتقال کی وجہ سے خاندان میں یہ سوچا جارہا تھا کہ شادی کو کچھ دنوں کے لیے ملتوی کردیا جائے ۔ سرسید کی والدہ کو معلوم ہوا تو وہ خود لڑکی کے گھر گئیں اور کہا کہ تین دن سے زیادہ ماتم رکھنے کا حکم نہیں ہے ۔ شادی ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہوگا اور جو امر کہ مشکلک خدا کو منظور تھا وہ ہوچکا۔ تم ہرگز شادی کو ملتوی مت کرو۔"(۳)

زمانہ غدر میں سرسید میرٹھ میں تھے اور ان کی والدہ اور خالہ دہلی میں تھیں اور اس خیال سے انگریز انھیں کچھ نہ کہیں گے گھر کو نہ چھوڑا لیکن ان کی یہ خوش فہمی

---

(۱) محمود احمد برکاتی (مرتب) ، " سیرت فریدیہ "، محولہ بالا ، ص ۳۱-۱۳۰

(۲) ایضاً ، ص ۱۳۲

حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید "، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲۹

(۳) ایضاً ، حصہ اول ، ص ۲۸

جلد ہی دور ہوگئی - بلا شبہ وہ قتل ہونے سے بچ گئیں لیکن بھرا پرا گھر لوٹ لیا گیا۔ سرسید دہلی پہنچے ہیں تو تین دن کے فاقے سے تھیں اور دو روز قبل پانی بھی ختم ہوچکا تھا - یہ تکلیف اور صدمہ معمولی نہ تھا بلکہ اتنا بڑا صدمہ تھا کہ بقول سرسید ان کی طبیعت جادہ اعتدال سے منحرف ہوگئی تھی۔ سرسید لکھتے ہیں :

" اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جادہ اعتدال سے منحرف ہوگئی اور صفرا کی نہایت شدت ہوگئی جو دوا یا غذا دی جاتی تھی، وہ قے ہوجاتی تھی۔ کبھی اس مرض میں کچھ تخفیف ہوجاتی۔ آخرکار اسی مرض میں یکم ربیع الثانی ، ١٢٧٣ھ مطابق ١٨٥٧ع (١٩ نومبر) کے انھوں نے بمقام میرٹھ انتقال کیا . . . . انھوں نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں مجھ کو کیں۔ ایک یہ کہ ان کو بغلی قبر میں جو مسنون ہے دفن کیا جائے۔ دوسری یہ بات کہی کہ ان کے ذمے نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے اور نہ کوئی نماز قضا کی ہے۔ صرف انہی دنوں کی نمازیں اگرچہ میں نے پڑھی ہیں لیکن اگر میں زندہ رہتی تو ان کو بھی قضا پڑھتی - میرے مرنے کے بعد تم اسی قدر دنوں کی نمازوں کا حساب کر کر کفارہ کے گیہوں غریبوں کو دے دینا ، جب کہ دوسرے دن انھوں نے قضا کی تو میں نے ان کی دونوں وصیتوں کو پورا کیا۔" (١)

سرسید کا یہ بیان گزرچکا ہے کہ " میری ننھیال کو شاہ عبدالعزیز سے اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی سے بیعت و عقیدت تھی۔" (٢)

ہم سرسید کی والدہ کی شاہ غلام علی سے بیعت و عقیدت کے واقعہ کو سرسید کی ننھیال کی تعلیم و ماحول کے خلاف ایک مستثنیٰ مثال کے طور پر پیش نہیں کرسکتے۔ بلکہ ہم اس واقعہ کو ان کے شوہر کی صحبت و اثر کا نتیجہ قرار ~~دیتے ہیں~~ چوں کہ

----

(١) محمود احمد برکاتی (مرتب) ، " سیرت فریدیہ" محولہ بالا ، ص ٣٨-١٣٧

(٢) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید" ، محولہ بالا ، ج ١ ، ص ٢٩

سرسید کے والد کو شاہ غلام علی سے کمال درجہ عقیدت تھی اور شاہ صاحب ان کے حال پر پدرانہ شفقت فرماتے تھے اس لیے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ شوہر کے فیصلے اور اس کی عقیدت و بیعت سے متاثر ہوکر بیویاں بھی اپنی عقیدت و ارادت کے رشتے ایک ہی بزرگ شخصیت سے استوار کرلیتی ہیں ٹھیک اسی روایت کو سرسید کے خاندان میں دہرایا گیا ۔ اس سے سرسید کی والدہ پر ان کے میکے کے اثرات کی نفی نہیں ہوتی۔ بالغرض سرسید کی والدہ کی شاہ غلام علی سے بیعت و عقیدت کے واقعے کو ان کے میکے کی تعلیم اور ماحول کے اثرات کے برعکس ایک مستثنی مثال تسلیم کرلیا جائے تو بھی اس سے [illegible] انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شاہ غلام علی [illegible] خانوادہ ولی اللہی کے تلامذہ اجل میں سے تھے ۔ شاہ غلام علی اصحاب ثلاثہ کے فیض و تربیت یافتہ تھے۔ (۱) انھوں نے حدیث کی سند شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں سے لی تھی (۲) شاہ غلام علی شاہ عبدالعزیز کے صاحب علم و فضل اور نامور تلامذہ میں سے تھے ۔ (۳) اس لیے سرسید کی والدہ اور سرسید کی ددھیال کو خانقاہ (غلام علی) سے جو فیض حاصل ہوا وہ مدرسہ (عبدالعزیز) کے فیضان علمی و تعلیمی سے [illegible] خالی نہ تھا ۔ اس لیے یہ کہنا بیجا ہوگا کہ شاہ عبدالعزیز سے ان کے اکتساب فیض کا سلسلہ براہ راست ذریعہ کی بجائے دوسرے ذریعے سے ہونے لگا سرچشمہ فیض وہی خانوادہ ولی اللہی تھا۔

---

(۱) محمد میاں، مولانا، "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، دہلی: مکتبہ برہان، ۱۹۵۷ء جلد دوم، ص ۵۰

(۲) عبدالرزاق قریشی، "مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام"، بمبئی: ادبی پبلی شرز، ۱۹۶۱ء، ص ۱۰۷
اشرف علی تھانوی، مولانا، "ارواح ثلاثہ"، لاہور: اسلامی اکادمی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۶۷

(۳) اکرام، شیخ محمد، "رود کوثر"، کراچی: تاج آفس، س ن، ص ۳۹۰

سرسید کے بھائی :

سرسید کے بھائی سید محمد بھی شاہ غلام علی سے بیعت تھے اور ان کے انتقال کے بعد شاہ احمد سعید کے ہاتھ پر اپنے انتقال سے قبل تجدید بیعت کی تھی۔ ان کا نام " محمد" بھی شاہ صاحب ہی کا رکھا ہوا ہے ۔ اور جس طرح کہ ان کے والد خانقاہ کے واسطے سے شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے سلسلہ تعلیم و تربیت سے منسلک تھے۔ اسی طرح ٹھیک اسی واسطے سے سید محمد بھی خانوادہ ولی اللہی سے رشتہ انسلاک رکھتے تھے۔

سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے صرف معمولی تعلیم پائی تھی ۔ مگر بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ ان کو بھی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھی۔ مرض الموت میں ایک دن شاہ صاحب احمد سعید صاحب کو جو اس وقت خانقاہ میں سجادہ نشین تھے بلایا اور ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور تیسرے دن انتقال کیا۔ ۱۸۳۵ء میں ان کا انتقال ہوا جب کہ وہ حکام ضلع فتح پور سے جہاں وہ منصف تھے دسہرہ کی تعطیل میں دہلی آئے ہوئے تھے ۔ (۱)

سرسید یا حالی نے سید محمد کی وفات کا مہینہ نہیں لکھا لیکن چونکہ یہ معلوم ہے کہ وہ دسہرے کی تعطیلات میں دلی آئے ہوئے تھے اور سرسید دسہرے کی تعطیلات گزار کر اپنی ملازمت پر واپس چلے گئے تھے اس کے بعد سید محمد کے انتقال کا حادثہ پیش آیا تھا۔ اور اس حادثے کے بعد سرسید فتح پور سے تبادلہ کراکے ۱۸ فروری ۱۸۳۶ء کو دلی آگئے تھے ۔ دسہرے کا تہوار چونکہ اکتوبر میں منایا جاتا ہے ، اس لیے

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید" ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۳۲

همارا خیال هے کہ یہ حادثہ اکتوبر کے بعد نومبر یا دسمبر کے مہینے میں پیش آیا هوگا۔

سید محمد چھوٹے بھائی سرسید سے عمر میں چند سال بڑے تھے گویا کہ ۱۸۱۱ع تک میں پیدا هوئے تھے اور چونتیس سال کی عمر میں عین جوانی میں ان کا انتقال هوا۔(۱)

سید محمد نہ صرف اپنے ننھیالی اور ددھیالی رشتوں سے خانوادہ ولی اللهی کے فیض یافتہ تھے بلکہ وہ خود شاہ غلام علی سے بیعت تھے اور ان کے انتقال کے بعد خانقاہ کے سجادہ نشین شاہ احمد سعید کے هاتھ پر تجدید بیعت کی تھی۔ یہ بحث ان کے والد میر متقی کے ذکر میں گزرچکی هے اور تفصیلی بحث مذکورة الصدر دونوں بزرگوں کے تراجم کے ذیل میں آئے گی کہ انھوں نے خانوادہ ولی اللهی کے کن بزرگوں سے علوم و فنون کی تحصیل کی تھی اور ان کا شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے کیا رشتہ تھا۔

جو نسبتیں سرسید کے والد اور بھائی کو خانقاہ کے بزرگوں سے حاصل تھیں سرسید کو بھی وہ تمام نسبتیں حاصل تھیں اگرچہ رسمی طور پر وہ کسی سے بیعت نہ تھے ۔ لیکن عقیدت و ارادت میں وہ اپنے باپ ، ماں اور بھائی سے پیچھے نہ تھے۔ آخر میں سرسید کے خیالات میں بڑا انقلاب آگیا تھا اور سلوک و تصوف اور بیعت کی رسمی باتوں پر وہ یقین نہ رکھتے تھے لیکن شاہ صاحب کا ذکر جمیل انقلاب فکر و حال کے بعد بھی ان کو وارفتہ و بے خود بنادیتا تھا۔ ان بزرگوں سے تعلق و نسبت سرسید کے لیے آخر تک ایک سرمایہ فخر رہا۔ شاہ غلام علیؒ اور خانقاہ کے دیگر بزرگوں سے سرسید کی عقیدت و تعلق پر هم ان بزرگوں کے تراجم کے ذیل میں بحث کی جائے گی ۔ یہاں ان ارشادات

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۳۳

پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ لیکن شاہ صاحب کو ان کے حال پر جو شفقت تھی اس کا اندازہ کرنے کے لیے حالی کی یہ روایت کافی ہے ۔ حالی لکھتے ہیں :

" سرسید پیدا ہوئے تو ان کے والد نے شاہ غلام علی صاحب سے نام رکھنے کی درخواست کی ۔ شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمد رکھا تھا ۔ ان کا نام احمد رکھا۔ سرسید کے دادا ان کے والد کی شادی ہونے سے پہلے قضا کرچکے تھے ۔ اور یہ اور ان کے بہن بھائی شاہ صاحب ہی کو دادا حضرت کہا کرتے تھے ۔ سرسید کہتے تھے کہ " شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی ہی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا۔ اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالی نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن متی کی اولاد کی محبت ایسی دے دی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بیچین کردیتی ہے ۔" (۱)

جب کہ پچھلے صفحات میں بحث کی جاچکی ہے کہ سرسید کے والد اور بھائی کو خانقاہ کے بزرگوں کے توسط سے شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے نسبت تھی اور ان کی والدہ کو نہ صرف اپنی سسرال بلکہ میکے کے ذریعے سے بھی اس خانوادہ سے نسبت تھی سرسید ان نسبتوں میں اپنے خاندان کے عز و شرف میں شریک تھے لیکن انھیں اپنے متعدد اساتذہ کے ذریعے سے بھی نسبت حاصل تھی یہ سرسید کا اپنے خاندان کے دوسرے افراد میں ایک امتیاز تھا جس پر سرسید کو فخر کرنا چاہیے تھا۔ ہم سرسید کے اس امتیاز کو ان کے اساتذہ کے ضمن میں نمایاں کیا جائے گا ۔

سرسید کی ننھیال اور ددھیال مدرسہ و خانقاہ کے زیر اثر تھیں اور اس کے اثرات سرسید کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما رہے تھے ۔ مولانا حالی نے ان اثرات کا ان

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۳۵-۳۳

الفاظ میں جائزہ لیا ہے :

" اسلام کی حقیقت کا یقین اور بانی اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی۔ دارالخلافہ کا اخیر دور تھا اور مسلمانوں کو آخرت کی امیدوں کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہ رہی تھی۔ اس لیے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے - خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا۔ شاہ غلام علی کی خانقاہ جو اس زمانے میں دیندار مسلمانوں کا ملجا و ماوی تھی اس کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق تھا۔ ان کے والدین خانقاہ کے مشائخ سے کمال ارادت و عقیدت رکھتے تھے اور اس لیے سرسید بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ خانقاہ میں جانے لگے تھے اور ایک مدت دراز تک انھوں نے وہاں کا رنگ محبت اپنی آنکھ سے دیکھا تھا ان کی والدہ کے سوا ان کے تمام ننھیال والے جہاں انھوں نے نشو و نما پائی تھی، شاہ عبدالعزیز کے خاندان کے معتقد تھے - پس سرسید نے آنکھ کھولتے ہی اپنے سارے گھر میں مذہب ہی کا دور دورہ دیکھا تھا۔ گویا مذہب کی آغوش میں انھوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔" (۱)

آگے چل کر حالی لکھتے ہیں :

" چوں کہ سرسید کا تمام خاندان دو ایسے خانوادوں سے عقیدت رکھتا

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید" محولہ بالا، ج ۲، ص ۹

تھا جو نہ صرف دلی بلکہ تمام ہندوستان میں کے مسلمانوں میں ایک جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے - اس لیے ان کا گھر بہت سی جاہلانہ رسموں اور بیہودہ اوہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں-" (۱)

(ب) **سرسید کا ننھیال :**

سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد جو خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں ہیں - اول ان کے دادا خواجہ عبدالعزیز بعنوان تجارت دلی میں آئے تھے .... اور انھوں نے یہیں سکونت اختیار کرلی تھی- ان کے بیٹے خواجہ اشرف تھے جن کے آٹھ بیٹے تھے - ازاں جملہ دو شخصوں نے بہت امتیاز حاصل کیا تھا- اول خواجہ نجیب الدین جو دلی میں شاہ فدا حسین کے نام سے مشہور ہیں .... دوسرے سرسید کے نانا دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ جو اپنے خاندان میں سب سے زیادہ با اقبال، متعلم، لائق، دانش مند، صاحب علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے - انھوں نے لکھنو جاکر علامہ تفضل حسین خاں سے جب کہ آصف الدولہ زندہ تھے ریاضی کی تحصیل اور تکمیل کی تھی - خواجہ فریدالدین کی تحصیل علمی کے بارے میں تفصیل نہیں ملتی - سرسید نے لکھا ہے کہ " دلی میں انھوں نے درسی کتابوں کو تمام کیا- دلی میں کوئی شخص علم ریاضیہ میں زیادہ مشہور نہ تھا "(۲) خواجہ فریدالدین نے " فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" کے دیباچے میں لکھا

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۱۰ (مرتب)

(۲) محمود احمد برکاتی، ' سیرت فریدیہ " محولہ بالا ، ص ۸۰

ہے کہ مجھے لڑکپن سے علم ریاضی کا شوق تھا اور طلب علم کے زمانے میں اس علم کو کسی قدر حاصل کیا تھا اور اکثر ریاضی کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ کسی کتاب کے حاشیے میں نظر سے گزارا تھا کہ آلات ریاضی میں سے ایک پرکار متناسبہ بھی ہے کہ اس سے اکثر اعمال نجومی اور بعض اشکال ھندسی اور مسائل حسابی مستخرج ہوسکتے ہیں - مگر آج کل اس آلے کی ناپابی کی وجہ سے اس کا علم و عمل مفقود ہوگیا ہے۔ اور یہ بات اپنے بعض استادوں کی زبانی بھی سن چکا تھا - اس لیے اس آلے کو دیکھنے کا شوق تھا۔ (۱)

خواجہ فرید ریاضی میں مجسطی اور رسائل متوسطات جو اکر کے نام سے مشہور ہیں نہایت تحقیق سے پڑھاتے تھے اور زیچ اور آلات رصد کے علم میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے - وہ خود آلات رصد کے بنانے اور رصد کرنے پر قادر تھے - (۲)

بہت سے لوگوں نے ان سے ریاضی کی تحصیل کی اور اسی میں کمال بہم پہنچایا اور نامور ہوئے۔ ازاں جملہ مولوی کرامت علی ، مولوی رجب علی خاں، خواجہ محمد ناصر خاں اور حکیم ککک رستم علی خاں ان کے مشہور شاگردوں میں سے تھے - خود ان کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں جو فنون ریاضی میں یدطولی رکھتے تھے انھیں کے شاگرد تھے۔ (۳)

خواجہ فرید کے تصنیف کیے ہوئے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے علم ھیئات اور آلات رصد کے باب میں تھے۔ جو ایام غدر میں ضائع ہوگئے - مگر ان میں سے تین رسالے خود

---

(۱) محمود احمد برکاتی (مرتب) ، " سیرت فریدیہ "، محولہ بالا ، ص ۸۰، ۸۴

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید "، محولہ بالا، ج ۱، ص ۳۲ (حاشیہ)

(۳) ایضاً، ج ۱، ص ۲۱-۲۰

انھیں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیراعظم ریاست پٹیالہ کی عنایت سے دستیاب ہوئے ہیں جن کو مدرسۃ العلوم کے کتب خانے میں داخل کردیا ہے۔ انھیں میں سے ایک رسالہ "فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" ہے -(۱)

خواجہ فرید الدین نے ۱۲ محرم، ۱۲۴۴ھ/۲۷ جولائی، ۱۸۲۸ء کو دہلی میں انتقال کیا - اور بیرون ترکمان دروازہ چوسٹھ کھمبا میں شاہ خضر حسین کے تکیے میں دفن کیے گئے - قبر پر ایک نفیس و خوب صورت عمارت تھی - ان کے مزار پر سالہاسال تک بسنت چڑھتی تھی اور ایسا عمدہ و نفیس میلہ بہ سبب قرب شہر کے ہوتا تھا کہ تمام درگاہوں میں جو بسنتیں ہوتی تھیں وہ سب مات ہوگئی تھیں۔ (۲)

سرسید احمد خاں نے خانوادۂ ولی اللہی سے اپنی ننھیال کے قلبی رشتے کا اعتراف خود کیا ہے - لکھتے ہیں :

"میری ننھیال کو شاہ عبدالعزیز سے اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت تھی - مگر میری والدہ کو حضرت شاہ غلام علی سے بیعت و عقیدت تھی -" (۳)

اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

"میری ننھیال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے اور شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔" (۳)

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲۲

(۲) محمود احمد برکاتی (مرتب)، "سیرت فریدیہ"، محولہ بالا، ص ۱۱۹
حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲۳

(۳) ایضاً، ج ۱، ص ۲۹

(۳) ایضاً، ج ۱، ص ۲۹

سرسید نے شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے اپنی ننھیال کی عقیدت کے سبب پر روشنی نہیں ڈالی۔ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے خاندان کو ریاست و مناصب دنیوی حاصل نہ تھے اس لیے اس عقیدت کی وجہ دنیوی نہیں ہوسکتی ۔ جہاں تک سرسید کے نانا اور ناناکے بھائی خواجہ نجیب الدین عرف فداحسین کا تعلق تھا ، دونوں رسول شاہی سلسلے میں بیعت تھے اس لیے ہم سرسید کے ننھیال کی عقیدت کا سبب طریقت میں شاہ عبدالعزیز سے نسبت میں تلاش ~~کرسکتے ہیں۔ ہمارے سامنے~~ نہیں کیا جاسکتا/ اب صرف ایک ہی گوشہ باقی رہ جاتا ہے جہاں قیاس آرائی ~~کرسکتے ہیں~~ کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ سرسید کے نانا اور ان کے خاندان نے شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے علوم و فنون کی تحصیل کی ہو۔ سرسید نے اپنے نانا کے حالات میں ایک یادداشت تالیف کی تھی جو" حیات جاوید" کی تالیف کے وقت حالی کے پیش نظر رہی تھی (۱) اور ایک مستقل رسالہ " سیرت فریدیہ" کے نام سے بھی لکھا تھا لیکن اس سے بھی ان کی زندگی کے اس پہلو پر کوئی روشنی نہیں پڑتی کہ انھوں نے دہلی میں کن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔

دہلی میں خواجہ فریدالدین کی تحصیل علمی کے بارے میں سرسید نے صرف ایک سطر لکھی ہے :" دلی میں انھوں نے درسی کتابیں کو تمام کیا-"(۲) خواجہ فریدالدین کے اپنے بیان سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ انھوں نے درسی کتابیں کو کسی ایک شخص کی خدمت میں تحصیل نہیں کیاتھا ، بلکہ کئی اساتذہ تھے۔ انھوں نے " بعض اساتذہ" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ خواجہ صاحب کا ایک رسالہ" فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" پرکار متناسبہ کے سلسلے میں ہے ۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے :

" کسی کتاب کے حاشیے میں نظر سے گزراتھا کہ آلات ریاضی میں سے ایک پرکار

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید" ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲۰

(۲) محمود احمد برکاتی (مرتب) ؛ " سیرت فریدیہ" ، محولہ بالا ، ص ۸۰

متناسبہ بھی ہے کہ اس سے اکثر اعمال نجومی اور بعض اشکال ہندسی اور بعض مسائل حسابی مستخرج ہوسکتے ہیں۔ مگر آج کل اس آلے کی ناواقفی کی وجہ سے اس کا علم و عمل مفقود ہوگیا ہے اور یہ بات اپنے بعض استادوں کی زبان سے بھی سن چکا تھا ۔ اس لیے اس آلے کو دیکھنے کا شوق تھا۔" (۱)

سرسید یا ان کی کسی تحریر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بعض اساتذہ کون کون بزرگ تھے ۔ لیکن اگر اس دور کے ایسے اساتذہ پر نظر ڈالی جائے جو تعلیم و تعلم میں خصوصاً ریاضی میں جو خواجہ فرید کا خاص فن تھا دھلی کے ارباب علم و فن کا مرجع رہے اور جن کا حلقہ تشنگان علوم و فنون کی سیرابی کا ضامن ہو تو وہ خانوادہ و مدرسہ ولی اللّٰہی یعنی شاہ عبدالعزیز ان کے اخوان فیض آثار اور ان کی خاندانی درس گاہ مدرسہ رحیمیہ کے سرچشمہ معارف کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ سرسید کے نانا نے دلی میں جن بزرگوں سے تحصیل علمی کی تھی ان میں شاہ عبدالعزیز ، شاہ عبدالقادر وغیرہ کی شخصیت ضرور شامل تھی اور شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے " ان کے ننھیال کی بہت عقیدت " کا راز اسی تعلق و نسبت میں ہے جس پر پردہ پڑا ہوا ہے ۔

شاہ عبدالعزیز اور ان کے برادران عزیز شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نہ صرف منقولات میں اپنے وقت کے امام و مجتہد تھے بلکہ معقولات میں بھی انہیں تینوں بھائیوں کی ہستیاں شائقین علوم و فنون کی مرجع و مرکز تھیں ۔ ان حضرات کے علم و فضل اور جامعیت کے بارے میں ان بزرگوں کے ذیل میں ہم تفصیل سے بحث کی جائے گی ۔ یہاں صرف ان کے ایک معاصر حضرت علامہ فضل امام خیرآبادی کی رائے نقل کی جاتی ہے۔

---

(۱) محمود احمد برکاتی (مرتب) ، " سیرت فریدیہ"، محولہ بالا ، ص ۸۳
حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲۳

ن شاہ عبدالعزیز کے بارے میں لکھتے ہیں :

" در علم حدیث و فقہ و اصول و تمامی علوم عربیت خاصہ لغت مشہور اند۔ ..... و تمام علوم و سائر فنون چہ عقلی و چہ نقلی ہمہ از بر اند۔ و در جمیع علوم مولوی صاحب را رتبۂ عقل و مستفاد بہم رسیدہ۔" (۱)

اس کے بعد شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

" و برادر صغیر شاہ عبدالقادر صاحب ایشان مانند برادر بزرگ خود حاوی فضائل و مجتمع نوافل اند۔ امروز درعلم ریاضی کم کے بودہ باشد کہ مشابہت با مولوی صاحب تواند نمود۔" (۲)

اور آخر میں شاہ عبدالعزیز کے دوسرے بھائی یعنی شاہ رفیع الدین کے بارے میں لکھتے ہیں :

" و دیگر برادر مولوی شاہ عبدالعزیز در بزرگی و علم اخلاق عدیل خود ندارند و در زہد و تقی و طہارت بے مثل اند علم حدیث و احوال ہمہ از بر است ۔ کتب حدیث و فقہ را بیشتر درس می گویند و درس معقول را بگذاشتہ اند۔" (۳)

ان بزرگوں کی روشنی میں یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ فریدالدین نے انہیں حضرات کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہوگا اور انہیں حضرات کی خدمت میں درسی کتابوں کو تمام کیا ہوگا اور یہی وہ

" بعض اساتذہ" ہیں جن کی صحبت اور فیض درس و تدریس سے ان میں ریاضی کا شوق پروان چڑھا ہوگا۔ اور یہی سبب شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے سرسید کی ننھیال کی " بہت عقیدت" کا ہوگا۔

سرسید نے اپنی ننھیال کی شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے عقیدت کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

---

(۱) شہابی، مفتی انتظام اللہ (مرتب) ، " تراجم الفضلا"، از فضل امام خیرآبادی، کراچی : پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، س ن، ص ۱۲-۱۵

(۲) ایضاً، ص ۱۷

(۳) ایضاً، ص ۱۷

"میری ننھیال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے اور شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک گنڈہ دیا کرتے تھے ۔ جس میں ایک تعویز ہوتا تھا اور اس تعویز میں ایک حرف یا عدد سفید مرغ کو ذبح کرکے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا ، بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کا اس کو امتناع ہوتا تھا ۔ سید حامد اور سید محمد میرے دونوں بھائی کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈا پہنایا۔ مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈے کے سبب سے انڈا یا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھاویں گے تو کوئی آفت آوے گی خدا پر ایمان رکھنے کے برخلاف ہے ۔ وہ ان دونوں لڑکوں کوجب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہوتا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلادیتیں۔" (۱)

چوں کہ سرسید نے اس واقعے سے اپنے ننھیال کی شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت پر استدلال کیا ہے ۔ اس لیے اس کی بعض جزئیات مثلاً "گنڈے" اور "تعویز" کی شرعی حیثیت ، مرغ کے " خون" کی طہارت و نجاست یا بغیر کسی طبی مصلحت کے ایک حلال شے کے استعمال کا امتناع وغیرہ پر، ہمارے دائرہ بحث میں نہیں آتے۔ سرسید نے جو بات کہی ہے اور جس کی طرف ہم اشارہ کرنا ~~چاہتے ہیں~~ مقصود ہے وہ یہ ہے کہ سرسید کی ننھیال کو شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے بزرگوں سے عقیدت تھی ، اس کے اثرات خاندان کی تمام زندگی میں نمایاں تھے اور ان کی ننھیال کے مرد و خواتین بزرگوں کے ذہن شاہ صاحب کی عقیدت و ارادت کی گرفت سے آزاد نہ تھے۔ اور اس طرح سرسید احمد خان اپنے ننھیال کے توسط سے " ولی اللہی" تھے نہ کہ کسی اور خاندان اور مکتبہ فکر سے وابستہ ۔

---

(۱) محمود احمد برکاتی (مرتبہ) ، " سیرت فریدیہ" ، محولہ بالا ، ص ۳۱-۱۳۰
حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲۹

تعلیم

پہلا دور

کسی شخص کی سیرت اور افکار پر سب سے پہلا اثر اس کے خاندانی ماحول کا پڑتا ہے ۔ کوئی شخص اپنے خاندانی روایات کا کتناہی باغی کیوں نہ ہو اور آزاد خیالی اور مجتہدانہ اقدامات و مساعی میں اپنے ابتدائی ماحول سے خواہ کتناہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو نیز اس کے ابتدائی معتقدات کی دنیا خواہ یکسر منقلب ہی کیوں نہ ہوگئی ہو لیکن اس کے ابتدائی ماحول کے اثرات اور معتقدات کی چھاپ اس کی فکر و سیرت پر ضرور موجود رہتی ہے ۔ بقول سرسید :" انسان کا دماغ کیسا ہی روشن ہوجاوے اور وہ کیسی ہی دلی قوت اور نڈر جرات اور بے خوف ملامت سے ان تعلیمی اور تقلیدی اور تربیتی بندشوں کو توڑنا چاہے جن سے وہ اپنے چھٹپن سے بندھا ہوا ہے پھر بھی کوئی نہ کوئی بندش اس کو باندھے رہتی ہے ۔" (۱)

سرسید کی ننھیال اور ددھیال دونوں کی عقیدت کے رشتے شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان اور شاہ غلام علی اور ان کی خانقاہ سے اُستوار تھے اور اگرچہ رشد و ہدایت اور تعلیم و سلوک اور تصوف میں خانقاہ کے اپنے امتیازات تھے لیکن تعلیم کتاب و سنت اور علوم و معارف اسلامی کی ترویج و اشاعت میں گویا کہ وہ مدرسہ عزیزیہ ہی کی ایک شاخ تھی ۔

خاندانی ماحول کے بعد کسی شخص کی فکر و سیرت کی تعمیر میں سب سے

---

(۱) سرسید احمد خاں، " مقالات سرسید"، (مرتب) محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۱ء، حصہ سوم، ص ۱۳-۱۲

زیادہ حصہ اس کے اساتذہ کا ہوتا ہے ۔ سرسید اس لحاظ سے بھی خوش نصیب تھے

کہ ان کے اساتذہ میں سے بیشتر کا تعلق شاہ عبدالعزیز کے خانوادۂ علمی سے تھا۔

اس لیے سرسید نے غیر شعوری طور پر اپنی شخصیت کی تعمیر، فکر و سیرت کی تہذیب

اور نظام فکر کی تشکیل کا سب سے زیادہ سرو سامان اسی خاندان کے افکار و تعلیمات

سے حاصل کیا۔ ان کے ذہن و فکر، انداز فکر اور سیرت پر خانوادہ ولی اللہی کی

چھاپ سب سے زیادہ گہری تھی ۔

تقریب بسم اللہ :

جیسا کہ مسلمانوں میں رواج ہے تقریباً پانچ سال کی عمر میں بچوں کی تعلیم کا آغاز " بسم اللہ " کی روایتی تقریب سے کیا جاتا ہے ، سرسید کی تقریب بسم اللہ کا اہتمام کیا گیا ۔ حالی نے سرسید کی تقریب بسم اللہ کا حال سرسید ہی کے الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

شاہ غلام علی :

بقول خواجہ الطاف حسین حالی سرسید کہتے تھے :

" مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے ۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے ۔ خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے ۔ مجھ کو لاکر حضرت کے سامنے بٹھادیا تھا۔ مجمع کو دیکھ کر ھکا بکا سا ہوگیا تھا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو " بسم اللہ الرحمن الرحیم" مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انھوں نے اٹھاکر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے ۔ اور اول بسم اللہ پڑھ کر اقرا کی اول آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں ۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ

پڑھتا گیا۔"

سرسید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انھوں نے کبھی کہا تھا ، پڑھا :

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی
بہ فیض نقشبند وقت و جان جان جانانی (۱)

سرسید کہتے تھے :

" شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے - اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے - ماشاء اللہ صرف میرے والد پر جو غایت درجے کی شفقت تھی اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔" (۲)

استانی :

سرسید کی تعلیم کی بنیاد شاہ غلام علی کے مبارک ہاتھوں سے پڑی تھی - بسم اللہ کی تقریب کے بعد سرسید کی پہلی باقاعدہ استاد ان کی ایک استانی تھیں جن کی خدمت میں انھوں نے ناظرہ قرآن مجید پڑھا تھا۔ حالی لکھتے ہیں :

" بسم اللہ ہونے کے بعد سرسید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ ان کی ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی - سرسید نے استانی ہی سے جو ایک اشراف گھرانے کی پردہ نشین بی بی تھیں ، سارا قرآن ناظرہ پڑھا تھا - وہ کہتے تھے کہ ——

" میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس جو زنانہ میں ہوئی تھی - وہ اس قدر دل چسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی -"

قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے -" (۳)

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین : " حیات جاوید " ، کان پور : نامی پریس ، ۱۹۰۱ ع
ج اول ، ص ص ۳۱-۳۰

(۲) ایضاً ، ج اول ، ص ص ۳۱-۳۰

(۳) ایضاً ، ج اول ، ص ۳۱

مولوی حمیدالدین :

یہ مکتب آج کل کے مدارس کی طرح کا کوئی مدرسہ نہ تھا بلکہ جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا۔ امرا کے بچوں کو پڑھانے کے لیے مدرس مقرر ہوتے تھے اور ڈیوڑھی کا ایک حصہ درس و تدریس کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ یہاں نہ صرف اس امیر کے بچے بلکہ دوسرے بچے بھی پڑھتے تھے۔ اسی قسم کا انتظام سرسید کے نانا کے مکان پر تھا۔ جہاں خاندان کے تمام بچے تعلیم حاصل کرتے تھے ۔ اس زمانے میں جب سرسید پڑھتے تھے، مولوی حمیدالدین مدرس مقرر تھے۔ باہر کے اساتذہ میں سب سے پہلے سرسید نے انھیں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور فارسی کی ابتدائی کتابیں کی تحصیل کی ۔ مولانا حالی لکھتے ہیں :

"مولوی حمیدالدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی ان کے ناناکے ہاں نوکر تھے ۔ جنھوں نے ان کے ماموؤں کو پڑھایا تھا ۔ ان سے معمولی کتابیں کریما، خالق باری، آمدنامہ وغیرہ پڑھیں۔"

"جب مولوی حمیدالدین کا انتقال ہوگیا تو اور لوگ پڑھانے پر نوکر ہوتے رہے ۔ انھوں نے فارسی میں گلستان، بوستان اور ایسی ہی ایک آدھ کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔" (۱)

مولوی حمیدالدین کے حالات کی اس سے زیادہ تفصیل نہیں ملتی اور نہ سرسید کے ان اساتذہ کے نام کسی تذکرے یا کسی تصنیف سے معلوم ہوتے ہیں جن سے سرسید نے اپنے ناناکے گھر پر تعلیم حاصل کی تھی ۔

سرسید کی والدہ :

فارسی کی تحصیل سرسید نے اپنی والدہ کی خدمت میں بھی کی ۔ گلستان

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۳۱

کے چند اسباق انھوں نے باقاعدہ اپنی والدہ سے پڑھے تھے۔ اور مطالعہ و آموختہ میں ان سے عام طور پر مدد لیتے تھے ۔ سرسید احمد لکھتے ہیں :

" میں نے خود گلستان کے چند سبق ان سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ جب میں ان کو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی مثل تنبیہہ کو اپنے پاس رکھ لیتی تھیں ۔ اگرچہ وہ خفا تو کئی دفعہ ہوئی ہوں گی ۔ مگر ان سوت کی لڑوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی۔ ان کی تعلیم اور ان کی نصیحتیں نہایت ہی حکیمانہ اور دل پر اثر کرنے والی تھیں ۔" (۱)

سرسید کے نانا :
==========

اس زمانے میں سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ معلوم نہیں کہ سرسید نے ان سے فارسی یا عربی کی کوئی کتاب جیسی باقاعدہ پڑھی تھی یا نہیں ۔ نانا سے استفادے اور اس کی نوعیت پر خود سرسید کے ایک بیان سے روشنی پڑتی ہے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

" شام کو چراغ جلنے کے بعد ان کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے ۔ سبق سنائے جاتے تھے ..... جب لڑکے باری باری سے سبق سناتے اور جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اس کو کسی قسم کی نفیس مٹھائی اکثر بادام کی خانہ ساز لوزتیں ملتی تھیں اور جس کو یاد نہ ہوتا تھا اس کو نہیں دی جاتی تھیں اور گھڑک دیتے تھے ....

راقم جس زمانے میں بوستان پڑھتا تھا حسب دستور سبق سنائے گیا اس سبق میں یہ شعر بھی تھا :

طمع را سہ حرف است ہر سہ تہی
و زاں نیست سلطان را بہی

---

(۱) محمود احمد برکاتی (مرتب) ، "سیرت فریدیہ"، محولہ بالا ، ص ۱۳۵

پہلے مصرعہ کا میں نے ترجمہ کیا کہ " طمع " کے تین نقطوں خالی۔ انھوں نے کہا " ہوتہ . . . " میں سمجھا میں نے غلط پڑھا۔ پھر غور کیا ، پھر وھی معنی کہے انھوں نے پھر ٹوکا ۔ تیسری دفعہ بھی وھی معنی کہے ۔ وہ خفا ھوئے اور کہا " بےپیر سبق یاد نہیں کرتا " ۔ کچھ بتایا نہ مجھ کو کچھ دیا۔ جس قدر مجھ کو رنج ہوا اور برابر آنسو آنکھوں سے جاری ھوئے وہ اب تک مجھ کو یاد ھے ۔ بہت دیر کے بعد میں سمجھا کہ " است " کے معنی ھیں نے نہیں کہے تھے ۔ ھمارے بھائیوں نے ھم کو اور چڑایا اور کہا " مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکلہ خود باید زد ۔ " (۱)

خواجہ زین العابدین:

خواجہ فریدالدین کا انتقال ھوا تو سرسید کی عمر دس سال کچھ سے کچھ زیادہ تھی ۔ اس وقت تک " گلستان " ، " بوستان " پڑھ چکے تھے اور جیسا کہ حالی نے لکھا کہ سرسید نے فارسی میں " گلستان " ، " بوستان " اور ایسی ھی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا ۔ (۲) پھر انھوں نے عربی پڑھنی شروع کی ۔ عربی میں " شرح ملا " ، " شرح تہذیب " ، " میبذی " ، " مختصر معانی " اور " مطول " ما انا قلت تک پڑھی ۔ مگر طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی سے ۔ "

اس کے بعد سرسید کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ھوا ۔ جس میں بقول حالی ان کی ننھیال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے ۔ (۳) ریاضی انھوں نے جو کچھ پڑھی اپنے ماموں کہ خواجہ زین العابدین سے پڑھی تھی ۔ وہ نواب دبیرالدولہ فریدالدین خاں کے چھوٹے بیٹے تھے ۔ ۱۸۳۶ء میں بہادر شاہ ظفر نے انھیں

---

(۱) محمود احمد برکاتی (مرتب) ، " سیرت فریدیہ " ، محولہ بالا ، ص ۲۲-۱۲۵

(۲) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، ج اول ، ص ۳۲

(۳) ایضاً ، ج اول ، ص ۳۲

دبیرالدولہ خاں بہادر مصلح جنگ کا خطاب دیا تھا۔ سرسید لکھتے ہیں :" کہ ان کی زندگی عجیب مختلف شوقوں میں بسر ہوئی ۔ زمانہ تعلیم گزرنے اور اپنے باپ سے علم ہیئت اور ریاضیات کو پوری طور پر پڑھنے کے بعد ان کو گانے اور بین بجانے کا شوق ہوا۔ اور یہ شوق کسی نہ کسی قدر اخیر عمر تک رہا۔"

بین جو ایک نہایت عجیب اور عمدہ باجا ہندوستان کا ہے اس کو خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے اور اس کے تونبوں اور کاٹ چھانٹ میں ایسی ایجادیں کی تھیں کہ لوگ متعجب ہوگئے تھے۔

کبھی ان کو فن ریاضی سے شوق ہوتا تھا۔ دن رات بجز آلات رصدکے بنانے اور کواکب کے رصد کرنے کے کوئی شغل نہ تھا۔ چونکہ خود بہت بڑے دست کار تھے۔ تمام آلات رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ نہایت بڑے قطر کا برنجی کرہ اور برنجی اسطرلاب اپنے ہاتھ سے ایسا عمدہ بنایا تھا جو عجائب روزگار سے تھا۔

کسی زمانے میں ان کو پتنگ بازی کا شوق ہوتا تھا ۔ اس زمانے میں بجز اس کے اور کسی چیز کا چرچا نہ رہتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے پتنگ بنانے کو بھی انھوں نے ایک علمی چیز کردیا تھا اور ایک رسالہ صنعت پتنگ میں لکھا تھا۔

کسی زمانے میں ان کو تیراندازی کا شوق ہوتا تو بجز تیراندازی اور کمانوں کے بننے کے اور سہ پہر کو تیراندازی کے جلسوں کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔.... تیراندازی کا فن انھوں نے سید محمد متقی یعنی سرسید کے والد سے جو اس فن میں بے نظیر تھے سیکھا تھا۔ اور اس میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے کمانیں اور ہر قسم کے تیر بناتے تھے ۔ ان کے کی بنائی ہوئی کمانیں کشمیر کی بنی ہوئی کمانوں سے زیادہ عمدہ سمجھی جاتی تھیں۔ (۱)

---

(۱) محمود احمد برکاتی (مرتبہ)، " سیرت فریدیہ"، محولہ بالا، ص ۳۳-۱۲۹
حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۱۸

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرلی تھی اور جنرل آکٹر لونی کے منشی ہوگئے تھے۔ پھر جنرل اسٹور کے منشی مقرر ہوئے ۔ مولوی عبدالقادر صاحب "وقائع عبدالقادر خانی" کی ان سے ۲۲-۱۸۲۳ء میں ملاقاتیں رہی تھیں ۔ ۲۲ جنوری، ۱۸۲۳ء کی یادداشت میں ان کا ذکر کیا ہے اور ان کی خوش روشی، ادب ، سلیقہ بزم، زبان دانی، خوش بیانی اور نوشت و خواند میں ان کی مہارت کا اعتراف کیا ہے ۔ (۱)

خواجہ الطاف حسین حالی ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

" خواجہ فریدالدین کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خان جو فنون ریاضی میں ید طولی رکھتے تھے، انھیں کے (یعنی خواجہ فریدالدین کے) شاگرد تھے۔ ۱۸۵۲ء میں جب طالب علمی کے ارادے سے پہلی ہی بار میرا دلی جانا ہوا اس وقت زین العابدین خان زندہ تھے اور دلی میں ان کی ریاضی دانی اور فنون ریاضی میں سے خاص کر موسیقی کے علم و عمل کی بہت شہرت تھی۔" (۲)

انہی جامع صفات ماموں کی خدمت میں سرسید نے ریاضی کی تحصیل کی تھی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں :

" انھوں نے اپنے ماموں زین العابدین خان سے حساب کی معمولی درسی کتابیں ، تحریر اقلیدس کے چند مقالے، ہیئات میں شرح چغمنی تک اور ایک قدر رسالہ متوسطات کا (جو مجسطی سے پہلے پڑھائے جاتے ہیں) پڑھا۔ مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ مجسطی کے پڑھنے کی نوبت پہنچی۔ کیوں کہ آلات رصد کا زیادہ شوق ہوگیا تھا ۔ چناں چہ آلات رصد پر جنتری اور چند رسالے جیسے مثل اعمال کرہ، اعمال اصطرلاب ، رسالہ صنعت اصطرلاب ، ربع مجیب ، ربع مقنطر ، حلزون، جریب الساعۃ ، پرکار تقسیم ،

---

(۱) ایوب قادری، محمد، (مرتبہ) ، " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) " ، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۱۹۸

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، محولہ بالا ، ج اول ، ص ۲۲-۲۱

پرکار متناسبہ اپنے ماموں سے پڑھے ۔" (۱)

خواجہ زین العابدین کا انتقال دھلی میں ۲۳ اکتوبر، ۱۸۵۶ع کو ھوا۔(۲)

حکیم غلام حیدر خان :

حالی نے سرسید کی تحصیل ریاضی کے تذکرے کے فوراً بعد طب کی تحصیل کا تذکرہ کیا ھے ۔ طب انھوں نے حکیم غلام حیدر خان سے پڑھی تھی جو اصحاب ثلاثہ(۳) کے شاگرد تھے اور ان کی خدمت میں سالہا سال تک استفادہ کیا تھا۔ (۴)

" اخیر زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ھوگیا۔ حکیم غلام حیدر خان سے جو ایک خاندانی حکیم تھے ، طب کی ابتدائی کتابیں مثل قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجات سدیدی، شرح اسباب اور نفیسی امراض عین تک پڑھی ۔ اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب انھوں نے پڑھنا چھوڑا ھے اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔"(۵)

حالی نے چند ماہ تک حکیم غلام حیدر خان کے پاس مطب کرنے کا جو تذکرہ کیا ھے ۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ فن طب کی عملی تربیت بھی حاصل کی ۔ وہ کہ مطب

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۳۱

(۲) محمود احمد برکاتی(مرتب) ، " سیرت فریدیہ"، محولہ بالا، ص ۱۲۹

(۳) اصحاب ثلاثہ کا لفظ اھل دھلی کی زبان میں امام عبدالعزیز اور ان کی دو بھائیوں مولانا رفیع الدین اور مولانا عبدالقادر کےلئے بولاجاتاتھا۔ شیخ خالدکردی کے خطوط میں یہ اصطلاح خاص طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ شیخ موصوف شاہ غلام علی کے نامور خلیفہ تھے اور اپنے مرشد کے حکم سے شاہ عبدالعزیز سے بھی استفادہ کیا تھا۔ جو ان کےبھی استاد حدیث تھے ۔ شاہ عبدالعزیز نے انھیں اپنے علوم کی روایت کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ ۱۲۳۲ھ/۲۷-۱۸۲۶ع میں انتقال ھوا۔ حجاز میں قیام تھا ۔ سال میں ایک بار حجاج کے ذریعہ دھلی خط بھیجتے تھے۔ ان کے مکاتیب کا مجموعہ چھپ گیا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے مکہ معظمہ میں یہ مجموعہ دیکھا تھا۔ (عبیداللہ سندھی، مولانا، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک " ، لاھور: سندھ ساگراکیڈمی، ۱۹۵۲ع ، صص: ۹۵-۹۳)

(۴) اختر جوناگڈھی، قاضی احمدمیاں(مرتب) ، " تذکرہ اھل دھلی"، از سرسید احمدخان، کراچی : انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ع ، ص: ۷۷

(۵) حالی، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۳۲

کرنے کا مطلب طبابت کوبطور پیشہ اختیار کرنے سے ہے جیسا کہ حامد حسن قادری نے مراد لیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" فن طب بھی حاصل کیا اور چند مہینے مطب بھی کیا ۔" (۱)

سرسید نے ان سے تلمذ کا خود بھی اعتراف کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

" راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے ۔" (۲)

حکیم غلام حیدر خان سے استادی کا ذکر صاحب " نزہۃ الخواطر" (۳) نے بھی کیا ہے ۔ لیکن ان کی معلومات کا ماخذ "حیات جاوید" ہے ۔ انھوں نے معلومات کو اور کتب تحصیلی کی تفصیل کو نقل کردیا ہے جو حالی نے لکھی ہے ۔

دوسرا دور

جیسا کہ حالی نے لکھا ہے کہ سرسید نے اٹھارہ انیس سال کی عمر میں پڑھنا چھوڑ دیا تھا ۔ اور کسی علم و فن کی بھی تکمیل نہ کی تھی جو کچھ پڑھا تھا وہ بھی نہایت بے پروائی اور کم توجہی سے پڑھا تھا اس طرح ان کی تحصیل علمی کا یہ دور ۳۶-۱۸۳۵ء میں ختم ہوگیا تھا ۔ چوں کہ شادی کی عمر حالی نے سترہ اٹھارہ سال لکھی ہے ۔ (۴) اس لیے اس وقت تک سرسید متاہل بھی ہوچکے تھے ۔ سرسید کی زندگی کا یہ دور نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گزرا ۔ حالی نے بہت محتاط لفظوں

---

(۱) حامد حسن قادری، " داستان تاریخ اردو"، کراچی : اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء، ص ۲۹۳

(۲) اختر جوناگڑھی، (مرتب)، " تذکرہ اہل دہلی"، محولہ بالا، ص ۷۷

(۳) عبد الحئی، مولانا سید، " نزہۃ الخواطر"، کراچی : کارخانہ تجارت کتب، ۱۹۷۶ء، ج ۸، ص ۳۱

(۴) حالی، الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۵۱

میں ان کی زندگی کے اس دور اور اس کے لیل و نہار کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ حالی لکھتے ہیں :

" سرسید کا عنفوانِ شباب نہایت زندہ دلی اور رنگینی صحبتوں میں گزرا تھا ۔ وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے .... اس قسم کے جلسوں اور صحبتوں میں سرسید کا شریک ہونا آخر کار رنگ لائے بغیر نہ رہا ۔ بے فکر امیر زادے عیاشی اور لہوولعب کی مثالیں قائم کرتے جاتے تھے خربوزوں کو دیکھ کر خربوزے رنگ پکڑتے جاتے تھے ۔ اگرچہ سرسید سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں متاہل ہوگئے تھے پھر بھی وہ اس متعدی مرض کے اثر سے اپنے تئیں نہ بچاسکے" - (۱)

اس زندگی کا پہلا دور ۱۸۳۸ء میں ختم ہوتا ہے جب کہ سرسید کے والد کا انتقال ہوا ۔ اس وقت سرسید کی عمر کچھ کم بائیس سال کی تھی ۔ ابھی تک سرسید کو کسی قسم کی فکر نہ تھی ۔ والد کے انتقال کے بعد صرف کچھ قلیل تو سرسید کی والدہ کے نام جاری رہا باقی سب تنخواہیں بند ہوگئیں اور چند ملکیں جو معافی کی تھی وہ بھی بسبب حین حیات ہونے کے ضبط ہوگئیں ۔ اس لیے سرسید کو گورنمنٹ کی نوکری کا خیال پیدا ہوا ۔ ہر چند ان کے رشتہ دار قلعہ سے قطع تعلق پر راضی نہ تھے مگر انھوں نے قلعہ کا سہارا یک قلم چھوڑ کر گورنمنٹ انگریزی یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرلی ۔

سرسید کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اس وقت دلی میں صدر امین تھے ۔ انھوں نے اپنے پاس کچھ دنوں کام سکھانے کے بعد فوجداری کے خفیف مقدمات کا اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کردیا ۔ فروری ۱۸۳۹ء میں وہ آگرے میں کمشنر کے دفتر میں نائب منشی ہوگئے ۔ اس جگہ پر سرسید نے اس وقت تک کام کیا جب کہ وہ منصفی کا

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، ج اول ، ص ۳۵

امتحان پاس کرنے کے بعد ۲۲ دسمبر، ۱۸۴۱ء کو مین پوری کے منصف مقرر ہوئے - مین پوری میں انہوں نے تقریباً پندرہ دن کام کیا اس لیے کہ ۱۰ جنوری، ۱۸۴۲ء کو وہ تبدیل ہوکر فتح پور سیکری آگئے - (۱)

مولوی نورالحسن :

فتح پور سیکری کے قیام کے دوران میں سرسید کو اپنی تعلیم مکمل کرنے کا خیال پیدا ہوا - لیکن آگرے کی زندگی میں ان کو دہلی کی طرح اساتذہ کی صحبت میسر نہ تھی اس لیے سرسید اپنے طور پر کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور مطالعے کے دوران جو مشکلات پیش آتی تھیں - چھٹی کے دن آگرے جاکر مولوی نورالحسن سے جو اصحاب ثلاثہ میں سے شاہ محمد اسحاق ، مفتی صدرالدین آزردہ اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے -(۲) مشکلات کو حل کرلیتے تھے- مولانا حالی لکھتے ہیں :

" مطالعہ کی عادت ابتدا سے ان کی رفیق رہی - جس زمانے میں وہ فتح پور سیکری میں منصف تھے اس وقت مولانا نورالحسن مرحوم آگرے میں منصف تھے - سرسید کی ان سے گہری دوستی تھی- مطالعہ کے وقت کتاب کے مشکل مقامات جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کو سمجھنے کے لیے ہر اتوار کو وہ گھوڑے پر سوار ہوکر فتح پور سے آگرے میں مولانا کے پاس آتے تھے - کئی برس تک ان کا بلا ناغہ یہ دستور رہا - وہ کہتے تھے کہ میرا گھوڑا رستے سے ایسا آشنا ہوگیا تھا کہ ایک بار آگرے سے چھوٹ کر فتح پور اپنے تھان پر پہنچ گیا تھا-" (۳)

---

(۱) حالی، الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ص ۵۱-۳۸(ملخصاً)

(۲) اختر جوناگڑھی(مرتبہ) ، " تذکرہ اہل دہلی"، محولہ بالا، ص ۱۲۳

عبدالحئی، سید،" نزہۃ الخواطر"، ~~محولہ بالا~~ حیدرآباد دکن: دائرۃ المعارف ۱۹۵۹ء، ج ۷، ص ۷۰

احتشام الحسن کاندھلوی، " حالات مشائخ کاندھلہ"، دہلی : ادارہ اشاعت دینیات، ۱۳۸۳ء، ص ۱۲۷

(۳) حالی، خواجہ الطاف حسین،" حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۵۳-۲۵۳

حالی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے مولانا نورالحسن سے بھی شاگردانہ تحصیل بھی کی بجائے دوستانہ استفادہ کیا تھا۔ لیکن سرسید نے اپنے رسالہ "جلاء القلوب بذکر المحبوب" مولفہ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں، (۱) "تسہیل فی جرالثقیل" مولفہ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء (۲) میں اور "تحفہ حسن" مترجمہ ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء (۳) میں مولانا نورالحسن سے اپنے شاگردانہ استفادہ کا اعتراف کیا ہے۔ اور "آثارالصنادید" میں اُن موصوف کے ترجمے میں بھی سرسید نے "بدرجہ غائت فطور تربیت استادانہ" کا ذکر کیا ہے۔(۴)

تیسرا دور

فتح پور سیکری میں سرسید کامل چار سال منصف رہے۔ ۸ فروری ۱۸۴۶ء کو سرسید فتح پور سیکری سے دلی تبدیل ہوگئے۔ انہیں دنوں میں ان کے بڑے بھائی کاملین عالم شباب میں انتقال ہوا تھا۔ اور ان کی والدہ پر یہ صدمہ نہایت سخت گزار تھا۔ اس لیے انہوں نے خود درخواست کرکے اپنی بدلی کرائی تھی۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک جب تک کہ وہ مستقل صدر امین مقرر نہیں ہوئے۔ دلی ہی میں رہے۔ اس عرصے میں صرف دو دفعہ یعنی ایک بار ۱۸۵۰ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۳ء میں قائم مقام صدر امین مقرر ہوکر رہتک جانے کا اتفاق ہوا۔

جس وقت وہ فتح پور سے بدل کر دلی میں آئے تھے اس وقت ان کی عمر انتیس برس کی تھی۔ حالی کا خیال ہے کہ یہاں آکر ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جو کتابیں

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، (مرتبہ)، "مقالات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء حصہ ۷، ص ۳۰

(۲) اسمعیل پانی پتی (مرتبہ)، "مقالات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء حصہ ۱۲، ص ۷۷

(۳) ایضاً، حصہ ۱۲، ص ۷۸

(۴) اختر جونا گڑھی، قاضی احمد میاں (مرتب) تذکرہ اہل دہلی، کراچی، ص ۲۰

ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بیپروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیاً ہوگئی تھیں ، ان کو از سر نو اور توجہ سے پڑھیں گے۔(١) ہمارا خیال ہے کہ یہ خیال سرسید کو فتح پور سیکری کے ابتدائی زمانہ قیام ہی میں پیدا ہوگیا تھا اور مولانا نورالحسن سے استفادے کا آغاز اسی سلسلۂ خیال کی ابتدائی کڑی تھی۔ لیکن اس کے لیے وہ ہفتے میں صرف تعطیل کا ایک دن ہی نکال سکتے تھے۔ فتح پور میں شاید ان کے حسب منشا تحصیل علمی کا کوئی بندوبست نہ ہوسکتا لیکن اب جب کہ سرسید دلی آگئے تھے تو ان کے لیے اس بات کا بہتر موقع تھا کہ وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنائیں - چنانچہ سرسید نے تک دھلی کے اس قیام سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

مولوی نوازش علی :

سب سے پہلے انھوں نے مولوی نوازش علی سے جو شاہ محمد اسحاق کے تلامذہ میں سے ایک صاحب استعداد مدرس تھے، پہلے پڑھی ہوئی کتابوں کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ پھر کچھ اور کتابیں بھی ان سے پڑھیں - حالی لکھتے ہیں :

> " مولوی نوازش علی مرحوم جو دلی کے مشہور واعظ تھے اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے ، ان سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثل قدوری و شرح وقایہ اور اصول فقہ میں شاشی، نورالانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی -" (٢)

جس زمانے میں سرسید مولوی نوازش علی مرحوم سے دلی میں پڑھتے تھے - میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دھلی بھی ان کے ساتھ پڑھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ جب سید صاحب چند روز کے لیے قائم مقام صدر امین مقرر ہوکر رہتک جانے لگے تو انھوں

---

(١) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، محولہ بالا ، ج اول ، ص ٥٢

(٢) ایضاً ، ج اول ، ص ٥٣

نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ بھی رہتک چلیے۔ مولوی صاحب ہنسنے لگے اور کہا کہ میں بھلا کیوں کر جاسکتا ہوں؟ ایک جماعت کثیر طلبہ کی مجھ سے پڑھتی ہے، ان کو کس پر چھوڑ کر جاؤں ۔ انھوں نے کہا سب طلبہ کو بھی ساتھ لے چلیے۔ مولوی صاحب کو اور زیادہ تعجب ہوا کہ اتنے طالب علم کھائیں گے کہاں سے ۔ سید صاحب نے کہا آپ ان کے کھانے پینے کا فکر تو کیجئے نہیں ۔ خدا رازق ہے ۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ آپ نہ چلیں گے تو میں رہتک جانے سے انکار کردوں گا اور اس سے میری آئندہ ترقی رک جائے گی ۔ آخر مولوی صاحب کو اس کے سوا کچھ بن نہ آیا کہ وہ مع طالب علموں کی جماعت کے ان کے ساتھ ہولیے اور جب تک رہتک رہنا ہوا سب کا خرچ سید صاحب کے ذمے رہا۔" (۱)

حالی نے اس واقعے سے سرسید کی عالی حوصلگی پر استدلال کیا ہے اور حامد حسن قادری نے اس سے سرسید کے شوق اور طلب علم پر استدلال کیا ہے۔ (۲) میرے خیال میں یہ دونوں باتیں درست ہیں ۔

حالی نے مولوی سید میر محمد کی زبانی جو رہتک کے سفر میں مولوی نوازش علی کے قافلہ علمی میں شریک تھے اور سرسید کے ہم سبق بھی تھے ۔ مولوی صاحب موصوف سے سرسید کے استفادے کی کیفیت اور تعلیمی رفتار بھی بیان کی ہے ۔ حالی نے لکھا ہے کہ سید میر محمد بیان کرتے تھے :

" جس زمانے میں سید صاحب دلی سے رہتک بدل کر گئے ہیں، میں بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔ وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی صاحب سے .... سبق پڑھتے تھے ۔ بیس بیس بائیس بائیس صفحے شرح جامی اور

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۵۰۸

(۲) حامد حسن قادری، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، ص ۲۹۵

قطبی کے وہ ہر روز پڑھتے تھے ۔ میں بھی ان کے ساتھ پڑھنے کے لیے گیا تھا مگر اس رفتار سے ان کے ساتھ نہ چل سکا اور واپس دلی چلا آیا۔" (۱)

سرسید نے " آثارالصنادید" میں نوازش علی کے ترجمے میں ان سے استفادے اور تلمذ کا اگرچہ اعتراف نہیں کیا لیکن" حیات جاوید" میں حالی نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ سب سرسید کی اطلاعات پر مبنی ہیں ۔

مولانا فیض الحسن :

دہلی میں قیام کے اسی زمانے میں سرسید نے مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے بھی استفادہ کیا تھا۔ مولانا فیض الحسن نے دہلی میں جن استادوں سے پڑھا تھا ان میں مفتی صدر الدین آزردہ، شاہ احمد سعید مجددی، اخوں شیر محمد، فضل حق خیرآبادی اور امام بخش صہبائی جیسے اصحاب علم و فضل شامل ہیں۔ (۲) ان میں صہبائی کے سوا تمام بزرگ اصحاب ثلاثہ سے تلمذ کا شرف رکھتے تھے۔ صہبائی مرحوم عبد اللہ خاں علوی کے شاگرد تھے۔ علوی نے شاہ اسمعیل شہید اور دوسرے اساتذہ سے پڑھا تھا ۔ علوی حضرت سید احمد شہید بریلوی سے بیعت بھی تھے۔ مولانا فیض الحسن سے سرسید نے مقامات حریری کے چند مقالے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے تھے ۔ حالی لکھتے ہیں :

" مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقامات حریری کے چند مقالے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے ۔" (۳)

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۵۸
حامد حسن قادری، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، ص ۲۹۳
عبد الحئی، سید، " نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۳۲

(۲) عبد اللہ قریشی، " مولانا فیض الحسن" (مقالہ)، " المعارف"، لاہور: جون، ۱۹۷۷ء، ص ۳۶

(۳) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، ج اول، ص ۵۳

سرسید نے ان سے استفادے کا خود بھی اعتراف کیا ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے " مدار اصول" بھی ان سے پڑھی تھی ۔ سرسید لکھتے ہیں:

" میں نے ان سے ایک کتاب مسمی" مدار اصول" فقہ کی اور چند مقالے مقامات حریری کے پڑھے ۔" (۱)

مولانا فیض الحسن سہارن پور کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے ۔ حکیم امام الدین دھلوی سے طب بھی پڑھی تھی۔ (۲) ۱۸۷۰ء تک تقریباً سترہ سال اورینٹل کالج لاھور میں عربی کے استاد رہے ۔(۳) ۱۸۸۷ء میں لاھور میں انتقال ہوا ۔ جنازہ سہارن پور لے جایا گیا اور دره آلی میں اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے ۔(۲)

شاہ مخصوص اللہ :

اس زمانے میں جب کہ سرسید فتح پور سیکری سے تبادلہ کروا کے دلی آئے تھے اور ان کی تعلیمی زندگی کا دور ثانی شروع ہوا تھا۔ انھوں نے شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کے پوتے شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کی نامور خلف الرشید مولانا شاہ محمد مخصوص اللہ سے بھی پڑھا تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں :

" (سرسید نے) شاہ مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے، حدیث پڑھنی شروع کی۔"مشکوۃ" اور ایک حصہ" ترمذی" کا اور کسی قدر اجزا" صحیح مسلم" کے پڑھے اور قرآن

---

(۱) اقبال علی، سید ،" سفر نامہ پنجاب "، لاھور: مجلس ترقی ادب، س ن، ص ۲۰٦

(۲) عبداللہ قریشی،" مولانا فیض الحسن"، " الصارق"، محولہ بالا، ص ۳۰

(۳) وحید قریشی، ڈاکٹر ،" اساتذہ اور پی ایچ ڈی اسکالروں کی فہرست"، " اورینٹل کالج میگزین"، لاھور : ۱۹۷۰ء ، ص ۱۳

(۲) سلیمان ندوی، سید ،" حیات شبلی"، اعظم گڑھ (بھارت) : دارالمصنفین، ۱۹۴۳ء ، ص ۸۳

مجید کی سند لی۔" (۱)

ابویحییٰ امام خان نے لکھا ہے "کہ مولوی مخصوص اللہ عامل آمین بالجہر و رفع یدین تھے ۔ سرسید احمد خان مرحوم آپ کے شاگردوں میں سے تھے اور اسی وجہ سے وہ بھی آخر تک ان سنتوں کے عامل رہے ۔" (۲)

مولوی نوازش علی ، مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور شاہ مخصوص اللہ سے سرسید کے استفادے کا ذکر مولانا سید عبدالحئی اور مولانا حامد حسن قادری نے بھی کیا ہے ۔ (۳) لیکن ان کا ماخذ " حیات جاوید" ہے ۔ ان تینوں بزرگوں سے سرسید کے استفادے کے تذکرے کے بعد حالی لکھتے ہیں :

" پس اس سے زیادہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے ہیں استاد سے انھوں نے کچھ نہیں پڑھا۔" (۴)

<u>میر محمد متقی :</u>

سرسید نے اس زمانے کے شرفا کی طرح تیراکی اور تیراندازی کو بھی بطور ایک فن کے حاصل کیا تھا۔ سرسید کے والد میر متقی اپنے زمانے میں ان دونوں فنون میں طاق تھے ۔ سرسید نے یہ دونوں فن اپنے والد ہی سے سیکھے تھے۔ (۵)

میر متقی کا ذکر چوں کہ سرسید کے ددھیال کے سلسلے میں یہاں میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے اس لیے یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، ج اول ، ص ۵۳

(۲) ابویحییٰ امام خان نوشہروی " تراجم علمائے حدیث ہند " ، دہلی : جید برقی پریس ، ۱۹۳۸ء ، ص ۱۱۳

(۳) عبدالحئی ، سید " نزہۃ الخواطر " ، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص ۳۲
حامد حسن قادری " داستان تاریخ اردو " محولہ بالا ، ص ۲۹۵

(۴) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، ج اول ، ص ۵۳

(۵) ایضاً ، ج اول ، ص ۱۸

چوتھا دور

سالم یہودی :

۱۸۶۲ء میں جب کہ سرسید غازی پور میں صدرالصدور تھے اور بائبل کی تفسیر لکھ رہے تھے اتفاقاً ان کی ملاقات " سالم نامی " یہودی سے ہوگئی ۔ سالم اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر سرسید سے دستگیری کا طالب ہوا۔ سرسید نے عبرانی زبان کی تحصیل کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کی طلب سے زیادہ دے کر اسے اپنے پاس روک لیا اور اس سے عبرانی پڑھنی شروع کردی۔ حالی لکھتے ہیں :

" غازی پور میں انھوں نے سالم نامی ایک یہودی کو نوکر رکھا اور اس سے عبرانی پڑھنی شروع کی ۔" (۱)

دوسری جگہ سالم سے سرسید کی ملاقات اور اس سے استفادے کی تھوڑی سی روداد بھی ملتی ہے ۔ حالی لکھتے ہیں :

" سالم ایک یہودی صنعائی یمن کا رہنے والا غازی پور میں سرسید کے پاس آیا اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش کے لیے پھرا ہوں کہیں کوئی صورت نہیں نکلی۔ سرسید نے پوچھا کہ کیا تنخواہ لوگے ؟ اس نے دس یا پندرہ روپے کہے ۔ سرسید نے کہا کہ میں تم کو پچیس روپے مہینا دوں گا مجھے عبرانی سکھاؤ ۔ سرسید کے ایک دوست کہتے تھے کہ اس نے خوشی کے مارے بڑھ کر سرسید کی داڑھی چوم لی اور یہ کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو ۔ سرسید نے اس کو نوکر رکھ لیا ۔ مگر چوں کہ وہ مسرف اور آوارہ مزاج تھا اس لیے اس کو

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید "، محولہ بالا ، ج اول ، ص ۱۱۰

بقدر ضرورت دیتے رہے اور اس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے جب وہ وطن کو جانے لگا تو کئی سو روپے جو اس کا چڑھا ہوا تھا حساب کرکے اس کے حوالے کردیا۔" (۱)

حالی نے یہ نہیں لکھا کہ سرسید نے سالم سے کتنے دنوں عبرانی سیکھی تھی - لیکن ہم اس بات سے کہ اس کی باقی تنخواہ کئی سو روپے تھی جو اس کے حوالے کی گئی تھی - سالم کی روز مرہ ضروریات زندگی کے لیے اگر سرسید اسے پندرہ روپے ماہانہ دیتے ہوں - تو ہر ماہ دس روپے اس کے حساب میں جمع ہوجاتے ہوں گے - کم از کم دو سو روپے کی رقم جس پر "کئی سو روپے" کا اطلاق کیا جاسکے - بیس مہینوں میں جمع ہوتی ہے - اس لیے حالی کے بیان کی روشنی میں سالم سے سرسید کے استفادے کی مدت ایک سال آٹھ ماہ تو ضرور ہوتی ہے - ہمیں حالی یا کسی اور کے بیان سے یہ ٹھیک پتا نہیں چلتا کہ عبرانی زبان میں سرسید کی استعداد کا کیا عالم تھا - صرف اتنی بات یقینی ہے کہ وہ عبرانی زبان سے واقف ہوگئے تھے۔

حامد حسن قادری نے سالم سے سرسید کی ملاقات اور اس سے عبرانی زبان سیکھنے کے واقعے سے سرسید کے شوق طلب علم پر استدلال کیا ہے۔" (۲)

چند بالواسطہ اساتذہ

سرسید کے اساتذہ میں بعض تذکرہ نگاروں نے چند اور بزرگوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ بزرگ مولانا شاہ محمد اسحاق ، مولانا شاہ محمد یعقوب ، مولانا امام بخش صہبائی،

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۸-۵۰۷
حامد حسن قادری، "داستان تاریخ اردو، محولہ بالا، ص ۳۹۵
امداد صابری، "فرنگیوں کا جال"، دہلی: فاروقی پریس، ۱۹۳۹ع ، ص ۲۸۸

(۲) حامد حسن قادری، "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۹۵

مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا مملوک علی نانوتوی بیان کیے گئے ہیں۔ اس مبحث کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ان بزرگوں سے سرسید کے تلمذ کی روایات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

شاہ محمد اسحاق :

شاہ محمد اسحاق سے تلمذ کے بارے میں معاصرانہ روایت آخری بیان ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" سرسید نے شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے جانشین شاہ محمد اسحاق سے کسب فیض کیا۔" (۱)

ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ بات " موج کوثر" کے حوالے سے لکھی ہے۔ صاحب موج کوثر کا بیان ہے :

" ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۵ء تک جب وہ دہلی کی منصفی پر مامور تھے۔ انھوں نے تحصیل علم میں زیادہ ترقی کی۔ اس زمانے میں سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ ، شاہ عبدالعزیز کے جانشین محمد اسحاق اور مولانا قاسم نانوتوی کے استاد اور محسن مولانا مملوک علی نانوتوی کے نام لیے جاتے ہیں۔" (۲)

صاحب " موج کوثر" کاکو نے اپنی معلومات کے لیے" تراجم علمائے حدیث ہند" کا حوالہ دیا ہے لیکن صاحب تراجم نے کسی سند اور حوالے کے بغیر شاہ محمد اسحاق کے تلامذہ میں سرسید احمد خان کا نام بھی ٹانک دیا ہے۔ (۳) لیکن وہ اپنی دوسری

---

(۱) افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر" مولوی نذیر احمد ـــ احوال و آثار"، لاہور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء ، ص ۱۷۲

(۲) اکرام ، شیخ محمد ،" موج کوثر"، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۶ء، ص ۸۰

(۳) ابو یحییٰ امام خان نوشہروی،" تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا ، ص ۱۲۰

تصدیق " ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات " میں لکھتے ہیں :

" سرسید نے حدیث جناب الصدرالصدورشاہ محمد اسحاق سے پڑھی جس کے اثر سے انھوں نے کبھی رفع یدین علی الصدر اور آمین بالجہر ترک نہ کی ۔" (۱)

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ انھوں نے سرسید احمد خان کو مدرسہ رحیمیہ کے دور خامس کے تلامذہ اجل میں شمار کیا ہے ۔ مدرسہ رحیمیہ کا دور خامس وہ دور ہے جس میں شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب مسند نشین درس و تدریس تھے ۔ (۲)

لیکن یہاں بھی انھوں نے اپنی معلومات کے ماخذ کا کوئی حوالہ اور اپنی رائے کے حق میں کوئی سند پیش نہیں کی ہے ۔ یہ بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ اب سے سوا صدی پہلے کے بارے میں ان کی معلومات ذاتی ہیں ۔ جب کہ فاضل مصنف ہمارے دور کی ایک شخصیت ہیں اور ابھی حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے ۔ ایک اور بات جو فاضل مصنف کے بیان کو پایۂ استناد سے گرادیتی ہے وہ یہ ہے کہ سرسید کے جس عمل حق یعنی رفع یدین و آمین بالجہر کو انھوں نے شاہ محمد اسحاق سے استفادہ و تعلیم کا اثر و فیضان بتایا ہے ٹھیک یہی بات وہ شاہ مخصوص اللہ سے سرسید کے تلمذ کے ضمن میں بیان کرچکے ہیں ۔(۳)

~~ہماری رائے~~ گمان غالب ہے کہ سرسید شاہ اسحاق کے شاگرد نہیں ۔ سرسید کے اساتذہ میں جن سے تلمذ انھوں نے ذکرکیا ہے ۔ اتنی بڑی کوئی شخصیت نہیں ۔ اگر وہ شاہ اسحاق کے شاگرد ہوتے تو وہ اس شرف کا فخریہ اظہار کرتے اور حالی بھی اس سے

---

(۱) ابویحیی امام خان نوشہروی : " ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات "، چیچہ وطنی، ساہیوال (پنجاب) : مکتبہ نذیریہ، ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۰ء، ص ۳۱

(۲) ایضاً، ص ۱۱۲

(۳) ابویحیی امام خان نوشہروی : " تراجم علمائے حدیث ہند "، محولہ بالا، ص ۱۱۲

بے خبر نہیں ہوسکتے تھے۔ پروفیسر محمد ایوب قادری بھی اس بیان کو درست نہیں سمجھتے۔ وہ لکھتے ہیں :

" ایوبی امام خاں نوشہروی کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ انھوں نے حدیث شاہ محمد اسحاق سے پڑھی تھی۔" (۱)

صہبائی :

افتخار عالم مارہروی نے مولوی نذیر احمد دہلوی کی زبانی ایک روایت نقل کی ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید بھی دہلی کالج کے طالب علم اور صہبائی کے شاگرد تھے۔ افتخار عالم کے بقول مولوی نذیر احمد دہلوی نے فرمایا کہ " ......اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی کی جماعت میں منشی ذکاء اللہ حساب کی جماعت میں پیارے لال لنگروی کی جماعت میں تھے ۔ میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا۔" (۲) ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے ۔(۳) لیکن ان کا موضوع چوں کہ مولوی نذیر احمد تھے اس لیے اس روایت کے پہلے جزو کی صحت و عدم صحت کے بارے میں انھوں نے غور نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس روایت کا پہلا جزو تاریخی صداقت سے خالی ہے۔ سرسید اور صہبائی میں دوستانہ علاقہ تھا ۔ اس کا اعتراف سرسید نے کیا ہے اور حالی نے بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے ۔ سرسید نے صہبائی کے شاگرد مولانا فیض الحسن سہارن پوری سے استفادہ کیا تھا ۔ اس کا اعتراف انھوں نے کیا ہے ۔(۴) اگر سرسید

---

(۱) ایوب قادری، محمد، " سرسید احمد خاں اور وہابی تحریک"، " نگار" پاکستان، کراچی: ۱۹۷۱ء، سرسید نمبر، حصہ دوم، ص ۳۸۳

(۲) فرحت اللہ بیگ، مرزا، " مضامین فرحت "، لاہور : اتار کلی کتاب گھر، س ن حصہ اول، ص ۳۱

(۳) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر " مولوی نذیر احمد دہلوی ـــ احوال و آثار"، محولہ بالا، ص ۲۸

(۴) اقبال علی، سید " سفر نامہ پنجاب"، محولہ بالا، ص ۲۰۶

فیض الحسن کے استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے تو وہ واضح الفاظ میں اور زیادہ فخر کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ۔ اس لیے ~~معلوم ہوتا~~ حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ سرسید نہ تو کبھی دہلی کالج میں داخل ہوئے اور نہ وہ صہبائی کے شاگرد تھے۔

<u>آزردہ :</u>

مولانا حامدحسن قادری نے مفتی صدرالدین کے تلامذہ میں نواب یوسف علی خان والی رام پور، اور نواب صدیق حسن خان، قنوجی ثم بھوپالی کے ساتھ سرسید احمد خان کا نام بھی لکھا ہے ۔(۱) پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی تذکرہ علمائے ہند میں نیز " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) " میں مفتی صدرالدین آزردہ کے ذیل میں مفتی صاحب موصوف کے تلامذہ میں سرسید کا نام شامل کیا ہے ۔(۲) لیکن ہر دو قادری صاحبان نے اس کے لیے کوئی حوالہ یا سند پیش نہیں کی ہے ۔

تذکرہ علمائے ہند کے حوالے سے انوارالحسن شیرکوٹی نے بھی سرسید کو مفتی صاحب کا شاگرد لکھا ہے ۔(۳) ان کے علاوہ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے بھی مفتی صاحب کے تلامذہ میں سرسید کا نام لکھا ہے ۔(۴) لیکن ڈاکٹر صاحب کا بیان بھی حوالہ و سند سے معرٰی ہے ۔

سرسید نے جن اساتذہ سے تحصیل علمی کی ان میں سے بعض کا مرتبہ نہ صرف

---

(۱) حامد حسن قادری، " داستان تاریخ اردو "، محولہ بالا، ص ۲۱۲

(۲) ایوب قادری، محمد، " تذکرہ علمائے ہند "، محولہ بالا، ص ۲۳۸
ایوب قادری، محمد، " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) "، کراچی: محولہ بالا، حصہ اول، ص ۲۷۱

(۳) انوارالحسن شیرکوٹی، " انوارقاسمی ۔ سوانح عمری مولانا قاسم نانوتوی "، لاہور: ادارہ سعدیہ مجددیہ ۱۹۶۹ء، حصہ اول، ص ۸۲

(۴) مختارالدین احمد، ڈاکٹر، " تذکرہ آزردہ "، از مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۲ء، ص ۱۲

مفتی صاحب سے کم تھا بلکہ مولانا نورالحسن کاندھلوی اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری تو ان کے شاگرد تھے۔ سرسید نے ان سے تلمذ کا اعتراف کیا ہے ۔ اگر سرسید نے مفتی صاحب سے بھی شاگردانہ استفادہ کیا ہوتا تو وہ ضرور ان کے ترجمے میں اس کا اعتراف کرتے اور حالی سے بھی سرسید کی تعلیمی زندگی کا یہ اہم واقعہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔

اس لیے ~~مطلق قطعی بعد واضح~~ ہے کہ سرسید نے مفتی صدرالدین آزردہ سے شاگردانہ استفادہ نہیں کیا۔

مملوک علی :

کئی اہل علم نے مولانا مملوک علی نانوتوی کو بھی سرسید کا استاد بتایا ہے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم تمام بیانات نقل کرتے ہیں ۔ پھر ان کی علمی و استادی حیثیت پر بحث کریں گے ۔ مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں :

" سرسید احمد خان استاد اساتذہ الہند مولانا مملوک علی کے شاگرد ہیں اور مولانا مملوک علی نے شیخ رشید الدین سے علم حاصل کیا تھا اور وہ شاہ عبدالعزیز کے سکھکہ تھے۔ آپ نے شاہ صاحب سے طریقہ تحریر سیکھا اور اس میں کمال حاصل کیا۔ نیز شاہ عبدالقادر اور مولانا عبدالحی سے بھی پڑھا لیکن آپ بیشتر شاہ رفیع الدین کی خدمت میں رہے۔ الغرض سید احمد دہلوی جو علی گڑھ دارالعلوم کے بانی ہیں ولی اللہی ہیں۔" (۱)

آگے چل کر ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

" سید احمد دہلوی بانی جامعہ علی گڑھ، نذیراحمد دہلوی مترجم قرآن اور مولوی ذکا اللہ اور دوسرے نامور اہل علم کو بھی ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہے ۔ " (۲)

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، لاہور : سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۵۲ء، ص ۱۲ (حاشیہ)

(۲) ایضاً، ص ۲۱۶

شیخ محمد اکرام لکھتے ھیں :

" سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ ان میں امام الہند شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیز کے جانشین محمد اسحاق اور مولانا قاسم نانوتوی کے استاد اور محسن مولانا مملوک علی نانوتوی کے نام لیے جاتے ھیں۔" (۱)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ھیں :

" ۱۸۳۶ء سے جنوری ۱۸۵۵ء تک سرسید دھلی میں منصف کے عہدے پر فائز رھے ۔ قدیم دھلی کالج میں نذیر احمد کی طالب علمی کا زمانہ بھی یہی ھے ۔ خود ان کے ایک بیان سے معلوم ھوتا ھے کہ اسی زمانے میں وہ سرسید سے متعارف ھوئے تھے۔ دھلی کالج میں بعض اساتذہ خصوصاً مولانا صہبائی سے سرسید کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اسی عرصے میں انھوں نے نذیر احمد کے استاد عربی مولانا مملوک علی سے بعض کتابیں پڑھی تھیں۔" (۲)

ان افکار و آرا میں آخری رائے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی ھے لیکن انھوں نے یہ بات شیخ محمد اکرام کے حوالے سے کہی ھے ۔ شیخ صاحب موصوف نے شاہ مخصوص اللہ اور شاہ محمد اسحاق سے سرسید کے تلمذ کو " تراجم علمائے حدیث ہند " کے حوالے سے بیان کیا ھے اور مملوک علی سے سرسید کے تلمذ کے بارے میں انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا ۔ لیکن ھمیں یقین ھے کہ یہ بات انھوں نے مولانا عبیداللہ سندھی سے اخذ کی ھے ۔ اب لے دے کے مولانا سندھی کی رائے رہ جاتی ھے اس رائے پر محمد ایوب قادری نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ھے :

" مولانا عبیداللہ سندھی نے مولانا مملوک علی کے تلامذہ میں سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، اور مولوی ذکا اللہ کو بھی شامل کیا ھے ۔

---

(۱) اکرام، شیخ محمد " موج کوثر"، محولہ بالا ، ص ۸۰

(۲) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر " مولوی نذیر احمد دھلوی۔ احوال و آثار"، محولہ بالا ، ص ۱۵۳

اس سلسلے میں مولانا سندھی نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ غالباً آخرالذکر حضرات کو تو اس لیے اس فہرست میں شامل کرلیا ہے کہ یہ دونوں حضرات دھلی کالج کے تعلیم یافتہ ہیں۔ مگر معلوم نہیں سرسید کو کس طرح ان کا شاگرد لکھ دیا ۔ سرسید احمد خان تودھلی کالج کے طالب علم بھی نہیں رہے ۔ سرسید احمد خان نے " آثارالصنادید" ۱۸۴۶ء میں مرتب کی اور اس وقت مولانا مملوک زندہ تھے ۔ انھوں نے اس میں کہیں تلمذ کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ اسی طرح " حیات جاوید" میں مولانا حالی نے ابتدائی تعلیم کا حال کم و بیش سرسید احمد خان ہی کے الفاظ میں نقل کیا ہے ۔ وہاں بھی سرسید نے مملوک علی کو اپنے اساتذہ میں شمار نہیں کیا۔" (۱)

غالباً پروفیسر محمد ایوب قادری کی اسی رائے کی بنیاد پر ~~انوارالحسن~~ [انوارالحسن] شیر کوٹی نے بھی لکھا ہے کہ سرسید مولانا مملوک علی کے تلامذہ میں شامل نہیں ۔(۲) انھوں نے اس امر پر کوئی بحث نہیں کی کہ ایک مشہور روایت کے برخلاف یہ بات انھوں نے کیوں لکھی ؟

لیکن ہم مولانا عبیداللہ سندھی کے بیان کو محمد ایوب قادری کے اس تبصرے اور انوارالحسن کے مجرد اعلان کی بنیاد پر رد نہیں کرسکتے ۔ مولانا سندھی کی معلومات کا ماخذ ظاہر ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا ~~محمد~~ [محمود] احسن دیوبندی اور اس حلقے کے اور بزرگ ہوں گے جنھوں نے مولانا محمد قاسم نانوتوی سے استفادہ کیا تھا مولانا قاسم نانوتوی کا تعلیمی زمانہ وہی ہے جو سرسید کے عنفوان شباب کا ہے ۔ مولانا نانوتوی نے اس عہد کے اکابر اساتذہ مولانا مملوک علی اور مفتی صدرالدین آزردہ سے بھی تحصیل علمی کی تھی۔ مولانا مملوک علی سے ان کا قریبی رشتہ تھا اور سرسید

---

(۱) ایوب قادری، محمد، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، کراچی: ~~مکتبہ عثمانیہ~~ [illegible] ۱۹۶۶ء، ص: ۱۸۵

(۲) انوارالحسن شیرکوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، (استدراک ، ص: ج

ان کے استاد مفتی آزردہ کی صحبت و مجلس کے فیض یافتہ تھے۔ اس طرح مولانا سعد ھی کا ذریعہ معلومات خاص سرسید کے عہد اور ان کے گرد و پیش کی زندگی سے تعلق رکھتا ھے ۔ ان کا ذریعہ علم معروف ھے اور اصول درایت کے مطابق شہرت و قبول نے ان کی رائے کو مستند و معتبر بنادیا ھے ۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علمی تحقیق میں ہم جس قسم کے حوالے اور سند کے عادی ھیں اس قسم کی کوئی سند موجود نہیں ھے ۔

حرف آخر :

اگرچہ شاہ محمد اسحاق ، امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا مملوک سے براہ راست سرسید کا تلمذ ثابت نہیں لیکن ایسی صورت میں کہ سرسید نے ان علمائے اربعہ کے تلامذہ سے تحصیل علمی کی ھے ۔ انھیں ان کے تلامذہ کی فہرست سے کیونکر خارج کیا جاسکتا ھے۔ اگر سرسید نے بلا واسطہ ان حضرات سے استفادہ نہیں کیا تو وہ بیک واسطہ ان حضرات کے تلامذہ میں شامل ھیں۔

اب اساتذہ کے واسطے سے خانوادہ ولی اللہی سے سرسید کی نسبتوں پر ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہئے :

۱- شاہ غلام علی — وہ بزرگ ھستی جس کے مبارک ہاتھوں سے سرسید کے فکر و سیرت کے قصر عظیم الشان کی پہلی اینٹ رکھی گئی جو اصحاب ثلاثہ کی شاگرد۔

۲- نانا — امام الہند شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز کے ارادت کیش اور عقیدت مند خاندان کے ایک اہم فرد۔

۳- والدہ — شاہ عبدالعزیز کے شاگرد رشید شاہ غلام علی کے مرید ۔

۴- والدہ	شاہ عبدالعزیز کے عقیدت مند باپ کی بیٹی اور شاہ صاحب کے شاگرد رشید شاہ غلام علی کی مرید۔
۵- ماموں	شاہ عبدالعزیز کے معتقد خاندان کے ایک فرد اور ابتدا ہی میں شاہ غلام علی (تلمیذ رشید شاہ عبدالعزیز) کے مرید خاص، میر مفتی کے شاگرد۔
۶- حکیم غلام حیدر خاں	شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں کے شاگرد اور فیض یافتہ ۔
۷- نورالحسن کاندھلوی	اصحاب ثلاثہ کے نامور تلامذہ شاہ اسحاق، صدرالدین آزردہ ، فضل حق خیرآبادی کے شاگرد۔
۸- نوازش علی	شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور شاگرد شاہ محمد اسحاق کے شاگرد۔
۹- فیض الحسن	اصحاب ثلاثہ کے نامور تلامذہ میں سے مفتی صدرالدین آزردہ ، شاہ احمد سعید مجددی، آخوند شیر محمد اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد۔ نیز امام بخش صہبائی کے شاگرد۔ جو بیک واسطہ مولانا عبداللہ خاں علوی، شاہ عبدالعزیز کے نامور بھتیجے علامہ و شہید مولانا شاہ محمد اسمعیل کے شاگرد تھے -
۱۰- مخصوص اللہ	شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے بیٹے اور شاگرد۔
۱۱- مملوک علی	شاہ عبدالعزیز اور اصحاب ثلاثہ کے شاگرد مولانا رشید الدین خاں اور شاہ محمد اسحاق سے پڑھا۔
۱۲- تا ۱۴-	ان کے علاوہ شاہ اسحاق، آزردہ اور صہبائی کے نام آتے ہیں -تو اگرچہ سرسید ان کے براہ راست شاگرد نہیں لیکن ان حضرات ثلاثہ کو کے

تلامذہ سے انھوں نے استفادہ کیا ہے ۔ ان میں
سے اول الذکر دو حضرات بلاواسطہ اصحاب ثلاثہ
کے شاگرد ہیں اور آخر الذکر بہ دو واسطہ شاہ
عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں سے نسبت تلمذ
رکھتے ہیں۔

اس لیے اساتذہ کے واسطے سے سرسید خالصتاً ولی اللہی ہیں اور اس خانوادہ علمی کی چھاپ ان کے افکار اور سیرت پر نمایاں نظر آتی ہے ۔

===XXX===

علمی خدمات

سرسید کی شخصیت میں بڑی ہمہ گیری تھی ۔ ان کے اندر یہ خاص خوبی تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں ، انتظامی، سیاسی، علمی، فکری، تہذیبی، تعلیمی اور تصنیف و تالیف ، تحقیق اور غور و فکر کے مسائل پر ان کی اہمیت کے مطابق توجہ دیتے تھے اور کسی مسئلے کا کوئی معمولی پہلو اور غیر اہم جزو بھی ان کی توجہ و نظر سے محروم نہ رہتا تھا ۔ حالی کے بقول :

> "سرسید کی طبیعت ایسی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی کہ جو کام
> ان کو درپیش آتا تھا ۔ اس میں وہ ایسی دل چسپی ظاہر کرتے تھے کہ
> گویا وہی ان کا خاص کام اور ضروری فرض تھا۔" (۱)

اس کے باوجود ان کا خاص ذوق تصنیف و تالیف کا تھا۔ سرسید کو اللہ تعالی نے تصنیف و تالیف کا خاص ذوق ، صلاحیت اور ملکہ عطا فرمایا تھا۔ حالی نے خود ان کا قول نقل کیا ہے اور اپنے مشاہدے سے اس کی تصدیق بھی کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

> "ہر ایک کام کو وہ یکساں ذوق و شوق اور یکساں دل بستگی کے

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۹۰

ساتھ انجام دیتے تھے ۔ مگر خود ان کا یہ بیان تھا کہ جیسا تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ، ویسا اور کسی کام میں نہیں لگتا۔ اور فی الواقع ، جیسا کہ دیکھا گیا ہے ۔ رنج میں ، خوشی میں ، صحت میں ، بیماری میں ، خلوت میں اور جلوت میں اس مشغلے سے ان کا جی نہیں اکتاتا تھا۔" (۱)

سرسید احمد خان نے ایک بھرپور علمی اور تصنیفی زندگی گزاری۔ ان کی علمی عملی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے ان کی تصانیف کی کثیر تعداد دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔ پھر اگر ان کی تصانیف کی کثرت کے ساتھ ان کے علمی و تحقیقی معیار اور فکر و نظر کی رفعت و وسعت کا بھی خیال کیا جائے تو حیرت اور بڑھ جاتی ہے ۔ سرسید کی سی بھر پور عملی زندگی کے ساتھ علم و تحقیق کے اس معیار اور فکر و نظر کی ایسی بلندی کی مثالیں شاذ کے درجے تک ہی میں ہیں اور بالآخر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ـــ

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان کی تصنیفات میں ہر طرح کے علمی کام اور بے شمار موضوعات پر ان کی علمی تحقیقی اور فکری کاوشوں کے نمونے موجود ہیں۔ ہر طرح کے علمی کام سے میری مراد یہ ہے کہ ترجمہ ، تالیف ، ترتیب و تصحیح ، تصنیف و تخلیق ، تحقیق و تنقید کے نمونے موجود ہیں اور اگر ان کے موضوعات کا احصاء کیا جائے تو تاریخ و تذکرہ ، سیرت و سوانح ، تعلیم و تہذیب ، تمدن و معاشرت ، مذہب و سیاست ، اخلاق و فلسفہ ، قانون و طب ، ادب و لسانیات ، ہیئت و ریاضی اور سائنس ، تصوف ، جغرافیہ ، صحافت ، سفر نامہ ،

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین ؛ "حیات جاوید" ، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۳۹۰

وغیرہ موضوعات تو ان کی فتوحات علمی کے جلی عنوانات ہیں اور اگر ان کی ذیلی تقسیم بھی کی جائے تو بلا مبالغہ عنوانات کی تعداد سیکڑوں تک جا پہنچے گی ۔

سرسید کی علمی و تصنیفی خدمات کے موضوع پر متعدد اہل علم و نظر نے قلم اٹھایا ہے ان کی کاوشیں ہمارے سامنے ہیں ۔ ان میں سے بعض نے تاریخ وار اور بعض نے موضوع وار تصانیف کی تفصیل بیان کی ہے اور بعض نے سرسید کی زندگی کے مختلف ادوار کے لحاظ سے ان کی تصانیف اور علمی خدمات پر تبصرہ کیا ہے اس سلسلے میں چند مقالات خاص طور پر ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔

خواجہ محمد زکریا،(۱) محمد فرمان(۲) ، شیخ محمد اسمعیل پانی پتی (۳) ، اور حامد حسن قادری (۴) نے تاریخی ترتیب سے سرسید کی تصنیفات کی تفصیل دی ہے۔ اس سلسلے میں خواجہ صاحب اور قادری مرحوم کے مقالات خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ انھوں نے تصانیف پر نہایت بیش قیمت تبصرے بھی کیے ہیں۔ محمد فرمان کا مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے انھوں نے تاریخ وار تصانیف کی فہرست دی ہے پھر تین ادوار میں ان تصانیف کو تقسیم کرکے ان پر مجموعی حیثیت میں تبصرہ کیا ہے ۔ اس کے بعد تبین الکلام ، خطبات احمدیہ اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے مضامین پر

---

(۱) زکریا، خواجہ محمد، "اس دور کی نثر(سرسید وغیرہ)"،(مقالہ) ، " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۱ع (اردو ادب ، حصہ سوم) ، ج ۸، ص ۱۹-۱۰۹

(۲) محمد فرمان، " سرسید احمد خاں"،(مقالہ) " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ع ، (اردو ادب حصہ چہارم) ، ج ۹ ، ص ۱۰۵-۲۹

(۳) اسمعیل پانی پتی، محمد(مرتب) ، "مقالات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ع حصہ اول، ص ۳-۱

(۴) حامد حسن قادری، "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، "سرسید کی تصانیف" ص ۲۴۵-۲۴۳ " نگار" پاکستان، کراچی ۱۹۷۰ع ، سرسید نمبر، حصہ اول ، ص ۲۷-۱۷

تبصرہ کیا ہے اور آخر میں سرسید کے اسلوب تحریر کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ سید بشیر الدین (۱) اور حالی (۲) نے موضوع وار سرسید کی تصانیف کا تعارف کرایا ہے۔ سید بشیرالدین نے مذہب، تصوف، تاریخ و سیاست، قانون، سائنس، سوانح، تعلیم، اخبار و رسائل، ادب، اور سفرنامہ کے عنوانات کے تحت سرسید کی تصانیف کی فہرست مرتب کردی ہے۔ جب کہ حالی نے مذہبی، علمی اور تاریخی تصنیفات کے عنوانات کے تحت تین حصوں میں ان کی تمام اہم اور مفصل تصانیف کو مختصر اور جامع تعارف کے ساتھ مرتب کردیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ (۳) اور قاضی احمد میاں جوناگڑھی (۴) نے سرسید کی زندگی کے مختلف ادوار قائم کرکے سرسید کی تصنیفات کی تفصیل دی ہے اور ان کی علمی خدمات پر تبصرہ کیا ہے۔ اس میں سید صاحب نے اجمال اور قاضی صاحب نے نہایت تفصیل سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مقالہ (۵) نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے نہایت دقت نظر سے ۱۸۳۷ء سے جو کہ سرسید کی علمی زندگی کا سال آغاز ہے،

---

(۱) بشیرالدین، سید: "سرسید احمد خاں کی تصنیفات و تالیفات"، (مقالہ)، "برگ گل"، (میگزین وفاقی اردو کالج)، کراچی: ۶۹-۱۹۶۸ء، سرسید نمبر، ص ۷۷-۱۵۲

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین: "حیات جاوید"، محولہ بالا، ضمیمہ نمبر ۲ (سرسید کی تصنیفات کی فہرست)، ص ۶-۲

(۳) عبداللہ، ڈاکٹر سید: "سرسید احمد خاں"، (مقالہ): اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور: دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۶ء، ج ۲، ص ۲۲-۱۱۶

(۴) اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں: "سرسید کا علمی کارنامہ"، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۳ء

(۵) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: "جدید اردو ادب کا بانی" (مقالہ): "نگار" پاکستان، کراچی: ۱۹۷۱ء، سرسید نمبر، حصہ دوم، ص ۲۰۵-۱۸۷

۱۸۹۸ع یعنی سال وفات تک چار ادوار میں ان کی تمام تصانیف کو تقسیم کیا ہے۔ صدیقی صاحب چوں کہ ایک ادیب ، ماہر لسانیات اور نقاد ہیں اس لیے انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق اردو ادب میں سرسید کا مقام متعین کیا ہے ۔ سرسید کے بارے میں ان کی رائے کا اظہار ان کے مقالے کے عنوان "جدید اردو ادب کا بانی" ہی سے ہوجاتا ہے ۔ اسی طرح علی محسن صدیقی (۱) ڈاکٹر سید معین الحق (۲) اور ڈاکٹر محمود حسین (۳) چوں کہ تاریخ کے محقق و نقاد ہیں اس لیے انھوں نے سرسید کی تاریخی تصانیف کو اپنے نقد و نظر کا موضوع بنایا ہے ۔ اور سرسید کی تاریخی مخطوطات پر تبصرہ کیا ہے ۔

ان تمام کاوشوں کی قدر اور اہل قلم کی گرامی مرتبت شخصیات کے احترام کے باوجود وضاحت کرنا ضروری ہے کہ یہ تمام بہت سرسری تھیں ہیں اور سرسید کی علمی فتوحات اور ان کے قلم کی بادشاہت کی آخری حدوں اور فضل و کمال کی بے پناہی کا ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکا۔

سرسید کی تصنیفات کی اس تقسیم و ترتیب کے علاوہ ایک اور ترتیب بھی ہوسکتی ہے جس سے ان کے کاموں کی نوعیت اور مقاصد کا بڑی خوبی سے اظہار ہوجاتا ہے :-

۱- تراجم و تالیفات : اس عنوان کے تحت سرسید کی تمام ایسی کتابوں کو جمع کیا جائے جو یاتو کسی کتاب کا ترجمہ تھیں یا ان کا بنیادی مواد کسی ایک یا کئی تصانیف سے حاصل کیا گیا تھا مثلاً "

---

(۱) علی محسن صدیقی ، " سرسید کی تاریخی تصنیفات " (مقالہ) ، " برگ گل" محولہ بالا ، ۱۹۶۸-۶۹ء ، ص ۷۷-۱۵۲

(۲) معین الحق ، ڈاکٹر سید ، " سرسید کے علمی و ادبی کارنامے" ، " برگ گل" ، محولہ بالا ، ۱۹۶۸-۶۹ء ، ص ۲۰-۱۱۳

(۳) محمد حسین ، ڈاکٹر ، " سرسید بحیثیت مورخ" ، " برگ گل" ، محولہ بالا ، ۱۹۶۸-۶۹ء ، ص ۵۱-۱۲۷
" نگار" پاکستان ، محولہ بالا ، ۱۹۷۱ء ، حصہ دوم ، ص ۸۲-۱۸۲

" جلاء القلوب بذکر المحبوب " ، " تحفہ حسن"، راہ سنت در رد بدعت"،

" ترجمہ کیمیائے سعادت (۱۸۵۳ع)"، " تسہیل فی جرالثقیل(۱۹۴۴ع)"،

" فوائد الافکار فی اعمال الفرجارؒ(۱۸۶۴ع)"، " انتخاب الاخوین(۱۸۳۱ع)"،

ترجمہ فیصلہ جات صدر شرقی و صدر غربی (۱۸۳۹ع)"، رسالہ علاج

ہیضہ (۱۸۶۸ع)"۔

۲- تصنیفات و تحقیقات :- اس سلسلے میں سرسید کی وہ کتابیں آتی ہیں گی

جن کی حیثیت مستقل تصنیف کی ہے ۔ ان تصنیفات کے موضوعات کی

علمی و تاریخی اہمیت کے پیش نظر سرسید نے قلم اٹھایا تھا مثلاً

" آثارالصنادید(۱۸۴۷ع "، " تاریخ ضلع بجنور(۱۸۵۷ع)"، " سیرت فریدیہ

(۱۸۶۴ع)"۔ اسی سلسلے میں ان تصنیفات کا ذکر بھی کیا جانا

چاہئے جن کی تصنیف و تحریر کا سبب خواہ کوئی اعتراض یا کوئی

وضاحت ہو لیکن ان کی حیثیت علمی اور مستقل تصنیف کی ہو جیسے

" الخطبات الاحمدیہ فی العرب و السیرۃ المحمدیہ (۱۸۸۷ع)" ،

" التحریر فی اصول التفسیر"۔

۳- تنقیدات و ایرادات :- وہ تصنیفات جو کسی خاص خیال اور رائے کی

تردید میں سرسید کے قلم سے نکلیں مثلاً" رسالہ اسباب بغاوت ہندکا

(۱۸۵۷ع) " ، ہنٹر پر ہنٹر(۱۸۷۱ع)"، " النظر فی بعض مسائل

الامام محمد غزالی(۱۸۸۰ع)"، " ہندوستان کا طریقہ تعلیم(۱۸۷۰ع)"۔

۴- مسائل و مباحث :- وہ تصانیف جو کسی خاص مسئلے میں پیدا ہوئے لوگوں

کے غلط خیال کی اصلاح اور لوگوں کی تعلیم و ہدایت کے نقطہ نظر سے

لکھی گئیں ۔ ایسی تصنیفات میں " کلمۃ حق"، " نمیقہ "،

"قول متین در ابطال حرکت زمین"، " احکام کتاب (طعام) اہل کتاب (۱۸۶۸ء)"،

" تحقیق لفظ نصاریٰ (۱۸۵۹ء)"، وغیرہ (کا) شمار ہوگا۔

۵- __تفاسیر و ترتیبات :-__ ایسی تصانیف جن کی علمی، تاریخی، مذہبی اہمیت کے پیش نظر یا کسی اور مقصد کے لیے مرتب کیا گیا یا ان کی تفسیر لکھی گئی ۔ اس سلسلے میں " آئین اکبری (۱۸۵۷ء)"، اور " تاریخ فیروز شاہی (۱۸۶۲ء)"کی تصحیح و ترتیب اور " انجیل و قرآن کی تفاسیر"، تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل ~~علیہ~~ (علی ملۃ) الاسلام (۱۸۶۲ء)"، اور " تفسیرالقرآن (۱۸۸۰ء)" کا شمار کیا جائےگا۔

۶- __مضامین و مقالات :-__ اس ضمن میں سرسید کے ان مضامین و مقالات کا ذکر کیا جانا چاہئے جو" سید الاخبار" (،) "علی گڑھ ~~سائنٹفک سوسائٹی گزٹ~~ (انسٹی ٹیوٹ گزٹ)"، " تہذیب الاخلاق"،یا کسی اور اخبار یا رسالے میں شائع ہوئے تھے۔

ایسے مضامین و مقالات کو عنوانات بالا کے ضمن میں بھی مضامین و مباحث کی مناسبت سے بیان کیا جاسکتا ہے ۔ اس لیے کہ ان کے بہت سے مضامین بنیادی طور پر ان کی تفسیر یا کسی اور تصنیف کا حصہ ہیں ۔ جیسے ان کے تقریباً تمام تفسیری مضامین ان کی" تفسیرالقرآن " کے مختلف مباحث ہیں۔ ~~ماٰثر~~ (ان) کا مضمون سلسلۃ الملوک کہ " آثارالصنادید" کا ایک جزو ہے ۔ ~~لکی~~ (ان) میں سے بیشتر مضامین " تہذیب الاخلاق" میں بھی شائع ہوئے اور الگ کتابچوں کی صورت میں بھی بڑی بھاری پر ان کی اشاعت ہوئی ۔ بلا شبہ ان مضامین و مباحث کی بڑی اہمیت ہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مستقل اور علاحدہ تصنیف نہیں ہیں بلکہ
بلکہ وہ ان کی تفسیر، یا کسی اور کتاب ہی کا حصہ ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد سرسید کی تصنیفات کو ایک منصوبے کے تحت مجلس ترقی ادب نے شائع کرنا شروع کیا ہے اس سلسلے میں اب تک سولہ جلدوں میں مقالات ۔ اس میں " تہذیب الاخلاق " ، " ~~سائنٹفک~~ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ " کے متفرق مضامین اور سرسید کی متعدد مستقل تصنیفات شامل ہیں، دو جلدوں میں " مکاتیب سرسید " ، سرسید کا " سفر نامہ پنجاب " " خطبات " وغیرہ شائع ہوچکی ہیں۔

چوں کہ شاہجہاں آباد کے لوگوں کا تذکرہ جو " آثارالصنادید " کے آخر میں شامل تھا ہمارا اہم خاص ماخذ ہے اس لیے آئندہ صفحات میں اس کے زمانہ تصنیف تک کی علمی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا ۔

سید الاخبار :

سرسید کی علمی و صحیفی زندگی کا آغاز " سید الاخبار " میں مضمون نگاری سے ہوتا ہے ۔ یہ اخبار سرسید کے بڑے بھائی سید محمد نے ۱۸۳۷ء میں دلی سے جاری کیا تھا اور سرسید چوں کہ بچپن سے خاندان میں " سید " کے عرف سے مشہور تھے اس لیے ان کی نسبت سے بڑے بھائی نے اس کا نام " سید الاخبار " رکھا تھا ۔ حالی لکھتے ہیں :

> " سرسید کی ابتدائی تحریریں غالباً " سید الاخبار " میں درج ہونی شروع ہوئی تھیں ۔ جس کو ان کے بڑے بھائی سید محمد خان نے ۱۸۳٦ء یا ۱۸۳۷ء میں اس وقت جاری کیا تھا جب کہ سرسید کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی ۔ " (۱)

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، حصہ دوم، ص ۹۸-۳۹۷

اس عبارت کے حاشیے میں حالی نے اخبار کے نام کی وجہ تسمیہ بھی بیان کردی ہے حالی لکھتے ہیں :

" چوں کہ سید احمد کا عرف اس زمانے میں " سید" تھا اور ان کے بھائی کو ان سے بہت محبت تھی اس لیے اخبار کا نام ان کے عرف کے لحاظ سے " سیدالاخبار" رکھا تھا۔ (۱)

حالی کے بیان سے جو " سیدالاخبار" کے متعلق واحد ماخذ ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے فتح پور چلے جانے اور ان کے بڑے بھائی کے " ہنگام " کی مصنفی پر چلے جانے کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا تھا۔ سید محمد کے انتقال کے بعد جب سرسید فتح پور سے تبادلہ کراکے فروری، ۱۸۴۶ء میں دہلی آئے تو انھوں نے اسے دوبارہ زندہ کیا۔ حالی کے بیان کئے سے اخبار کے دوبارہ احیا کے پس منظر پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ حالی لکھتے ہیں :

" سرسید ابتدا سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے۔ خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض رہتے تھے ۔ لہذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو ۔ " سیدالاخبار" جو ان کے بھائی کا جاری کیاہوا اخبار تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارات دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کرکے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

" سیدالاخبار" کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد کر رکھا تھا ۔ مگر زیادہ تر سرسید خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے ۔ مگر یہ اخبار ایک مدت جاری رہ کر بند ہوگیا مگر عمارتوں کی تحقیق نہایت محنت اور عجلت کے ساتھ برابر جاری رہی ۔" (۲)

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین،" حیات جاوید"، محولہ بالا ، حصہ دوم، ص ۳۹۷

(۲) ایضاً، حصہ اول ، ص ۵۲-۵۳

پروفیسر شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے کہ " سید الاخبار" میں ایسے مضامین خاص اہتمام سے شائع ہوتے تھے جن میں تاریخی مسائل پر بحث ہوتی تھی۔(۱)

جام جم :

" سید الاخبار" میں مضمون نگاری کے آغاز کے بعد ان کی پہلی علمی کاوش " جام جم" کے نام سے منصۂ شہود پر آئی ۔ یہ کتاب ۲۵ مئی، ۱۹۳۹ء کو مکمل ہوئی تھی لیکن شائع ۱۹۳۰ء میں ہوئی ۔ اس میں جدولوں کی شکل میں امیر تیمور سے لے کر سراج الدین بہادر شاہ ظفر تک تینتالیس بادشاہوں کے بارے میں ضروری معلومات کو مرتب کیا گیا ہے۔ جن عنوانات کے تحت یہ معلومات مرتب کی گئی ہیں ، وہ یہ ہیں :

> " نام بادشاہ، نام پدر، نام مادر، قوم، سال ولادت، محل جلوس، عمر بوقت جلوس، سال جلوس، تاریخ جلوس، مدت سلطنت، سکہ ، مدت عمر، سال وفات ، تاریخ وفات ، لقب بعد وفات ، مدفن، اور کیفیت "(۲)

ان سترہ عنوانات کے تحت ہر بادشاہ کے بارے میں جو بنیادی اور اہم معلومات جمع کی گئی تھیں ان کی افادیت آج تک مسلم ہے ۔ اس رسالے کی تالیف میں سرسید

---

(۱) شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، محولہ بالا ، ج ۸، ص ۵۱

(۲) اسماعیل پانی پتی، محمد ،(مرتب) ، " مقالات سرسید" لاہور : ۱۹۶۵ء، ج ۱۲، ص ۲ (تمہید)
شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، " جام جم"، (مقالہ) ، " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، ج ۱۲، ص ۳۶ تا ۱۳
زکریا، خواجہ محمد ، " اس دور کی نثر (سرسید وغیرہ) "، (مقالہ) ، " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص ۱۱۰

نے جن کتابوں سے استفادہ کیا تھا خاتمۂ رسالہ پر ان کی طویل فہرست درج کردی ہے۔ اس عمل سے سرسید کے کلیتہً تاریخ و تحقیق کے ذوق اور سائنٹی فک نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے ۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ از اول تا آخر ان جدولوں کی مکمل خانہ پُری کی گئی ہے ۔ بہت سی معلومات کلیتہً تک سرسید کی رسائی نہیں ہوسکی۔ سرسید نے اس نقص کا صاف اعتراف کیا ہے ۔ اس پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نام مادر، مدت عمر، سال وفات ، تاریخ وفات ، لقب بعد وفات ، مدفن وغیرہ کے خانوں میں ندارد یا فتہ نہ شد ، دست ندارد ، وغیرہ کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر اس نقش سے سرسید کے ذوق ادبی کا پتا چلتا ہے ۔ مثلاً سکندر شاہ عرف احمد خان کی تاریخ وفات کے خانے میں لکھتے ہیں :

" چشم در آرزوئے دیدار تاریخ وفاتش ماند" (۱)

یہ کتاب سرسید کی ابتدائی علمی کاوشوں میں سے ہے ۔ اس وقت تک مسلمانوں کی علمی زبان چوں کہ عام طور پر فارسی تھی ، اس لیے سرسید نے اسے فارسی زبان میں مرتب کیا تھا۔ مدت کے بعد یہ نایاب رسالہ لاہور سے سرسید کے مقالات کے سلسلے میں شامل کرکے شائع کردیا گیا ہے ۔ (۲)

<u>انتخاب الاخوین :</u>

اسی زمانے میں جب کہ انھوں نے " جام جم " کے نام سے رسالہ مرتب کیا، ان کی دوسری تالیف " انتخاب الاخوین" کے نام سے دنیا کے سامنے آئی ۔ سرسید نے دیوانی قوانین کا یہ انتخاب ۱۸۴۰ء میں جب کہ انھوں نے منصفی کا امتحان دیا تھا مرتب کیا تھا۔

---

(۱) " جام جم" (مقالہ) " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، ج ۱۲، ص ۳۶-۱۳

(۲) ایضاً، ج ۱۲، ص ۳

حالی نے اس کی ترتیب و اشاعت کی بھی روداد بیان کردی ہے - وہ لکھتے ہیں :

" اس زمانے میں انھوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ اس غرض سے تیار کیا کہ وہ عہدہ منصفی ملنے کا ایک ذریعہ ہو۔ جب وہ خلاصہ تیار ہوچکا تو صاحب کمشنر نے اس کو گورنمنٹ میں پیش کیا اور سرسید کے لیے عہدہ منصفی کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے اس پر یہ حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی ہو سید احمد خان کو اس پر مقرر کیا جائے - لیکن ابھی ان کو یہ عہدہ ملنے نہ پایا تھا کہ عہدہ منصفی کے لیے قواعد امتحان جاری ہوگئے - صاحب کمشنر نے ان کو امتحان دینے کی ہدایت کی۔ انھوں نے خود بھی امتحان کی تیاری کی اور اپنے بڑے بھائی سید محمد خان اور ماموں زاد بھائی حاتم علی خان کو بھی امتحان دینے پر آمادہ کیا۔ سید محمد خان نے پہلی دفعہ قانون کی طرف کم توجہ کی تھی اس لیے وہ دوسرے سال امتحان میں پاس ہوئے مگر سرسید اور حاتم علی خان نے پہلی ہی بار امتحان دے کر ڈپلوما حاصل کرلیا -

امتحان کے بعد سرسید نے وہ خلاصہ چھاپ دیا اور اپنے بڑے بھائی کا نام بھی اس میں شامل کرکے اس کا نام" انتخاب الاخوین" رکھا۔ اس کو اس زمانے کے بعض ظریف دونوں بھائیوں کے اتحاد کی وجہ سے " دم الاخوین" کہتے تھے۔ خان بہادر منشی غلام نبی خان اور میرے بھائی (۱) مرحوم کہتے تھے کہ " یہ انتخاب منصفی کے امیدواروں کے لیے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبے میں شائع ہوگیا - لوگوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے امیدوار اسی کی بدولت منصف ہوگئے -" ۱۸۸۳ء میں انجمن اسلامیہ ، لاہور نے جو سرسید کو ایڈریس دی تھی اس میں بھی سرسید کے اس احسان کا ذکر کیا تھا۔" (۲) یہ رسالہ ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ (۳)

---

(۱) " میرے بھائی" سے مراد حالی کے برادر بزرگ خواجہ امداد حسین مرحوم ہیں۔ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔ " کلیات حالی"، محولہ بالا، ۱۲؎ صص ۲، ۱۲ و ۲۷-۳۳۵

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا ، حصہ اول ، ص ۵۰

(۳) قریشی، پروفیسر محمد ، " سرسید احمد خان"(مقالہ) ، " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، محولہ بالا ، ج ۹ ، (اردو ادب، چہارم) ، ص ۴۳ اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد ، " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، حصہ اول ، (مقدمہ) ، ص ا

تسہیل فی جرالثقیل :

" جام جم " اور " انتخاب الاخوین" دونوں رسالے سرسید نے فتح پور سیکری میں ملازمت کے زمانے میں تالیف کیے تھے۔ " تسہیل فی جرالثقیل " بھی اسی زمانے کی تالیف ہے ۔ یہ علم جرثقیل کے متعلق ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے جسے حکیم ابوزر نامی علم جرثقیل کے ایک فاضل نے جو یمن کا رہنے والا تھا، عربی زبان میں تصنیف کیا تھا۔ بعد کے ایام میں ایران کے ایک فاضل اجل ابوعلی نے اس کتاب کا خلاصہ فارسی زبان میں مرتب کیا اور " معیار العقول" اس کا نام رکھا۔ اس فارسی خلاصے کا ذکر ایک مرتبہ سرسید نے کپتان جارج ولیم ھملٹن اور پادری جان جیمس مور سے کیا، جن کو اس علم سے خاص دل چسپی تھی تو ان دونوں نے سرسید سے اس رسالے کے اردو ترجمے کی فرمائش کی ۔ چنان چہ انھوں نے ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں اس کا اردو میں ترجمہ کیا اور اپنے استاد مولوی نورالحسن کی اصلاح اور درُستی کے بعد آگرے کے یتیموں کے چھاپے خانے میں ۱۸۴۴ء میں چھاپ کر شائع کیا۔ اس رسالے میں بھاری چیزوں کے اٹھانے، سخت چیزوں کے چھوڑنے اور موٹی چیزوں کو دبانے کے لیے مشینیں بنانے کی ترکیبیں اور ان کے استعمال کے قاعدے بتائے گئے ہیں۔" (۱)

یہ تمام تفصیلات سرسید نے اس رسالے کے آغاز میں تحریر کی ہیں۔ یہ رسالہ اگرچہ فارسی ترجمہ ہے لیکن سرسید نے لفظی ترجمے کی بجائے مفہوم کے بیان اور مطلب کی وضاحت کو ضروری سمجھا ہے اس لیے اس کی زبان ترجمہ کی زبان کے مقابلے میں تصنیف اور تخلیق کی زبان کے زیادہ قریب ہے ۔ چوں کہ یہ رسالہ سرسید کی ابتدائی تالیفات میں سے ہے اس لیے نمونہ تحریر کے طور پر اس کے آغاز کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں :

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید"، محولہ بالا، حصہ شانزدہم، (تمہید)، ص ۳

"آدمی کو لازم ہے کہ ہر طرح اپنے پروردگار کی تعریف کرے جس نے ایک چٹکی خاک سے طرح بطرح کی صورتیں بنائیں اور اپنے بندوں کو دین کی سیدھی سیدھی راہیں بتائیں اور اللہ کی رحمت ہو اس کے پاک پیارے محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ اس کے سبب سے ہم گمراہوں نے دوزخ کی آنچ سے نجات پائی اور پروردگار کی امرکی نے راہ دکھائی۔

اللہ اور اللہ کے رسول کی حمد اور نعت کے بعد سید احمد حسنی الحسینی المخاطب بہ خطاب جواد الدولہ سید احمد خان بہادر عارف جنگ فتح پور سیکری ضلع آگرہ کا منصف سب بزرگوں اور عقل مندوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ جرثقیل کا علم بہت عجیب و غریب ہے - ساری دنیا کے کارخانے اسی پر موقوف ہیں - حق یہ ہے کہ اگر یہ علم نہ ہوتا تو دنیا کا کارخانہ نہ چلتا اور یہ علم بہت تھوڑا ہے - کل اصل اصول اس کے پانچ کلیں ہیں اور باقی سب صورتیں انہیں پانچ کلوں کے توڑ جوڑ سے نکلتی ہیں۔" (۱)

اب یہ رسالہ لاہور سے "مقالات سرسید" کے سلسلے میں شامل کرکے چھاپ دیا گیا ہے - (۲)

ترجمہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار:

"پرکار متناسبہ" کے اعمال میں سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین کا فارسی میں ایک رسالہ تھا جسے سرسید نے کپتان جارج ولیم ہملٹن اور پادری کلا جیمس مور کے ایما پر ترجمہ کرکے ۱۸۳۶ء میں چھاپہ خانہ "سید الاخبار" دہلی سے شائع کردیا تھا۔ اس رسالے کے تعارف کے لیے اسی پر ایک مختصر سا مقدمہ بھی ہے جس میں اصطلاحات کے ترجمے کے بارے میں سرسید نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے - سرسید لکھتے ہیں :

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) "مقالات سرسید"، محولہ بالا، حصہ شانزدہم، ص ۷۶
(۲) ایضاً، حصہ شانزدہم، صص ۷۵-۹۶

" اس رسالے میں بعضے بعضے عربی کے الفاظ جو اس علم میں مستعمل ہیں، آئیں گے - ان کا ترجمہ اردو میں کرنا مناسب نہ جانا۔ اس واسطے کہ وہ الفاظ بہت مشہور ہیں - اور اس سے قطع نظر آدمی کو لازم ہے کہ جس علم کو پڑھے اس کی اصطلاحات سے واقف رہے - اس لیے بعضے الفاظ کی تشریح اور پرکار متناسبہ کی صورت لکھتے ہیں -" (۱)

اس کے بعد سرسید نے سطح ، خط ، دائرہ ، محیط ، مرکز ، نقطہ، قطر ، قوس ، وتر ، سہم، جیب اور زاویہ — اصطلاحات کی تشریح کی ہے پھر پرکار متناسبہ کی شکل و صورت کی وضاحت کی ہے - پھر اس کے اصال کا تذکرہ کیا ہے - جیسا کہ مقدمے کی ابتدائی سطروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ~~اس علم~~ اصطلاحات کی تشریح تک سرسید کی تحریر ہے اس کے بعد ان کے نانا خواجہ فریدالدین کی تحریر کا ترجمہ ہے - لیکن یہ ترجمہ بھی ترجمے کے مقابلے میں تخلیق کی خوبیوں کا حامل ہے - سرسید کی زبان اور طرز تحریر کا اندازہ مقدمے کی ابتدائی سطروں سے جو اوپر نقل کی گئی ہیں، بخوبی ہوجاتا ہے -

سرسید کے مقالات میں یہ رسالہ بھی شامل کرلیا گیا ہے -(۲)

مولانا حامد حسن قادری (۳) اور شیخ محمد اسمعیل پانی پتی (۴) نے اس کا سال اشاعت ۱۸۴۶ع تحریر کیا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے -

اسی زمانے میں جب کہ سرسید فتح پور سیکری سے تبدیل ہوکر دہلی آگئے تھے

---

(۱) اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد (مرتب) ، " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، حصہ شانزدہم، ص ۱۰۰-۹۹ اور تمہید ، ص ۲-۳

(۲) ایضاً ، (ترجمہ — " فوائد الافکار فی اعمال الفرجار) ،حصہ شانزدہم، ص ۲۰۶-۹۷

(۳) حامد حسن قادری، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۳۱۶

(۴) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، حصہ اول ، (مقدمہ) ، ص ۳

انھوں نے " آثار الصنادید " کی تحقیق و تصنیف کا آغاز کیا لیکن چوں کہ " آثارالصنادید " اس تذکرے کی تالیف اور مقالہ کا موضوع تحقیق سے خاص تعلق رکھتی ہے اس لیے اس پر مفصل تفصیل کے ساتھ آخر میں بحث کی جائے گی ۔ البتہ سرسید کی دوسری تالیفات و تصنیفات جو سرسید کے علمی کاموں میں خاص اہمیت رکھتی ہیں اور جن سے سرسید کے فکری نشو و نما اور ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ساتھ ہی جو سرسید کے مکتبہ فکر کو سمجھنے اور متعین کرنے میں مدد و معاون ہیں، ان پر بطور خاص نظر ڈالنا ضروری ہے کہ اجمالی تعارف ۔ آئندہ مبحث " علمی زندگی اور فیضان ولی اللہی " ایسی کتابوں کے تذکروں و تعارف پر مشتمل ہے ۔

===XXX=====

علمی زندگی اور فیضان ولی اللہی

جلاء القلوب بذکر المحبوب :

سرسید کا یہ پہلا رسالہ ہے جو انھوں نے کسی مذہبی مسئلے پر لکھا۔ یہ رسالہ ١٢٥٨ھ/١٨٤٢ء میں تالیف ہوا اور رمضان، ١٢٥٩ھ / اکتوبر، ١٨٤٣ء میں سید الاخبار پریس دہلی سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ (١) قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے اس کا سال تالیف ١٢٥٥ھ/١٨٣٥ء لکھا ہے ۔(٢) جو درست نہیں۔ حالی(٣)

---

(١) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد، " مقالات سرسید "، محولہ بالا، حصہ ہفتم، ص ٣
زکریا، خواجہ محمد، " اس دور کی نثر (سرسید وغیرہ) (مقالہ) " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند " محولہ بالا، ج ٨، اردو ادب (سوم)، ص ١١٠

(٢) اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں، " سرسید کا علمی کارنامہ "، محولہ بالا، ص ٣٣

(٣) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، محولہ بالا، ضمیمہ نمبر ٢، سرسید کی تصنیفات کی فہرست، ص ٢

اور حامد حسن قادری(۱) نے اس کا سال تالیف ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء لکھا ہے - سرسید نے یہ رسالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، وفات ، معجزات اور دیگر حالات کے بیان میں اس لیے لکھا تھا کہ مولود کی مجلسوں میں پڑھنے کے لیے جتنے رسالے ملتے تھے ان میں صحیح کم روایتیں بہت کم تھیں- سرسید نے ~~اس رسالے میں~~ اس زمانے کے خیالات کے موافق صحیح روایتوں سے یہ رسالہ تالیف کیا تھا- (۲) رسالے کے خاتمے میں سرسید نے اس کے ماخذ کی نشان دہی بھی کردی ہے - لکھتے ہیں :

> " اس رسالے کو سرورالمحزون سے ماخوذ کیا اور چند مطالب مدارج النبوۃ سے اس میں بڑھائے اور بعض بعض باتیں اصل رسالے میں سے کم کردی گئیں -" (۳)

چنانچہ ۱۸۷۸ء میں جب سرسید اپنی تصانیف کی ترتیب پر متوجہ ہوئے تو یہ رسالہ جو انھوں نے سلسلہ " تصانیف احمدیہ " میں شامل نہیں کیا البتہ اس پر ایک مختصر ریویو کرکے سلسلہ تصانیف میں اس رسالے کی جگہ شامل کردیا- اس ریویو میں سرسید نے اس رسالے کے سبب تالیف پر بھی روشنی ڈالی ہے ، اس کے ماخذ کی نشان دہی بھی کردی ہے اور اس کے بارے میں اپنی آخری رائے بھی نقل کردی ہے - وہ لکھتے ہیں :

> " یہ کتاب اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب کہ لوگوں کی دیکھا دیکھی مولود کی مجلس کا دل میں بہت شوق تھا ....اسی زمانے میں بہت سے رسالے مولود کے دیکھے اس وقت کے خیال کے مطابق بھی ان میں ایسی باتیں معلوم ہوئیں جو ٹھیک نہ تھیں .... اس لیے دل میں آیا کہ ایک مختصر

---

(۱) حامد حسن قادری: " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۳۱۳

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید "، محولہ بالا ، حصہ اول ، ص ۵۱ وضمیمہ نمبر ۲ ، سرسید کی تصنیفات کی فہرست، ص ۲

(۳) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، حصہ ہفتم، ص ۳۰

رسالہ جو بطور بیان حالات و واقعات کے ہو اور جس میں نامعتبر باتیں نہ ہوں لکھا جائے .... بڑا ماخذ اس رسالے کا سرور المحزون ہے - جس کو شاہ ولی اللہ صاحب نے تصنیف کیا تھا اور کچھ باتیں مدارج النبوۃ سے جس میں ہزاروں لغو اور نامعتبر کہانیاں مندرج ہیں، لی گئی تھیں - اس زمانے میں تو اس رسالے کے لکھنے پر بڑا فخر تھا - مگر اب اس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس میں بھی بہت سی نامعتبر بلکہ لغو باتیں ہیں-"(۱)

جلاء القلوب کی تحریر کا نمونہ یہ ہے :

" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول کے مہینے میں پیر کے دن پیدا ہوئے ہیں- اللھم صل علی محمد و آل محمد - جس وقت کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہور فرمایا، انوارالٰہی ظاہر ہوئے اور کسری کہ کافروں میں بہت بڑا عظیم الشان بادشاہ تھا اور ہزاروں برس سے اس کے گھر میں بادشاہی چلی آتی تھی ، اس کا محل لرز گیا اور چودہ کنگرے اس کے گر پڑے - بیت

صیتش در انوارہ دنیا فتاد
تزلزل در ایوان کسری فتاد

اور فارس کا آتش کدہ کہ ہزار برس سے اس میں آگ جلتی رہتی تھی اور فارس کے آتش پرست اس کی پوجا کرتے تھے، دفعتاً بجھ گئی اور ساوہ کے چشمے میں ایک بوند پانی نہ رہا -

حلیمہ بنت ابی ذویب اور ثویبہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا اور ام ایمن نے آپ کو پالا - اللھم صل علی محمد و آل محمد -

جب کہ آپ کا سن مبارک چار برس کا ہوا آپ کی والدہ ماجدہ نے انتقال فرمایا - آپ کے والدؐ آپ کے پیدا ہونے سے پہلے رحلت فرماچکے تھے اور عبدالمطلب آپ کے دادا آپ کی پرورش کرنے لگے - جب کہ آپ آٹھ برس اور دو مہینے کے ہوئے - آپ کے دادا نے بھی رحلت فرمائی - پھر ابو طالب آپ کے چچا نے آپ کی پرورش کی - اللھم صل وسلم علی محمد و آل محمد -"(۲)

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) ، " مقالات سرسید "، محولہ بالا ،حصہ ہفتم،ص ۳۲-۳۱
(۲) ایضاً، حصہ ہفتم ، ص ۸-۷

تحفہ حسن :

"جلاء القلوب" کے بعد ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء میں سرسید نے "تسہیل فی جرالثقیل" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں سرسید نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مشہور تصنیف "تحفہ اثنا عشریہ" کے دسویں اور بارھویں باب کا ترجمہ کا ترجمہ کر کے شائع کیا۔ حالی لکھتے ہیں :

"یہ ترجمہ ہے تحفہ اثنا عشریہ کے باب دہم اور باب دوازدہم کا۔ باب دہم میں وہ مطاعن جو شیعہ صدیق اکبر پر کرتے ہیں مع ان کے جوابات کے مذکور ہیں۔ اور باب دوازدہم میں تولا اور تبرا کا بیان ہے۔" (۱)

سرسید نے تحفہ اور اس کے مصنف کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے ۔ اس سے سرسید کے اس وقت کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

"جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب نے جو "تحفہ اثنا عشریہ" لکھی ہے ۔ اس سے (بڑھ کر) تحفہ کوئی کتاب ہو نہیں سکتی اور بن نہیں آتی۔ اس واسطے میں نے اس کتاب کے دسویں باب سے مطاعن حضرت ابوبکر صدیق جو خلیفہ اول ہیں۔ صاف صاف اردو زبان میں ترجمہ کیا کہ چھوٹے سے بڑے تک اور جاہل سے عالم تک کو فائدہ پہنچے اور شیعوں کی اوچھی اوچھی باتیں سب کو معلوم رہیں اور اس ترجمہ کا نام تحفہ حسن رکھا۔" (۲)

یہ ترجمہ مولانا نورالحسن کی ہمت افزائی اور اصلاح سے مکمل ہوا تھا ۔ سرسید نے اس کا اعتراف کیا ہے ۔ دسویں باب کے اس ترجمہ میں بارہ طعنے اور ان کے جواب آئے ہیں ۔ اس باب کی آخری سطر قوسین میں یہ ہے " افسوس کہ باقی اوراق اس بات کے ترجمے کے شائع ہوگئے" ۔(۳) اور اس کے بعد بارھویں باب کا ترجمہ شروع

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، حصہ اول، ص ۵۱

(۲) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) "مقالات سرسید"، محولہ بالا، حصہ شانزدہم ص ۲۸۶

(۳) ایضاً، حصہ شانزدہم، ص ۲۸۷

ہوگیا ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دسویں باب کا مکمل ترجمہ نہیں ہے ۔ بارھویں باب کے ترجمے میں چوتھے مقدمے میں ایک مقام پر سرسید نے نومبر، ۱۸۷۸ء میں ایک حاشیہ بڑھایا ہے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت شاہ عبدالعزیز نے " لا تجد قوماً یومنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ " ــــ اور ــــ " یا ایھاالذین آمنوا لا تتخذوالیھود و النصاری اولیاء" ــــ اور ــــ " لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء" ــــ آیات کے مطالب سے بحث کی ہے اور ان کا اطلاق شیعوں پر کیا ہے ۔ سرسید حاشیے میں لکھتے ہیں :

" اس مقام پر شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے شیعوں کے مقابلے میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں جو خاص واقعات سے متعلق ہیں کفار اہل کتاب سے۔ صرفاً عداوت یا محبت رکھنے سے ان آیتوں کو کچھ تعلق نہیں ہے ۔" (۱)

اس کے بعد سرسید اپنے دعویٰ پر سورہ ممتحنہ کی آیات " لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین.... (آیت ۷، ۸) سے استدلال کیا ہے

تصانیف احمدیہ کی ترتیب میں سرسید نے اس رسالے کو نظر انداز کردیا تھا لیکن مجلس ترقی ادب لاہور نے یہ نایاب رسالہ تلاش کرکے سرسید کے سلسلہ " مقالات" میں شامل کردیا ہے ۔(۲) مولانا حامد حسن قادری نے لکھا ہے کہ اس رسالے کی اشاعت کے بعد سرسید نے کبھی شیعوں کے عقائد اعمال سے تعرض نہیں کیا ۔"(۳) لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لینا چاہئے کہ ان کے خیالات میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب)، " مقالات سرسید"، محولہ بالا، جلد شانزدھم، ص ۳۸۷

(۲) ایضاً، حصہ شانزدھم، صص ۳۸۷-۴۵۶ (مشمولہ تحفہ حسن)

(۳) حامد حسن قادری، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، ص ۳۱۳

ہوگئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے یہ رویہ صرف اس وجہ سے اختیار کیا تھا کہ اس تحفے نے ان کے پیش نظر مقاصد کو نقصان پہنچ سکتاتھا۔ اس لیے انھوں نے تصانیف احمدیہ کے سلسلے میں تحفہ حسن کی بجائے اس پر ریویو چھاپا۔ اس ریویو کا آغاز انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے :

" مذہب اہل سنت اور شیعہ اثنا عشریہ میں جو مباحث افضلیت اور استحقاق خلافت خلفائے اربعہ کے ہیں اور مذہب خوارج میں جو عقائد ختنین و اہل بیت کی نسبت اور مذہب نواصب میں علی مرتضٰیؓ اور اہل بیت کی نسبت ہیں ان سے زیادہ لغو و بیہودہ مباحث و عقائد کوئی نہیں ہیں۔" (۱)

اس آغاز کے بعد تبصرے میں انھوں نے اہل تشیع کے ہر مسئلے کی تردید نہایت سخت الفاظ میں کردی ہے ۔ "حضرت علی کی خلافت کے پہلے جواز کو انھوں نے رد کردیا ہے ۔" ان کی افضلیت کے مسئلے کے مباحث کو انھوں نے " بیہودہ" ٹھہرایا ہے ۔" ان کے نزدیک " مطاعن صحابہ ایک ایسا لغو اور بیہودہ اور جھوٹا کام ہے جس کے برابر دنیا میں دوسرا نالائق کام نہیں۔" (۲) ان کے ایسے ہی خیالات تبرا کے متعلق ہیں لکھتے ہیں :

" تبرا جس کا رواج ان شیعوں میں ہوگیا ہے جو نامہذب ہیں۔ نہایت خراب چیز ہے اور انسان کے دل میں ایک بدی اور بداخلاقی اور بدطینتی پیدا کرنے والا ہے ۔ جو اسلام کے مقصد اعلا کے برخلاف ہے۔" (۳)

یہی خیالات ان کے تحفہ کے متعلقہ ابواب کے ترجمہ اور اس کی اشاعت کے وقت تھے اور یہی خیالات ان کے اس وقت تھے جب انھوں نے تصانیف احمدیہ کے سلسلے کے لیے

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) "مقالات سرسید"، محولۂ بالا، حصہ ہفتم، ص ۳۰۱

(۲) ایضاً، حصہ ہفتم، ص ۲-۳۰۱

(۳) ایضاً، حصہ ہفتم، ص ۳۰۲

" تحفہ حسن" پر ریویو لکھا اور شائع کیا۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ " تحفہ حسن" کی مفصل تحریر کی بجائے اس پر ریویو کی مختصر عبارت سلسلہ تصانیف میں شامل کی ۔ اور اس مختصر اور جامع ریویو کے بعد سلسلہ تصانیف میں " تحفہ حسن" کی شمولیت کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے ۔

لیکن سرسید نے انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انھوں نے ان تاریخی حالات و واقعات پر نہایت جچی تلی رائے دی ہے جن پر شیعی اور غیر شیعی عقائد کا مدار ہے ۔ کہا کہ ان کا مذہبی عقیدہ ہی نہیں علمی مسلک کلیۃً یہی ہے ۔

سرسید لکھتے ہیں :-

" انسان سے غلطی اور خطا کا واقعہ ہونا خصوصاً ایسی بڑی سلطنت کے انتظام میں جو صحابہ کے ہاتھ میں تھی ایک ایسا امر ہے جو ناگزیر ہے۔ صحابہ معصوم نہ تھے ۔ اگر بالفرض ان سے غلطیاں واقع ہوئیں تو کیا آفت ہوئی اور کیوں وہ بری سمجھی جاویں ۔ اگر ان ہی روایتوں پر جو موجودہیں نکتہ چینی کا مدار ہو تو اس نکتہ چینی سے نہ حضرت علی مرتضیٰ بچتے ہیں نہ خلفائے ثلاثہ ۔ اور ہم تو باوجود تسلیم کرلینے کے ان تمام نکتہ چینیوں کے جو خوارج و نواصب اور شیعہ ان بزرگوں کی نسبت پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی بزرگ کو برا اور بدخیال نہیں کرتے۔ وہ تمام واقعات ایسے ہی ہیں جو دنیا میں ہمیشہ پیش آتے ہیں۔ وہ ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں ۔ ان سے نہ ان بزرگوں کی بزرگی میں کچھ نقصان لازم آتا ہے اور نہ مذہب اسلام کو ان واقعات سے کچھ تعلق ہے ۔" (۱)

گزشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سرسید نے یہ ترجمہ مسئلے اور موضوع کی اہمیت کے پیش نظر کیا تھا۔ لیکن ۱۸۷۸ء میں جب کہ وہ اپنی تصانیف کی ترتیب کی طرف متوجہ ہوئے تو ایک حاشیے میں انھوں نے اس ترجمے کا اصل محرک واقعہ بھی نقل

---

(۱) اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، حصہ ہفتم، ص ۳۰۲

زکریا، خواجہ محمد " اس دور کی نثر (سرسید وغیرہ) "، محولہ بالا ، ص ۱۱۲

کردیا ہے - سرسید لکھتے ہیں :

" ایک میرے نہایت دوست شیعہ مذہب تھے - ان کے ہاں ایک چھوٹا بچہ تھا۔ جس کو ایک بکری کا بچہ پال دیا تھا اور وہ خوب اس سے ہل گیا تھا۔ ایک دن اس بکری کے بچے کو ذبح کر ڈالا - وہ چھوٹا بچہ خوب رویا۔ اس کے باوانے اس سے کہا کہ عمر یہ کام کرگیا۔ وہ بچہ عمر کو برا بھلا کہتا تھا۔ یہ کام صرف اس لیے کیا تھا کہ بچپن ہی سے اس کے دل میں عمر کی عداوت اور ان کے نام سے نفرت پیدا ہو۔ اسی واقعہ کو دیکھ کر میں نے یہ ترجمہ شروع کیا تھا۔ دل ایک ایسی چیز ہے کہ جب اس میں عداوت کی، گو کہ وہ بزیدھی سے ہو اور نفاق کی ، گو وہ کسی حالت میں ہو جڑ بندھتی ہے تو اس کی نیکی و صفائی گندی اور بدلی ہوجاتی ہے - اس لیے جیسے کہ میں شیعوں کے مسئلے حب اہل بیت کو پسند کرتا ہوں ویسا ہی ان کے مسئلہ تبرا و تقیہ کو ناپسند کرتا ہوں - اور دلی نیکی اور صفائی اور سچائی کے بالکل برخلاف جانتا ہوں۔" (۱)

تحفہ حسن میں سرسید کی تحریر کا نمونہ یہ ہے :

" اس خداوند تعالیٰ قدوس ہی کو سب تعریفیں پھبتی ہیں جو ہر عیب اور نقصان سے پاک ہے اور اس کے کسی کام میں طعنہ تشنہ کا مقام نہیں - جو کیا وہ عین حکمت ہے اور جو کرتا ہے وہ عین مصلحت ہے - اپنے بندوں کے لیے کیا کیا کچھ کیا ،رسول بھیجے، سیدھی راہ بتائی ، بھلے برے کی سمجھ سکھائی - اور درود اور رحمت پہنچے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو کہ ان کے نور ہدایت سے عالم روشن ہوا۔ گم راہوں نے سیدھی راہ سیکھی ، دوزخ کے عذاب سے بچے، اپنے معبود کو پہچانا ، اور اپنے پیدا ہونے کا سبب جانا۔ اور ان کی آل اور اصحاب اور خلفائے راشدین پر اللہ کی رحمت ہو کہ انھوں نے دین کے چمکنے کے لیے اپنی جان اور مال اللہ کی راہ میں فدا کی، طرح طرح کے دکھ اٹھائے انواع انواع کی مصیبتیں سہیں،

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) "مقالات سرسید"، محولہ بالا ، حصہ شانزدہم، ص ۷۸۶

دنیا کے مزوں کو چھوڑا، خدا کی راہ کو پکڑا۔

اما بعد! دنیا میں وہی بات اچھی ہے جس سے کسی کو فائدہ پہونچے اور وہی شخص اچھا ہے جس سے لوگ نفع اٹھائیں۔ اور سب سے بڑا نفع دین کا ہے اور جس سے دین کی بات رواج پائے اور مسلمان اسے سیکھیں وہی شخص بھلا ہے ۔ اس خیال سے اس گنہگار سید احمد حسینی الحسنی غفراللہ ذنوبہ کے دل میں یہ بات آئی کہ کوئی کتاب ایسی لکھی جائے جس سے سب کو نفع پہونچے اور ثواب عظیم ہوئے۔ جب کہ میں نے غور کیا اس زمانے کے عوام کو خلفائے راشدین کے حال سے غافل پایا اور شیعوں نے جو خلفائے راشدین کی نسبت جھوٹی جھوٹی باتیں بنائی ہیں، وہ سب باتیں ان کے مذہب کا لڑکا لڑکا چوھا چوھا نوک زبان رکھتا ہے ۔ اور عوام ان باتوں کو سن کر حیران ہوتے ہیں اور ڈگمگانے لگتے ہیں اور جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز نے جو" تحفہ اثنا عشریہ " لکھی ہے اس سے [بڑھکر] تحفہ کوئی کتاب ہو نہیں سکتی ۔ اور بن نہیں آئی ۔ اس واسطے میں نے اس کتاب کے دسویں باب سے مطاعن حضرت ابوبکر صدیق کا جو خلیفہ اول ہیں صاف صاف اردو زبان میں ترجمہ کیا کہ چھوٹے سے بڑے تک اور جاھل سے عالم تک کو فائدہ پہونچے اور شیعوں کی اوچھی اوچھی باتیں سب کو معلوم رہیں اور اس ترجمہ کا نام " تحفہ حسن" رکھا ۔" (۱)

<u>کلمۃ الحق :</u>

یہ رسالہ ۱۸۳۹ء میں لکھا گیا۔ اس میں پیری مریدی کے رسمی و روایتی طریقے پر تنقید ہے ۔ مولانا حالی نے اس رسالے کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے :

" یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقۂ مروجہ کے برخلاف لکھا ہے ۔ " (۲)

رسالے کے تعارف میں حالی کے قلم سے بھی ایک سطر ہے جو دوسری تذکرہ نویسوں

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، (مرتب) مقالات، محولہ بالا ، حصہ شانزدہم، (تحفہ حسن) ، ص ۸۲-۸۵

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا ، حصہ اول ، ص ۵۹

نے بھی نقل کردی ہے - (۱) اس رسالے میں ٹھیک ٹھیک انہیں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو جاہل اور دنیا دار فقیروں ، پیروں اور صوفیوں کے بارے میں شاہ اسمعیل شہید کے تھے - رسالے کے شروع میں سرسید موضوع کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

" یہ کلمة الحق پیری اور مریدی کے بیان میں ہماری زبان سے نکلا ہے ، کیوں کہ ہمارے زمانے میں پیری مریدی کا ایسا ایک جھگڑا لگا ہے جس کے سبب ہزاروں آدمی دھوکے میں پڑے ہیں-" (۲)

رسالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے صوفیہ کے اشغال کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مشہور کتاب" القول الجمیل" سے بھی استفادہ کیا ہے -

کلمة الحق کی تحریر کا نمونہ یہ ہے :

" ہمارے زمانے میں پیری مریدی کا ایسا ایک جھگڑا لگا ہے ، جس کے سبب ہزاروں آدمی دھوکے میں پڑے ہیں- جہاں ایک نئی صورت کا آدمی دیکھا کوئی تو اس کو قطب کہتا ہے اور کوئی ابدال اور کوئی ولی اور کوئی غوث اور پھر وہ کیسی ہی باتیں کرتا ہو، اس پر کچھ خیال نہیں کرتے - اگر کوئی کہے کہ میاں یہ تو شرع کے خلاف باتیں کرتا ہے ، تو یوں جواب دیتے ہیں کہ اجی! تم نہیں جانتے ، طریقت کا اور ہی رستہ ہے ، فقیروں کی باتیں ہی جدا ہیں- شریعت تو ظاہر کے لیے ہے یہ ولی اللہ کے ہیں جو کریں سو بجا ہے اور یہ نہیں جانتے کہ اللہ کی راہ نبی کی اطاعت بغیر ملتی ہی نہیں۔ وہ بہت ---

---

(۱) حامد حسن قادری، " داستان تاریخ اردو" ، محولہ بالا ،ص ۳۱۶
معین الحق ، ڈاکٹر ، " سرسید کے علمی و ادبی کارنامے" (مقالہ) ،" برگ گل" محولہ بالا ، ص ۱۲۳
سرسید کے علمی کارنامے " ، محولہ بالا ، ص ۳۱
محمد زکریا ، خواجہ ، " اس دور کی نثر (سرسید احمد خاں) ، محولہ بالا ، ص ۱۱۲
(۲) اسمعیل پانی پتی ، (مرتب) ، " مقالات سرسید" ، محولہ بالا ، حصہ پنجم ، ص ۲۶۹

در یں راہ جز مرد داعی نرفت
گم آں شد کہ دنبال راعی نرفت

جو ذرا بھی شریعت کی راہ سے بھٹکا وہی راہ بھولا۔ اگر کوئی آسمان پر اڑے اور زمین میں گھسے اور ایک بال بھر شریعت سے پھرا ہو، وہ گم راہ ہے۔ ولی و ابدال، غوث اور قطب ہونا کچھ کرشمہ اور کرامات نہیں ہے، بھوت اور پلیت، دیو، جن، خبث اور بھان متی بھی بہت سے شعبدے اور تماشے دکھاتے ہیں۔ ولی و ابدال، غوث و قطب وہی ہے جو پورا پورا شریعت پر چلے قال اللہ تعالی:

" قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ "

یعنی اللہ صاحب نے سورہ آل عمران میں فرمایا کہ اے نبی! تو کہہ دے کہ اگر تم اللہ کو چاہتے ہو تو میری راہ چلو کہ اللہ تم کو چاہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آدمی کیسی ہی عبادت اور بندگی کرے، مگر اللہ اس کو جب ہی دوست رکھتا ہے جب شریعت محمدیہ علی صاحبہ الصلوۃ والسلام کا تابع ہوجاوے۔ دیکھو! جوگی، بیراگی، رشی اور فقیر کیسی کیسی محنتیں کرتے ہیں اور مصیبتیں بھگتے ہیں اور جوگ اٹھاتے ہیں، مگر جب شریعت کے برخلاف کرتے ہیں تو سب اکارت ہے۔ اور شریعت کی تابعداری یہی ہے کہ جو اللہ اور اللہ کے رسول نے کہا اس کو کیا اور جس سے منع کیا اس کو نہ کیا۔" (١)

<u>راہ سنت در رد بدعت:</u>

سرسید نے یہ رسالہ ١٨٥٠ء میں تحریر کیا تھا۔ حالی لکھتے ہیں: "کہ یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانے میں اہل بدعت کے برخلاف متبعین سنت کی تائید میں لکھا ہے۔" (٢)

---

(١) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ)، " مقالات سرسید "، محولہ بالا، حصہ پنجم، ص: ٧١-٢٦٩

(٢) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، محولہ بالا، ج ١، ص: ٥٩

مولانا حامد حسن قادری نے ان الفاظ پر اس جملے کا اضافہ کیا ہے "کہ سرسید خود بھی غیر مقلد تھے اور مقلدین کو بدعتی سمجھتے تھے" (۱) قاضی اختر جوناگڈھی کے بیان سے بات ذرا اور واضح ہوجاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "یہ رسالہ فرقہ اہل حدیث کی تائید اور اہل بدعت کے رد میں لکھا ہے۔" (۲)

اس رسالے کی نسبت سرسید خود لکھتے ہیں :

"یہ رسالہ راہ سنت [illegible]ء زمانے میں لکھا گیا تھا جب کہ وہابیت کا نہایت زور شور سے دل پر اثر چھایا ہوا تھا۔ اگرچہ اس زمانے کی طرز تحریر و بیان میں کچھ فرق ہو مگر دراصل یہ رسالہ جناب مولانا مولوی محمد اسمعیل صاحب کے ایک رسالے مسمی بہ "احقاق حق الصریح فی احوال الموتی والضریح" سے ماخوذ ہے۔" (۳)

شاہ اسمعیل شہید کے رسالے کے نام میں سرسید کے حافظے نے غلطی کی۔ شاہ صاحب کے رسالے کا نام "ایضاح الحق الصریح باحکام المیت والضریح" ہے۔ شاہ اسمعیل کا یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے اور اس کا خاص موضوع بدعت اور تقلید کا رد اور سنت کا اتباع ہے۔ (۴) سرسید نے دراصل اسی رسالے کا ملخص ترجمہ اپنے انداز میں کردیا ہے۔ اور بدعت کی تعریف، اس کی اقسام اور صحیح راہ سنت پر بحث کی ہے۔ اس کی

---

(۱) حامد حسن قادری، "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، ص ۳۱۶

(۲) اختر جوناگڈھی، "سرسید کا علمی کارنامہ"، محولہ بالا، ص ۳۱
زکریا، خواجہ محمد، "اس دور کی نثر (سرسید وغیرہ)"، محولہ بالا، ص ۱۱۳

(۳) اسمعیل پانی پتی (مرتب)، "مقالات سرسید"، محولہ بالا، حصہ پنجم، ص

(۴) ابویحییٰ امام خان نوشہروی، "تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۱۰۷

تالیف کا باعث حضرت مفتی صدرالدین آزردہ کی محفل میں بدعت کی تعریف سے متعلق ایک بحث ہوئی تھی - یہ ۱۸۵۰ع کا زمانہ تھا- ۱۸۸۳ع میں تصانیف احمدیہ کی ترتیب کے وقت سرسید ان صحبتوں کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" یہ باتیں گو ایسی صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں - کجا وہ صحبتیں اور کجا وہ مجلسیں- کہاں وہ آزردہ اور کہاں وہ شیفتہ ، اور کہاں وہ صہبائی ، کہاں وہ علما اور کہاں وہ صلحا صرف یاد ہی یاد ہے -" (۱)

راہ سنت در رد بدعت کی تحریر کا نمونہ یہ ہے :

" سنو بھائی مسلمانو، ہمارے زمانے میں بدعت کا ایسا زور ہوا ہے کہ سنت کے نام سے لوگ بھاگتے ہیں - اگر سنت کا نام لو تو وہابی اور معتزلی کہلاؤ اور اگر بدعت پر بدعت کرتے جاؤ تو اللہ کے ولی بن جاؤ - اب تو یہی مشہور کیا ہے کہ سنت پر چلے وہ وہابی اور جو بدعت کرے وہ ولی- ایک بزرگ کا قول ہے کہ اگلے زمانے میں بعضے بزرگوں نے ایسا کیا ہے کہ جب بہت سے لوگ ان کے معتقد ہوجاتے تھے اور ہر وقت ان کے گرد رہتے اور اس سبب سے ان کے اوقات میں خلل پڑتا تو ان کا عقیدہ توڑنے اور اپنا پیچھا چھڑانے کو ایک چھوٹی سی سنت کو چھوڑ دیتے تھے- تاکہ لوگ بے اعتقاد ہوجائیں اور ملامت کریں کہ یہ تو تارک سنت ہے ، اس کے پاس پھٹکنا نہیں چاہئے - اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ اگر کوئی یہ چاہے کہ مجھے لوگ برا کہیں اور میرے پاس نہ پھٹکیں تو وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرے کہ اس زمانے میں یہی بات اس کے برا کہنے کو کافی ہے :

" ببیں تفاوت رہ از کجاست تابہ کجا "

افسوس کیا زمانہ تھا کہ اگلے لوگ سنت رسول اللہ صلعم پر جان دیتے تھے اور اب جو سنت پر چلے اس پر نام دھرا جاتا ہے کوئی نہیں پوچھتا کہ پیغمبر صلی اللہ

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، (مرتب) " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، حصہ پنجم، ص ۲۲۸

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں کیا ہوتا تھا ۔ اور صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کیا کرتے تھے ۔ آیا ان کے ہاں بھی مرنا ، جینا ، شادی غمی ہوتی تھی ، وہ بھی خدا کے طالب تھے ، دنیا سے بھاگتے تھے ، انھوں نے کیا کیا ، وہی ہم بھی کریں ، کون سی چیز اس زمانے میں نہ ہوتی تھی جو اب نئی ہوگئی کہ نئی بات کا نکالنا پڑا اور جن زمانوں کے اچھے ہونے کی حضرت صلعم نے خبر دی ان کی پیروی چھوڑنے کی کیا ضرورت پیش آئی ۔" (۱)

نمیقہ :

سرسید کا یہ رسالہ ۱۸۵۲ء کا مرقومہ ہے ۔ حالی اس رسالے کے بارے میں لکھتے ہیں :" یہ رسالہ فارسی زبان میں بطور ایک فرضی یا واقعی مکتوب کے لکھا گیا ہے ۔ جس میں تصور شیخ ، مصطلحہ مشائخ نقشبندیہ کو وسیلہ محبت خدا و محبت رسول و انجذاب رحمت الہی بتایا ہے ۔" (۲)

حامد حسن قادری لکھتے ہیں :" یہ دل چسپ بات ہے کہ مشائخ نقشبندیہ جن کے تصور شیخ کو سرسید وسیلہ محبت الہی بتاتے ہیں وہ سب کے سب اہل تقلید تھے یعنی سرسید ان کے اصلی ثبوت کو صحیح مانتے ہیں ۔ لیکن ان کے اصول تقلید کو غلط جانتے ہیں ۔" (۳)

تصور شیخ کا مسئلہ شاہ غلام علی کی خانقاہ طریقت اور شاہ عبد العزیز کے مدرسہ فکر کا مشترکہ مسئلہ تھا ۔ اس لیے کہ دونوں خانوادے نقشبندیہ سلسلۂ طریقت سے تعلق رکھتے تھے ۔ سرسید نے خانقاہ و مدرسہ دونوں سے استفادہ کیا تھا ۔ سرسید نے اس رسالے میں تصور شیخ کا محبت و معرفت الہی کے ایک ذریعے کی حیثیت سے اثبات کیا ہے ۔

---

(۱) اسمعیل پانی پتی (مرتب) " مقالات سرسید " ، محولہ بالا ، حصہ پنجم ، ص ۳۶۰-۳۵۹
(۲) حالی ، خواجہ الطاف حسین " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، ج اول ، ص ۵۹
~~زکریا ، خواجہ محمد " اس دور کی نثر (سرسید احمد خان) " محولہ بالا ، ص ۲۶۳~~
اختر جوناگڑھی ، " سرسید کا علمی کارنامہ " ، محولہ بالا ، ص ۳۱
(۳) حامد حسن قادری ، " داستان تاریخ اردو " ، محولہ بالا ، ص ۳۱۶
زکریا ، خواجہ محمد " اس دور کی نثر (سرسید احمد خان) " ، محولہ بالا ، ص ۱۱۳

مولانا حالی نے ایک مضمون " سرسید کے خواب" میں بیان کیا ہے :

" سرسید کی تصنیفات کی فہرست میں جو ایک رسالہ موسوم بہ " صیقلؔ" بہ زبان فارسی تصور شیخ کے بیان میں ہے اس کی نسبت سرسید کہتے تھے کہ " میں نے اسے شاہ احمد سعید صاحب کو دکھایا تھا۔ انھوں نے اس کو دیکھ کر یہ فرمایا تھا کہ جو باتیں اس میں لکھی گئی ہیں وہ اہل حال کے سوا کوئی نہیں لکھ سکتا۔ پس یہ اس توجہ کی برکت ہے جو شاہ غلام علی صاحب کو تمہارے ساتھ تھی اور اب تک ہے -" (۱)

سرسید نے مسئلے کے اثبات و اہمیت کے بارے میں رائے دینے سے پہلے چار مقدمات قائم کئے ہیں - اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا۔ کسی مسئلے میں اظہار رائے کا یہ ایک سائنسی طریقہ ہے جسے سرسید نے اختیار کیا ہے -

سرسید نے اس رسالے کو من و عن بغیر کسی تصحیح و نوٹ کے " تصانیف احمدیہ" میں شامل کیا ہے - جب کہ " تحفہ حسن" اور " جلاء القلوب " کو شامل کرنے کی بجائے ان پر ریویو شامل سلسلہ تصانیف کیے۔ اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ چوں کہ " تحفہ حسن" کی اشاعت کو انھوں نے مصلحت کے خلاف سمجھا اور " جلاء القلوب" کے مواد کی صحت کے بارے میں ان کی رائے بدل گئی تھی اور " کلمۃ الحق" ، " راہ سنت" اور " صیقلؔ" کے مضامین کے بارے میں ان کی رائے میں چوں کہ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اس لیے انھیں سلسلہ تصانیف میں شامل کرلیا۔ تو " صیقلؔ" کی حد تک یہ بات

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) ، " مقالات سرسید"، لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ء ، حصہ پانزدہم، ص ۱۸۱

تعجب انگیز ہے - اس لیے کہ تصور شیخ کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔ حضرت شاہ سید احمد شہید جب (جیسا) معتدل مزاج اور سادہ روش عالم دین اور شیخ طریقت بھی اس کا متحمل نہیں ہوسکا۔ شاہ ~~اسمٰعیل~~ (اسماعیل) کے تو حاشیہ خیال میں بھی یہ چیز کاہے کو آئی ہوگی - سرسید نے اپنے خواب ۱۸۹۵ء میں مرتب کیا تھا جب کہ وہ سورہ یوسف کی تفسیر لکھ رہے تھے -(۱) چنان چہ ایک خواب کے سلسلے میں انھوں نے "صیغہ" کے بارے میں شاہ احمد سعید کا قول نقل کیا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس باب میں ۱۸۹۵ء تک ان کے خیال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

نا مناسب نہ ہوگا کہ سرسید کی فارسی تحریر کے نمونے سے بھی یہ کتاب (تذکرہ) خالی نہ رہے - ہم یہاں اس رسالے کا "مقدمہ اول" پورے کا پورا بطور نمونہ تحریر نقل ~~کرتے ہیں~~ (کیا جاتا ہے) :

<u>مقدمہ اول</u>

از مسلمات کرام و متفق علیہ خواص و عوام است کہ صحبت را اثرے ہست اگر با نیک بنشینی نیک برآئی و اگر با بد ہمنشین گردی نقاب از چہرۂ قبح برکشائی و این معنی است کہ ازین سو تا آن سرکس زبان بحرف انکارش نیالا بدخواہی از گیرد ترسا باز پرس و خواہی از زاہد و پارسا باز جو۔ وللہ در من قال

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

و مارا حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کہ دلم خاک راہ و جانم فدائے فرق آن عرش دستگاہ باد درین باب بس است - اخرجہ البخاری عن ابی موسی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل الجلیس الصالح والسوء

---

(۱) سرسید احمد خان، "تفسیر قرآن"، علی گڑھ : مطبع انسٹی ٹیوٹ ، ۱۸۹۵ء، سورۃ ق ۵۷؛ اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) ، " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، حصہ پانزدہم، ص ۱۷۱

کحامل المسک و نافخ الکیر فحامل المسک اما ان یحذیک و اما ان تبتاع منہ و اما ان تجد منہ ریحا طیبۃ و نافخ الکیر اماان یحرق ثیابک واما ان تجد منہ ریحا خبیثۃ ۔"

پس در اثر صحبت کہ ان را بہ عرف عام فیض صحبت نامند کسی را جائے گفت نماند ۔" (۱)

گزشتہ سطروں میں سرسید کی چند ابتدائی تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی علمی زندگی کے آغاز سے جس خانوادے کے رہین منت افکار تھے وہ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان تھا۔ سرسید کا سب سے پہلا رسالہ جس میں ان کی تصنیف و تالیف کی بہترین صلاحیتوں کا اظہار ہوا ہے ۔ " جلاء القلوب بذکر المحبوب" ہے ۔ سرسید اس سے قبل ۱۸۳۹ء میں " انتخاب الاخوین" اور ۱۸۴۰ء میں " جام جم" کے نام سے دو رسالے مرتب کرچکے تھے ۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ان کی تصنیف نہیں ہے ۔ " انتخاب الاخوین" ، قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا مجموعہ ہے اس میں ان کی فکر کو دخل نہ تھا۔ نہ زبان ان کی اپنی تھی ۔ امتحان کے نقطۂ نظر سے دیوانی قوانین کو ایک خاص ترتیب سے جمع کردیا تھا۔ " جام جم" کی حیثیت بھی تصنیف و تالیف کی نہ تھی بلکہ وہ ایک مفصل چارٹ تھا جس میں انھوں نے امیر تیمور سے لے کر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر تک تینتالیس بادشاہوں کے متعلق معلومات کو فارسی زبان میں ایک چارٹ کی شکل میں جمع کردیا تھا۔ اس میں ان کے لیے اپنے قلم کی جولانی دکھانے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس لیے میرے نزدیک ان کی پہلی کتاب جس سے ان کی مصنفانہ و مولفانہ کمال کا پتا چلتا ہے، " جلاء القلوب بذکر المحبوب"

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) ، " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، حصہ پانزدھم، ص: ۱۸۳

ہے - اور جیسا کہ تفصیل گزرچکی ہے اس رسالے کا بڑا ماخذ شاہ ولی اللہ کی کتاب " سرورالمحزون" تھی۔ اس میں جہی کہ انھوں نے لفظی ترجمہ کا التزام کیا تھا بلکہ اسے ایک آدھ دوسری کتاب کو بطور ماخذ استعمال کیا تھا اور اس سے استفادے کو اپنے الفاظ میں اپنے اسلوب میں، اور اپنی ترتیب میں پیش کیا تھا۔ اس لیے اس کی حیثیت سرسید کی پہلی تحقیق و تصنیف کی تھی۔ سرسید کی دوسری کتاب " تحفہ حسن" بھی خاندان ولی اللہی کے عظیم المرتبت رکن یا اس قصر رفیع الشان کے سب سے اہم ستون حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کی ایک کتاب کا ترجمہ تھا۔ " تحفہ حسن" کے بعد بلکہ ان کی تمام علمی و تحقیقی کاوشوں میں اہم ترین تصنیف " آثارالصنادید" ہے - شخصیات کے تذکرے پر مشتمل اس کا اہم ترین حصہ اس کا چوتھا باب ہے اور اس کی اہم ترین شخصیات خاندان ولی اللہی کے اراکین و اساتین ہیں - اس کی اہمیت کے اندازے کے لیے یہ مقالہ کفالت کرتا ہے - " آثار الصنادید" پر چونکہ ہم آئندہ مفصل بحث کرچکے ہیں اس لیے اس مقام پر طول کلام مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

۱۸۵۰ء میں سرسید کے قلم سے ایک نہایت فکر انگیز اور ایمان پرور خیالات پر مشتمل رسالہ " راہ سنت در رد بدعت" کے نام سے منصۂ شہود پر آیا - اس کے ماخذ کے بارے میں خود سرسید نے صراحت کردی ہے کہ یہ رسالہ شاہ محمد اسمعیل کے ایک رسالہ " ایضاح الحق الصریح باحکام المیت والضریح " سے ماخوذ ہے - سلسلہ بحث کا آخری رسالہ " نمیقہ " ہے اور جیسا کہ عرض کرچکے تھے کہ تصور شیخ کا مسئلہ شاہ غلام علی کی خانقاہ طریقت اور شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ فکر کا مشترکہ مسئلہ ہے - دونوں خانوادے نقشبندی سلسلۂ طریقت سے تعلق رکھتے تھے اور سرسید نے خانقاہ و مدرسہ دونوں سے استفادہ کیا تھا۔

شاہ ولی اللہ کے علوم و معارف سے استفادے کے سلسلے میں " جلاء القلوب " سرسید

کا پہلا اور آخری رسالہ وہ تھا جس میں انھوں نے شاہ صاحب سے استفادہ کیا ہو ۔ اول تو شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمعیل کے افکار شاہ صاحب ہی کا فیضان تھا۔ لیکن سرسید نے بالواسطہ ہی نہیں بلاواسطہ بھی شاہ ولی اللہ کے افکار سے استفادہ کیا ہے ۔ آئندہ مبحث میں ہم ان مضامین و افکار کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن میں سرسید نے شاہ ولی اللہ سے براہ راست ان کی کتابوں کے مطالعے سے استفادہ کیا ہے۔

افکار ولی اللہی اور سرسید

سرسید نے خانوادہ ولی اللہی کے اسلاف سے لے کر اخلاف تک کے افکار وسیرت سے استفادہ کیا ہے ۔ اور اپنے شبستان فکر و سیرت کی تزئین میں ان سے کام لیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں وہ شاہ ولی اللہ کے افکار اور شاہ اسمعیل کے ذوق تمسک بالسنت اور جذبہ اصلاح و عمل صالح سے بہت متاثر ہوئے ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انھوں نے بدلے ہوئے حالات پر نظر ڈالی اور اسلام کے دفاع اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے انھیں ایک نئے علم کلام اور جدید نظام فکر کی تشکیل کی ضرورت محسوس ہوئی تو علمائے دین اور فلاسفر اسلام میں شاہ ولی اللہ کے افکار انھیں پیش نظر مقصد کے لیے سب سے زیادہ مفید معلوم ہوئے ۔ اس سلسلے میں حجۃ البالغہ اور التفہیمات الالٰہیہ ان کی بہت پسند آئیں ۔ اور انھوں نے اپنے متعدد معتقدات کی بنیاد شاہ ولی اللہ کے افکار پر رکھی ہے اور اپنے بہت سے مضامین کے لیے سارے کا سارا مواد شاہ صاحب موصوف کی کتابوں سے لیا ہے ۔ مثلاً :

۱۔ طبقات علوم دین :۔ سرسید کا یہ مضمون "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت ۱۵ محرم ۱۲۸۸ھ کے شائع ہوا تھا۔ اور اب جدید سلسلہ مقالات میں

شامل کیا گیا ہے ۔(۱) یہ پورا مضمون شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب " حجۃ اللہ البالغۃ" کے دیباچے سے ماخوذ ہے ۔(۲) مضمون کے آخر میں سرسید نے " حجۃ اللہ البالغۃ " کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ۔ اور اس کا نہایت اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ تصنیف و تالیف میں ہر زمانے کا جدا علمی انداز ہوتا ہے ، شاہ صاحب کے عہد کے مقابلے میں موجودہ دور میں تصنیف و تالیف کا انداز بدل گیا ہے اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ علم اسرار دین کی اس شراب کہنہ کو نئے جام و پیمانے میں بے نوشان علم و فکر کی خدمت میں نئے دلائل و براھین سے دو آتشہ و سہ آتشہ بناکر پیش کرنا چاہئے اور نئی بزم فکر و نظر کو اس طرح ترتیب ~~دیا چاہئے~~ دیا جائے کہ اس کا فیضان ایک خاص ذوق رکھنے والوں تک محدود رہنے کی بجائے عام ہوجائے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

> " اس علم یعنی علم اسرار دین میں احیاء العلوم امام حجۃ الاسلام غزالی اور حجۃ اللہ البالغۃ شاہ ولی اللہ صاحب کی نہایت عمدہ کتابیں ہیں۔ مگر زمانۂ حال کے مطابق ان کو بھی کامل نہ سمجھنا چاہئے ۔ اس لیے کہ اس زمانے میں بہت سی چیزیں اب معلوم یا موجود ہوئی ہیں جو اس زمانے میں نہ تھیں اور یہ کہ طرز تحریر و طریق تقریر اور مناظر استدلال اور طریقہ ایراد اس زمانے میں نئے طرز پر شروع ہوا ہے جو ان زمانوں میں نہ تھا اور یہ کہ حال کے لوگوں کے خیالات کو بہ نسبت اس زمانے کے بہت وسعت ہوگئی ہے ۔ اور یہ کہ ان کتابوں میں بہت سی باتیں بر بنیاد ایرات

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) ، " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، حصہ اول ، ص ۳۰-۳٦

(۲) عبدالحق حقانی، ابو محمد (مترجم)[۸] " حجۃ اللہ البالغۃ"، از امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ، کراچی : نور محمد اصح المطابع، و کارخانہ تجارت کتب ، س ن ، ج اول ، ص ۳-۱

مسلمہ مذہبی بیان کی گئی ہیں جو صرف معتقدین اسلام کے لیے بلا شبہ مفید ہیں مگر بہ لحاظ شان و قدر و منزلت اس علم کے اس کے بیان کا (انداز) ایسا عام ہونا چاہئے جو معتقدین اور غیر معتقدین سب کے لیے مفید اور برابر موثر ہو -" (١)

٢- __کتاب احادیث :-__ سرسید کا یہ مضمون سب سے پہلے " تہذیب الاخلاق" بابت یکم شوال ، ١٢٨٨ھ میں شائع ہوا تھا - اب اسے جدید سلسلہ "مقالات سرسید" میں شامل کرلیا گیا ہے - (٢) اس مضمون کا حصہ اول جس کتب احادیث کے طبقات اور ان کی تقسیم کی بحث ہے - " حجۃ اللہ البالغہ " کے " مبحث ہفتم" کے چوتھے باب " کتب حدیث کے طبقات " سے اخذ کیا گیا ہے -(٣) اور حصہ ثانی شاہ عبدالعزیز کی مشہور کتاب " عجالہ نافعہ " کے خاتمے سے ماخوذ ہے جس میں شاہ عبدالعزیز نے راویان حدیث کے کذب اور وضع احادیث کی علامات اور اسباب پر بحث کی ہے -(٣)

٣- __گناہ سے کیوں عذاب ہوتا ہے اور شرک سے کیوں نجات نہیں ہوتی :-__

سرسید کا یہ مضمون سب سے پہلے " تہذیب الاخلاق" بابت یکم ربیع الاول ، ١٣١٢ھ میں چھپا تھا اور اب جدید سلسلہ مقالات میں شامل کرلیا گیا ہے -(٥) " حجۃ اللہ البالغہ" کے مبحث اول کے مختلف ابواب میں پیش کردہ شاہ ولی اللہ کے افکار پر مبنی ہے - امام غزالی کے افکار سے بھی استفادہ کیا گیا ہے - شاہ ولی اللہ کا حوالہ بھی

---

(١) اسمعیل پانی پتی ، (مرتبہ) " مقالات سرسید" ، محولہ بالا ، حصہ اول ، صص ٣٠-٣٩

(٢) ایضاً ، حصہ اول ، صص ٢٣-٢٠

(٣) عبدالحق حقانی ، ابومحمد (مرتبہ) " حجۃ اللہ البالغہ" ، محولہ بالا ، صص ٣٠١-٢٩٣

(٣) عبدالحلیم چشتی ، محمد (مرتبہ) ، " فوائد جامعہ برعجالہ نافعہ" از شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی ، کراچی : نورمحمد کارخانہ تجارت کتب ، ١٩٦٣ء ، صص ٢٥-٢٣

(٥) اسمعیل پانی پتی ، (مرتبہ) ، "مقالات سرسید" ، محولہ بالا ، حصہ اول ، صص ١٥-٢٠٣

دیا ہے ۔ خاتمہ بحث کے لیے شاہ صاحب ہی کے افکار سے کام لیا ہے چنانچہ مبحث اول کے پانچویں باب " حقیقت روح " سے ایک طویل عبارت بھی نقل کی ہے اور اس کا ترجمہ بھی کیا ہے ۔ (۱)

۲۔ العجب ثم العجب :۔ " آخری مضامین سرسید" میں سے ایک مضمون " العجب ثم العجب " کے عنوان سے بڑی تقطیع کے بھی دو صفحے کا ہے ۔(۲) اس کے ماخذ کاسوالہ ~~کا~~ سرسید نے پہلی ہی سطر میں یہ کہہ کر بتادیا ہے کہ " حضرت شاہ ولی اللہ صاحب " تفہیمات الٰہیہ" میں تحریر فرماتے ہیں " اس کے بعد انھوں نے ، حیات کے مختلف ادوار معدنیات، نباتات ، حیوان ، انسان کی وضاحت کی ہے ۔ اور بڑی تقطیع کے ایک صفحہ کے بعد ایک جگہ لفظ " انتہیٰ" لکھتے ہیں ۔ گویا کہ انھوں نے یہ شاہ ولی اللہ کے الفاظ ہی کو اردو کا جامہ پہنادیا ہے ۔ (۳) سرسید نے ان افکار سے اختلاف یا ان کا رد نہیں کیا ہے بلکہ اپنے خیالات کے اثبات کے لیے اس سے استدلال کیا ہے ۔ انھوں نے شاہ صاحب کے ان فکر انگیز خیالات پر حیرت کا اظہار کیا ہے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

" مگر جو کچھ کہ تعجب ہم کو ہے ۔ وہ اس بات سے ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ان چاروں دوروں کا ہونا اور خصوصاً اسی طرح پر کہ انھوں نے بیان کیا ہے ، کہاں سے اخذ کیا ہے ؟ جو لوگ کہ ڈاروں کی

---

(۱) عبدالحق حقانی، ابومحمد (مترجم) ،" حجۃ اللہ البالغۃ"، محولہ بالا ،ص ۳۹-۳۸

(۲) امام الدین گجراتی و احمد بابا مخدومی لاھوری ، " آخری مضامین سرسید"، لاھور: اللہ والے کی قومی دکان، ۱۸۹۸ع ، ص ۹۶-۹۵
اسمعیل پانی پتی(مرتب) ، " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، حصہ اول ، ص ۲۳۹-۲۳۶

(۳) غلام مصطفی قاسمی ،(مرتب) ، " التفہیمات الالٰہیہ"، محولہ بالا ، الجزءالاول ، ص ۶۷-۱۶۶

تعیین کے قائل ہیں ۔ وہ تو شاہ ولی اللہ صاحب کے اس بیان سے انقلاب کی تعیین پر استدلال کرتے ہیں ۔ اور جو لوگ انقلاب کے قائل نہیں ہیں بلکہ سائلت کے قائل ہیں، جیسا کہ ہمارا خیال ہے ۔ وہ ان کے بیان سے سائلت کی تعیین پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ کہاں سے ان دعووں کا شاہ ولی اللہ صاحب نے استنباط کیا ہے اس وقت تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔" (۱)

۵- قرآن مجید کی تفسیر کے اصول :- سرسید کا یہ ایک نایاب مضمون ہےجو ان کی زندگی میں لاہور سے کتابچے کی صورت میں" تحریر فی اصول التفسیر" کے نام سے اللہ والے کی قومی دکان لاہور سے ۱۸۹۲ء میں چھپا تھا اور اب مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے سلسلہ مقالات سرسید میں شامل کرلیا ہے ۔

جب سرسید تفسیر لکھ رہے تھے تو محسن الملک اور سرسید کے مابین اصول تفسیر اور بعض مسائل تفسیر کے بارے میں مراسلت ہوئی تھی ۔ اس مضمون کا نصف اول (۳۰ صفحات) اسی مراسلت پر مشتمل ہیں۔ اس میں سرسید نے انھیں بھی طرح مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بعد میں انھیں خیال پیدا ہوا کہ جن اصولوں کے مطابق وہ اپنی تفسیر لکھ رہے ہیں ان کی وضاحت کردی جائے ۔ چناں چہ انھوں نے اپنی تفسیر کے مقدم اصولوں پر مبنی ایک مضمون لکھ کر چھپوادیا۔ اس کے کئی اصولوں میں انھوں نے شاہ ولی اللہ کی " التفہیمات الالہیۃ" اور " الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" سے استفادہ کیا ہے ۔ البتہ ایک مقام پر انھوں نے شاہ ولی اللہ کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہے ۔ لیکن یہ اختلاف اس امر سے تعلق رکھتا ہے کہ قرآن مجید بلفظہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا یا اس کا مفہوم ۔ خدا کی طرف سے اور الفاظ

---

(۱) ~~اسمعیل پانی پتی (مرتبہ) "مقالات سرسید" مجلد~~ [محمد امام الدین گجراتی و اکبر یار ... (مرتب)] ہاشم " آخری مضامین سرسید" [مرتبہ اکبر] سرسید"، ص ۹۶

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہیں ۔لیکن ان سے اختلاف رائے کے ساتھ ان کو " حجۃ الاسلام" اور " حجۃ اللہ فی الانام" کے القاب سے یاد کیا ہے ۔ سرسید کے الفاظ یہ ہیں :

" والعجب ثم العجب علی ، قال الامام حجۃ الاسلام بل حجۃ اللہ فی الانام الشاہ ولی اللہ الدہلوی فی کتابہ التفہیمات الالہیہ حیث قال..."(۱)

تفسیر کے نویں اصول پر جہاں سرسید نے معجزات کے بارے میں تفسیر میں اپنے رویے کا اظہار کیا شاہ ولی اللہ کی فکر سے استدلال کیا ہے ۔ اور تفہیمات ہی کا حوالہ دیا ہے ۔(۲) جس کے بعد تفسیر کے گیارھویں اصول میں قرآن مجید کے حفظ و ضبط کے بارے میں " الفوز الکبیر" کے باب سوم کی پہلی فصل سے حوالہ دیا ہے ۔(۳) پھر تیرھویں اصول میں قرآن کے نزول کی کیفیت و مدت کے بارے میں انھوں نے " الفوز الکبیر" کے باب سوم کی پہلی فصل میں شاہ صاحب موصوف کے علم و فکر سے استدلال کیا ہے ۔(۴) پھر پندرھویں اصول میں بھی دو مقام پر شاہ ولی اللہ کے افکار سے استدلال پیش کیا ہے ۔(۵)

۲۔ <u>آدم کی سرگزشت</u> :۔ اوپر ہم سرسید کے مضمون " العجب ثم العجب" میں بیان کر آئے ہیں کہ شاہ ولی اللہ نے زندگی کے چار دور قرار دیے ہیں معدنیات، نباتات ، حیوان اور انسان ۔ شاہ صاحب نے کسی ایک دور کی تفصیل بیان نہیں کی ہے۔

---

(۱) اسمٰعیل پانی پتی (مرتب) ، " مقالات سرسید" لاہور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ع حصہ دوم، ص ۲۸-۲۲۷
شاہ ولی اللہ کے قول کے لیے دیکھیے " التفہیمات الالہیۃ"، ج ۱، ص ۲۳۷

(۲) اسمٰعیل پانی پتی (مرتب) " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، حصہ اول ، ص ۳۰-۲۳۹

(۳) مقیم عبداللہ ، محمد (مترجم) ، " الفوز الکبیر" از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ، کراچی : اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ع ، ص ۱۶۱

(۴) ایضاً، ص ۶۰-۱۵۹

(۵) ایضاً، باب چہارم ، پہلی فصل ، ص ۹۶-۱۹۵
ایضاً، باب سوم، تیسری فصل ، ص ۱۸۲

سرسید نے ان کے نظریے سے مماثلت کے نظریے پر جس کے وہ خود قائل ہیں، استدلال کیا ہے - آدم کی سرگزشت دراصل حیات کے چوتھے دور یعنی انسان" کے خلق و ہدایت کی تشریح ہے جو سرسید نے قرآن کی روشنی میں کی ہے - لیکن اس مضمون میں سرسید نے جو کچھ کہا ہے وہ اس میں منفرد ہیں۔

سرسید کا یہ مضمون پہلی مرتبہ " تہذیب الاخلاق" بابت یکم ربیع الاول، ۱۲۸۹ھ میں شائع ہوا تھا اور لاہور سے ایک مجموعہ مقالات میں شامل کیا گیا ہے - (۱)

ان مضامین کا تو پورا ڈھانچہ شاہ ولی اللہ کے افکار و معلومات سے تیار کیا گیا ہے یا سب سے زیادہ انھوں نے شاہ صاحب کے افکار سے فائدہ اٹھایا ہے - لیکن اور بہت سے مسائل ہیں جن میں ان کی پرواز خیال حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے آسمان فکر کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکی ہے - ان کا سب سے بڑا کام حضرت محدث دہلوی کے مائدۂ فضل و افکار کی خوشہ چینی اور سب سے بڑا مجتہدانہ اقدام آپ کے افادات کی بطور خود تالیف و تدوین نظر آتی ہے -

۷- <u>مفہمین</u> :- شاہ ولی اللہ نے " حجۃ اللہ البالغۃ" کے باب" حقیقۃ النبوۃ و خواصہا " میں اعلا انسانوں کے مختلف درجات و مراتب (۲) کامل، حکیم، خلیفہ، مؤید بروح القدس، ہادی و مزکی، امام، منذر، اور ان سب سے اوپر نبی اور ان کی استعدادات اور دوائر کار و فرائض کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، سرسید نے ان تمام خیالات کو اخذ کرلیا ہے -(۳)

---

(۱) اسمعیل پانی پتی (مرتب) " مقالات سرسید"، محولہ بالا، حصہ اول، ص ۲۱۶-۳۲

(۲) عبدالحق حقانی، ابو محمد (مترجم) " حجۃ اللہ البالغۃ"، محولہ بالا، ج اوّل، ص ۱۷۵

(۳) سرسید احمد خاں " تفسیر القرآن"، آگرہ : مطبع مفید عام، ۱۹۰۳ء، ج سوم، ص ۲۰-۱۹

۸- نبوت :- شاہ ولی اللہ نے نبوت کے لیے استعداد اور توجہ الٰہی کی شرط کو لازم قرار دیا ہے - سرسید نہایت خوشی سے اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں - نبوت تحت فطرت کی بحث میں بھی سرسید نے شاہ ولی اللہ سے استفادہ کیا ہے - سرسید لکھتے ہیں :

" یہ اصول جو میں نے بیان کیا ایک ایسا اصول ہے کہ اگر وہ ذہن میں رکھا جائے تو بہت سے مقامات قرآن مجید کی اصلی حقیقت منکشف ہوتی ہے مگر یہ اصول ایسا نہیں ہے جس کو میں نے ایجاد کیا ہو اور نبوت کو ماتحت فطرت ، قرار دیا ہو بلکہ اور محققین علما کی بھی یہی رائے ہے .... مگر شاہ ولی اللہ صاحب نے تفہیمات الٰہیہ میں اس اصول کو زیادہ تر وضاحت سے بیان کیا ہے (۱) اور شاہ ولی اللہ نے جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے اس کا مطلب بالکل اس کے مطابق ہے جو میں نے بیان کیا ہے گو کہ دونوں کے طرز ادا اور طریق تقریر اپنی اپنی طرز پر جداگانہ مذاق سے ہو -" (۲)

اس کے بعد سرسید نے تفہیمات الٰہیہ کی پوری ایک تفہیم (۲۸) کو نقل کیا ہے اور اس کا ترجمہ کیا ہے -(۳) آخر میں لکھتے ہیں :

" یہ بیان شاہ ولی اللہ صاحب کا ہماری دلیل سے بالکل مطابق ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہماری دلیل کا ماخذ یہی بیان ہے جو نہایت عالی دماغی اور بلا خوف لومۃ لائم کے شاہ صاحب نے فرمایا ہے -" (۴)

---

(۱) غلام مصطفٰی قاسمی" مرتب ، " التفہیمات الالٰہیہ"، محولہ بالا ، الجزء الاول ، صص ۹۳-۹۲

(۲) سرسید احمد خان"تفسیرالقرآن" ، محولہ بالا ، ج سوم ، ص ۱۹۲
اسمٰعیل پانی پتی ، (مرتب) " مقالات سرسید "، [illegible] لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء ، حصہ چہاردہم، ص ۱۳۰

(۳) غلام مصطفٰی قاسمی (مرتب) " التفہیمات الالٰہیہ"، محولہ بالا ، الجزء الاول ، صص ۹۳-۹۲

(۴) سرسید احمد خان " تفسیرالقرآن"، محولہ بالا ، ج سوم، صص ۹۳-۱۹۲

۹- ارتفاقات :- " ارتفاقات " اور اصلاح رسوم کے سلسلے میں بھی سرسید کے ٹھیک ٹھیک وہی خیالات ہیں جن کا اظہار شاہ ولی اللہ نے " حجۃ اللہ البالغۃ" کے باب " الارتفاقات و اصلاح الرسوم " میں کیا ہے -(۱) سرسید لکھتے ہیں :" شاہ ولی اللہ نے اس مبحث کی تفصیل کی ہے اور بہت اچھی کی ہے -"(۲) اس باب میں سرسید نے شاہ ولی اللہ سے انبیا کی بعثت کے مقاصد کے سیاسی پہلو سے اختلاف کیا ہے - حالاں کہ وہ جب کھانے ، پینے، لباس، مکان بنانے، انفصال مقدمات ، حدود کا قیام، لشکروں کی تشکیل ، جہاد و قتال ، مال غنیمت کی تقسیم، سلطنت کا قیام ، اور بہت سے وہ امور جو منظم حکومتی انجام دیتی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیے، تسلیم کرتے ہیں تو سرسید کے اس قول کا کہ شاہ صاحب نے جو محض دنیاوی امور کو بھی مذہب یا شریعت میں شامل کرلیا ہے ، ہم اس کو تسلیم نہیں کرسکتے -(۳) کیا وزن رہ جاتا ہے ، لیکن اس باب میں شاید سرسید کی مجبوری کو ان کے گرد و پیش اور وقت کے سیاسی حالات میں تلاش کرنی چاہیے -

۱۰- ابداع و خلق و تدبیر :- اس بحث میں بھی سرسید نے شاہ ولی اللہ کے اصول خلق و تدبیر سے اتفاق کیا ہے - (۴) لیکن اس سلسلے میں انھوں نے قبض وبسط اور احالہ و الہام کی جو مثالیں دی ہیں ان کی افادیت یا موثر حیثیت سے اختلاف کیاہے-(۵)

---

(۱) عبدالحق حقانی(مرتبہ) " حجۃ اللہ البالغۃ "، محولہ بالا ، ج اول ، مبحث سوم ، " الارتفاقات "، ص ۱۰۱-۷۹

(۲) سرسید احمد خاں، " تفسیرالقرآن"، محولہ بالا ، ج سوم، ص ۲۳

(۳) ایضاً، ج سوم، ص ۲۶

(۴) عبدالحق حقانی، ابومحمد (مرتبہ) ، " حجۃ اللہ البالغۃ"، محولہ بالا ، ج اول ، مبحث اول ، پہلا باب ، ص ۲۵-۲۲

(۵) سرسید احمد خاں، " تفسیرالقرآن"، محولہ بالا ، ج سوم، ص ۳۲-۳۱

ظاہر ہے کہ کسی امر یا کسی اصول سے اتفاق کے بعد اس کے ثبوت کے لیے کسی مثال یا استدلال کو مفید اور موثر نہ سمجھنا ، بالکل الگ بات ہے ۔

۱۱- معجزات :- سرسید معجزے کو دلیل ثبوت تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ قرآن میں معجزات کے ذکر کے قائل ہیں۔ ان کے اس عقیدے اور رائے کا ماخذ بھی افکار و معارف ولی اللہی ہیں۔ حالی نے اس مسئلے پر نہایت عمدہ بحث کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" سرسید جس طرح کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معجزات کا قرآن میں مذکور ہونا تسلیم نہیں کرتے ، اسی طرح ان کے نزدیک انبیائے سابقین کے معجزات کا بھی قرآن میں کچھ ذکر نہیں ہے اور اس لیے انھوں نے انبیائے سابقین کے ہر ایک ایسے واقعے کو جو ظاہرا کسی امر خارق عادت پر دلالت کرتا ہے قانون قدرت کے مطابق ثابت کرنے میں کوشش کی ہے ۔ مگر ان کے بعض ہم خیال باوجود اس کے کہ وہ آنحضرتؐ کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی امر قانون قدرت کے خلاف وقوع میں نہیں آسکتا ۔ مگر ان کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ انبیائے سابقین کے اکثر واقعات اگرچہ نفس الامر میں موافق قانون قدرت کے واقع ہوئے ہیں ، مگر قرآن مجید میں بطور خوارق عادت کے ، جیسا کہ عرب کے اہل کتاب اعتقاد رکھتے تھے، بیان کیے گئے ہیں اور ان کے نزدیک قرآن کی طرز بیان ہرگز اس کی سچائی کے برخلاف نہیں ہے کیوں کہ قطع نظر اور دلائل کے خود سرسید نے متعدد آیتوں کی تفسیر اس اصول کے مطابق کی ہے کہ قرآن میں بہت سی باتیں ، بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ فی الواقع صحیح ہیں یا نہیں ۔ محض لوگوں کی معمولی سمجھ اور ان کے اعتقاد کے موافق بیان کی گئی ہیں۔

اور یہ اصول درحقیقت انھوں نے شاہ ولی اللہ کی کتاب " حجۃ اللہ البالغۃ" سے اخذ کیا ہے ۔ جہاں وہ لکھتے ہیں کہ۔۔۔

" شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقائق علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے ان کی اصل خلقت میں ودیعت تھی، ان سے خطاب کیا ہے"

اور دوسری جگہ شاہ صاحب اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ :

" انبیاء کی شان اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ ان کی معمولی سمجھ اور عقل سے بڑھ کر جس پر کہ وہ مجبول ہوئے ہیں، کلام نہ کریں۔" (۱)

۱۲- حقیقت روح :- سورہ الاعراف کی تفسیر میں سرسید نے روح کی حقیقت کے بارے میں شاہ ولی اللہ کی فکر سے استدلال کیا ہے اور "حجۃ اللہ البالغۃ" کا حوالہ دیا ہے - (۲) اور روح کے بارے میں وہ بحث نقل کردی ہے جو شاہ صاحب نے کی ہے -(۳)

۱۳- معاد قیامت، حشر، حیات بعد الممات ، کیفیت حساب و کتاب ، جزاء سزاء، عذاب و ثواب وغیرہ مسائل میں بھی سرسید نے شاہ ولی اللہ کے حوالے سے اظہار خیال کیا ہے - اور " حجۃ اللہ البالغۃ" اور " التفہیمات الالہیۃ" کی عبارتیں کے حوالے دیے ہیں -(۴) آخر میں لکھتے ہیں کہ :

" اب معاد کے متعلق کیفیت حساب و کتاب، عذاب و ثواب کا بیان باقی ہے جس کو اگلے علماء نے اور خصوصاً امام غزالی اور شاہ ولی اللہ نے نہایت خوبی سے بیان کیا ہے اور ہم بھی اس کو آئندہ موقع بہ موقع بیان کریں گے - ان شاءاللہ -" (۵)

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۷۸
(۲) سرسید احمد خان، " تفسیرالقرآن"، محولہ بالا، ج سوم ، صص ۲۷-۱۲۶
(۳) عبدالحق حقانی، ابو محمد (مترجم) ، " حجۃ اللہ البالغۃ"، محولہ بالا، ج اول، مبحث اول ، باب حقیقۃ الروح ، صص ۳۹-۳۶
(۴) سرسید احمدخان، " تفسیرالقرآن"، محولہ بالا، ج سوم، صص ۲۷-۱۳۵
(۵) ایضاً، ج سوم ، ص ۱۵۵

ان مسائل کے علاوہ اور بے شمار مسائل میں معراج، حقیقت رویاء، سنت عادت اور عبادت، مذہب کی تشکیل، کسی مسئلے میں احادیث کے اختلاف کی صورت میں صحیح راہ حل وغیرہ مسائل میں سرسید نے شاہ ولی اللہ کے افکار سے استدلال کیا ہے -(۱) البتہ بعض مقامات پر سرسید نے شاہ صاحب کی تشکیل یا ان کے استدلال سے اختلاف کیا ہے -

اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ شاہ ولی اللہ اپنا ایک مستقل نظام فکر رکھتے ہیں۔ سرسید نے ان کے افکار سے استفادے کے باوجود اس پورے نظام فکر کو قبول نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے اپنے نظام فکر کے اثبات اور ہم ذہنی فکر و مزاج رکھنے والوں اور شاہ صاحب سے متاثر افراد میں اسے قابل قبول بنانے کے لیے شاہ صاحب کے افادات سے اپنے نظام فکر کی تزئین و آرائش کا کام لیا ہے - مثلاً سرسید معراج جسمانی کے قائل نہیں ہیں اور اس باب میں انھوں نے شاہ ولی اللہ کے افکار سے استدلال کیا ہے - اگرچہ یہ استدلال درست نہیں ہے - معراج کے بارے میں شاہ صاحب اپنا خاص فکر رکھتے ہیں۔ ان کی کسی ذیلی و ضمنی بات سے یا سیاق و سباق سے الگ کرکے ان کے کسی قول سے کسی دوسرے مکتب فکر کے اثبات و استدلال کا کام لینا درست نہیں - شاہ صاحب کے قول و فکر کو اس کے اپنے محل میں دیکھنا چاہیے -

سرسید نے شاہ ولی اللہ کی عالمانہ بزرگی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، ان کی تصنیفات کی علمی حیثیت کا اعتراف کیا ہے - ان کے مجتہدانہ فکر اور بصیرت کے

---

(۱) سرسید احمد خان، "تفسیر القرآن"، محولہ بالا، ج سوم، ص ۱۲-۱۳ اور ۳۷-۳۳
سرسید احمد خان، "تفسیر القرآن"، علی گڑھ: انسٹی ٹیوٹ گزٹ پریس، ۱۳۲۵ھ
ج ششم، ص ۱۷-۱۶ و ۷۵ اور ۸-۱۰۷
سرسید احمد خان، "تفسیر القرآن"، محولہ بالا، ج پنجم، ص ۷۸-۴۳
سرسید احمد خان، "الخطبات الاحمدیہ"، محولہ بالا، چھٹا خطبہ، ص ۵۲-۲۵۵
ایضاً، دیباچہ، ص ۲۲-۲۱

سرسید معتقد ہیں اور اپنے خاص دینی معتقدات کے اثبات اور دینی حلقوں میں قابل قبول بنانے کے لیے سرسید نے شاہ صاحب کے افادات و افکار سے سب سے زیادہ کام لیا ہے۔ لیکن وہ کئی مقامات پر شاہ صاحب کے ماخذ تک بھی نہیں پہنچ سکے مثلاً "العجب ثم العجب" میں سرسید نے شاہ صاحب کے افکار متعلقہ "حیات" پیش کیے ہیں اور آخر میں لکھتے ہیں :

"مگر ہم کو پتا نہیں لگتا کہ شاہ صاحب نے وہ بیان کہاں سے اخذ کیا ہے ۔ اگر انھوں نے بذریعہ اپنے مکاشفہ کے بیان کیا ہے تو اس میں کچھ کلام نہیں اور اگر انھوں نے کتاب اور سنت سے اخذ کیا ہے تو ہم کو امید ہے کہ کوئی دوست ہم کو اس کے ماخذ سے مطلع فرمائے گا۔" (۱)

اسی طرح "حجۃ اللہ البالغۃ" کے مبحث اول میں دوسرا اور تیسرا باب عالم مثال اور ملاء اعلی پر ہے (۲) اور علما و صوفیہ کے یہاں یہ اصطلاح عام ہے ۔ ملاء اعلی کی تشریح خود سرسید نے اپنی تفسیر میں ایک مقام پر کی ہے ۔(۳) لیکن سرسید نے اس کے بارے میں کافی واقفیت نہ ہونے کا اعتراف کیا ہے ۔(۴)

اسی طرح معراج کے بارے میں شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ آپ کو مسجد اقصی تک سیر کرائی گئی اور وہاں سے سدرۃ المنتہی تک اور جہاں تک اللہ تعالی نے چاہا آپ کو لے جایا گیا اور یہ تمام باتیں حالت بیداری میں بجسدہ پیش آئیں ۔ لیکن یہ واقعہ ایک ایسے مقام میں ہوا جو برزخ کی طرح عالم مثال اور عالم شہادت کے درمیان ہے جس میں دونوں کے احکام جمع تھے ۔ (۵)

[illegible]

(۱) ~~سرسید احمد خان~~، "آخری مضامین سرسید"، محولہ بالا، ص ۹۶

(۲) عبد الحق حقانی، ابو محمد (مترجم)، "حجۃ اللہ البالغۃ"، محولہ بالا، ج اول، عالم مثال، ص ۲۵

ایضاً، ج اول، ملاء اعلی، ص ۲۹

(۳) سرسید احمد خان "تفسیر القرآن"، محولہ بالا، ج پنجم، صص ۸۰-۷۹

(۴) اسمعیل پانی پتی، "مقالات سرسید"، محولہ بالا، حصہ سوم، صص ۷۷-۱۷۶

(۵) عبد الحق حقانی، ابو محمد (مترجم)، "حجۃ اللہ البالغۃ"، محولہ بالا، ج دوم، باب سیر النبی صلعم، ص ۵۲۹

اس کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں :

"یہ انہی کی رائے یا مکاشفہ ہے جس کا پتا نہ کسی روایت میں ہے نہ اقوال علما میں سے کسی قول میں۔" (۱)

اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

"شاہ ولی اللہ صاحب نے آنحضرت صلعم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معراج میں جانا بجسد برزخی بین المثال والشہادہ بیان کیا تھا اور ہم نے کہا تھا کہ ہم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔" (۲)

یہ تو وہ چند مقامات ہیں جہاں سرسید نے خود اپنے عجز فہم یا نقص علم کا اعتراف کیا ہے۔ ہم ان مقامات کا احصا نہیں کرسکتے جہاں سرسید کے سمند فکرو فہم نے ٹھوکر کھائی ہے اور یہ بحث ہمارے موضوع کے دائرے میں بھی نہیں آتی۔

شاہ ولی اللہ کی شخصیت اور سرسید :

اب شاہ صاحب کی شخصیت اور ان کے علمی کاموں اور ان کی تصنیفات کے بارے میں سرسید کے افکار پر ایک اجتماعی نظر ڈال لینی چاہیے۔ تاکہ معلوم ہوسکے کہ بحیثیت مجموعی شاہ صاحب اور ان کے کاموں کو سرسید کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ سرسید نے شاہ صاحب کو متعدد مقام پر "امام حجۃ الاسلام" کے لقب سے اور ایک مقام پر "حجۃ اللہ فی الانام" کے لقب سے ملقب کیا ہے۔(۳) ایک مقام پر انہیں ان علما میں شمار کرتے ہیں جنہوں نے بندشوں کو توڑا اور میدان تحقیق میں بہادرانہ قدم رکھا۔ اور اس سلسلے کے علما میں انہیں آخری شخصیت قرار دیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ انہوں نے چوں کہ قدیم تقلیدی ماحول میں پرورش پائی تھی اس لیے ان کی تصانیف میں کہیں کہیں ان کے چھٹپن کے ماحول اور بندشوں کے نشانات پائے جاتے ہیں

---

(۱) سرسید احمد خان، "تفسیر القرآن"، محولہ بالا، ج ششم، ص ۷۵

(۲) ایضاً، ج ششم، ص ۱۰۷

(۳) اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) "مقالات سرسید"، محولہ بالا، حصہ دوم، ص ۲۸-۲۲۷

اور اس لیے اگر ایک جگہ نہایت اعلا مضامین مثل ایک شفاف اور خوش گوار دریا کے بہتے چلے آتے ہیں اور ایک صفحہ الہام ربانی سے مزین نظر آتا ہے تو دوسری جگہ وہ دریا قدیم ماحول اور مقلدانہ افکار میں بند نظر آتا ہے اور سڑا ہوا پانی معلوم ہوتا ہے اور دوسرا صفحہ دیکھ کرتعجب ہوتا ہے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

" انسان کا دماغ کیسا ہی روشن ہوجایے اور وہ کیسی ہی دلی قوت اور نڈر جرات اور بے خوف ملامت سے ان تعلیمی اور تقلیدی اور تربیتی بندشوں کو توڑنا چاہے ، جن سے وہ اپنے بچپن سے بندھا ہوا ہے ۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی بندش اس کو باندھے رہتی ہے ۔ ہمارے ہاں کے علما کا بھی جنھوں نے ان بندشوں کو توڑا اور میدان تحقیق میں بہادرانہ قدم رکھا اور جن کا سلسلہ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب پر ختم ہوتا ہے یہی حال ہوا ہے ۔ ان کی تصانیف میں ان سخت بندشوں کے جا بجا کہیں نشان پائے جاتے ہیں ۔ نہایت عالی دماغی سے ایک عمدہ مضمون لکھتے چلے جاتے ہیں جو مثل ایک شفاف اور خوش گوار دریا کے بہتا چلا جاتا ہے پھر جاکر اسی بند میں بند ہوجاتا ہے اور سڑا ہوا پانی معلوم ہوتا ہے ۔ان کی تصانیف کے ایک صفحے کو دیکھو تو الہام ربانی معلوم ہوتا ہے اور دوسرے صفحے پر ایسا مضمون آجاتا ہے جس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔" (۱)

ایک اور مقام پر انھوں نے " حجۃ اللہ البالغہ " کی بڑی تعریف کی ہے لیکن ساتھ ہی اس ضرورت کی طرف بھی توجہ دلاتی ہے کہ موجودہ دور میں ان مضامین کو موجودہ دور کے انداز تصنیف و تالیف ، علمی معیار اور زمانۂ حال کے مقتضی کے مطابق نئے دلائل و براہین سے مزین و مرتب کرکے پیش کرنا چاہیے ساتھ ہی ان میں ایسا اسلوب اختیار کیا جائے کہ وہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں اور دیگر مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کے لیے بھی یکساں طور پر مفید ثابت ہوں۔

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) ، " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، حصہ سوم ، ص: ۱۳-۱۱۲

سرسید لکھتے ہیں :

" اگلے لوگوں نے جن میں سب کے سرتاج امام حجۃ الاسلام غزالی ہیں اور سب کے آخر شاہ ولی اللہ صاحب ہیں ۔ ان کی نسبت بھی ان کٹ ملاؤں نے اسرار دین کے بیان کرنے کے سبب سے بہت سے کفر کے فتوے دیے ہیں۔ ان فتوؤں سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑا ۔ مگر ان کٹ ملاؤں کی ہنڈیا میں جو تھا وہی ان کے چمچوں میں نکل آیا۔

اس علم یعنی علم اسرار دین میں "احیاء العلوم" امام حجۃ الاسلام غزالی کی اور "حجۃ اللہ البالغۃ" شاہ ولی اللہ صاحب کی نہایت عمدہ کتابیں ہیں۔ مگر زمانہ حال کے مطابق ان کو بھی کامل نہ سمجھنا چاہیے ۔ اس لیے کہ اس زمانے میں بہت سی چیزیں اب معلوم یا مروج ہوئی ہیں جو اس زمانے میں نہ تھیں اور یہ کہ طرز تحریر اور طریق تقریر اور مدار استدلال اور طریقہ ایراد اس زمانے میں نئے طور پر شروع ہوا ہے جو ان زمانوں میں نہ تھا اور یہ کہ حال کے زمانے کے لوگوں کے خیالات کو بہ نسبت اس زمانے کے بہت زیادہ وسعت ہوگئی ہے اور یہ کہ ان کتابوں میں بہت سی باتیں بر بنیاد امورات مسلمہ مذہبی بیان کی گئی ہیں جو صرف معتقدین اسلام کے لیے بلا شبہ مفید ہیں۔ مگر بہ لحاظ شان و قدر و منزلت اس علم کے اس کے بیان کا پیرا انداز ایسا عام ہونا چاہیے جو معتقدین اور غیر معتقدین سب کے لیے مفید اور برابر موثر ہو۔

پس وہ مطالب اس لائق ہیں کہ ان کو حال کے پیرایہ تقریر کے موافق از سر نو بیان کیا جائے ۔ مگر یہ کام اسی سے ہوسکتا ہے جس پر خدا کی مہربانی ہوتی ہو اور اس کے دل کو نور ایمان سے منور کیا ہو اور کچھ حصہ علم لدنی سے عطا فرمایا ہو ۔" (۱)

ایک اور مقام پر سرسید نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو دور آخر کے ان محقق و فلسفی علما میں شمار کیا ہے جنھوں نے اپنے افکار کی بنیاد حکمت پر رکھی ہے اور اس

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) "مقالات سرسید"، محولہ بالا، حصہ اول، ص ۳۰-۳۱

لیے ان کی تصانیف میں ہر امر کے ثابت کرنے کے لیے ایک فلسفیانہ قاعدہ نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کم علم اور پابند روایات علما میں مقبول نہ ہوئے اور ان کی تصانیف مروج نہیں ہوسکیں۔ سرسید نے ان کی تصنیفات کے عدم قبول اور رواج پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور اس کے اسباب کی جستجو بھی کی ہے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

" بعض بزرگوار ذی علم لوگوں نے .... اپنی تصنیف کے دائرے کو بھی وسیع کردیا ہے ۔ وہ ہرچیز کے امکان کو خدا تعالی کی قدرت کاملہ کی طرف منسوب کرکے اس بنا پر ہر ایک واقع کو صحیح خیال کرتے ہیں اور اس کے وقوع کے امکان کو منطقی دلیلوں سے تائید کرکے اپنے مذہب کے مخالف عیب چینوں کو جواب با صواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ کتابیں در حقیقت ایسی مصرح اور مدلل لکھی گئی ہیں کہ کوئی شخص جو کسی مذہب کو مانتا ہو اور مذہبی معجزات کا قائل ہو ۔ کسی عقیدہ مندرجہ کتب مذکور پر بدون اس کے کہ اپنے مذہب کو بھی ویسے ہی الزامات اور اعتراضات کا مورد بنادے، حرف گیری نہیں کرسکتا۔

لیکن اس شخص کے نزدیک جو قوانین قدرت کے برخلاف کسی امر کے ہونے پر اعتقاد نہیں رکھتا اور وحی اور الہام کو بھی نہیں مانتا ۔ ان کتابوں کی دلیلیں جن کی صحت کی بنا مذہب کے اوپر ہے ۔ اس آدمی کی مانند ہیں جس کی صرف ایک ٹانگ ہو اور چلنے پھرنے سے عاری ہو ۔

ان علما نے جو اوروں کی نسبت زیادہ ذی علم تھے اپنی تصانیف میں ایک فلسفیانہ قاعدہ اس امر کے ثابت کرنے کے لیے اختیار کیا ہے کہ مذہب علم سے مطابقت رکھتا ہے ، انھوں نے ہر روایت کی صحت کی تحقیق کی ہے اور ہر ایک لفظ کے معنوں پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان الفاظ سے کیا مراد ہے ۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ ان علمائے فلسفی میں سب سے پیچھے خیال کیے جاتے ہیں ۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ ایسی تصنیفات جیسی

ان کی ہیں، کچھ زیادہ مطبوع و مروج نہ ہوئیں - کچھ تو اس وجہ سے کہ ان کے مضامین عام لوگوں کے احاطہ فہم و ادراک سے باہر ہیں اور کچھ اس سبب سے کہ وہ ان بزرگوں مصنفین کے مطبوع خاطر نہیں جو عقائد مذہبی پر فلسفی دلیلوں لانے پر اعتراض کرتے ہیں اور اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ مذہب کے ثبوت پر حکمت سے استدلال کی جائے -

پہلی قسم کے علما کو جنہوں نے اپنے مذہب کے واسطے فلسفی دلائل پیش کرنے میں جانفشانی کی ہے، دوسری قسم کے علما ان کو دین حق کا دشمن قرار دیتے ہیں اور ان کو گم راہ کہتے ہیں، جس اتہام سے خود شاہ ولی اللہ صاحب بھی نہیں بچے -" (۱)

جس حقیقت کے اظہار و وضاحت کے لیے ہم نے یہ داستان چھیڑی گئی تھی - وہ مقصد پورا ہوگیا- اب اس داستان کو طول دینا پیش نظر مقصد کے لیے بالکل ضروری نہیں البتہ یہ امر واضح کردینا ضروری ہے کہ سرسید شاہ ولی اللہ کے معترف ضرور تھے لیکن انہوں نے شاہ صاحب کے علوم و معارف پر مقلدانہ نظر نہیں ڈالی بلکہ معارف ولی اللہی کے مطالعے میں بھی انہوں نے اپنی عقل و بصیرت کو رہنما بنایا- یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بعض مقامات پر شاہ صاحب پر تنقید کی ہے - لیکن علوم و فنون کے مطالعے میں عقل و بصیرت کو رہنما بنانا اور مقلدانہ کسی استاد کے پیچھے نہ چلنا بھی شاہ صاحب علیہ الرحمہ کا فیضان ہے - اس لیے کہ روایت پرست و تقلید شعار ہندوستان میں مجتہدانہ فکر و نظر کی حامل وہی ایک شخصیت ہے - سرسید نے اس عہد کے مسائل اور گرد و پیش کے حالات میں اپنی راہ بناکر فی الحقیقت حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی بلند سیرت، ان کے مجتہدانہ انداز فکر اور غیر مقلدانہ

---

(۱) سرسید احمد خاں، "الخطبات الاحمدیہ"، محولہ بالا، بارہواں خطبہ، ص ۵۱-۲۵۰

مقلدانہ نظر کی پیروی کی ہے -

شاہ ولی اللہؒ کا مسلک اور سرسید؛

آخر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے مسلک کی طرف اشارہ کرکے یہ بتادیا جائے کہ سرسید کا اس مسلک سے کیا تعلق تھا - شاہ صاحب نے اپنے مسلک کے بارے میں اپنی خود نوشت میں نہایت واضح الفاظ میں لکھا دیا ہے کہ مذاہب اربعہ، ان کے اصول اور ان احادیث کے مطالعے کے بعد جن سے ائمہ اربعہ اپنے مذہب کا استدلال کرتے ہیں، میں فقہائے محدثین کے طریق پر قائم ہوگیا ہوں اور اس فیصلے میں اشارہ غیبی اور تائید الہی بھی شامل رہی ہے - شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں :

" بعد ما طالعت کتب المذاہب الاربعہ و اصولہا و نظرت فی الاحادیث التی یتمسکون بہا اعتزمت علی طریق الفقہاء المحدثین باشارۃ دوالغیب وایمائہ "(۱)

مولانا عطا اللہ حنیف نے اس مقام پر ایک نہایت محققانہ حاشیہ لکھا ہے جس میں فقہائے محدثین کی وضاحت کے ساتھ شاہ صاحب کے مسلک کو انہیں کے الفاظ میں منقح کردیا ہے - اور کمال ایجاز و اختصار کے ساتھ واضح کردیا ہے کہ فقہائے محدثین سے مراد امام احمد بن حنبل ، امام بخاری، امام مسلم ، امام شافعی وغیرہم ہیں اور کہ مذاہب اربعہ میں امام شافعی کا مذہب سنت و حدیث نبوی سے زیادہ قریب ہے - شافعی کی نظر حقیقت اسباب و علل تک پہنچی ہوتی ہے - وہ تفقہ اور استنباط میں محدثین و فقہاء کے امام اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے - یہ لب لباب ہے مولانا نے حنیف کے محققانہ حاشیہ کا - مناسب ہوگا کہ اس مکمل حاشیے پر ایک نظر ڈال لی جائے - حاشیہ یہ ہے :

" وہم الامام احمد بن حنبل و اسحاق بن راہویہ و غیرہما کما

---

(۱) عطا اللہ حنیف بن حسین سلفی بھوجیانی (مرتب) " الجزءاللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف " (ملحقہ الفوز الکبیر) ، محولہ بالا ، ص ۵-۳

صریح المولف فی الحجۃ ص ۱۵ ج ۱، وقال فی التفہیمات ص ۳۰، ج ۱، واقرب الناس الی المجددیۃ المحدثین القدما انہم کالبخاری و مسلم و اشباہم "(۱) وقال فی الخیر الکثیر ص ۱۲۳" واما ہذہ المذاہب الاربعۃ فاقربہا الی السنۃ مذہب الشافعی المنقح وکان نظرہ یصل الی حقیقۃ العلل و الاسباب "(۲) وقال مثنیا علی الامام الشافعی فی کتابہ قرۃ العینین ص ۲۳۲، مامعربہ " والشافعی آیۃ من آیات اللہ تعالی نظرہ اعمق و فقہہ و استنباطہ اقوی - ہوامام جمیع المحدثین و الفقہاء " -

وقال فی التفہیمات ص ۲۰۲" ونحن ناخذمن الفروع ما اتفق علیہ العلماء لا سیما ہاتان الفرقتان [redacted] المعظیمتان- الحنفیۃ والشافعیۃ و خصوصاً فی الطہارۃ والصلوۃ فان لم یتیسر الاتفاق و اختلفوا فناخذ بما یشہد لہ ظاہر الحدیث و معروفہ "(۳) و تفصیل ہذا الاجمال فی التفہیمات ص ۲۱۲، ج ۱-" (۴)

اقوال ولا یخفی علی من طالع کتبہ کحجۃ اللہ والمصفی و المسوی یری انہ یبصرالحدیث ولا یتقید بمذہب والحق انہ اجل من ان یکون حنفیا او شافعیاً -" (۵)

" اقوال" کے بعد سے آخر تک مولانا محمد عطا اللہ حنیف کی عبارت ہے اور اس میں انہوں نے شاہ صاحب کے مسلک کا فیصلہ کردیا ہے کہ ان کی شخصیت اس سے بہت بلند ہے کہ انہیں حنفی یا شافعی کہا جائے- یہ بات" حجۃ اللہ البالغہ " اور " موطا" کی شرح المصفی اور المسوی کے ہر قاری پر واضح ہوجاتی ہے -

---

(۱) غلام مصطفی قاسمی (مرتب) : " التفہیمات الا لہیۃ " محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۵۴

(۲) عابد الرحمن صدیقی (مرتب) : " الخیر الکثیر"، از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، کراچی : قرآن محل ، س ن ، ص [redacted] ۳۳۵

(۳) غلام مصطفی قاسمی (مرتب) : " التفہیمات الا لہیۃ"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۲۳۲

(۴) ایضاً ، ج ۲، ص ۷۷-۲۷۶

(۵) عطا اللہ حنیف بن حسین سلفی بھوجیانی (مرتب) : " الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف"، (ملحقہ الفوز الکبیر) محولہ بالا ، ص ۵

ٹھیک یہی مسلک سرسید کا تھا لیکن شاہ ولی اللہ جن مسائل کا عدم تحمل وقت کی بنا پر صاف صاف بیان اور جن اعمال حقہ کا وہ اپنے عمل سے اعلان نہ کرسکے تھے - سرسید نے ڈنکے کی چوٹ نہ صرف ان کا اعلان و اظہار کیا بلکہ اپنے عمل کو دوسروں کے لیے نمونہ چھوڑ گئے - رفع یدین، آمین بالجہر، ترک تقلید، تمسک بالکتاب والسنۃ وغیرہ ان کے ایسے ہی اعمال حقہ ہیں- تقلید کے خلاف انھوں نے جتنے شدید الفاظ میں اظہار خیال کیا (۱) وہ اسلامی ہند کی دینی تاریخ میں پہلی مثال تھی-

===xxx====

"آثارالصنادید"

ورود اور تالیف:

"آثارالصنادید" سرسید کی معرکہ آرا تصنیف ہے - (۲) دھلی کی عمارات اور اس عہد کے علما، صوفیہ، شعرا، خوش نویس، ارباب فن کا کوئی تذکرہ علمی، ادبی، تہذیبی، تاریخ دھلی کے آثار قدیمہ کی تاریخ ایسی نہیں جس کے لیے نہایت بلند پایہ تحقیقی، علمی اور تاریخی مواد اس سے حاصل نہ کیا گیا ہو - ۱۸۵۷ع کے بعد بعض طبقے سرسید کے مذہبی خیالات اور سیاسی روش کی بنا پر ناراض ہوگئے لیکن "آثارالصنادید" لکھ کر سرسید نے جو نقوش علمی نشان راہ چھوڑے تھے ان سے سرمو انحراف کی انھیں بھی مجال نہیں ہوئی -

فروری، ۱۸۳۶ع میں سرسید فتح پور سیکری سے تبدیل ہوکر دلی آئے تھے -

---

(۱) سرسید کے مذہبی افکار کے لیے دیکھئے :
حالی، خواجہ الطاف حسین: "حیات جاوید"، محولہ بالا، عنوان: "مذہبی خدمات"، از اول تا آخر
اور خاص تقلید سے متعلق ان کے افکار کے لیے، صص ۵۲۶-۲۷ اور ۵۳۲-۳۳

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین: "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، صص ۵۲-۵۳

اس زمانے میں انھوں نے کئی یادگار کام انجام دیے -

اولاً :- انھوں نے اپنی نامکمل تعلیم کی تکمیل کی طرف توجہ دی اور مولوی نوازش علی ، مولوی فیض الحسن اور مولانا شاہ مخصوص سے تحصیل علمی میں وقت صرف کیا۔

ثانیاً :- " سید الاخبار" جو ان کے بھائی سید محمد نے جاری کیا تھا اور ایک مدت سے سرسید اور ان کے بھائی کے دلی سے باہر رہنے اور پھر بھائی کے انتقال کی وجہ سے بند ہوگیا تھا ، ازسرنو جاری کیا۔

ثالثاً :- " آثارالصنادید" کی تحقیقات کو انھوں نے موضوع بنایا۔

جیسا کہ حالی نے لکھا کہ " سید الاخبار" کا اجرا اور " آثارالصنادید" کی تحقیق کا آغاز سرسید نے اس لیے کیا تھا کہ ان کی آمدنی گھر کے اخراجات کو مشکل سے مکتفی تھی - لہذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو - اس کی ترکیب ان کی نظر میں یہ آئی کہ " سیدالاخبار" کو دوبارہ جاری کیا جائے اور دھلی اور قرب و جوار کے آثار قدیمہ پر ایک کتاب لکھی جائے - (۱) جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے وہ تو پورا نہ ہوا ، اخبار جاری نہ رہ سکا جلد ہی بند ہوگیا۔ آمدنی میں کوئی اضافہ " آثارالصنادید" کی اشاعت سے بھی نہ ہوا۔ بلکہ تجارتی نقطہ نظر سے اس کاروبار میں سراسر نقصان ہوا - حالی لکھتے ہیں :

" پہلے ایڈیشن میں بھی ایک شخص کی بدعہدی کے سبب جو اس کے چھاپنے کا ذمہ دار ہوا تھا سراسر نقصان رہا -" (۲)

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید" ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۵۲-۵۳

(۲) ایضاً ، ج ۱ ، ص ۵۷

لیکن دھلی کی تاریخ اور آثار و مشاھیر پر ان کی تحقیق کا جو نتیجہ اور ان کے قلم کا جو اثر " آثارالصنادید " کی شکل میں دنیا کے سامنے آیا وہ ایک شاھکار تھا ۔ اس درجہ تحقیقی اور بلند پایہ کتاب اس موضوع پر نہ تو پہلے سے موجود تھی نہ بعد میں ظہور پذیر ھوئی ۔ تاریخ و ادب میں اگر سرسید کے قلم سے صرف یہی ایک کتاب یادگار ھوتی تو وہ بجا طور پر علمی دنیا کے شکریے کے مستحق ھوتے اور تاریخ میں ان کی حیات جاوید کے لیے صرف یہی ایک کتاب کافی ھوتی ۔ چناں چہ ھم دیکھتے ھیں کہ اس کی تاریخی اھمیت کا اعتراف اس وقت کی سب سے بڑی اکادمی لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے کیا اور سرسید کو سوسائٹی مذکور کا آنریری فیلو مقرر کیا ۔(۱)

حالی نے " آثارالصنادید " کی تحقیق و تالیف کے بارے میں لکھا ھے :

" اس زمانے میں جب کہ وہ دلی میں منصف تھے ۔ ان کو عمارات شہر اور نواح شہر کی تحقیقات کا خیال ھوا ۔ سرسید ھمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باھر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ھوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باھر رھتے تھے ان کے ساتھ اکثر ان کے دوست اور ھم دم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ھوتے تھے۔

باھر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا بہت سی عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ھوگئی تھیں ۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے ۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ھوسکتے تھے ۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا ۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ھوگئے تھے ۔ اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے ان سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اس سے کیا مقصود تھا ۔ کتبوں میں جن بادشاہوں کے نام لکھے تھے ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی ۔ بعض

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین : " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۵۷

علمی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہوگئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی ، پھر اکثر عمارتوں کے عرض و طول و ارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت کی صورت حال قلم بند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے، اور ہر ایک کتبے کو بعینہ اس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ چن کاتب مصور سے کھنچوانا، اور اس طرح کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ بر آ ہونا، فی الحقیقت نہایت دشوار کام تھا۔ سرسید کہتے تھے :

"قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جاسکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوالیا جاتا تھا ۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا۔"

سرسید کی آیندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور ان کی یہ حالت بالکل ابوتمام کے اس شعر کی مصداق تھی :

و یصعد حتی یظنّ الجہول
بأنّ لہ حاجۃ فی السّماء

(یعنی وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اس کو آسمان پر کچھ کام ہے)

باوجود اس قدر مشکلات کے "آثارالصنادید" کا پہلا اڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر چھپ کر تیار ہوگیا۔" (۱)

آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن :

"آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن سرسید کے اپنے مطبع ، مطبع سید الاخبار" میں سید عبدالغفور بقا کے زیر اہتمام ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ع میں چھپ کر شائع ہوا ۔

"آثار الصنادید" کی تحقیق و تصنیف اور کتابت و اشاعت کی تیاری میں کل ڈیڑھ سال

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا ، ~~دوسرا باب~~ حصہ اول ، ص ۵۵-۵۲

کی مدت صرف ہوئی تھی - اور یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے - اس سے سرسید کی صلاحیت کار اور تیز رفتاری کا اندازہ ہوتا ہے اور اس صورت میں کہ اس میں بچاسوں نقشے اور کتبے بھی ہیں اور علم و تحقیق کا پیمانہ بھی انتہائی بلند ہے - ہماری حیرت میں اور اضافہ کر جاتا ہے -

" آثارالصنادید " چار ابواب پر مشتمل ہے - سرورق کی پشت (یعنی صفحہ ۲) سے صفحہ ۵ تک نواب محمد ضیاء الدین خان بہادر کے قلم سے منظوم تقریظ ہے - صفحہ ۶ سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے - پہلے از قسم دیباچہ ایک تحریر ہے اسی میں صفحہ ۶ تا ۱۳ پر سرطامس تھافلس مٹکاف صاحب بارونٹ کی مدح میں سرسید کی ایک طویل فارسی مثنوی ہے - دیباچہ کے اسی آخری صفحے پر ابواب کی فہرست ہے -

<u>پہلا باب :</u>

" شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال میں " کے عنوان سے ہے - اس میں تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے - جن میں ہندو اور مسلمان دونوں کی عمارتیں شامل ہیں اور چند کے سوا ہر عمارت کا نقشہ اور کتبہ اس کے ساتھ دیا گیا ہے - باب کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے جس کا دل پر بڑا اثر ہوتا ہے :

بیا و نقش عمارات شهر یاران بین
که این سپهرجفا پیشه چون به پست و شکست

یہ باب صفحہ ۱۴ سے شروع ہوتا ہے لیکن اس سے اگلے صفحہ پر ۱۵ کی بجائے صفحہ ۱ ڈالا گیا ہے - (۱) اس باب کا آخری صفحہ ۲۳۸ ہے گویا کہ یہ باب ۲۳۹ صفحوں پر مشتمل ہے اور یہ کتاب کا سب سے طویل باب ہے - (۲)

---

(۱) چاروں ابواب کے صفحات الگ الگ ہیں - (راقم ابوسلمان)

(۲) انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کے کتب خانہ خاص میں " آثارالصنادید " کے ۱۸۴۷ع، ۱۸۵۴ع ، ۱۸۷۶ع ، ۱۹۰۴ع کے چار ایڈیشن موجود ہیں - ۱۹۶۵ع میں اس کا ایک ایڈیشن کراچی سے اور ایک ۱۹۶۵ع میں دہلی سے شائع ہوا تھا " آثار الصنادید " کے چوتھے باب کے الگ دو ایڈیشن انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) سے شائع ہوئے تھے - نیز یہ باب " مقالات سرسید " ، حصہ شانزدہم میں بھی شامل ہے - یہ تمام ایڈیشن راقم کے سامنے ہیں اور اس تحریر میں ان سے استفادہ کیا گیا ہے - (ابوسلمان شاہجہان پوری)

دوسرا باب :- " قلعہ معلی کی عمارت کے حال میں" کے عنوان سے ہے - اس میں دہلی کا لال قلعہ اور اس کی ۳۲ عمارتوں کا بیان ان کے نقشوں اور کتبوں کے ساتھ ہے - سب سے پہلے لال قلعہ کا بیان ہے - آغاز مثنوی کے اشعار سے ہوتا ہے - پھر نہایت شاعرانہ انداز میں اس کے خندق و کنگرہ کی رفعت و بلندی کا ذکر ہے اور پھر اس کی بناء تعمیر کی تاریخ بیان کی ہے - پھر قلعہ کی دیگر عمارات کا بیان ہے -

یہ باب ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ کتاب کا مختصر ترین باب ہے -

تیسرا باب :- کا اس کا سرعنوان" خاص شہر شاہجہاں آباد کے حال میں" ہے- اس میں خاص دہلی شہر کی شہر پناہ ، دروازوں، آبادیوں، بازاروں اور عمارتوں یعنی مسجدوں، خانقاہوں، مدرسوں، امرا کے مکانوں، حویلیوں، گرجا گھروں، مندروں کے علاوہ باغیچوں اور کنوؤں کا بیان ہے - اس باب کا آغاز بھی دہلی کی تعریف میں فارسی اشعار سے ہوتا ہے - یہ باب ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے -

چوتھا باب :- " دلی اور دلی کے لوگوں کے بیان میں " کے عنوان سے ہے - پہلے دلی کی مدح میں فارسی کے ۲۵ اشعار ہیں - اس سہ دگل کا عنوان جلی یہ شعر ہے :

صفت حضرت دہلی کہ سواد اعظم

ہست مشہور دی از حرسہا اللہ نشان

اس باب میں اول کسی قدر ان آبادیوں ، قلعوں، محلوں وغیرہ کا بیان ہے جو سمت ۳۰۳ بکرمی سے لے کر آخر تک وقتاً فوقتاً اس سر زمین میں آباد و تعمیر ہوئیں- اس کے بعد یہاں کی آب و ہوا اور زبان اردو کا ذکر ہے - اس ابتدائی تحریر کی حیثیت " مشاہیر اہل دہلی" کے تذکرے کی تمہید کی سی ہے - اس بیان کے بعد

سرسید لکھتے ہیں :

" اب میں تھوڑا سا بزرگان معاصرین علیہ الرحمۃ کا جن کے فیض خدمت میں مشرف ہوا ہوں یا اس زمانے میں ان کے وجود باجود سے عالم کو رونق تھی حال لکھتا ہوں۔" (۱)

اس کے بعد اس عہد کی ایک سو انیس اکابر شخصیات پر سرسید کے قلم کی سدابہار تحریر ہے ۔ سرسید نے ان شخصیات کو دس طبقات میں تقسیم کیا ہے ۔ جن کی تفصیل و تعداد حسب ذیل ہے :

۱-	ذکر کبار مشائخین رضی اللہ عنہم	۱۸
۲-	رسول شاہیوں کا بیان	۳
۳-	مجذوبوں کا بیان	۹
۴-	ذکر علمائے کرام	۱۲ (یہاں علمائے کرام سے مراد اطبا ہیں)
۵-	ذکر علمائے دین رضی اللہ عنہم	۲۹
۶-	ذکر قراء و حفاظ	۵
۷-	ذکر بلبل نوایان سواد جنت آباد حضرت شاہجہان آباد	۱۷
۸-	خوش نویسان	۱۱
۹-	مصوران	۳
۱۰-	ارباب موسیقی	۹

یہ کل ایک سو اٹھارہ شخصیات ہوتی ہیں ۔ حالی نے تعداد ایک سو بیس (۲)

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثار الصنادید "، محولہ بالا ، باب چوتھا ، ص ۱۵

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۵۶

اور شیخ محمد اسمعیل پانی پتی نے تعداد ایک سو انیس لکھی ہے -(۱) لیکن دونوں حضرات سے شمار میں غلطی ہوئی ہے - یہ باب صفحات کی تعداد کے لحاظ سے تو پہلے باب سے دو صفحے کم ہے یعنی یہ باب ۲۳۰ صفحوں میں ہے لیکن ادبی نقطہ نظر سے یہی باب کتاب کی جان ہے -

کتاب کے آخر میں چند تقریظات ہیں جو صفحہ ۲۳۱ سے شروع ہوتی ہیں اور صفحہ ۲۳٦ پر ختم ہوتی ہیں۔

- پہلی تقریظ مرزا اسداللہ خاں غالب کے قلم سے ہے - جو فارسی نثر میں ہے - صفحہ ۲۳۱
- دوسری تقریظ مولوی امام بخش صہبائی کے قلم سے ہے - یہ بھی فارسی نثر میں ہے - صفحہ ۲۳۸
- تیسری تقریظ نواب صدرالدین خاں آزردہ کے قلم سے ہے فارسی نظم میں ہے - صفحہ ۲۴۳
- آخری صفحہ (۲۳٦) پر مولوی امام بخش صہبائی کی جودت طبع کی یادگار تاریخ تصنیف کتاب ہے :

" صنفہ سید احمد خاں مصنف "
۱۲٦۳ ھجری

=====xxxx=====

" آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن :

یہ ایڈیشن ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء میں دھلی سے شائع ہوا - سرورق پر " مطبع سلطانی"

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، حصہ شانزدھم، ص ۲۱۰

واقع قلعہ معلی" درج ہے - لیکن اندرونی کتاب ابواب کے شروع میں سرورق پر " مطبع احمدی ، دھلی ، ١٢٧٠ ھجری/١٨٥٣ء عیسوی " درج ہے - گمان یہ ~~ہمارا خیال~~ ہے کہ کتاب کے تینوں باب ١٨٥٣ء میں مطبع احمدی میں چھپ گئے ہوں گے لیکن کتاب کا سرورق اور ابتدائی اوراق ١٨٥٣ء میں مطبع سلطانی میں چھپے ہوں گے -

سرسید نے اس ایڈیشن پر جو دیباچہ تحریر کیا ہے اس سے اس تحریک پر بھی روشنی پڑتی ہے جو دوسرے ایڈیشن کی تیاری کا باعث ہوئی تھی - سرسید لکھتے ہیں :

" ١٢٦٣ ھجری مطابق ١٨٤٦ء کے میں ایک کتاب ضلع دھلی کے مکانات کے حال میں لکھ کر چھاپی تھی اسی زمانے میں جناب مسٹر آرتراسٹن راہرٹس صاحب بہادر صاحب کلکٹر ، مجسٹریٹ شاہجہان آباد ولایت انگلستان کو تشریف فرما ہوئے اور اس کتاب کو لے جاکر رویل ایشیاٹک سوسائٹی ~~سوسیٹی~~ میں پیش کیا - ممبران سوسیٹی نے اس کتاب کو نہایت پسند کیا ان میں سے جناب عالی کرنیل سکس صاحب بہادر شریک محکمہ عالیہ کورٹ آف ڈرئکٹرز نے صاحب ممدوح کو فرمایا کہ اگر اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو تو بہت بہتر ہے ، جب کہ صاحب موصوف ولایت سے ہوکر پھر دھلی میں تشریف لائے تو انھوں نے اس خاکسار کی شرکت سے اوس کتاب کا ترجمہ کرنا شروع کیا اس وقت یہ بات خیال میں آئی کہ اگر اوپر تو کتاب بہت اچھی طرح سے مرتب کی جاوے اور جو خرابیاں کہ پہلی کتاب میں ہوگئی ہیں وہ سب درست کی جاویں تو بہت اچھی بات ہے - الحمد اللہ کہ خدا تعالی نے اس آرزو کو پورا کیا - جس طرح کہ دل چاھتا تھا اسی طرح پر یہ کتاب بھی ہوئی - پہلی کتاب سے یہ کتاب بہت باتوں میں اچھی ہے -" (١)

دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے متن اور مباحث کی ترتیب میں کس حد تک

---

(١) سرسید احمد خان ، " آثار الصنادید " ، محولہ بالا ، (دوسرا ایڈیشن) ، ص ٢-٣

مختلف تھا؟ اس امر پر خود سرسید کی اسی تحریر سے روشنی پڑتی ہے - وہ دفعہ وار لکھتے ہیں :

" ۱- اس کتاب کا پہلا باب جس میں مختصر ہندوستان کی آبادی اور پرانی اور نئی حل داریوں کا ذکر ہے پہلی کتاب میں نہیں تھا۔

۲- پہلی کتاب کے دوسرے باب میں اوس قلعہ کا بھی پہلی کتاب سے بہتر بیان ہے اور علاوہ اس کے ابتدائی آبادی سے آج تک جس قدر قلعہ بنے اور شہر بسے ان سب کا بھی ذکر ہے -

۳- پہلی کتاب کے پہلے اور تیسرے باب میں جس قدر مطالب تھے وہ سب اس کتاب کے تیسرا باب میں بلکہ بعض پرانے مکانات کا اور حال جو دریافت ہوا ہے وہ زیادہ ہے -

۴- پہلی کتاب میں دو نقص تھے ایک یہ کہ بعضے پرانے مکانات کا اصلی حال دریافت نہ ہوا تھا ، دوسرے یہ کہ پہلی کتاب میں بعض جگہ بیان حالات میں کچھ غلطی ہوگئی تھی - اس کتاب میں یہ دونوں نقص دور کیے گئے -

۵- پہلی کتاب میں عمارات کا بیان متفرق اور غیر منظم تھا اب کی دفعہ سب عمارات کا حال بترتیب سال بڑا انتظام سے لکھا گیا ہے۔

۶- پہلی کتاب میں جو حال بیان کیا گیا تھا اس کی سند نہ تھی اب کے کتاب میں جو حال لکھا گیا ہے اکثر اوس کی سند کے لیے نام اوس کتاب تاریخی کا جس سے وہ حال لکھا گیا حاشیہ پر مندرج ہے -

۷- بڑی عمدہ بات اس حال کی کتاب میں یہ ہے کہ جس قدر کتبہ پرانی

عمارتیں پر ہیں وہ سب اصلی قطع اور اصلی خط کے مطابق مندرج ہیں۔"(۱)

اس کے بعد ان کتابوں کی طویل فہرست ہے جن سے "آثارالصنادید" کی تحقیق و تالیف میں مدد لی گئی ہے ۔ پھر تصحیح کے سلسلے میں کرنیل سکس صاحب بہادر اور مسٹر آرتھر اسٹن راپرٹس صاحب بہادر کی قدر دانی اور رئیس پروری کا اور اشاعت میں مسٹر ایڈورڈ تھامس صاحب بہادر کے تعاون کا شکریہ ادا کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد فہرست ابواب دی گئی ہے اور جیسا کہ سرسید کے دیباچے سے کتاب میں تبدیلیوں کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ فہرست ابواب کتاب سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہے ۔" فہرست ابواب کتاب" یہ ہے :

- آخر میں چند صفحے انگریزی میں ہیں۔

پہلے ایک صفحے میں سرسید کے خاندانی حالات ہیں ، دو صفحے کا دیباچہ ہے اور تین صفحوں میں - قطب مینار پر ایک مختصر مگر جامع مضمون ہے ۔

---

(۱) سرسید احمد خاں ، " آثار الصنادید"، محولہ بالا ، (دوسرا ایڈیشن) ، ص ۵-۳

کتاب کے اور فہرست ابواب کتاب کے مطالعے سے ان تبدیلیوں کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے جو دوسرے ایڈیشن کو پہلے ایڈیشن سے ممتاز کرتی ہیں ۔ اجمالاً ان پر پھر ایک نظر ڈال لینی چاہئے ۔ مثلاً

۱- اس ایڈیشن میں پہلا باب اضافہ ہے ۔

۲- پہلے ایڈیشن کے باب اول کی تمام معلومات کو اس ایڈیشن کے باب سوم میں شامل کردیا گیا ہے ۔ جس سے اس ایڈیشن کے باب سوم کی ہیئت و ضخامت دونوں بدل گئی ہیں۔ نیز اسی تیسرے باب کے شروع میں کوئی دس (زائد) صفحوں میں اس باب سے متعلق عمارتوں کی تاریخ بنا اور بانی وغیرہ کے ناموں کی فہرست جدول کی شکل میں دی گئی ہے ۔ اس سے ایک نظر میں عمارتوں کے بارے میں بہت سی بنیادی باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔

۳- پہلے ایڈیشن میں دوسرے باب کا موضوع " قلعہ معلی کی عمارتیں" تھا۔ لیکن اس ایڈیشن میں، جیسا کہ سرسید کے دیباچے کی دفعہ ۲ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا دائرہ وسیع ہوگیا ہے ۔ ساتھ ہی پہلے باب کے آخر میں (صفحہ ۲۸-۳۵) دوسرے باب کی فہرست " کے عنوان سے ان تمام قلعوں اور شہروں کے آباد ہونے کی تاریخوں کی فہرست جدول کی شکل میں ہے ۔

۴- اس ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کا چوتھا باب شامل نہیں ہے ۔ دیگر معلومات و مندرجات کی تکمیل ، تصحیح اور ترمیم کے علاوہ اس کی زبان و اسلوب میں بھی پہلے ایڈیشن سے فرق ملتا ہے ۔ اور یہ ایڈیشن کی

خاص خوبی ہے جس پر آئندہ صفحات پر بحث کیجائے گی -

۵- بقول حالی :" اس ایڈیشن کے لیے سرسید نے نقشے بھی از سر نو کمال اہتمام سے تیار کرائے تھے - مگر ابھی چھپنے نہ پائے تھے کہ غدر ہوگیا اور وہ سب نقشے تلف ہوگئے - کچھ نقشے جواب ملے ہیں وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں-"(۱)

دوسرے ایڈیشن کا پہلا باب " دھلی کی حل داروں کے مختصر حالات میں" کے عنوان سے ہے جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھا- یہ اس ایڈیشن میں خاص اضافہ ہے - یہ تحریر جو اپنی افادیت کے لحاظ سے مستقل اہمیت کی حامل ہے - سرسید نے ۱۸۵۲ء میں لکھی تھی- پہلے اسے " آثارالصنادید کے دوسرے ایڈیشن کا باب اول بنادیا گیا اور بعد میں اسے" سلسلة الملوک" کے نام سے الگ بھی شائع کردیا گیا - حالی اس کے بارے میں لکھتےہیں :

" سلسلة الملوک مرتبہ ۱۸۵۲ء - یہ ایک مختصر مگر مفید اور صحیح فہرست ان راجاؤں اور بادشاہوں کی ہے جو دھلی میں پانچ هزار برس سے نوبت بہ نوبت فرمانروا ہوتے چلے آئے - اس میں راجہ یدھشٹر سے لے کے ملکہ معظمہ قیصر ہند تک ۲۰۲ فرمانرواؤں کا نام ، باپ کا نام، سنہ جلوس دارالسلطنت اور یہ کہ اس کا عہد کس کس زمانے میں تھا نہایت تحقیق اور جانفشانی سے لکھا ہے - اصل میں یہ وہی فہرست ہے جو " آثارالصنادید" کے دوسرے ایڈیشن میں پہلے باب کے ساتھ اضافہ کی گئی ہے - اسی کو کسی قدر اصلاح کے بعد علاحدہ چھاپ کر اس کا نام سلسلة الملوک " رکھ دیا ہے-"(۱)

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین " حیات جاوید"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۵۷

(۲) ایضاً ، ج ۱ ، ص ۵۹

حالی کے بیان میں صرف یہ اصلاح کی ضرورت ہے کہ " پہلے باب کے ساتھ اضافہ" نہیں کی گئی بلکہ اسی تحریر کو بطور پہلے باب کے آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کیا گیاہے ۔ دور حاضر کے ایک اور محقق سی ۔ ڈبلیو ۔ ٹرول بھی لکھتے ہیں :

"(طبع ثانی میں) پہلا باب اضافہ شدہ ہے ۔ یہ باب ایسی تاریخی جداول پر مشتمل ہے جن میں اساطیری ادوار سے عہد حاضر تک کے فرمانروایان دہلی کے متعلق تاریخ وار بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔" (۱)

چوں کہ سلسلۃ الملوک کا آثار الصنادید سے خاص تعلق ہے اس لیے اس تحریر کے پس منظر پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے ۔ اور اس مقصد کے لیے سرسید کا بیان کفالت کرتا ہے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

" جس زمانے میں ۔۔۔مسٹر آرتھرآسٹن رابرٹس ۔۔۔ کلکٹر و مجسٹریٹ شاہجہاں آباد نے کتاب " آثارالصنادید" کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا اوراس کی نہایت صحت کی تاکید فرمائی تو بسبب اختلاف کتب تواریخ اور غلطی کاتبوں کے ہر امر کی صحت میں کمال دقت اور نہایت کلفت ہوتی تھی اور بے سبب مرتب ہونے سلسلہ حکومت بادشاہوں اور راجوں کے اس کتاب کی صحت نہ ہوسکتی تھی۔ کیوں کہ اس کتاب میں اگلے بادشاہوں اور امیروں اور راجاؤں کی بنائی ہوئی عمارتوں کا حال ہے ۔ پھر جب تک کہ ان بادشاہوں اور راجاؤں کا حال بصحت معلوم نہ ہو، اس وقت تک اس کتاب کی صحت کیوں کر ہو، اس واسطے میں نے دہلی کے راجاؤں اور بادشاہوں کی فہرست بنائی جس میں پانچ ہزار برس کے راجاؤں اور بادشاہوں کا حال تھا۔ اتفاق سے وہ فہرست صاحب ممدوح کے ملاحظے سے گزری اور پسند طبع عالی ہوئی اس سبب سے میں نے خیال کیا کہ اگر وہ بطریق اسلوب مرتب ہوجاوے اور ایک کتاب بن جاوے تو نہایت مفید ہوگی اور یہ مختصر کتاب وہ فائدہ دے گی جو بڑی بڑی کتابوں سے بھی حاصل نہ ہوتا ۔ اللہ تعالی نے میرے اس ارادے کو

---

(۱) اکرام چغتائی ، محمد (مترجم) ، " آثار الصنادید"، از سی ۔ ڈبلیو۔ ٹرول ، (مقالہ) ، سہ ماہی " اردو"، کراچی : ۱۹۷۵ء ، شمارہ ۲، ص ۱۹۰

پورا کیا اور رفتہ رفتہ وہ فہرست ایک کتاب بن گئی اور " سلسلۃ الملوک" اس کا نام رکھا ۔ خدا کرے کہ پسند طبع صاحب ممدوح کے ہو جن کی قدردانی اور رئیس پروری سے یہ عجیب چیز تالیف ہوئی ۔" (۱)

چناں چہ اس تحریر کی تکمیل کے بعد سرسید نے اسے علاحدہ کتابی شکل میں چھاپ کر شائع کردیا تھا۔ پھر اسے "آثار الصنادید" میں شامل کیا گیا۔ اب اسے لاہور سے سلسلۂ "مقالات سرسید" میں شامل کرلیا گیا ہے ۔ (۲)

دوسری اشاعت میں حالات کی تکمیل ، معلومات کے اضافہ ، اغلاط کی تصحیح ، مباحث کی ازسرنو تدوین ، اور پہلے باب کے اضافے کے علاوہ جو خاص خوبی اس ایڈیشن کی ہے وہ زبان اور اسلوب بیان سے متعلق ہے ۔ حالی نے اس خصوصیت کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے ۔ لکھتے ہیں :

" الغرض یہ اڈیشن ۱۸۴۷ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ اسی زمانے میں مسٹر راپرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ شاہجہاں آباد ولایت جاتے تھے ۔ وہ ایک نسخہ " آثارالصنادید" کا ساتھ لے گئے ۔ اور وہاں جاکر اس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبران سوسائٹی نے اس کو بہت پسند کیا اور کورٹ آف ڈائرکٹرز کے بعض ممبروں نے مسٹر راپرٹس سے کہا کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہوجائے تو بہت بہتر ہے ۔ جب مسٹر راپرٹس ولایت سے واپس آئے تو انھوں نے سرسید کی شرکت سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا ۔ اس وقت سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو کسریں پہلے اڈیشن میں رہ گئی ہیں ان کی درستی اور اصلاح کی جائے ۔ چناں چہ انھوں نے کتاب پر نظر ثانی کرکے اس کو از سر نو مرتب کیا۔ جو کچھ ترمیم یا اصلاح یا اضافہ انھوں نے پہلے اڈیشن

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید"، لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء ، حصہ ششم، ص ۱۲۸

(۲) ایضاً، حصہ ششم، ص ۱۲۲

میں کیا ہے اس کا مفصل ذکر طبع ثانی کے دیباچے میں مندرج ہے - نئی خوبی اس نئے ایڈیشن میں یہ ہے کہ اس کی عبارت میں بہ نسبت پہلے ایڈیشن کے نہایت سادہ ہے اور اس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفات باردہ سے بالکل پاک ہے -" (۱)

سرسید کی اصلاحات اور تبدیلیاں:

گزشتہ سطروں میں اس ایڈیشن میں حوالوں اور معلومات کے اضافے اور تصحیح کے علاوہ زبان و بیان کی تبدیلیوں کا ذکر بھی آیا ہے - مناسب ہوگا کہ پہلے ان تبدیلیوں پر نظر ڈال لی جائے پھر اس پر تبصرہ کیا جائے - پہلے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) کی عبارت پہلے اور دوسرے ایڈیشن (۱۸۵۴ء) کی عبارت اس کے بعد نقل کی جاتی ہے + اس مقصد کے لیے ہم نے باب اول اور سوم میں سے تین مختلف مقام سے عبارتوں کا انتخاب کیا گیا ہے -

اشاعت اول :

۱- اسی واسطے خاک پائے اہل ہنر خوشہ چین معنی طرازان سخنور امیدوار رحمت صمد سید احمد مخاطب بخطاب جوادالدولہ عارف جنگ بیٹا سید محمد متقی خان بہادر مرحوم اور پوتا جوادالدولہ جواد علی خان بہادر مرحوم اور نواسا نواب دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خان بہادر مصلح جنگ کا دانایان اولی الابصار اور صاحب طبعان روزگار کی خدمت میں عرض کرتا ہے - (۲)

اشاعت ثانی :

۱- اما بعد ! سید احمد خان بیٹا سید محمد متقی خان بہادر اور پوتا

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، محولہ بالا، ج ۱، ص، ۵۷-۵۶

(۲) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید "، (۱۸۴۷ء — اشاعت اول) ، ص ۷-۶

جوادالدولہ جواد علی خان بہادر اور نواسا نواب دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خان بہادر مصلح جنگ کا یہ عرض کرتا ہے -" (۱)

اشاعت اول :

(۲) اسی بازار میں یہ ایک مسجد ہے ، دل کش و دل ربا ، فرحت بخش و روح افزا سرسے پاؤں تک سنگ سرخ کی اور گرد اس کے مکانات اور حجرہ طالب علموں کے لیے بنے ہوئے ہیں - ضلع غربی سے ملحق کرسی دے کر مسجد بنائی ہے - جس کی رفعت و شان کے آگے گنبد اخضرفلک پست ہے اور جس کی عظمت و جلال کے آگے ملاء اعلا گرد ہے - اس مسجد فیض بنیاد کو اعزازالنساء بیگم بیوی شہاب الدین محمد شاہجہان نے ۱۰۶۰ ھجری مطابق ۲۳ جلوس کے بنائی ہے - ان بیگم کا خطاب اکبرآبادی محل تھا - اس سبب سے یہ مسجد بھی اکبر آبادی مسجد مشہور ہوگئی ہے -

اس مسجد کے تین برج اور سات در ہیں - مسجد کی عمارت ترپسٹھ گز طول میں اور سترہ گز عرض میں ہے سنگ سرخ کی اور اس کا پیش طاق سنگ مرمر کا پرچین کار ہے اور اس کے آگے ایک چبوترہ ہے ترپسٹھ گز اور ستاون گز کے عرض ہے ساڑھے تین گز کا اونچا اور اس پر سنگ سرخ کا کٹہرا لگا ہوا ہے اور اس کے آگے ایک حوض ہے بارہ سے بارہ گز کا کہ چشمۂ آفتاب و ماہتاب پر شوق لے جاتا تھا اور نہر کا پانی اس میں آتا تھا - بیت

درون صحن حوضے پصد آب و تاب

درخشندہ چوں چشمۂ ماہتاب

---

(۱) سرسید احمد خان ، " آثارالصنادید" ، (۱۸۵۴ع - اشاعت ثانی) ، ص ۳

جب سے یہ شہر خراب ہوگئی اس حوض میں بھی پانی نہیں رہا۔ اس کے گرد حجرے بنے ہوئے ہیں۔ ایک سو چوبیں گز کے طول اور ایک سو چار گز کے عرض سے - اور ہر حجرے کے آگے ایک ایوان ہے اور اس کے آگے سو تاسو چار گز کے عرض سے چبوترہ تھا۔ اور اس مسجد کے دو مینار ہیں بہت بلند۔ منجملہ ان کے شمالی مینار بجلی کے صدمے سے ٹوٹ گیا ہے اور اب تک ویسا ہی ٹوٹا پڑا ہے - اور اس کے دروازے پر ایک کتبہ ہے خط نسخ میں " (۱)

اشاعت ثانی:

شہر شاہجہان آباد کے فیض بازار میں یہ مسجد واقع ہے -

نواب اعزاز النساء بیگم عرف[(۲)] اکبر آبادی بیگم زوجہ شاہجہان بادشاہ نے ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء کے یہ مسجد بنائی -

اس مسجد کے تین برج اور سات در ہیں - مسجد کی عمارت ترپسٹھ گز لمبی اور سترہ گز چوڑی تین سنگ سرخ کی ہے - اس کا پیش طاق خراسنگ مرمر کا نہایت پرچین کار ہے - اس کے آگے ایک چبوترہ ہے سنگ سرخ کا کٹہرہ دار - ترپسٹھ گز کا لمبا اور ~~سترہ~~ سترہوں گز کا چوڑا اور ساڑھے تین گز کا اونچا - اس کے آگے سنگ سرخ کا ایک حوض ہے۔

مسجد کا ~~کے~~ صحن ایک سو چوبیں گز لمبا اور ایک سو چار گز چوڑا ہے اور اس کے گرد طالب علموں کے رہنے کے لیے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کے دروازے پر کتبہ سنگ موسی

---

(۱) سر سید احمد خان، " آثار الصنادید "، محولہ بالا، (۱۸۴۷ء) اشاعت اول، باب تیسرا، ص ۳۶-۳۵

(۲) صحیح نام اعزالنساء ہے جیسا کہ اشاعت اول میں ہے - اعزاز النسا، یا اعزازالنسا (آثار الصنادید، دھلی، ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۳) درست نہیں - مسجد کے کتبات میں بھی اعزالنسا ہے - دیکھئے: " آثار الصنادید "، ۱۸۴۷ء باب تیسرا، ص ۳۶ ۱۸۵۴ء کتبے ھا ص ۳۲، ۱۸۷۶ء باب تیسرا ص ۱۹، ۱۹۰۴ء کتبہ ھا، ص ۶۷، ۱۹۶۵ء کتبہ ھا ص ۳۳۱ و ۱۹۶۶ء ص ۱۷۸

کی پچی کاری سے کھدا ہوا ہے - (۱)

اشاعت اول :

(متن) یہ لاٹھ حقیقت میں " مسجد قوت الاسلام" کا مینار ہے - اس کی رفعت اور شان اور بلندی اور خوش صافی کا بیان نہیں کیا جاسکتا - یہ لاٹھ اس قدر بلند ہے کہ بہت دور دور کے پھرنے والے بجز ایک آدھ جگہ کے ایسی بلند کوئی عمارت روئے زمین پر نہیں نشان دیتے - نقل مشہور ہے کہ اگر اس کے نیچے کھڑے ہوکر اوپر دیکھو تو نیچے والے کو نیچی اور بڑی والے کو پکڑی تھام کے دیکھنا پڑتا ہے - یہ لاٹھ اس قدر بلند ہے کہ آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے اوپر سے بے شک آسمان کو پکڑ لوں گا - اور اس نردبان آسمانی کے ذریعے سے بے شبہ آسمان پر چڑھ جاؤں گا - بارہا لوگوں کو اتفاق ہوا ہے کہ ساون بھادوں کے مہینے میں کہ عین موسم پھول والوں کی سیر کا ہوتا ہے ، اس لاٹھ پر چڑھے ہوئے ہیں - جب نیچے اترے تو دیکھا کہ خوب مینہ برس گیا ہے جب جانا کہ اللہ اکبر ابر اس لاٹھ سے نیچا تھا - اس لاٹھ کے اوپر سے نیچے کے آدمی ذرا ذرا سے معلوم ہوتے ہیں ، اور چھوٹے چھوٹے آدمی ، ننھے ننھے ہاتھی گھوڑے دکھائی دینے کے سبب بڑا تماشا معلوم ہوتا ہے - اور اسی طرح نیچے والوں کو اوپر کے لوگ ذرا ذرا سے معلوم ہوتے ہیں اور ایسا شبہ پڑتا ہے کہ فرشتے آسمان پر سے اترتے ہیں - غرض کہ یہ لاٹھ عجائب روزگار کے سے ہے - کہ روئے زمین پر اپنا مثل نہیں رکھتی - باوجود اس قدر بلندی اور عظمت کے ، ایسی خوب صورت خوش قطع بنی ہوئی ہے کہ بے اختیار دیکھنے ہی کو جی چاہتا ہے - اس لاٹھ میں بالکل سنگ سرخ لگا ہوا ہے اور چوتھا درجہ سنگ مرمر کا ہے - ہر ہر درجے پر آیات قرآنی کھدی

---

(۱) سرسید احمد خاں ، " آثارالصنادید" ، (۱۸۵۴ ء) ، تیسرا باب ، ص ۷۱-۷۰

ہوتی ہیں۔ اور جا بجا منبت کاری بھی ہوتی ہے ۔ اس لاٹھ کے بیچ میں مدور اور
کمر کی ایسی خوب صورت پٹیں ہیں کہ جس کا کچھ بیان نہیں ہوسکتا۔ چوں کہ
اس کی خوبی تو بیان سے باہر ہے ۔" (۱)

اشاعت ثانی :

(۳) اس عمارت کی رفعت اور شان اور بلندی اور خوش نمائی کا بیان نہیں کیا جاسکتا ۔ حقیقت میں یہ عمارت ایسی ہے کہ روئے زمین پر اپنا مثل نہیں رکھتی۔ نقل مشہور ہے کہ اگر اس کے نیچے ، کھڑے ہوکر اوپر دیکھو تو ٹوپی والے کو ٹوپی اور پگڑی والے کو پگڑی تھام کر دیکھنا پڑتا ہے ۔ اس لاٹھ پر سے نیچے کے آدمی ذرا ذرا سے معلوم ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے آدمی ننھے ننھے ہاتھی گھوڑے دکھائی دینے سے عجب کیفیت معلوم ہوتی ہے ۔ اسی طرح نیچے والوں کو اوپر کے آدمی بہت چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ غرض کہ یہ لاٹھ عجائب روزگار سے ہے ۔ باوجود اس قدر بلندی اور عظمت کے ایسی خوب صورت اور خوش قطع بھی ہوئی ہے کہ بے اختیار دیکھنے کو جی چاہتا ہے ۔ اس لاٹھ کے نیچے کے درجے کی ایک انچ مدور اور ایک کمرکی پٹائی ہے ۔ اور دوسرے درجے کی سب پٹیں مدور ہیں ۔ اور تیسرے درجے کی سب پٹیں کمر کی ہیں اور اوپر کے دونوں درجے گول ہیں اور تمام پتھر سنگ سرخ کا لگا ہوا ہے ۔ مگر چوتھے درجے میں سنگ مر مر بھی ہے ۔ اور ہرجگہ منبت کاری اور گل کاری ایسی خوب صورتی سے کی ہے کہ اس کی ہر ایک بیل مسلسل پر ہزاروں معشوقوں کی زلف دوتا

---

(۱) سرسید احمد خاں، "آثارالصنادید"، (۱۸۴۷ء) ، باب پہلا ، ص ۲۹-۱۲۸

قربان ہے اور اس کے ادنا سے ادنا پھول ہنگفتگی پر سینکڑوں گل رخوں کے لب جاں بخش نثار ہیں۔ (۱)

ان اقتباسات کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں سرسید نے ـــ

۱- فارسی تراکیب اور مقفع و مسجع عبارت آرائی سے گریز کیا ہے مثلاً پہلے اقتباس میں سے انہوں نے یہ جملے اور تراکیب حذف کردی ہیں

"اسی واسطے خاک پائے اہل شہر خوشہ چیں معنی طرازان سخنور امید وار رحمت صمد .... مخاطب بخطاب جوادالدولہ عارف جنگ" ..... دانایان اولی الابصار اور صاحب طبعان روزگار کی خدمت میں۔"

۲- انہوں نے شاعرانہ اور غیر تاریخی انداز بیان کو ترک کردیا ہے ۔ مثلاً دوسرے اقتباس میں سے ان جملوں پر غور فرمائیے:

(الف) مسجد کی تعریف میں : "دل کش و دل ربا، فرحت بخش و روح افزا ۔"

(ب) "جس کی رفعت و شان کے آگے گنبد اخضر پست ہے اور جس کی عظمت و جلال کے آگے ملاء اعلا گرد ہے ۔"

(ج) حوض کی تعریف میں : "کہ چشمۂ آفتاب و ماہتاب پر شرف لے جاتا ہے اور شہر کا پانی اس میں آتا تھا ۔ بہت

---

(۱) سرسید احمد خاں: "آثارالصنادید"، (۱۸۵۳ء ، تیسرا باب، ص ۱۵۱۔

در ان صحن حوضے بصد آب و تاب

درخشندہ چوں چشمۂ ماھتاب

جب سے یہ شہر خراب ہوگئی ہے اس شہر میں بھی پانی نہیں رہا۔"

(د) آخری اقتباس میں قطب صاحب کی لاٹ کی بلندی کی تعریف میں : " یہ لاٹھ اس قدر بلند ہے کہ آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے اوپر سے بے شک آسمان کو پکڑ لیں گا ۔ اور اس نردبان آسمانی کے ذریعے سے بے شبہ آسمان پر چڑھ جاؤنگا۔"

۳- ان عبارتوں کے حذف سے عبارت ہر جگہ خود بخود مختصر ہوگئی ہے لیکن بعض مقامات پر انھوں نے عبارت کی تلخیص کردی ہے ۔ مثلاً پہلے ایڈیشن میں یہ جملہ تھا :

" یہ لاٹھ اس قدر بلند ہے کہ بہت دور دور کے بسنے والے بجز ایک آدھ جگہ کے ایسی بلند کوئی عمارت روئے زمین پر نہیں نشان دیتے ۔"

دوسرے ایڈیشن میں عبارت کی اس طوالت نے اختصار و ایجاز کا یہ جامہ پہنا ہے :

" حقیقت میں یہ عمارت ایسی ہے کہ روئے زمین پر اپنا مثل نہیں رکھتی ۔"

دوسرے ایڈیشن میں تبدیلیوں سے پہلے یعنی اشاعت اول کی زبان و بیان کے بارے میں حالی نے لکھا تھا :

" اس ایڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ اور تکلفات

بارده کے سبب آج کل کے مذاق کے موافق بہت پھیکی اور بے مزہ ہوگئی تھی اور اس کے سوا اس میں اور بھی بہت سی کسریں اور فروگزاشتیں رہ گئی تھیں۔"(۱)
محمد رحمت اللہ رعد نے اس کی زبان کو متروک اور عبارت کو مبالغہ آمیز اور واقعات کے خلاف قرار دیا ہے - (۲)

لیکن دوسرے ایڈیشن میں اصلاح و ترمیم کے بعد اس کی " بہت سی کسریں اور فروگزاشتیں" دور ہوگئی تھیں اور " قدیم طرز کی رنگین" مبالغہ اور تکلفات بارده " میں بھی کمی آگئی تھی بلکہ اس میں یہ خوبیاں پیدا ہوگئی تھیں:

۱- تحریر میں صفائی اور سادگی پیدا ہوگئی ،

۲- خیال آرائی کی جگہ حقیقت نگاری کا رنگ چوکھا ہوگیا۔

۳- انداز بیان کی شاعرانہ قدر و قیمت کے مقابلے میں تاریخی نقطۂ نظر سے اس کے اسلوب کی اہمیت زیادہ بڑھ گئی - رعد نے طبع ثانی کی عبارت کو " صاف اور مورخانہ" لکھا ہے - (۳)

اور ان تمام تبدیلیوں سے سرسید کی تاریخی بصیرت اور شعور کی پختگی کا پتا چلتا ہے -

لیکن اس تاریخی ایڈیشن کی ایک بہت بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں صرف تین باب ہیں، چوتھا باب جو " دلی اور دلی کے لوگوں کے بیان میں تھا" تھا، اس میں شامل نہیں۔

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۵۶
(۲) رعد، محمد رحمت اللہ، " تمہید"، " آثارالصنادید"، کان پور، نامی پریس، ۱۹۰۴ء، ص ۳-۲
(۳) ایضاً، " تمہید"، ص ۳-۲

اسی ایڈیشن کے ذکر میں گزرچکا ہے کہ دوسرے ایڈیشن پر نظرثانی، تصحیح اور از سر نو ترتیب کا خیال سرسید کی یورپ میں اہل علم کو اس سے دلچسپی کی بنا پر پیدا ہوا تھا۔ یورپین اہل علم کی خاص توجہ کا مرکز اس کی تاریخی اہمیت کے ابواب یعنی اس کے ابتدائی تین ابواب تھے اس لیے دوسرے ایڈیشن کے لیے ان کی ساری توجہ انہی ابواب پر مرکوز رہی تھی اور انھیں ابواب کی معلومات کو اہم اضافوں اور ترمیموں اور اصلاحوں کے بعد انھوں نے دوسرے ایڈیشن کی شکل میں شائع کردیا تھا۔ اہل دھلی سے متعلق باب کو انھوں نے غیر ضروری خیال کیا یا ترجمہ کے لیے اس کی ضخامت ایک مناسب حد سے بڑھ جانے کے خیال سے اسے ترک کردیا تھا۔ لیکن حالی کے ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ "آثارالصنادید" ابھی زیر طباعت تھی کہ غدر ہوگیا اور دوسرے ایڈیشن کے تمام نسخے غدر میں ضائع ہوگئے۔ حالی لکھتے ہیں :

> " .... اس ایڈیشن کے لیے سرسید نے نقشے بھی از سر نو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے تھے۔ مگر ابھی چھپنے نہ پائے تھے کہ غدر ہوگیا اور وہ سب نقشے تلف ہوگئے ۔ کچھ نقشے جو اب ملے ہیں وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ البتہ چوتھا باب جس میں دلی کے مشاہیر کا حال لکھا گیا تھا وہ اس ایڈیشن میں نہیں ہے ۔
>
> یہ ایڈیشن ۱۸۵۴ع میں چھپ کر تیار ہوگیا تھا مگر نہ اس ایڈیشن سے اور نہ پہلے ایڈیشن سے سرسید کو جیسا کہ خیال تھا کچھ فائدہ نہیں ہوا ۔ دوسرے ایڈیشن کے تقریباً تمام نسخے غدر میں تلف ہوگئے ۔" (۱)

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ غدر یا جنگ آزادی کا پہلا شعلہ ۱۸۵۷ع کے اوائل میں بھڑکا تھا ۔ وسط ۱۸۵۷ع کے بعد دھلی ہنگاموں کا مرکز بنا۔ اس لیے انھیں

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، محولہ بالا، ج ۱، ص ۵۷

اسی زمانے میں اس کے تمام نسخوں کو تلف ہونا چاہئے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا ۔ اس ایڈیشن کے تمام حصے مطبع احمدی دہلی میں ۱۸۵۳ء میں چھپ کر تیار ہوگئے ۔ اس کے بعد اس کا سرورق اور دیباچہ وغیرہ مطبع سلطانی واقع قلعۂ معلی میں ۱۸۵۳ء میں چھپا اور اس طرح جو حصے مقصود اشاعت تھے ، شائع کردیے گئے ۔ اس کا ایک نسخہ گارسین دتاسی کو بھیجا گیا ۔ گارسین دتاسی نے اسی سال دسمبر ۱۸۵۳ء کے خطبے میں اردو زبان کی تاریخ کے بارے میں اس سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے اور اس پر بحث کی ہے ۔ (۱) اس کے بعد ژورنال آسیاٹک کی جلد ۸ (۱۸۵٦ء) ص ۳٦-۵۳۲ میں تبصرہ شائع کیا۔ (۲) اور پھر اسی کی بنیاد پر اس کے فرانسیسی ترجمے کا آغاز کیا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ۱۸۵۷ء تک اس کی اشاعت بلکہ اس کے نقشوں کی طباعت بھی مکمل نہ ہوپائی تھی تو گارسین دتاسی کے دسمبر ۱۸۵۳ء میں اس کے ذکر و اقتباس اور ۱۸۵٦ء میں پیرس سے اس پر تبصرہ کیا معنی رکھتا ہے۔ نیز گارسین دتاسی نے ۱۰ دسمبر ۱۸۵۷ء کے خطبے میں لکھا ہے کہ :" میں اس کتاب کا کامل ترجمہ عنقریب شائع کرنے والا ہوں "۔(۳) گویا کہ اس وقت تک گارسین دتاسی ترجمہ مکمل کرچکے تھے ۔ اشاعت کا مرحلہ درپیش تھا۔ نیز دوسری اشاعت کے نسخے کم یاب ضرور ہیں نایاب نہیں ۔ ہندوستان اور پاکستان کی تقریباً تمام اہم لائبریریوں میں مل جاتے ہیں ۔ اگر ۱۸۵۷ء کے غدر میں اس کے تمام نسخے تلف ہوگئے ہوتے تو کتاب کو نہ

---

(۱) مسز بیگ حیدرجہاں (مترجم) :" خطبات گارسین دتاسی"، اورنگ آباد (دکن) : انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۵ء ، ص ۵۱-۳۹ (پانچواں خطبہ)

(۲) اکرام چغتائی ، محمد (مترجم) :" آثارالصنادید (تبصرہ) از سی ڈبلیو، ٹرول ، " اردو"، کراچی : ۱۹۷۵ء ، شمارہ ۲، ص ۲۰۳

(۳) یوسف حسین خان، ڈاکٹر (مترجم) ، " خطبات گارسین دتاسی"، محولہ بالا ، ص ۲۲۳

نوٹ : خطبات گارسین دتاسی کے خطبات نمبر ۱ تا ۴ و ۶ کا ترجمہ سر سید ورکس سوسائٹی نے کیا تھا ۔ پانچویں خطبے کا ترجمہ مسز بیگ حیدرجہاں کا ہے اور خطبات نمبر ۷ تا ۱۲ دونوں کا ترجمہ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے کیا تھا۔ دیکھیے ، عبدالحق ، مولوی : خطبات گارسین دتاسی (مقدمہ) محولہ بالا ، ص د ، ب ، ج

صرف کم یاب بلکہ نایاب ہوتا چھلے تھے -

آثار الصنادید کا انگریزی و فرانسیسی ترجمہ:

دوسرے ایڈیشن کے ذکر میں آغاز بحث میں گزرچکا ہے کہ مسٹر رابرٹس پہلا ایڈیشن انگلستان لے کر گئے تھے اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں پیش کیا تھا اور سوسائٹی مذکور کے ایک رکن مسٹر سکس نے اس کے انگریزی ترجمے کی فرمائش کی تھی۔ مسٹر رابرٹس کی واپسی پر اس کے انگریزی ترجمے کا آغاز کیا گیا اسی دوران میں سرسید کو اس پر نظر ثانی کرنے اور پہلی اشاعت کی خامیاں دور کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزرچکی ہے - یہاں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ سرسید نے یہ ایڈیشن خالص مورخانہ نقطۂ نظر سے مرتب کیا تھا اور اس نقطۂ نظر کے مطابق اس کے پہلے تین حصے ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ چناں چہ انھیں شائع کردیا گیا۔ اس کے ابتدائی تین حصے جس انداز سے مرتب کیے گئے تھے ، چوتھا حصہ اس سے میل نہ رکھتا تھا اور جس مقصد سے ابتدائی حصوں پر مشتمل دوسرا ایڈیشن تیار کیا گیا تھا اس مقصد کے لحاظ سے بھی سود مند نہ تھا ، اس لیے اسے نظر انداز کردیا گیا۔ اسی طرح عمارات کے نقشے بھی ایک زائد چیز تھے اس لیے ان کی تکمیل و اشاعت کا انتظار بھی نہیں کیا۔ نقشوں کے مقابلے میں کتبوں کی اہمیت زیادہ تھی ، وہ شامل ہیں۔

اس ایڈیشن کے بارے میں چند باتیں مزید توجہ طلب ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے - تاکہ بحث و نظر کا کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہ رہے -

" آثارالصنادید" کے انگریزی ترجمے کی بابت گزرچکا ہے - پہلی اشاعت کے بعد ولایت سے واپسی پر مسٹر رابرٹس نے اس کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا۔ لیکن حالی کا خیال ہے کہ یہ ترجمہ مکمل نہیں ہوا۔ وہ لکھتے ہیں :

" مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی نے سرسید کی شرکت سے اس کا ترجمہ

کرنا شروع کردیا تھا۔ مگر ابھی بہت کچھ ترجمہ کرنا باقی تھا کہ مسٹر رابرٹس کی دلی سے تبدیلی ہوگئی ۔ پھر معلوم نہیں کہ وہ ترجمہ پورا ہوا یا نہیں اور کسی نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا یا نہیں" لیکن فرانس کے مشہور اورینٹلسٹ موسیو گارسین دتاسی نے ۱۸۶۱ع میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرکے مشتہر کیا جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی تھی۔" (۱)

" آثارالصنادید" کا فرانسیسی ترجمہ اس کی اشاعت ثانی کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا اس میں باب اول کی چیدہ چیدہ باتیں شامل تھیں اور دوسرے اور تیسرے باب کا ترجمہ مکمل تھا۔ پہلے یہ ترجمہ " ژورنال آسیاٹک میں شائع ہوا تھا پھر الگ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ حالی نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ جرمن مستشرق سی ڈبلیو ٹرول نے اس کی ضروری تفصیل دی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" اسی (دوسری) طباعت کے دوسرے اور تیسرے باب کا فرانسیسی ترجمہ ، جس میں باب اول کی چیدہ چیدہ باتوں کو شامل کردیا گیا ہے از گارسین دتاسی در " ژورنال آسیاٹک "

جلد ۱۵ (۱۸۶۰ع) ، صص ۳۶-۵۰۸

جلد ۱۶ (۱۸۶۰ع) ، صص ۲۵۳-۱۹۰

صص ۲۵۱-۳۹۲

صص ۲۳-۵۲۱

جلد ۱۷ (۱۸۶۱ع) ، صص ۹۷-۷۷

یہ ترجمہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا(پیرس ، ۱۸۶۱ع)

قبل ازیں مترجم (گارسین دتاسی) دوسری طباعت پر تبصرہ بھی شائع کرچکاتھا۔ ژورنال آسیاٹک ، جلد ۸ (۱۸۵۲ع) ، صص ۳۶-۵۳۲" (۲)

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین: " حیات جاوید "، محولہ بالا، ج ۱، ص ۵۷

(۲) اکرام چغتائی ، محمد: (مرتب) " آثارالصنادید " (مقالہ) از سی ڈبلیو ٹرول ، " اردو" محولہ بالا (دور) شمارہ ۲، ص ۲۰۲

سرسید کا اعزاز:

اسی ترجمے کی بنیاد پر رائل ایشیا ٹک سوسائٹی لندن نے سرسید کو سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا تھا ۔ حالی نے لکھا ہے :

" اسی ترجمے کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی مذکور کا آنریری فیلو مقرر کیا تھا۔ چناں چہ ۱۸۶۳ء میں اول مسٹر ربن ہولڈراسٹ سکریٹری سوسائٹی موصوف کی چھٹی مورخہ ۲۰/ جون، ۱۸۶۳ء سرسید کے نام اس مضمون کی پہنچی کہ " یورپ میں آپ کی کتاب کی بہت قدر کی گئی ہے اور بہ اتفاق رائے چند ممبران سوسائٹی آپ اس سوسائٹی کے آنریری ممبر مقرر ہوگئے ہیں۔" اس کے بعد جو ڈپلوما، سوسائٹی نے سرسید کو بھیجا، اس کا ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے :

لندن، ۳ جولائی، ۱۸۶۳ء

گریٹ برٹن اور آئرلینڈ کی رائل ایشیا ٹک سوسائٹی نے زیر سرپرستی ہرموسٹ اکسلنٹ مجسٹی وکٹوریا ،آج کی تاریخ سید احمد خان کو اس سوسائٹی کی آنریری ممبری کے ساتھ نامزد کیا۔ جس کی سند میں یہ ڈپلوما ان کو ارسال کیا جاتا ہے ۔

شرح دستخط (اڈورڈ کول بروک)، پریسیڈنٹ
اچ رالنس ڈائرکٹر
ربن ہولڈراسٹ سکریٹری۔(۱)

یورپ کے علمی حلقوں میں " آثارالصنادید" کی جس طرح پذیرائی ہوئی اور سرسید کو جس گراں قدر اعزاز سے نوازا گیا وہ اس کی تاریخی اور تحقیقی اہمیت کے اعتراف کا بہت بڑا ثبوت ہے ۔ " آثارالصنادید" کی یہ پذیرائی اور قدرافزائی بیرون ملک ہی میں اس کی تاریخی اور تحقیقی اہمیت کے اعتراف کا بہت بڑا ثبوت ہے ۔ آثارالصنادید" کی یہ پذیرائی اور قدر افزائی بیرون ملک ہی نہیں ملک کے اندر بھی ہوئی ۔ چناں چہ

حالی، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۵۸-۵۷

اسے کلکتہ یونی ورسٹی کے تحت وسطانیہ کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ علی گڑھ اخبار (علی گڑھ سائنٹفک گزٹ) کی اشاعت ۲۲ ستمبر، ۱۸۷۱ء کے حوالے سے " گارسیں دتاسی " نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے :

" کلکتہ یونی ورسٹی کی سنڈیکیٹ نے قطعی طور پر فیصلہ کیا ہے کہ وسطانیہ کے امتحانات ہندوستانی اور دوسری مروجہ زبانوں میں ہوسکتے ہیں۔ وسطانیہ کے آخری امتحان کے بعد امیدوار کو اس کی قابلیت کی تصدیق کا صداقت نامہ دیا جائے گا ۔ اس قسم کا پہلا امتحان یکم مارچ ۱۸۷۲ء کو منعقد ہوگیا۔ اردو میں سید احمد خاں کی " آثارالصنادید " اور مشہور شاعر غالب کا دیوان نصاب میں شامل ہیں۔" (۱)

تیسرا ایڈیشن:

" آثارالصنادید " کا تیسرا ایڈیشن جون ۱۸۷٦ء مطابق جمادی الاول، ۱۲۹۳ھ میں " مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنو " سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن آثار کے پہلے ایڈیشن کے مطابق ہے ۔ مشمولات یہ ہیں :

---

(۱) یوسف حسین خان، ڈاکٹر (مرحوم) ، " ہندستانی زبان و ادب ، ۱۸۷۱ء میں " ، (مقالہ) " مقالات گارسیں دتاسی "، (انگریزی) مترجمہ ، ڈاکٹر حمید اللہ ، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹٦۴ء ، ج اول، ص ۱۱۲

اس کے بعد غالب ، صہبائی اور آزردہ کی تقاریظ ہیں مگر " خاتمۃ الطبع " پورا صفحہ جو ناشر کی طرف سے ہے " زیادہ ہے - اسی سے اس کی تاریخ اشاعت کا پتا چلتا ہے - ہر حصے کے شروع میں سرورق ہے جیسا کہ شروع میں ہے -

ناشران نے مصنف کی ان ترمیمات و اصلاحات کو بھی قبول نہیں کیا جو دوسرے ایڈیشن میں مصنف کے قلم سے عمل میں آئی تھیں - اگر چوتھے باب کی شمولیت کے ساتھ وہ ترمیمات و اصلاحات کو بھی قبول کرلیا جاتا تو اس ایڈیشن کی اہمیت پہلے اور دوسرے ، دونوں ایڈیشنوں سے بڑھ جاتی ہے -

یہ ایڈیشن بھی سرسید کی زندگی میں شائع ہوا تھا - اور اگرچہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ منشی نول کشور نے سرسید کی اجازت اور ان کے ایما کے بغیر چھاپ لیا ہوگا - لیکن ہمیں یہ ثبوت بھی نہیں ملا کہ منشی صاحب موصوف نے سرسید سے واقعی اجازت لی تھی اور اس ایڈیشن کی اشاعت میں ان کے ایما کو دخل تھا - اس کی زبان ، اسلوب یا مضمون میں بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے - اس لیے بھی ~~ہم کہہ سکتے ہیں~~ [کہا جا سکتا ہے] کہ سرسید نے اس پر نظر ثانی نہیں کی - البتہ علامہ فضل حق خیرآبادی کے ترجمے کے عنوان میں تبدیلی ملتی ہے - ۱۸۴۷ع کے پہلے ایڈیشن میں عنوان یہ ہے : " جناب مولانا مخدومنا مولوی فضل حق سلمہ اللہ تعالی " - ۱۸۷۶ع کے ایڈیشن میں کلمہ " سلمہ اللہ تعالی " کو " نوراللہ مرقدہ " سے بدل دیا گیا ہے - پہلا خیال یہی ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی خود سرسید نے کی ہوگی لیکن جب ہم ترجمے میں پہلی اشاعت کے مطابق درازی عمر کی دعا " یہ آرزو ہے کہ ایسے صاحب کمال کے خزانہ عمر میں بھی ترقی روز بروز عطا ہو - " دیکھتے ہیں تو اس خیال کو دل سے نکالنا پڑتا ہے - اگر سرسید یہ تبدیلی کرتے تو متن میں درازی عمر کی دعا کو بھی دعائے

مغفرت سے بدل دیتے ۔ مزید تقویت اس امر سے پہنچتی ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی (م ۲۰ ۔ اگست ۱۸۶۱ء) کے علاوہ اور بھی کئی بزرگ ۱۸۴۶ء کی اشاعت سے قبل انتقال کرچکے تھے ۔ مثلاً مومن خان مومن (م ۱۳ ۔ مئی ۱۸۵۲ء) مولانا مخصوص اللہ (م ۲۷ ۔ اگست ۱۸۵۵ء) ، مولوی امام بخش صہبائی (م ۱۸۵۷ء) مولوی محبوب علی (م ۹ ۔ مئی ۱۸۶۵ء) ، مولانا شاہ محمد یعقوب (م ۱۵ ۔ اپریل ۱۸۶۶ء) ، مولانا نورالحسن (م ۲ ۔ مئی ۱۸۶۸ء) ، مفتی صدرالدین آزردہ (م ۱۵ جولائی ۱۸۶۸ء) ، نواب قطب الدین خاں (م ۱۸۷۳ء) ، مولوی کریم اللہ (م ۷۵-۱۸۷۳ء) وغیرہم ۔ ان تمام شخصیات سے وہ صرف سرسید واقف تھے بلکہ بعض سے تو بہت قریبی روابط بھی تھے ۔ لیکن کسی کے ترجمے یا عنوان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے ۔ ان تمام حضرات کے ناموں کے ساتھ سلمہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ درج ہیں۔ اگر سرسید علامہ فضل حق خیرآبادی کے ترجمے کے عنوان میں تبدیلی کرتے تو بڑی آسانی کے ساتھ کسی دقت کے بغیر ان تمام حضرات کے تراجم کے عنوانات تبدیل کرسکتے تھے ۔ اس لیے حتمًا خیال یہ ہے حضرت علامہ موصوف کے عنوان ترجمہ میں تبدیلی اس نسخے کے کاتب یا مصحح کے قلم کی یادگار ہے ۔ سرسید کے قلم سے یہ تبدیلی نہیں ہے ۔

چوتھا ایڈیشن:

" آثارالصنادید " کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۰۴ء میں محمد رحمتہ اللہ رعد نے اپنے مطبع نامی پریس کانپور سے شائع کیا تھا ۔ اس ایڈیشن کی تیاری میں حسن کتابت و طباعت کے علاوہ متن کی صحت اور عمدہ کاغذ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اور نقشے اور کتبے بھی نہایت احتیاط و اہتمام سے تیار کیے گئے تھے۔ یہ ایڈیشن چونکہ ۱۸۵۴ء کی اشاعت کے مطابق تھا اس لیے مشاہیر دھلی والا حصہ اس میں شامل نہیں ہے ۔

مشمولات کی تفصیل یہ ہے :

آخر میں چار صفحے انگریزی میں ہیں ان میں سے پہلا صفحہ مصنف (سرسید احمد خان) کے خاندانی حالات میں ہے ، دوسرا صفحہ یوں ہیں (دیباچہ) کے عنوان سے ہے اور آخری دو صفحے میں قطب مینار پر ایک مختصر مگر جامع نوٹ ہے -

جیسا کہ عرض کیا - یہ " آثارالصنادید" کا چوتھا ایڈیشن ہے لیکن چوں کہ اس کی بنیاد سرسید کے اصلاح و ترمیم شدہ دوسرے ایڈیشن پر رکھی گئی ہے اس لیے ناشرین نے اسے تیسرا ایڈیشن قرار دیا ہے - لیکن میرے خیال میں اسے تیسرا ایڈیشن قرار دینا درست نہیں -

دوسرے ایڈیشن میں عمارتوں کے کتبے شامل تھے لیکن ان کے نقشے موجود نہ ہونے کی وجہ سے ایک نقص پیدا ہوگیا تھا - منشی رحمت اللہ رعد نے اس نقص کو دور کردیا - انھوں نے ۱۳۰ عمارتوں کے نقشے طبع اول میں سے اصل کے مطابق بنواکر اس میں

شامل کردیے[۱] اس طرح دوسرے ایڈیشن کے مقابلے میں اس کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود" یہ ایڈیشن بھی نا مکمل رہ جاتا ہے ۔ یعنی " آثارالصنادید" طبع اول کا چوتھا باب اس میں موجود نہیں اور کچھ مکانات، گلی کوچوں اور بازاروں کا حال بھی اس میں نہیں ملتا۔ نقشے بھی مقابلتاً اس میں کم ہیں ۔ اس کے علاوہ ترتیب کی بہت سی خامیاں موجود ہیں۔ مثلاً صفحہ وار فہرست جیسی ضروری چیز کتاب کے شروع میں نہیں دی گئی ۔ خالی چھوڑے گئے صفحات کی زیادتی سے عبارت کے تسلسل میں فرق پڑتا ہے ۔ صفحات کا نمبر شمار بھی مسلسل نہیں اور کچھ نقشوں میں قطع و برید بھی کردی گئی ہے ۔ جس سے ان کی اہمیت کم ہوجاتی ہے ۔"(۲)

پانچواں ایڈیشن:

" آثارالصنادید" کا پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں سنٹرل بک ڈپو دہلی نے شائع کیا۔ اس کے بارے میں ناشر کا دعوا ہے کہ یہ جملہ سابقہ ایڈیشنوں کی خوبیوں پر حاوی ایک مکمل ایڈیشن " ہے ۔(۳) اس میں یہ مبالغہ آمیز دعوا بھی ملتا ہے کہ اگر مصنف (سرسید) خود اپنی حیات میں اس کتاب کی جامعیت کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ اس جامعیت سے مختلف نہ ہوتی جو اس ایڈیشن کو حاصل ہوگئی ہے ۔" (۴) اس کے مرتب و مدون خالد نصیر ہاشمی ہیں ۔ اس میں ابتدائی تین باب چوتھے ایڈیشن کے مطابق ہیں ۔ جس کا متن دوسرے ایڈیشن کے مطابق اور نقشے پہلے ایڈیشن کے مطابق

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، کان پور: مطبع نامی پریس، ۱۹۰۴ء، ص ۳ (دیباچہ)، مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد)

(۲) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، دہلی: سنٹرل بک ڈپو، ۱۹۶۵ء، عرض ناشر، ص ۳ (مرتبہ خالد نصیر ہاشمی)۔

(۳) ایضاً، ص ۱

(۴) ایضاً، ص ۵

تیار کئے گئے تھے اور زیر نظر اشاعت میں چوتھے باب کی جگہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کا مرتبہ " تذکرہ اہل دہلی" کو شامل کرلیا گیا۔ قاضی صاحب نے "تذکرہ اہل دہلی" کے متن کے لیے ۱۸۷٦ء کے ایڈیشن کو بنیاد بنایا تھا۔ مرتب نے قاضی صاحب کے تمام حواشی بھی اخذ کر لیے ہیں لیکن ان کا نام ہرجگہ قلم زد کردیا ہے۔ نقشوں کی تیاری میں پہلی اور تیسری اشاعتوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ صفحات کے نمبر شروع سے آخر تک مسلسل کردیے ہیں۔ اشاریہ شامل ہے کتابت و طباعت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور کاغذ عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔ صحت متن کے لحاظ سے یہ اشاعت گزشتہ تمام اشاعتوں پر فوقیت رکھتی ہے۔

چھٹا اردو ایڈیشن:

" آثارالصنادید" کا چھٹا ایڈیشن ۱۹٦٦ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی سے شائع ہوا اس کا متن ۱۸۷٦ء کے ایڈیشن کے مطابق ہے۔ اس میں چاروں ابواب شامل ہیں۔ اسے ڈاکٹر معین الحق نے مرتب کیا ہے۔ جا بجا مفید حواشی سے مزین ہے۔ چوتھے باب میں ہر شخصیت کے ترجمے کے ذیل میں مزید ماخذ درج کردیے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب " اسلامی فن تعمیر ہند پاکستان میں" کے عنوان سے اس پر ایک محققانہ مقدمہ بھی لکھا ہے اس ایڈیشن پر سرسید کے تیار کرائے ہوئے عمارتوں کے نقشوں کو حذف کردیا گیا ہے اور ان کی جگہ بعض عمارتوں کے فوٹو شامل کیے ہیں۔ لیکن ان فوٹوؤں سے عمارت کے وہ تمام پہلو سامنے نہیں آتے ہیں جو نقشوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ طبع اول میں شامل عمارتوں کے نقشے اصول نقاشی کے مطابق تیار کئے گئے تھے۔(۱) اسی کے مطابق تیسرے ایڈیشن میں تھے اور اسی کے مطابق رحمت اللہ رعد نے اپنے ایڈیشن کے لیے تیار کرائے تھے۔ فوٹوؤں سے کسی عمارت کے تمام پہلو سامنے نہ آنے کے علاوہ عمارت کی عظمت و

---

(۱) رعد، محمد رحمت اللہ (مرتب)؛ " آثارالصنادید"، محولہ بالا، تمہید، ص ۲

وسعت اور بلندی
وسعت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اندازے کے لیے کسی بھی عمارت کے نقشے کو دیکھ لیا جائے جس کا اس ایڈیشن میں فوٹو شامل کیا گیا ہے مثلاً جامع مسجد دہلی کا اندرونی نقشہ ۱۵x۲" میں اور اس کے جنوبی، شمالی اور مشرقی دروازوں کے تین الگ الگ نقشے شامل ہیں جن میں سے ہر نقشہ ۷x۳½" میں ہے اور اسی سائز کا ایک نقشہ عقبی سمت کا شامل ہے ۔ ان سے مسجد کی عظمت اور وسعت و بلندی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے لیکن زیر نظر ایڈیشن میں شامل ۶x۴" کے فوٹو سے بالکل نہیں ہوتا۔ اگر ان تمام عمارتوں کے فوٹو ہوتے جن کے نقشے سرسید نے " آثارالصنادید" میں شامل کیے تھے تو بھی یہ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت شمار کی جاسکتی تھی ۔ آخر میں " کتبات " کے عنوان سے ایک طویل ضمیمہ ہے جس میں دہلی کی عمارتوں پر چار جلدوں میں مولوی ظفر حسن کی کتاب سے عمارتوں کے کتبے نقل کردیے گئے ہیں۔

اگرچہ اس ایڈیشن میں کتابت و طباعت کی بے شمار اغلاط موجود ہیں لیکن ڈاکٹر سید معین الحق کے مقدمہ، حواشی اور ضمیمہ کی وجہ سے یہ ایڈیشن بہت اہم ہوگیا ہے ۔

تذکرہ اہل دہلی :

یہ" آثار" الصنادید" کا چوتھا باب ہے جو آثار کے پہلے ، تیسرے ، پانچویں اور چھٹے ایڈیشن میں شامل ہے ۔ صرف دوسرے اور چوتھے ایڈیشن میں شامل نہیں ہے ۔ چوں کہ یہ باب ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے اسے مرتب کرکے الگ کتابی صورت میں شائع کردیا۔ اس کی تکمیل و اشاعت بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے ارشاد و ایما پر صورت پذیر ہوئی تھی ۔ قاضی صاحب مرحوم نے پہلے رسالہ " اردو" میں اس کی اشاعت کا آغاز کیا تھا۔(۱)

---

(۱) سہ ماہی " اردو"، کراچی: اپریل، ۱۹۵۰ء ، شمارہ ۲ مجلد ۲۶، ص ۱۲۱

لیکن بعد میں اسے انجمن ترقی اردو کے دوسرے رسالے " تاریخ و سیاسیات" میں ازسرنو شروع کیا گیا۔ " تاریخ و سیاسیات" کا پہلا شمارہ اپریل، ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا اس میں تذکرہ کی پہلی قسط شامل ہے۔ اور آخری شمارہ اگست، ۱۹۵۲ء کا شائع ہوا تھا اس میں بھی شامل ہے۔ " تاریخ و سیاسیات" کے چودہ نمبر نکلے تھے ان میں سے ۹ نو نمبروں میں تذکرہ بالاقساط چھپا ہے۔ رسالہ بند ہوا تو تذکرے کے صرف ۱۵۲ صفحے چھپے تھے اور موس کا ترجمہ زیر اشاعت تھا۔ رسالے میں چھپنے کے علاوہ ایک خاص تعداد میں تذکرہ کے صفحات مزید چھپوا لیے جاتے تھے تاکہ بعد میں کتابی صورت میں چھاپ دیا جائے۔ " تاریخ و سیاسیات" کے بند ہوجانے کی وجہ سے تذکرہ کے بقیہ صفحات الگ چھپواکر ۱۹۵۵ء میں کتابی صورت میں شائع کردیا گیا۔ کتابی صورت میں یہ ایڈیشن بہت تھوڑا شائع ہوا تھا اس لیے ۱۹۶۵ء میں اس کی دوسری اشاعت کا انتظام کرنا پڑا۔ اس ایڈیشن پر قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے قلم سے دیباچہ ہے۔ اس میں انھوں نے " آثارالصنادید" کی روداد تصنیف و اشاعت بیان کی ہے۔ ساتھ ہی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ خاص طور پر انھوں نے اس کے چوتھے باب (تذکرہ اہل دہلی) کی تاریخی و ادبی اہمیت پر بحث کی ہے۔ چوں کہ آئندہ خاص طور پر ایک بحث " آثارالصنادید" کے چوتھے باب کی ادبی و تاریخی اہمیت اور اس کے اسلوب پر آرہی ہے اس لیے تکرار کے خیال سے یہاں اس بحث سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اس کا نام " تذکرہ اہل دہلی" قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کا اپنا اختیار کردہ ہے۔ " آثارالصنادید" میں اس باب کا عنوان " شاہجہان آباد کے لوگوں کا بیان" ہے۔

شاہجہان آباد کے لوگوں کا بیان :

۱۹۶۵ء میں مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے نایاب رسائل و مضامین کے

ایک مجموعے میں " آثار الصنادید" کا چوتھا باب شامل کر لیا گیا ہے -(۱) بلا شبہ اس مجموعے میں "جام جم" ، " تسہیل فی جرالثقیل" ، " فوائد الافکار فی اعمال الفرجار"، " قول متین در ابطال حرکت زمین"، وغیرہ نادر و نایاب رسائل اور دیگر مضامین شامل ہیں لیکن " نایاب رسالے یا مضمون کی حیثیت سے " آثارالصنادید" کے باب چہارم کی شمولیت کا جواز نہ تھا کہ حقیقتاً یہ اس وقت تک نایاب نہ رہا تھا - ہندوستان سے " آثارالصنادید" کا مکمل ایڈیشن شائع ہوچکا تھا اور باب چہارم کراچی سے " تذکرہ اہل دہلی" کے نام سے چھپ چکا تھا- خود مقالات کے مرتب شیخ محمد اسمعیل پانی پتی نے اس کا حوالہ دیا ہے -

" آثارالصنادید " کی تصنیف میں صہبائی کا حصہ :

" آثارالصنادید" کے بارے میں ایک اہم مسئلہ اس کی تصنیف میں امام بخش صہبائی کی شرکت کا ہے - " آثارالصنادید" پر تقریباً تمام لکھنے والوں اور سرسید کے مصنفین نے اس کی تحریر میں صہبائی کی شرکت کا ذکر کیا ہے - اس خیال کی بنیاد حالی اور شبلی کے دو بیانات ہیں - مولانا حالی لکھتے ہیں :

> " آثار الصنادید" کا سب سے پہلا ایڈیشن ، جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے - وہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ گو اس وقت طبع سلیم کے اقتضا سے خود سرسید کی طرز تحریر سیدھی سادھی تھی- اگرچہ سوسائٹی کے اثر سے یقیناً سادی عبارت لکھنے کو وہ خود حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے- جس کی وجہ سے انھوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جن عمارتوں کی تحقیقات نہایت جانکاہ کوشش سے انجام کو پہنچائی ہے ، ان کا حال اپنی سیدھی سادی

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) ، " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، حصہ شانزدہم، " شاہجہاں آباد کے لوگوں کا بیان"، صص ۲۸۳-۲۰۷

عبارت میں جو اس وقت خود ان کی (اپنی) نظر میں کم وزن معلوم ہوتی تھی تحریر کریں۔ مگر اس اڈیشن کے شائع ہونے کے بعد وہ بہت جلد اس غلطی سے متنبہ ہوئے اور اس کو دوبارہ اپنے سیدھے سادے نیچرل اسٹائل میں لکھ کر شائع کیا۔" (١)

علامہ شبلی نعمانی اپنے مشہور مضمون" سرسید اور اردو لٹریچر " میں لکھتے ہیں :

" سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ " آثارالصنادید" کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو انہوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیے تھے -" (٢)

حالی کے اس خیال کو قاضی احمد میاں [redacted] اختر جوناگڑھی نے قطعاً رد کردیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" لیکن پہلے اڈیشن میں بہت سا حصہ ایسا بھی ہے جو سادہ نثر میں لکھا گیا ہے - اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پوری کتاب مولانا صہبائی کے قلم سے نہیں لکھی گئی بلکہ سرسید کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے اور بعض مقامات میں مولانا صہبائی نے سادہ نثر کو مقفا اور مسجع نثر میں لکھ دیا ہے-" (٣)

اس کے بعد قاضی صاحب نے علامہ شبلی کی رائے جسے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں اپنی تائید میں پیش کیا ہے - گویا کہ وہ حالی کی رائے کے مقابلے میں شبلی کی رائے سے متفق ہیں کہ بعض بعض مقامات صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اب اس مسئلے پر اس ترتیب سے نظر ڈالیے: [illegible]

---

(١) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، حصہ دوم، ص ٢٩٨

(٢) " مقالات شبلی"، اعظم گڑھ : دارالمصنفین ، ص ٥٨

(٣) اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں (مرتب) " تذکرہ اہل دہلی"، از سرسید احمد خاں، کراچی : ١٩٥٥ء، انجمن ترقی اردو، دیباچہ ، ص ٣

۱- " آثارالصنادید" کی تحقیق کے سلسلے میں حالی کے بیانات گزر چکے ہیں کہ تمام تحقیقات سرسید کی ہیں۔ سرسید معلومات کی فراہمی کے لیے تعطیلات میں گھر سے نکلتے تھے ۔ مکانات اور کھنڈروں کا مشاہدہ کرتے تھے، عمارتوں پر چڑھتے تھے، چھینکے میں لٹکتے تھے، کتبے پڑھتے اور نقل کرتے تھے، عمارتوں کی پیمائش کرتے تھے، بلندیوں کو ناپتے تھے، اس قسم کا کام تنہا انجام نہیں دیا جاسکتا تھا اس کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو نہ صرف رفیق سفر ہوتا بلکہ کتبوں کے پڑھنے میں، عمارتوں کی پیمائش میں اور بلندیوں کو ناپنے میں ان کی مدد کرتا ۔ چنانچہ رفاقت کا یہ فرض سرسید کے دوست امام بخش صہبائی نے ادا کیا ۔ پھر تاریخی کتابوں، تذکروں وغیرہ سے ان معلومات کی تکمیل و تصدیق کرلی تھی اور فراہم کردہ معلومات کے مطابق ماہرین فن سے عمارتوں کے نقشے تیار کروائے تھے ۔ یہ تمام کام سرسید نے انجام دیا اس بارے میں کسی مصنف و محقق بشمول حالی نے شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔

۲- مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ تمام حاصل کردہ و فراہم شدہ معلومات کو ضبط تحریر میں کون لایا۔ حالی کا بیان نقل کیا جاچکا ہے کہ صہبائی کا لکھا ہوا ہے ۔ یہ بیان قاضی احمد میاں کو تسلیم نہیں ہے اور یقین ہے کہ یہی رائے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تھی ۔ اس لیے کہ اس رائے کا اظہار ان کے سامنے ہوا انہوں نے "تاریخ و سیاسیات" میں اسے چھاپا پھر اسے الگ کتابی شکل میں شائع کیا۔ بلکہ حالی کے اسی بیان سے جو تفصیل سامنے آتی ہے وہ صرف " بعض مقامات" یعنی عمارتوں کی تحقیق والے حصے کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ اس سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ پوری کتاب صہبائی کی لکھی ہوئی ہے ۔ اب اگر حالی اور شبلی دونوں کے بیانات کو ملاکر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر ~~پہنچتے ہیں~~ پہنچنا آسان ہے کہ عمارتوں والا حصہ یا اس

کے بعض مقامات صہبائی کے لکھے ہوئے تھے - " آثارالصنادید" کا چوتھا باب اس ذیل میں نہیں آتا- لیکن ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اس میں بھی صہبائی کے قلم کی گلکاری کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا- بلکہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے تو صہبائی کے قلم کی گل کاری کا خاص محل اسی چوتھے باب کو قرار دیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" چوں کہ یہ کتاب تاریخی مقامات اور قدیم عمارات پر ہے - اس لیے اس میں زیادہ عبارت آرائی ممکن نہیں ہے - البتہ اس کے چوتھے باب میں مولانا صہبائی کے قلم کی گل کاریاں نظر آتی ہیں - اور کوئی تعجب نہیں اگر اس میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ جھلکتا ہے کیوں کہ مولانا موم ان کے دل دادہ تھے اور اسی طرز میں لکھتے تھے-" (١)

اگرچہ ان ہی سطروں میں قاضی صاحب نے " اور کوئی تعجب نہیں اگر اس میں"... لکھ کر اپنی رائے کی قطعیت کو ختم کردیا ہے - وہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ایسا ہو تو جائے تعجب نہیں - لیکن بعد کی سطروں سے تو وہ اس امکان کو بھی ختم کردیتے ہیں - لکھتے ہیں :

" لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اصل مضمون سرسید کا اپنا ہے - اس زمانے میں جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تو اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا- سرسید نے بھی" آثارالصنادید" میں تھوڑی بہت انشا پردازی سے کام لیا اور اس طرز کو برتا-" (٢)

قاضی صاحب کی یہ رائے نہایت متوازن اور صحیح ہے اور ہم اس سے پورا پورا اتفاق ~~کرتے ہیں~~ کیا جاسکتا ہے - اور یہی رائے ان تمام محققوں اور نقادوں کی ہے جنھوں نے " آثارالصنادید"

---

(١) اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں: " تذکرۂ اہل دہلی"، محولہ بالا، دیباچہ ، ص ٣

(٢) ایضاً، دیباچہ ، ص ٣

کی تصنیف میں صہبائی کی شرکت تسلیم کی ہے ۔ انھوں نے بھی " آثارالصنادید " کو سرسید ہی کی تصنیف قرار دیا ہے ۔ حافظ کا خود حالی نے جنھوں نے بھی " آثارالصنادید " صہبائی کی تحریر قرار دی ۔ وہ بھی اسے تحقیق و تصنیف سرسید ہی کی قرار دیتے ہیں ۔

<u>تذکرے کی اہمیت :</u>

" آثارالصنادید " کا باب چہارم ایک مستقل تصنیف ہے ۔ جس کا " آثارالصنادید " کے تین ابواب سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ جب " آثارالصنادید " کو اس کے بغیر چھاپا گیا تو اس کی تصنیفی حیثیت میں کسی نقص کا احساس ہوا نہ اس کی تاریخی حیثیت متاثر ہوئی ۔ اس حصے کے بغیر بھی آثار اپنے موضوع پر ایک مکمل اور جامع تصنیف تھی اور جب یہ باب الگ کتابی شکل میں چھپ کر قاری کے سامنے آیا تو اسے دیکھ کر یہ خیال پیدا نہ ہوا کہ یہ کسی کتاب کا ایک حصہ ہے ۔ آثار سے الگ اس کے مستقل تصنیف ہونے کا خیال اس لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس باب کی تمام شخصیات کا تعلق صرف ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی عیسوی سے ہے جب کہ آثار الصنادید " کے موضوع کا دائرہ ۱۲۵۰ قبل مسیح تک پھیلا ہوا ہے ۔ خواجہ محمد زکریا کے ذہن میں بھی باب چہارم کی یہی خصوصیت تھی۔ وہ لکھتے ہیں :

" انھوں نے مناسب ترمیم و اصلاح اور اضافے کے ساتھ کتاب کو ازسرِنو مرتب کیا چوتھا باب جو مشاہیر دہلی کے بارے میں تھا اور کتاب کے موضوع سے مطابقت نہیں رکھتا تھا ، بالکل خارج کردیا گیا۔" (۱)

دوسری ایڈیشن میں اسے شامل نہ کرنے کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ " آثارالصنادید " سے اس کا تعلق نہ تھا۔ یہ ایک الگ اور مستقل تصنیف تھی اور

---

(۱) زکریا ، خواجہ محمد : اردو کی نثر (سرسید وغیرہ) مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند ج ۸ ، ص ۱۱۵

"آثارالصنادید" اس کے بغیر بھی ایک مکمل تصنیف تھی ۔ اسی لیے سرسید نے اسے دوسرے ایڈیشن میں آثار کے ساتھ شامل نہیں کیا۔ اسی طرح جب قاضی محمد میاں اختر جوناگڑھی نے اسے ایڈٹ کیا اور ایک مستقل تذکرے کی حیثیت سے اس کو شائع کیا تو اس خیال سے ان کا ذہن بھی خالی نہ تھا ۔ انھوں نے اس کی تاریخی اہمیت کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے اس میں یہ خیال صاف جھلکتا ہے ۔ اور شیخ محمد اسمعیل پانی پتی نے جب اسے دابواب رسائل و مضامین پر مشتمل "مقالات سرسید" میں شامل کیا تو ان کے دماغ میں بھی یہی خیال تھا کہ " شاہجہان آباد کے لوگوں کا بیان" جو " آثارالصنادید" کا باب چہارم ہے ایک مسلسل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی بھی اسے " آثارالصنادید" سے الگ ایک مستقل تصنیف تصور کرتے ہیں۔ ھلے اس خیال کی بنیاد ان کی اس تحریر پر ہے :

" سرسید نے ان باکمالوں کا ایک تذکرہ جو مغلوں کے دور آخر میں دہلی میں جمع تھے اپنی تالیف " آثارالصنادید" میں شامل کیا تھا۔ اس تذکرے پر نظر ڈالنے سے حالی اور ذکا اللہ کے بیانات کی بڑی بڑی توثیق ہوجاتی ہے ۔" (۱)

اس باب کی تمہید کے مطالعے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید اسے ایک مستقل کتاب سمجھتے تھے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

" اگرچہ لوگ یہ خیال کریں کہ میں نے اس شہر کے لوگوں کا حال لکھا ہے وہ بہ نظر حب الوطنی ہوگا۔ لیکن جن لوگوں کے مزاج میں انصاف ہوگا وہ میری اس ساری کتاب کو دیکھ کر جان لیں گے کہ میں نے جو حال لکھا ہے وہ افراط و تفریط سے خالی ہے ...." (۲)

---

(۱) شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر؛ "سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر"، (مقالہ)، " تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۱۰-۹

(۲) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا، ص

اس عبارت میں یہ جملہ " وہ میری اس سطری کتاب کو دیکھ کر جان لیں گے " ۔ صاف اس امر کا غماز ہے کہ سرسید اسے مستقل تصنیف سمجھتے تھے ۔ " آثار الصنادید " اور اس کے باب چہارم " شاہ جہاں آباد کے لوگوں کا بیان " میں صرف یہ تعلق ہے کہ آثار دلی کے قدیم راجاؤں اور بادشاہوں کے آثار کی تاریخ ہے اور اس کا چوتھا حصہ سرسید کے بزرگ معاصرین کے حال میں ہے جن کا تعلق صرف ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی عیسوی سے ہے جن کے بغیر دلی کی علمی و تہذیبی ، تاریخ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ۔ ان کی بدولت دل کی عظمت میں اضافہ ہوا ہے ۔ دلی کو صرف اس کی عمارتوں نے شان و عظمت نہ دی تھی اور ان آثار کے مٹ جانے سے دلی " مرحوم " نہ کہلائی تھی بلکہ دلی کو باعظمت اور باوقار بنانے والی یہی شخصیات ہیں جب میر تقی نے کہا تھا :

" دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آتی تصویر نظر آتی "

اور جب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے دلی کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا اور حجاز بیت المقدس اور نجف کے سوا سب پر اسے فوقیت دی تھی اور کہا تھا :

" ان البلاد اماد وھی سیدۃ   والدھار درۃ والکل کالصدف "

(ترجمہ : بلاد و امصار کی تاریخ میں دہلی ایک سردار کی طرح سربلند ہے اور دوسرے شہر اس کے سامنے باندیوں کی طرح سرجھکائے کھڑے نظر آتے ہیں ۔ یا اس کی حیثیت خالی سیپیوں کے ڈھیر میں چمکتے ہوئے موتی کی سی ہے ۔)

تو ان حضرات کے پیش نظر چند رنگین و سنگین عمارتیں نہ تھیں بلکہ علمی و تہذیبی روایات ، ارباب ہنر ، اہل فضل و کمال اور وہ اہل اللہ تھے جنھوں نے دلی کی علمی و تہذیبی تاریخ بنائی تھی اور جن کے وجود سے دلی کی آبرو تھی ۔ شاہ صاحب کے مذکورہ قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں :

مکان ھا (ھم) جمال الارض قاطبۃ　　　خلقا و خلقا بلا عجب ولا صلف

(ترجمہ : دل کے باشندوں پر نظر ڈالیے تو کیا صورت و سیرت اور کیا سرشت و اخلاق ھر لحاظ سے خوب صورت اور تکبر سے دور نظر آئیں گے اور ایسا معلوم ھوگا کہ گویا ساری زمین کا حسن اھل دھلی میں جمع ھوگیا ھے -)

بہا مدارس لوطاف الجمیر بہا　　　لم تنقیح عیدہ الا علی الصحف

(ترجمہ : یہاں علوم و فنون کی اتنی درس گاھیں، تعلیم و تربیت کے لیے بزرگوں کی خانقاہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے اتنے کتب خانے ھیں کہ اگر کوئی شخص ان کا اندازہ کرنا چاھتے تو اسے ھر طرف کتابیں ھی کتابیں نظر آئیں گی -)

کم مسجد ز خرفت فیہا منارۃ　　　بو قابلتہ شموس الفجو تنکسف

(ترجمہ : اس شہر میں اسلامی تہذیب کی تاریخ اور اس کے خصوصیات کو نمایاں کرنے والی کتنی ھی مسجدیں ھیں جن کے مینار اتنے بلند ھیں کہ اگر آفتاب ان کے مقابل آجائے تو اسے گہن لگ جائے گا -)

لا تروان زینت الدنیا بز ھیہتا　　　کم من ارب ، قدعلا بابن ذی شرف (۱)

(ترجمہ : تاریخ میں دھلی نے دوسرے شہروں کو شرف بخشا ھے - اس میں تعجب نہ کرنا چاھئے کیوں کہ کتنے ھی باپ اپنے بیٹوں کی بزرگی کی بدولت نیک نامی کا سرٹیفکیٹ نامی کا شرف اور شہرت چاھتے ھیں -)

شاہ عبدالعزیز نے دھلی کے شرف اور قدر و منزلت کے لیے جن علمی و تہذیبی خصوصیات اور اھل دھلی کے جن محاسن کی طرف اشارہ کیا ھے اسے شاعرانہ خیال اور

---

(۱)　سرسید احمد خاں، " آثار الصنادید "، محولہ بالا ، ۱۸۴۷ع ، ص

مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے - سرسید نے اس تصنیف کے آغاز میں ٹھیک ٹھیک ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" اگرچہ لوگ یہ خیال کریں کہ میں نے اس شہر کے لوگوں کا حال لکھا ہے وہ بہ نظر حب الوطن ہوگا لیکن جن لوگوں کے مزاج میں انصاف ہوگا وہ میری اس ساری کتاب کو دیکھ کر جان لیں گے کہ میں نے جو حال لکھا ہے وہ افراط اور تفریط سے خالی ہے - حقیقت میں یہاں کے لوگ ایسے ہیں کہ شاید اور کسی اقلیم کے نہ ہوں گے - ہر ایک شخص، ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے - ہر ایک کو علم و ہنر سے شوق اور دن رات لکھنے پڑھنے کا ذوق ہے - ہر ایک کی جبلت میں اخلاق ایسا سمایا ہے کہ اگر ایک ایک بات ان کی لکھی جائے تو ہزار ہزار اخلاق کی کتاب بن جاوے - اس پر حلم ویسا ہی ہے مروت ویسی ہے - دوست پرستی کا کچھ بیان نہیں - بغض اور حسد کا نشان نہیں :

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن

آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

ہزار ہا آدمی ہیں کہ جنھوں نے تمام مکروہات ترک کر کر اور خواہش نفسانی کو چھوڑ کر طریقہ سنت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیا- پس پھر خیال کرو کہ جو خوبی طریقہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے وہی خوبی یہاں کے آدمیوں میں ہے :

مردم او جملہ فرشتہ سرشت   خوش دل و خوش خوے چو اہل بہشت

ہر ہمہ نزدیک دل و گرم خون   رفتہ چو جان درتن مردم درون

ہرسو موہرتی ایشان ہنر   و آمدہ ہر موئی شگافی بسر

ہرچہ بہ صنعت بہ ہمہ عالم است   ہست درایشان و زیادت ہم است

و زقلمی ہرچہ بر آرد علم   وان چہ نہ گنجد بہ زبان قلم

بیش تر از علم و ادب بہرہ مند   زاہل سخن خود کہ شمارد کہ چند

اگرچہ بعض بعض جوان آزاد مزاج آوارہ طبع بھی ہیں اور بقول سعدی کے :

" درایام جوانی چنان کہ افتد دانی "

آوارہ مزاج اور لہو لعب میں بھی مصروف ہیں اور بجز عشق بازی اور واہیات کے اور کچھ کام نہیں رکھتے، لیکن اس پر بھی سب باتیں ایک حیا کے ساتھ ہیں اور نتی کے اوچھل شکار کھیلتے ہیں۔ اس ہم غنیمت اسکتہ کچھ تو حیا ہے ۔ اور ہزاروں جوان سادہ رو نیک خو ایسے ہیں کہ باوصاف جوانی اور عالم شباب کے مطلق واہیات کی طرف متوجہ نہیں ۔ اور وہ طریقہ سلامت روی اور نیک طبعتی اختیار کیا ہے کہ دیکھنے سے تعلق ہے ۔ غزل :(۱)

اے دھلی واے بتان سادہ — پگ بستہ دریشہ کج نہادہ
خون خوردن شان بہ آشکار است — گرچہ بپنہان خورند بادہ
قربال دہ بردہ زان کہ ہستند — از غایت ناز خود مرا دہ
نزدیک دل آن چنان کہ جہان را — برداشتہ گوشۂ نہادہ
جائے کہ بود کنندہ گل گشت — در کوچہ و مدگل پیادہ
آسیب صبا رسید بردوش — دستار چہ بر زمین فتادہ
شان در رہ عاشقان بہ دنبال — خون نابہ ز دیدگان کشادہ
ایشان ہمہ بادہسی در سر — بیجا ہمہ دل بباد دادہ
خورشید پرست شد مسلمان — زین کج کلہان شوخ و ساد
کردند مرا خراب و سرمست — ہندو بچگان تاک زادہ

سر بستہ شان بحرف مر غل
خسرو چو می گست در قلادہ

اب میں بزرگان معاصرین علیہ الرحمۃ کا جن کے فیض خدمت سے میں مشرف ہواہوں یا اس زمانے میں ان کے وجود باوجود سے عالم کو رونق تھی ، حال لکھتا ہوں ۔" (۲)

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی اس کی تاریخی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں :

" اس تذکرے کی ایک خاص تاریخی اہمیت ہے جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں ، وہ یہ کہ اس میں جن بزرگوں اور اہل ہنر کا تذکرہ ہے وہ آج کسی

---

(۱) یہ غزل حضرت خواجہ امیر خسرو کی ہے اور ان کے دیوان میں موجود ہے ۔(راقم) ~~(ابوسلمان)~~

(۲) سرسید احمد خان" آثارالصنادید"، محولہ بالا ، (۱۸۴۷ع) ، ص ۱۵-۱۲

کتاب میں نہیں ملتا ، بلکہ سرسید کے بعد دہلی سے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ ان میں " آثار الصنادید" ہی سے اخذ و اقتباس کیا گیا ہے۔ چنانچہ " تذکرہ اہل دہلی" مولفہ سید احمد اور تاریخ دارالحکومت دہلی مولفہ مولوی بشیرالدین میں جن بزرگان دین ، مشائخ اور اہل ہنر کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اسی کتاب سے ماخوذ ہے جن کا سرسید نے اپنے معاصرین کے چشم دید حالات لکھے ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ معتبر اور مستند ہے اور اصل ماخذ کا حکم رکھتا ہے ۔" (۱)

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی سرسید کی اس علمی خدمت کے بارے میں لکھتے ہیں :

" سرسید نے ۱۸۴۷ء (۲) میں ایک نہایت مفید کام کیا۔ یعنی ان کے زمانے میں مختلف علوم و فنون کے جس قدر ماہر اور مشاہیر دہلی میں موجود تھے اور جو کسی نہ کسی حیثیت سے مشہور تھے ان کا ایک جامع اور مبسوط تذکرہ مرتب کیا۔ ظاہر ہے کہ اس تذکرے کو مرتب اور مدون کرنے میں سرسید کو دوڑ دھوپ ، تگ و دو اور سعی و کوشش کرنی پڑی ہوگی اور حالات و واقعات کی تلاش میں کس کس کی خوشامد نہ کرنی پڑی ہوگی ۔ جب جاکر یہ بے نظیر تذکرہ مرتب ہوا ہوگا۔ اس میں سرسید نے اس قسم کے ایسے کملائے دہر ماہر کے سوانحی حالات جمع کیے تھے جو اپنے اپنے فن میں اپنے زمانے میں یکتائے عصر تھے اور جن کا مثل دہلی کی خاک سے پھر پیدا نہ ہوسکا۔ اس تذکرے میں کل ۱۱۹ لوگوں کا حال تھا۔۔۔ یہ ۱۸۵۷ء کے "انقلاب عظیم" سے پہلے کے علمائے عصر، کملائے فن ، شاعران نواسنج ، طبیبان حاذق وغیرہ کے حالات کا حسین اور دل آویز مرقعہ تھا جسے سرسید کے شگفتہ قلم نے صفحہ قرطاس پر بڑی روانی اور خوبی کے ساتھ کھینچا تھا۔ اگر سرسید کا یہ تذکرہ نہ ہوتا تو ہمیں اس دور کے مشاہیر کے حالات اور دہلی مرحوم کے ان درخشندہ جواہر کا کچھ بھی پتا نہ لگ سکتا ۔ یہ حالات جس قدر ضروری

---

(۱) اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں، " تذکرہ اہل دہلی"، محولہ بالا، دیباچہ ، ص ۳

(۲) ۱۸۴۷ء " آثار الصنادید" کی اشاعت کا سال ہے، اگر کام کرنے سے مراد تصنیف و تالیف ہو تو صحیح سال ۱۸۴۶ء ہے۔ اگر مقصود سال اشاعت ہو تو شیخ محمد اسمعیل پانی پتی صاحب نے صحیح لکھا ہے ۔ (راقم)

اور اہم تھے اس قدر نایاب اور ناپید تھے ان کو ایک مبسوط مضمون کی شکل میں سرسید نے ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں اپنی مشہور عالم کتاب " آثار الصنادید " کے آخر میں لگایا تھا۔" (۱)

یہ تو دہلی کے اکابر علم وفضل اور ارباب فن کے بارے میں ایک معاصر شہادت کی حیثیت سے اس تذکرہ کی اہمیت تھی جس کی طرف اختر جوناگڑھی اور اسمعیل پانی پتی نے اشارہ کیا ہے ۔ لیکن خود سرسید کے ذہنی و فکری ارتقا اور سیرت کے مطالعے میں اس تذکرے کی بہت اہمیت ہے ۔ اختر جوناگڑھی نے اس تذکرے کی اس اہمیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" اس تذکرے میں جن مشائخ و علما خصوصاً حضرات نقشبندیہ کا حال لکھا ہے اور جس حسن عقیدت کے ساتھ ان کے تذکرے قلم بند کیے گئے ہیں ۔ اس سے روحانیت کی طرف سرسید کا رجحان ، تصوف و معرفت سے ان کا دلی لگاؤ اور صاحب نسبت بزرگوں سے گہری عقیدت مندی کا پتا چلتا ہے اور جو لوگ ان کو دہریہ اور نیچری سمجھتے ہیں ان کے خیالات کی تردید ہوجاتی ہے اور یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتباع شریعت میں اصحاب طریقت کی پیروی کو ضروری اور لازمی سمجھتے تھے اور خالص اسلامی تصوف اور اصحاب معرفت کے معتقد و معترف بلکہ مرید تھے۔" (۲)

سرسید کا اسلوب نگارش :

سرسید کی علمی خدمات کے ذیل میں ہم ان کی ابتدائی تحریروں کے نمونے نقل کیے جا چکے ہیں ان پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ سادگی ، بے ساختگی ، سلاست اور صاف انداز بیان سرسید کی تحریر کی جو عام خصوصیات سمجھی جاتی ہیں ان کے نشانات ان کی ابتدائی تحریروں ہی میں نظر آتے ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں :

---

(۱) اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد ، " مقالات سرسید " ، محولہ بالا ، حصہ شانزدہم ، " شاہجہان آباد کے لوگوں کا بیان " (مشمولہ) ، ص ۲۰۹-۱۰

(۲) اختر جوناگڑھی ، قاضی احمد میاں (مرتبہ) ، " تذکرہ اہل دہلی " ، محولہ بالا ، " دیباچہ " ، ص ۳

" سرسید کی ابتدائی تحریریں غالباً " سیدالاخبار" میں درج ہوتی شروع ہوتی تھیں جس کو ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں اس وقت جاری کیا تھا جب کہ سرسید کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی - اگرچہ اس وقت سے لے کر ۱۸۵۷ء تک انھوں نے متعدد کتابیں اور رسالے مذہب اور تاریخ کے متعلق لکھے اور ان میں سے بعض کتابیں (جیسے آثارالصنادید") بدرجہ غایت مقبول اور مشہور بھی ہوئیں لیکن طرز تحریر میں اس وقت تک کوئی ایسی صُریح تبدیلی پیدا نہیں ہوئی جس کے لحاظ سے سرسید کو اردو لٹریچر میں کسی ممتاز حصہ کا مستحق کہا جاسکے -

البتہ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ عبارت کی سادگی اور بے ساختگی جو سرسید کی تحریر کی عام خاصیت ہے وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تحریروں میں بھی جب کہ تصنع اور تکلف انشا پردازی کا زیور سمجھا جاتا تھا ، برابر پائی جاتی ہے-

نہایت صحیح اور سچا مقولہ ہے کہ " اذا ارادالله شیئاً هیّأ اسبابه " چوں کہ سرسید سے قوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام ظہور میں آنا تھا اس لیے خدا تعالی نے ان کی ذات میں وہ تمام خاصتیں جمع کردی تھیں جو ایک ریفارمر میں ہونی ضروری ہیں- انھیں خاصیتوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ابتدا سے تحریر یا تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت کرتے تھے اور گریمر کی پابندی سے فطرۃً آزاد تھے - یہی وجہ تھی کہ انھوں نے جو اول اول دلی میں اپنے گرد شعرا کا جمگھٹا دیکھ کر ان کی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا- کچھ بہت دن نہ گزرے کہ وہ ان تکلفات لابدی سے جو شاعری کے لیے لازم ہیں اور حقائق نگاری میں مخل ہوتے ہیں ، ہمیشہ کے لیے دست بردار ہوگئے - انھوں نے " سیرت فریدیہ" میں اپنے بچپن کا حال لکھا ہے کہ ان کے نانانے جب کہ وہ بوستاں پڑھتے تھے ، ان کا سبق سنا ، سبق میں وہ شعر بھی تھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے :

" طمع را سہ حرف ست ہر سہ تہی "

انھوں نے اس کا ترجمہ کیا کہ طمع کے تین حرف تینوں خالی- نانانے تین دفعہ ٹوکا اور بہت خفا ہوئے مگر یہ وہی معنی کیے گئے چوں کہ محاورے کے

موافق ترجمہ بھی فصیح تھا۔ اس لیے گرامر کا مطلق خیال نہ آیا ۔ جو حال ان کا اس بچپن کے زمانے میں تھا وہی اخیر دم تک باقی رہا ۔ وہ تحریر و تقریر کی رنگینی گرامر کی کچھ پروانہ کرتے تھے ۔ وہ ان قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں، بالکل آزاد تھے ۔ وہ ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہیں، صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کی زبان دلی کی بول چال میں محدود نہ تھی بلکہ جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی ان کی زبان اور وہی بول چال تھی ۔ غالباً انھوں نے کسی لفظ کے استعمال کرتے وقت یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ یہ لفظ اہل زبان بولتے ہیں یا نہیں؟ اور کسی فقرے کو لکھ کر پھر یہ نہ دیکھا ہوگا کہ قواعد کی رو سے اس کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں۔

یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ایک سچے رفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے جیسی سچائی اور راست بازی ۔ وہ مثل شاعروں اور انشا پردازوں کے اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اس بے قرار آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تحاشا آگ بجھانے کے لیے پکارتا ہے، ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسان کے منھ سے نکل جاتے ہیں۔ وہ واقعات پر تشبیہ و استعارے کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ ان کی ننگی تصویر کھلم کھلا سب پر ظاہر کرتا ہے ۔ وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ الفاظ اور قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے ۔

الغرض سرسید نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنع کو کبھی دخل نہیں دیا، جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی، غدر کے زمانے تک جو کہ تقریباً بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے اپنے اسی سیدھے سادے اور مجہول اسٹائل میں ہر قسم کی تحریریں کیا کتابیں، کیا مضامین، کیا مقدمات کے فیصلے، اور تجویزیں برابر لکھتے رہے ۔

اس بیس سال کی مشق و مہارت نے جو کہ ایک انداز پر متصل جاری رہی ضرور ہے کہ ان کے قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ مضمون

کے سلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہوگی ۔ کیوں کہ نیچرل قوی
سے جب ان کے مقتضی کے موافق برابر کام لیا جاتا ہے تو ان سے اکثر فوق العادۃ
کرشمے ظہور میں آتے ہیں مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب کہ اس سیدھی
سادی تحریر کے اصلی جوہر کھلنے والے اور اس ٹھنڈی آگ کے شعلے بلند ہونے
والے تھے ۔ غالباً اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر یا تقریر کا اصل مقصد
لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اس امر میں سب کی ر
رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے ۔ اسی ایک مقصد
کے لیے کوئی الفاظ میں تراش خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی کوئی کلام
کی بنیاد و متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر کوئی
سج سج کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈ
ڈھونڈ کر اہل زبان کے محاورے اور روزمرے بہم پہنچاتا ہے ۔ اسی طرح کوئی
کسی ڈھنگ پر چلتا رہے اور کوئی کسی طریقے پر ۔ مگر حق یہ ہے کہ کلام کی
تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں :

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

بے شک کلام کے موثر ہونے کے لیے اس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضروری ہے ۔ مگر
اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ او بے تکلف ہوگا وہ موثر بھی
ضرور ہوگا ۔ کلام کیسا ہی سادہ اور بے تکلف ہو جب تک کہ متکلم
کا دل آزادی اور سچائی سے بھرا ہوا نہ ہو، کبھی موثر نہیں ہوسکتا
جس طرح تلوار کا کاٹ در حقیقت اس کی باڑھ میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرتبی
ہاتھ میں ہے ۔ اسی طرح کلام کی تاثیر اس کے الفاظ میں نہیں متکلم کی
سچائی اور اس کے نڈر دل اور بے لاگ زبان میں ہے ۔ وہی الفاظ جو ایک سچے
اور دل سوز ناصح کی زبان سے نکل کر لوگوں کے دلوں میں تیر و سنان کا کام
کرتے ہیں ممکن نہیں کہ ایک نمائشی واعظ کی زبان پر ان میں کچھ بھی اثر
باقی رہے ۔ سچے ناصح کے لعن طعن میں جو اثر ہوتا ہے وہ جھوٹے واعظ
کی بشارتوں میں نہیں ہوتا ۔ سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت
ان کی سچائی اور حق گوئی میں تھی۔ .... سرسید کی تحریریں بھی چیز

تھی جس نے ان سیدھے سادے اور معمولی لفظوں میں جادو کا سا اثر پیدا
کردیا تھا اور تمام قوم میں ہل چل ڈال دی تھی۔" (۱)

حالی نے نہایت تفصیل کے ساتھ سرسید کی طرز تحریر پر کلام کیا ہے - لیکن ہمارا موضوع چوں کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تحریریں اور خاص طور پر "آثارالصنادید" اور "تذکرہ اہل دھلی" ہے جو اس مقالے کا سب سے بڑا ماخذ ہے اس لیے ہم ان کی بعد کی تحریروں کی خصوصیت سے صرف نظر کی جاتی ہے - حالی نے سرسید کی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تحریروں کے جن محاسن کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ان کی تحریر کی سادگی ، بے ساختگی ، تصنع اور بناوٹ سے نفرت ، عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری الفاظ کا بے تکلف استعمال سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ مطلب نگاری ، سیدھا سادہ اور نیچرل اسٹائل ، سچائی اور حق گوئی اور خیالات کی بلندی و شکوہ وغیرہ خصوصیات ہیں لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ سرسید کی ابتدائی تحریریں زبان کے محاسن نہ تھے - حالی نے لکھا ہے اور ثبوت کے لیے اس تذکرے کی شخصیات کے تذکار و تراجم پر نظر ڈال لینی چاہئے - صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی تحریر لفظی خوبیوں کے لحاظ سے بھی ادب کے معیار پر بھی اترتی ہے -
حالی لکھتے ہیں :

" مگراس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سرسید کی تحریر جو بظاہر متعارف لفظی خوبیوں سے خالی معلوم ہوتی تھی درحقیقت اس میں لفظی خوبیاں نہ تھیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب عمدہ اور پاکیزہ خیالات ایسے صاف اور معنی خیز لفظوں میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لفظوں کے ساتھ ہی ساتھ معنی بھی ذہنوں میں اترتے جاتے ہیں تو خیالات کی خوبی ناظروں کو الفاظ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی بلکہ محاسن لفظی خیالات کی شکوہ میں دب جاتے ہیں۔

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید" ، محولہ بالا ، حصہ دوم ،
صص ۳۰۲- ۳۹۷

اس کے سوا جب مصنف کی ہمت محض صدہ خیالات کے پھیلانے پر مصروف ہوتی ہے تو اس کے بیان میں محاسن لفظی کی اسی قدر گنجائش ہوتی ہے جس قدر کہ ہر مقام کا مقتضا ہوتا ہے اور اس لیے وہ عبارت میں اس قدر گھل مل جاتے ہیں کہ جب تک بہ نظر غور نہ دیکھا جائے عام بیان ان سے سادہ نظر آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تحریر میں لفظی خوبیاں ایسی اجاگر نہیں معلوم ہوتیں جیسی دیگر مصنفین کے کلام میں معلوم ہوتی ہیں ورنہ صنائع لفظی کے سوا اس میں تمام محاسن لفظی و معنوی موجود ہیں۔ تشبیہیں بھی ہیں، استعارے بھی ہیں، کنائے بھی ہیں، تمثیلیں برجستہ اور تلمیحیں نہایت لطیف ہیں۔ بذلے اور لطیفے حد سے زیادہ دل کش اور دل فریب ہیں۔ کہاوتیں اور اشعار بر محل جا بجا نظر آتے ہیں مگر اس قبیل کی جو چیز ہے اس میں ایسا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے کہ گویا بے قصد و بے ارادہ مصنف کے قلم سے ٹپکی ہے ۔" (۱)

خواجہ محمد زکریا نے ۱۸۵۷ء سے قبل کی نثر پر جو فاضلانہ مقالہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے سرسید کی نثر اور اس کی خصوصیات پر بھی بحث کی ہے اور مختلف تصانیف کی زبان پر الگ الگ اظہار خیال کیا ہے ۔

"جلاء القلوب بذکر المحبوب" (۱۸۴۲ء) کی نثر پر خواجہ محمد زکریا نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :

"اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سید احمد خاں نے اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز میں بھی سادہ اور سلیس نثر کو مطمح نظر بنایا تھا اور اس زمانے میں بھی آپ مروجہ نثر کے اسالیب سے ہٹ کر فطری انداز بیان کو اپنانے میں مصروف تھے۔" (۲)

"جلاء القلوب بذکر المحبوب" کے بعد ۱۸۴۴ء میں "تسہیل فی جرالثقیل" کے نام سے ان کے قلم سے ایک ترجمہ نکلتا ہے ۔ اس کی نثر کے بارے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

"تسہیل فی جر ثقیل" کی نثر ریاضی کی اصطلاحات سے گراں بار ہے ۔

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، حصہ ۲، ص، ۳-۲۰۲

(۲) زکریا، خواجہ محمد، "اس دور کی نثر (سرسید وغیرہ)"، (مقالہ مشمولہ) "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۱۱۱

کیوں کہ یہ کوشش ادبی تصنیف نہیں ھے ۔ اس کے فقروں میں تعقید بھی موجود ھے ۔ کیوں کہ اس کی تحریر کا اصل مقصد مطالب کی وضاحت ھے ۔ اس لیے فقروں کی ساخت پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ فقروں کے گنجلک ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ھے کہ یہ بہرصورت ترجمہ در ترجمہ ھے ۔ تاہم اس کی نثر مقفا اور مسجع ہرگز نہیں بلکہ واضح طور پر " عاری" ھے ۔ (۱)

قول متین سرسید کی ۱۸۳۶ء کی یادگار ھے ۔ اس کی نثر کی نسبت خواجہ صاحب نے لکھا ھے :

" قول متین در ابطال حرکت زمین بھی ان کی اس دور کی دوسری تحریروں کے اسلوب سے مختلف نہیں ۔ زیادہ توجہ مفہوم کی ادائیگی پر ھے ۔ اس میں عربی کے مشکل الفاظ اور اصطلاحات موجود ہیں مگر قافیہ بندی کی شعوری کوشش پوری کتاب میں نظر نہیں آتی ۔" (۲)

" تحفہ حسن" بھی سرسید کا ۱۸۴۴ء کا یادگار ترجمہ ھے ۔ سرسید کی علمی خدمات کے مبحث میں اس کتاب کے کئی اقتباس ~~ھے~~ نقل کیے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ھے کہ سرسید شروع ہی سے سادہ نگارش کی طرف مائل تھے ۔ کسی قسم کی پیچیدگی اور الجھاؤ نہ ان کے خیالات میں ھے نہ انداز بیان میں۔ " کلمہ حق " ۱۸۴۹ء کی اور " راہ سنت در رد بدعت " ۱۸۵۰ء کی تالیفات ہیں اور زبان و بیان کے ان ہی محاسن سے آراستہ و پیراستہ جن سے دوسری تصنیفات و تالیفات متصف ہیں۔

تذکرہ کا اسلوب تحریر :

" آثارالصنادید" کے اسلوب تحریر کے بارے میں حالی نے لکھا ھے :

---

(۱) زکریا، خواجہ محمد " اس دور کی نثر (سرسید وغیرہ) (مقالہ) " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، محولہ بالا، ج ۸، (مقالہ) ، ص ۱۱۳

(۲) ایضاً، ج ۸، صص ۱۲-۱۱۳

" اگرچہ اس ایڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ اور تکلفات باردہ کے سبب آج کل کے مذاق کے موافق بہت پھیکی اور بے مزہ ہوگئی تھی اور اس کے سوا اس میں اور بھی بہت سی کسریں اور فروگزاشتیں رہ گئی تھیں مگر مضمون کے لحاظ سے نہایت عبرت خیز تھی۔" (۱)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :

" آ ثارالصنادید کا سب سے پہلا اڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے ۔" (۲)

" آثارالصنادید " کے اسلوب کے بارے میں یہی بنیادی رائے تھی جسے بعد کے نقاد اور اہل قلم نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ کسی نے اس کی ساختگی و تکلف کو مقفا و مسجع عبارت لکھا ہے کسی نے اس کی رنگینی اور مبالغہ کے لیے اس کا رشتہ " سہ نثر ظہوری " اور " انشائے ابوالفضل " سے جوڑ دیا ہے - پھر یہ بحث یہاں تک بڑھی کہ " آثارالصنادید " کے بجائے ان کی ابتدائی دور کی تمام تصانیف کے بارے میں لکھ دیا گیا کہ ـــ

" ابتدائی دور کی تصانیف کا انداز پر تکلف ہے اور ان کی عبارت مسجع و مقفا ہے ۔" (۳)

ابتدائی دور سے فاضل نقاد کا مقصود ۱۸۵۷ء تک کی تصانیف ہیں ، لیکن کیا واقعی یہ تنقید حقیقت پر مبنی ہے ؟ ابتدائی دور کی تصنیفات پر ہم گزشتہ صفحوں میں بحث ~~کر آئے ہیں~~ ہو چکی ہے، متعدد کتابوں سے سرسید کی تحریر کا نمونہ بھی نقل ~~کر آئے ہیں~~ کیا گیا ہے اور متعدد ابتدائی تصنیفات کے اسلوب تحریر کے بارے میں ایک فاضل نقاد خواجہ محمد زکریا

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، حصہ اول ، ص ۵۶

(۲) ایضاً ، حصہ دوم ، ص ۳۹۸

(۳) فرمان ~~فتح پوری~~ ، پروفیسر محمد ، " سرسید احمد خان " ، (مقالہ) " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند " ، محولہ بالا ، (چہارم) ، ج ۹ ، ص ۸۳

کی رائے بھی نقل کی گئی ہے۔ ہماری نگاہوں نے تو یہی دیکھا اور دماغ نے یہی فیصلہ کیا کہ ابتدائی تصانیف کا انداز بیان نہایت آسان ، سلیس ، عام فہم ہے اور بے تکلف زبان سے نکلا اور بے ساختہ قلم سے ٹپکا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ مولانا حالی کی بھی یہی رائے ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" البتہ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ عبارت کی سادگی اور بے ساختگی جو سرسید کی تحریر کی عام خاصیت ہے وہ ۵۷ء سے پہلے کی تحریروں میں بھی تھی۔ جب کہ مسجع اور تکلف انشاپردازی کا زیور سمجھا جاتا تھا، کم برابر پائی جاتی ہے ۔" (۱)

۱۸۵۷ء سے قبل کی تحریرات میں صرف " آثارالصنادید" ایک ایسی تصنیف ہے جس میں بعض مقامات پر تکلف اور ساختگی پائی جاتی ہے اور مقفا جملے اور مسجع تحریر معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بلا تخصیص اشاعت اس کی تحریر کی خوبی سادگی، بے تکلفی، سلاست اور " اردویت " ہے ۔

خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں :

" آثارالصنادید" کے بارے میں تمام نقادوں ، محققوں، تاریخ دانوں اور تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ پہلے ایڈیشن کی عبارت پر تکلف اور فارسیت سے گرانبار تھی۔ بعض لوگوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یہ اردو میں "سہ نثر ظہوری" اور " انشائے ابوالفضل" کے تتبع کی کوشش تھی ۔ اور یہ کہ دوسرے ایڈیشن میں جہاں مواد میں تبدیلیاں کی گئیں ، وہاں انداز بیان کو بدل کر آسان اور نئے زمانوں کے تقاضوں کے مطابق بنایا گیا مگر دونوں اشاعتوں کے انداز بیان کا مقابلہ کیا جائے تو کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں ایڈیشنوں کی نثر میں سادگی اور بے تکلفی ہے ۔ رنگین بیان اور فارسیت کی

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۹۸

بجائے سلاست اور " اردویت " ہے ۔ اگرچہ اشاعت ثانی میں مواد کے اعتبار سے قطع و برید کی گئی ہے بعض فقروں میں کمی بیشی کی گئی ہے ، لیکن جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے اس میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ اشاعت اول کا صرف آخری باب جو مشاہیر دلی کے بارے میں ہے کسی قدر مختلف اسلوب میں نظر آتا ہے ۔ مگر اس میں بھی کہیں کہیں قافیہ بندی کی گئی ہے اور بس ۔ یہ قافیہ بندی اگرچہ کہیں کہیں باغ و بہار یا غالب کے خطوط کی یاد دلاتی ہے لیکن اس کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا۔" (۱)

خواجہ صاحب نے جو " آثارالصنادید" کے چوتھے باب کو اسلوب کے لحاظ سے اس کے ابتدائی ابواب سے " کسی قدر مختلف اسلوب میں" بتایا ہے نیز یہ کہ کہیں کہیں اس میں بھی قافیہ بندی کی گئی ہے لیکن اس کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ تو خواجہ صاحب نے اپنی اسی رائے کی تائید میں حضرت شاہ غلام علی کے ترجمے کی ابتدائی سطریں نقل کی ہیں ۔ اس کے بعد ان الفاظ میں اس کے اسلوب پر تبصرہ کیا ہے :

" سرسید شخصیت کے تعارف کا آغاز تو کسی قدر قدیم انداز میں کرتے ہیں مگر جلد ہی آسان عبارت لکھنے لگتے ہیں ۔ اس اقتباس کی نثر نہایت آسان ہے۔ اس میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ۔ حالاں کہ موضوع ایسا ہے کہ لفاظی اور عبارت آرائی کی بڑی گنجائش نکل سکتی تھی ، مگر اس سے اجتناب کیا گیا ہے۔ ذراسی کاوش سے قافیے کئی گنا بڑھائے جاسکتے تھے۔ موجودہ صورت میں جو قافیے موجود ہیں ان میں آورد کی کیفیت نہیں بلکہ آمد اور بے ساختگی ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ یہ باب بھی بہت حد تک سادہ نثر کا نمونہ ہے ۔" (۲)

ہم خواجہ صاحب کے شکر گزار ہیں کہ ان کی اس عبارت اور تبصرے سے کہ سرسید

---

(۱) زکریا ، خواجہ محمد " اس دور کی نثر (سرسید وغیرہ) " ، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، محولہ بالا ، ج ۸ ، (حصہ سوم) ، ص ۱۱۶

(۲) ایضاً ، ج ۸ ، (حصہ سوم) ، ص ۱۱۷

شخصیت کے تعارف کا آغاز تو کسی قدر قدیم انداز میں کرتے ہیں مگر جلد ہی آسان عبارت لکھنے لگتے ہیں۔" ہمیں اس تذکرے (یعنی آثارالصنادید کے چوتھے باب) کے تراجم کی تحریر و نگارش کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کا خیال پیدا ہوا ۔ اگرچہ شاہ غلام علی کے ترجمے میں تو خواجہ صاحب موصوف کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے تعارف کا آغاز کسی قدیم انداز میں ہوا ہے لیکن عام طور پر شخصیات کے تعارف میں سرسید نے اسی اصول کو برتا ہے وہ شخصیت کے اوصاف و محامد کے بیان میں مقفا و مسجع زبان استعمال کرتے ہیں اور جہاں سے حالات و سوانح شروع ہوتے ہیں تو ایک دم نہایت آسان زبان لکھنے پر اتر آتے ہیں اور پھر اسی انداز میں ترجمہ اختتام کو پہنچتا ہے ۔ اسی بات کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ترجمہ کا آغاز تقریظ کے قدیم انداز سے ہوتا ہے اور حالات و سوانح کے بیان میں سرسید جدید سوانح نگاری کے اصول پر اتر آتے ہیں حالانکہ اس وقت اون کے سامنے جدید سوانح نگاری کی ایسی کوئی روایت نہ تھی اور نہ ہی یہ روایت سرسید نے ڈالی، اس پر عمل کرکے دکھایا اور اپنے نقش قلم کو دوسروں کے لیے رہنما چھوڑ گئے ۔ یہ سرسید کی اپنی جدت تھی اور آج خواہ کسی کو یہ انداز پسند نہ آئے لیکن کم از کم بزرگان دین، علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے تذکار کے لیے یہ نہایت مفید اسلوب بیان ہے کہ پہلے صاحب ترجمہ کے فضائل و محاسن اور اوصاف و محامد کا نقش قاری کے دل پر ثبت کرکے ترجمے کے مطالعے کا ذوق اور اس کے لیے تڑپ پیدا کردی جائے پھر آسان زبان ، سادہ اسلوب اور واقعاتی انداز میں سوانح و سیرت کو بیان کیا جائے ۔ سرسید نے چند تراجم کے سوا تمام ترجموں میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے ۔ یہ چند مستثنی تراجم مفتی صدرالدین آزردہ ، امام بخش صہبائی اور مولانا نورالحسن کے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کا ترجمہ ترجمے کے ذیل میں آتا ہی نہیں ۔ سرسید نے ان کے ترجمے

کا آغاز نہایت شاعرانہ اور مبالغہ آمیز انداز میں کیا ہے ۔ پہلے مولانا جامی کی نعت کا مشہور شعر ـــ

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب

ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

ان پر منطبق کیا ہے ۔ پھر ایک صفحہ سے " زائد " تمہید کے مضمون سے سیاہ کیا ہے۔ پھر " آغاز مدح " کے ذیلی عنوان سے اوصاف و مدائح شروع ہوتے ہیں اور کوئی حد فاصل قائم کیے بغیر تقریباً تین صفحوں میں جاکر ترجمہ یا قصیدہ ختم ہوتا ہے ۔ اس کے بعد ان کی عربی اور فارسی نثر و نظم اور فارسی اور اردو کلام کا نمونہ ہے ۔ اسی طرح امام بخش صہبائی سے تعلقات اور ان کے ذوق کا لحاظ ضروری تھا چناں چہ موزونیت ان کے ترجمے میں بھی سرسید نے قلم کی قدرت کاری اور کمال نگارش کا خوب خوب اظہار کیا ہے۔ " آثارالصنادید " کی تالیف میں سرسید کے ساتھ انھوں نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے اپنا قیمتی وقت صرف کیا تھا ~~اپنے اوقات عزیز صرف کیے تھے~~ اور اپنے تئیں صعب و تعب میں ڈالا تھا ضروری تھا کہ سرسید کی جانب سے اس کا حق ادا کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں سرسید کے قلم نے کوتاہی نہیں کی ۔ مولانا نورالحسن سے سرسید کا رشتہ استادی شاگردی کا تھا اور اس تعلق و عقیدت و ارادت کا مقتضا یہی تھا کہ ان کی مدح و توصیف میں کمال اہتمام کیا جائے چناں چہ ~~ہم دیکھتے ہیں کہ~~ ویسا ہی حسن و کمال اہتمام موجود ہے ۔

ان ترجموں کے سوا تمام تراجم میں انھوں نے اسی اصول کی پابندی کی ہے جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے ۔ البتہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن میں اس قسم کی کوئی تمہیدی عبارت نہیں ایک دم حالات شروع ہوجاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱- مولانا شاہ ابوسعید کے ترجمے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

" آپ شاہ غلام علی صاحب کے خلیفہ اعظم ہیں اور آپ کے انتقال کے بعد آپ ہی سجادہ نشین ہوئے تھے لیکن اس بات کو بھی خیال کرلو کہ آپ حضرت مجدد کی اولاد میں ہیں ...."

۲- شاہ احمد سعید کے ترجمے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے :

" شاہ ابوسعید صاحب کے بڑے بیٹے اور جانشین ہیں ...."

۳- شاہ عبدالغنی کے ترجمے کا آغاز یہ ہے :

" آپ بھی جناب شاہ ابوسعید صاحب کے فرزند ارجمند ہیں اور حقیقت میں فخر خاندان ہیں...."

۴- نواب قطب الدین خان کے ترجمے کا آغاز اس طرح کیا ہے :

" تحصیل علم و فضل خصوصاً فقہ و حدیث خدمت بابرکت مولانا اسحاق صاحب مرحوم مغفور بہرہ سے کی ۔ اتباع سنت میں سر بعش رواں مسلک دین سے آپ کا قدم آگے بڑھا ہوا ہے ...."

۵- مولوی عبدالخالق کے ترجمے کے آغاز کی سطریں ملاحظہ ہیں :

" آپ کا شہرہ علم و فضل کا اوائل حال سے آج تک شاہجہان آباد میں ایسا بلند ہے کہ اس سے گوش فلک ..."

۶- مولوی نصیرالدین کے ترجمے کے آغاز کا انداز یہ ہے :

" شاگردان جناب مولانا محمد اسحاق صاحب مغفور مرحوم سے ہیں ...."

۷- مولوی کریم اللہ آغاز ترجمہ یہ ہے :

" جامع فنون ہیں ، خصوصاً دینیات میں دست گاہ کامل ہے -

توکل و قناعت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے ہے ۔۔۔"

سرسید نے بالکل یہی انداز مولوی کرامت علی، مولوی مملوک علی، مولوی نوازش علی، مولوی محمد رستم علی خان، حاجی محمد، ملا سرفراز وغیرہ کے تراجم کے آغاز میں اختیار کیا ہے -

اس کے برعکس اصحاب ثلاثہ، شاہ اسمعیل شہید، مولانا فضل حق، علی مومن، شیفتہ، صدنی وغیرہ کے تراجم کے آغاز میں شاعرانہ انداز بیان - مقفا و مسجع تحریر اور تکلف و صناعت کی زبان کو استعمال کیا ہے - لیکن کہیں تہائی، چوتھائی صفحہ ہے کہیں چار، چھ جملے، کہیں دو ایک اور بعض مقامات پر صرف ایک آدھ جملہ اس انداز کا ہے - سرسید کی تالیف کی اس خوبی کے صحیح اندازے کے لیے آغاز ترجمہ کے چند نمونے نقل کیے جاتے ہیں :-

۱- <u>شاہ عبدالعزیز :</u>- اعلم العلماء، افضل الفضلا، اکمل الکملاء، اعرف العرفا شرف الافاضل، فخر الاماجد والاماثل، رشک سلف، داغ خلف، افضل المحدثین، اشرف العلماء ربانیین، مولانا و بالفضل اولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ العزیز ......"

۲- <u>مولانا رشید الدین خان :</u>- جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول، یگانہ روزگار، بہین نتیجہ قرون و ادوار، یکتائے زمان، ندوۂ دوران مولوی محمد رشید الدین خان طاب سراہ و جعل اللہ الجنۃ مثواہ....."

۳- <u>شاہ رفیع الدین :</u>- مولی الکرام، مخدوم الانام، عامل باعمل، فاضل اجل، اسوۂ افاضل عرب و عجم، زبدۂ ارباب همم، سند اکابر روزگار، فخر کملائے شہر و دیار، محی الشرع والسنۃ، ماحی ھوی و بدعۃ، موسس

اساس دین مبین، ھادینا و مولانا حضرت شاہ رفیع الدین ...."

۴- مولوی مخصوص اللہ :- عالم باعمل، مبرّا از حرص و امل ، زبدۂ فقہائے
زمان، اسوہ صلحائے جہان، معارف دستگاہ مولوی مخصوص اللہ ...."

۵- شاہ عبدالقادر :- حضرت با برکت کثیر الافادت ، جناب غفران مآب کامل
واصل زبدہ علمائے متالہین ، اسوہ کملائے زاہدین، محقق مسائل دین ، موسس
معانی شرع مبین، ھادی شریعت پیر طریقت ،مولانا شاہ عبدالقادر صاحب
غفراللہ لہ ...."

۶- مولانا عبدالحئی :- افضل الفضلا ، اکمل الکملا ، قامع بنیان مبتدع بدع
واھوا، ھادی زھد و تقوی ، فضائل دستگاہ ، فواضل پناہ ، جامع صفات
جلال و جمال ، قامع اساس کفر و ضلال ، مولانا عبدالحئی صاحب
غفر اللہ لہ ......"

۷- شاہ محمد اسحاق :- مخدومی مخدوم الاعالی افضل الکرام اشرف العظام ،
ملک سیرت فرشتہ صورت ، جامع رموز حقیقت و طریقت، مواظب اوامر شریعت،
علمائے دین، مسند المحدثین ، یگانہ آفاق مولانا مولوی محمد اسحاق ....."

۸- شاہ محمد یعقوب :- صاحب خلق محمدی تابع شریعت احمدی، جامع محامد
صفات، ھادی جماعہ اوقات، خالق کے محب اور خلائق کے محبوب مولوی محمد
یعقوب ...."

۹- علامہ فضل حق خیر آبادی :- مستجمع کمالات صوری و معنوی جامع فضائل
ظاہری و باطنی، بناء بنائی فضل و افضال بہار آرای چمنستان کمال،
متکی ارایک اصابت رائی مسند نشین دیوان افکار رسائی، صاحب خلق

محمدی، مورد سعادات ازلی و ابدی، حاکم محاکم مناظرات فرمان روائی کشور محاکمات ، عکس آئینہ صافی شمس ثالث اثنین بدیعی و حریری ، المعی وقت ولوذعی آوان فرزوق عہد ، ولید دوران، مبطل باطل و محقق حق مولانا محمد فضل حق - ......"

١٠- <u>شاہ اسمعیل شہید</u> :- اس انداز سے جو ترجمے سرسید نے لکھے ہیں ان میں سب سے زیادہ شان دار ترجمہ حضرت شاہ اسمعیل شہید کا ہے - اس کا آغاز نظامی گنجوی کے اشعار سے کیا گیا ہے - اشعار کے بعد القابات کی ایک طویل فہرست ہے جن سے ان کی سیرت کے محاسن اور فضائل و کمالات کا اظہار ہوتا ہے - ان کے حالات اور خدمات کے بیان میں بھی نہایت تفصیل سے کام لیا ہے - حضرت شاہ غلام علی کے بعد تذکرہ کا سب سے طویل ترجمہ یہی ہے - دوسرے طویل تراجم حضرت سید احمد شہید اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ہیں لیکن وہ اس سے نہ صرف سطروں کے شمار میں بلکہ صفحوں کی گنتی میں کم ہیں- اسی طرح اس کے آغاز کی عبارت جو اوصاف و محامد اور فضائل و کمالات پر مبنی ہے - تذکرہ کے تمام تراجم میں سب سے طویل ہے - اس کے انداز بیان شاعرانہ اور مقفا و مسجع ہے لیکن مبالغے کو اس میں قطعاً دخل نہیں- شاہ اسمعیل شہید کی زندگی، ان کی سیرت ، ان کی علمی دینی، اصلاحی، تحریک اور جہاد میں ان کی خدمات کا ایک ایک پہلو ہلکے سامنے ہے اور سرسید نے ان کے ترجمے میں شاعرانہ انداز اور ادیبانہ طرز نگارش میں جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخ و سوانح کی معلوم سچائیاں ہیں جن کی طرف سرسید نے اشارہ کردیا ہے - کتو سرسید لکھتے ہیں :

" علم برکش اے آفتاب بلند   خرامان شو اے ابر مشکین پرند

بنال ای دل رعد چون کوس شاہ　　　بخند ای لب برق چون صبح گاہ

بیارائے ہوا قطرۂ ناب را　　　بگیر ای صدف در کن این آب را

برآئے در از قعر دریای خویش　　　بتاج سرشاہ کن جای خویش

یعنی شاہ کشور شریعت گستری ملک الملوک دیار دین پروری ، قامع بنیان شرک و طغیان، حاوی موجبات علم و ایقان ، موسس اساس کمال ، مہذب اوضاع حال و قال ، سالک مسالک ہدایت و ارشاد مجلی آئینہ صافی اعتقاد ، مرکز دائرہ علم، محلقۂ آسمان فہم، مرقی مدارج درجات عالی ، پیشوای ادانی و اعالی ، مرجع مآب فضائل کامرتضی طبائع افاضل رموز فہم سرائر تفسیر قرآنی دقیقہ یاب معالم تقدیرات ربانی ، جامع کمالات صوری و معنوی نکتہ سنج کلام الہی وحدیث نبوی ، قدوہ اعالی پیش گاہ قبول ، جلال غوامض معقول و منقول بانی ومبانی فضل و افضال ، ممہد قواعد تکمیل و اکمال ، جاہد حق و یقین ، مثبت دلائل دین ، مولائی مخدومی مخدوم الادانی مولوی محمد اسمعیل قدس سرہ ۔۔۔۔۔"

ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ سرسید نے شخصیات کے تراجم کے آغاز کے لیے دو اسلوب اختیار کیے ہیں ۔ ایک یہ کہ کسی تمہید ، القاب اور اوصاف و کمالات کے اظہار کے بغیر ایک دم حال بیان کرنا شروع کر دیا ہے دوسری یہ کہ حالات و سوانح کے بیان سے قبل القابات اور اوصاف و کمالات کا نہایت فصیح و بلیغ انداز میں اظہار کیا ہے لیکن اگر ان دونوں قسموں کے تراجم پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ ان دونوں قسموں میں بھی انھوں نے کوئی بندھا ٹکا اسلوب اختیار نہیں کیا بلکہ ہر قسم کے تراجم کے آغاز میں تنوع ہے ۔ اس تنوع نے ایک دل کشی پیدا کردی ہے ۔

سرسید کے اسلوب نگارش کے سلسلے میں یہ نکتہ بھی نظر انداز نہ کردینا چاہئے کہ جب ہم نے کہا ہے کہ ان کا اسلوب تذکرے یعنی " آثارالصنادید" کے چوتھے، باب میں بھی سادہ و آسان اور سلیس و عام فہم ہے تو یہ بات ایک خاص دور کے عام رجحان اور

اس دور میں تحریر کے عام پسندیدہ اسلوب کے پیش نظر کہی ہے ۔ سرسید نے جس زمانے میں یہ تذکرہ لکھا بلا شبہ فورٹ ولیم کالج کے تحت جدید نثر کا آغاز ہوچکا تھا لیکن اس اسلوب نے ابھی اہل علم و اصحاب قلم میں مقبولیت حاصل نہیں کی تھی۔ اس وقت علمی زبان فارسی تھی اور اردو میں بھی مقفا و مسجع عبارت آرائی کو پسند کیا جاتا تھی۔ اردو ادب کی تاریخ میں غالب کی خطوط نگاری کو ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے لیکن ابھی یہ سنگ میل دور دور نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن سرسید قلم اٹھاتے ہیں تو اس عام اور پسندیدہ روش پر نہیں چلتے بلکہ تحریروںنگارش میں اپنی راہ خود بناتے ہیں اور اسی پر چلتے ہیں۔ چنانچہ ان کے تمام ابتدائی رسائل آسان زبان اور سادہ اسلوب میں ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان ابتدائی رسائل ؟؟ و تصنیفات کے مقابلے میں اس تذکرے کی زبان عربی و فارسی آمیز ، مقفا و مسجع اور اسلوب پر تکلف ہے لیکن اس زمانے میں کہ خاص ذوق فارسی کا تھا اور نثر میں " سہ نثر ظہوری" اور " انشائے ابوالفضل" معیار سمجھی جاتی تھیں۔ ہر شخص فارسی دان اور عربی سے واقف تھا ۔ یہ تذکرہ آسان زبان اور سادہ اسلوب کا حامل تھا۔ اگر آج کے دور میں جب کہ فارسی اور عربی کی تعلیم عام طور پر متروک ہوگئی ہے ، ذوق ختم ہوگیا ہے اور عربی و فارسی آمیز اردو تو درکنار مولوی محمد اسمعیل میرٹھی اور مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کی اردو درسی کتابوں کو بھی مشکل ترین اور قدیم ~~اسلوب~~ زبان و اسلوب میں سمجھ کر ترک کردیا گیا ہے ۔ تو اس تذکرے کی زبان پر مشکل اور پر تکلف ہونے کا الزام لگادیا جانا سوائے ~~جائیے توسلسی پے~~ ادبی اور ذوق کی کم ~~زاقتی کا کوئی جواب~~ نہیں۔ کسی کتاب کے اسلوب کے بارے میں فیصلے کے لیے علم و ذوق شرط ہے نہ کہ کم سوادی و محرومی علم و ذوق ؟ اگر کوئی فارسی سے ناواقف ، عربی سے نابلد اور ادبی ذوق سے نا آشنا ہونے کے باوجود اس تذکرے کے اسلوب کے بارے میں

فیصلہ کرنا ہے کا مشکل و پرتکلف ہے اور اس میں " سہ نثر ظہوری" اور " انشائے ابوالفضل" کی جھلک اور اس کا تتبع نظر آتا ہے تو ہمیں مصروف شکوہ سنج ہونے کی بجائے اس عہد کی کم نظری و بے ذوقی کا ماتم گسار ہونا چاہئے ۔ اس باب میں ضروری رائے یہی ہے کہ اس تذکرے کو اس کے زمانہ تصنیف اور اس عہد کے ادبی ذوق و رجحان اور علمی و تہذیبی ماحول میں رکھ کر اس کی زبان اور اس کے اسلوب نگارش کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہئیے اور اگر ان امور کا خیال رکھ کر فیصلہ کیا جائے تو اسی نتیجے پر پہنچا جائے گا۔ کہ اس تذکرے کی زبان آسان و عام فہم اور اسلوب سادہ و پرکار ہے ۔ اس کی زبان میں سلاست و لطافت بھی ہے اور اسلوب میں دل فریبی اور نظر افروزی کا سامان بھی موجود ہے ۔ حالی نے لکھا ہے "کہ سرسید کی ہر قسم کی بے شمار تحریریں موجود ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شاخ میں جس پیرایۂ بیان پایا جاتا ہے جو اس مضمون اور اس کی شاخ کے لیے موزوں اور مناسب ہے"۔(۱) اس اصول کی روشنی میں اس تذکرے پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے علما، مشائخ ، اطبا، شعرا، ارباب فنون وغیرہ سب کے لیے کلک حسب اقتضا زبان اختیار کی ہے ۔ علمی، ادبی ، دینی شخصیات، اور فنون کے ماہرین کے ترجمے کے لیے " باغ و بہار" کی کہانیوں کا اسلوب کس طرح مناسب نہ ہوتا ۔ اس کے لیے مناسب زبان اور موزوں اسلوب وہی ہوسکتا تھا جو سرسید نے اس تذکرے میں اختیار کیا ہے ۔

***

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، حصہ ۲، ص ۲۰۳

باب ۔ دوم

شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کے شاگرد

باب دوم امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تین ارشد تلامذہ کے تذکرے پر مشتمل ہے ۔ یہ تینوں تلامذہ صاحب موصوف کے صاحب زادگان والا تبار بھی ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنی تعلیم و تربیت سے جو جماعت صالحہ تیار کی تھی اور جس نے نہ صرف شاہ صاحب کے علوم و معارف کی ~~امانت~~ کی حفاظت کی بلکہ جس کی بدولت شاہ صاحب کے علوم و معارف کی شہرت سے نہ صرف برصغیر ہند و پاک کے کوہ و صحرا گونج اٹھے بلکہ اقصائے ترکی و شام سے لے کر مضافات مصر تک جس کی دانائی کا سکہ چلنے لگا، اس کے سرخیل یہی اصحاب ثلاثہ تھے ۔ جنھیں دنیا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے نام سے جانتی ہے ۔ یہی تینوں ارواح مقدسہ اپنے عظیم المرتبت والد کی وراثت علم و فکر کے جانشین ہوئے ، یہی شاہ صاحب کی علمی و فکری تحریک کو آگے بڑھانے کا موجب بنے اور انہی کی بدولت خانوادہ ولی اللہی نے ایک مکتبہ فکر کی صورت اختیار کی ۔ یہ تینوں حضرات شاہ صاحب سے براہ راست اور بلا واسطہ مستفید تھے اور ان کا خانوادہ علمی میں طبقہ اول کے افراد شمار کیے جاتے ہیں۔

سرسید نے "آثارالصنادید" میں ان تینوں بزرگوں کے تراجم کمال عقیدت کے ساتھ لکھے ہیں ۔ سرسید کی یہ تحریریں "آثارالصنادید" کی اشاعت اول کے مطابق اس باب کا متن بنی ہیں۔ تعلیقات میں سرسید کے بعض بیانات کی تصحیح ، بعض اشارات کی وضاحت اور ان کے مختلف پہلوؤں کی تکمیل کی گئی ہے ۔

باب ـ دوم

شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کے شاگرد

۱ـ جناب مولانا مولوی شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز :

" اعلم العلماء افضل الفضلا اکمل الکملاء اعرف العرفا شرف الافاضل فخر الاماجد والاماثل رشک سلف داغ خلف افضل المحدثین اشرف علما ربانین مولانا و بالفضل اولانا شاہ عبدالعزیز دھلوی قدس سرہ العزیز ـ ذات سمات ان حضرت بابرکت کی جامع فنون کسبی و وھبی اور مجموعۂ فیوض ظاھری و باطنی تھی ـ اگرچہ جمیع علوم مثل منطق و حکمت و ھندسۂ و ھیت کو خادم علوم دینی کا کر کر تمام ھمت و سراسری کو بتحقیق غواص حدیث نبوی و تفسیر کلام الٰہی اور اعلائے اعلام شریعت مقدسۂ حضرت رسالت پناھی میں مصروف فرماتے تھے، اور سوا اس کے جو کہ جلائے آئینہ باطن صیقل عرفان و ایقان سے کمال کو پہنچی تھی ، طالبان صافی نہاد کی ارشاد و تلقین کی طرف توجہ تمام تھی ـ اس پر بھی علوم عقلیہ میں سے کون سا علم تھا کہ اس میں یکتائی اور یک فنی نہ تھی ـ علم ان کے خانوادہ میں بطناً بعد بطن اور صلباً بعد صلب اس طرح سے چلا آتا ھے جیسے سلطنت سلاطین تیموریہ کے خاندان میں ـ چودہ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد ماجد اشرف الاماجد عمدہ علمائے حقیقت آگاہ شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی خدمت میں تحصیل علوم عقلی و نقلی اور تکمیل کمالات باطنی سے فارغ ہوئے تھے ـ اس کے چند مدت کے بعد حضرت شاہ موصوف نے وفات پائی اور آپ کی ذات فائض البرکات سے مسند خلافت نے زینت و بہا اور وسادۂ ارشاد و ھدایت نے رونق بے منتہا حاصل کی ، کیوں کہ مولانا رفیع الدین اور مولانا عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہما کہیں، برادر حقیقی آپ کے جن کے ذکر بعد اس کے بتفصیل آئے گا ، والد ماجد کے روبرو سن صغیر رکھتے تھے ، تمام علوم اور فیوض کو انھیں حضرت کی خدمت میں کسب کیا ـ علم حدیث و تفسیر بعد آپ کے

تمام ہندوستان سے مفقود ہوگیا۔ علمائے نامی ہندوستان کے خوشہ چیں اسی سرگروہ علما کے خرمن کمال کے ہیں اور جمیع کملا اس دیار کے چاشنی گرفتہ اسی زبدۂ ارباب حقیقت کے مائدۂ فضل و افضال کے ۔ یہ آفت جو اس ویزو زمان میں تمام دیار ہندوستان خصوصاً شاہجہاں آباد حرسہا اللہ من الشر و الفساد میں مثل ہوائے وبائی کے عام ہوگئی ہے کہ ہر عامی اپنے تئیں عالم اور ہر جاہل آپ کو فاضل سمجھتا ہے اور فقط اسی پر کہ چند رسالے مسائل دینی اور ترجمہ قرآن مجید کو اور وہ بھی زبان اردو میں کسی نے استاد اور کسی نے اپنے زور طبیعت سے پڑھ لیا ہے ، اپنے تئیں فقیہ و مفسر سمجھ کر مسائل و وعظ گوئی میں جرأت کر بیٹھا ہے ، آپ کے ایام حیات تک اس کا اثر نہ تھا ، بلکہ علمائے متبحر اور فضلائے مفتی المرام باوجود نظر غائر اور احاطۂ جزئیات مسائل کے جب تک اپنا سمجھا ہوا حضرت کی خدمت میں عرض نہ کرلیتے تھے اس کے اظہار میں لب کو وا نہ کرتے تھے اور اس کے بیان میں زبان کو جنبش نہ دیتے تھے۔ حافظہ آپ کا نسخہ لوح و تقدیر تھا بارہا اتفاق ہوا کہ کتب غیر مشہورہ کی اکثر عبارات طویل اپنی یاد کے اعتماد پر طلبا کو لکھوادیں اور جب وہ کتابیں دستیاب ہوئیں تو دیکھا گیا کہ جو عبارت آپ نے لکھوادی تھی اس میں من اور عن کا فرق نہ تھا ۔ باوجود اس کے کہ سنین عمر شریف (۸۰) قریب اسی کے پہنچ گئے تھے اور کثرت امراض جسمانی سے طاقت بدن مبارک میں کچھ باقی نہ رہی تھی خصوصاً قلت غذا سے لیکن برکات فیض باطنی اور حدت قوائے روحانی سے حسب تفصیل مسائل دینی اور تبیین دقائق یقینی پر مستعد ہوتے تو ایک دریائے ذخار موج زن ہوتا تھا اور فرط افادات سے حضار کو حالت استغراق بہم پہنچتی تھی ۔ اوایل حال میں فرقۂ اثنا عشریہ نے شورش کو بلند کیا اور باعث تفرقۂ خاطر لگ جہاں اہل تسنن کے ہوئے ، حضرت نے بسبب التماس طالبین کمال کے کتاب

"تحفۂ اثنا عشریہ" کہ غایت شہرت محتاج بیان نہیں بذل توجہ قلیل و/ بعض اوقات و چیز سے باین کثرت ضخامت تصنیف کی کہ ہر طالب علم بے مایہ بھی علمائے شیعہ کے ساتھ مباحثہ و مناظرہ میں کافی ہوگیا۔ ثقات بیان کرتے ہیں کہ آپ تصنیف کے وقت عبارت اس کتاب کی اس طرح سے زبانی ارشاد کرتے جاتے تھے کہ گویا از بر یاد ہے اور حوالہ کتب شیعہ کے جن کو علمائے فرقہ مذکور نے شاید بجز نام کے سنا نہ ہوگا، باعتبار حافظہ بیان ہوتے جاتے تھے اور اس پر متانت عبارت اور لطائف و ظرافت جیسے ہیں ناظرین پر ہویدا ہے۔ یہ امور جو آپ سے ظہور میں آتے تھے مجال بشر سے باہر ہیں۔ ہفتہ میں دوبار مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی اور شائقین صادق العقیدت و صافی نہاد خواص و عوام سے مور و ملخ سے زیادہ جمع ہوتے تھے اور طریقۂ رشد و ہدایت کا استفادہ کرتے - ۱۲۳۸ھ بارہ سو اڑتالیس ہجری میں اس جہان فانی سے سفر آخرت کو اختیار کیا۔ بعض موزوں طبیعتان نے دو تین قطعہ تاریخ وفات میں موزوں کیے ہیں، ان میں سے ایک قطعہ لکھتا ہوں:

حجت اللہ ناطق و گویا　　　شاہ عبدالعزیز فخر زمن

روز شنبہ و ہفتم شوّال　　　درمیان بہشت ساخت وطن

مہر صبح الدہار در عرفان　　　مثل بدرمنیر در ہمہ فن

از سر لطف و حلم تاریخش　　　رضی اللہ عنہ گفت حسن

۸ + ۳۰

زبان عربی میں نظم و نثر نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ریختہ کلک در سلک ان حضرت سے بہت یادگار ہیں، اگرچہ وہ نثر عربی جس کو آپ نے دل لگاکے لکھا ہو راقم کو دستیاب نہیں ہوئی، مگر دو چار رقعے جو آپ نے قلم برداشتہ نہایت سرسری طور لکھ دیے تھے ہاتھ لگے، ان میں سے ایک رقعہ تیمناً لکھ دیتا ہوں - اور اگرچہ نظم آپ کی دفتر دفتر ذخیرہ ذخیرہ ہے، لیکن احترازاً عن الاطناب دو قطعوں پر کہ

حضرت شاہ جہاں آباد کی تعریف میں اور شیخ احمد عرب کے مناقب حیدریہ کی تقریظ میں لکھے تھے انھیں پر قناعت کرتا ہوں :

رقعۂ عربی

سلام علیکم قد قرأتُ کتابکم بقرۃ عینی فاق فضل خطابکم

اردت صلات المعظم لکی نفسیۃ والظلی ماعندی دعا لبابکم

فقلت بقلب خاشع متضرع بضاعت ربنافی لبکم دلبابکم

و یعطیک فی الدارین خیراً عطیۃ و یصرف عنک السوء مابہابکم

و یفتح ابواب الکمال جمیعہا ففیہا یکون ذھابکم و ایابکم

و یجعلک الرحمن مثل ذ آبۃ بخیرالدّین و الدنیا و حسن مآبکم

وقد لاح مابشرتنی من بشارۃ

جزاک اللہ عنّی و شیّب شبابکم

" و بعد فقد وصل الینا کتابکم مرۃ بعد اولالی وکان فیہ عدم الشفاء الکلی بقرۃ عینی، فلاذہ و ھذا ماشوش خواطری عدواللہ سبحانہ ان یشفیہا عاجلاً کاملاً ۔ معلوم ان اخوانکم کلہم فیہم مادۃ سوء القنیۃ کانت تقلبہم فی ایام الصبا فلما کبر و ازالت عنہم وما عرضت لا حدمنہم الاوقد وجبت ان یمشی بین اثنین و یھاوی بین الرجلین [redacted] یستحلل المادۃ المتوحلۃ و نزول لاخلاط المورمۃ ، و ھذا التدبیر کثیراً مایقع مفیدۃ فائدۃ بیّنۃ عاجلۃ و ینبغی ان یداعی ھذا الامر حیثما امکن و ایضا بتصورواللہ ھوالشافی۔ و یقرء عنّی السلام اخوانکم کلہم و والدتکم الماجدۃ و خواجہ محمد امین ۔ و یقرء الشیخ محمد امیر بعد السلام ان فی قدم والدکم تشبث شوکۃ تورمت بہا القدم و تقیّحت حتی احتاجت الی الی الشق ، فشقت ولم تبرد بعد و ھو منتظر لقد ومک فان امکن فہوالاولی۔"

ستۃ ابیات فی تقریظ المناقب الحیدریۃ للشیخ احمد ابن محمد انصاری الیمنی

الشرواني -

رايت وريقات عدل بشرها | على فضل تحرير اليه يسند
و ممدوحه في ذالك الطرس حيدر | سمّى اميرالمؤمنين المؤيد
ولاغروان فاه الكرام بمدحه | ازا الفضل محمود دمنشيه احمد
له قدم في الشرحالي وان ابوا | عليه براهين البراعة تشهد
وفي نظمه لطف وحسن سلاسة | يذلّ لديه كل نظم و يحسد

هدا على مرّالد هور حلاوةً

يزيد على الا كاس طراً و يزيد

xxx

هذه ابيات في وصف الدهلي

يامن يسائل من دهلي و رفعتها | على البلاد وما حازته من شرف
ان البلاد لماد وهي سيدة | وادها درة والكل كالصدف
فاقت بلاد الورى عزاً و منقبة | غيرالحجاز و غير القدس والنجف
سكانها جمال الارض قاطبة | خلقا و خلقاً بلا عجب و لاصلف
بها مدارس لوطات الجميربها | لم تنفتح عينه آلا على الصحف
كم مسجد ز خرفت فيها منارة | لوقابلته شموس الضحونكسف
لاغروان زهت آلدنيا بزينتها | كم من ابن قد علي بابن ذوي شرف

وماء جون جرى من تحتها فحكى

انهار خلد جرت في اسفل الغرف " (١)

---

(١) سرسيد احمد خان، " آثار الصناديد "، دهلي : مطبع سيد الاخبار، ١٢٦٣هـ/١٨٣٧ء
(اشاعت اول) ، ص. ٣٢-٣٩

تعلیقات
~~تالیفات~~ :

شاہ عبدالعزیز

شاہ ولی اللہ کے منجھلے بیٹے تھے - بڑے بھائی شاہ محمد دہلوی تھے لیکن ان کی شہرت نہ ہوسکی -(۱) اس لیے عام طور پر شاہ عبدالعزیز ہی کو شاہ ولی اللہ کا بڑا بیٹا سمجھا جاتا ہے - شاہ عبدالعزیز ۲۵ رمضان، ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۱ اکتوبر، ~~۱۷۴۶ع~~ ۱۷۴۶ء کو بوقت سحر دہلی میں پیدا ہوئے -(۲) ان کا تاریخی نام غلام حلیم عرف سہیتا اور لقب سراج الہند تھا۔ عرف کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ پیدائش کے بعد نہلا دھلا کر انھیں مسجد (= مسیت) میں ڈال دیا گیا تھا گویا کہ انھیں اللہ کی نذر کردیا گیا تھا اس لیے مسیتا عرف پڑا -(۳) پانچ برس کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ پہلے قرآن مجید پڑھا پھر فارسی کی تعلیم شروع ہوئی - صرف و نحو کے چند ابتدائی رسائل پڑھنے کے بعد گیارہ برس کی عمر میں حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے ایک مسترشد کے سپرد کردیا۔ انھوں نے دو سال تک معقولات اور تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم دی - اس کے بعد وہ اپنے والد کے خاص درس میں شریک ہوئے اور علوم ظاہری و باطن کی تکمیل کی - ان کے والد کے خاص حلقہ درس میں وہی طالب علم داخل ہوسکتے تھے جو اپنے کمال حافظہ اور خوبی ذہانت میں ممتاز حیثیت کے مالک ہوتے تھے - والد ماجد سے تحصیل علوم و معارف اور سند حدیث کے علاوہ ان کے تربیت یافتگان مخصوص،

---

(۱) محمود احمد برکاتی، "شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، لاہور: تخلیق مرکز، ۱۹۷۶ع، ص ص ۳۹-۱۳۳

(۲) مہر، غلام رسول، "اردو دائرۂ معارف اسلامیہ"، (مقالہ مشمولہ)، "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی"، لاہور: دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۵ع ج ۱۱، ص ۲۳۳

(۳) محمود احمد برکاتی، ~~محولہ بالا، ج ۱۵~~ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، محولہ بالا، ص ۱۵۰

راسخین فی العلم ، حقیقت شناسان مقام ولی اللہی کے سرگروہ اور تلامذہ اجل مولانا محمد عاشق پھلتی اور خواجہ محمد امین کشمیری سے بھی بعض کتب حدیث کی سند لی اور علم فقہ کی تحصیل مولوی نوراللہ سے کی - (۱) شاہ عبدالعزیز نے اردو زبان کی تحصیل بطور ایک فن کے خواجہ میر درد کی خدمت میں [illegible] کی تھی -(۲) شاہ عبدالعزیز کے سراج الہند امام عبدالعزیز محدث بننے میں ان بزرگوں کے دست تعلیم و تربیت کا بڑا حصہ ہے -

پندرہ برس کی عمر میں تحصیل علمی سے فراغت پاکر مدرسہ رحیمیہ میں اپنے والد اور دیگر اساتذہ کی نگرانی میں درس و تدریس کا آغاز کیا - اس وقت تک آپ تفسیر، حدیث، فقہ ، اصول، عقائد ، منطق، کلام ، هندسہ ، هیئت ، ریاضی، تاریخ ، جغرافیہ وغیرہ علوم میں مہارت پیدا کرچکے تھے - (۳) اور آپ کے فضل و کمال کا شہرہ دلی کے گلی کوچوں اور ملک کے علمی و تعلیمی حلقوں میں پھیل چکا تھا - آپ کی عمر ابھی سترہ برس کی تھی کہ والد ماجد نے داعی اجل کو لبیک کہا - چوں کہ تمام بھائیوں میں آپ ہی بڑے اور علم میں ممتاز تھے اس لیے مسند درس اور سلوک و طریقت کی ~~سجادگی~~ سجادگی اور جانشینی آپ کے حصے میں آئی - مسند نشینی کی تقریب میں وقت کے تمام علما و مشائخ جمع تھے - مولانا فخرالدین نے ان کے سرپر دستار فضیلت باندھی اور ان کے والد ماجد کی مسند درس و ارشاد پر بٹھایا - (۴)

---

(۱) ایوب قادری، محمد ، (مرتب) "تذکرہ علمائے ہند"، از رحمان علی، کراچی : پاکستان هسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۱ء ، ص ۳۰۲

(۲) فراق ، ناصر نذیر، " لال قلعہ کی ایک جھلک "، دهلی : محبوب المطابع، ۱۹۳۳ء ص ۲۲-۲۲

(۳) مہر ، مولانا غلام رسول، محولہ بالا ، ص ۲۳۵

(۴) آزاد ، مولانا ابوالکلام، "نقش آزاد"، (خطوط و دیگر تحریرات)"، (مرتبہ) ، مولانا غلام رسول مہر، لاهور : کتاب منزل، ۱۹۵۹ء ، ص ۳۲۹

اور تقریباً پینسٹھ سال (بحساب قمری) تک درس و تدریس طلبہ کے ساتھ اصلاح امت اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف رہے اس دوران میں ہزارہا طلبہ ان کی تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوکر ملک سے بیرون ملک تک پھیل گئے - وعظ اصلاح کے نتیجے میں مسلمانوں کی حالت میں ایک عظیم الشان انقلاب حالت پیدا ہوگئی اور اسلامی دنیا میں ان کی بلند پایہ تصنیفات و تالیفات کی دھوم مچ گئی - نواب صدیق حسن خان نے ان کی خدمات کے تین دائرے قرار دیے ہیں - درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور دعوت و ارشاد -(۱) سرسید نے بھی ان کی خدمات کے ان تینوں دائروں کی طرف اشارہ کیا ہے - (۲) شرح اس اجمال کی یہ ہے :

" (اولاً) انھوں نے اپنے درس و تدریس اور تعلیم و تربیت سے ایسے اصحاب کی ایک جماعت پیدا کردی جو تمام علوم و فنون اسلامی کے ماہر اور حزب ولی اللہی کے مقاصد اور اس کی اہمیت سے آشنا تھی اس جماعت نے پورے ھندوستان میں پھیل کر حزب ولی اللہی کے لیے ذھنی و فکری زمین ہم وار کی اور اس کے بعض اکابر مثلاً شیخ خالد کردی نے برصغیر پاک و ھند سے باھر حزب اور اس کے مقاصد کو روشناس کرایا- ان کے تلامذہ کی تعداد کا ابھی تک کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکا- ۱۸ویں صدی کے اواخر ھی سے ان کے تلامذہ ملک میں پھیلنا شروع ہوگئے تھے اور ۱۹ویں صدی کے وسط تک سیکڑوں کی تعداد میں علمی و تعلیمی مراکز و مدارس ملک کے طول و عرض میں قائم ہوچکے تھے -"

درس و تدریس کے ذریعے آپ کی تعلیم و ارشاد اور کمال درس و افتا کا شہرہ

---

(۱) صدیق حسن خان، نواب، " ابجد العلوم"، (الجز الثالث)، بھوپال: مطبع صدیقی، ۱۲۹۱ھ، ص: ۲۹٦

(۲) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید"، لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۸۷٦ء، صص: ۳۱-۳۰

برصغیر پاک و ہند سے باہر حجاز ، ترکی ، مصر، شام اور دیگر اسلامی ممالک میں پھیل گیا۔ ایک عالم دین نے جو پورے ہندوستان کے دیار و امصار کے علماء و فضلاء سے ملا اور مدارس و مکاتب کو دیکھا تھا ، اسے کوئی ایسا عالم دین نہیں ملا جو بالواسطہ یا بلا واسطہ حضرت شاہ عبدالعزیز سے رشتہ تلمذ نہ رکھتا ہو ۔ (۱)

سرسید احمد خان نے اس جملے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے :

" علمائے نامی ہندوستان کے خوشہ چین اس سرگروہ علما کے خرمن کمال کے ہیں اور جمیع مدارس دیار کے چاشنی گرفتہ اس زبدۂ ارباب حقیقت کے مائدۂ فضل و افضال کے ۔" (۲)

شاہ صاحب کے اثرات تعلیم و ارشاد کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :

" حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی ... خاندان سے باہر اگر ان کے تعلیم یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضان علم کام نہ کر رہا ہو۔" (۳)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

" شاہ عبدالعزیز کو شہرت و قبولیت کی عالم گیر سند ملی ۔ بنگال سے لیکر بخارا و سمرقند تک ان کی عظمت و استادی کا سکہ چلنے لگا ۔" (۴)

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، لاہور : سندھ ساگر اکیڈمی، ۱۹۵۲ع ، ص ۴۳

(۲) سرسید احمد خان، " آثار الصنادید"، محولہ بالا ، ص ۳۰

(۳) آزاد ، مولانا ابوالکلام " تذکرہ"، دہلی : ساہتیہ اکاڈیمی، ۱۹۶۸ع ، ص ۲۷۱

(۴) مہر، مولانا غلام رسول (مرتبہ) ، " نقش آزاد"، محولہ بالا ، ص ۳۱۸

شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ کی جلالت علمی کا اندازہ کرنے کے لیے اس تذکرے کے باب سوم پر نظر ڈال لینی چاہیے - جو مدرسۂ رحیمیہ کے فارغ التحصیل اور اصحاب ثلاثہ کے تلامذہ پر مشتمل ہے - ان کے علاوہ مولانا حسن علی ہاشمی لکھنوی، مولانا حسین احمد ملیح آبادی، مولانا سلامت اللہ بدایونی کان پوری، مولانا روف احمد مجددی مصطفی آبادی، سید قطب الہدی رائے بریی، شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی، قاضی ثنا اللہ پانی پتی، مولانا خرم علی بلہوری، شیخ فضل حق عرف غلام میدا ساحر کاکوری، شاہ رحمن بخش چشتی، مولوی سید رمضان علی، مولوی سید حیدر علی مجاہد، مولوی عیاض خان، باجوڑی اکبرآبادی، سید جیلانی فاروقی، مولوی کلیم فیاض خان بلاس پوری، مولوی محمد شکور جعفری مچھلی شہری، مولانا ظہورالحق قادری، مولینا شاہ عبدالغنی ابوالعلائی، مجتمعی وغیرہم کا شمار شاہ عبدالعزیز کے اجل تلامذہ میں ہوتا ہے -

(ثانیاً) شاہ عبدالعزیز نے ولی اللہی فکر کو کتب و صحائف میں محفوظ کردیا- انھوں نے اپنے پیچھے بلند پایہ تصانیف و تالیفات کا ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے - ان میں تفسیر " فتح العزیز ، معروف بہ تفسیر عزیزی" (دو جلدوں میں، شروع کے سوا اور آخر کے دو پاروں کی) (کلکتہ : ۱۲۴۸ھ) ، " تحفہ اثنا عشریہ" (لکھنو : ۱۸۷۹ اع) " بستان المحدثین" (دہلی : ۱۸۷۶ اع) ، " عجالۂ نافعہ " (دہلی : ۱۲۱۳ھ) ، سرالشہادتین" (دہلی : ۱۲۶۱ھ) ، " عزیز الاقتباس فی فضائل اخبار الناس" (دہلی : ۱۳۲۲ھ) ، " میزان العقائد" (دہلی : ۱۳۲۱ھ) ، " فتاوی عزیزی (دہلی : ۱۳۳۱ھ) ، " ملفوظات شاہ عبدالعزیز " (میرٹھ : ۱۳۱۴ھ) ، " رسائل خمسہ، تقریر دل پذیر فی شرح عدیم النظیر"، "ہدایت المومنین" وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں -(۱) ان کے علاوہ بعض

---

(۱) مہر ، مولانا غلام رسول " اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، (مقالہ) " شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، محولہ بالا ، ص: ۲۳۶
ابویحیی ، امام خان نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ہند"، دہلی: جید برقی پریس ۱۹۳۸ اع ص: ۶۱-۶۰
ایوب قادری ، تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص: ۳-۲۰۲

کتابوں پر ان کے حواشی اور بعض کے شروح بھی ھیں - (۱) ان میں سے بیشتر کتابیں فارسی میں ھیں اور ایک دو عربی میں ھیں - ان سب کے اردو تراجم بھی شائع ھوچکے ھیں۔

(ثالثاً) شاہ عبدالعزیز نے صرف درس و تدریس طلبۃ اور تصنیف و تالیف رسائل و کتب ھی میں ~~[illegible]~~ اپنی ھمت کو صرف نہیں کیا بلکہ ان کے عزائم بلند نے خدمت دین و ملت کا ایک اور میدان تلاش کیا۔ انھوں نے اصلاح و تزکیہ اور تعلیم و تربیت اسلامی کی ضرورت کو بھی محسوس کیا اور ھفتے میں دوبار منگل اور جمعہ کے روز وعظ کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے وعظوں نے عوام ھی کو متاثر نہیں کیا بلکہ ادبی حلقوں میں بھی ان کی مجلس وعظ کی خاص قدر تھی - سرسید نے بھی خواص و عوام میں ان مجالس کی مقبولیت اور ان کے اثر و نفوذ کا اعتراف کیا ھے - (۲) مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ھیں :

" امام عبدالعزیز نے عام مسلمانوں کو اپنے مقاصد سے آشنا کرانے کے لیے ھفتے میں دوبار وعظ کہنا شروع کیا اور اس پر آخر عمر تک عمل پیرا رھے - ھفتے میں دوبار منگل اور جمعہ کو دھلی کے کوچہ چیلان کے بڑے مدرسے میں مجلس وعظ منعقد ھوتی تھی جس میں خواص و عوام مور و ملخ کی طرح جمع ھوتے تھے - طرز بیان ایسا دل کش تھا کہ ھر مذھب کا آدمی مجلس وعظ سے خوش ھوکر اٹھتا تھا۔ آپ کی کوئی بات کسی کو گراں نہ گزرتی تھی.... امام عبدالعزیز کے ان وعظوں سے عوام میں مستقل بیداری پیدا ھوئی اور خواص

---

(۱) محمود احمد برکاتی، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۵۳
ابویحیی امام نوشہروی، "ھندوستان میں اھل حدیث کی علمی خدمات"، چیچاوطنی، ساھیوال : مکتبہ نذیریہ، ۱۳۹۱ھ، ص ۳۱-۳۹

(۲) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا، ص ۳۱-۵۰

ان سے یہ سمجھتے کہ وعظ کے ذریعے عوام کی کس طرح تربیت فکری کی جاتی ہے۔
چنانچہ یہ تربیت یافتہ خواص آپ کی تحریک کے داعی بن کر ہندوستان کے
ہر گوشے میں پھیل گئے ۔" (۱)

شاہ عبدالعزیز کی ان مجالس وعظ نے مسلمانوں کی اصلاح و تربیت میں زبردست حصہ لیا ان کے ذریعے نہ صرف دینی ذوق اور مزاج پیدا ہوا بلکہ تحریک احیائے اسلام کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

ان مجالس کی ادبی حیثیت بھی تھی۔ شاہ عبدالعزیز نے زبان کو بطور ایک فن کے حاصل کیا تھا ان کی زبان کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی تھی روزمرہ اور محاورے پر ان کو عبور تھا۔ جوش خطابت میں بھی ان کی زبان سے کوئی لفظ بے موقع ، کوئی محاورہ غلط اور کوئی جملہ خلاف محل نہ نکلتا تھا۔ ان کی زبان کو سند کا درجہ کا حاصل تھا۔ اس لیے شائقین ادب ان کی مجالس وعظ میں زبان سیکھنے کے لیے شریک ہوتے تھے ۔ شاہ نصیر اور ذوق میں جب کسی بات پر شکررنجی پیدا ہوگئی اور اصلاح کلام کا سلسلہ موقوف ہوا تو ذوق نہایت پابندی کے ساتھ شاہ صاحب کی مجالس وعظ میں شرکت فرمانے لگے اور ایک دوست کے دریافت کرنے پر اس کا سبب انھوں نے یہ بتایا کہ " استاد مجھ گناہ گار سے ناخوش ہوگئے شعر و سخن میں اصلاح نہیں ملتی ، اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے کہ مولانا عبدالعزیز صاحب " اردو دانی " میں شاہ نصیر سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں اور اردو کے محاورے اور روزمرہ یاد کرتا ہوں اس لیے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب

---

(۱) عبیداللہ سندھی، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" محولہ بالا ، ص ۷۳

اردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد صاحب کی خدمت میں چھٹیں سے حاضر ہوتے تھے اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے آپ کی تقریر کو سنا کرتے تھے اور محاورات دل ہی دل میں چنا کرتے تھے ۔ مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے " جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہے اسی طرح اصول زبان بھی فن ہے اور اردو زبان کے موجد اور مجتہد خواجہ میر درد ہیں آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو کیوں کہ خواجہ صاحب یکے ہاں ہیں۔" (۱)

محمد حسین آزاد نے تو ذوق کے ایک قصیدے پر شاہ صاحب کی اصلاح کا تذکرہ بھی کیا ہے ، کہ اسی زمانے میں جب نصیر اور ذوق سے ان بن تھی اور اصلاح موقوف تھی، ذوق نے اپنا ایک قصیدہ جو انہیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنا تھا شاہ صاحب کو دکھایا تھا کہ اس کی صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں ۔ شاہ صاحب نے اپنے اطمینان کا اظہار فرمادیا اور پڑھنے کی اجازت دے دی تو انہوں نے وہ قصیدہ بے جھجک پڑھ دیا۔ " (۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی ذات گرامی نہ صرف علوم و معارف دینی کا سرچشمہ، مسند درس و ارشاد کی زیب دہ اور اہل علم کا مرجع تھی بلکہ اصحاب نقد و نظر کے لیے مصدرِ فیض اور اہل زبان کے لیے مستند کی حیثیت بھی رکھتی تھی ۔

---

(۱) فراق ، ناصر نذیر، " لال قلعہ کی ایک جھلک " ، دھلی :محبوب المطابع، ۱۹۳۳ع ، ص: ۹۴تا۹۶

(۲) آزاد ، محمد حسین، " آب حیات" ، لاھور :شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۴ع ، ص: ۴۴۴

سرسید نے شاہ صاحب کی ذات فیض سمات کو جامع فنون کسبی و وہبی اور مجموعہ فیض ظاہری و باطنی قرار دیا ہے اور علوم عقلیہ میں ان کی یکتائی، ان کے بےمثل حافظے اور اعلا ذہانت، کمال خطابت اور حیرت انگیز حاضر جوابی کا اعتراف کیا ہے - (۱) لیکن اس باب میں سب سے اہم شہادت مولوی عبدالقادر صاحب " وقائع عبدالقادر خانی" کی ہے جنھوں نے ۱۸۱۲ء میں شاہ صاحب کو دیکھا تھا اور ان کی مجلس وعظ میں بھی شرکت کی تھی - ان کے کمال خطابت کے بارے میں لکھتے ہیں " کہ اردو، فارسی، ایرانی، تورانی دھلی، کی مختصر زبان اور عربی میں ایسا خوش بیان میں نے بہت کم دیکھا ہے - شاہ صاحب کے مقام علم و فضل کے بارے میں لکھتے ہیں :

" مولانا شاہ عبدالعزیز علم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ میں شہرۂ آفاق ہیں اور ہیئت، ہندسہ، مجسطی، مناظرہ، اصطرلاب، جرثقیل، طبیعات، الہیات، منطق، اتفاق اختلاف ملل، دحل، قیافہ، تاویل، تطبیق مختلف اور تفریق مشتبہ میں یکتائے زمانہ تھے- فن ادب اور ہرقسم کے اشعار سمجھنے میں بلند مرتبہ رکھتے تھے -" (۲)

شاہ صاحب کے ایک اور معاصر مولانا فضل امام لکھتے ہیں :

" در علم حدیث و فقہ اصول و تمامی علوم عربیت خاصہ لغت مشہور اند "-

اس سے آگے مزید لکھتے ہیں :

" تمام علوم و سائر فنون چہ نقل و چہ عقلی ہمہ از برانذ و درجمیع علوم مولوی صاحب را رتبہ عقل تک مستفاد بہم رسیدہ"-(۳)

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۰ء، محولہ بالا، ص ۳۱-۳۹

(۲) عبدالقادر، مولوی، " علم و عمل"، (وقائع عبدالقادر خانی)"، حصہ اول، ص ۲۲-۲۲۳

(۳) شہابی، مفتی انتظام اللہ (مرتب)، " تراجم الفضلا"، از فضل امام خیرآبادی، کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، س-ن، ص ۱۶-۱۵

نواب صدیق حسن خان نے ابجد العلوم میں شاہ ولی اللہ ، ان کے خاندان عالی شان اور ان کے ابنائے صالحین کی جلالت علمی ، خدمات دینی اور ذوق تصنیف و تالیف کا نہایت شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے (۱) اتحاف النبلا میں شاہ عبدالعزیز کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اپنے زمانے میں علما و مشائخ کے مرجع تھے، کثرت حفظ ، تعبیر رویا ، سلیقہ وعظ و انشا ، تحقیق و جستجو نیز مذاکرہ و مباحثہ میں انھیں درجۂ امتیاز حاصل تھا ۔ ان کی شاگردی بڑے بڑے علما کے لیے باعث فخر تھی ۔ ان کی تالیفات فضلا کے نزدیک معتمد علیہ ہیں ۔(۲) صاحب کمالات عزیزی نے تو انھیں صاحب کشف و کرامات لکھا ہے ۔(۳) بلا شبہ ان کا وجود آیت میں آیات اللہ تھا اور اللہ کی آیت بذات خود ایک کرامت ہے اللہ تعالی نے ان کے وجود کو اپنے فیوض و انوار سے بھردیا تھا ۔ سرسید لکھتے ہیں :

" باوجود اس کے کہ ان کے سنین عمر شریف اَسیّی کے پہنچ گئے تھے اور کثرت امراض جسمانی سے طاقت بدن مبارک میں کچھ نہ رہی تھی خصوصاً قلت غذا سے ۔ لیکن برکات فیض باطنی اور حدت قوائے روحانی سے حسب تفصیل مسائل دینی اور تبیین دقائق یقینی پر مستعد ہوتے تو ایک دریائے ذخار موجزن ~~کککک~~ ہوتا تھا ۔ اور فرط افادات سے حضار کو حالت استغراق بہم پہنچتی تھی ۔" (۴)

سرسید احمد خان نے " آثار الصنادید " کے علاوہ بھی اپنی تحریروں میں شاہ

---

(۱) صدیق حسن خان ، " ابجد العلوم "، محولہ بالا ، ص ۹۱۲-۹۱۵

(۲) صدیق حسن خان ، " اتحاف النبلا "، کان پور : مطبع نظامی ، ۱۲۸۸ ، ص ۲۹۶-۲۹۷

(۳) ظہیرالدین احمد [ولی اللہی] ، " کمالات عزیزی "، لاہور : اسلامی اکادمی ، [سن ن] ، ص ۲۰-۲۷

(۴) سرسید احمد خان ، " آثار الصنادید "، محولہ بالا ، ص ۳۰

شاہ عبدالعزیز کا ذکر کیا ہے - انھوں نے اپنی ابتدائی علمی زندگی میں شاہ صاحب کے " تحفۂ اثنا عشریہ " کے دو ابواب کا ترجمہ کرکے بھی چھپوایا تھا- (۱)

سرسید نے متعدد مقامات پر ان کے تفسیری افکار ، تحقیقات نیز فتاوی وغیرہ کا حوالہ دیا ہے اور اپنے خیالات پر ان سے استدلال کیا ہے - اسباب بغاوت ہند میں ایک مقام پر انگریزی زبان کی تحصیل کے متعلق ان کے مشہور فتوے کا حوالہ دیا ہے - سرسید لکھتے ہیں :

" بڑے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر تھے - اول اول تو ان سے بھی کچھ کچھ وحشت لوگوں کو ہوئی تھی- اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز جو تمام ہندوستان میں نہایت نامی مولوی تھے، زندہ تھے- مسلمانوں نے ان سے فتوا پوچھا - انھوں نے صاف جواب دیا کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے - اس پر سیکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے -" (۲)

اسی طرح پراسری دوتوں کے جواز کے سلسلے میں انھوں نے شاہ عبدالعزیز کے ایک فتوے سے استدلال کیا ہے - (۳) سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں معراج کے سلسلے کی تمام احادیث کا رد کرتے ہوئے عجالۂ نافعہ سے شاہ عبدالعزیز کی تحقیقات حدیث سے استدلال کیا - (۴) تائید و استدلال کے ساتھ بعض مقامات ما اُھل بہ لغیر اللہ (۵)

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے پہلا باب

(۲) سرسید احمد خان ، " رسالہ اسباب بغاوت ہند " ، کراچی : اردو اکیڈمی سندھ ، ۱۹۵۷ء ، ص ۔۔۔۔ (دارالعلوم مسلمانان کے متعلق)

(۳) سرسید احمد خان ، " مقالات سرسید " ، حصہ دہم ، لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء ، ص ۲۰۹

(۴) سرسید احمد خان ، " تفسیر القرآن (ج ششم) ، علی گڑھ : علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ، ۱۸۹۵ء ، (تفسیر سورہ بنی اسرائیل) ، ص ۱۲۳

(۵) سرسید احمد خان ، " مقالات سرسید " ، (حصہ پانزدہم) ، لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ء ، (حرام اشیا کا کھانا) ، صص ۷۲-۳۷۱

اورٌ کل فی فلک یسبحون(۱) کی تفاسیر میں سرسید نے شاہ صاحب کے افکار سے اختلاف بھی کیا ہے - لیکن بہ حیثیت مجموعی وہ ان کی جامعیت اور فضائل و محاسن اور خدمات کے بہت مداح ہیں۔

شاہ عبدالعزیز کی تصنیفی اور تالیفی خدمات کا تذکرہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے لیکن ان کے شاعرانہ کمال کا بیان باقی ہے - شاہ صاحب کی شاعرانہ حیثیت پر ان کے تذکرہ نگاروں نے بہت کم توجہ دی ہے اور بلا شبہ ان کے دیگر کارناموں کے مقابلے میں ان کی شاعری کی بہت کم حیثیت ہے - لیکن وہ شاعر بہرحال تھے اور عربی و فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے - سرسید نے ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے - ان کے علاوہ متعدد حضرات کے نام ان کے منظوم خطوط ہیں۔ شاہ اہل اللہ کے نام ایک منظوم خط کے کچھ اشعار ابویحیی امام خان نوشہروی نے نقل کیے ہیں۔ (۲)

شاہ عبدالعزیز کی شادی ان کے استاد و مربی اور حضرت شاہ ولی اللہ کے خصوصی تربیت یافتگان اور مخصوص احباب میں سے مولوی نوراللہ بڈھانوی کی صاحب زادی سے شاہ ولی اللہ نے اپنی زندگی ہی میں کرادی تھی - مولانا سندھی نوراللہ بڈھانوی کے بارے میں لکھتے ہیں :

"شاہ عبدالعزیز کے خسر مولوی نوراللہ بڈھانوی شاہ ولی اللہ کے خواص اصحاب سے تھے، وہ فقہ حنفی کی تحقیق کا طریقہ شاہ صاحب سے سیکھ چکے تھے -" (۳)

اولاد میں صرف تین صاحب زادیاں تھیں۔ بڑی صاحب زادی کا نکاح اپنے

---

(۱) سرسید احمد خان، "مقالات سرسید"، حصہ دہم، محولہ بالا، ص ۲۵۳

(۲) ابویحیی امام خان نوشہروی، "تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۵۷

(۳) عبیداللہ سندھی، مولانا، "امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف"، "الفرقان"، (ولی اللہ نمبر)، بریلی: ۱۳۶۰ھ، ص ۳۲۸

بھتیجے مولانا محمد عیسی ابن شاہ رفیع الدین سے کردیا تھا۔ دوسری صاحب زادی کا نکاح مولوی محمد افضل لاھوری کے ساتھ ھوا تھا۔ شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب انھی کے صاحب زادگان عالی مرتبت تھے۔ تیسری صاحب زادی مولانا عبدالحئی کے حبالہ عقد میں آئی تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی مولانا عبدالقیوم بھوپالی تھے۔ (۱) تینوں صاحب زادیوں کا انتقال شاہ صاحب کی حیات میں ھوگیا تھا۔ (۲)

مولانا غلام رسول مہر نے دوسری اور تیسری صاحب زادی کو عمر کے لحاظ سے ابویحیی کی اس ترتیب کے برعکس مقدم و موخر لکھا ھے - (۳) لیکن ھمیں یہی ترتیب درست معلوم ھوتی ھے جو ھم نے نوشھروی کے حوالے سے اختیار کی گئی ھے - حکیم محمود احمد برکاتی نے بھی اسی ترتیب کو اختیار کیا ھے -(۴)

اواخر رمضان ، ۱۲۳۹ھجری میں بیمار ھوئے - مرض نے شدت اختیار کرلی تو جو نقدی پاس تھی وہ شرعی حصص کے مطابق بھتیجوں اور ذوی الارحام میں تقسیم کردی۔ پھر وصیت فرمائی کہ میرا کفن اس کپڑے کا ھو جو میں پہنتا رھا - ان کا کرتا دھوتر کا اور پاجامہ گاڑھے کا ھوتا تھا۔ ۷شوال ، ۱۲۳۹ھ (بروز یک شنبہ) مطابق ۵ جون، ۱۸۲۴ع کو صبح کے وقت انتقال ھوا۔

سرسید سے تاریخ وفات کے انضباط میں تسامح ھوا۔ انھوں نے ۱۲۳۸ھ ھندسوں اور لفظوں میں تحریر کی ھے جو درست نہیں - (۵) صحیح تاریخ وفات ۷شوال ، ۱۲۳۹ھ

---

(۱) ابویحیی امام خان نوشھروی ، " تراجم علمائے حدیث"، محولہ بالا ، ص ۶۱

(۲) محمود احمد برکاتی ، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۵۴

(مقالہ)

(۳) مہر، غلام رسول ، " اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، "شاہ عبدالعزیز دھلوی"، [illegible]
محولہ بالا ، ج ۱۱ ، ص ۶۳۴

(۴) محمود احمد برکاتی ، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۵۵

(۵) سرسید احمد خان ، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، ص ۳۱

اور یک شبہ کا دن ہے ۔ مومن کے قطعہ تاریخ سے بھی ۱۲۳۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔

قمری سال کے حساب سے اسی برس کچھ دن عمر پائی ۔ یکے بعد دیگرے پچپن مرتبہ نماز جنازہ ادا ہوئی ۔(۱) دھلی کے ترکمان دروازے کے باہر عبدالعزیز شکر بار کے مزار سے آگے ایک چہار دیواری میں جو ان کا خاندانی قبرستان ہے اور مہندیان کے نام سے مشہور ہے ، ایک چبوترے پر اپنے والد ماجد کے برابر میں دفن ہیں ۔(۲)

مومن خان مومن نے آپ کی وفات حسرت آیات پر ایک نہایت شاندار قطعہ تاریخ وفات لکھا ۔ جس میں آپ کے علم و فضل کے بارے میں بھی اشارے ملتے ہیں :

انتخاب نسخۂ دین ، مولوی عبدالعزیز ۔۔۔ بے عدیل و بے نظیر ، بے مثال و بے مثل
جانب ملک عدم ، تشریف فرما کیوں ہوئے ۔۔۔ آگیا ہے کیا کہیں ، مردوں کے ایمان میں خلل
ہے ستم اے چرخ ، تو کس کو جہان سے لے گیا ۔۔۔ کیا کیا یہ ظلم تجھے بیکسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش ، اک عالم تہ و بالا ہوا ۔۔۔ لوٹتا تھا خاک پر ، ہر قدسی گردوں محل
کیا کسو کیا کس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن ۔۔۔ ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
مجلس درد آفرین تعزیت میں میں بھی تھا ۔۔۔ جب پڑھی تاریخ " مومن " نے یہ آکر برمحل

دست بے داد اجل سے بے سروپا ہوگئے

فقر و دیں ، فضل و ہنر ، لطف و کرم ، علم و عمل (۳)

۱۲۳۹ھ

---

(۱) مہر ، مولانا غلام رسول ، " اردو دائرہ معارف اسلامیہ " ، محولہ بالا ، ص ۳۶-۶۳۵

(۲) محمد عالم شاہ فریدی ، " مزارات اولیائے دھلی " ، دھلی : جید برقی پریس ، ۱۳۳۶ھ ، ص ۱۳-۱۲

(۳) ~~مومن خان مومن~~ [فائق رامپوری، کلب علی خان (مرتب)] ، " کلیات مومن " ، (جلد دوم) ، لاهور : مجلس ترقی ادب ، ۱۳۲۳ھ ، ص ۱۰۶

جناب مولانا شاہ رفیع الدین، علیہ الرحمۃ و الغفران :

" مولوی الکرام ، مخدوم الانام، عالم باعمل ، فاضل اجل اسوۂ افاضل عرب و عجم ، زبدۂ ارباب ہمم، سند اکابر روزگار ، فخر کملائے شہر و دیار، محی الشرع و السنۃ ، ماحی ہوی و بدعۃ ، موسس اساس دین مبین، ہادینا و مولانا حضرت شاہ رفیع الدّین قدس سرہ العزیز۔ یہ حضرت خلف الصّدق حضرت شاہ ولی اللہ غفراللہ لہ کے اور چھوٹے بھائی مولانا و مخدومنا حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ۔ تحصیل علوم عموماً اور سند حدیث نبوی کی خصوصاً اپنے والد ماجد کی خدمت میں کی ۔ علوم و فنون میں مستند الیہ ارباب استعداد تھے ۔ چوں کہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم و مغفور بسبب کبرسن اور ضعف مزاج و کثرت امراض کے دماغ تعلیم و تدریس طلبا نہ رکھتے تھے ، سلسلہ تدریس کا حضرت کی ذات بابرکات سے جاری تھا۔ فضلائے نامی ہر دیار کے کہ ارباب کمال سے مشہور یکتائی حاصل کرچکے تھے ، جب آپ کی خدمت میں پہنچے اپنے تئیں طفل ابجد خواں اور مبتدی محض سمجھ کر ابتدا سے انتہا تک پھر تحصیل علم پر کمر باندھتے ۔ اسی واسطے دیار ہندوستان کے جمیع فضلائے نامی انھیں حضرت فیض موہبت کے مستفیدوں میں سے ہیں۔ ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متباینہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے۔ جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے، حضّار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسی فن میں جامۂ یکتائی ان کے قامت استعداد پر قطع ہوا ہے ۔ باوجود ان کمالات کے افاضۂ فیض باطن کا یہ حال تھا کہ جنید بغدادی رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہ کہ اگر ان کے وقت میں ہوتے تو بے شک و ریب اس میں اپنے تئیں کمترین مستفیدان تصور کرتے ۔ اور سخا و کرم کا یہ حال تھا کہ زر درد اور گل در مٹھی کو گل دستہ میں محبوس مشاہدہ کرنا سخت ناگوار ہوتا تھا۔

الغرض ملک تھے صورت بشر میں - کوئی زبدۂ کملائے دھر کے اوصاف میں کہاں تک زبان قلم کو فرسودہ کرے کہ اگر بالفرض ایک حرف اس دفتر سے لکھا جائے، ایک کتب خانہ تیار ہوسکتا ہے - حضرت کے نظم و نثر زبان عربی میں بہت ہیں، مگر چند اشعار پر قناعت کرتا ہوں :-

هذه ابیات فی بیان
معراج النبی علیه الصلوة والسّلام

یا احمد المختار یا زین الوری   یا خاتم الرسل ما اعلا کا

یا کشف الذراء من مستجد   یا منجی فی الحشر من والا کا

هل کان غیرک فی الانام من استوی   فوق البراق و جاوزلا فلا کا

واستمسک الرّوح الامین رکابه   فی سیرة و استخدام الافلا کا

عرضت لک الدنیا و دامراملة   نسخت بهمتک طامعین رواکا

فردتهم فی خیبة من قصدهم   الله صانک عنهم ووقاکا

واخترت من لبن و خمر فطرة   الاسلام بالهدی الیه هداکا

قعدت لک الرسل العظام ترقباً   صلوت مضیو طالبهم مسراکا

وامتهم فی القدس بعد تجاوز   منهم بامر الله ادولّا کا

و بکی الکلیم لمارأک علوته   وبحافسوک بحق فیهم زاکا

و تزیّنت حور الجنان بشاشة   بک ستهدی شوقا الی لقیا کا

وتبشبش العرش المعظم لاعباً   برجلیک حال الفضل اذا آوا کا

خلّفت روح القدس عند السدرة   الصحی یخاف من الجلال جلاکا

ادناک ربک فی منازل قربه   جلّی لک الاکوان ثم حبا کا

واتم نعمته علیک علم تسل   ان توثر الا دقائق والا مساکا

القی الیک کنو ز اسرار سمت — من حیطة الافہام اذا جاکا
وسالت فیہا العفو منه شفاعة — فاجاب ربک قد وہبت ھنا کا
حتی اذا تم الدنو تستّرت — عنک البهجة فی سنا مولا کا
فرأیته جہراً بمعنی دونه — ماکان الّا اللہ فی مجلا کا
فکساک نوراً من اشعة ذاته — اقناک عنک اذا به القاکا
فلک المناسب والسیادة للوری — وبخلافة الرحمن یا بشرا کا
جعلت لک الاقدار والا دوارد — الجنات والنیران فی مرآکا
اعطاک تنفیذا و تیسیراً الی — دین قویم محکم لقرا کا
وسواہ من دعم جسام مالہا — قدّ و حدّ ینتہی اولاکا
فرجعت مسروراً بہا فی لمحة — وجمیع خلق اللہ قد حثا کا
لجرت دین اللہ بعد ذنوبه — و محوت راس الجہل والاشراکا
فقد اتیتک سیدی مستجدیاً — من سیبک المدار ارحمن ولاکا

یا لیتنی قد فزت منک بنظرة
فی بدر وجه نوّالا جلا کا " (۱)

تالیفات :

شاہ رفیع الدین ، شاہ ولی اللہ کے سنجھلے بیٹے تھے - مولانا عبدالحی نے پورا نام رفیع الدین عبدالوہاب بن ولی اللہ و بن عبدالرحیم لکھا ہے - اور علم میں شاہ عبدالعزیز کو ان کا استاد اور طریقت میں ان کے ماموں شاہ محمد عاشق پھلتی کو

---

(۱) سرسید احمد خان ، " آثارالصنادید " ، محولہ بالا ، ص ۹۵-۹۱

ان کا شیخ بتایا ہے - (۱) ۱۱۶۳ھجری مطابق ۱۷۵۰ء میں دھلی میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علمی کے بارے میں سرسید کا بیان ہے کہ تحصیل علوم عموماً اور سند حدیث نبوی خصوصاً اپنے والد ماجد کی خدمت میں کی -" (۲) مولوی محمد عالم شاہ فریدی نے شاہ محمد عاشق پھلتی کو ان کا استاد لکھا ہے -(۳) اور ملفوظات عزیزی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہ عبد العزیز کے خاص مرتبے کے تلامذہ میں سے تھے -(۴) چوں کہ والد کے انتقال (۱۱۷۶ھ) کے وقت ان کی عمر ۱۳ برس سے زیادہ نہیں تھی اور ہنوز تعلیم جاری تھی اس لیے تکمیل علوم کا مرحلہ اس کے بعد آیا ہوگا۔

۱۱۷۹ھ میں تکمیل علوم و فنون کے بعد علماء و فقرا کی ایک مجلس میں دستار فضیلت باندھی گئی اور طلبہ کی ایک جماعت ان کے سپرد کردی گئی۔ شاہ ابوسعید کے نام شاہ عبد العزیز ایک خط (۱۱۷۹ھ) میں تحریر فرماتے ہیں :

" رفیع الدین بفضل الہی تحصیل علوم سے فارغ ہوگئے ہیں ایک مجلس میں علماء و فقرا کے سامنے ان کے دستار تبرک باندھی گئی اور درس کی اجازت دی گئی - الحمد للہ بہت سے طلبہ ان سے مستفید ہورہے ہیں۔" (۵)

اور جب شاہ عبد العزیز نے بسبب کہرسنی ، ضعف مزاج اور کثرت امراض کے تدریس ترک کردی تو ان کے اسباق کی ذمہ داری اور مدرسے کی صدارت کا بار بھی آپ ہی نے اٹھایا۔ (۶) آپ کے تبحر کا یہ عالم تھا کہ ایک وقت میں فنون متباینہ اور علوم مختلفہ

حیدرآباد دکن، دائرۃ المعارف، ۱۹۵۹ء

---

(۱) عبد الحئی ، سید ،" نزھۃ الخواطر"، کراچی : کارخانہ تجارت کتب ، ۱۹۶۷ء ، الجز السابع، صص ۱۸۲-۸۳

(۲) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۵۲

(۳) محمد عالم شاہ فریدی، " مزارات اولیائے دھلی"، محولہ بالا ، ص ۱۳

(۴) (مرتبہ) ، " ملفوظات عزیزی"، میرٹھ : مطبع مجتبائی، س ن ، صص ۳۰ و ۸۳

(۵) " مکتوبات المعارف"، سہارن پور : مطبع الانوار، ۱۳۰۲ھ ، (بحوالہ محمود احمد برکاتی، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان") ، ص

(۶) سرسید احمد خاں" آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۵۲

درس فرماتے تھے اور جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی طرف توجہ فرماتے تھے تو حضار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسی فن میں جامۂ یکتائی آپ کے قامت استعداد پر قطع ہوا ہے - (١)

شاہ رفیع الدین کو منقولات کے ساتھ معقولات سے بھی خاص دل چسپی تھی۔ شاہ عبدالعزیز نے ان کے کمالات علمی کا " ملفوظات " میں متعدد مقامات پر اعتراف کیا ہے۔ ریاضی میں انھیں خاص تبحر حاصل تھا۔ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں :

" میرے ہزاروں شاگردوں میں سے مولوی رفیع الدین کو خاص مرتبہ حاصل ہے - ریاضیات میں تو انھیں موجد کا مقام حاصل ہے -" (٢)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :

" فن ریاضی میں مولوی رفیع الدین کی مثال ہند و ولایت میں نہیں ملے گی -" (٣)

مولانا فضل امام خیرآبادی نے ان کے فضل و کمال کا نہایت شان دار الفاظ میں اعتراف کیا ہے - شاہ عبدالعزیز کے ترجمے میں شاہ عبدالقادر کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں :

" و دیگر برادر مولوی شاہ عبدالعزیز در بزرگی و علم اخلاق عدیل خود ندارند۔ و در زہد و تقوی و طہارت بے مثل اند۔ علم حدیث و احوال ہمہ از بر است - کتب حدیث و فقہ را بیشتر درس می گویند و درس معقول را بگذاشتہ اند۔" (٣)

مولوی کریم الدین پانی پتی نے ان کے ذہن رسا، عربی زبان و ادب میں ان کے

---

(١) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ٥٢
(٢) " ملفوظات عزیزی"، محولہ بالا، ص ٣٠
(٣) ایضاً، ص ٦٢
(٣) شہابی، انتظام اللہ، (مرتب) " تراجم الفضلا"، محولہ بالا، ص ١٧

کمال ، وسعت مطالعہ اور ان کی عالمانہ بزرگی کا اعتراف کیا ہے - (۱)

۱۷۹۱ھ میں انھوں نے درس و تدریس کا آغاز کیا تھا اور ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ع میں انتقال فرمایا - اس طرح نصف صدی سے زیادہ عرصے تک مدرسہ رحیمیہ میں مسند نشین درس و تدریس رہے اور ہزارہا شائقین علوم دینی نے ان سے استفادہ کیا- لیکن ان کے تلامذہ کی کوئی جامع فہرست ابھی تک مرتب نہیں ہوسکی - ابویحیی امام خان نوشہروی نے شاہ احمد سعید ، شاہ عبدالغنی، شاہ مخصوص اللہ ، شاہ محمد اسحاق ، مولانا محمد شکور مچھلی شہری، سید محمد بخش عرف تربیت خان کے نام گنائے ہیں- (۲) صاحب " ابجد العلوم" نے اپنے والد ماجد علامہ حسن بن علی قنوجی کو ان کے نامور تلامذہ میں سے بتایا ہے -(۳)

اپنے خاندان کے دیگر ارکان رفیع الشان کی طرح تصنیف و تالیف کا انھیں بھی خاص ذوق تھا اور تقریباً تین درجن تصانیف و تحریرات یادگار چھوڑی ہیں- ان میں سب سے زیادہ شہرت ان کے ترجمۂ قرآن کو ہوئی - اس کی ایک تاریخی حیثیت ہے - حامد حسن قادری کے بقول " شمالی ہند میں نثر کی سب سے پہلی کتاب مولانا شاہ رفیع الدین رحمتہ اللہ علیہ کا اردو ترجمۂ قرآن ہے -" (۴) رام بابو سکسینہ کی تحقیق کے مطابق تو قرآن شریف کا سب سے پہلا اردو ترجمہ بھی یہی ہے - (۵) سرسید نے لکھا ہے کہ مولوی رفیع الدین صاحب کا ترجمہ تراکیب نحوی کے لیے ایک بہت عمدہ

---

(۱) کریم الدین پانی پتی، " تذکرہ فرائد الدہر"، دہلی: مطبع العلوم مدرسہ، ۱۸۴۷ع، ص۳۱
(۲) ابویحیی امام خان نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا ، ص ۲۶
(۳) صدیق حسن خان، " ابجد العلوم" محولہ بالا ، ص ۹۱۵
(۴) حامد حسن قادری، " تاریخ داستان زبان اردو"، کراچی : اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۲۶ع، صص ۲۲-۲۳
(۵) عسکری، مرزا محمد (مترجم) ، " تاریخ ادب اردو"، از رام بابو سکسینہ، لاہور: س ن، ص ۱۲ (تفصیل کے لیے دیکھئے عبدالحق" پرانی اردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں"، مضمون مشمولہ " قدیم اردو"، ص ۱۱۸)

دستاویز ہے ۔ (۱) ترجمے کی تاریخ کے بارے میں اتفاق نہیں ۔ حامد حسن قادری نے
اس اعتراف کے ساتھ کہ " اس ترجمے کی قطعی تاریخ متعین نہیں۔" ۱۲۰۰ھ کے قریب،
تحریر کی ۔ (۲) احسن مارہروی نے بھی اندازاً ۱۲۰۳ھ تحریر کی ہے ۔(۳) اور بشیر
الدین احمد نے ۱۲۰۵ھ لکھی ہے ۔(۴) یہی رائے حکیم محمود احمد برکاتی کی ہے کہ
یہ ترجمہ آپ نے تقریباً ۱۲۰۵ھ میں مکمل فرمایا تھا۔ (۵) قرآنی خدمات کے سلسلے میں
اردو میں تفسیر رفیعی (سورہ بقرہ کی تفسیر) بھی ان کی یادگار ہے ۔ لیکن ان
دونوں کے بارے میں محتاط بیان یہ ہے کہ یہ شاہ صاحب کے اپنے قلم کی تحریر نہیں ہے
بلکہ یہ شاہ صاحب کے دروس قرآن کی تقاریر ہیں جنہیں ان کے ایک مستر شد سید نجف
علی معروف بہ فتح دار خان نے قلم بند کی تھیں ۔(۶) ان کا ایک اردو رسالہ " راہ نجات"
کے نام سے ہے ۔ اس کا ذکر سرسید نے بھی سید محمد بخاری کے نام اپنے بعض مکاتیب
میں کیا ہے ۔(۷) سرسید نے " کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" کی طرف سے رپورٹ
میں قصبوں اور دیہاتوں میں قائم کیے جانے والے مدرسوں اور مکاتب میں مسلمان بچوں کو
دینی مسائل سے آگاہ کرنے کے لیے یہ رسالہ تجویز کیا تھا۔ (۸) اردو میں ترجمہ ، تفسیر

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب)؛ " مقالات سرسید"، لاہور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء ، حصہ ہفتم، ص ۲۵۵

(۲) اختر جوناگڈھی، قاضی احمد میاں؛ " تذکرہ اہل دہلی"، کراچی : انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ء ، ص ۱۷

(۲) حامد حسن قادری، " داستان زبان اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۷۹

(۳) احسن مارہروی؛ " تاریخ نثر اردو"، ص ۷۷

(۴) بشیرالدین احمد دہلوی؛ " واقعات دارالحکومت دہلی"، آگرہ : شمسی مشین پریس، ۱۹۱۹ء ، حصہ دوم، ج دوم، ص ۵۸۸

(۵) محمد احمد برکاتی، حکیم" شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۵۸

(۶) ایضاً، ص ۱۵۸-۵۹

(۷) اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب)؛ " مکتوبات سرسید"، (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۹ء) مکتوب مورخہ ۳ اکتوبر، ۱۸۸۷ء ، ص ۳۲۶

ایضاً، مکتوب مورخہ ، ۳ دسمبر، ۱۸۸۷ء ، ص ۳۲۷

(۸) اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد (مرتب)؛ مقالات سرسید"، لاہور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء (مقالہ مشمولہ ، " طریقہ تعلیم مسلمانان")، ج ۸، ص ۸۷

اور " راہ نجات" کے سوا ان کی اور کوئی تحریر موجود نہیں۔

صاحب " ابجد العلوم " نے ان کی مصنفات کثیرہ میں سے صرف دو (۱) مولانا عبدالحئی نے پندرہ کتابوں کے نام ، اپنے والد کے بعض قصائد پر تخمیس کے علاوہ " ولہ غیر ذلک من المؤلفات الجیدہ" لکھا ہے - (۲) صاحب " تراجم علمائے حدیث ہند" نے صرف پانچ کا (۳) صاحب " قاموس المشاہیر" (۴) اور صاحب " تذکرہ علمائے ہند" نے چھ کا (۵) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے سات کا (۶) اور دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے شاہ رفیع الدین کی کم و بیش بیس کتابیں بتائی ہیں لیکن حوالہ صرف چودہ تصانیف کا دیا ہے - (۷) لیکن محمود احمد برکاتی نے جامع فہرست دی ہے - ان کی تحقیق کے مطابق تین اردو ، چودہ فارسی اور پندرہ عربی کل بتیس تصانیف ہیں۔ منظومات میں تین قصائد ان کے علاوہ ہیں - ان میں سے رسالہ" حملۃ العرش "، " آثار القیامت" ، " تنبیہہ الغافلین"، " رسالہ سمت قبلہ"، رسالہ " تعدیلات المخمسۃ المحصورۃ"، مجموعہ" فتاویٰ فارسی" میں اور" تکمیل الاذہان"، " مقدمۃ العلم" ، " دمغ الباطل"، رسالہ " فی اثبات شق القمر و ابطال براہین الحکمۃ "، رسالہ " فی تحقیق الالوان"،

---

(۱) صدیق حسن خان، نواب ،" ابجد العلوم"، محولہ بالا ، ص ۹۱۵
(۲) عبدالحئی، سید،" نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ص ۱۸۳
(۳) ابویحییٰ امام خان نوشہروی،" تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا ، ص ۲۶
(۴) نظامی بدایونی،" قاموس المشاہیر"، بدایون :نظامی پریس، ۱۹۲۴ع ، ص ۲۲۳
(۵) ایوب قادری(مرتب) ، " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۱۹۶
(۶) ابواللیث صدیقی،ڈاکٹر (مضمون نگار) ، " اس دور کے نثر نگار"، " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، (اردو ادب — حصہ دوم) ، ج ۷، ص ۳۶۶
(۷) محمد شفیع لاہوری(مضمون نگار) ، " رفیع الدین"، " اردو دائرہ معارف اسلامیہ" لاہور :دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۳ع ، حصہ ۱۰ ، ص ۱۹-۳۱۸

رسالہ " فی المنطق "، رسالہ " فی التاریخ "، " اسرار المحبت"، وغیرہ عربی میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نظم میں قصیدۂ عینیہ ، در رد قصیدہ شیخ الرئیس ، قصیدہ معراجیہ اور تخمیس برقصیدہ شاہ ولی اللہ دربیان حقیقت نفس ، ان کی یادگار ہیں۔(۱)

شاہ رفیع الدین کے ایک رسالے کا تذکرہ سرسید نے کیا ہے ۔ یہ رسالہ "ابطال حرکت زمین" میں تھا۔ جب خود سرسید نے " قول متین در ابطال حرکت زمین" نامی رسالہ لکھا تو انھیں شاہ صاحب کے رسالے کی تلاش ہوئی لیکن رسالہ اس وقت بھی سرسید کو نہیں ملا تھا۔ (۲) نہ بعد میں اس کا پتا چلا ۔ سرسید احمد خان نے قصیدہ معراجیہ سے ان کے کلام کا نمونہ دیا ہے ۔ (۳)

شاہ رفیع الدین کے چند صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں ۔ صاحبزادی کا نام امۃ اللہ تھا اور مولوی سید نجم الدین سونی پتی کے ساتھ بیاہی گئی تھیں۔ سید ناصر الدین اور سید ظہیرالدین ان کے صاحب زادے یعنی شاہ رفیع الدین کے نواسے تھے۔ صاحب زادوں کا نام محمد عیسی، محمد مصطفی، مخصوص اللہ ، محمد حسین، محمد موسی اور محمد حسن تھا۔ مولوی محمد عیسی کا عقد شاہ عبدالعزیز کی بڑی صاحب زادی سے ہوا تھا۔ مولوی محمد مصطفی کا نکاح شاہ عبدالقادر کی صاحب زادی زینب سے ہوا تھا۔ ان کی صاحب زادی کلثوم تھیں، مولوی محمد موسی کے ایک صاحب زادے عبدالسلام اور ایک صاحب زادی تھیں۔ مولوی محمد حسن کے ایک صاحب زادے اور چند

---

(۱) محمود احمد برکاتی ، حکیم " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"،محولہ بالا ، ص ۱۵۸-۶۱

ابویحیی امام خان نوشہروی،" ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات"، چیچہ وطنی، ساہیوال :مکتبہ نذیریہ، ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۰ء، ص ۰۰۰

(۲) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب)" مقالات سرسید"، لاہور :مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء ، حصہ شانزدہم، ص ۳۹۲

(۳) سرسید احمد خان" آثارالصنادید"، محولہ بالا، ص ۵۳

صاحب زادیاں تھیں ۔(۱) مولوی مخصوص اللہ اور مولوی محمد حسین کے ظروف و اولاد کے بارےمیں کوئی علم نہیں ہوسکا۔ مولوی مخصوص اللہ سے سرسید نے استفادہ بھی کیا تھا۔(۲) اور " آثار الصنادید" میں ان کا ترجمہ بھی لکھا ہے ۔

سرسید احمد خاں نے جہاں ان کے ترجمۂ قرآن کو تراکیب نحوی کے لیے ایک عمدہ دستاویز قرار دیا ہے ۔ وہاں انھوں نے متعدد مقامات پر بعض الفاظ کے ترجمے اور مطالب پر تنقید بھی کی ہے ۔ (۳) لیکن ان کے کمالات اور علوم و فنون متداولہ و مختلفہ میں ان کے درک ، ان کے فیض باطن اور ان کے سخا و کرم کا نہایت شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے ۔(۴) نواب صدیق حسن خان نے انھیں محقق مدقق لکھا ہے۔(۵)

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے " کہ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔" (۶) بھی زندگی اپنے والد کے مدرسۂ رحیمیہ میں درس و تدریس ، ترویج و اجماع سنت اور تصنیف و تالیف میں بسرکی ۔ شعر گوئی کا ذوق بھی تھا۔ آخر میں درس و تدریس کا مشغلہ چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ مولینا حالی نے ان کے بارے میں لکھا ہے " شاہ رفیع الدین نہایت صاف گو اور آزاد طبع آدمی تھے۔"(۷)

---

(۱) محمود احمد برکاتی، حکیم، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۲۲-۱۲۳

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین ؛ " حیات جاوید"، کان پور: نامی پریس ، ۱۹۰۱ء، ص ۵۳ حصہ اول

(۳) سرسید احمد خاں، " تفسیر قرآن"، علی گڑھ : مطبع انسٹی ٹیوٹ ، ۱۸۹۵ء، ج پنجم، ص ۱۵۹
سرسید احمدخاں؛ "سحر" (مقالہ) ؛ مقالات سرسید"، لاہور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء ، حصہ چہارم، ص ۳۲۷ اور ۳۳۰
سرسید احمدخاں، " قصۂ موسیٰ علیہ السلام"، " مقالات سرسید"، لاہور : ۱۹۶۲ء، حصہ چہاردہم، ص ۳۵۱

(۴) سرسید احمد خاں، "آثارالصنادید"، محولہ بالا ، ص ۵۳-۵۲

(۵) صدیق حسن خاں، نواب؛ " ابجد العلوم" ، محولہ بالا ، الجز الثالث، ص ۹۱۵

(۶) آزاد ، مولانا ابوالکلام، " تذکرہ" محولہ بالا ، ص ۲۷۱ حصہ دوم

(۷) حالی، خواجہ الطاف حسین؛ " حیات جاوید"، محولہ بالا ، ص ۳۸۷

۱۲۳۳ھ میں دھلی میں ھیضے کی وبا پھیلی تھی اس سے شاہ رفیع الدین، بھی متاثر ھوگئے اور اسی بیماری میں ٦ شوال ، ۱۲۳۳ھ مطابق ۹ اگست، ۱۸۱۸ع ستر سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔(۱) اپنے خاندانی قبرستان میں والد کے بائیں دفن کئے گئے ۔(۲) فاتحہ سوم کے موقع پر مجمع کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ھے کہ اکہاسی بار قرآن مجید ختم ھوا تھا۔ (۳)

====xxx====

جناب جنّت مآب مولوی عبدالقادر قدس سرہ :

" حضرت بابرکت کثیرالافادت جناب غفران مآب کامل واصل زبدہ علمائے متاکّہین اسوۂ کملائے ربانین ، محقق مسائل دین، مؤسس معانی شرع مبین، ھادی شریعت ، پیر طریقت، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب غفراللہ لہ آپ خلف الرشید ھیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اور کہین برادر مولوی شاہ عبدالعزیز اور مولوی شاہ رفیع الدین قدس سرھما کے ۔ آپ کے علم و فضل کا بیان کرنا ایسا ھے کہ کوئی آفتاب کی تعریف فروغ اور فلک کی مدح بلندی کے ساتھ کرے ۔ زبان کو کیا طاقت کہ ایک حرف حضرت کی صفات سے لکھ سکے اور قلم کی کیا مجال کہ آپ کی مدائح سے ایک ذرہ لکھ سکے ۔ کسب فیض باطنی سوائے والدماجد کے اور بزرگوں کی خدمت سے بھی اتفاق ھوا، اب اس جزو زمان میں ایسا مکاشفہ صحیح کم کسی اھل کمال سے اتفاق ھوا ھے ۔ بارھا ثقات کی زبان سے سنا گیا کہ جس امر میں کچھ فرمایا ویسا ھی بے کم و کاست ظہور میں آیا۔ باوجود اس کے کہ بسبب کثرت اخلاق کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ ادھر بیٹھ

---

(۱) محمد شفیع الدین، " رفیع الدین"، " اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، محولہ بالا ، ص۳۱۸

(۲) محمد شاہ عالم فریدی،" مزارات اولیائے دھلی"، محولہ بالا ، ص ۱۳

(۳) محمود احمد برکاتی، حکیم، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا،ص ۱۲۲

یا ادھر ، لیکن مجذوب اللہ لوگوں کے دل میں آپ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ روسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بسبب ادب کے دور دور خاموش بیٹھتے اور بدوں آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات کے سوا یا را نہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں۔ کرامت حضرت بحد تواتر پہنچ گئی ہیں ۔ اگر ان کا بیان کیا جائے کتاب میں گنجائش نہیں۔ بیت :

مردان خدا خدا نباشند

لیکن ز خدا جدا نباشند

از بسکہ ترک حضرت کے مزاج میں بہت تھا ، تمام عمر اکبر آبادی مسجد کے ایک حجرے میں بسرکی ۔ آپ کا کچھ کلام نظم و نثر سے راقم کو دستیاب نہیں ہوا۔غالب یہ ہے کہ جو آپ کی اوقات متبرک تھی اس سے کہ اپنی طبع اقدس کو ان امور کی طرف متوجہ فرماتے ادھر ملتفت نہیں ہوئے ہوں گے ۔ تیس پینتیس برس سے زیادہ گذرتے ہیں کہ حضرت نے جہان فانی سے رخت سفر عالم دوامی جاودانی کی طرف باندھ کر جوار رحمت الہی میں آسایش کی ۔ " (۱)

__تعلیقات :__

شاہ عبدالقادر ، حضرت ولی اللہ کے چوتھے بیٹے تھے ۔ ان کی ولادت دھلی میں ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء میں ہوئی ۔ والد کی وفات ہوئی تو صرف دو سال کی عمر تھی اور قرآن مجید کی تعلیم کے بعد فارسی اور عربی تعلیم کا آغاز تھا۔ " صرف میر" تک پہنچے تھے ۔(۲) ابویحیی امام خان نوشہروی نے لکھا ہے کہ " اپنے والد ماجد

---

(۱) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید"، محولہ بالا اشاعت اول ، چوتھا باب، ص ۹۷-۹۵

(۲) محمود احمد برکاتی ،حکیم،" شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۲۳

شاہ ولی اللہ سے علوم و فنون پڑھے ۔" (۱) عنایت اللہ نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے اپنے والد بزرگ وار شاہ ولی اللہ سے تعلیم حاصل کی ۔(۲) سرسید کا خیال ہے کہ کسب فیض باطن سوائے والد ماجد کے اور بزرگوں کی خدمت سے بھی اتفاق ہوا ۔ (۳) شاہ ولی اللہ اعلا تعلیم کے مخصوص طلبہ کی جماعت کو پڑھاتے تھے اور شاہ عبدالقادر ابھی آغاز ہی میں تھے اور یہ عمر کسب فیض باطن کی بھی نہیں ہوتی ۔ اس سلسلے میں مولوی [illegible] مولوی محمد یحیی تنہا کی رائے زیادہ صائب معلوم ہوتی ہے کہ " ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد مکرم کے سایۂ عاطفت میں پائی یعنی والد ماجد کے زیر نگرانی ابتدائی تعلیم کے مراحل سے گزرے ۔(۴) اغلب یہ ہے کہ تعلیم انھوں نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کی خدمت میں حاصل کی ہوگی کہ والد ماجد کے انتقال کے بعد شاہ عبدالعزیز جانشین درس و تدریس تھے ۔ محمود احمد برکاتی نے لکھا ہے کہ علوم کی تکمیل شاہ محمد عاشق اور دوسرے علما سے کی ۔ (۵) شاہ محمد عاشق شاہ عبدالقادر کے ماموں بھی تھے اور ان سے ان کے بڑے بھائیوں نے بھی تحصیل علمی کی تھی ۔ ناصر نذیر فراق کی روایت کے مطابق " اصول زبان اردو انھوں نے بھی اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز کی طرح خواجہ میر درد سے سیکھے تھے ۔ (۶) بیعت ارشاد شاہ عبدالعدل دہلوی سے کی (۷) مولوی [illegible]محمد عالم شاہ فریدی نے شاہ عبدالعدل

---

(۱) ابویحیی امام خان نوشہروی،" تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۹۳
(۲) عنایت اللہ ،" شاہ عبدالقادر دہلوی"، (مقالہ) " اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور: دانش گاہ پنجاب ، ۱۹۷۳ع ، ج ۱۲، ص ۱۳۵
(۳) سرسید احمد خان،" آثار الصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب ، ص ۵۳
(۴) تنہا ، مولوی محمد یحیی ، " سیر المصنفین"، قاضی آباد: دارالاشاعت ، ۱۹۲۴ع، حصہ اول ، ص ۱۰۶
(۵) محمود احمد برکاتی، حکیم،" شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۲۳
(۶) فراق ، ناصر نذیر،" لال قلعہ کی ایک جھلک"، محولہ بالا ، ص ۶۱-۶۰
(۷) محمود احمد برکاتی، حکیم،" شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۲۳

کے ساتھ خواجہ محمد ناصر سے بھی شرف بیعت " کا تذکرہ کیا ہے - (۱) اپنے دو بڑے بھائیوں کی طرح درس و تدریس مشغلہ تھا۔ مسجد اکبر آبادی میں پڑھاتے تھے - اور یہی مسجد ان کا مسکن تھا۔ (۲) درس حدیث و قرآن اور درس فقہ سے جو وقت بچتا تھا ذکر و فکر میں گزارتے تھے -(۳) ان کے عظیم المرتبت معاصر مولانا فضل امام خیرآبادی نے ان کے تبحر علمی اور جامعیت فضل و کمال کے بارے میں شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کے ضمن میں لکھا ہے :

" و برادر صغیر شاہ عبدالقادر صاحب ایشان مانند برادر بزرگ خود حاوی فضائل و مستجمع فواضل اند۔ امروز در علم ریاضی کم کسے بودہ باشد که مساهمت با مولوی صاحب تواند نمود۔" (۴)

رحمان علی لکھتے ھیں :

" تفسیر، حدیث، فقہ میں فضیلت تامہ رکھتے ھیں -" (۵)

مولانا اشرف علی تھانوی نے امیر شاہ خان کی زبانی نقل کیا ہے کہ " معقولات میں درک رکھتے تھے "(۶) مولانا آزاد کے بقول" شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے -"(۷) اور رام بابو سکسینہ کے مطابق " اپنے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے واسطے مثل اپنے بدرِبزرگوار اور برادران محترم کے مشہور تھے -(۸)

---

(۱) محمد عالم شاہ فریدی گ، " مزارات اولیائے دھلی"، محولہ بالا، ص ۱۳
(۲) عبدالحئی ، سید، " نزھت الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۲۹۵
(۳) ابویحیی امام خان نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ھند"، محولہ بالا، ص ۲۳
(۴) انتظام اللہ شہابی (مرتب) " تراجم الفضلا"، محولہ بالا، ص ۱۷
(۵) ایوب قادری ، محمد، " ترجمہ تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ۳۱۵
(۶) اشرف علی تھانوی، " ارواح ثلاثہ"، لاھور : اسلامی اکادمی، ۱۹۷۶ء، ص ۲۱
(۷) آزاد ، مولانا ابوالکلام، " تذکرہ"، محولہ بالا، ص ۲۷۱
(۸) عسکری، محمد حسن (مترجم) ، " تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا، ص ۱۲

سرسید نے ان کے صاحب کشف و کرامات ہونے اور لوگوں کے دلوں میں ان کا احترام اور رعب علم و تقوی کا ذکر کیا ہے -(۱) نواب صدیق حسن خان نے بھی ان کے زہد اور تقوی اور فراست ایمانی کا ذکر کیا ہے -(۲) مولانا عبدالحئی نے لکھا ہے: "کہ ان کی ولایت اور بزرگی پر لوگوں کا اتفاق تھا-"(۳) نہایت قانع اور صاحب استغنا بزرگ تھے- سرسید لکھتے ہیں: " کہ از بس کہ ترک حضرت کے مزاج میں بہت تھا تمام عمر اکبرآبادی مسجد کے ایک حجرے میں گزار دی-" (۴) ان کے کمال علم و فضل اور محاسن اخلاق و سیرت پر مولانا عبدالحئی نے سب سے اچھا تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :

" و جمع العلم و العمل و الزہد و التواضع و حسن السلوک و وضع الله سبحانہ لہ المحبة فی قلوب عبادہ لما اجتمع فیہ من خصال الخیر فصار مرجوعا الیہ فی بلدتہ و مرجوعا الیہ بعلم الروایة والدرایة و تہذیب النفوس والدلالة علی معالم الرشد و طرائق الحق-" (۵)

ہفتے میں ایک روز چہار شنبے کو شاہ عبدالعزیز اور دوسرے اعزہ سے ملنے مسجد سے مکان آیا کرتے تھے -(۶) اہل دنیا کی طرف مطلق التفات نہ فرماتے اسی سبب سے تصنیف و تالیف کی طرف بھی چنداں توجہ نہ کی - (۷) اس کے باوجود انھیں سیاسیات میں بھی درک تھا- (۸)

اگرچہ ان کی علمی یادگار صرف ان کا اردو ترجمہ قرآن مجید ہے لیکن اس کی

---

(۱) سرسید احمدخان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۵۵-۵۴
(۲) صدیق حسن خان، نواب، " ابجد العلوم"، محولہ بالا، الجز الثالث، ص ۹۱۵
(۳) عبدالحئی ، مولانا سید، " نزہة الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۲۹۵
(۴) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۵۵
(۵) عبدالحئی، مولانا سید، " نزہة الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۲۹۵
(۶) محمود احمد برکاتی، حکیم، " شاہ ولی الله اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۲۴
(۷) ایوب قادری، محمد، " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، (حاشیہ) ، ص ۳۵
(۸) تنہا، مولوی محمد یحیی، " سیرالمصنفین"، محولہ بالا، ص ۱۰۶
ابویحیی امام خان نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۲۴

بدولت انھیں جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ بہت کم کسی کتاب اور اس کے مصنف کو حاصل ہوئی ہوگی ۔ مولوی محمد یحیی تنہا لکھتے ہیں :

" قرآن شریف کا بامحاورہ ترجمہ اردو یا موضح القرآن آپ سے یادگار ہے جس پر بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں نثار ہیں۔" (۱)

سرسید نے اسے اردو کا پہلا ترجمہ اور اردو لغات کے لیے ایک بڑی سند قرار دیا ہے ، وہ لکھتے ہیں :

" عربی زبان کا اردو میں ترجمہ سب سے پہلے مولوی عبدالقادر صاحب اور مولوی رفیع الدین صاحب نے کیا۔ مولوی عبدالقادر صاحب کا اردو ترجمہ کلام اللہ کا اردو لغات کے لیے ایک بڑی سند ہے ۔" (۲)

مولانا احسن مارہروی نے لکھا ہے :

" مذہبی خدمت کے غالباً یہ پہلے نمونے ہیں جو مسلمانوں کے قلم سے اردو نثر میں یادگار پائے جاتے ہیں۔" (۳)

مولانا ابوالکلام آزاد نے خواجہ عبدالوحید صاحب کے نام ایک خط میں لکھا ہے :

" شاہ صاحب (عبدالقادر) کی سب سے بڑی خدمت جس میں اردو زبان ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت قرآن کا ترجمہ کیا ، جب زبان بالکل ابتدائی طفولیت کی حالت میں تھی اور نثر نویسی بھی بری طرح شروع نہیں ہوئی تھی ۔ ایسا کام صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جو زبانوں کے ڈھالنے والے ہوتے ہیں۔" (۴)

---

(۱) تنہا ، مولوی محمد یحیی ، " سیرالمصنفین" ، محولہ بالا ، ص ۱۰۷

(۲) اسمعیل پانی پتی (مرتب) " مقالات سرسید " ، محولہ بالا ، حصہ ہفتم ، ص ۲۵۵

(۳) احسن مارہروی ، " تاریخ نثر اردو " ، محولہ بالا ، ص ۷۹

(۴) ابوسلمان شاہجہان پوری (مرتب) " مکاتیب ابوالکلام آزاد " ، کراچی : اردو اکیڈمی سندھ ، فروری ، ۱۹۶۸ء ، ص ۱۹۲

شاہ عبدالقادر نے اپنے بڑے بھائی شاہ رفیع الدین کے مقابلے میں لفظ لفظ اور حرف حرف کا ترجمہ کرنے کی بجائے ادائے مفہوم اور وضاحت مطلب کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے ۔ اس لیے ان کا ترجمہ پہلے ترجمے کی نسبت مختصر اور صاف ہوگیا ہے ۔(۱) یہ قرآن مجید کا پہلا با محاورہ اردو ترجمہ ہے ۔(۲) مولوی عبدالحق نے نہایت تفصیل کے ساتھ شاہ ولی اللہ کے خاندان کی دینی خدمات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" ہندوستان کے نامور محدث اور عالم شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خاندان نے جو دینی خدمات انجام دی ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کا خا فیض سارے ملک کو پہنچا ہے ۔ شاہ ولی اللہ نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی زبان میں ۱۱۵۰ھ میں کیا جو بڑی خوبیوں کا ہے ان کے فرزندوں میں سے مولانا شاہ رفیع الدین اور مولانا شاہ عبدالقادر نے اردو زبان میں ترجمے کیے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ بہت مقبول اور مشہور ہوا اور اب تک بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ یہ ترجمہ ٹھیٹ اردو میں ہے ۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عربی الفاظ کے لیے ہندی یا اردو کے ایسے برجستہ اور برمحل الفاظ ڈھونڈھ کے نکلے ہیں کہ ان سے بہتر ملنا ممکن نہیں۔"(۳)

اسی مقالے میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں :

" وہ مفہوم کی صورت اور اصل لفظ کے حسن کو برقرار رکھنے کے علاوہ اردو زبان کے روزمرہ اور محاورے کا بھی خیال رکھتے ہیں۔" (۴)

اور آگے چل کر لکھتے ہیں :

" شاہ عبدالقادر کا ترجمہ زیادہ سلیس اور صاف اور صحیح ہے۔" (۵)

---

(۱) حامد حسن قادری، "تاریخ داستان زبان اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۵
(۲) محمد عالم فریدی، مولوی، "مزارات اولیائے دہلی"، محولہ بالا ، ص ۱۳
(۳) عبدالحق ، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی، "قدیم اردو"، کراچی : انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۱ء ، ص ۱۳۱
(۴) ایضاً ، ص ۱۳۲
(۵) ایضاً ، ص ۱۳۳

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بھی شاہ صاحب کی اس دینی قرآنی اور لسانی و ادبی خدمت کا اعتراف کیا ہے -(۱)

یہاں اس غلط فہمی کی تردید بھی ہوجانی چاہئے کہ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ اردو زبان میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ ہے - ان سے پہلےان کے بھائی شاہ رفیع الدین اردو میں ترجمہ کرچکے تھے - حامد حسن قادری نے لکھا ہے کہ " شاہ عبدالقادر سے تقریباً بیس برس پہلے دھلی ہی میں حکیم شریف خاں قرآن مجید کا ترجمہ کرچکے تھے -(۲) حکیم شریف خاں کا ذوق و خدمت ترجمۂ قرآن بھی دراصل خاندانِ ولی اللٰہی کا فیضان تھا اس لیے کہ حکیم صاحب موصوف کی تعلیم اسی خاندان عالی شان میں ہوئی تھی-(۳) لیکن اردو تراجم کی تاریخ اس سے بھی پہلے سے شروع ہوتی ہے - (۴) البتہ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں پہلا با محاورہ ترجمہ یہی ہے - نیز قبولیت اور شہرت میں بھی کوئی دوسرا ترجمہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا- لیکن جو بات اس کی زبان کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے اور جس کا اعتراف خود سرسید نے بھی کیا ہے ، وہ صحت ترجمہ کے بارے میں نہیں ہے - اس لیے کہ اپنے مقالات میں خود سرسید نے کئی مقامات پر بعض الفاظ کے ترجمے پر تنقید کی ہے - (۵) مولانا ابوالکلام آزاد

---

(۱) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: "اس دور کے نثر نگار"، (مقالہ مشمولہ) ، " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، محولہ بالا ، ج ۷، صص ۴۳-۴۷۲ اور ۴۸۱

(۲) حامد حسن قادری: "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۱۶۱
ایوب قادری، محمد : "حکیم شریف خاں دھلوی کا ترجمہ قرآن"، (مقالہ) ، " قومی زبان"، کراچی : یکم دسمبر، ۱۹۶۰ء، صص ۳۰-۲۹

(۳) کوثر چاند پوری، "اطبائے عہد مغلیہ"، کراچی: ہمدرد اکیڈمی، ۱۹۶۰ء، ص ۱۰...

(۴) عبدالحق، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی: "پرانی اردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں"، (مقالہ) "قدیم اردو"، محولہ بالا ، ص ۱۱۸

(۵) "سحر"، (مقالہ) : "مقالات سرسید"، محولہ بالا ، حصہ چہارم، صص ۳۰-۳۲۷
" قصہ موسی علیہ السلام کا" (مقالہ) : "مقالات سرسید"، محولہ بالا ، حصہ چہاردہم ، ص ۲۵۱

نے بھی ترجمے کے دقائق کی طرف اشارہ کیا ہے اور چند مثالیں بھی دی ہیں۔" (۱)

ترجمے کے ساتھ شاہ صاحب نے حواشی بھی تحریر فرمائے ہیں۔ جن کا تاریخی نام " موضح قرآن" (۱۲۰۵ھ) ہے - ترجمے ہی کی طرح ان حواشی کو بھی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہے -

حکیم محمود احمد برکاتی نے مولانا عبدالحئی کی مشہور تالیف" الثقافة الاسلامیہ فی الہند"، کے حوالے سے شاہ عبدالقادر کے ایک اردو رسالے " ظہور الصلوۃ" کا ذکر بھی کیا ہے -(۲) لیکن اس کا وجود اہل علم و نظر کے نزدیک ابھی تک عنقا کی حیثیت رکھتا ہے - سید محمد بخاری کے نام سرسید کے خط مورخہ ۳۱/ اکتوبر، ۱۸۸۷ء سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے " حقیقة الصلوۃ" کے نام سے شاہ عبدالقادر کا ایک رسالہ دیکھا تھا۔(۳) میرا خیال ہے کہ یہ ایک ہی رسالہ ہے اور مولانا عبدالحئی اور سرسید دونوں میں سے ایک بزرگ کو نام کے بارے میں تسامح ہوا ہے - ترجمہ، موضح اور رسالہ صلوۃ کے سوا ان کی کسی اور تصنیف یا تحریر کا کوئی علم نہیں ہوسکا۔ حتیٰ کہ سرسید کو بھی کلام و تحریر کا نمونہ درج کرنے کے لیے کوئی نگارش ہاتھ نہیں آئی تھی۔

ان کی جسمانی یادگاروں میں صرف ان کی ایک صاحب زادی کا پتا چلتا ہے۔ جن کا نام زینب تھا اور ان کا عقد ان کے چچا شاہ رفیع الدین کے صاحب زادے شاہ محمد مصطفٰی کے ساتھ ہوا تھا۔ ان کے بطن سے صرف ایک صاحب زادی کلثوم تھیں۔ یہی وہ عظیم خاتون تھیں جنھیں شاہ محمد اسمعیل شہید کی زوجیت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ (۴)

---

(۱) ابوسلمان شاهجہان پوری،" مکاتیب ابوالکلام آزاد"، محولہ بالا، ص ۱۹۸
(۲) محمود احمد برکاتی،" شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۶۵
(۳) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) " مکتوبات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۹ء، ص ۳۲۶
(۴) محمود احمد برکاتی"، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان" ، محولہ بالا، ص ۱۶۵

شاہ عبدالقادر نے تقریباً پینتالیس برس تک مسجد اکبر آبادی میں قرآن و حدیث اور فقہ کا درس دیا۔ اس مدت میں بلا مبالغہ سینکڑوں طلبہ نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہوگا اور تکمیل علوم و فنون کی ہوگی لیکن ان کے بہت کم تلامذہ کے نام معلوم ہوسکے ہیں۔ نواب صدیق حسن خان نے ان کے اجل تلامذہ میں صرف مولانا فضل حق خیرآبادی کا نام دیا ہے -(۱) مولانا سید عبدالحئی نے فضل حق کے علاوہ مولانا عبدالحئی، شاہ اسمعیل ، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، شاہ محمد اسحاق ، سید محبوب علی جعفری، سید اسحاق بن عرفان کے نام دیے ہیں - (۲) " ارواح ثلاثہ " کی روایت میں مفتی صدرالدین آزردہ کا اضافہ ہوا ہے -(۳) ابویحییٰ امام خان نوشہروی کی تحقیق میں صرف ایک نیا نام مولانا امام الدین بخشی امروہوی کا آیا ہے - سرسید نے ان کے سامنے شاہ اسمعیل شہید کے زانوئے سبق تہ کرنے کی خبردی ہے - (۵) خلیق احمد نظامی کی تحقیق سے اس فہرست میں حافظ محمد علی خیرآبادی کے نام کا اضافہ ہوا ہے -(۶) حکیم محمود احمد برکاتی نے ان کے تلامذہ کی فہرست میں صرف پانچ نام گنائے ہیں لیکن ہم اپنی اس فہرست میں ان کی تحقیق سے صرف شاہ محمد یعقوب کا اسم سامی ہی کا اضافہ کیا جاسکتا ہے -(۷) بہرحال اس سلسلے میں جو نام بھی آئے ہیں وہ منتخب روزگار

---

(۱) صدیق حسن خان، نواب، " ابجدالعلوم" محولہ بالا ، الجزالثالث، ص ۹۱۵

(۲) عبدالحئی ، مولانا سید ،" نزھت الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۲۹۵

(۳) اشرف علی تھانوی، " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، صص ۲۱-۵۹

(۴) ابویحییٰ امام خان نوشہروی،" تراجم علمائے حدیث ھند"، محولہ بالا ، ص ۲۵

(۵) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، ص ۵۶

(۶) خلیق احمد نظامی،" تاریخ مشائخ چشت"، اسلام آباد: دارالمؤلفین، ۱۹۷۵ع ، ص ۲۶۸

(۷) محمد احمد برکاتی، حکیم،" شاہ ولی اللہ اور ان کاخاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۲۵

ہیں اور اپنے استاد کی علمی منزلت اور دینی وجاہت کے اندازے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن شاہ عبدالقادر کے سلسلۂ تلامذہ میں ایک ایسا نام ابھی رہ گیا ہے جسے اس سلسلے میں دوسرے اکابر علما سے کم حیثیت اور شہرت حاصل نہیں ہوئی ۔ جو تحریک جہاد کا بانی اور مسلمانوں کی اصلاح اور نشأت ثانیہ کی روح تھی ۔ میرا اشارہ امیرالمومنین سید احمد شہید رائے بریلوی کی طرف ہے ۔ شاہ عبدالقادر سے سید صاحب کے تلمذ کا ذکر خود سرسید نے کیا ہے ۔(۱) اور سید صاحب کے دو نامور محققین مولانا غلام رسول مہر (۲) اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی(۳) نے شاہ صاحب سے ان کے تلمذ کا اعتراف کیا ہے ۔

شاہ عبدالقادر کا انتقال ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۴ع میں ہوا۔(۴) اور [illegible] خاندانی قبرستان میں اپنے والد کے بائیں میں شاہ رفیع الدین کے برابر میں دفن ہوئے ۔(۵)

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۲۶

(۲) مہر، مولانا غلام رسول، " سید احمد شہید"، لاہور :شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۸ع ، ص ۴۷

(۳) ابوالحسن علی ندوی، " سیرت سید احمد شہید"، لاہور: خواجہ بک ڈپو، ۱۹۵۸ع ، ص ۸۸ اور ۹۳

(۴) محمود احمد برکاتی، حکیم،" شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۲۵

(۵) محمد عالم شاہ فریدی،" مزارات اولیائے دہلی"، محولہ بالا ، ص ۱۴

باب ـ سوم

اصحاب ثلاثہ کے شاگرد

باب سوم علما و مشائخ اور شاعر و اطبا کے عنوان سے دو فصلوں پر مشتمل ہے ۔ پہلی فصل میں اٹھارہ نامور علمائے دین اور مشائخ طریقت کے تراجم ہیں۔ اور دوسری فصل میں دہلی کے آٹھ نامور اطبا اور شاعر ہیں۔ یہ تمام اصحاب علم و فن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے اخوان کرام یعنی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے شاگرد ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مرحوم دہلی کے یہ وہ نامور علماء، مشائخ ، ائمہ فن طب اور شاعر بے بدل ہیں جو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے بہ یک واسطہ اصحاب ثلاثہ سے شرف نسبت تلمذ رکھتے ہیں۔ دوسرے دور میں ولی اللہی خانوادۂ علمی انہیں نامورانِ علم و فضل سے عبارت تھا ۔

باب ـ سوم

اصحاب ثلاثہ کے شاگرد

(فصل ـ اول)

علمائے دین اور مشائخ طریقت

جناب حضرت مولانا شاہ ابوسعید نوراللہ مضجعہ :

" آپ شاہ غلام علی صاحب کے خلیفہ اعظم ہیں اور آپ کے انتقال کے بعد آپ ہی سجادہ نشین ہوئے تھے ـ لیکن اس بات کو بھی خیال کرلو کہ آپ حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں جو حضرت شاہ صاحب کے پیران پیر تھے اور واقع میں حضرت شاہ صاحب بھی آپ کو ویسا ہی سمجھتے تھے اور نہایت تعظیم و تکریم فرماتے تھے ـ نسب آپ کا حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ تک اس طرح پہونچتا ہے کہ شاہ ابوسعید بیٹے حضرت صفی اللہ کے ، اور حضرت صفی اللہ بیٹے حضرت عزیز القدر کے ، اور حضرت عزیز القدر بیٹے ، حضرت محمد عیسی کے ، اور حضرت محمد عیسی بیٹے حضرت سیف الدین کے ، اور حضرت سیف الدین بیٹے حضرت خواجہ محمد معصوم کے ، اور حضرت خواجہ محمد معصوم بیٹے حضرت مجدد الف ثانی کے ، رحمتہ اللہ علیہم اجمعین ـ اور حضرت مجدد شیخ فاروقی ہیں۔ یہ شرافت اور علو مرتبہ تو از روئے نسب کے تھا ، اور علاوہ اس کے صفات ذاتی اور کمالات ظاہری و باطنی ایسے تھے کہ جن کا کچھ حد و حساب نہیں۔ حافظ کلام اللہ اور عاشق رسول اللہ۔ علوم دینی آپ کو بہت مستحضر تھے اور دن رات انہیں کے درس میں گذرتے تھے علم قرات میں یکتائے روزگار تھے۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور کمال قرات سے پڑھتے کہ لوگ دور دور سے سننے آتے ـ پہلے پہل تو آپ نے مولانا شاہ درگاہی صاحب علیہ الرحمتہ سے کہ بڑے اولیائے وقت سے تھے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تھی اور نسبت باطنی بخوبی حاصل کرکے پیری مریدی کی اجازت لی تھی۔ لیکن اپنے خاندان کی

نسبت نے زور کیا اور اسی طریقۂ نقشبندیہ کی طرف کھینچا کہ آپ نے دوبارہ حضرت شاہ غلام علی صاحب سے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی ، اور از سر نو تمام مقامات کو حاصل کیا۔ آپ کی شکل و شمائل بہت نورانی تھی بے اختیار آپ کی صحبت میں حاضر رہنے کو دل چاہتا ۔ اور جب تک بیٹھتے وسوسہ شیطانی ایک نہ آتا ۔ اوقات آپ کی بعینہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اوقات تھی۔ صرف خالصاً للہ مشق خط نسخ ٹکّو خاں صاحب سے کی اور کلام اللہ لکھ لکھ کر وقف کیے۔ اگرچہ تعلقات ظاہری مثل زن و فرزند آپ کے حضرت شاہ صاحب کی نسبت زائد تھے لیکن ویسی ہی بے تعلقی حاصل تھی ، باہمہ اور بے ہمہ سے بھی کچھ زیادہ قدم رکھا تھا۔ اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بدرجۂ کمال تھا۔ کوئی بات خلاف سنت نہ کرتے اور ہردم پیروی سنت ہی کا خیال رکھتے ۔ اخلاق محمدی اس وسعت سے تھا کہ ہر شخص ملنے والا یہی جانتا تھا کہ جیسے عنایت اور شفقت آپ کو میرے حال پر ہے اس سے سوا دوسرے پر نہیں۔ حقیقت میں تواضع کو بدرجۂ کمال پہنچایا تھا اور سخاوت کو حد سے زیادہ اختیار کیا تھا۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو ابوسعید سے فخر ہے ۔ میں نے اگر فقیری کی تو کیا کہ کسی کا کچھ غم نہیں رکھتا ابوسعید کو دیکھو کہ باوصف خلائق دنیاوی کے کیا ، اپنے معبود کی عبادت میں مصروف ہے کہ گویا مطلق کچھ تعلق ہی نہیں رکھتا آپ کی صحبت سے ہر شخص کو ایک فیض ملتا اور اجتماع خاطر اور توجہ الی اللہ حاصل ہوتا ۔ واہ واہ طریقۂ پیر کو خوب نباہا۔ بلکہ اس سے بھی ایک آدھ قدم آگے رکھا ۔ آپ کی ذات سے بھی ہزارہا آدمیوں کو فیض ہوا اور طرح طرح کا فیض ہر ایک کو آپ سے ملا۔ بعد انتقال شاہ صاحب کے آپ ان کی جگہ مسند ارشاد پر بیٹھے اور سالہا سال لوگوں کو آپ کے فیض صحبت سے علو مراتب اور کمال مدارج حاصل ہوئے کہ اسی اثنا میں محبت رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بہت غلبہ کیا اور آپ نے زیارت حرمین شریفین کا ارادہ کیا۔ اللہ نے وہ ارادہ بھی پورا کیا اور حج اور زیارت

مدینہ منورہ نصیب کی - بوقت مراجعت کے بہ مقام ٹونک آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے لاشۂ مبارک کو دلّی میں لاکر خانقاہ میں حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پہلو میں دفن کیا۔ ولادت آپ کی ۱۱۹۶ھ میں ہوئی اور یہ مصرع تاریخ ولادت ہے مصرع

حافظ و عالم و ولی بادا

وفات آپ کی ۱۲۵۰ میں عید کے دن ہفتے کو ہوئی - اور نورالله مضجعه ، آپ کی وفات کی تاریخ ہے اور یہ قطعہ بھی تاریخ وفات میں ہے -

قطعہ

امام ومرشد ما شاہ بو سعید سعید   بعید فطر چو شد واصل جناب خدا

ولی شکستہ و مغموم گفت تاریخش   ستون محکم دین دہی فتادہ زپا " (۱)

تعلیقات :

مولانا شاہ ابوسعید کے والد کا نام صفی القدر تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی تک ان کا سلسلہ نسب یہ ہے :

" صفی القدر ابن عزیز القدر ابن محمد عیسی ابن سیف الدین ابن خواجہ محمد معصوم بن شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی -" (۲)

حضرت مجدد الف ثانی کا سلسلہ نسب اٹھائیس[۲۸] واسطوں سے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے - (۳)

مولانا شاہ ابوسعید ۲ ذی قعدہ ، ۱۱۹۶ھ/ ۹ اکتوبر، ۱۷۸۳ع بروز چہار شنبہ

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، دہلی: مطبع سید الاخبار، ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ع اشاعت اول، چوتھا باب ، ص ۲۲-۲۳

(۲) اختر دہلوی، مرزا محمد ؛ تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان"، لاہور: ملک سراج الدین اینڈ سنز، ۱۹۵۷ع ، ص ۳۵۱

(۳) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) ؛ تذکرہ علمائے ہند " از مولوی رحمان علی، کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۱ع ، ص ۸۸

مصطفی آباد (رام پور) میں پیدا ہوئے۔(۱) لیکن مجددیہ سلسلے کے ایک عالم و محقق ڈاکٹر غلام مصطفی خان صاحب کی تحقیق کے مطابق آپ کی تاریخ ولادت یکم ذی قعدہ ہے۔(۲) اور عنایتی تذکرہ بھی زیادہ قابل اعتبار ہے۔" حافظ و عالم و کامل ولی بادا" سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔

تعلیم کا آغاز رام پور سے ہوا اور تکمیل دہلی میں ہوئی۔ ان کے اساتذہ میں میاں سراج احمد بن شیخ محمد مرشد، مفتی شرف الدین رام پوری، قاری نسیم، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز اور شیخ کلو کے نام آتے ہیں۔(۳) محمد ایوب قادری نے شاہ محمد اسحاق کے تلامذہ میں بھی شاہ ابوسعید کا ذکر کیا ہے۔(۴) صاحب حدائق الحنفیہ کے مطابق مولانا سراج احمد اور شاہ عبدالعزیز سے علم فقہ و حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ مولوی عبدالقادر نے لکھا ہے " کہ سراج احمد سے حدیث کی سند لی"۔(۵) مولانا عبدالحئی نے " نزہتہ الخواطر" میں اور سید ذوالفقار احمد نے " ابجد العلوم" کے ایک حاشیے میں لکھا ہے " کہ انھوں نے مفتی شرف الدین رام پوری سے کتابیں پڑھیں اور بعض کتابیں شاہ رفیع الدین دہلوی سے پڑھیں اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے اجازہ عامہ حاصل کیا تھا اور طریقہ نقشبندیہ کی تحصیل شاہ غلام علی دہلوی سے کی تھی"۔(۶) مولوی رحمان علی

---

(۱) احمد ولی اللٰہی، سید: "یادگار دہلی"، (دہلی ...) ص ۸۹

(۲) غلام مصطفی خان، ڈاکٹر (مرتب): "ہدایت الطالبین و مرقاۃ السالکین" از شاہ ابوسعید دہلوی، کراچی: اعلا کتب خانہ، ۱۹۵۸ء، ص ۱

(۳) سرسید احمد خان: "آثار الصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۱
احمد ولی اللٰہی، سید: "یادگار دہلی"، محولہ بالا، ص ۸۹
اختر دہلوی، مرزا محمد: "تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان"، محولہ بالا، ص ۲۵۱
بشیر الدین احمد دہلوی: "واقعات دارالحکومت"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۹۳

(۴) ایوب قادری، محمد (مرتب): "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۳۰۹

(۵) ایوب قادری، محمد (مرتب): "علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)" از مولوی عبدالقادر، کراچی: پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۰ء، ج ۱، ص ۲۵۹

(۶) عبدالحئی، مولانا سید: "نزہتہ الخواطر"، کراچی: کارخانہ تجارت کتب، ۱۹۷۶ء، ج ۷، ص ۱۳-۱۳
صدیق حسن خان، نواب: "ابجد العلوم"، بھوپال: مطبع صدیقی، الجزء الثالث، ص ۲۳۹

کے بیان کے مطابق بھی مولانا شاہ عبد العزیز سے اجازہ عامہ حاصل کیا تھا۔ قاری نسیم سے فن تجوید پڑھا تھا اور شیخ کلو کی خدمت میں خط نسخ کی مشق کی تھی ۔(١)

ان کے مشائخ طریقت میں ان کے والد، حضرت مولانا شاہ فیض الحسن المعروف بہ شاہ درگاھی اور حضرت شاہ غلام علی کے اسمائے گرامی نظر آتے ھیں ۔ "حدائق الحنفیہ" کے مطابق پہلے اپنے والد ماجد سے کمالات باطنی حاصل کیے ۔ پھر حضرت شاہ درگاھی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت ھوئے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد ان کی خاندانی نسبت مجددیہ نے زور کیا اور ١٢٢٥ھ/ ١٨١٠ع میں دھلی پہنچ کر حضرت شاہ غلام علی سے نقشبندی مجددی کے سلسلے میں بیعت کا شرف حاصل کیا اور آپ کے خلیفہ مجاز قرار پائے ۔(٢) شاہ ابوسعید کو حضرت شاہ غلام علی کا خلیفہ اول ھونے کا شرف حاصل ھے۔(٣) والد ماجد سے اکتساب فیض باطنی کے سوا آخر الذکر دو بزرگوں سے بیعت و خلافت کا ذکر سرسید، سید احمد ولی اللھی اور بشیرالدین نے بھی کیا ھے ۔(٤)

سرسید نے ان کی نسبی شرافت اور علوِ مرتبہ کے علاوہ ان کے علمی و عملی محاسن

---

(١) ایوب قادری، محمد (مرتب): "تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ٧٥
ایوب قادری، محمد (مرتب): علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)"، محولہ بالا، ج ١، ص ٢٥٩
فقیر محمد جہلمی، مولوی: "حدائق الحنفیہ"، لکھنو: مطبع نول کشور، ١٩٠٦ع، ص ٤٧١
محمد حسن نقشبندی مجددی، مولوی: "مشائخ نقشبندیہ"، لاھور: اللہ والے کی قومی دکان، س ن، (اشاعت پنجم)، ص ٣٣١

(٢) فقیر محمد، "حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ٤٧١
عبد الحئی، مولانا سید: "نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ٧، ص ١٣

(٣) اختر دھلوی، مزرا محمد: "تذکرہ اولیائے ھند و پاکستان"، محولہ بالا، ص ٣٥١
ایوب قادری، محمد (مرتب): "تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ٧٥
غلام مصطفی خان، ڈاکٹر (مرتب): "ھدایت الطالبین وبرکۃ السالکین"، محولہ بالا، ص ٢
روف احمد مجددی، شاہ (مرتب): "مکاتیب شریفہ"، از غلام علی شاہ مجددی، استانبول (ترکی): ١٩٧٦ع، ص ١

(٤) سرسید احمد خان: "آثارالصنادید" محولہ بالا، چوتھا باب، ص ١٦
احمد ولی اللھی، "یادگار دھلی"، محولہ بالا، ص ٨٩
بشیرالدین احمد دھلوی: "واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا، ج ٢، صص ٩٢-٩٣

اور کمالات سیرت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :

" صفات ذاتی اور کمالات ظاہری اور باطنی ایسے تھے کہ جن کا کچھ حد و حساب نہیں۔ حافظ کلام اللہ اور عاشق رسول اللہ علوم دینی آپ کو مستحضر تھے اور تمام دن رات انہیں کے درس میں گزارتے تھے۔ علم قرأت میں یکتائے روزگار تھے۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور کمال قرأت سے پڑھتے کہ لوگ دور دور سے سننے آتے تھے۔" (۱)

سرسید نے آپ کی سیرت و سمائل پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ شکل و شمائل نورانی اور شخصیت پرکشش تھی ۔ تعلقات زن و فرزند کے باوجود باہمہ و بے ہمہ سے بھی کچھ زیادہ قدم رکھا تھا۔ اتباع سنت نبویؐ بدرجہ کمال تھا ، تواضع ، سخاوت اور اخلاق محمدیؐ کا نمونہ تھے ۔ قرآن مجید لکھ لکھ کر وقف کیا کرتے تھے۔ شاہ غلام علی ان پر فخر کرتے تھے ۔ (۲)

درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت کے علاوہ سید احمد شہید کی تحریک" اصلاح و جہاد" میں بھی آپ نے حصہ لیا جہاں چہ ۱۸۱۸ع کے اواخر میں پچاس افراد کا جو قافلہ سید احمد شہید کی سربراہی میں جو قافلہ دعوت اصلاح و ارشاد کے نکلا تھا اس پر مولانا عبدالحئی اور شاہ اسمعیل کے علاوہ نمایاں افراد میں شاہ ابوسعید بھی تھے اس قافلے نے تقریباً چار ماہ تک غازی آباد ، مرادنگر ، میرٹھ ، سردھنہ ، بڑھانہ ، پھلت ، مظفر نگر ، دیوبند ، سہارن پور ، رام پور ، بریلی ، شاہ جہان پور کا دورہ کیا تھا۔ (۳)

شاہ غلام علی کے انتقال (۲۲ صفر ، ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ع) کے بعد آپ نے مسند ارشاد و

---

(۱) سرسید احمد خاں،" آثار الصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۱۵

(۲) ایضاً، چوتھا باب ، ص ۱۶

(۳) محمد میاں، مولانا ، " علمائے ہند کا شان دار ماضی"، دھلی : الجمعیۃ ۱۹۵۷ع ج دوم، ص ۲-۱۰۱

ہدایت کو رونق بخشی- ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۳ء میں اپنے بڑے صاحب زادے مولانا احمد سعید کو اپنا جانشین مقرر کیا اور منجھلے صاحب زادے شاہ عبدالغنی کو ساتھ لے کر سفر حج اختیار کیا۔ اس سفر کے موقع پر تین مہینے مکہ معظمہ میں قیام کیا اور وہاں کے اکابر سے شیخ عبداللہ سراج ، شیخ عمر مفتی شافعیہ ، سید عبداللہ وغیرہ سے ملاقاتیں کیں- پھر آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے - حج سے فراغت کے بعد محرم ، ۱۲۵۰ء میں آپ بیمار ہوگئے- واپسی میں ۲۲ رمضان کو ٹونک پہنچے - آپ کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی حتی کہ ٹھیک عیدالفطر کے روز یکم شوال ، ۱۲۵۰ھ/۳۱ جنوری، ۱۸۳۵ء بروز شنبہ آپ نے انتقال فرمایا-(۱) مادہ تاریخ وفات یہ ہے :

" ستون محکم دین متین فتادہ زپا" (۲)

آپ کے صاحب زادے مولانا شاہ عبدالغنی آپ کے ساتھ تھے آپ نے انھیں اتباع سنت اور اہل دنیا سے پرہیز کی وصیت کی اور فرمایا" کہ اگر دنیا داروں کے پاس جاؤ گے تو ذلیل ہوگے ورنہ دنیا دار کتوں کی طرح تمہارے دروازے پر لوٹیں گے -"

شاہ عبدالغنی آپ کی نعش کے صندوق میں بند کرکے چالیس روز کے بعد دہلی لے آئے اور خانقاہ شاہ غلام علی میں شاہ غلام علی اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے پہلو دفن کئے گئے۔ (۳)

---

(۱) ایوب قادری، محمد (مرتب) " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۷۵
ایوب قادری، محمد (مرتب) "علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) " محولہبالا ج۱ ، ص۲۵۹
فقیر محمد ، " حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا ، ص ۴۷۱
محمدحسن نقشبندی مجددی " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا ، صص ۳۵-۳۳۳

(۲) ابوسعیدمجددی دہلوی ، " ہدایت الطالبین و مرآۃ السالکین"،محولہ بالا ، ص۲

(۳) فقیر محمد ، " حدائق الحنفیہ "، محولہ بالا ، ص ۴۷۲
عبدالحئی، مولانا سید " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۱۳
محمد حسن نقشبندی " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ "، محولہ بالا ، ص ۳۳۵

" ھدایۃ الطالبین و مرآۃ السالکین" ، " رفیق الطلاب" وغیرہ آپ کی تصنیفات سے یادگار ھیں۔(۱) اول الذکر سلوک کے اسرار اور صحبت کے واردات نقلی کر دیا ان میں ھے - جسے ڈاکٹر مولانا غلام مصطفی خاں صاحب نے ترجمہ و مرتب کرکے مختصر و مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کردیا ھے - اس کے آخر میں شاہ غلام علی کا ایک مختصر رسالہ " معارف و علوم مجددیہ" بھی شامل کردیا ھے - (۲) آپ نے ایک رسالے میں جملہ سلوک مجددیہ کو بھی مرتب فرمادیا ھے - مولوی محمد حسن نقشبندیہ مجددی لکھتے ھیں کہ انھوں نے شاہ غلام علی صاحب سے از ابتدا تا انتہا جملہ سلوک مجددیہ بکمال تفصیل حاصل کیا - چناں چہ اس کے بیان میں ایک رسالہ بھی تحریر فرماکر حضرت شاہ (غلام علی) صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور حضرت شاہ صاحب نے اس کو نہایت پسند فرماکر چند سطریں اس کی تعریف میں تحریر فرمائیں -

آپ کی اولاد میں مولانا شاہ احمد سعید مجددی دھلوی اور مولانا شاہ عبدالغنی مجددی دھلوی اور شاہ عبدالمغنی تین صاحب زادے تھے اور تینوں نہایت نامور ھوئے - سرسید نے اول الذکر کا ترجمہ بھی نہایت عقیدت اور کمال ارادت کے ساتھ لکھا ھے - شاہ عبدالمغنی حافظ تھے اور فقہ و حدیث سے بھی انھیں مناسبت تھی۔۱۲ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ میں مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ھوا۔(۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ھے کہ شاہ ابوسعید کے چار فرزند تھے - (۵) انھوں نے نہ ماخذ کا حوالہ دیا ھے نہ تفصیل لکھی ھے۔

---

(۱) ایوب قادری ، محمد (مرتب) ،" تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا ، ص ۷۵

(۲) ابوسعید مجددی دھلوی ،" ھدایت الطالبین و مرآۃ السالکین"، محولہ بالا ، ص ۲۶-۱۲۰

(۳) محمد حسن نقشبندی ، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ "، محولہ بالا ، ص ۳۳۲

(۴) ایضاً ، ص ۳۸-۳۳۷

(۵) خلیق احمد نظامی ، پروفیسر ، " تاریخی مقالات"،

پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی چار فرزند بتائے ھیں اور ان کے نام مذکرۃ الصدر دو ابنائے گرامی کے علاوہ شاہ عبدالرشید اور شاہ محمد عمر لکھے ھیں۔(١) لیکن پروفیسر موصوف کو اس باب میں تسامح ھوا ۔ صاحب "مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" کی تصریح و تفصیل کے مطابق آخر الذکر دونوں اصحاب مولانا احمد سعید کے بیٹے تھے۔ وہ لکھتے ھیں :

" حضرت شاہ عبدالرشید فرزند اکبر حضرت شاہ احمد سعید کے تھے۔"(٢)

اور آگے چل کر لکھتے ھیں :

" حضرت شاہ محمد عمر صاحب فرزند ثالث حضرت شاہ احمد سعید کے تھے۔"(٣)

صاحب " یادگار دھلی" کا بھی یہی بیان ھے ۔(٤) عبدالرشید کو محمد ایوب قادری صاحب نے خود بھی دوسری جگہ احمد سعید کا بیٹا لکھا ھے جس سے مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی نے استفادہ کیا تھا۔ (٥)

سرسید نے شاہ ابوسعید کا ترجمہ مفصل اور نہایت جامع لکھا ھے جو شخصیت اور خدمات و محاسن سیرت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ھے ۔ اس میں ان سے صرف ایک تسامح ھوا ھے اور شاید یہ بھی کتابت کی غلطی ھو ۔ سرسید نے شاہ ابوسعید کے والد کا نام صفی اللہ لکھا ھے ۔ (٦) حالانکہ صحیح نام صفی القدر ابن عزیز القدر ھے۔(٧)

---

(١) ایوب قادری، محمد (مرتب) " تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ٧٥
ایوب قادری، محمد (مرتب) " علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) " محولہ بالا، ص ٢٥٦
(٢) محمد حسن نقشبندی " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا، ص ٣٥٥
(٣) ایضاً، ص ٣٦٠
(٤) احمد ولی اللّٰهی، سید " یادگار دھلی"، محولہ بالا، ص ٩٠
(٥) ایوب قادری، محمد (مرتب) " تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ٢٨٣
(٦) سرسید احمد خان " آثار الصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ١٥
عبدالحئی، مولانا سید " نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ٧، ص ١٣
(٧) ظہور محمد، " حدائق الحنفیۃ"، محولہ بالا، ص ٣٧١
انوارالحسن شیرکوٹی " انوار قاسمی"، لاھور : ادارہ سعدیہ مجددیہ، ١٩٦٩ء، حصہ ، ص ١٠٩
ایوب قادری، محمد (مرتب) " تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ٧٥

اور مولانا عبدالحئی نے صرف صفی بن عزیز لکھا ہے ۔(۱) مولانا ابوسعید بلا شبہ مشائخ نقشبندیہ کی ایک بزرگ ہستی تھے ۔ اسی لیے سرسید نے ان کا ذکر مشائخ میں کیا ہے۔ مولانا عبدالحئی نے بھی ان کے علو شخصیت کا اعتراف کیا ہے لیکن وہ ایک بڑے عالم دین، بلند پایہ فقیہ اور محدث اور صاحب درس و تدریس بھی تھے۔(۲) اس لیے ہم نے انہیں علمائے دین میں شامل کیا ہے ۔

سرسید کو آپ کی تحریر ہم دست نہیں ہوسکی تھی اس لیے "آثارالصنادید" میں آپ کا ترجمہ اس اہتمام سے خالی رہا۔ ہم نے آپ کی کتاب "ہدایت الطالبین و مرقاۃ السالکین" کی تمہیدی سطریں درج کردی ہیں :

"بعداز حمد و صلوۃ کمینۂ درویشان بلکہ ننگ و عار ایشان ابوسعید مجددی نسباً و طریقۃً عفی عنہ وکان اللہ لہ عوضاً عن کل شئی واضح می نماید کہ بعضے یاران طریقت کہ للہ فی اللہ جلیس صحبت بودند متصدع گردیدند کہ انچہ درراہ سلوک از اسرار و واردات برتو وارد شدہ اند و بتوجہ مشائخ کرام درین راہ کشفاً و وجداناً دریافتہ و از کار و مراقبات کہ در ہر مقام بعمل آوردہ برائے ما بنویس کہ آن را سند خود دانستہ موافق آن معمول خود سازیم فقیر گفت کہ مکتوبات قدسی آیات حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی و کلام فرزندان آن حضرت کہ بہ تفصیل تمام از مسائل و اسرار و از جمیع اقسام مستغنی فرمائے ہر خاص و عام است و ہم چنین باوجود اختصار و ایجاز رسائل قطب الاقطاب حضرت پیر دستگیر ما کہ در نصائح و بیان طریقہ تحریر یافتہ برائے طالبان راہ یقین کافی اند۔ بندہ را باین ہمہ عدم لیاقت کہ حاصل روزگار خود دارد دربیان این راہ چیزے نگاہداشتن تحصیل حاصل است ۔ چون کہ مخلصان را باین کمترین حسن ظن بود ہرگز از سوال خود ہا باز نماندند و گفتند ہرکے راہ کہ بوقت رخصت از مشائخ خود تبرکے عنایت می شود تاکہ باوطان خود

---

(۱) عبدالحئی ، مولانا سید، "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۱۳

(۲) ایضاً، ج ۷، ص ۱۳

باز گردد۔ باعث تحریر ترا تبرک خودی سازیم ۔ هرچند از باعث عدم فرصت به لیت و لعل پرداختم لیکن از سوال ایشان چاره نداشتم ۔ چیزی که از اتفاقات زمانه وارد بنده لکھنو گردیدم فی الجمله فرصتے دست داد ۔ لهذا باوجود نا اهلی خود از اجابت مسئول چاره ندیدم و آنچه درین راه بتوجه پیران کبار برین خاکسار ورود یافته بود اظهاراً للشکر مامور به است تحریر نموده لیکن باید دانست که آنچه درین رساله تحریر یافته از واردات و کشوف خود که از فضل الٰهی و توجه پیر دستگیر . . . . . لیط ذره بی مقدار را عنایت گردیده قلمی می گردد۔ مگر در بعضے جاها که تفصیلے و تطویل کرده ام از معلومات و مسموعات نیز تحریر یافته است از تقلید صرف و ازیافته علمی و محض دفهمند گزگ۔ و کفی بالله شهیدا و هو حسبی و نعم الوکیل۔"

====xxxx====

سید احمد شہید بریلوی قدس سرہ :

* جناب ہدایت انتساب زبدہ واصلان درگاہ سید احمد صاحب (طالب ثراہ وجعل الجنتہ مثواہ) سادات عظام اور مشائخ کرام سے تھے موطن اصلی آپ کا بریلی ۔ اوائل حال میں شوق طالب علمی میں وطن سے وارد شاہجہان آباد ہوکر حضرت بابرکت مولانا عبدالقادر علیہ الرحمتہ کی خدمت سراسر افادات میں خاص ہوکر مسجد اکبر آبادی میں فروکش ہوئے ۔ اور صرف و نحو میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ از بس کہ ذوق درویشی اور مسکینی طبیعت میں بڑی ہوئی تھی۔ اکثر خدمت مسجد اور اس مقام کے واردین خصوصاً درویشان پاک طینت کی ، جو دور دراز سے تحصیل علم باطنی کے شوق میں جناب مولانا عبدالقادر صاحب مغفور موصوف کی خدمت میں حاضر رہتے، خاطر داری اور سرانجام مہام میں ایسے بدل سرگرم ہوتے تھا اس امر کو اہم مہام سمجھے ہوئے تھے ۔ اور اس زمانے میں بھی اپنی اوقات کو طاعات و عبادات میں ایسا معروف کیا تھا کہ جو لوگ صرف اس امر کے واسطے کنج نشین اور گوشہ گزین تھے ان سے بھی اس طرح خاطر مجموع اور

حضور قلب سے ظہور میں نہ آتے تھے ۔ اکثر مولانائے مذکور رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس بزرگ کے احوال سے آثار کمال ظاہر ہوتے ہیں اور مادہ اس سعادت مند کا ترقی مدارج علیا قابل نظر آتا ہے ۔ اسی اثنا میں سرگروہ علمائے امام ، اسوۂ بلغائے عظام ، جامع کمالات صوری و معنوی ، خادم حدیث شریف نبوی ، مولانا و بالفضل اولانا مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی علیہ الرحمتہ سے بیعت کا ارادہ کیا ۔ جب ان کی خدمت میں گئے ، مولانائے ممدوح نےچونکہ ان کے حالات سے واقف تھے ، فرمایا کہ حق جل و علا نے اس صاف باطن کو اختیار طریقۂ رشد و ہدایات کے باب میں واسطے کا محتاج نہیں رکھا اور وسیلہ کا نیازمند نہیں کیا ۔ لیکن اہل ظاہر کے نزدیک ہر چیز کے لیے ایک سبب ضروری ہے ، رفع حجت کے واسطے کچھ مضائقہ نہیں ۔ پھر آپ نے مولانائے موصوف سے بیعت کے بعد چند مدّت کے سفر اختیار کیا اور اطراف و جوانب میں خدا شناسان پاک باطن سے فیض حاصل کرنے میں سرگرم رہے ۔ از بسکہ مقامات عالی روز بروز کھلتے جاتے تھے اور مراتب علیا آناً فاناً ترقی میں تھے ، اس دولت بے زوال سے اہل ظاہر کو آگاہی ہوچکی اور ہر طرف سے لوگوں نے ہجوم کیا اور کسی نے بیعت اور کسی نے روائے حاجات سے سوال کرنا شروع کیا ۔ چوں کہ اخفائے حال اور ستر احوال منظور تھا ۔ خیال میں یہ آیا کہ اگر اہل دنیا کے لباس سے ملبس ہوکر علم باطنی کی تحصیل اور تکمیل کی جائے تو یہ ہجوم عوام کا جمعیت اوقات میں خلل انداز نہ ہوگا ۔ اس خیال سے ٹونک کی طرف تشریف لے گئے اور نواب امیر خاں کی رفاقت میں بسرکی ۔ اور از بسکہ شجاعت اور جواں مردی سادات صحیح النسب کا جوہر ہے ، اس اثنا میں تردداتِ عظیمہ آپ سے ظہور میں آئے اور باوجود تلاش اہل باطن کی روز و شب پیش نہاد تھی اور اکثروں کو ہدایت کی راہ بھی آپ سے حاصل ہوئی ۔ جب اس عرصے میں جمیع مراتب

کی تکمیل ہوگئی آپ ترک دنیا کرکر پھر شاہجہان آباد میں تشریف لائے اور مسجد اکبرآبادی میں وارد ہوئے ۔ اس اثنا میں مولانا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوچکا تھا ۔ اور مولوی محمد اسمعیل رحمۃ اللہ علیہ قائم مقام علوم رسمی کے درس و تدریس میں مصروف تھے اور اہل باطن کی طرف چنداں ملتفت نہ ہوتے تھے ۔ جب اس دفعہ آپ کے تشریف لانے سے مردم شہر میں ایک غلغلہ پڑگیا تھا اور طالب فیض باطن کے کثرت سے ہجوم کرنے لگے ۔ ایک بار مولوی صاحب موصوف نے بہ اتفاق مولوی عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ کے آپ کی خدمت میں جاکر عرض کیا کہ ہم کو نماز حضور قلب سے کبھی میسر نہیں ہوئی ، اگر آپ کی ہدایت سے یہ امر حاصل ہوجائے تو عین مدعا ہے ۔ حضرت نے کشف باطن سے معلوم کیا کہ یہ بطریق امتحان اس طرح سے کہتے ہیں ۔ تبسم کیا اور فرمایا کہ مولانا آج شب کو اس حجرے میں تشریف لاؤ شاید یہ بات ظہور میں آجائے ۔ ان کو زیادہ استعجاب ہوا اور شب کو دونوں صاحب تشریف لے گئے اور آپ نے اپنے ساتھ ان کو نماز میں کھڑا کیا اور جب نماز پڑھوا چکے ، فرمایا کہ اب جدا جدا نیت باندھ کر دو دو رکعت علاحدہ پڑھو ۔ یہ جب کھڑے ہوئے تو اس طرح کا استغراق ہوا کہ ان دونوں صاحبوں کو انھیں دو رکعت میں شب بسر ہوگئی ۔ جب یہ فیض باطن مشاہدہ کیا ، صبح کو دونوں صاحبوں نے بیعت کی اور یہاں آپ کی کفش برداری میں حاضر رہے کہ آپ کی کفش برداری کو فخر سمجھتے تھے ۔ چند روز کے بعد آپ نے فرمایا کہ مولانا مشیت الٰہی میں یہ ہے کہ تم کو تکمیل اس علم کی اور تفہیم ان مراتب کی سفر میں حاصل ہو ، ان کو ہمراہ لے کر مکہ معظمہ کا سفر کیا اور راہ میں قریب ہزار آدمی کے اپنے ہمراہ لے کر اور ان کے مایحتاج کے کفیل ہوکر حج ادا کیا اور وہاں سے پھر ہندستان کی طرف تشریف لائے ۔ اور آپ جو ترویج رسوم شرعیہ اور امر بالمعروف بہت کرتے ، منہیات کا رواج ان کے قدم کی برکت سے اکثر اطراف سے اٹھ گیا ۔ طرفہ

یہ ہے کہ شہر کلکتہ میں جب تک آپ نے تشریف رکھی شراب مطلق نہ بکنے پائی اور کلال خانہ بند رہا اور اس نواح میں آپ کے مریدوں کی کثرت لکھوک سے گزر گئی اور آپ کے اکثر خلفا کو قطب اور اوتاد کا مرتبہ حاصل ہوا۔ اور جو کہ ازروئے کشف باطن کے معلوم ہوگیا تھا کہ آپ کو مع اکثر مریدین پاک اعتقاد کے سعادت شہادت حاصل ہونے والی ہے۔ مولانا اسمعیل اور مولانا عبدالحئی کو اجازت ہوئی کہ اطراف ہندستان میں وعظ کہو اور بیشتر جہاد اور فضیلت شہادت بیان کرو۔ ہرچند یہ اس کا منشا نہ جانتے تھے اور نہ پی نہ لے گئے کہ اس ارشاد کا سبب کیا ہے ۔ لیکن جو کہ مرید با اخلاص تھے سرمو تجاوز نہ کیا اور فرمان بجالائے ۔ ان کے وعظ سے لکھو کھا مردم شاہ راہ ہدایت پر آئے ۔ اور شوق ماھوالحق دل میں جم گیا تھا اور جہادکی افضلیت ذہنوں میں بیٹھ گئی اور خود بخود چاہنے لگے کہ اگر جان و مال راہ الٰہی میں صرف ہو تو عین سعادت ہے ۔ بعد مدت کے ان بزرگوں کو حضرت نے لکھا کہ اب ہمارے پاس چلے آؤ ۔ یہ تو جان نثار تھے تک بہ مجرد حکم کے مشتاقین وعظ کو نیم جان چھوڑ کر خدمت بابرکت میں راہی ہوئے اور حضرت ان کو ہم راہ لے کر کوہستان کو چلے گئے اور یہ ہنوز اس کے منشا سے واقف نہیں۔ جب پنجتار میں وارد ہوئے قوم افغان باآن کہ جوش سے کم نہیں ، حضرت کے ایسے معتقد ہوئے کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت امامت کی اور عہدکیا کہ اگر حضرت جہاد کریں تو ہم سرفروشی کو حاضر ہیں۔ آپ کے سکھوں کی قوم پر جہاد قائم کیا ۔ مردم ہندوستان اس خبر کے سننے سے اطراف و جوانب سے راہی ہوئے اور سوائے قوم افاغنہ کے مردم ہندوستانی لاکھ آدمی کے قریب جمع ہوئے اور خطبہ آپ کے نام کا پڑھا گیا ، دور دور امام ہوگیا۔ چند منزل تک عشر جو طریقۂ اسلام میں ایک نوع خراج کی ہے آپ کے پاس آنے لگا۔ پشاور اور بعض اور مکان سکھ کی عمل داری سے نکل کر غازیان اسلام کے تصرف میں آگئے ۔ سکھوں کے باوجود اس شوکت و شان ظاہری کے آپ کا ایسا رعب دل میں بیٹھ گیا کہ

کچھ ملک دینے پر راضی ہوئے سچ ہے - ع

" ہیبت حق است ایں از خلق نیست "

لیکن حضرت کو جو کہ ترویج اسلام منظور تھی قبول نہ کیا۔ کئی سال تک یہی سلسلہ ونہیں چلا گیا۔ اور مولانا مولوی عبدالحئی علیہ لرحمتہ نے بیماری بدنی سے سفر آخرت اختیار کیا۔ بعد اس کے جو کہ قوم افاغنہ بندہ زر اور نہایت طامع ہیں، سکھوں کے اغرا سے آپ سے منحرف ہوگئے اور عین معرکہ جنگ میں آپ سے دغاکی - از بسکہ مشیت الہی میں دولت شہادت آپ کے نصیب میں تھی، قریب بالا کوٹ کے حضرت نے مع مولوی محمد اسمعیل اور اکثر مومنین صادق اعتقاد کرشہادت پائی - انا للہ و انا الیہ راجعون۔ حضرت کی شہادت کو چودہ پندرہ برس کا عرصہ گزرتا ہے - " (۱)

تعلیقات :

سید احمد شہید ۶ صفر، ۱۲۰۱ھ/۲۹ نومبر، ۱۷۸۶ع کو بعد کے روز رائے بریلی (اودھ) میں پیدا ہوئے - والد کا نام سید محمد عرفان تھا۔ سلسلہ نسب ۳۵ واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ سے جا ملتا ہے - ددھیال اور ننھیال دونوں ذی علم خاندان تھے۔ چار برس چار ماہ اور چار دن کی عمر ہوئی تو روایت کے مطابق مکتب میں پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا لیکن جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ ذوق ان میں نہیں ہے - تین برس تک برابر مکتب میں جاتے رہے لیکن قرآن مجید کی چند سورتیں حفظ کرسکے اور مفردحروف ~~مو...~~ کے سوا کچھ لکھنا نہ آیا۔ مرزا حیرت دہلوی نے لکھا ہے کہ قرآن مجید عمدہ طور پر

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید "، محولہ بالا، اشاعت اول، چوتھا باب، ص ۲۸-۳۳

(۲) مہر، مولانا غلام رسول، " سید احمد شہید "، لاہور، کتاب منزل، ۱۹۵۲ع، حصہ اول، ص ۵۲-۵۷

پڑھ لیا اور یہ نسبت اور بچوں کے اسے یاد بھی خوب تھا۔ غالباً یہ بات دائرہ قرآن مجید پڑھ لینے کے بارے میں ہے جب حفظ کرنے کی نوبت آئی تو اس میں کامیابی نہ ہوئی - مرزا حیرت کے بقول " کریما کا پہلا شعر تین دن میں یاد ہوا تھا۔" (۱) بھائیوں نے لگا سے ان کی عدم توجہی پر محمول کیا اور انہیں تنبیہہ کی لیکن والد ماجد نے فرمایا کہ میاں ان کو خدا پر چھوڑ دو جو ان کے حق میں بہتر سمجھے گا کرے گا۔ ہماری تاکید کا کچھ فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ (۲) چنداں چہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا کیونکہ ممکن ہے کچھ کامیابی حاصل کی ہو لیکن ان کی طبیعت کا رجحان دوسرا تھا وہ محلے کے ضعیفوں ، اپاہجوں ، بیواؤں اور پڑوسیوں کے گھروں پر جاتے اور ان کی ضروریات معلوم کرکے ان کی خدمت بجا لاتے - ان کے گھروں میں پانی بھرنا ، بازار سے سودا سلف لانا ، حتی کہ ان کے لیے جنگل سے لکڑیاں کاٹنا باندھ کر سر پر اٹھا لانے میں بھی کوئی عار نہ تھا۔ کھیلوں میں انہیں مردانہ اور سپاہیانہ کھیل پسند تھے - جہاد کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ کھیل میں بھی دو گروہ بنا لیتے ایک گروہ دوسرے پر حملے کرتا اور ان کے فرضی قلعے فتح کرتا - تیرنے اور پانی میں کھڑے ہونے کی مشق بہم پہنچائی تھی - ورزش کا شوق تھا۔ صحت اچھی تھی

تیرہ سال کی عمر تھی والد ماجد نے سفر آخرت اختیار کیا - غالباً اس کے بعد لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ گیا۔ ۱۷، ۱۸ برس کی عمر میں اپنے سات عزیزوں کے ساتھ لکھنؤ کا سفر اختیار کیا۔ عزیزوں کا مقصد تلاش معاش تھا۔ لیکن سید صاحب کے مقصد سفر کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مشکلات اور بے روزگاری کے زمانے میں انہیں سمجھاتے تھے کہ عزیزو! اس تلاش و جستجو اس تکلیف و مصیبت کے باوجود تمہیں دنیا نہیں ملتی۔

---

(۱) حیرت دہلوی ، مرزا ، "حیات طیبہ" ، لاہور : مکتبہ السلام ، ۱۹۵۸ء ، ص ۳۸۲

(۲) ابوالحسن علی ندوی ، "سیرت سید احمد شہید" ، ج اول ، ص ۷۹

ایسی دنیا پر خاک ڈالو اور میرے ساتھ دہلی چلو اور شاہ عبدالعزیز صاحب کا وجود غنیمت سمجھو" لیکن عزیزوں نے تو توجہ نہ دی ۔ سات آٹھ مہینے اس حیص بیص میں نکل گئے ۔ بلآخر ایک روز اپنے ساتھیوں سے کہہ کہے سنے بغیر تن تنہا اگلے سفر پر روانہ ہوگئے اور شدائد و مصائب جھیلتے ہوئے دہلی پہنچ گئے اور شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ شاہ صاحب ان کے دادا اور چچا سے واقف تھے ، خاندان کا حال معلوم ہوا تو نہایت عزت و توقیر سے پیش آئے ۔ شاہ صاحب نے مقصد سفر دریافت فرمایا تو عرض کیا کہ آپ کی ذات مبارک کو غنیمت سمجھ کر اللہ تعالی جل شانہ کی طلب میں پہنچا ہوں ، شاہ صاحب نے انہیں اپنے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر کی خدمت میں اکبر آبادی مسجد میں جہاں وہ درس دیتے تھے بھیج دیا۔

سید صاحب نے اکبرآبادی مسجد کے ایک حجرے میں سکونت اختیار کی اور شاہ عبدالقادر سے عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھنے لگے ۔ (۱) امیر شاہ خان اپنے استاد میاں جی محمدی کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ میں نے مولانا محمد اسحق صاحب سے کافیہ شروع کیاتھا اور سید صاحب جب تشریف لائے تو انھوں نے شاہ اسحاق صاحب سے میزان شروع کی تھی اور اتنی جلدی ترقی کی کہ صفت سے آگے مجھے کافیہ میں پکڑ لیا اور کافیہ ہی پڑھتے ہوئے انھوں نے مشکوۃ بھی شاہ صاحب سے شروع کردی اور کوئی کتاب مطبی اسمعیل صاحب سے بھی پڑھتے تھے ۔ (۲) لیکن یہ روایت چنداں درست معلوم نہیں ہوتی۔

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول "سید احمد شہید"، محولہ بالا ، حصہ اول ، ص ۷۳

(۲) اشرف علی تھانوی، مولانا "ارواح ثلاثہ"، لاہور: اسلامی اکادمی، ۱۹۷۶ء، ص ۳۶-۱۳۵

اس لیے کہ شاہ اسحاق نے ۱۸۰۸ء میں تکمیل کی اور اس کے معاً بعد تدریس کا آغاز کیا۔(۱) اس وقت سید صاحب فراغت کے بعد رائے بریلی جاچکے تھے نیز اس روایت سے سید صاحب کی ذہانت ان کے بہترین طالب علم ہونے اور درسیات سے ان کی دل چسپی کا جو نقش جمیل سامنے آتا ہے وہ مسلم نہیں ہے ۔ شاہ اسمعیل سے استفادہ کا ذکر کریم الدین پانی پتی نے بھی کیا ہے ۔ (۲) مرزا حیرت دہلوی نے لکھا ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے بطور خاص انھیں خود تخلیے میں پڑھانا شروع کیا تھا۔ (۳) شاہ عبدالعزیز سے " بعض کتابیں" پڑھنے کا مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی ذکر کیا ہے (۴) اور مولانا عبیداللہ سندھی بھی سید صاحب کے شاہ صاحب سے تلمذ کے قائل ہیں۔(۵) جب کچھ عرصے اور تجربے کے بعد اندازہ ہوا کہ درسیات کی طرف ان کی توجہ کم ہے زیادہ اور انھیں قبول نہیں کرتا تو شاہ عبدالعزیز نے انھیں قرآن و حدیث کے درس و تدریس کے وقت موجود رہنے اور سماعت کا حکم فرمایا۔ چناں چہ اس طرح ان کو جس قدر شرعی علوم کی ضرورت تھی انھوں نے حاصل کرلیے ۔ بقول مرزا حیرت " آپ کو اکثر حدیثیں اور قرآن کا بہت سا حصہ نوک زبان ہوگیا۔" شاہ عبدالعزیز ان کی اس کام یابی سے بہت خوش ہوئے اور سید کا قرآن و حدیثی مطالب کا یہ مذاق دیکھ کر پھولے نہ سمائے اور کہنے لگے الحمد للہ تمھیں یہاں آنے سے اس قدر تو فائدہ ہوا کہ آج تم اپنے ہم وطنوں میں یہ آزادی

---

(۱) محمود احمد برکاتی، حکیم، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، لاہور: مجلس اشاعت اسلام مرکز ، ۱۹۷۶ء ، ص: ۱۶۷

(۲) کریم الدین پانی پتی، " طبقات الشعرائے ہند"، دہلی: جامع العلوم مدرسہ دہلی، ۱۸۳۸ء ، ص: ۲۹۵

(۳) حیرت دہلوی، مرزا، " حیات طیبہ"، محولہ بالا ، صص: ۳-۵۰۲

(۴) ابوالحسن علی ندوی، " سیرت سید احمد شہید" محولہ بالا ، ج اول ، ص ۹۳

(۵) عبیداللہ سندھی، مولانا، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک "، لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی، ۱۹۵۲ء ، صص: ۱۱-۲۱۰

پند و نصائح کرسکتے ہو۔ مرزا حیرت کے بقول سید صاحب قرآن و تفسیر و حدیث کے بہت سے حصے سے واقف ہوچکے تھے اور صدہا حدیثیں اور ان کا مقصد نوک زبان ہوگیا تھا۔(۱) " ارواح ثلاثہ" میں مولوی عبدالقیوم ابن مولانا عبدالحئی کی روایت بیان کی گئی ہے کہ سید صاحب نے شاہ اسمعیل سے بھی پڑھا تھا۔ (۲) سید صاحب کی تعلیم کے معیار کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ سید صاحب نے اگرچہ درسیات کی تکمیل نہیں کی لیکن آپ کو دینی علوم سے ضروری واقفیت ہوگئی تھی ۔ قرآن مجید تو آپ نے خاص طور سے پڑھا۔ ترجمان قرآن شاہ عبدالقادر کی توجہ اور صحبت نے اس کو جلا دی۔(۳) لیکن یہ سمجھنا کسی طرح درست نہیں کہ سید صاحب ناقص التعلیم تھے ۔ اس لیے کہ انہوں نے درسیات کی تکمیل نہیں کی تھی۔ یہ بات ثابت ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے انہیں قرآن و حدیث کے درس میں حاضری اور سماعت کی اجازت دی تھی۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے " سماعت " کو باقاعدہ ایک طریقہ تعلیم تسلیم کیا ہے اور اس لیے انہوں نے سید صاحب کو باقاعدہ عالم دین مانا ہے ۔ (۴) دھلی میں تعلیم کی مدت ایک ڈیڑھ سال سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی لیکن مولانا غلام رسول مہر نے انہیں بالغ نظر عالم د تسلیم کیا ہے ۔ (۵) دھلی کے اسی قیام کے زمانے میں سید صاحب نے شاہ عبدالعزیز سے بیعت بھی کرلی تھی۔

مرزا حیرت دھلوی کی تحقیق کے مطابق سید صاحب ربیع الاول ۱۲۲۱ھ میں اور ابوالحسن علی ندوی کی تحقیق کے مطابق ۱۲۲۲ھ میں دھلی پہنچے تھے۔

---

(۱) حیرت دھلوی، مرزا، " حیات طیبہ "، محولہ بالا، ص ۵۰۳

(۲) اشرف علی تھانوی، " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا، ص ۱۰۹

(۳) ابوالحسن علی ندوی، " سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۹۳

(۴) عبیداللہ سندھی، مولانا، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۲۱۰

(۵) مہر، مولانا غلام رسول، " سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۷۳

دھلی سے وطن روانگی کی تاریخ مرزا حیرت دھلوی نے محرم، ۱۲۲۳ھ تحریر فرمائی ھے۔(۱) ابوالحسن علی ندوی کے نزدیک بھی ۱۲۲۳ھ میں سید صاحب کی وطن میں موجودگی ثابت ھے۔ اسی زمانے میں خاندان کے ایک بزرگ سید محمد روشن کی صاحب زادی بی بی زھرہ کے ساتھ ان کا نکاح کردیا گیا۔ ۱۲۲۴ھ میں آپ کی بڑی صاحب زادی بی بی سارا پیدا ھوئیں۔ (۲)

۱۲۲۶ھ میں سید صاحب نے دھلی کا دوسرا سفر اختیار کیا اور کچھ مدت قیام کرکے ۱۲۲۷ھ میں نواب امیر خان والی ٹونک کی خدمت میں تشریف لے گئے اور ان کے لشکر میں ملازمت اختیار کرلی۔ مولانا مہر صاحب لکھتے ھیں کہ سید صاحب یہ نصب العین لےکر امیر خان کے پاس گئے تھے کہ اس عظیم الشان آزاد قوت کو صحیح راستے پر لگائیں۔ اس سے آزادی وطن اور احیائے اسلام کا کام لیں۔ (۳) سید صاحب نے امیر موصوف کے ساتھ سات سال قیام کیا اور جب دسمبر، ۱۸۱۷ع میں نواب نے انگریزوں سے مصالحت کرلی تو سید صاحب نے ان سے قطع تعلق کرلیا۔ اور دھلی لوٹ آئے۔ روانگی سے قبل شاہ عبدالعزیز کے نام ایک خط میں لکھتے ھیں "یہ خاکسار حضورکی قدم بوسی میں عنقریب حاضر ھوتا ھے۔ یہاں لشکر کارخانہ درھم برھم ھوگیا۔ نواب صاحب فرنگی سے مل گئے اور یہاں رھنے کی کوئی صورت نہیں۔" (۴) اس سے معلوم ھوتا ھے کہ امیر سے سید صاحب کا تعلق تحصیل معاش کے لیے محض ملازمت کا نہ تھا۔ وابستگی کا ایک خاص مقصد تھا اور جب دیکھا کہ یہ مقصد پورا نہیں ھورھا ھے تو بلا پس و پیش علاحدگی اختیار کرلی۔ (۵)

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول: "سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۷۳

(۲) ابوالحسن علی ندوی: "سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۹۷

(۳) مہر، غلام رسول، "سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۸۹

(۴) سید احمد شہید: "مکتوبات سید احمد شہید"،(عکسی)، لاھور: مکتبہ رشیدیہ،

(۵) مہر، مولانا غلام رسول: "سید احمد شہید"، محولہ بالا، "نواب امیر خان سے علاحدگی"، صص ۱۰۲-۱۰۳

ٹونک سے سید صاحب کی مراجعت ۱۸۱۸ء کے وسط میں ہوئی تھی یہاں سے سید صاحب کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا ۔ اور سید صاحب کی زندگی کا یہ باب ہندوستان میں اسلامی دعوت اور مسلمانوں کی نشئت ثانیہ کی تاریخ کا ایک باب بن گیا۔ اب ان کے سامنے مسلمانوں کی اصلاح و تجدید کی جو اسکیم تھی اس پر مولانا مہر صاحب نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :

" سید صاحب کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنایا جائے ۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اس روح کو زندہ کیا جائے جو قرون اول کے مسلمانوں کا طغرائے امتیاز تھی ۔ اور ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کی بنیادیں استوار کی جائیں جو آٹھ سو سال تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہنے کے بعد تیزی سے اغیار کے قبضے میں جارہا تھا جب تک نواب امیر خاں آزاد رہا ، سید صاحب نے اس کا دامن نہ چھوڑا ۔ نواب نے انگریزوں سے معاہدہ کرلیا تو امید کا یہ چراغ بھی گل ہوگیا۔ اور سید صاحب کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اپنے نصب العین کی خاطر تنظیم کا مستقل بندوبست کریں۔ دھلی پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے ذہن میں ایک نقشہ تنظیم بناچکے تھے جسے جامۂ عمل پہنانے کی غرض سے وہ دھلی میں ٹھہر گئے اور ایک برس تک وطن کا رخ نہ کیا ۔ اس سلسلے میں انھوں نے میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے سوچے ہوئے نظام کی کام یابی کے امکانات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرلیں ۔ پھر جہاں جائیں اسی کے لیے اپنی زندگی کے گران مایہ اوقات وقف رکھیں ۔ (۱)

دھلی کے علمی ادبی حلقوں میں اس وقت خاندان ولی اللہی کے علم و فضل کا سکہ رواں تھا اور جب تک کسی سکے پر ولی اللہی دارالضرب کی مہر نہ ہو اس کا دھلی اور ہندوستان کے بازار علم و دین میں رواج پانا ممکن نہ تھا۔ سید صاحب

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول " سید احمد شہید "، محولہ بالا ، ص: ۱۵-۱۱۴

کا اگرچہ علمی، دینی، اور سلوک و طریقت کا رشتہ اسی خاندان اعظم گلستانی سے تھا - انھیں شاہ عبدالعزیز کی سرپرستی بھی حاصل تھی - حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کی تحریک اور دینی اور اصلاحی مساعی تحریک ولی اللہی کے سلسلے کی کڑی تھیں- (۱) لیکن تحریک احیا اسلام اور اصلاح مسلمین کے لیے بھی ضروری تھا کہ اس خاندان کے نوجوان اصحاب علم و فضل کی معاونت حاصل ہو- سید صاحب دہلی پہنچے تو اکبرآبادی مسجد کے اسی حجرے میں قیام کیا جس میں زمانۂ طالب علمی میں رہاکرتے تھے - اسی حجرے میں انھوں نے جہاد کے لیے تنظیم کی مستقل اسکیم مرتب کی تھی - (۲) شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کا ان کی جانب التفات دیکھا تو خاندان ولی اللہی کے لوگ خود بخود ان کی طرف متوجہ ہوگئے - پہلے مولوی محمد یوسف پھلتی جو شاہ ولی اللہ کے بڑے بھائی شاہ اہل اللہ کے پوتے تھے بیعت ہوئے - ان کے بعد مولانا عبدالحی اور شاہ اسمعیل شہید سید صاحب کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے - پھر شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب نے ان سے رشتہ بیعت قائم کیا- ان کے ساتھ حکیم مغیث الدین مولانا وجیہہ الدین، حافظ معین الدین اور ان کے فرزندان نے بیعت کی - اس کے بعد نہ صرف سید صاحب کے قبول عام کی رکاوٹ دور ہوگئی بلکہ ایک قومی تحریک اور ترغیب کا سر و سامان بھی پیدا ہوگیا- مہر صاحب لکھتے ہیں :

" ان اکابر علم کی بیعت نے وقت کے اکثر اصحاب کی توجہ سید صاحب کی طرف پھیردی - دہلی، پھلت، بوڑھانہ اور آس پاس کے تمام اضلاع و بلاد کی فضا سید صاحب کی شہرت سے معمور ہوگئی - دور دور سے لوگ بیعت کے لیے دہلی پہنچنے لگے - جہاں جہاں یہ صدا پہنچی کہ شاہ اسمعیل، مولانا

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" محولہ بالا

(۲) مہر، مولانا غلام رسول، " سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۷۱

عبدالحی اور شاہ محمد اسحاق نے سید احمد کی بیعت کرلی ہے ، وہاں وہاں کے لوگوں میں طلب و شوق کی بیتابی پیدا ہوگئی - یہی زمانہ ہے جب مختلف مقامات سے دعوت نامے سید صاحب کے پاس پہنچنے لگے کہ سب لوگ خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتے لطفاً خود تشریف لائیے اور فیض توجہ سے مشرف فرمائیے - گویا دعوت اصلاح اور تنظیم جہاد کی جو اسکیم سید صاحب نے اپنے ذہن میں سوچ رکھی تھی اس پر عمل کا سازگار وقت آگیا تھا اسی لیے انھوں نے وطن جانا ملتوی کیا اور اصل کام میں لگ گئے - " (١)

دسمبر ، ١٨١٨ء میں سید صاحب دہلی سے نکلے اور دو آبے کے مختلف مقامات کا دورہ کیا ان میں غازی آباد ، میرٹھ ، مظفر نگر ، سہارن پور ، شہر اور ان اضلاع کے بہت سے قصبات شامل ہیں - بیشتر مقامات مولانا عبدالحی ، شاہ اسمعیل اور مولانا محمد یوسف ان کے ہم راہ تھے - اس دورے پر تقریباً چھ ماہ صرف ہوئے - (٢) مئی میں دہلی واپس ہوئے اور اسی ماہ کے آخر میں رائے بریلی کے لیے روانہ ہوگئے راستے میں مرادآباد ، رام پور ، بریلی ہوتے ہوئے ٢٣ جون ، ١٨١٩ء کو تقریباً دس برس کے بعد وطن مالوف رائے بریلی پہنچے - لیکن یہاں پہنچنے کے بعد بھی وہ دعوت و اصلاح کے کاموں سے غافل نہیں ہوئے - اس موقع پر انھوں نے الہ آباد ، بنارس ، کان پور ، لکھنؤ اور ان اضلاع کے مختلف مقامات کے دورے کیے- ان دوروں میں بھی بیشتر مقامات پر شاہ اسمعیل شہید اور مولانا عبدالحی ان کے ساتھ تھے- اور رائے بریلی پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد جہاد کی تیاری کے سلسلے میں اپنے ساتھیوں کو جنگی فنون کی مشق بھی شروع کرادی تھی- (٣)

---

(١) مہر ، مولانا غلام رسول : " سید احمد شہید " ، محولہ بالا ، ج ، ص ١١٨

(٢) ابوالحسن علی ندوی ، مولانا : " سیرت سید احمد شہید " ، محولہ بالا ، (دوآبے کا تبلیغی دورہ) ، پانچواں باب ، ص ٣٥-١١٣
مہر ، مولانا غلام رسول ، " سید احمد شہید " ، محولہ بالا ، (دو آبے کا دورہ) ، گیارھواں باب ، ص ٣٠-١٢٣

(٣) ابوالحسن علی ندوی ، مولانا : " سیرت سید احمد شہید " ، محولہ بالا ، چھٹا تا نواں باب ، ص ٢٢٦-١٣٦
مہر ، مولانا غلام رسول ، " سید احمد شہید " ، محولہ بالا ، بارھواں تا پندرھواں باب ، ص ٧٧-١٣١

اسی دوران میں آپ نے سفر حج کا عزم کرلیا اور تقریباً دو سال کے قیام کے بعد شوال ، ۱۲۳۶ھ کی آخری تاریخ (۳۰ جولائی، ۱۸۲۱ع) کو پیر کے دن تقریباً چارسو افراد کے ایک قافلے کے ساتھ حج کے ارادے سے رائے بریلی سے روانہ ہوئے - لیکن راستے میں الہ آباد ، بنارس ، عظیم آباد اور راستے میں پڑنے والے قصبات میں تمام مقامات پر کم و بیش قیام کرتے اور دعوت اصلاح و تبلیغ جہاد کا فریضہ انجام دیتے ہوئے چارماہ میں (سفر کے وسط میں) کلکتہ پہنچے (۱) کلکتے میں آپ کی دعوت و ارشاد سے جو انقلاب پیدا ہوا اس کی طرف سرسید نے بھی اشارہ کیا ہے - کلکتے میں تین ماہ کے قیام کے بعد جمادی الاول ، ۱۲۳۷ھ، میں اپنے آٹھ سو ساتھیوں کے ساتھ سفر حج کے لیے روانہ ہوئے اور تقریباً دو سال کے بعد ۲ صفر، ۱۲۳۹ھ کو دوبارہ کلکتے کے ساحل پر قدم رکھا - اور رائے بریلی کے سفر میں مختلف مقامات پر قیام فرماتے اصلاح و ارشاد اور اعلائے کلمۂ حق فرماتے ہوئے رمضان، ۱۲۳۹ھ میں رائے بریلی پہنچ گئے -

سید صاحب نے اس مرتبہ ۷ جمادی الاخر ، ۱۲۴۱ھ تک ایک سال دس مہینے رائے بریلی میں قیام کیا - رائے بریلی میں یہ ان کی زندگی کا آخری قیام تھا - اس زمانہ قیام کے اہم مشاغل میں سے مکانوں کی مرمت، مساجد کی تعمیر، جہادکی ترغیب و دعوت اور رفقا کی ایمانی و عملی تربیت ہے - ابوالحسن علی ندوی نے رائے بریلی کے اس ماحول کو جو سید صاحب کے قیام سے پیدا ہوگیا تھا علمی و روحانی تربیت گاہ سے تعبیر کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

---

(۱) راستے میں دعوت ارشاد کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو :
مہر ، مولانا غلام رسول، "سید احمد شہید"، محولۂ بالا ، سترھواں باب،
صص ۱۸۷-۲۱۱
ابوالحسن علی ندوی، مولانا، "سیرت سید احمد شہید"، محولۂ بالا ، دسواں و
گیارھواں باب، صص ۲۲۷-۷۲

" ایک سال دس مہینے کی یہ مدت ایک ایسی فضا اور ماحول میں گزری جس میں ایک طرف دینی جذبات اور ایمانی کیفیات کی ترقی اور نشو و نما کا سامان تھا اور دوسری طرف جفا کشی، مجاھدے، سادہ اور سپاھیانہ زندگی اور خود شکنی کی تعلیم - یہی دو سرچشمے ھیں جن سے جہاد فی سبیل اللہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کی قوت اور توفیق پیدا ہوتی ہے - جماعت جو اس وقت کئی سو افراد پر مشتمل تھی اور امیر جماعت ایک طرف ذکر و نوافل ، تذکیر و دعوت میں مشغول تھے دوسری طرف فنون حرب اور محنت و مشقت کے کاموں میں مستعد اور چاق و چوبند تھے۔" (۱)

۷ جمادی الاخرہ ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۷ جنوری، ۱۸۲۶ع ، پیر کا دن گزار کر رات کو آپ نے رائے بریلی سے آخرکار سفر اختیار کیا۔ اس سفر میں گوالیار، ٹونک ،اجمیر، سے مارواڑ کے ریگستان سے گزر کر عمر کوٹ کے مقام پر سندھ میں داخل ہوئے - یہاں سے میر پور، حیدرآباد ، رانی پور، شاہ پور، شال ، قندھار، غزنی، کابل ہوتے ہوئے پشاور آئے اور وہاں سے خویشگی اور نوشہرہ کا سفر کیا۔ یہ سفر ۱۸ جمادی الاول ، ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸ دسمبر، ۱۸۲۶ع کو گیارہ ماہ میں ختم ہوا۔ دوسرے اسفار کی طرح اس سفر کے دوران میں بھی دعوت و ارشاد کا سلسلہ برابر جاری رہا - راستے میں ایک ایک مقام پر بعض اوقات ایک ہفتے سے زیادہ قیام کیا۔ جہاں جہاں سے سید صاحب گزرے وہاں کے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں نے بھی آنکھیں فرش راہ کیں - گوالیار کے راجہ نے لشکر کی میزبانی کی اور تحائف و خلعت فاخرہ سے نوازا - راجہ کے وزیر ہندو راؤ نے سید صاحب اور ان کے رفقائے خاص کی شاہانہ دعوت کی اور خلعتیں پیش کیں۔ رانی پور (سندھ) میں سید صاحب کی ملاقات پیر سید صبغت اللہ شاہ راشدی سے ہوئی - اور پیر صاحب نے اپنے گاؤں" پیر گوٹھ" میں بلاکر تین شبانہ روز سید صاحب اور

---

(۱) ابوالحسن علی ندوی، مولانا،" سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا ، حصہ اول ، ص ۳۳۸-۳۳۹

مجاہدین کی مہمانی کے فرائض انجام دے اور مجاہدین کے لیے لباس مہیا کیا۔ (۱)

سید صاحب وسط دسمبر، ۱۸۲۶ء میں نوشہرہ پہنچے تھے اور مئی ، ۱۸۳۱ء تک ساڑھے چار سال کی مدت سرحد میں بسر کی ۔ یہ سارا عرصہ سکھوں سے جنگ ہی میں نہیں گزرا بلکہ اس مدت کے شب و روز مسلمانوں میں جہاد کی روح پھونکنے، اصلاح اعمال و رسوم ، خوانین کے آپس کے مناقشوں کے تصفیے ، قیام ملت کی بہترین تدابیر، اسلامی شریعت کے اجرا کی کوششوں اور جہاد کی تیاریوں میں بسر ہوئے اور ان مقاصد عالیہ میں عظیم الشان کامیابیاں بھی ہوئیں ۔ یکم شعبان ، ۱۲۴۴ھ مطابق ۶ فروری، ۱۸۲۹ء کو پنجتار میں آپ کے دست مبارک پر قیام شریعت کی عام بیعت کی گئی ۔ اس اجتماع عظیم میں سرحد کے ہر حصے سے علماء و خوانین شریک ہوئے تھے ۔ صرف علمائے کرام اور ان کے تلامذہ کی تعداد چار ہزار تھی ۔ خوانین ان کے سوا تھے۔ سرحد کے بیشتر علاقوں میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی ۔ قاضیوں اور عمال کا تقرر عمل میں آیا ، عشر و زکوٰۃ کا نظام قائم ہوا ، اصلاح رسوم و اعمال کی کوششیں بار آور ہوئیں ۔ اور مسلمانوں کی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا۔ اس دوران میں بہت سی جنگیں ہوئیں، شب خون مارے ۔ شکست کے زخم بھی کھائے اور اللہ کی نصرت سے عظیم الشان فتوحات بھی حاصل ہوئیں ۔ (۱)

آخری معرکہ ۲۴ ذی قعدہ، ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ، ۱۸۳۱ء کو پیش آیا ۔ یہ معرکہ بالاکوٹ (ضلع ہزارہ) کے مقام پر رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ کے مقابلے کا تھا۔ اسی معرکے میں سید صاحب شہید ہوگئے ۔ جمعہ کا دن اور گیارہ بجے کا وقت تھا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بالا کوٹ میں آپ کا مزار ہے ۔ (۲)

---

(۱) سفر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو :
ابوالحسن علی ندوی، "سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا ، حصہ اول ابواب ۲۲-۱۸ ص ۳۹۸-۲۵۶
مہر، غلام رسول ، " سید احمد شہید "، محولہ بالا ج اول ، ابواب ۲۹-۲۶ ، ص ۲۸۳-۳۲۶

(۲) تفصیلات کے محولہ بالا کتب حوالے جات ملاحظہ ہوں ۔

سید صاحب کا اصل مذاق علمی نہیں عملی تھا۔ وہ مجاہد فی سبیل اللہ تھے اور انیسویں صدی عیسوی کی سب سے بڑی اسلامی تحریک کے بانی ہوئے ۔ عمل و تنظیم اور قیادت و امارت کی ان میں بہترین صلاحیتیں تھیں۔ سرحد میں اسلامی حکومت قائم کرکے دنیا کو قرون اولیٰ کے دور سعادت و برکات کا ایک نمونہ دکھادیا یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ سید صاحب اخلاص و للہیت کا نمونہ تھے ۔ ان کے صاحب کرامت ہونے کا اعتراف تو خود سرسید نے کیا ہے ۔ ان کی زبان کو اللہ تعالیٰ نے تاثیر کی خوبی عطا فرمائی تھی وہ جو بات زبان سے فرماتے تھے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتی تھی۔

اس کے باوجود کہ ان کا مذاق علمی تھا نہ تصنیف و تالیف سے انہیں دل چسپی تھی ، چند نہایت مفید و موثر رسائل ان کی یادگار ہیں :

۱- تنبیہ الغافلین(۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء ، دہلی) فارسی میں مختصر رسالہ ہے ۔ اردو ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے ۔

۲- رسالہ نماز فارسی کا رسالہ ہے ۔ اردو ترجمہ شائع ہوچکا ہے ۔

۳- صراط مستقیم (۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء ، کلکتہ) فارسی میں چار ابواب پر مشتمل تزکیہ و اصلاح باطن اور علم سلوک و تصوف میں آپ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے ۔ یہ کتاب شاہ اسمعیل شہید نے ۱۲۳۳ھ میں مرتب فرمائی تھی اس کے پہلے ابتدائی دو ابواب مولانا عبدالحی کے لکھے ہوئے ہیں۔ سید صاحب جو کچھ فرماتے تھے اس کو شاہ صاحب اپنے الفاظ و عبارت اور علمی اصطلاحات کے ساتھ لکھ لیتے تھے ۔ پھر سید صاحب اس پر نظر فرماتے تھے اور اصلاح و تصحیح کردیتے تھے ۔ بعض مقامات پر آپ کی ہدایت کے مطابق دو دو تین تین مرتبہ عبارتیں

بدل گئیں - اردو ترجمہ چھپ چکا ہے - سفر حج کے موقع پر مولانا عبدالحی نے اس کا عربی ترجمہ بھی کیا تھا۔

۴- مہمات احمدیہ فی الطریق المحمدیہ (آگرہ و کلکتہ سے ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۳ء اور ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء) میں چھپ چکا ہے - (۱)

۵- تفسیر سورہ فاتحہ ، یہ مختصر تفسیر اردو میں ہے - زبان بول چال کی ، محاورے کے مطابق شگفتہ اور اپنی سلاست روانی میں شاہ عبدالقادر دھلوی کی "موضح القرآن" کے بعد اردو زبان میں دوسری کوشش ہے -(۲)

۶- حقیقت الصلوٰۃ - سید صاحب کی ایک تقریر تھی جسے ۱۳۲۰ھ میں برکاش اسٹیم پریس لاہور سے چھاپ دیا گیا تھا۔ (۳) غالباً یہ فارسی کا وہی رسالہ نماز ہے جس کا تذکرہ مولانا غلام رسول مہر نے بھی کیا ہے - اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے - (۴)

سید صاحب کی ان علمی یادگاروں کو تو شاید اردو ادب میں کوئی مقام نہ دیا جائے لیکن ان کی تحریک اصلاح و جہاد نے اردو ادب کو بہت متاثر کیا۔ ان کی تحریک کے

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول، "سید احمد شہید"، (مقالہ مشمولہ) " اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، لاہور: دانش گاہ پنجاب ، ۱۹۶۲؟ ، ج ۲، ص ۱۳۲

(۲) عبدالحلیم چشتی، محمد ، " تفسیر سورہ فاتحہ سید احمد شہید"، (مقالہ مشمولہ) ، " الرحیم"، حیدرآباد (سندھ) : ستمبر، ۱۹۶۵ء، ج ۳، ش ۴، ص ۶۷-۲۶۳

(۳) سیف ، محمد خالد ، " کلام شاہ اسمعیل شہید"، لائل پور: طارق اکیڈمی، ۱۹۷۴ء ، ص ۱۷

(۴) مہر ، مولانا غلام رسول ، " سید احمد شہید"، (مقالہ مشمولہ) " اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، محولہ بالا ، ص ۱۳۲

زیر اثر بہت سے رسالے نماز کی ترغیب اور تشویق پیدا کرنے کے لیے لکھے گئے ۔ متعدد شعرا نے جہاد کے فضائل ، قیام صلوۃ کی اہمیت اور ترک صلوۃ کی برائی کے مضامین کو منظوم کیا اور اس دور میں رسالہ بے نمازاں، فقہی مسائل میں منظوم کتب اور جہاد پر رسائل و مثنویات بہت مقبول رہے ۔ سید صاحب کی شان میں بھی مدحیہ نظمیں لکھی گئیں ۔ اس سلسلے میں سید عبدالرزاق کلامی ، مومن ، خرم علی، نشاط ، نجف علی جھجری، قاضی علاء الدین بلخری وغیرہ کا ذکر مولانا غلام رسول مہر نے کیا ہے ۔ (۱)

تحریک مجاہدین کے شعری سرمایے اور اس تحریک سے وابستہ و متاثر شعرا پر ڈاکٹر معین الدین عقیل نے نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ۔ اور مذکورۃ الصدر شعرا کے علاوہ مولوی ضمیر الدین، مولوی یحییٰ علی، مولانا ابوالحسن، عبدالحق آرزی، حکیم عبدالحمید صادق پوری، امین اللہ پیام، میر قاسم علی قاسم، مولوی محمد حسین فقیر، حیدر حسن، عبدالرحیم ، فتح اللہ ، عبداللہ خانم دہلوی، صدرالدین آزردہ، ابوسلیمان، فضل، وغیرہم کی تحریک سے وابستگیوں اور تحریک سے متاثر ان کے کلام پر روشنی ڈالی ہے۔(۲)

اردو نثر کا میدان اس سے بھی وسیع رہا ہے ۔ اس تحریک کی بدولت متعدد ایسے اہل قلم پیدا ہوئے جن کے ذوق تصنیف و تالیف کا سب سے بڑا میدان تحریک جہاد و اصلاح کے مقاصد علیا رہے ہیں ان میں مولوی خرم علی بلہوری، مولوی کرامت علی جونپوری، مولانا سخاوت علی جونپوری، مولانا ولایت علی صادق پوری اور مولوی عبداللہ حسین نہایت

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول: "جماعت مجاہدین"، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۵ع ، ص ۱۰۸-۱۰۰

(۲) عقیل، ڈاکٹر معین الدین: "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ"، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۶ع ، ص ۳۵-۲۲۹

معروف ہیں۔ (۱) متاثر اہل قلم کے نامی اور ان کی خدمات کا حصار طول الامل ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل (۲) اور مولانا محمد عبدالحلیم چشتی نے (۳) نہایت تفصیل کے ساتھ تحریک شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید کو تحریک جہاد و اصلاح کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

سید صاحب نے تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی ۱۲۲۳ھ میں ہوئی تھی۔ اس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ دوسرا نکاح ۱۸۲۰ء میں نکاح بیوگان کی تحریک و ترغیب کے سلسلے میں احیائے سنت اور مسلمانوں کے لیے ایک مثال قائم کرنے کی غرض سے اپنے بھائی سید محمد اسحاق کی بیوہ سیدہ ولیہ سے کیا۔ تیسرا نکاح ۱۲۴۳ھ میں فہر میں فاطمہ بنت نواب شاہ نامی ایک سیدہ سے کیا۔ یہ نکاح آپ نے اطبا کی ہدایت پر کیا۔ جنگ شیدو کے موقع پر آپ کے خلاف جو سازش کی گئی تھی اس میں آپ کو زہر دے دیا گیا چوں کہ جسم پر اس کے اثرات صحت کے بعد بھی ظاہر ہوجاتے تھے اس لیے اطبا نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ اپنی کسی بیوی کو پاس بلا لیں یا مزید نکاح کرلیں چوں کہ ازواج کو اس وقت کے حالات میں بلا نا ممکن نہ تھا اس لیے رفقا کے مشورے اور ازواج

---

(۱) محمد ایوب قادری، " تحریک مجاہدین کے چند نامور مصنفین"، (مقالہ مسلسل)، " الولی"، حیدرآباد (سندھ):
جنوری و فروری، ۱۹۷٦ء، ج ۴، ش ۱۱–۱۰، ص ۲۵–۱۹
اپریل، مئی، ۱۹۷٦ء، ج ۵، ش ۱ و ۲، ص
جون، جولائی، ۱۹۷٦ء، ج ۵، ش ۳ و ۴، ص

(۲) عقیل، ڈاکٹر معین الدین: " تحریک آزادی میں اردو کا حصہ"، محولہ بالا، عنوان" تحریک مجاہدین کا نثری ادب"، ص ۵۲–۲۳۹

(۳) عبدالحلیم چشتی، محمد: " سید احمد شہید کی تحریک کا اثر اردو ادب پر"، (مقالہ مسلسل) " الرحیم"، حیدرآباد (سندھ):
فروری، ۱۹٦٦ء، ج ۳، ش ۹، ص ٦۳۲
مارچ، ۱۹٦٦ء، ج ۳، ش ۱۰، ص ۷۰۵
اپریل، ۱۹٦٦ء، ج ۳، ش ۱۱، ص ۷۹۸

کی اجازت سے آپ نے تیسرا نکاح کرلیا۔

سید صاحب هجرت کے وقت اپنی دونوں ازدواج کو رائے بریلی میں چھوڑ دیا تھا۔ پھر وہ آپ کے حکم سے ذی الحجۃ ۱۲۴۲ھ میں ٹونک اور سفر (ستمبرہ ۱۸۲٦ اع) ادھین پور گوٹھ (سندھ) میں بھجوادیا تھا۔ آپ کے بھتیجے مولوی محمد یعقوب ابن مولوی سید محمد ابراهیم گھریلو امور کی انجام دهی کے لیے محرم کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھے ۔ سید صاحب کی شہادت کے کچھ عرصے بعد آپ کی تیسری زوجہ بھی بیوہ ہو آگئی تھیں ۔ پھر تینوں ازواج اور اولاد کو نواب وزیرالدولہ والی ٹونک نے ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ اع میں ٹونک بلالیا تھا اور نہایت عزت و تکریم سے رکھا تھا۔

سید صاحب کی اولاد میں پہلی اور تیسری بیوی سے صرف دو بیٹیاں تھیں۔(۱) پہلی بیوی سے ۱۲۲۲ھ میں ایک بچی پیدا ہوئی جس کا نام سارا رکھا اور تیسری بیوی سیدہ فاطمہ سے ۷ شعبان، ۱۲۴٦ھ/ ۲۱ جنوری، ۱۸۳۱ اع کو سرحد میں راج دواری کے مقام پر ایک بچی پیدا ہوئی اس کا نام ھاجرہ رکھا۔ ھاجرہ کی شادی سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب کے صاحب زادے سید محمد یوسف کے ساتھ ہوئی تھی ۔(۲)

سرسید نے سید صاحب کا ترجمہ جس عقیدت سے لکھا ہے وہ اس کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے ۔ لیکن اس میں سرسید سے بعض تسامحات بھی ہوئے ہیں اور بعض عبارتیں تشریح طلب ہیں ۔ مناسب ہوگا ان پر ایک نظر ڈال لی جائے :

---

(۱) مہر، غلام رسول، " سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۱، ص: ۲٦۹، ۲۷۰، ۲۷٦ ج ۲، ۳۳۵، ۳۳٦، ۸۱۷، ۲۵-۸۲۲

(۲) دستاویزات و شجرہ خاندانی (قلمی) مملوکہ ڈاکٹر سید یونس حسنی، پرنسپل، کیڈٹ پبلک کالج، کراچی

مہر، مولانا غلام رسول، " سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۳٦

۱- سرسید نے آپ کا موطن اصلی بریلی لکھا ہے - یہ بریلی (روہیل کھنڈ کا شہر) نہیں" رائے بریلی" (اودھ کا شہر) ہے جو لکھنؤ سے اڑتالیس میل کے فاصلے پر جنوب مشرق میں ہے -

۲- سرسید نے ٹونک جانے کا سبب دہلی میں لوگوں پر ان کے مقامات علیا کا منکشف ہوجانا اور غرض علم باطنی کی تحصیل و تکمیل بیان کی ہے -

اس باب میں مولانا غلام رسول مہر کی رائے نہایت صائب ہے - وہ فرماتے ہیں :

" تکمیل حال اور اخفا کا مدعا وطن یا دہلی میں بوجہ احسن پورا ہوسکتا تھا - اس زمانے میں سید صاحب ولی اللہی خاندان کے ہزاروں مریدوں میں سے ایک معمولی اور کم نام مرید تھے- وہ جہاں بھی بیٹھ جاتے تکمیل حال و اخفا کے مقاصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا لطف کی بات یہ ہے کہ نواب کے لشکر میں پہنچنے کے بعد جو صورت حال پیش آئی وہ اخفا کی مصلحتوں کے سراسر خلاف تھی.... مجھے یقین ہے کہ آپ کو وہی جذبۂ خدمت دین کشاں کشاں نواب کے لشکر میں لے گیا تھا جس کی بنا پر انجام کار انھوں نے بطور خود فداکاروں کی ایک جماعت مرتب کی اور حیات طیبہ کے گراں بہا اوقات جاں بازی و جاں فشانی میں صرف کردیے- یعنی وہ اسلامی حکومت کے احیا کی خاطر جہاد فی سبیل اللہ کا عزم لے کر امیر خاں کے پاس گئے تھے -" (۱)

۳- سرسید نے شاہ عبدالقادر کی وفات کے بعد ان کا قائم مقام مسند درس و تدریس شاہ اسمعیل کو لکھا ہے - شاہ اسمعیل کا مصروف درس و تدریس ہونا درست ہے لیکن یہ درست نہیں کہ شاہ عبدالقادر کی قائم مقامی ان کے حصے میں آئی تھی- شاہ عبدالقادر کی وفات (۱۸۱۳ع) کے وقت شاہ رفیع الدین

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول: " سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۶۸ و ۸۷

حیات تھے ۔ ان کا انتقال ۹ اگست ۱۸۱۸ء کو ہوا اور ان کے بعد شاہ عبدالعزیز ۵ جون، ۱۸۲۳ء کو فوت ہوئے ۔ سید احمد شہید ۱۸۱۸ء کے وسط میں دہلی پہنچے ۔ اس وقت شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین حیات تھے لہذا اس وقت (جون، ۱۸۲۳ء) تک بھی شاہ عبدالقادر کی جانشینی مسند درس و تدریس کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا اور اس کے بعد درس و تدریس میں قائم مقامی شاہ محمد اسحاق کے حصے میں آئی ۔ یہ بات خود سرسید نے شاہ اسحاق کے ترجمے میں لکھی ہے ۔

۴- پنجتار میں بیعت امامت لینے کا واقعہ شعبان، ۱۲۴۴ھ/ فروری، ۱۸۲۹ء کا ہے ۔ اس موقع پر ڈھائی ہزار علما و خوانین جمع تھے اور ان سے بیعت لی گئی ۔(۱) اور ایک روایت کے مطابق دو ہزار علما اسی قدر ان کے تلامذہ اور خوانین کی تعداد ان کے سوا تھی۔ (۲)

۵- سرسید نے سفر حج میں سید صاحب کے ساتھیوں کی تعداد "قریب ہزار آدمی کے" بتائی ہے لیکن مولانا غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق صحیح تعداد ۷۹۳ (۳) اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تحقیقات کے مطابق یہ تعداد ۸۰۰ تھی۔(۴) یہ تمام مسافران حجاز دس جہازوں میں سوار تھے ۔ ہر دو فاضل محققین نے الگ الگ ہر جہاز کے مسافروں کی تعداد جہاز پر ان کے امیر کا نام اور بعض جہازوں کے کپتانوں کے ناموں کی بھی صراحت کردی ہے ۔

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول، "سید احمد شہید"، (مقالہ مشمولہ) "اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۱۳۰

(۲) مہر ، مولانا غلام رسول، "سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۵۹

(۳) ایضاً، ج ۱، ص ۲۲۱

(۴) ابوالحسن علی ندوی، "سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۱۳-۳۱۲

۶- سفر حج کے موقع پر کلکتے میں آپ کے قیام کی بدولت جو انقلاب حال پیدا ہوا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرسید نے لکھا ہے کہ کلکتے میں جب تک آپ نے تشریف رکھی شراب مطلق نہ بکنے پائی اور کلال خانے بند رہے ۔ اس بات کی تصدیق دوسری معتقدانہ تصانیف سے بھی ہوتی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :

" کلکتے میں شراب کی دکانوں کا یہ حال تھا کہ یک لخت شراب بکنی موقوف ہوگئی ۔ دکان داروں نے جاکر سرکار انگریزی میں اس کا شکوہ کیا کہ ہم لوگ سرکاری محصول بلا عذر ادا کرتے ہیں اور دکانیں ہماری بند ہیں۔ جب سے ایک بزرگ اپنے قافلے کے ساتھ اس شہر میں آئے ہیں۔ شہر اور دیہات کے تمام مسلمان ان کے مرید ہوئے اور ہر روز ہوتے جاتے ہیں۔ انھوں نے تمام نشہ آور چیزوں سے توبہ کی ہے ۔ اب کوئی ہماری دکانوں کو ہوکر بھی نہیں نکلتا۔" (۱)

۷- سرسید کا یہ خیال بھی درست ہے کہ سید صاحب کے مریدوں کی تعداد اس نواح میں لاکھوں سے گزر گئی ۔ سید صاحب نے حج کو جاتے ہوئے تقریباً تین ماہ کلکتے میں قیام کیا تھا اس دوران میں تقریباً ایک ہزار آدمی روزانہ بیعت سے مشرف ہوتے تھے ۔ ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :

" کثرت بیعت کا یہ حال تھا کہ صبح سے دو ڈھائی پہر رات گئے تک مردوں اور عورتوں کا ہجوم رہتا۔ حضرت کو سوائے نماز پڑھنے اور ضروریات بشری کے فرصت نہ ملتی تھی۔ علاحدہ علاحدہ ایک ایک شخص سے بیعت لینا محال تھا ۔ ایک وسیع مکان میں سب جمع ہوجاتے، حضرت تشریف لاتے سات آٹھ دستاریں کھول کر آپ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے ۔ لوگ ان کو جا بجا تھام لیتے اور آپ بیعت کے الفاظ کو اذان کی طرح بلند آواز سے تلقین فرماتے ۔ دن میں سترہ یا اٹھارہ بار یہی عمل ہوتا ۔" (۲)

---

(۱) ابوالحسن علی ندوی، "سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲۸۷

(۲) ایضاً، ج ۱، ص ۲۸۳

یہ حال مسلمانوں میں انقلاب حال کا تھا۔ غیر مسلموں میں بھی آپ کی دعوت اسلام کا اثر تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :

" مولانا عبدالحی صاحب جمعے کو اور سہ شنبے کو نماز ظہر کے بعد شام تک وعظ فرماتے تھے۔ لوگ پروانہ وار جمع ہوتے تھے۔ روزانہ دس پندرہ ہندو مسلمان ہوتے ۔ دوسرے تیسرے روز ان کا ختنہ ہوتا۔ ان کے رہنے کے لیے ایک علاحدہ مکان تھا۔ قافلے کے دس بارہ آدمی ان کی خدمت و راحت کے لیے مقرر تھے۔" (۱)

اس بیان سے یا کسی اور تحقیق سے مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہوسکی لیکن ان کی خدمت و راحت کے لیے ۱۰، ۱۲ آدمیوں کے مقرر کیے جانے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی تعداد ایک وقت میں بھی سینکڑوں ہوسکتی ہے اور دو تین ماہ تک اس سلسلے کو پھیلایا جائے تو یہ تعداد ہزاروں تک پہنچ سکتی ہے۔

۸۔ سرسید کا یہ بیان محل نظر معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے اسمعیل شہید اور مولانا عبدالحی کو جہاد کی فضیلت کا بیان کرنے کا حکم دیا اور وہ اس کا منشا نہ جانتے تھے ۔ سید صاحب حج پر جانے سے پہلے ہی تحریک جہاد کے لیے ایک نظام عمل مرتب کرچکے تھے ۔ اسی کے مطابق رائے بریلی کے قیام کے دوران میں فنون سپہ گری کی مشقیں شروع کرچکے تھے۔ (۲) حج کے دوران میں ۱۰ ذی الحجہ ، ۱۲۳۷ھ کو منی ظہی کے مقام پر اپنے ساتھیوں سے جہاد کی بیعت لی تھی۔ (۳) اور حج سے واپسی کے بعد اسی نظام عمل

---

(۱) ابوالحسن علی ندوی، "سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲۸۶
(۲) ایضاً، ج ۱، ص ۱۹۳
(۳) ایضاً، ج ۱، ص ۳۲۶

کے مطابق تحریک شروع کی تھی۔ ہر دو بزرگوں کو دعوت جہاد و فضیلت شہادت کے بیان کا پورا منشا معلوم تھا ۔ وہ لوگوں کو جہاد فی سبیل اللہ میں صلاً قدم اٹھانے کی ترغیب دیتے تھے اور جو اہل ہمت اقدام و سعی کے لیے آمادہ ہوجاتے تھے انہیں ایک نظام سے وابستہ کرتے جاتے تھے۔ (۱) اسی طرح سرسید کا یہ بیان بھی محل نظر ہے کہ سید صاحب انہیں لے کر کوہستان کو روانہ ہوئے اور یہ ہنوز اس کی منشا سے واقف نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اقدام ان بزرگوں کے مشورے ہی سے اٹھایا گیا تھا۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں :

" تنظیم جہاد ابتدائی مراحل میں طے کرچکی تو رفیقوں کے مشورے سے قرار پایا کہ شمال و مغرب کے علاقہ سرحد کو مرکز بنایا جائے ۔ وہاں کے باشندے مسلمان تھے۔ ان کی آزادی سکھوں کی یورشوں کے باعث خطرے میں پڑچکی تھی۔ اس علاقے کے عقب میں اسلامی حکومتیں تھیں جن سے خیرسگالی کی امید تھی۔ پنجاب پر اقدام کے ساتھ سندھ اور بہاول پور کی مسلمان حکومتیں معاون ہو سکتی تھیں۔" (۲)

۹- سرسید نے لکھا ہے کہ سوائے قوم افاغنہ کے مردم ہندوستان لاکھ آدمی کے قریب جمع ہوئے ۔ صرف ہندوستان کے ایک لاکھ مجاہدین کی تصدیق نہیں کی جاسکتی لیکن اگر ہندوستانی و غیر ہندوستانی کی تفریق ختم کردی جائے تو تعداد کا یہ اندازہ بالکل درست ہے ۔ غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے —
ابوالحسن علی ندوی، "سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۱، (سولھواں باب، جہاد اور اس کے مقاصد و اسباب"، ص: ۷۵-۳۵۳
مہر، مولانا غلام رسول، " سید احمد شہید"، محولہ بالا، حصہ اول، (انیسواں باب، جہاد کے لیے دعوت و تنظیم")، ص ۳۹-۲۲۲

(۲) "(سید) احمد شہید" (مقالہ مشمولہ) " اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲، ص ۱۳۹
نیز تفصیل کے دیکھئے :
مہر، مولانا غلام رسول ، " سید احمد شہید"، محولہ بالا، انیسواں باب، ص ۳۹-۲۲۲
ابوالحسن علی ندوی، " سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا، حصہ اول، سولھواں باب، ص ۷۵-۳۵۳

سید صاحب کی کوشش سے ہندو میں سکھوں سے لڑنے کے لیے کم و بیش ایک لاکھ مجاہد جمع ہوگئے -" (۱)

۱۰- سرسید کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ بشرط مصالحت اٹک پار کا پورا علاقہ سید صاحب کے حوالے کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا لیکن آپ نے یہ پیش کش قبول نہ کی -(۲)

سرسید کے پیش نظر ان کی کوئی تحریر نہیں تھی اس لیے " آثارالصنادید" نمونۂ تحریر سے خالی رہی- ہم یہاں ان کی تفسیر سورہ فاتحہ سے چند سطریں نقل کرتے ہیں تاکہ یہ تذکرہ ان کی تحریر کے نمونے سے تہی دامن نہ کہلائے - رب العالمین کی تفسیر کے ذیل میں " فائدہ" کے عنوان سے لکھتے ہیں :

" جب مسلمان اللہ کے سامنے کھڑا ہوکر اس کی تعریف ایسی کرے کہ اپنے دل سے سمجھے اور ٹھیک جانے کہ اسی طور پر ہے اس میں کچھ تفاوت نہیں- فی الحقیقت وہ ایسا ہی ہے تو اللہ اس پر متوجہ ہوکر اس کا جواب آپ ارشاد فرماتے ہے کہ ہاں ایسا ہی ہیں اور اس بندے کو بھی جتاتا ہے کہ اس جواب پر ہر ایک بندہ اپنے مرتبے کے موافق یا کلام سنتا ہے یا اسے الہام ہوتا ہے یا دل کو تسکین اور قرار اور خوشی اللہ کو متوجہ ہوتی ہے اور قبول کرنے کی پائی جاتی ہے - حضور دل سے سمجھ کر سوال کرنے کے سبب یہ بات ہوتی ہے - اس میں تفاوت نہیں ہوتا -" (۳)

---

(۱) (سید) احمد شہید (مقالہ) " اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، ج ۲، ص ۱۳۰

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو :
ابوالحسن علی ندوی"، سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا ، حصہ دوم، "سکھوں کی سعی مصالحت "، صص ۱۹-۲۱۸
مہر، مولانا غلام رسول"، (سید) احمد شہید"(مقالہ) ،" اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲، ص ۱۳۰ نیز " سید احمد شہید"، محولہ بالا ، ج دوم، باب ۲۱، "سکھوں کا پیغام مصالحت" صص ۳-۲۰۲

(۳) عبدالحلیم چشتی، محمد"، تفسیر سورہ فاتحہ "، (مقالہ) ، " الرحیم"، حیدرآباد (سندھ) : ستمبر، ۱۹۶۵ء ، ج ۳، ش ۴، ص ۲۷۳

جناب حضرت مولانا شاہ احمد سعید صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ :

" شاہ ابوسعید صاحب کے بڑے بیٹے اور جانشین ہیں۔ کمالات آپ کے اس سے سوا ہیں جو بیان میں آئیں اور صفات آپ کی اس سے بہت ہیں جو کہی جاویں ۔ حافظ کلام اللہ ہیں اور مطیع سنت رسول اللہ ۔ اپنے پیروں کی طرح سلسلۂ ارشاد و تلقین اور توجہ اور استغراق جاری ہے ۔ اور حق پوچھو تو اب انہیں کی ذات فیض آیات سے خانقاہ کو رونق ہے ۔ علم حدیث و فقہ و تفسیر بدرجۂ کمال حاصل ہے ۔ دن رات مشغلہ درس و تدریس جاری ہے ۔ مسائل دینی آپ کے فیض سے حل ہوتے ہیں اور فتوی شرع شریف آپ کی مہر سے مسجل کیے جاتے ہیں ۔ قدم بہ قدم اپنے بزرگوں کے طریقے پر چلتے ہیں اور اپنے پیروں کا طریقہ برتتے ہیں۔ نسبت باطنی بہت مستحکم ہے ۔ سیکڑوں آدمی آپ کے فیض توجہ سے مقامات مشکلہ سے نکلتے ہیں اور مدارج اعلا کو پہونچتے ہیں۔ اللہ تعالی ایسے بزرگ کو سلامت رکھے جس سے خاندان مجددیہ قائم ہے ۔ آمین ثم آمین ۔ ولادت آپ کی ١٢١٧ھ میں ہوئی ہے اور "مظہر یزدان" کلمہ آپ کی ولادت کی تاریخ ہے ۔ اگرچہ عمر شریف سے چھیالیس سنین طے فرمائے ہیں۔ لیکن مدارج کمال ہزار در ہزار طے ہوئے ہیں۔ آپ نے بھی جناب حضرت شاہ غلام علی صاحب سے بیعت کی ہے اور انہیں سے خلافت پائی ہے لیکن اپنے جناب والد سے بہت سا فیض حاصل کیا ترقی بہ در ترقی پائی اور ان سے بھی خلافت حاصل کی ۔ اب ان کے انتقال کے بعد آپ ہی سجادہ نشین ہیں اور ارشاد و تلقین میں مصروف اللّٰھم متع المسلمین بطول حیاتہ و ضاعف مدارج المھتدین بطول بقائہ ۔" (١)

---

(١) سرسید احمد خان: "آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ٢٧-٢٥

۸؎ تعلیقات :

مولانا شاہ احمد سعید دھلوی شاہ ابوسعید مجددی کے بڑے بیٹے تھے۔ ربیع الاول ۱۲۱۷ھ مطابق جولائی، ۱۸۰۲ء میں رام پور میں پیدا ہوئے - (۱) "مظہر یزدان" سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے -(۲) ابتدائی تعلیم و تربیت رام پور میں والد اور والد کے ماموں مولانا سراج احمد کے زیر سایہ ہوئی -(۲) کچھ کتابیں مفتی شرف الدین رام پوری سے پڑھیں - اس کے بعد لکھنو جاکر مولانا محمد اشرف اور علامہ نورالحق سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد آپ دھلی تشریف لے گئے اور مولانا فضل امام اور مولانا رشید الدین خاں کے علاوہ اصحاب ثلاثہ سے بھی استفادہ کیا۔ (۳) دس سال کی عمر میں دھلی تشریف لائے تو قرآن مجید حفظ کرچکے تھے اور درسیات کی ابتدا ہوچکی تھی - آپ کے دیگر اساتذہ میں مفتی شرف الدین رام پوری، مولانا فضل امام ، مولانا رشید الدین خاں کے اسماء گرامی آتے ہیں - اصحاب ثلاثہ سے بھی انھیں شرف تلمذ حاصل تھا۔ صاحب "یادگار دھلی" کے مطابق اول الذکر دو اساتذہ سے علوم عقلیہ کی تکمیل کی تھی - مولانا رشید الدین خاں وغیرہ سے حدیث پڑھی تھی۔ (۴) مولانا رشید الدین خاں کے ساتھ "وغیرہ" کے لفظ سے صاحب "یادگار دھلی" کا اشارہ شاید شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کی طرف ہوگا۔ مولوی بشیرالدین دھلوی نے شاہ عبدالعزیز سے تلمذ کا ذکر نہیں کیا اور سب اساتذہ وہی مذکورۃ الصدر ہیں۔ (۵) مولوی محمد حسن نقشبندی مجددی

---

(۱) عبدالحئی، مولانا سید ؛ "نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۰
محمد حسن، مولوی، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" ؛ محولہ بالا ، ص ۳۳۸

(۲) عبدالحئی، مولانا سید ؛ "نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۰
سرسید احمد خاں؛ "آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۱۷

(۳) عبدالحئی ، مولانا سید ؛ "نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، صص ۳۱-۳۰

(۴) احمد ولی اللہ ، سید ؛ "یادگار دھلی"، محولہ بالا ، ص ۸۹

(۵) بشیرالدین دھلوی؛ "واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا ، ج ۱، ص ۱۵۴

نے خود آپ سے آپ کی تحصیل علمی اساتذہ کرام کے بارے میں ایک روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا :

" میں نے اکثر کتب تصوف مثل رسالہ قشیریہ و عوارف المعارف و احیاء العلوم و مکتوبات شریف و مثنوی مولانا روم حضرت شاہ (غلام علی) صاحب سے پڑھی یا سنی ہیں اور بعض کتب حدیث بھی پڑھی ہیں اور کتب معقول و منقول دیگر علمائے وقت سے مثل مولوی فضل امام و مولوی رشید الدین خان سے استفادہ کی ہیں۔ نیز حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب و مولانا رفیع الدین صاحب و شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور حدیث کی سند مجھ کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ سے حاصل ہے - " (۱)

محمد ایوب قادری صاحب نے مولوی ظہور اللہ فرنگی محلیؒ کے تلمذ اور تحصیل علمی کا ذکر بھی کیا ہے - (۲)

جب آپ رام پور سے دھلی تشریف لے گئے تو اس وقت سے حضرت شاہ آپ پر توجہ کرتے تھے اور آپ کے حال پر نہایت الطاف و مہربانی فرماتے تھے - مولوی محمد حسن نے متعدد واقعات تحریر فرمائے ہیں جن سے آپ کے حال پر شاہ صاحب کی شفقت اور محبت کا اظہار ہوتا ہے - آپ سبق پڑھ کر آتے اور حضرت شاہ صاحب کا حلقہ ہوتا تو آدمیوں کی کثرت کی وجہ سے بیٹھنے کی جگہ نہ ہوتی تو شاہ صاحب آپ کو بلاکر اپنی مسند کے پاس بٹھا لیتے -" (۳)

شاہ احمد سعید نے تحصیل علم کے ساتھ سلوک و طریقت کی تعلیم بھی نہایت محنت کے ساتھ حاصل کی تھی اور ذکر و فکر اور حلقہ و مراقبہ کا التزام رکھا تھا۔

---

(۱) محمد حسن، مولوی، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ "، محولہ بالا، صص ۳۹-۳۳۸

(۲) ایوب قادری، محمد (مرتب) " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۲۵۹

(۳) محمد حسن، مولوی، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا، ص ۳۳۸

آپ خود فرماتے تھے :

" جن ایام میں میں علم پڑھا کرتا تھا تو اکثر شب مطالعہ میں گزرجاتی تھی اور اسی طرح ذکر و فکر اور شاہ صاحب کے حلقے و مراقبے کا بھی التزام رکھا تھا۔" (۱)

حضرت شاہ صاحب کے علاوہ آپ اپنے والد سے بھی توجہ لیا کرتے تھے - کبھی حضرت شاہ صاحب کی موجودگی میں اور اکثر حضرت شاہ صاحب کی مفارقت میں صاحب " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ " نے خود آپ کا قول نقل کیا ہے " میں نے جمیع مقامات پر اپنے والد سے بھی توجہ لی ہے -" (۲)

حضرت شاہ صاحب اور ان کے والد کی توجہات کی بدولت آپ نے نہایت عجلت کے ساتھ جملہ منازل سلوک طے کرلیں۔ آپ کے مقام کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ شاہ صاحب نے حاضرین سے شاہ احمد سعید اور آپ کے والد ماجد ابوسعید کی طرف اشارہ کرکے دریافت فرمایا کہ تمھیں ان دونوں میں سے کون اعلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو آپ نے خود فرمایا کہ میری نگاہ میں بیٹا باپ سے بہتر ہے -(۳) صاحب " یادگار دھلی" نے بھی پہلے شاہ غلام علی سے آپ کی بیعت پھر اپنے والد ماجد سے طے مقامات کا ذکر کیا ہے - (۴) لیکن آپ کو کسب نسب اور اجازت و خلافت حضرت شاہ غلام علی رحمتہ اللہ علیہ سے حاصل تھی۔ (۵)

---

(۱) محمد حسن، مولوی: " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ "، محولہ بالا، ص ۳۴۹
(۲) ایضاً، ص ۳۵۰
(۳) ایضاً، ص ۳۵۰
(۴) احمد ولی اللہی، سید: " یادگار دھلی"، محولہ بالا، ص ۸۹
(۵) محمد حسن، مولوی: " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا، ص ۳۴۹

سلوک اور طریقت کے علاوہ معقولات اور درس و افتا میں بھی صدر نشین خانقاہ تھے - سرسید نے علم حدیث و فقہ و تفسیر میں ان کے کمال کا اور دن رات مشغلہ درس و تدریس کا ذکر کیا ہے -(۱) خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :

" درس و تدریس کا محبوب مشغلہ تھا - دور دور سے طلبہ آپ کے پاس آتے تھے - علم دین پر بڑی مہر اور کامل واقفیت کی وجہ سے استفتا آپ کے پاس بھیجے جاتے تھے اور آپ کے فتوی کو نہایت عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا -" (۲)

ان کے علمی و دینی مقام کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ شاہ غلام علی نے انھیں ستون دین محمدی قرار دیا ہے - صاحب " خزینۃ الاصفیا" کی روایت ہے کہ شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے :

" ابو سعید رؤف ، بشارت اللہ اور احمد سعید اس زمانے میں ستون دین محمدی ہیں -" (۳)

مولانا بشارت اللہ بہرائچی کے نام ایک خط میں شاہ صاحب نے اپنے خلفا میں ان چاروں کو شرف امتیاز کی سند تحریر کی ہے - آپ فرماتے ہیں :

" چہار کس دریا ران من ممتاز اند شمار میان ابوسعید ، و رؤف احمد و احمد سعید -" (۴)

آپ اپنے مریدین کو سنت و شریعت پر عمل کی تلقین فرمایا کرتے تھے - آپ کے زمانے میں شاہ غلام علی کی خانقاہ کی شان و شوکت برقرار رہی ان کے یہاں ہندوستان و خراسان سے لوگ آتے تھے اور ان کے خلفاء قندھار کابل میں موجود تھے -

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۱۷
(۲) خلیق احمد نظامی ، " تاریخی مقالات"، دھلی : ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۴ع ، ص ۲۲۰-۲۱
(۳) غلام سرور لاھوری ، مفتی، " خزینۃ الاصفیا"، لکھنو : نول کشور پریس، ۱۹۱۳ع، ج ۱، ص ۷۰۹
(۴) محمد حسن ، مولوی ، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا ، ص ۳۷۳

انھوں نے شاہ غلام علی کے سلسلے کے بین الاقوامی نظام کو برقرار رکھا۔ ہندوستان سے باہر بھی ان سے عقیدت و ارادت کا یہی عالم تھا۔ (۱)

ان کے حالات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک مدبر اور سیاسی مبصر بھی تھے - وہ انگریزوں کی ملازمت کو پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے - مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک واقعہ خاص سرسید اور مولانا شاہ احمد سعید کے تعلق سے لکھا ہے :

" اوائل میں اصحاب علم و ککک تقوی انگریزیملازمت سے مجتنب رہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ نرم ہوتے گئے - چناں چہ دہلی کے کئی خاندانی آدمیوں نے ملازمت اختیار کرلی تھی۔ شاہ (عبدالعزیز) صاحب کا مولوی عبدالحئی اپنے خویش کو ملازمت سرشتہ کی اجازت دینا اس دروازے کی آخری بندش کا ٹوٹ جانا تھا۔ البتہ خانقاہ والوں کا مسلک غدر تک یہی رہا - وہ انگریزی حکومت کے نوکروں سے کسی طرح کا نذرانہ یا تحفہ قبول نہیں کرتے تھے - وہ کہتے تھے کہ ان کا وسیلہ معیشت مشتبہ ہے -

سرسید احمد خاں مرحوم بھی خانقاہ کے مریدوں میں سے تھے۔ اور شاہ غلام علی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے جب انگریزی نوکری کرلی اور اس کے بعد ملنے گئے اور حسب معمول نذر لے گئے تو خانقاہ کے تمام مشائخ نے یہ قبول کرنے سے انکار کردیا۔" (۲)

مولانا ابوالکلام نے خانقاہ والوں کے جس مسلک سیاسی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بالکل درست ہے - لیکن ان کے بیان کا آخری حصہ واقعتاً صحیح نہیں ہے یعنی یہ واقعہ سعائے دنیا کے نیچے پیش نہیں آیا کہ سرسید انگریزی نوکری اختیار کرنے کے بعد

---

(۱) خلیق احمد نظامی، " تاریخی مقالات"، دہلی : ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۶ء، ص ۲۲۱
خلیق احمد نظامی، "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ"، دہلی : ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۶

(۲) مہر، مولانا غلام رسول، " نقش آزاد"، از مولانا ابوالکلام آزاد، لاہور : کتاب منزل، ۱۹۵۹ء، ص ۳۱۵

نذر پیش کرنے خانقاہ گئے ہیں اور خانقاہ والوں نے بہ وجہ مذکورہ نذر قبول کرنے سے انکار
انکار کردیا ہو ـ مولانا آزاد کو اس سلسلے میں نہایت تسامح ہوا۔ فی الحقیقت یہ ایک خواب تھا جو سرسید نے دہلی میں مصلی کے زمانے میں دیکھا تھا اور " حیات جاوید" کے ساتھ بطور ضمیمہ " سرسید کے چند خواب " میں موجود ہے ـ چوں کہ اس خواب سے اہل خانقاہ سے سرسید کی عقیدت اور خانقاہ والوں کے مسلک کا پتا چلتا ہے اس لیے اس کا یہاں نقل کرنا نا مناسب نہ ہوگا ـ لکھتے ہیں :

• وہ دلی میں منصف تھے کہ انھوں نے (خواب میں) دیکھا کہ وہ گویا بیعت کے ارادے سے خانقاہ جانے کو اپنے گھر سے اٹھے ہیں۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ ان کو خیال ہوا کہ نذر کے لیے کچھ لے لینا چاہیے ـ اس وقت انھوں نے دیکھا کہ ایک ہندو دوست ان کے پاس کھڑا ہے ـ سید نے پندرہ روپے اس سے قرض لیے اور خانقاہ میں گئے ـ وہاں دیکھا کہ شاہ ابوسعید صاحب اور ان کے پاس شاہ احمد سعید صاحب اور ان کے پاس شاہ عبدالغنی صاحب اور سب کے پیچھے میاں محمد مظہر بیٹھے ہیں۔ شاہ ابوسعید صاحب نے بیعت کو لینے کو فرمایا ـ سید نے کہا میں تو اسی ارادے سے آیا ہوں لیکن بالکل جو طریقہ مسنون ہے اسی طرح پر بیعت کرنی چاہتا ہوں ـ فرض کرو کہ اس قسم کے زہد و مجاہدے میں جو مسنون نہیں ہیں صفائی قلب جلد حاصل ہوتی ہے اور جو طریقہ مسنون ہے اس میں بہ دیر حاصل ہوتی ہے تو مجھے وہ جلدی نہیں بلکہ وہ دیر پسند ہے ـ

ہنوز شاہ صاحب نے جواب نہیں دیا تھا کہ میاں مظہر بولے کہ دیکھیے حضرت یہ کیسی وہابیوں کی سی باتیں کرتے ہیں ـ شاہ ابو سعید نے ناراضی سے جواب دیا کہ ایک شخص اتباع سنت چاہتا ہے اور تم اس کی نسبت کہتے ہو کہ وہابیوں کی سی باتیں کرتا ہے ـ

اس کے بعد وہ سید کی طرف متوجہ ہوئے اور سید سے کہا کہ نقشبندی طریقے میں کوئی امر بھی خلاف سنت نہیں ہے ـ سید نے کہا کہ بہت اچھا ـ اس وقت

سید نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر بعد بیعت کے نذر دی جائے گی تو گویا اس کا معاوضہ ہوگا۔ بہتر ہے کہ پہلے نذر دی جائے اور اس کے بعد بیعت ہو ۔ پس سید نے پانچ روپے نکال کر شاہ ابوسعید صاحب کے نذر کیے اور پانچ روپے شاہ احمد سعید صاحب کے ۔ دونوں صاحبوں نے نذریں لے لیں۔ جب شاہ عبدالغنی صاحب کو نذر دی تو انھوں نے کہا کہ تم انگریزوں کے نوکر ہو، میں نہیں لیتا۔ سید نے کہا میری تنخواہ کا روپیہ نہیں ہے ۔ میں تو ایک ہندو سے قرض لے کر لایا ہوں۔ اس پر انھوں نے لینے سے انکار کیا۔ شاہ ابوسعید صاحب نے فرمایا کہ یہ نہیں لیتے تو ان کی والدہ کے پاس بھیج دو۔ اس گفتگو کے بعد نوبت بیعت تک نہیں پہنچی کہ آنکھ کھل گئی۔" (۱)

یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یہ حالی کی تحریر ہے ۔ انھوں نے سرسید کے خواب کو اپنے لفظوں میں بیان کردیا ہے ۔ مولانا حالی کے بقول یہ سرسید کی اپنی تحریر ہے۔ سرسید نے خواب ایسے طور پر لکھوائے ہیں کہ گویا دوسرا شخص ان کے خواب لکھ رہا ہے۔" حالی نے اس بیان کو اسی طرح نقل کردیا ہے ۔ چوں کہ سرسید کا خیال تھا کہ جو کچھ ذہن و خیال میں ہوتا ہے خواب میں وہی نظر آتا ہے ۔ اس لیے اس خواب کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

" دہلی میں جو لوگ مقدس تھے وہ انگریزوں کی ایسی نوکری کو جس میں انفصال مقدمات کا کام نہیں ہوتا تھا بلکہ بطور صلہ کے کام کرنا ہوتا تھا اور نیز اس کی نوکری کو جائز سمجھتے تھے اور جن عہدوں میں انفصال مقدمات کا کام ہوتا تھا جیسے منصفی اور صدرالصدوری ، اس کو ناجائز سمجھتے تھے چوں کہ خلاف شرع بموجب انگریزی قانون کے مقدمات فیصل کرنے پڑتے تھے شاہ عبدالغنی صاحب کا بھی یہی حال تھا اور اسی سبب سے انھوں نے نذر لینے

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، کان پور :نامی پریس، ۱۹۰۱ع ، ضمیمہ نمبر۳، ص ۱۳-۱۲
اسمعیل پانی پتی، " مقالات سرسید"، لاہور :مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ع ، حصہ پانزدہم ، ص ۸۰-۱۷۹

سے انکار کیا تھا۔" (۱)

خواب پر سرسید کے اس تبصرے ہی سے شاید مولانا ابوالکلام آزاد کو اشتباہ ہوا کہ یہ امر حقیقت کی دنیا میں پیش آچکا ہے -

سرسید کے اس خواب اور تبصرے سے شاہ عبدالغنی کے حسن خیال کی طرف اشارہ ملتا ہے اس کی تصدیق ارواح ثلاثہ کی ایک روایت سے بھی روشنی پڑتی ہے - روایت ہے کہ ان کے گھر میں کسی وقت کے فاقے کا سن کر صدرالصدور مفتی صدرالدین آزردہ نے کچھ رقم بھیجی لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا اور جب خود مفتی صاحب نے حاضر ہوکر یہ رقم قبول کرلینے پر اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں آپ کی نوکری کو اچھا نہیں سمجھتا اس لیے اس کو لینے سے معذور ہوں (۲) - اسی قسم کا ایک اور واقعہ مولف" ارواح ثلاثہ" نے" تذکرہ الرشید" کے حوالے سے نقل کیا ہے -(۳) سرسید نے شاہ احمد سعید کا تذکرہ نہایت عقیدت کے ساتھ لکھا اور جب ۱۸۵۳ع میں سرسید قائم مقام صدرامین ہوکر دھلی سے رھتک جارہے تھے(۴) تو حسب روایت شاہ صاحب سے ملاقات و اجازت کے لیے تشریف لے گئے - یہ تذکرہ خود سرسید نے اپنے قلم سے تحریر کیا ہے- سرسید لکھتے ہیں :

" جب میں دھلی سے رھتک جانے والا تھا - حضرت شاہ احمد سعید صاحب کی خدمت میں رخصت کے لیے حاضر ہوا- اس وقت ایک عورت ایک نہایت

-----

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین" حیات جاوید"، محولہ بالا، ضمیمہ ۳، ص، ۱۳-۱۴
اسمعیل پانی پتی، " مقالات سرسید"، محولہ بالا، حصہ پانزدھم، ص، ۸۰-۱۷۹
(۲) اشرف علی تھانوی، مولانا" ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا، ص، ۱۲۹
(۳) ایضاً، ص، ۷۱-۱۷۰
(۴) حالی، خواجہ الطاف حسین" حیات جاوید"، محولہ بالا، حصہ اول، ص، ۵۲

ترو تازہ رنگترہ لائی اور شاہ احمد سعید کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے اس کو لے کر رکھ لیا۔ میرے دل میں یہ بات آئی کہ اگر شاہ صاحب یہ رنگترہ مجھ کو دے دیں تو میرے سفر کے لیے ایک فال نیک ہوگی۔ جب میں رخصت ہوکر جانے لگا تو شاہ صاحب نے وہ رنگترہ اٹھاکر مجھ کو دے دیا کہ آپ اس کو لیتے جائیے۔ میں چوں کہ ایک دنیا دار تھا اور گوکہ شاہ صاحب کی خدمت میں مجھ کو عقیدت تھی اور ہے ۔ مگر اس کو ایک امر اتفاقی سمجھا اور جو لوگ کہ مریدان خاص حضرت شاہ صاحب تھے انھوں نے اس امر کو خطرات قلب پر بطور مکاشفہ کے مطلع ہونا قرار دیا۔" (۱)

اس سے جہاں سرسید کی زندگی کے ایک خاص واقع اور حضرت شاہ احمد سعید سے ان کی عقیدت کا حال معلوم ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس زمانے میں ان کے فکری انقلاب کی بنیادیں پڑچکی تھیں۔

شاہ احمد سعید ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کے زمانے میں بھی حالات سے بے تعلق نہیں تھے فتوی جہاد پر ان کے دستخط موجود ہیں۔(۲) یہ فتوی جہاد ۳ ذی الحجہ ، ۱۲۷۳ھ/۲۷ جولائی، ۱۸۵۷ء کے "صادق الاخبار" میں چھپا تھا۔ اور جب انھیں دنوں میں بعض نام نہاد مجاہدین نے غلط راستہ اختیار کیا تو وہ ان کے خلاف علم جہاد بلند کرکے تیغ بکف میدان عمل میں اتر آئے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب خانقاہ و سجادہ ہونے کے باوجود عملی سیاست سے بے تعلق اور کوتاہ بیں نہ تھے ۔

---

(۱) "آخری مضامین سرسید"، لاہور: اللہ والے کی قومی دکان، ۱۸۹۸ء "واقعات نامۂ الورود"، (مضمون مکشوفہ) ، ص ۹۲-۹۳
اسمعیل پانی پتی، (مرتبہ) "مقالات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء حصہ اول، ص ۱۱۵

(۲) عتیق صدیقی، "۱۸۵۷ء — اخبار اور دستاویزیں"، دھلی: مکتبہ شاہ راہ ، ۱۹۶۶ء، ص ۱۹۹

عبداللطیف اپنے روز نامچے میں لکھتا ہے :

" ۸ ذی الحجہ ء/ ۳۱ جولائی (۱۸۵۷ ء) :

جب ان (باغیوں) کی سرکشی حد سے گزرگئی تو تمام مسلمانوں نے ان تادیب کی کوشش کی ۔ شاہ غلام علی رحمتہ اللہ علیہ کے جانشین ، مولانا شاہ احمد سعید جو قابل تعریف اور برگزیدہ ہستی ہیں سب سے پہلے ان مفسدوں سے جہاد کے لیے اٹھے اور جہاد کا جھنڈا جامع مسجد کے سامنے نصب کردیا اور جہاد کی تلقین کی اور عام دعوت دی۔ جوں ہی لوگوں نے سنا ان کے گرد آکر جمع ہونے لگے ۔ جامع مسجد کے سامنے عقیدت مندوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ گر مجاہدین نے اسی جگہ کو اپنا مسکن بنالیا۔ اکثر دکان داروں نے انھیں خورد و نوش دینے کی ہمت کی ۔ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو انھیں غصہ آیا اور کہا : یقیناً اس خانہ خراب گروہ (باغیوں) نے ہماری یہاں بھی خرابی پیدا کی ۔ ان کی سرزنش کے لیے ضرور اٹھنا چاہیے لیکن اس میں کچھ تامل ضروری ہے ـــــ

بتندی سبک دست بردن بہ تیغ

بدندان برو پشت دست دریغ

بادشاہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ باغیوں کا ایک کمینہ صفت جرگہ شکوہ و شکایت کرتا اور شور مچاتا ہوا بارگاہ میں داخل ہوا۔ پس بادشاہ نے مفتی صدر الدین خاں کی زبانی جو سنجیدہ گو، شگفتہ مزاج ، ذی علم اور بالحاظ آدمی تھے (مولانا شاہ احمد سعید) کے پاس کہلا بھیجا اور یہ شعر بھی اپنے قلم سے لکھ کردیا ـــــ

رخ عتاب ابی یار گر بہشت عاز دردکسے

دارویں آں بہ کہ دھر کز حیاز درد کسے " (۱)

لیکن جب شر پسندوں کی روک تمام کردی گئی

ہنگامہ غدر میں شہر خالی ہوگیا۔ انھوں نے بھی اہل و عیال کو شہر سے باہر قطب صاحب کو بھیج دیا لیکن خود خانقاہ سے باہر قدم نہیں نکالا ۔ لیکن جب دھلی

---

(۱) خلیق احمد نظامی(مرتب) ، " ۱۸۵۷ ء کا تاریخی روزنامچہ"، محولہ بالا ، ص ۵۵-۱۵۴

لیکن جب دہلی میں قیام کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ہجرت کا ارادہ کرلیا - چناں چہ خانقاہ کا انتظام اپنے مرید و خلیفہ حاجی دوست محمد قندھاری کے سپرد کیا اور خود اہل و عیال کے پاس چلے گئے - کچھ دنوں کے بعد محرم، ۱۲۷۳ھ میں بہ راہ پنجاب حجاز کے لیے ہجرت فرما ہوئے - آخر شوال ۱۲۷۳ھ میں مکہ مکرمہ پہنچے -(۱) وہاں سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی - سلطان ترکی کی جانب سے آپ کا وظیفہ مقرر ہوگیا تھا - ان افکار دنیوی سے مطمئن اور ذکر و فکر میں زندگی بسر کی - ۲ ربیع الاول، ۱۲۷۷ھ/ ۱۸ ستمبر، ۱۸۶۰ء بروز سہ شنبہ ظہر و عصر کے درمیان میں انتقال فرمایا - اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے روضے کے قریب مدفون ہوئے - (۲) صاحب تذکرہ اولیا ے ہند و پاکستان نے آپ کا سال انتقال ۱۲۷۰ھ/ ۵۴-۱۸۵۳ء تحریر کیا ہے -(۳) یہ صریح غلط ہے -

ہندوستان سے شاہ احمد سعید کے ہجرت کرجانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ غلام علی کی خانقاہ کو جو عالم اسلام میں مرکزیت حاصل تھی وہ ختم ہوگئی - آپ کے بعد ہندوستان کی سر زمین میں اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں پھر اس پائے کا کوئی شیخ طریقت پیدا نہیں ہوسکا جو دہلی کی مرکزی خانقاہ کو اس کی کھوئی ہوئی عظمت واپس دلاتی - پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :

"ان کے ہندوستان سے چلے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدت و ارادت کا ایسا مرکز ٹوٹ گیا جس کے ذریعہ ہندوستان کے مسلمانوں کا تمام ممالک اسلامیہ سے قریبی روحانی رشتہ بندھا ہوا تھا - ان کے ہندوستان میں قیام کے زمانے میں عرب و عجم کے بہت سے لوگ دہلی کی طرف ہی رجوع کرتے تھے -" (۴)

---

(۱) عبدالحئی، مولانا سید "نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۲-۳۱
(۲) ایضاً، ج ۷، ص ۳۲
احمد ولی اللہی، سید "یادگار دہلی"، محولہ بالا، ص ۹۰
(۳) اختر دہلوی، مرزا محمد "تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان"، محولہ بالا، ص ۳۵۲
(۴) خلیق احمد نظامی "تاریخی مقالات"، محولہ بالا، ص ۲۲۲

پروفیسر موصوف نے ایک اور جگہ آپ کی ہجرت سے خانقاہ شاہ غلام علی کی ویرانی کا تذکرہ کیا ہے - فرماتے ہیں :

" شاہ احمد سعید نے حرمین شریفین کی راہ لی اور شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ کا چراغ گل ہوگیا۔" (۱)

آپ کے ساتھ آپ کے دونوں چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی مجددی اور شاہ عبدالمغنی بھی مع اہل و عیال کے ہجرت کرگئے تھے۔ اگرچہ آپ نے درس و تدریس حدیث و تفسیر و فقہ کا سلسلہ بھی ایک مدت تک جاری رکھا اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کو آسمان شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا اور اس کی حدیں ہندوستان سے نکل کر کابل و قندھار اور سمرقند و بخارا و حجاز تک پھیل گئیں - آپ کی ذات گرامی ایک چشمہ فیض تھا جس سے ہزار ہا تشنہ لب سیراب ہوئے پھر بھی آپ کے تلامذہ اور آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہونے والے ہزارہا افراد میں سے صرف چند نام ملے ہیں۔ صاحب " مشائخ نقشبندیہ " نے آپ کے نامور خلفا میں سے مولانا محمد ارشاد حسین رام پوری ، مولانا ولی الدین اور دوست محمد قندھاری ، اور آپ سے بیعت ہونے والوں میں آپ کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالمغنی کا ذکر کیا ہے - (۲) اور صاحب تذکرہ علمائے ہند نے مولوی جلال الدین رام پوری کی آپ سے بیعت اور مولانا رشیدالدین گنگوہی کے تلمذ کا ذکر کیا ہے۔(۳) مرزا محمد اختر دہلوی نے مولوی محمد غوث (پنجاب) کا ان کے مرید کی حیثیت سے بزرگان مشہور مجددیہ کے سلسلے میں ذکر کیا ہے - مولانا ارشاد حسین رام پوری کی

---

(۱) خلیق احمد نظامی، پروفیسر: "تاریخ مشائخ چشت"، اسلام آباد : دارالمؤلفین، ۱۹۷۵ء، ص ۳۲۷

(۲) محمد حسن نقشبندی مجددی، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا، ص ۳۲۷ اور ۲۹-۳۲۶

(۳) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) : "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۵۲۶ اور ۵۷۰

(۳) مختر دہلوی، مرزا محمد : "تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان"، محولہ بالا ، ص ۳۵۲

بیعت کا تذکرہ محمد ایوب قادری نے بھی کیا ہے - (۱)

آپ کے تین بیٹے تھے تینوں عالم و فاضل اور اصحاب ارشاد و سلوک میں سے تھے۔ تینوں نے باپ کے ساتھ ہی ہجرت کی تھی - بڑے صاحب زادے مولانا شاہ عبدالرشید تھے۔ اپنے باپ کے سچے جانشین ہوئے۔ ۱۲ ذی الحجہ ، ۱۲۸۶ھ/ ۱۹ مارچ ، ۱۸۷۰ء کو مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ دوسرے صاحب زادے مولانا شاہ محمد عمر تھے - یہ بھی عالم دین اور بیعت و ارشاد کے لیے اپنے والد ماجد کی جانب سے خلیفہ و مجاز تھے۔ اپنے صاحب زادے شاہ ابوالخیر محی الدین کی شادی کے سلسلے میں رام پور تشریف لے گئے۔ ۲ محرم الحرام ، ۱۲۹۸ھ/ ۵ دسمبر، ۱۸۸۰ء کو رام پور میں انتقال فرمایا۔ اور چھوٹے صاحب زادے مولانا شاہ محمدمظہر تھے۔ حافظ قرآن اور عالم دین تھے۔ مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے۔ وہیں ۱۱ محرم ، ۱۳۰۱ھ/ ۱۲ نومبر، ۱۸۸۳ء کو انتقال فرمایا۔(۲)

آپ کی علمی یادگار " الاخبار الاربعہ دربیان سلاسل اربعہ" ،" الحق المبین فی الرد علی الوہابین ، الفوائد الضابطہ فی اثبات الرابطہ ، الذکر الشریف دراثبات مولد شریف ، سعید البیان فخر سید الانس و الجان پانچ رسائل ہیں۔ (۳) آخر الذکر رسالہ اردو میں ہے۔ جسے ڈاکٹر غلام مصطفی خان صاحب نے ایک مختصر و مفید مقدمہ کے ساتھ چھپوادیا ہے۔

---

(۱) ایوب قادری ، محمد (مترجم و مرتب) " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۵۲۰

(۲) محمدحسن نقشبندی مجددی ؛" مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا ، ص ۲۲-۳۵۵
احمد ولی اللہ مشتاق ؛" یادگار دہلی"، محولہ بالا ، ص ۹۱-۹۰
نذیر احمد ، محمد ؛" تذکرۃ العابدین" علی گڑھ : تجارتی پریس، ۱۹۶۷ء ، ص ۲۸۰
احمدسعید دہلوی ، " سعیدالبیان فی سید الانس والجان"، حیدرآباد (سندھ) : ۱۳۸۵ھ ، مقدمہ از ڈاکٹر غلام مصطفی خان ، ص ۲

(۳) ایضاً ، " مقدمہ" از ڈاکٹر غلام مصطفی خان ، ص ۳

ان کے علاوہ " تحفہ زواہد " کے نام سے حضرت شاہ احمد سعید کے مکاتیب کا مجموعہ بھی ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب نے مرتب کرکے چھپوادیا ہے - مولانا عبدالحی نے " فوائد ضابطہ " اور انہار اربع کے علاوہ ان کی ایک کتاب تصحیح المسائل فی الرد علی مائۃ مسائل" کا ذکر بھی کیا ہے -

سرسید نے آپ کا ترجمہ مشائخ کے ضمن میں شامل کیا ہے - بلا شبہ طریقت و سلوک میں ان کا فیضان ہدایت و ارشاد و علم اور عمدہ کیر ہوا لیکن جیسا کہ خود سرسید نے کہا ہے " کہ علم حدیث و فقہ و تفسیر بدرجہ کمال حاصل ہے اور دن رات مشغلہ درس و تدریس جاری ہے-" (۱) اور مولانا عبدالحی نے انہیں " العالم الکبیر الفقیہ " لکھا ہے - ہم نے بھی انہیں علمائے دین اور اصحاب درس و تدریس ہی میں شمار کرنا مناسب سمجھا - (۲)

===XXX====

جناب مولوی احمد علی صاحب مرحوم :

جناب مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم کے واقعہ کی خبر ہم لکھ ہی چکے تھے کہ دفعتاً ہم کو دوسری ویسی ہی حسرت ناک خبر جناب مولوی احمد علی صاحب مرحوم محدث سہارن پور کے واقعہ جان کاہ کی پہونچی جناب موصوف نے مولوی محمد قاسم صاحب کی رحلت سے دوسرے دن اس جہان گذران سے بمقام سہارن پور رحلت فرمائی- انا للہ و انا الیہ راجعون -

مولوی محمد قاسم صاحب کے واقعہ کے متصل اس واقعہ کا ہونا اور بھی زیادہ حسرت اور افسوس کا باعث ہے - ایک ہی وقت میں دو ایسے بزرگان دین کا ایک ہی حصۂ ملک سے اٹھ جانا درحقیقت نہایت اندوہناک واقعات ہیں- مولوی احمد علی صاحب م

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۱۷

(۲) عبدالحی، مولانا سید " نزہتہ الخواطر" ، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۰

اگرچہ اب بہت ضعیف ہوگئے تھے لیکن با ایںہمہ بہت غنیمت تھے - انھوں نے حدیث کو اس طریق پر حاصل نہیں کیا تھا جس طرح اور اکثر علماء کا دستور ہے کہ سند کے سلسلہ کو درست کرنے کی نیت سے کسی کتاب کے چند ورق یا چند جزو کسی صاحب سند عالم سے پڑھ لیے اور بے فکر ہوگئے - جناب مولوی احمد علی صاحب مرحوم نے تمام کتب صحاح اور بعض دیگر کتب حدیث کو من اولہ الی آخرہ جناب مولوی محمد اسحاق صاحب سے سبقاً سبقاً پڑھا تھا اور جب کہ مولوی محمد اسحاق صاحب نے دھلی سے ہجرت فرمائی تو مولوی احمد علی صاحب بھی مکہ معظمہ تشریف لے گئے - اور خاص حرم بیت اللہ میں حدیث کی کتابوں کو مولوی محمد اسحاق صاحب سے تمام کیا اور اس کے بعد ھندستان کو واپس آئے اور یہاں پہونچکر انھوں نے حدیث کی کتابوں کو نہایت عمدگی اور صحت سے چھاپا اور ان کو مشتہر کیا خصوصاً بخاری کو جس خوبی سے اور عمدگی سے انھوں نے چھاپا وہ ان کی ایک بے نظیر کوشش تھی۔

آخر عمر میں جناب ممدوح نے اپنے آپ کو مدرسہ اسلامیہ سہارن پور کی خدمات کے لیے جو کچھ اس وقت میں ان سے ممکن تھیں وقف کردیا تھا اور اسی شغل میں ان کا حسن خاتمہ ہوا خدا غریق رحمت کرے -

یہی راہ سب کو چلنی ہے جو اس وقت زندہ ہیں ان کی نسبت کسی وقت سنا جاوے گا کہ نہیں ہیں۔

کل من علیھا فان و یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام -(۱)

تعلیقات :

مولانا احمد علی سہارن پوری ، عالم ، فاضل ، فقیہہ ، محدث ، جامع معقول و منقول ، حاوی فروع و اصول تھے - (۲) ان کی تاریخ پیدائش کا پتا نہیں چل سکا۔

---

(۱) سرسید احمد خاں: "جناب مولوی احمد علی صاحب مرحوم"، (مضمون)، "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"، علی گڑھ، ۲۲ اپریل، ۱۸۸۰ء، جلد ۱۵، شمارہ ۳۲، کالم، ص ۶۷ - ۶۸ء

(۲) فقیر محمد جہلمی: "حدائق الحنفیہ"، لکھنو: نولکشور، ۱۸۹۱ء، ص ۴۹۳

لیکن ۱۲۹۷ھ میں انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۲ برس کی تھی۔ (۱) اس سے سال پیدائش تقریباً ۱۲۲۵ھ نکلتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف و مولد سہارن پور میں حاصل کی۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا پھر عربی و فارسی کتب کا آغاز ہوا۔ تکمیل کے لیے دہلی گئے۔ ان کے اساتذہ میں شیخ وجیہہ الدین صدیقی سہارن پوری، مولانا مملوک علی نانوتوی، شاہ محمد اسحاق دہلوی، اور مولانا عبدالحی بڈھانوی کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔(۲) شاہ اسحاق سے انھوں نے دہلی میں اور پھر حجاز میں حدیث پڑھی تھی اور سندِ حدیث و اجازت حاصل کی تھی۔ صاحبِ "حیاتِ شبلی" نے یہ سند نقل کردی ہے۔(۳) سرسید نے ان کی تحصیل حدیث کی اس خصوصیت کا بھی ذکر کردیا ہے کہ انھوں نے محض رسماً سند و اجازہ حاصل نہ کیا تھا بلکہ تمام کتب صحاح و دیگر کتب حدیث کو من اولہ الی آخرہ جناب مولوی محمد اسحاق صاحب سے تمام کیا اور اس کے بعد ہندوستان آئے۔ (۴) شاہ اسحاق سے انھوں نے جو کتابیں پڑھی تھیں ان کی تفصیل سند میں موجود ہے۔ اس کی روشنی میں "صحیح بخاری" کو سرسید کے اس بیان سے مستثنیٰ کردینا

---

(۱) احمد رضا بجنوری، سید: "انوار الباری، اردو شرح صحیح البخاری"، (مقدمہ)، دیوبند: مکتبہ ناشر العلوم، ۱۹۶۲ء، حصہ دوم، ص ۲۱-۲۲۰

(۲) ایوب قادری، محمد، (مترجم و مرتب): "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۲۶۱
سلیمان ندوی، سید: "حیات شبلی"، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۴۳ء، ص ۸۵
فضل حسین بہاری، "الحیاۃ بعد المماۃ"، کراچی: حافظ محمد شہید اینڈ برادرس، ۱۹۵۹ء، ص ۵۰
ابویحییٰ امام خان نوشہروی، "تراجم علمائے حدیث ہند"، ۱۹۳۸ء، ج اول، ص ۱۲۰
احمد رضا بجنوری، سید: "انوارالباری، اردو شرح صحیح البخاری"، محولہ بالا، (مقدمہ)، حصہ دوم، ص ۲۱-۲۲۰
ایوب قادری، محمد: "مولانا محمد احسن نانوتوی"، کراچی: روھیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، ۱۹۶۶ء، ص ۳۳ اور ۱۸۳

(۳) فقیر محمد جہلمی، "حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۴۹۳
سلیمان ندوی، سید: "حیات شبلیؒ"، محولہ بالا، ص ۸۴-۸۵
احمد رضا بجنوری، سید: "انوار الباری اردو شرح صحیح البخاری"، محولہ بالا، (مقدمہ) ج ۲، ص ۲۲۱

(۴) سرسید احمد خان: "جناب مولوی احمد علی مرحوم"، "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"، ۲۴ اپریل، ۱۸۸۰ء، ص ۴۷۸

چاهیے اس لیے کہ شاہ صاحب نے اپنی عطا کردہ سند میں صاف لکھ دیا ہے :

" ان الحافظ الموصوف قرأ طرفاً من الصحیح البخاری و طرفاً سمع بقرأۃ الغیر علی۔" (۱)

انھوں نے حرمین شریفین کے دیگر علما و مشائخ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ (۲)

مولانا احمد علی سہارن پوری ۱۲۶۱ھ میں حجاز تشریف لے گئے تھے ۔(۳) اسی سفر مبارک کے موقع پر انھوں نے شاہ اسحاق صاحب سے دوبارہ استفادہ کیا تھا۔ واپس وطن آکر انھوں نے دہلی میں " مطبع احمدی" قائم کرلیا تھا اور اپنے خاص ذوق حدیث کے مطابق کتب حدیث کی تصحیح و اشاعت کے کام میں مصروف ہوگئے تھے ۔ ان کی اس خدمت کا ذکر سرسید نے بھی کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

" اس کے بعد ہندوستان کو واپس آئے اور یہاں پہنچ کر انھوں نے حدیث کی کتابوں کو نہایت عمدگی اور صحت سے چھاپا اور ان کو مشتہر کیا۔ خصوصاً بخاری کو جس خوبی سے اور عمدگی سے انھوں نے چھاپا، وہ ان کی ایک بے نظیر کوشش تھی۔" (۴)

سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں ان کی خدمت تصحیح و اشاعت کتب حدیث پر روشنی ڈالی ہے :

" علاوہ درس و تدریس کے مولانا سہارن پوری کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کرکے چھاپ کر عام کیا۔ چنانچہ ۱۲۶۵ھ میں جامع ترمذی اور ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری شائع کی۔

---

(۱) سلیمان ندوی، سید : " حیات شبلی"، محولہ بالا، ص ۸۲-۸۴

(۲) فقیر محمد جہلمی، " حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۴۹۳

(۳) سلیمان ندوی، سید : " حیات شبلی"، محولہ بالا، ص ۸۵

(۴) سرسید احمد خان، " جناب مولوی احمد علی صاحب مرحوم"، " علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"، ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء، ص ۴۶۸-۴۶۹

مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ استاد موصوف نے بیس برس کامل بخاری کی تصحیح و تحشیہ میں بسر کیے۔" (۱)

محمد ایوب قادری لکھتے ہیں :

" مولانا احمد علی سہارنپوری نے ۱۲۶۲ھ میں حجاز سے واپس آنے کے بعد دھلی میں ایک پریس "مطبع احمدی" کے نام سے قائم کیا تھا اور اس مطبع سے بالخصوص کتب حدیث کی اشاعت کا خوب کام ہوا۔" (۲) جامع ترمذی اور صحیح بخاری کے علاوہ اس مطبع سے مشکوۃ المصابیح بھی نہایت اہتمام سے شائع ہوئی تھی ۔(۳) بخاری کے آخری پانچ چھ پاروں کے تحشیہ و تصحیح نگاری اور تصحیح کی خدمت مولانا قاسم نانوتوی نے انجام دی تھی ۔" (۴)

مولانا احمد علی سہارنپوری نے صرف تصحیح متن اور اشاعت ہی کا اہتمام نہیں کیا تھا بلکہ ان کتابوں پر حواشی اور تعلیقات بھی تحریر فرمائے تھے ۔(۵)

صاحب " حدائق الحنفیہ" نے ان کے اس کمال کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" پھر دھلی میں آکر مطبع احمدی نام سے جاری کیا جو غدر تک بڑے زور و شور سے جاری رہا اور اس میں بڑی بڑی علمی کتابیں آپ کے اہتمام اور تحشی سے چھپتی رہیں۔ خصوصاً صحیح بخاری وغیرہ پر آپ نے عمدہ حواشی چڑھائے اور ان میں حنفی مذہب کی خوب تائید کی ۔" (۶)

---

(۱) سلیمان ندوی، سید : "حیات شبلی"، محولہ بالا، ص ۸۵

(۲) ایوب قادری، محمد : "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۱-۲۱۰

(۳) ایضاً، ص ۲۱۱

(۳) ایضاً، ص ۱۱-۲۱۰

محمد یعقوب نانوتوی، مولانا : "حالات مولوی محمد قاسم"، بہاول پور : مطبع صادق الانوار، ۱۲۹۷ھ، ص ۷-۶

(۵) احمد رضا بجنوری، سید : "انوار الباری اردو شرح صحیح البخاری"، محولہ بالا (مقدمہ)، ص ۲۲۱

(۶) فقیر محمد جہلمی، " حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۴۹۳

کتب حدیث پر حواشی و تعلیقات نگاری کی علمی و دینی خدمت کے علاوہ ان کے چند تراجم و تصنیفات کا بھی پتا چلتا ہے ۔ ان کا ایک فارسی رسالہ " الدلیل القوی علی ترک القراۃ للمقتدی" ہے جس کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے ۔ (۱) ترجمہ مسند الاسلام بھی ان کی یادگار ہے ۔(۲) اور ان کا ایک فتوی میلاد و عرس کے بارے میں " فتاوی میلاد و عرس" کے نام سے مخطوطے کی شکل میں کتب خانہ آصفیہ ، حیدرآباد (دکن) اور کتبخانہ سورا لر الحکما ، حیدرآباد (دکن) کی زینت ہے ۔ (۳)

ھنگامہ ۱۸۵۷ء میں ان کا مطبع احمدی لٹ گیا تھا تمام کاروبار چوپٹ ہوگیا ، سہارن پور چلے آئے تھے اور دو برس تک اپنے مکان میں بیٹھ کر درس دیتے رہے ۔ پھر شیخ الٰہی بخش صاحب رئیس کمپ میرٹھ کی طرف سے کلکتے جاکر کاروبار جاری کیا۔ جس سے آپ کو پانچ سو روپے ماہوار کی آمدنی تھی اس زمانے میں بھی شیخ صاحب کی اجازت سے صبح سے دو بجے تک مسجد حافظ جمال الدین میں درس دیتے تھے ۔ تقریباً دس برس کلکتے میں قیام رہا۔ پھر پیرانہ سالی کی وجہ سے وطن لوٹ آئے اور سہارن پور میں بیٹھ کر آخیر وقت تک درس و تدریس حدیث میں مصروف رہے(۴) وہ دارالعلوم دیوبند کی بنیادی اینٹ رکھنے والوں میں سے تھے (۵) (۶) مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے معین ومددگار [illegible] اور اسی مدرسہ سہارن پور میں خدمت درس و تدریس حدیث میں مصروف تھے۔(۷)

---

(۱) فقیر محمد جہلمی، " حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا ، ص ۲۹۳

(۲) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی (نگران) ، " قاموس الکتب "، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۱ء ، (اشاعت اول) ، جلد اول ، ص ۲۱۹

(۳) ایضاً ، ج اول ، ص ۳۹۱

(۴) سلیمان ندوی ، سید ، " حیات شبلی"، محولہ بالا ، ص ۸۶

(۵) طیب ، مولانا قاری محمد ، " الہامی مدرسہ"، (مقالہ) ، " الرشید"، لاہور: [illegible] فروری-مارچ ، ۱۹۷۶ء، دارالعلوم دیوبند نمبر، ج ۴، ش ۳۹۲ ، ص ۱۳۹
ایوب قادری ، محمد ، مولانا احسن نانوتوی ، محولہ بالا ، ص ۲۱۶

(۶) ایضاً ، ص ۱۵۵

(۷) سلیمان ندوی ، سید ، " حیات شبلی"، محولہ بالا ، ص ۸۶

درس و تدریس حدیث کا انھیں بہت شوق تھا اور یہ مشغلہ انھوں نے زندگی بھر جاری رکھا ۔ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے :

" اللہ تعالی نے آپ کے درس میں بھی برکت بخشی اور سیکڑوں علماء اس فیض سے سرفراز ہوئے ۔" (۱)

ان کے تلامذہ میں سے مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا احمد حسن امروھوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، علامہ شبلی نعمانی اور ان کے ابنائے کرام مولانا خلیل الرحمن سہارن پوری اور مولانا حبیب الرحمان سہارن پوری نہایت نامور اور علم و عمل کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ (۲)

حضرت محدث سہارن پوری نے کتب حدیث کی تصحیح و اشاعت اور درس و تدریس کے ذریعے حدیث کی اشاعت میں سرگرم حصہ لیا ۔ مولانا محمد احسن نانوتوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی میں تصحیح و تحقیق حدیث کا ذوق انھیں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا ۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے ان کے مقام علمی پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :

" اس زمانے میں علمائے احناف میں موصوف سے بڑھ کر علم حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا۔" (۳)

ان کے اخلاق حمیدہ کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے مولانا شبلی مرحوم کا یہ قول نقل کیا ہے :

" وہ بے حد منکسر، متواضع اور نیک تھے ۔ کبھی مسجد میں امامت

---

(۱) احمد رضا بجنوری، سید ،" انوارالباری اردو شرح صحیح البخاری"، محولہ بالا ، حصہ دوم، ص ۲۲۱

(۲) ایوب قادری، محمد ،(مترجم و مرتب) " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۱۷۸ اور ۳۶۸

(۲) سلیمان ندوی ، سید ، " حیات شبلی"، محولہ بالا ، ص ۸۵ اور ۸۲ (حاشیہ)
ایوب قادری، محمد ،" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۳۱، ۸۹، ۹۰، ۲۰۹، ۲۱۲ و ۲۳۵

(۳) سلیمان ندوی، سید ،" حیات شبلی"، محولہ بالا ، ص ۸۵

نہیں کی، چپکے سے مسجد میں جاتے اور جماعت میں شامل ہوکر واپس آجاتے
بازار سے سودا خرید کر خود لاتے تھے۔" (۱)

صاحب " حدائق الحنفیہ" نے ۶ جمادی الاول، ۱۲۹۷ھ(۲) اور صاحب " حیات شبلی" نے ۷ جمادی الاول تاریخ وفات لکھی ہے ۔(۳) سید احمد رضا بجنوری نے حضرت نانوتوی کی وفات کے دو روز بعد لکھا ہے (۴) مولانا قاسم نانوتوی نے چونکہ ۴ جمادی الاول کو انتقال فرمایا تھا(۵) لہذا ان کے حساب سے تاریخ وفات ۶ ہوتی ہے۔صاحب " حیات شبلی" کو حضرت محدث سہارن پوری کے صاحب زادے مولانا خلیل الرحمن نے معلومات بہم پہنچائی تھیں(۶) اس لیے ہمارا خیال ہے کہ یہی تاریخ زیادہ قابل اعتماد ہے یعنی آپ نے ۷ جمادی الاول، ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸ اپریل، ۱۸۸۰ء بہ روز یک شنبہ سہارن پور میں رحلت فرمائی۔" غزادہ خوبی" آپ کی تاریخ وفات ہے - (۷)

======XXXXX=====

محی السنۃ قامع البدعۃ مولانا مولوی محمد اسمعیل رحمۃ اللہ علیہ :

" علم برکش ای آفتاب بلند	خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بنال اے دل رعد چوں کوس شاہ	بخند اے لب برق چوں صبح گاہ
ببار اے ہوا قطرۂ ناب را	بگیر اے صدف در کن ایں آب را
بر اے در از قعر دریاے خویش	بتاج سرشاہ کن جائے خویش

یعنی شاہ کشور شریعت گستری ملک الملوک دیار دین پروری، قامع بنیان شرک

---

(۱) احمد رضا بجنوری، سید "انوار الباری اردو شرح صحیح البخاری"، محولہ بالا، حصہ دوم، ص ۲۲۱
(۲) فقیر محمد جہلمی" حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۴۹۳
(۳) سلیمان ندوی، سید" حیات شبلی"، محولہ بالا، ص ۵۶
(۴) احمد رضا بجنوری، سید "انوار الباری اردو شرح البخاری"، محولہ بالا، حصہ دوم، ص ۲۲۱
(۵) محمد یعقوب، مولانا" حالات مولوی محمد قاسم "، محولہ بالا، ص ۳۰
(۶) سلیمان ندوی، سید"، " حیات شبلی"، محولہ بالا، ص ۸۵
(۷) فقیر محمد جہلمی" حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۴۹۳

و طغیان حاوی موجبات علم و ایقان ، موسس اساس کمال مہذب اوضاع حال و قال ، سالک مسالک ہدایت و ارشاد مجلّی آئینہ صافی اعتقاد ، مرکز دائرۂ علوم، مطلقۂ آسمان فہوم ، مرتقی مدارج درجات عالی پیشوائے ادنا و اعالی، مرجع و مآب فضائل ، کامروائے طبائع فاضل ، رموز فہم سرائر تفسیر قرآنی دقیقہ یاب معالم تقدیرات ربانی، جامع کمالات صوری و معنوی نکتہ سنج کلام الہی و حدیث نبوی، قدوۂ اعالی پیش گاہ قبول ، جلال غوامض معقول و منقول ، بانی مبانی فضل و افضال ، ممہد قواعد تکمیل و اکمال ، جاہد حق و یقین مثبت دلائل دین، مولائی مخدومی الاسامی مولوی محمد اسمعیل قدس سرہ ۔ آپ کو حضرات ثلثہ یعنی مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولانا شاہ رفیع الدین اور مولانا شاہ عبدالقادر غفراللہ لہم کے ساتھ نسبت برادر زادگی کی تھی اور بسبب اس کے کہ جناب جنت مآب مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے بعد انتقال والد ماجد ان کے ، بجائے فرزندی کے پرورش کیا تھا اور حضرت مرور مغفور کی خواہش بھی ان کے ساتھ منسوب تھیں۔ ان کی تربیت اپنے ذمہ لے کر روز شب حضرت کی تکمیل میں ساعی تھے ۔ از بسکہ جوہر قابل محتاج تربیت اور نیازمند تعلیم نہیں ہوتا، آپ کے آئینۂ خاطر نے صیقلۂ تائید الہی سے ایسی صفا اور جلا حاصل کی تھی کہ اسرار ازل بے حجاب آپ پر منکشف تھے ۔ اسی واسطے اوائل حال میں مطالعۂ کتب کی طرف چنداں التفات نہ فرماتے تھے ، اور حال یہ تھا کہ حضرت مرور کی خدمت میں زادے سبق خوانی نہ کرکر بیٹھتے ۔ از بسکہ بسبب استغنا کے یہ محفوظ نہ رہتا تھا کہ سبق کس جائے سے شروع ہوگا، کبھی اس کے بعد کی عبارت سے شروع کردیتے ۔ جب حضرت مغفور وہاں سے امتناع فرماتے تو آپ فرماتے کہ اس مطلب کو آسان سمجھ کر نہیں پڑھا اور فی الواقع اگرچہ مطلب عقدۂ لاینحل ہوتا۔ اس طرح اس کی تقریر کرتے کہ موجب حیرت اعالی و ادنی ہوتا اور کبھی اس کے ماقبل سے آغاز

کرتے - جب حضرت اس سے متنبہ فرماتے تو آپ اس میں کچھ شبہ کردیتے ، اور وہ شبہ ایسا ہوتا کہ حضرت استاد کو اس کے دفع میں بہت متوجہ ہونے کی حاجت ہوتی - اس استعداد خدا داد کی اعانت سے پندرہ سولہ برس کی عمر میں تحصیل معقول و منقول سے فراغت حاصل ہوگئی - چو کہ آپ کی ذہانت کی دھوم تمام شہر میں تھی، اکثر فضلائے اکمل کہ دعوی کتاب دانی و دقیقہ شناسی کا رکھتے تھے ، وہ مقامات باریک کہ جن کے صاف کرنے میں روزگار دراز فکر کرنا چاہئے آپ سے سر راہ ملاقی ہوکر بہ اعتبار ظاہر کے بطور مناظرہ کے اس کا استفسار کرتے، اس لحاظ سے کہ اگر ان کے مکان پر جاویں گے تو شاید مطالعہ کتاب یا اعانت شروح اور حواشی سے اس کو بیان کریں- اور آپ بے تامل اس کو اس طرح سے تقریر فرماتے تھے کہ ان کو اس جرات سے کمال خجالت حاصل ہوتی - ذکر اس زبدۂ ارباب کمال کا داعی ہے کہ ہزار ہزار محامد پسندیدہ کو زبان پر لاکر اندوکے آتش شوق کو تسکین دے - بیت :

گہر نثار کند بر سر زبان چشم
مرا چو نام شریف تو بر زبان آید

لیکن کیا کیجے کہ نہ زبان کو طاقت تقریر ہے اور نہ قلم کو یارائے تحریر- معقولات میں آپ کا نتیجۂ وہم مثل بدیہیات اور منقولات میں آپ کی تنہا نقل مانند متواترات تھی کا یہ حال تھا کہ ہر مسئلہ کو آیات و حدیث کے ساتھ مستند فرماتے تھے - بیشتر کتب علم معقول پر حواشی تحریر کیے ، اور از بس کہ طبیعت وقّاد جدت و نثار کی طرف مائل تھی ، ایک رسالہ منطق میں لکھا اور اس میں شکل اوّل کے ابعد الطبائع اور شکل رابع کی ابعد البدیہیات ہونے کا دعوا کیا اور اس کے دلائل اس قوت و استحکام کے ساتھ مذکور فرمائے کہ اگر معلم اول موجود ہوتا ، ایسی براہین کو تار عنکبوت سے سست تر

اور ایک رسالہ اثبات رفع یدین میں مسما" بقرۃ العینین فی اثبات رفع الیدین" تالیف کیا اور حدیثیں اشہر اور نہایت قوی سے اس کا استدلال کیا ہے اور دلائل فقہائے سابق جو اس کے مقابل میں ہیں، ایسے سوالات سے اس طرح پر اٹھایا ہے کہ مصنّف غیر متعصب کو سوا تسلیم کر اور چارہ نظر نہیں آتا۔ اور رسائل کثیرہ فنون شتا میں آپ سے یادگار ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے حال ہدایت اشتمال میں سے قدرے ہدیۂ ارباب کمال کیا جائے تاکہ خلق ہونا ایسے فرد کامل کا نمونۂ قدرت رب ذوالجلال سمجھا جائے۔ اوائل حال میں از بس کہ کسب فیض باطنی کا بہت اچھا تھا، جناب غفران مآب زبدۂ اولاد حضرت خیرالانام مصطفا جد امجد علیہ السلام میر احمد قدس سرہ العزیز کی خدمت میں اعتقاد بہم پہنچایا اور ان سے فیض باطن کو کسب کیا اور پھر کی رفاقت میں سفر حج اختیار کرکے مناسک حج کو ادا کیا اور وہاں سے ہندوستان کو مراجعت کرکے حضرت کی خدمت میں اطراف و جوانب میں پھرکی اور ہدایت و ارشاد سے [redacted] عباد اللہ کو راہ راست دکھائی اس اثنا کے احوال تو اس قدر ہیں کہ زبان قلم اس کے تصور سے شق ہوتی ہے مگر اواخر میں بادشاہ سید الطائفہ پیر طریقت کے احوال مردم شاہجہان آباد کی طرف ملتفت ہوکر راہ رشد و ہدایت کو وا کیا اور وعظ و نصائح سے اہل غفلت کے کان کھول دیے۔ جو جو مسائل کہ ان پر مواظبت کرنی ضروریات دین سے تھی اور بسبب سستی اور کاہلی کوشی علمائے وقت کے، عوام روزگار کا کیا بل خواص کے گوش وہم تک بھی نہ پہنچے تھے۔ آپ کی سعی و جہد سے سب پر کھل گئے اور آوازۂ اعلام سنت اور ہدم بنیان شرک و بدعت کا جنوب و شرق کے کان تک پہنچ گیا۔ باوجودے کہ ارباب مشیخت اور صاحبان تشخص کہ سلسلۂ اعتقاد و سررشتہ ارادت خاص وعام کا ان کے ساتھ مستحکم تھا، اور کسی کو ان کی مداہنت کا گمان نہ ہوتا تھا، اس گمان سے کہ اگر مسائل حقہ گوش مردم روزگار تک پہنچا تو ہمارے حق میں موجب ضعف اعتقاد کا ہوجائے گا، علم منازعت اور لوائے مخالفت

بلند کرکے درپے اذیت و اہانت ہوئے ، لیکن چوں کہ مؤید بہ تائید اللہ تھے، اس ہدایت و ارشاد سے باز نہ آئے اور خلق کو یہاں تک توفیق اختیار سنت دینی اور ترک بدعات و احداث کی ہوئی کہ ایک اور ہی طرح کا دور ہر ایک کی پیشانی احوال سے چمکنے لگا اور ان مفسدان مضل کا بازار کاسد ہوگیا۔ اور لوگوں نے جان لیا کہ یہ بزرگ بطمع اخذ و جز کے امر حق کو آج تک چھپاتے رہے اور بچشم خود دیکھا گیا کہ وضیع و شریف کو توفیق نماز کی ایسی ہوئی کہ مسجد جامع میں نماز جمعہ کے واسطے ایسی کثرت ہونے لگی ، جیسے عیدگاہ میں نماز عیدین کے واسطے ہوا کرتی ہے ۔ اور تائید الٰہی اور ان کی صدق نیت اور خلوص طویت کی برکت سے الی الآن وہی حال چلا جاتا ہے اور یہ ثواب انہیں حضرت کے جریدۂ اعمال میں لکھا گیا اور آج تک اس کا اجر ان کی روح پر فتوح کو پہنچتا جاتا ہے ۔ الحمد للہ علی ذلک فالحمد للہ علی ذلک ۔ آپ کی عادت یوں تھی کہ روز جمعہ اور روز سہ شنبہ کو مسجد جامع میں مجلس وعظ کو مرتب فرماتے تھے، طرفہ تر یہ ہے کہ سامعین کو کہ ہزار ہا سے متجاوز ہوتے تھے، اس چار روز کے عرصے میں بہ سبب اغوائے مغویان ضلالت نہاد کے یا بہ سبب انحراف امارہ کے اگر شبہ پیدا ہوتے اور ارادہ کرتے کہ اپنے وعظ میں آپ کی حسن تقریر سے اس کو دفع کریں گے ، جب درس کی مجلس میں آن کر حاضر ہوتے تو حضرت ابتداء وعظ میں کلمات چند بطریق تمہید کے ارشاد کرتے اور ان کی تقریر کی جامعیت سے وہ چیزیں مذکور ہوتیں کہ ہر شخص اپنے شبہ کا جواب پالیتا اور کچھ خدشہ باقی نہ رہتا ، یہاں تک کہ بعد اختتام درس کے کسی کو یہ خلجان نہ رہتا کہ ان شبہات کو پھر اپنی زبان سے بیان کرکے دلیل کرے اور عمدہ مقاصد تردید شرک و بدعت اور احیائے سنت تھا ۔ آپ کی حسن تقریر سے وہ مشکل خاصہ کہ طالب علم کو بعد رد و قدح کے ذہن نشین ہو، جہلائے عامی کو بہ مجرد استماع کے سمجھ میں آجاتے تھے اور اس طرح محظوظ خاطر ہوتے تھے کہ مخالفین سے بعضے اہل علم

چاہتے کہ کچھ دلائل علمی سے اس کو رد کرکے اس کے ذہن سے نکالیں ممکن نہ ہوتا۔ جب
یہ مطالب ختم ہو چکے بموجب ارشاد سید اصفیا ہادی پیر طریق خدا کے اس طرح سے
تقریر وعظ کی بنا ڈالی کہ مسائل جہاد فی سبیل اللہ بیشتر بیان ہوتے اور یہاں تک آپ
کی صیقل تقریر سے مسلمانوں کا آئینہ باطن صفا اور مجلا ہوگیا اور اس طرح سے راہ حق
میں سرگرم ہوئے کہ بے اختیار چاہنے لگا کہ سران کا راہ خدا میں فدا ہو اور جان ان
کی اعلائے لوائے دین محمدی میں صرف ہو ۔ بعد مدّت کے پیر دستگیر نے طلب کیا اور
آپ معتقدین کو تشنہ چھوڑ کر ان کی خدمت میں راہی ہوئے اور بالاتفاق حضرت ممدوح
کے جہاد پر کمر باندھی اور کوہستان میں تشریف لے جاکر اطراف ہندوستان میں خطوط
طلب بھیجے ۔ اس طرح سے جوق جوق روانہ ہوئے اور حضرت کی خدمت میں سوائے مردم
کوہستان ہندوستانیوں میں سے لاکھ آدمی سے زیادہ مجتمع ہوگئے ، اور کارہائے نمایاں راہ
خدا میں ظہور میں آئے ۔ تائید الٰہی سے ان حضرت کا رعب کفار کے دل میں ایسا
متمکن ہوا کہ جس جگہ گروہ قلیل غزات [redacted] مسلمین سے متوجہ ہوتا اور اس کا سرگروہ یہ
حضرت ہوتے، لشکر کفار اگرچہ مور و ملخ سے زیادہ ہوتا، بے سرپا فراری ہوتا۔ اور وہاں
کے معاملات کی تفصیل حضرت بابرکت زبدۂ اولاد سیّدالمرسلین کے احوال کے ضمن میں
ہوچکی ہے ۔ چوں کہ مشیت الٰہی میں سلسلہ اس کام کا یہیں تک تھا، اتفاق تقدیر سے
لشکر کفار کو غلبہ ہوا اور یہ حضرت قلعہ بالاکوٹ کی طرح میں ہم راہ پیر طریقت اور
اکثر مسلمین غزاتؔ کے جنت اعلا کی طرف رہی ہوئے ، انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ اس
واقعہ کو چودہ پندرہ برس گذرتے ہیں اور چوں کہ یہ طریقہ آخر الزمان میں جہاد ڈالا
ہوا ان حضرت کا ہے ، اب تک اس سنت کی پیروی عباداللہ نے ہاتھ سے نہیں دی اور
ہر سال مجاہدین اوطان مختلفہ سے بہ نیت جہاد اسی طرح کی طرف راہی ہوا کرتے ہیں

اور اس امر نیک کا ثواب آپ کی روح مطہر [پر] ہمیشہ پہنچتا رہتا ہے ۔ بہر کیف اگرچہ نظم و نثر عربی بھی آپ سے یادگار ہوگا ، لیکن راقم کو دستیاب نہیں ہوا ۔ اس واسطے یہ کتاب اس زیور سے خلیع العذار رہی ۔

تعلیقات :

شاہ اسمعیل دہلوی ۱۲ ربیع الآخر ، ۱۱۹۳ھ مطابق ۲۹ اپریل ، ۱۷۷۹ع کو پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے ۔ (۱) وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے اور سب سے چھوٹے بیٹے شاہ عبدالغنی کے اکلوتے صاحب زادے تھے ۔ پہلے قرآن مجید ناظرہ پڑھا پھر حفظ کیا اور آٹھ برس کی عمر میں وہ قرآن مجید کے حافظ ہوگئے تھے ۔ اور یہ حفظ محض رسمی نہ تھا بلکہ بامعنی قرآن حفظ کرلیا گیا تھا ۔ (۲) اس کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم شروع ہوئی ۔ ابھی وہ ابتدائی کتابیں ہی پڑھ رہے تھے کہ ۱۲ رجب ، ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۲ اپریل ، ۱۷۸۱ع کو والد ماجد نے اس جہان فانی سے عالم ماورائی کی طرف رخت سفر باندھا ۔ والد کے انتقال کے بعد شاہ عبدالقادر نے انھیں بیٹا بنالیا اور ان کی تعلیم و تربیت میں ساعی ہوئے ۔ (۳)

شاہ اسمعیل نے صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں والد ماجد کی خدمت میں پڑھی تھیں ، والد کے انتقال کے بعد معقولات ، منطق وغیرہ کی کتابیں انھوں نے شاہ عبدالقادر سے پڑھیں اور حدیث کی تکمیل شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں کی ۔ (۴) انھوں نے اپنے دادا کی مشہور فکر پرور اور انقلاب انگیز تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" بھی شاہ عبدالعزیز سے پڑھی تھی اور اس کے اصولوں پر عمل کرنے والی ایک جماعت بھی بنائی تھی ۔ (۵)

---

(۱) مہر ، مولانا غلام رسول ، "اسماعیل شہید" ، (مقالہ) ، "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" ، لاہور ، دانش گاہ پنجاب ، ج ۲ ، ص ۴۷۹

(۲) حیرت دہلوی ، مرزا ، "حیات طیبہ" ، محولہ بالا ، ص ۳۷

(۳) سرسید احمد خاں ، "آثار الصنادید" ، محولہ بالا ، چوتھا باب ، ص ۵۶

(۴) حیرت دہلوی ، مرزا ، "حیات طیبہ" ، محولہ بالا ، ص ۴۱

(۵) عبیداللہ سندھی ، مولانا ، "شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک" ، محولہ بالا ، ص ۹۳

مولانا غلام رسول مہر نے شاہ رفیع الدین سے بھی فیض حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے۔(۱) ان کے تذکرہ نگاروں نے تعلیم میں ان کی بے پروائی کا تذکرہ کیا ہے ۔ لیکن ساتھ ہی ان کی ذہانت، طباعی، نکتہ رسی، حاضر دماغی اور حافظے کے کمالات کا اعتراف بھی کیا ہے (۲) نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ ان کی ذکاوت کا جوہر بہت بلند تھا اور ان کے ذہن و فہم کی تیزی کے قصے اب تک اہل علم کی ہر مجلس کے لیے باعث زینت سمجھے جاتے ہیں۔ (۳)

مولانا عبدالحی نے ان کے فہم و ذکا، ذہانت و فطانت ، شہامت و قوت نفس اور صلابت فی الدین کے الفاظ سے ان کے کمالات کا اعتراف کیا ہے ۔ اور دنیا کی ایک نادر و بدیع شخصیت گردانا ہے ۔(۴)

۱۲، ۱۵ برس کی عمر میں قرآن ، حدیث، فقہ ، اصول وغیرہ کے علاوہ منطق، فلسفہ اور تاریخ ، جغرافیہ ، ریاضی وغیرہ میں بھی ماہر ہوگئے تھے ۔ (۵) لڑکپن میں نہایت شوخ اور تیز طبیعت کے مالک تھے ۔ کھیلوں سے بھی دل چسپی تھی ۔ شطرنج کھیلتے تھے ، پتنگ اڑاتے تھے، مختلف کھیلوں میں بھی شرکت فرماتے تھے۔ ان کے اندر حس مزاح بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بے تکلف دوستوں کو خوب چھیڑتے تھے اور ان سے ہنسی مذاق کرتے تھے۔(۶) لیکن درس و تدریس، وعظ و خطابت اور تصنیف و تالیف کی

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول ، "جماعت مجاہدین"، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۵ء، ص ۱۲۰

(۲) تفصیل کے لیے دیکھئے متعلقہ صفحات کتب ذیل :

(الف) "آثار الصنادید"، محولہ بالا ، ص

(ب) "حیات طیبہ"، محولہ بالا ، ص

(ج) ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی، "تراجم علمائے حدیث ہند"، ص

(۳) صدیق حسن خاں ، نواب ، "اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین"، کان پور : مطبع نظامی، ۱۲۸۸ھ، ص ۳۱۶

(۴) عبدالحی، مولانا سید ، "نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۵۷-۵۶

(۵) حیرت دہلوی، مرزا ، "حیات طیبہ"، ص ۵۳-۴۳

(۶) اشرف علی تھانوی، مولانا ، "ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۹۵-۹۳، ۱۰۸، ۱۲۰-۱۱۹

مصروفیتوں کے ساتھ تمام شوق چھوٹ گئے تھے ان کا ایک ایک عمل سنت کے مطابق اور ان کا ہر قدم احیائے سنت کے لیے ہوگیا تھا اور سید احمد شہید کی ملاقات و صحبت کے بعد ان کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔

شاہ اسمعیل نے تمام سواری، تلوار ونیزہ بازی، اور کشتی کے فن میں بھی مہارت حاصل کی تھی نیز انھوں نے سردی، گرمی کی برداشت اور مسلسل جاگتے رہنے اور جب چاہیں سوجانے کی مشق بھی بہم پہنچائی تھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد درس و تدریس اور وعظ و ارشاد میں مصروف ہوگئے تھے اور احیائے سنت کے لیے ان کی کوششوں اور اہل بدعت کے خلاف ان کے جہاد نے دہلی کے گلی کوچوں میں ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ مولوی عبدالقادر نے اپنے زمانے کے جن علمائے دہلی کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ان میں اصحاب ثلاثہ کے علاوہ شاہ اسمعیل شہید بھی ہیں۔ دہلی کا سفر انھوں نے ۱۸۱۳ء میں کیا تھا۔ وہ شاہ عبدالعزیز کی مجلس وعظ میں شریک بھی ہوتے تھے۔ شاہ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں "کہ دادا اور چچاؤں کی یادگار ہیں اور ذہن کی جودت اور قوت توجیہہ میں بے مثل ہیں۔ خدا ان کا نگہبان رہے۔" (۱)

شاہ اسمعیل شہید اس وقت دہلی میں موجود اور درس و تدریس کے ساتھ وعظ و ارشاد میں مصروف تھے۔ لیکن جب ۱۸۲۳ء میں مولوی عبدالقادر نے دوسرا سفر کیا تو اس وقت وہ دہلی میں موجود نہیں تھے بلکہ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ سید صاحب کے ساتھ حج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اس لیے ان کا انداز بیان پہلے سے مختلف ہے۔

---

(۱) ایوب قادری، محمد، "علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲۳۸

ابتدا اس سے ان کے خصائص، فکر دینی اور معمولات وعظ کا بھی پتا چلتا ہے - مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں :

" دھلی میں مولوی محمد اسمعیل ... جو حسن بیان، قوت استنباط اور تیزی ذہن میں اس زمانے میں اپنے دادا اور چچاؤں کی یادگار تھے، مخلوق کو ان بدعات سے روکنے پر جو مستحبات بلکہ واجبات میں مخلوط ہوگئی ہیں کمرھمت باندھ رکھی تھی - جمعہ کے دن جامع مسجد میں اور دوسرے دنوں میں اس قسم کے مجموعوں میں بیان کرتے تھے - عوام ان کے وعظ و پند سے بہت نفع اٹھاتے تھے اور جو لوگ بدعات پر عمل کرتے ہیں اور آبا و اسلاف کو انبیاء و رسل کے سنتوں کا ناسخ سمجھتے ہیں، اگرچہ اس کلمے کے تلفظ سے باز رہتے ہیں- لیکن بدعت شکن (یعنی مولانا اسمعیل شہید)؟ پر طعن کرتے ہیں کہ اس کی بات اسلاف کے خلاف ہے -" (۱)

نواب صدیق حسن خان نے شاہ اسمعیل کو ان کے عہد کا ذکی ترین شخص، دین کے معاملات میں کسی کی رو رعایت نہ کرنے والا ، تحفظ و احیائے سنت میں ان کی حمیت اور بدعت اور اہل بدعت کے خلاف ان کی سختی کا ذکر کیا ہے -(۲)

سید صاحب سے بیعت کے بعد وہ ان کے سفر و حضر کے شریک اور تحریک اصلاح و جہاد کی ایک مرکزی شخصیت بن گئے تھے - سید صاحب کی جن عظیم الشان خدمات کا تذکرہ ان کے تعلیقات ~~حواشی~~ میں گزرا ہے ان تمام خدمات میں شاہ اسمعیل شہید شریک ہیں- مولانا غلام رسول مہر نے ان کی خدمات کو مختصر طور پر اس طرح دفعہ وار بیان کردیاھے:

" دوران قیام سرحد میں وعظ و تذکرہ ، دعوت إلی اعلام ، دفاع و اقدام تدبیر و سیاست وغیرہ تمام مشاغل میں وہ پیش پیش رھے - جن کارناموں میں

---

(۱) ایوب قادری، محمد ، " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) ، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۲۳۳

(۲) صدیق حسن خان، نواب ، " ابجد العلوم"، محولہ بالا ج۳، ص ۹۱۶

شاہ اسمعیل کو درجہ امتیاز حاصل ہوا ان کی اجمالی کیفیت یہ ہے :

۱- مقام ہنڈ میں بہ سلسلۂ امامت جہاد علماء و خوانین سے تمام مذاکرات شاہ صاحب ہی نے کیے تھے۔

۲- جنگ شیدو میں سید صاحب کی علالت کے باعث ان کے ساتھ ہاتھی پر سوار تھے ۔ درانیوں کے فرار کے بعد سکھوں نے سید صاحب کا تعاقب کیا تو شاہ صاحب نے ہاتھی کو میدان جنگ سے باہر نکال کر سید صاحب کو گھوڑے پر سوار کرایا اور ایک جماعت کے ہم راہ روانہ کردیا ۔ سکھوں کو ان کے تعاقب سے باز رکھنے کے لیے خود ہاتھی ہی پر سوار رہے اور بعد میں سید صاحب سے جاملے ۔

۳- ہزارہ میں محاذ جہاد کی ابتدائی تنظیمات انھیں نے کیں۔

۴- شنکیاری کی جنگ میں تھوڑے سے رفیقوں کے ساتھ سکھوں کے بہت بڑے لشکر کو شکست دے کر بھگادیا ۔ شاہ صاحب کی قبا غنیم کی گولیوں سے چھلنی ہوگئی اور ہاتھ کی چھنگلیا پر سخت زخم آیا۔ شاہ صاحب اس چھنگلیا کو مزاحاً اپنی انگشت شہادت کہا کرتے تھے ۔

۵- بیعت اقامت شریعت کے لیے اڑھائی ہزار علماء و خوانین کو شاہ صاحب ہی نے پیش نظر مقصد پر متفق الرائے کیا تھا۔

۶- تھوڑے سے غازیوں کے ساتھ ہنڈ کا مستحکم قلعہ مسخر کرلیا اور اس میں غنیم کی جانب سے صرف دو جانوں کا نقصان ہوا۔

۷- زیدہ کی جنگ میں صرف سات سو غازیوں کے ساتھ یار محمد خان پر فتح پائی۔ جس کے پاس دس ہزار فوج اور سات توپیں تھیں۔ اس جنگ میں صرف دو غازی شہید ہوئے ۔

۸- پائندہ خان تنولی کو شکست دے کر امب و عشرہ پر قبضہ کرلیا۔

۹- مایار کی جنگ میں صرف تین ہزار غازیوں کے ساتھ، جن میں بیشتر ملکی تھے ۔ آٹھ ہزار درانیوں کو شکست فاش دی ۔

۱۰- فتح پشاور کے بعد سلطان محمد درانی سے صلح کی گفتگو میں سید صاحب نے شاہ صاحب ہی کو مختار بنادیا تھا۔" (۱)

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول: "اسمعیل شہید" (مقالہ)، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، محولہ بالا، ج ۲، ص ۷۵۱

شاہ اسمعیل شہید کی شان علمی اور علوم دینی میں ان کے تفقہ اور فنون میں ان کی دقیق النظری کا اعتراف ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے - ان سب کا نقل کرنا تو تحصیل حاصل ہے - یہاں صرف ایک جامع بیان شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا نقل کیا جاتا ہے کہ وہ آپ کے عم بزرگ وار اور شیخ و استاد بھی تھے - حضرت علامہ و شہید کے مضامین علم و کمال میں یہ ایک شہادت " جامع الشواہد" ہے - اس کے بعد کسی اور شہادت و بیان کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے - حضرت علامہ و شہید اور مولانا عبدالحی سید احمد شہید بریلوی کے ساتھ لکھنؤ کے سفر میں تھے آپ نے حج کے فضائل و فرضیت کے موضوع پر وعظ کہے - اس موقع پر مولوی بادر علی مانک پوری نے اہل ھند پر عدم فرضیت حج کا فتوی دیا اس کے جواب میں حضرت علامہ و شہید اور مولانا عبدالحی نے ایک استفتا کے جواب میں دلائل و براہین قطعیہ کے ساتھ فرضیت حج کا فتوا دیا تھا - منشی دمیم الدین خان صاحب نے یہ دونوں فتوے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں دہلی بھیج دیے اور ان کی رائے دریافت کی - شاہ عبدالعزیز نے حضرت علامہ و شہید کے کمال علم و فضل اور بے مثل ذہانت و فہم و ذکا کا اعتراف فرماکر انھیں حجۃ الاسلام، تاج المفسرین، فخر المحدثین، سرآمد علمائے محققین و علمائے ربانیین سے ملقب فرمایا، حضرت علامہ کے جواب و مہر و دستخط کو اپنے جواب و مہر و دستخط کے مثل فرمایا اور علم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول و منطق میں انھیں اپنے آپ سے کمتر نہ بتلایا نیز ہر مشکل و لاینحل مسئلے اور شکوک و خلجان میں حضرت علامہ و شہید اور مولانا عبدالحی کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا- چوں کہ شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا یہ ایک نہایت اہم خط ہے اس لیے ہم اسے یہاں من و عن نقل کیا جاتا ہے :

" منشی صاحب عالی مراتب مجمع محاسن و مناقب سلمہ اللہ تعالی
از فقیر عبدالعزیز بعد ابلاغ سلام مسنون و دعوات خیر مقرون مکشوف خاطر و دوستی

ذخائر بادرقيمۀ كريمۀ ايشان معه دو قطعه استفتا در مقدمه فرضيت حج بر باشندگان
هندوستان و اختلاف نمودن بعض بعض كسانيكه ايشان بعدم فرضيت حج
هندوستانيان قائل اند بمضمون سوال واحد وجوابات يكی دستخطی دانايان غريب
ساكنان نواحی و جوار و دوم مهری شيخ الاسلام مولوی عبدالحی صاحب و
تصحيح حجة الاسلام مولوی محمد اسمعيل صاحب زاد مجدهما الله تعالی علماً وفضلاً و
كمالاً حصول فرحت شمول نموده بر مضامين مندرجه آنها اطلاع گرديد مشفق من از
فحاوی مضامين جواب اول چنان مستنبط می شود كه بزرگان مذكور بجز دو چهار
فتاوی معروفه كه سند آنها پيش واقفان اين فن ظاهر و باهر است نديده اند
غرض كه از ادراك كتب دينيه معتبره كه مدار دين متين بر آنست بهره وافی
نمی دارند و از تحصيل علم فقه و اصول ذخيره نيند و ختة اندمحض صرف
اوقات درتحصيل منطق نموده اند و درستی آنهم بمواجه ماهران فن مذكور محال
و اشكال است درينصورت سند اقوال قبيحه شان ساقط از پايۀ اعتبار تصور توان
كرد و بر احكام آنها عمل نمودن سراسر راه ضلالت و بطالت پيمودن است ازين
عقايد شنيعه حق سبحانه و تعالی جميع مومنين رامامون و محفوظ دارد و
توفيق طاعت خود روزی كند جواب ثانی نوشتۀ تاج المفسرين و فخر المحدثين
سر آمد علمائے محققين مولوبين موصوفين مطابق و موافق احاديث نبويه وكتب اصول
معتبره فقهيه است ـ چنان چه مقابل مهر ودستخط شان صحيحاً مهر خود ثبت كرده شد
ملاحظه بايد فرمود تاكه اطمينان كلی خواهد گرديد و فرستادن استفتائے مذكور در صورت
بودن مهر و دستخط برخورداران ممدوحين احتياج نداشت چرا كه ايشان
در علم تفسير و حديث و فقه اصول و منطق وغيره از فقير كمتر نيستند مهر و
دستخط شان گويا مهر و دستخط فقير است و عنايت جناب باری تعالی اسمه
كه شامل حال مولوبين موصوفين ست شكر اين نعمت عظمے ادا كردن نمی توانم
حق جل و علے زياده تر ازين بمراتب عليا فائز گرداند و برائے اشخاص مبين
اصل شريعت جميع مومنين راهمين عنايت الهی خواستن موجب نجات اخرويست
مخلص من مولوبين ممدوحين را يكے از علمائے ربانی تصوريده هرچه احتياج آن
محال باشد رو بری ايشان پيش خواهند كرد انشاء الله العزيز همه شكوك و
خلجان دفع خواهند گرديد عنايت فرمائے من اگرچه چندين كلمات را بظاهر
تعريف و توصيف خود تصور توان كرد ليكن اظهار امر حق بر واقفان واجب و لازم

است لہذا چشم پوشی در حق مناسب ندانستم و ہر دو استفتا پلٹ رقیمہ ہذا می رسد از رسیدش مطلع خواہند نمود این وقت بسبب ضعف طبیعت بہر ہمین قدر اکتفا کرد " والاجمال عندکم معنی من التفصیل واللہ تعالی یقول الحق و یہدی السبیل السلام علیکم و بالفضل بارک اللہ فی معاشکم و معاد کم " مکرر این کہ انتظار باید کشید کہ اشخاص معلوم در عرصہ قریب التوالی معافی صوم و صلوۃ بر ہندوستانیان خواہند نوشت [illegible] بدلیل این کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم در ہند تشریف فرمانشدہ اند و برائے معافی زکوۃ اولی باشد فقط "

عبارت لفافہ یہ ہے :

" لفافہ ہذا در بلدہ لکھنو در سرائے معالی خان رسیدہ - بمطالعہ منشی صاحب منشی نعیم الدین خان برادر مولوی خیرالدین صاحب"(۱)

شاہ اسمعیل شہید کے مقام کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :

" اور پھر چند قدم اور آگے بڑھو - مقام عزیمت دعوت کی کیسی کامل اور آشکارا مثال سامنے آتی ہے - ساری مثالوں سے آنکھیں بند کرلو صرف یہی ایک مثال زیر بحث حقیقت کے فہم و کشف کے لیے کافی ہے - حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع و کامل ہے! بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود رہا۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مردمیداں کا منتظر تھا اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ و مجدد شہید رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص کردیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔ کہ

می خواست رستخیز ز عالم برآورد
آن باغبان کہ تربیت این نہال کرد

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انہی کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔...
... شاہ صاحب نے مزاج وقت کے عدم تحمل و استعداد سے مجبور ہوکر دعوت و

---

(۱) عزیز الدین مرادآبادی، مولوی: "صاعق الحدید علی صاحب التحقیق الجدید"، دھلی: جید برقی پریس، ۱۳۵۱ھ، ص ۱۷-۱۱۵

اصلاح امت کے جو بھید بوادی دھلی کے کھنڈروں اور کوٹھہ کے حجروں میں دفن کردیے تھے - اب اس سلطان وقت و اسکندر عزم کی بدولت شاہجہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ھنگامہ مچ گیا اور ھندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے - جن باتوں کے کہنے کی بڑی بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب برسر بازار کی جارہی اور ہورہی تھیں اور خون شہادت کے چھینٹے حرف و حکایت کو نقوش و سواد بناکر صفحہ عالم پر ثبت کر رہے تھے" (۱)

سرسید نے شاہ صاحب کے ترجمے میں ان کے محاسن فکر و سیرت اور خدمات دینی و اصلاح امت کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے نہ صرف سرسید کی ان سے عقیدت کا پتا چلتا ہے بلکہ اس کا ایک ایک حرف شاہ صاحب کے قیام عزیمت دعوت کی حقیقت کے فہم و کشف کے لیے کافی ہے - سرسید نے اپنی تحریروں میں اور بھی کئی مقامات پر شاہ اسمعیل شہید کے فکر سلیم ، صداقت شعاری محبت توحید اور اعلائے کلمۂ حق کے لیے ان کی جاں نثاری کا تذکرہ و اعتراف کیا (۲) شاہ صاحب کی تصنیفات نے سرسید کے خیالات پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا- تقلید کی بندشوں کے خلاف جہاد اور خیالات کے اظہار میں بے خوفی اور بے باکی کا سبق انھوں نے شاہ صاحب ھی سے لیا تھا- حالی نے لکھا ہے کہ" مولانا اسمعیل شہید کی تصنیفات نے ان کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور ان کو کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا" (۳) اس زمانے میں جب کہ سرسید بقول خود وھابیت کا زور تھا انھوں نے شاہ صاحب کے ایک رسالے " ایضاح الحق الصریح " کا

---

(۱) آزاد ، مولانا ابوالکلام " تذکرہ"، دھلی : ساھتیہ اکاڈیمی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۷۰

(۲) ملاحظہ ہو : " خطبات سرسید"، ج اول ، ص ۵۰۳
مقالات سرسید ، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء، حصہ چہارم، صص ۸۷-۲۸۶
اسمعیل پانی پتی، " مکتوبات سرسید"، لاھور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۹ء
~~صص ۱۰۰ اور ۱۰۲~~
مکتوب بنام محسن الملک ، صص ~~۳۸-۳۶~~ ۶۰ و ۱۰۲
مکتوب بنام مولوی ابو محمد ابراھیم ، ص ۶۹-۶۸

(۳) حالی، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید"، محولہ بالا ، ص ۲۹۳

"راہ سنت و رد بدعت" کے نام سے ترجمہ بھی کیا تھا۔ (۱)

ہماری معلومات کی حد تک صرف ایک مقام پر سرسید نے شاہ صاحب کے بارے میں حقیقت واقعہ کے اظہار میں تسامح ہوا ہے ۔ سرسید رسالہ "اسباب بغاوت ہند" میں لکھتے ہیں "کہ بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی مولوی محمد اسمعیل نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کہا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی اس وقت اس نے صاف بیان کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگریزی کے امن میں رہتے ہیں، ہندوستان میں جہاد نہیں کرسکتے ۔ اس لیے ہزاروں آدمی جہادی ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عمل داری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحد پنجاب پر جاکر لڑائی کی ۔" (۲)

جہاں تک عمل کا تعلق ہے یہی ہوا کہ ہندوستان کو میدان جہاد بنانے کی بجائے شمال مغربی علاقے کو میدان عمل منتخب کیا گیا لیکن سرسید نے جو بات شاہ اسمعیل شہید سے منسوب کی ہے ۔ وہ بات انھوں نے کسی تحریر یا تقریر میں بیان نہیں فرمائی ۔ دوسری بات یہ کہ شمال مغربی سرحد کو جہاد کے لیے میدان عمل بنانے کا تعلق ترتیب عمل سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ مقصد و نصب العین سے ۔ جہاں تک مقصد و نصب العین کا تعلق ہے تو یہ بات واضح ہے کہ وہ بھی ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی اور ان کے اثر سے نجات دلانے کا مقصد لے کر اٹھے تھے لیکن پنجاب کو جہاں تک سکھوں کی حکومت تھی اور جن کی ترک تازیوں سے مغرب و جنوب میں سرحد و سندھ محفوظ نہ تھا، چھوڑ کر شمالی و وسطی ہند کی طرف رخ کرنا خطرے سے خالی نہ تھا

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے مقدمہ
(۲) سرسید احمد خان، "اسباب بغاوت ہند"، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۵

اس لیے تحریک جہاد کا مرکز سرحد کو بنایا گیا۔ اور تحریک کا آغاز سکھوں کے استیلا سے کیا گیا۔ (۱) لیکن اس باب میں سرسید کو ہم مورد الزام نہیں ٹھہرانا چاہتے میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں تحریک کے مقاصد کے متعلق سید احمد شہید بریلوی کے وہ خطوط اور اعلام نامے شائع نہ ہوئے تھے اور شاید عام طور پر اسی طرح مشہور ہوگا ۔ جیسا کہ سرسید نے تحریر کیا ہے ۔

شاہ اسمعیل شہید کو اپنے دادا حضرت شاہ ولی اللہ کی طرح تجدید وتدوین علوم و معارف اور اپنے چچاؤں (یعنی) اصحاب ثلاثہ کی طرح تعلیم و تربیت اصحاب استعداد اور مسند درس و تدریس کی رونق افروزی کا موقع نہیں ملا لیکن احیائے سنت اور ردشرک و بدعت میں انھوں نے جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اور مسلمانوں میں جو انقلاب پیدا کردیا اس کا اندازہ سرسید کے ان جملوں سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے :

" اواخرکیں (میں) بہ ارشاد سید الطائفہ پیر طریقت کے احوال مردم شاہجہاں آباد کی طرف ملتفت ہوکر راہ رشد و ہدایت کو وا کیا اور وعظ و نصائح سے اہل غفلت کے کان کھول دیے جو جو مسائل کہ ان پر مواظبت کردی ضروریات دین سے تھی اور بسبب سستی اور کاہلی کوشی علمائے وقت کے عوام (و) روزگار کیا بل خواص کے گوش وہم تک بھی نہ پہنچے تھے آپ کی سعی و جہد سے سب پر کھل گئے اور آوازہ اعلام سنت اور بدبدیان (بدیان) شرک و بدعت کا وضیع گدا و شریف کے کان تک پہنچ گیا۔ باوجودیکہ ارباب مشیخت اور صاحبان تشخیص ...... علم منازعت اور لوائے مخالفت بلند کرکے درپے اذیت و اہانت ہوئے لیکن چوں کہ مؤید بہ تائید اللہ تھے اس ہدایت و ارشاد سے باز نہ آئے اور خلق کیہاں تک

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو :

ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا ، باب ۱۶، جہاد اور اس کے مقاصد و اسباب اور باب ۱۷ سرحد کا انتخاب ، ص ۹۷-۳۵۳

مہر، مولانا غلام رسول، " سید احمد شہید"، محولہ بالا ، باب ۲۲، سکھ اور انگریز ، ص ۶۱-۲۵۰ اور باب ۲۵، سرحد کو کیوں مرکز بنایا ، ص ۸۱-۲۷۷

توفیق اختیار سنت نبوی اور ترک بدعت و امورات کے ہوئی کہ ایک امر ہی طرح کا دہر ہر ایک کی پیشانی احوال سے چمکنے لگا اور ان مفسدان کفل کابازار کاسد ہوگیا۔ " (۱)

" ارواح ثلاثہ" کی روایت میں ہے کہ شاہ اسمٰعیل کی دعوت و ارشاد سے دو ڈھائی لاکھ آدمی درست ہوگئے تھے۔ (۲) آپکی دعوت و ارشاد اور جہاد فی سبیل اللہ کی کوشش کے باوجود شاہ صاحب کی متعدد نہایت اہم تصانیف یادگار ہیں۔ یہ تصانیف دوسرے لگ اصحاب علم و فضل کے مقابلے میں بہت کم ہیں لیکن اردو کے دینی ادب میں آج تک ان کا کوئی جواب مہیا نہیں ہوسکا۔ اور ان کی صرف ایک کتاب " تقویۃ الایمان" کے اثر و نفوذ دینی کا اردو کی کوئی دوسری تصنیف مقابلہ نہیں کرسکی ۔ ان کی تصانیف میں سب سے پہلے تو سرسید ہی نے " بیشتر کتب علم معقول پر حواشی " لکھے ۔ رسالہ " منطق"، قرۃ العینین فی اثبات رفع الیدین" (۳) (صحیح نام تنویرالعینین ...ہے) اور " تقویۃ الایمان" کا ذکر کیا ہے ۔(۴) نواب صدیق حسن خان نے آخر الذکر دو کتابوں کے علاوہ صراط مستقیم، ایضاح ....، مختصر فی اصول الفقہ ، رد الاشراک اور توحید میں ایک کتاب کا ذکر کیا ہے ۔(۵) مولانا عبدالحی نے بھی تقریباً ان تمام کتب کا ذکر کیا ہے ۔(۶)
مرزا حیرت دہلوی نے اپنی تصنیف میں شاہ صاحب کی تصنیفات کے بارے میں ایک مستقل باب باندھا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ شاہ صاحب کی تصنیفی خدمات ، محاسن اور مطالب و مباحث کا تعارف کردیا ہے لیکن اس فہرست میں صرف منصب امامت ، کا اضافہ ہوا ہے۔(۷)

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، ص ۵۷
(۲) اشرف علی تھانوی، (مرتب) " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۹۹
(۳) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، صص ۵۶-۵۷
(۴) اسمٰعیل پانی پتی، (مرتب) " مکتوبات سرسید"، محولہ بالا ، ص ۲۰ (مکتوب بنام محسن الملک)
(۵) صدیق حسن خان، نواب " ابجدالعلوم"، الجز الثالث، ص ۹۱۲
(۶) عبدالحی ، مولانا سید " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۵۹
(۷) حیرت دہلوی، مرزا، " حیات طیبہ"، محولہ بالا ، باب ۱۵، صص ۳۰۷-۳۳۶

شاہ صاحب کی تصانیف عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہیں - مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے ان کی سب سے بڑی فہرست دی ہے -

شاہ نے ایک رسالہ " تنویر العینین " کے جواب میں کسی صاحب کے رسالے پر تنقید میں " تنقید الجواب در اثبات رفع الیدین" کے نام سے بھی لکھا تھا۔

فارسی:

۱- **منصب امامت** :- امامت کے مسئلے میں جامع اور محققانہ رسالہ - اصل فارسی اور اردو ترجمہ شائع ہوچکا ہے -

۲- **ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت و الضریح** :- متعدد بار اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہوچکی ہے - سرسید کا رسالہ " راہ سنت و رد بدعت " اسی رسالے سے ماخوذ ہے اور اس کا اعتراف خود سرسید نے کیا ہے -

۳- **رسالہ یک روزی** :- " تقویۃ الایمان" پر مولانا فضل حق خیرآبادی کے اعتراضات کے جواب میں - چوں کہ یہ رسالہ ۱۵ ذوالحجہ ، ۱۲۳۱ھ کو ایک ہی نشست میں تحریر فرمایا تھا اس لیے رسالہ " یک روزی" کے نام سے مشہور ہوا- چھپ چکا ہے-

۴- **صراط مستقیم** :- یہ سید احمد بریلوی شہید کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے شاہ صاحب نے مرتب فرمایا اس کا ایک باب شاہ صاحب کا لکھا ہوا ہے لیکن مطالب اس کے بھی سید صاحب کے ہیں - اسی طرح اس کا ایک حصہ مولانا عبدالحی نے تحریر فرمایا تھا - یہ رسالہ بھی شائع ہوچکا ہے -

اردو:

اردو میں شاہ صاحب کی ایک ہی کتاب" تقویۃ الایمان" ہے اور ان کی تمام تصانیف میں یہ کتاب معرکہ آرا ہے - یہ دو ابواب پر مشتمل ہے - پہلے باب میں توحید کا بیان اور شرک کی برائی ہے اور دوسرے باب میں اتباع سنت کا بیان اور بدعت

کی ہوائی ھے - یہ کتاب دراصل ان کی کتاب " ردالاشراک" (عربی) " کا اردو ترجمہ ھے۔ اب تک لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر شائع ہوچکی ھے - اثبات توحید اور ردشرک میں اس کتاب کا جواب پورا اردو ادب پیش کرنے سے قاصر ھے - پہلی بار ۱۸۲۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۸۵۲ء میں اسی کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے - اردو میں ایک کتاب " تذکیر الاخوان" کے نام سے بھی ھے - یہ کتاب بھی " ردالاشراک" کے باب ثانی کا ترجمہ ھے - (۱)

مولوی عبدالشکور مرزا پوری نے " التحقیق الجدید علی تصنیف الشہید" کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں "صراط مستقیم ، تنویر العینین ، ایضاح الحق اور تقویۃ الایمان" کے بارے میں لکھا کہ شاہ اسمعیل شہید کی تصانیف نہیں ھیں لیکن کسی بھی طبقہ علم میں یہ خیال پایہ علم و استناد حاصل نہ کرسکا - حقیقت یہ ھے کہ یہ کوشش انھیں حنفی ثابت کرنے کے لیے تھی۔ مولوی عزیز الدین مراد آبادی نے اس کے جواب میں " مطرق الجدید علی صاحب التحقیق الجدید" میں ایک نہایت محققانہ بحث کرکے ان کے افکار کے تار و پود کو بکھیردیا ھے - (۲)

سرسید نے جس رسالہ منطق اور کتب معقولات پر حواشی کا ذکر فرمایا ان کے وجود کا ابھی تک علم نہیں ہوسکا۔ اسی طرح تنقید الجواب فی در اثبات رفع الیدین کا ذکر مولانا غلام رسول مہر مرحوم " اتحاف النبلا" از نواب صدیق حسن خان کے حوالے سے کیا ھے - اس کے وجود و اشاعت کا علم بھی نہیں ہوسکا۔ ان کی طرز تحریر کسی قدر دل چسپ اور با اثر ھے اور معلوم ہوتا ھے کہ ایک دریائے ذخار امڈا چلا آتا ھے(۳)

---

(۱) سیف، محمد خالد، (مرتب) " کلام شاہ اسمعیل شہید"، لائل پور: طارق اکیڈمی، ۱۹۷۲ء، ص ۱۸

(۲) عزیز الدین مرادآبادی، مولوی: مطرق الحدید علی صاحب التحقیق الجدید"، محولہ بالا، ص

(۳) تنہا، مولوی محمد یحیی، " سیرالمصنفین"، غازی آباد: دارالاشاعت، ۱۹۲۴ء، ج اول، ص ۱۱۲

شاہ اسمعیل شہید نے نثر میں اپنی تحریرات کے علاوہ منظوم کلام بھی یادگار چھوڑا ہے - منظومات میں مثنوی سلک نور، نعت میں بلند پایہ قصیدہ اور ایک قصیدہ سید احمد شہید کی منقبت میں اور متفرق اشعار کا ذکر مولانا مہر صاحب نے کیا ہے-(١) اب شاہ صاحب کا تمام کلام محمد خالدسیف نے ایک مجموعے میں چھاپ دیا ہے - اس میں اردو میں مثنوی سلک نور، رسالہ بے نمازاں، تسخہ قوت ایمان کے نام تین منظومات ہیں اور فارسی میں مثنوی سلک نور، قصیدہ در مدح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ، قصیدہ در مدح حضرت سید احمد شہید اور رسالہ رد الاشراک کے خاتمے کے چند اشعار ہیں- واضح رہے کہ مثنوی سلک نور کے عنوان سے اردو اور فارسی میں الگ الگ مستقل دو نظمیں ہیں - دونوں میں ترجمے کا تعلق نہیں - (٢) فارسی کلام سے شاہ صاحب کی پختہ کلامی کا اظہار ہوتا ہے - اور ان کی مثنوی سلک نور (اردو) تو اردو شاعری کی بیاض میں نمایاں جگہ پانے کی مستحق ہے -(٣) یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ حضرت علامہ شہید کا صرف یہی کلام ہے جو اس مجموعے میں شامل ہے - اس لیے کہ علامہ شہید کی ایک نعت میرے پیش نظر ہے جو اس میں شامل نہیں ہے-(٤)

شاہ صاحب کے تلامذہ کے ہمیں بہت کم نام معلوم ہوسکے ہیں - چوں کہ ان کی شہرت ایک مدرس کی حیثیت سے نہیں ہوئی اس لیے ان کے تلامذہ کی فہرست مرتب کرنے کی طرف بھی کسی نے توجہ نہیں کی - بہرحال جو چند نام معلوم ہوسکے ہیں یہ ہیں - مولوی کرامت علی اسرائیلی نے حدیث شاہ اسحاق کے علاوہ شاہ اسمعیل سے بھی

---

(١) مہر، مولانا غلام رسول ، " اسمعیل شہید"(مقالہ) ، " اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، محولہ بالا ، ج ٢ ، ص ٥٢-٧٥٣

(٢) کلام کی تفصیل اور معلومات کی اشاعتیں کی تاریخ کے لیے دیکھئیے " کلام شاہ اسمعیل شہید" کو (مقدمہ) ، از ڈاکٹر سید عبداللہ ، ص ٢٥-١٥

(٣) ایضاً ، ص ٢٢-٢٣

(٤) ابویحیی امام خان نوشہروی،" تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا ، ص ١١٢

پڑھی تھی۔(١) مولوی سخاوت علی عمری جن بوری نے جن اساتذہ سے علوم نقلیہ و عقلیہ کی تحصیل کی تھی ان میں شاہ صاحب کا اسم سامی بھی آیا ہے ۔(٢) اس تذکرہ کی ایک اہم شخصیت مولوی عبداللہ خان علوی کو حضرت شاہ شہید سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ (٣) سید غوث شاہ قلندر کا فرمودہ ہے کہ انھوں نے شاہ اسمعیل شہید سے کافیہ کا ایک سبق پڑھا تھا۔ (٤)

شاہ اسمعیل کی شادی شاہ عبدالقادر کی نواسی اور شاہ رفیع الدین کی پوتی کلثوم سے ہوئی تھی۔ ان کی یادگار شاہ محمد عمر تھے۔ مولانا سید عبدالحی نے ان کے توکل و استغنا اور تبتل الی اللہ کا ذکر کیا ہے ۔ (٥) ٢ جمادی الثانی، ١٢٦٨ھ کو وفات ہوئی ۔(٦) مومن خان مومن نے " مرگ شیخ زمان" سے تاریخ نکالی ہے ۔(٧)

شاہ اسمعیل معرکہ بالا کوٹ میں ٦ مئی، ١٨٣١ء کو شہید ہوئے ۔ آپ کی قبر بالا کوٹ میں ست بنے نالے کے پار ہے ۔

سرسید کو " آثارالصنادید " کی تالیف کے وقت شاہ صاحب کے کلام بلا تحریر دستیاب نہیں ہوا تھا اس لیے کتاب نمونۂ تحریر سے خلیع العذار رہی تھی۔ مناسب

---

(١) فضل حسین بہاری، " الحیاۃ بعدالمماۃ"، محولہ بالا، صص ٣١-٣٠
(٢) ایوب قادری، محمد؛ " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ٢٠٧
(٣) عبدالحی، مولانا سید؛ " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ٧، ص ٣٠٦
مہر، مولانا غلام رسول؛ " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا، ص ٢٩٥
(٤) گل حسن شاہ ، مولوی؛ " تذکرہ غوثیہ (حالات و کرامات شاہ غوث علی قلندر)"، لاہور: اللہ والے کی قومی دوکان، س۔ ن، (المشتہر سید محمد علی شاہ قادری، سجادہ نشین درگاہ غوثیہ) ، ص ١٧
(٥) عبدالحی، مولانا سید؛ " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ٧، ص ٣٣٠
(٦) محمود احمد برکاتی، حکیم، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ١٠٠
(٧) ~~مومن خان، مومن~~؛ " کلیات مومن"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ١٩٦٣ء، ج ٢، ص ١٠٩

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں " تقویۃ الایمان" سے چند سطریں نقل کردی جائیں :

" ہر خاص و عام کو چاہیے کہ اللہ و رسول ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اسی کو سمجھیں اور اسی پر چلیں اور اسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں سو سننا چاہیے کہ ایمان کے دو جزو ہیں۔ خدا کو خدا جاننا اور رسول کو رسول سمجھنا اور خدا کو خدا سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا شریک کسی کو نہ سمجھے اور رسول کو رسول سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی راہ نہ پکڑے - اس پہلی بات کو توحید کہتے ہیں۔ اور اس کے خلاف کو شرک اور دوسری بات کو اتباع سنت کہتے ہیں۔ اور اس کے خلاف کو بدعت - سو ہرکسی کو چاہیے کہ توحید اور اتباع سنت کو خوب پکڑے اور شرک و بدعت سے بچے کہ یہ دونوں چیزیں ایمان میں خلل ڈالتی ہیں۔ اور باقی گناہ اس سے نیچے ہیں کہ وہ اعمال میں خلل ڈالتے ہیں اور چاہیے جو کوئی توحید اور اتباع سنت میں بڑا کامل ہو اور شرک و بدعت سے بہت دور، اور لوگوں کو اس کی صحبت سے یہ بات حاصل ہوتی ہو اسی کو اپنا پیر و استاد سمجھے - "

====xxx====

جناب مولانا مولوی محمد صدرالدین خاں بہادر سلمہ اللہ تعالی :

هزار بار بشویم دهن زمشک و گلاب

هنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

رسم ہے کہ جب مداحان ادب سرشت کو اثنائے سخن میں احتیاج ہوتی ہے کہ اپنے ممدوح کی طرف اشارت کریں، سخن کو اس طرح پر ادا کرتے ہیں کہ ادا فہمان معنی رس ان کے مطلب پر لے جاتے ہیں اور اگر اس سے زیادہ توضیح کے نیازمند ہوتے ہیں، اور اگر اس سے زیادہ توضیح کے نیازمند ہوتے ہیں، ایسے چند اوصاف حمیدہ اور محامد گزیدہ یاد کرتے ہیں کہ سامع کا ذہن اس برگزیدہ انفس و آفاق کی طرف منتقل ہوجائے اور غرض اس سے یہ ہے کہ جو جاہ بلند اور مرتبۂ ارجمند ممدوح کا ارفع ہے اس امر سے کہ اس کے

نام والا مقام کو زبان پر لائیں ، چاہتے ہیں کہ حتی الوسع ترک تصریح کریں۔ اور جو کہ بعض محل کا اقتضا یہی ہوتا ہے کہ اس کے نام نامی و اسم گرامی کو مذکور کرنا چاہیے، بمقتضائے الاسماء تنزل من السماء کے ایسے اکابر عظام اور ایسے عمائد والا مقام کو نام بھی موافق علو شان کے مرحمت ہوتا ہے - پس جیسا کہ ان کی رفعت جاہ اور والادستگاہ اور بلند قدر و مقدار اور بزرگی شان و اقتدار پر یہ نام دلالت کرے گا، ان صفات سے ایسی کون سی صفت ہے کہ اس کے قائم مقام ہوسکے۔ اسی واسطے حق جلّ و علی بھی کبھی اپنے نام پاک کو مصرح یاد فرماتا ہے - ذرۂ مقدار اوّل از راہ ادب کے طریقہ صفات میں رہ گرا ہوتا ہے - اور چوں کہ سرتا سر اخلاق پسندیدہ کے اوصاف حمیدہ حد تحریر اور انداز تقریر سے متجاوز ہیں، عنان ادب کو ہاتھ سے دے کر دست توسل کو ذیل اسم سامی میں مشبث کرتا ہے کہ ایسے نام کا لینا گویا صفات غیر متناہیہ کا حصر اور دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے :

" چہ نامی کہ مولائے نام توام "

آغاز مدح :
=======

اکمل کملائے روزگار ، افضل فضلائے ہر دیار، حاکم محاکم جاہ و جلال ، متکی ارائک اقبال ، کلید دروازہ علم، لوح طلسم علم، عالم محقق تجرید ، مدقق سرجملہ علمائے متالہین، رافع مداقشات حکما و متکلمین، بفضل خصوصات آصر، [redacted] بفیصل مقدمات مجلی آئینہ تدبیر، ناظر صور تقدیر، نخل بند حدائق فضل و افضال ، مظہر صفات جلال و جمال ، جامع محاسن صوری و معنوی مستجمع کمالات ظاہری و باطنی، کاشف دقائق معقول و منقول ، واقف حقائق فروع و اصول ، توبگر صورت درویش سیرت ، انسان پیکر ملک سہرت ، مرجع مآرب جہان و جہانیان مولانا مخدومنا مفتی محمد صدرالدین خان بہادر قلم کو کیا طاقت کہ

ان کے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے - قطع نظر اس سے کہ اس زبدۂ جہان و جہانیان کی صفات کا احصار محالات سے اور کمالات کا حصر مرتبۂ متصورات سے ہے ، جس وقت قلم چاہتا ہے کہ کوئی صفت صفات میں سے لکھے ، یا زبان ارادہ کرتی ہے کہ کوئی مدح مدائح میں سے کہے جو کہ ہر صفت قابلیت اول لکھنے کی اور مدح لیاقت پہلے بیان کرنے کی رکھتی ہے ، مدت تک یہی عقدۂ بند زبان تحریر اور گرہ لسان تقریر رہتا ہے کہ کس سی صفت سے آغاز اور کس سی مدح سے ابتدا کرے - شعر :

مجلس تمام گشت و بپایان رسید عمر

ما ہم چنان در اول وصف تو ماندہ ایم

بے شائبہ تکلف و بے آمیزش مبالغہ ایسا فاضل و کامل کہ جامع فنون شتی اور مستجمع علوم بے منتہا ہو ، اب سوا اس سرگروہ علمائے روزگار کے بساط عالم پر جلوہ گر نہیں - ان حضرت کی طبع رسا شکل رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج سے - ارباب فہم و ذکا اور ناخن فکر عقدہ لاینحل کو پہلے اس سے وا کرتا ہے کہ گرہ حباب کو انگشت موج دریا معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا اور رمز شناسی اس مرتبہ کہ واقعی معلوم ہوگیا کہ نگاہ نرگس نے کیا اشارہ کیا - اگر ان کا حدس صائب صحف گل پر تفسیر نہ لکھتا ، بلبل آسی محض رہتی - اور اگر ان کا فکر رسا سطور شمشاد کے معنی نہ بیان کرتا ، قمری سجع خوان نہ ہوتی - ان کی دقت طبع اور حدت فہم کے سامنے لالہ کے داغ دل اور سنبل کی پریشانی اور ارغوان کی جگر خونی کی وجہ (سے) مضمون پیش پا افتادہ ہے - اگر ان کی رائے روشن معجز نما ہو نقطۂ موہوم کو اشارۂ انگشت سے تقسیم کرے ، اور جزو لایتجزی کو دو نیم - قلب المومن عرش اللہ گویا انہیں کے دل کی شان میں ہے کہ حامل وحی ان کے انفاس

ا؎ دوسرے نسخہ میں مجلس کی جگہ لفظ "قصہ" ہے وہ زیادہ مناسب ہے

فیض اقتباس کے واسطے گوش بر آواز رہتا ہے اور لی مع اللہ ان پر علی الدوام صادق ہے کیوں کہ کوئی وقت ایسا نہیں ہے کہ جبرئیل بارگاہ قرب الٰہی پر دیر تک اجازت بارگاہ منتظر نہ رہے ۔ راہ حق میں تیز رو تھے اور مسلک دنیا میں کامل کوش، لیکن تونگری ظاہری درویشیٔ معنوی کی پردہ پوش ہے :

کسانیکہ راہ خدا داشتند

چنیں خرقہ زیر قبا داشتند

اگر مولوی جامی زندہ ہوتے یہ بیت :

چو فقر اندر لباس شاہی آمد

بہ تدبیر عبید اللہی آمد

سوا اس برگزیدۂ انفس و آفاق کے اور کسی کی شان میں نہ کہتے ۔ جو کہ ارباب معنی پر یہ بات ظاہر ہے کہ لباس فقر میں مصروف اطاعت ہونا اور گوشۂ خلوت کو واسطے فراغ عبادت کے اختیار کرنا موجب شہرت ہے اور ہمت بلند بسبب کثرت اہل دنیا کے اس شغل کے اہم سے باز رکھتی ہے ۔ لباس اہل ظاہر کو اختیار کیا اور از بسکہ احقاق حق اور فریادرسی عباد اور عدل و انصاف افضل عبادات ہے ، منصب صدارت کو اپنے ذمہ پر لیا۔ سبحان اللہ کیا طریقۂ دار دہی اور کیا سرشتۂ انصاف ہے کہ نوشیرواں ان کے دیوان عدالت میں عہدۂ پیشکاری کے لائق بھی نہیں سمجھا جاتا۔ باقی رہا عدل عمر رض یہاں بسبب ادب کے کچھ کہا نہیں جاتا۔ شوکت ظاہری سے ان کے دربار میں دارا کو گذار نہیں اور جلالت باطنی سے ان کی خلوت میں فرشتے کو بار نہیں۔ باوجود ان مراتب بلند اور اس منصب ارجمند کے خلق محمدی کو اختیار کیا ہے کہ افادۂ علوم اور افاضت مسائل دین کے وقت ہر ادنا کو اجازت سخن ہے ۔ بمضمون اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے موزونی سخن کی طرف بھی متوجہ ہوکر نظم و نثر میں اوقات شریف کو مصروف فرماتے ہیں۔ زہے امت خاتم المرسلین ۔ اس جگہ بقدر گنجائش کاغذ کچھ نظم اور

کچھ نثر آپ کا درج کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو کہ فصاحت و بلاغت کو کیا رتبہ عطا کیا ہے:

دیباچۂ رسالہ لا تشدّ الرحال

الحمد للہ الذی جعل البیت امناً و مثابةً للناس اجمعین۔ و جعلہ ہدیً و مبارکاً للعالمین۔ و فضل المدینة علی سائر البلاد، و شرفہا بحلول خیرالعباد۔ و جمع لہا بین طرق الفضل و الطیب، وہی تنفی الناس کما ینفی الکیر خبث الحدید۔ فیہا روضة من ریاض الجنة، والنزول فیہا من المآثم جنة ۔ و شرف بیت المقدس و بارک حولہ و اشہر بین الناس مجدہ و طولہ و جعلہ مہبط الوحی و متعبد الانبیاء، و مستقر عبادہ المکرمین والصلحاء ۔ و فضل المساجد الثلثة علی سائرالعالم و عظمہا و کرم فضائلہا۔ تجل ان تحد بحد او تعد بعدّ او تحصر بکلام او تحصی بنظام ۔ تشد الرحال الیہا من کل بلدة و قریة و فلاة ۔ والصلوة فیہا بمائة الف و الف او خمسمائة صلوة ۔ والصلوة علی سیدنا محمدنِ الذی ہو افضل من کل راکع و ساجد و علی آلہ و اصحابہ الطاہرین الغر الاماجد ما ذکر المسجود لہ فی المساجد۔ و رضوان اللہ علی المقتدین بآثارہم الذین بذلوا جہدہم فی استنباط الاحکام و تحقیق عقائد الاسلام ۔ و اقبلوا علی تمہید اصولہا و قوانینہا و تلخیص ۔ حججہا و براہینہا ۔ و ابرموا قواعد الدین و مہدوہا و رفعوا مبانیہا و شیّدوہا۔ وارشدوا المسترشدین بایضاح المحجة الزموا المعاندین باقامة الحجة ۔ و حفظوا قواعد الشریعة الحنیفة السمحة البیضاء من ان تزلزلہا شبہ اہل البدع والاہواء ۔ شکر اللہ سعیہم واعاد الینا نفعہم ۔ اما بعد فیقول العبد المسکین محمد صدرالدّین وفقہ اللہ للعمل فی یومہ لغدہ قبل ان یخرج الامر من یدہ ان العلم فی ہذا الزمان قد اندرس آثارہ وسقط من القلوب محلہ و مقدارہ ۔ و نضبت انہارہ وتلعت اشجارہ و غار ماءہ و ہواءہ، واظلم فضاءہ وتغیرت خضرتہ و تبدلت نضرتہ و ذہبت طراوتہ

و يبست نداوته - و غربت شموسه و اقماره أفلت اصحابه و انصاره - و افلت ثوابته و سياره
و رحلت اخباره و اخياره - حتى صار اليوم نهباً ناشحاً و غثاً فاضحى العلم مغلوباً والجهل
مطلوباً - والنقص كمالاً والحمق جمالاً و الاقبال و بالاً والحكمة ضلالاً - والعقل فضولاً والعزل
مقبولاً والبدعة سنة والضلالة حكمة و انصرفت الهمم عن تحصيل الحق بالتحقيق زلت
الاقدام عن سواء الطريق ، بحيث لا يوجد راغب في العلم ولا خاطب للفضيلة وصارت الطباع
كانها مجبولة على الجهل والرذيلة - ومابقي من العلم الا الاسم ولامن الدين الا الرسم
و امام الدين يتوهم الجهلة بالعلماء وهم في غير هذه البلدة - فاكثرهم كما ترى ما على
قلوبهم اكنة فلا يكادون يفقهون حديثاً ايهتدون الناس على ما آتاهم الله من فضله - فاذا جاءهم
ما عرفوا من الحق كفروا به وارادوا تلبيساً و تدليساً - طائفة منهم يغمضون الابصار ولا يكتفون
بالاخبار و يحسبون انهم يحسنون صنعاً - هي ما يرتفع اليه نظرهم هوا النقل عن [illegible]
الكافي ، وما الكفاية من غير الثقات الى درايته و استبصار في روايته - والقوا شراشرهم على
صحيح الروايات من الفتاوى غير المعتمدة - والنقل من شخص معين او مجهول من غير ان
يخطر ... ببالهم تحصيل في الادلة والاصول لم يعلموا ان الذاهل عنه كالبنيان على غير
اساس - و اذا سئل عما هو عليه ... لم يقدر على ايراد حجة او قياس ، فيا حسرة على
ابناء الزمان بانهم قد اتخذوه ظهرياً وصار طلبه عندهم لاه شيئاً فرياً - والمختار عند
جماعة منهم الاخذ بالقول المرجوع الذي لا تغني من جوع ولا تنفع من بجح - ومنهم من
تمسك برواية فقيهة نادرة قد رضا منهم - ان الكل جديد لذة - كل بضاعتهم الطعن
في الائمة المجتهدين وجل صناعتهم القدح في الاوهام العقريين - الصراط المستقيم والمحلى
ماخذهم واساسهم، وابن تيمية و ابن حزم رئيسهم ورأسهم - لا يهتدون الى طريق الحق
بل يترددون في تيه بلاها دو دليل و هم اضلوا كثيراً وضلوا عن سواء السبيل - وفئة
منهم يقلدون آباؤهم فهم على آثارهم مقتدون اولوكان آباؤهم لا يعقلون شيئاً ولا

يهتدى - و بعضهم يستنبطون الاحكام الكل من الاحاديث والقرآن ولا يعلمون شيئاً من العلوم حتى علم اللسان- وهم اذا وقعوا فى معضلة عمياء خبطوا فيها خبط عشواء والذين معهم ماغرقوا من الاتباع والتقليد- يقولون ان هذا هو سواء السبيل - و اذا رجعوا الى شيوخهم ينقلون قولهم بلا حجة ولا دليل- ولقد منّ الله سبحانه على هذه الامة لوجود العلماء فى كل عصر الذين عضّوا فى العلم بنواجذهم و رموا غرض الاصابة بنوافذهم - و صرفوا فى التحصيل العلم اعمارهم واحيوا لكسب الفضل ليلهم ونهارهم - فالقوا وافادوا واجادوا و اجادوا-

فطوبى لمن راجع اليهم ونزول رياضهم ووارثى الحق حقا ، ونزل اتباعهم و سحقاً - لقوم الذين لايترددون اليهم ولا يرجعون اما تليت عليهم قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون - وكفى لنا مستند اعلى غواية كبرائهم انهم حرموا السفر الى زيارة قبور الانبياء و الاولياء- متمسكين بحديث لا تشد الرحال - فاملين عليهم فى شرحه مايخرجهم من الضلال مع تفرق البال و تشتت الحال - فظلت اعناقهم خاضعين وقالوا آمنا بما جاءنا من الحق المبين - والله سبحانه هو المسئول ان يوفقنا للصدق والصواب و يصون عقولنا من الزيغ والارتياب - ويجعلنا ممن شرح بالحق صدراً او شرح فى فتح باب الاشكال فرفع قدراً وهو على مايشاء قدير و بالاجابة جدير -

اشعار عربى

وكاكغصنى بانة قد تالفا — على دوحة حتى استطا لا و اينعا

يغنيهما صدح الحمايم مرجعاً — ويسقيهما كاس السحائب مترعا

سليمين من خطب الزمان اذا سطا — خليلين من قول الحسود اذا سعا

ففارقنى من غير ذنب حبيبة — والقى بقلبى حرقة وتوجعا

عفا الله عنه ما جناه فاننى — حفظت له العهد القديم وضيّعا

نثر فارسی

رهین منت بخت بیدارم که من هیچ در حساب را که چون حرف باطل بغلط بر زبان گوهر فشان نمی گذشت از روستائی بی اعتباری آورده روشناس شهرستان صحبت خطاب گردانید ، و از نشیب گاه فراموشی بالا داده و برفراز والا پایگی یاد آوری رسانید- باری طالع راگذری بسر وقت بیدلان افتاد که دور گردان بزم دل فروز را که چون غبار شکست در کنار آن راه نتوانستنی یافت از ره سپری وادی بی آرائشی رهانیده از نزدیکی بساط حضور گزیده سامانی فراهم دادو کاروان نسیم مصر دربیت الحزن بار اقامت برکشاد و ساربان زمام ناقهٔ لیلی را بکف اختیار قیس شکسته پا داد - قطره ام دریا ، مسم کیمیا ، خزفم گوهر ، خارخسکم گل تر ، شامم روکش روز ، بامدادم رشک نوروز - دردم دوا ، گردم توتیا ، خوشه ام خرمنی ، سبزه ام سحی ، یاسم امید ، خزانم بهار جاوید گردید - پستم را بلندی ، طالعم را ارجمندی ، بشم راسحر ، دمسم را اثر ، سرافکندیم راسر فرازی شکسته خاطر را دل نوازی پدید آمد - همانا همایون فال طائر سایهٔ اقبال بگسترد که خطاب سلیمان به موردناتوانی رسانید و زبان حال را بزبان مور کریمه اِنّیٓ اُلْقِیَ اِلَیَّ کِتَابٌ کَرِیْمٌ گویاساخت- سراپای دل را شگرف کشایشی روآورد و پیشگاه سینهٔ بوالعجب انشراحی فراگرفت - خاطر پریشان را پیرایهٔ فرخی جمعیت و مایهٔ خرسندی آرامش حاصل شد - نسیم الطاف قدیم بتازگی وزید و گلشن عاطفت از سر شگفت - چون از دور افتادگان از یاد رفته و فراموشان از طاق دل افتاده پرس و جوئی بسامان بودکه ، خاطر حسرت اندوز یکجاگون کامرانی ها بر آمود و بدیع انبساطی رهی روزگار اخلاص سرشت گردید - بیت :

" نیافت صبح دم آغوش دوست از بر دوست
تمتعی که دل از ذکر این پیام گرفت

ازان باز که بار فصل خصومات رابرگردن گرفته، انفاس گرامی را بجابایست داده ام،

نقوش سخن گذاری و نکته سرائی از ساحت ضمیرم یک قلم سترده و تار عنکبوت نسیان بر زوایائی سر اوقات آن یکسر تنیده آمد ، و راس المال متخیلات آن که در خزانهٔ خیال داشت بتاراج اختلاط منشی از پست منشان سست فطرت ، که حفظ ضوابط معمولهٔ عدالت را عرش المعرفه بالغ خردی و سدرة المنتهای دانش پژوهی شمرده اند بر دادهٔ والااوامی شغل هائی دیگر ضمیمهٔ آنست دوست مایهٔ آسودگی چندانی بدست نیارستم آورد که لختی آئین سخن طرازی و نکته سنجی را بکار برم ، مگر چون آهنگ این صناعت را باگوهرم سرشته اند گاه گاه بسیج آن تار بجد نسیج این علایق را ازهم میگسلاند - وهرگاه بهمین هدیهٔ نو آزادگان طبع از احیائی دورانی برفراز اعتبار منزل می گیرد ، هم چو بلبلی که بداستان سرائی بلبل دیگر درچمن بخروش آید و آهنگ ناله ساز دهم، با اختیار نوائی جان خراش از خاطر بریان بر می زند-وبسر جوش شوق بی خودی جوش بی هنگام دار از جامیرود- هر چند از آشوب درونی و برونی بی راه مسلم و سخن را بآئینی که باید گذار ده و گزین کاری بسزا برنخواسته ام - اما فروهیده فراهنگان اصناف گوهر و سخن سرایان نوبده وران را مرسلة الصدر ریح و روان نوادم نبهید- اکنون از [illegible] حال هم بزرگوار می دونسیم شفائی ایشان از نادرهٔ حکمت دادارجان آفرین است و مایهٔ حیرت دران دوریات بکار ساز حقیقی روی نیاز آورده ، جلائل نعم الهی را دریافته ، شرح آن نگالهد گفتار در نگنجد- فی‌الجمله بسر نوشت آسمانی طیلسان صحت بردوش گرفته و بحصار آورده اند در حصار حراست علی‌الاطلاق منزل گرفته والسلام حرره محمد صدرالدین ختم الله بالحسنی -

غزلیات فارسی

========

آتش عشق فلک در دل و در جانم سوخت

زان که از داغ و گردید که نتوانم سوخت

دل زخمی تاب جگر سوخت و مژگانم سوخت

آخر این شعله به بیدایم و پنهانم سوخت

پنبهٔ مرهم او مهر قیامت باشد

عشق آن داغ که در سینهٔ سوزانم سوخت

روز هجران تو می سوخت مرا حسرت وصل

در شب وصل تو اندیشهٔ هجرانم سوخت

هیچ که چرخ جفا پیشه دمی ساخت بمن

شکر ایزد که ز آه شرر افشانم سوخت

زحمت از بهر عذابم مکش ای نار جحیم

که سراپائی مرا خجلت عصیانم سوخت

شرر دوزخ جان تاب بسی بود بلند — چون مقابل شده با سینهٔ سوزانم سوخت

برگ و جمعیت دیوان جزا برهم خورد — جنت از حسن تو دوزخ از افغانم سوخت

بازآن بستر خارست وهمان بالش سنگ — سرشوریدهٔ من زانوی یارانم سوخت

بزم افروز شبستان نشدم آن شمعم — بخت خوابیده سرخاک شهیدانم سوخت

دل پر درد بخون تاب جگر سوخت مرا — آنکه یک ضربه اوساخته ام آنم سوخت

هرنگه کان بت ترسابچه درکارم کرد — آتشی بود کزاوخرمن ایمانم سوخت

کو نسیمی که زشوب درد و سوز کند — خاست ازحد سمومی که گلستانم سوخت

گرز آتش سخنی هیچ کمالم نفزود

لیکن آزرده ازوبان حسودانم سوخت

وله

حسن کی راه زن کا فرودیندار نبود — آفت سبحه بلائی بت و زنار نبود

یاد روز یکه جزا و هیچ بدیدار نبود — پردهٔ دیدهٔ مرا مانع دیدار نبود

هردری بُرخم از روضهٔ رضوان وابود — خواهش بوی گل از رخنهٔ دیوار نبود

این شروشور نه درصحبت رندان بوده — جمله بدست دمی حوصله بردار نبود

بود از گردش چشم تو گلستان دل ما — درمیان واسطهٔ ثابت و سیار نبود

رتب اردی زلب مستی من سرمیزد   لی ترادی ادب آموز طلب کار نبود

مست درگوشهٔ میخانهٔ وحدت بودیم   کارما باده کشی بود و دگرکار نبود

عشق بی پرده تماشائی جمالش میکرد   همچو بیخود زمشی وعدهٔ دیدار نبود

بود سر رشتهٔ کارم بسر زلف سیاه   قصهٔ کشمکش سبحه و زنار نبود

شکر لله چو بخلوت حرمم آوردند   رهی دل جز طرف خانهٔ خمار نبود

دست تا بند نقابش برساندم مردم   سعی خوش بود مگر بخت مددگار نبود

صحبتی بود و عجب دوش میان من و یار   صد شکایت بلب ورخصت اظهار نبود

دل خون گشته مدد کرد وگرنه صد بحر   خرج یک روزهٔ این چشم تلف کار نبود

گرد غم جز دل ناشاد محلی نگزید   ورنه آئینه ما قابل زنگار نبود

سهل و آسان شده امروز بعهد تو چنین   ورنه دشوار تراز ترک وفا کار نبود

از کساد هوست این که بهیچم نخرند   جنس تا بود گران ناز خریدار نبود

لطف ساقی بگردم همن آخر کرد   چون مرا حوصلهٔ ساغر سرشار نبود

در دلم آن مژه صد خنجر الماس شکست   زهر چشم تو آن گرچه مددگار نبود

از علاج دل بیمار چرا دست کشید   گر مسیحا به تقاضای تو بیمار نبود

طرز آتش سخنی طبع من ایجاد نبود   پیش ازین این روش و شیوهٔ اشعار نبود

آه از خجلت آزرده بها زار جزا
هیچش از جنس گران مرتبه دربار نبود

ولہ

خواهم دم دعا بدعا ناگریستن   شد بسکه بی اثر بدعا ها گریستن

سوز دلم نبود دوبالا گریستن   این درد را نگشته مداوا گریستن

دل قطره قطره خون شده از چشم برچکید   تاراج داد مشغلهٔ ما گریستن

بیهوش بضبط گریه بکوشم زرشک غیر   بر رحم تا نیاورد او را گریستن

جز چون تو سنگ دل نتواند شد از دگر   نگریستن بحال من و ناگریستن

از اشک ریزئی مژه خالی نشد دلم   خواهم چو زخم از همه اجزا گریستن

بی عندلیب خوش نبود ناله در چمن   خواهیم در خزان به تمنا گریستن

واعظ اگر بیاد قدی گریه ناروا است   باز ازچه رد ست ازین طوبی گریستن

شوید ز دیده لذت خوابی که دیده بود   بیشت از آن گرفت زلیخا گریستن

ای چشم دجله ریز ادب را نگاه دار   اینست در مدینه و بطحا گریستن

رسوا شدن چو برق بود با بچشم نم   ای ابر با گریستن ما گریستن

ابر آب شد ز گریه ام و برق خنده زن   آهی کجا که جمع کنم با گریستن

از سوز سینه خوف ندارم کار ماست   از کاو کاو آن مژه ور دریا گریستن

آورد مش بر حم بطرزی مگر نسیم   خوش صرفه بود از لب گویا گریستن

طوفان نوح بود حدیثی شنیده ام   چشم ترم نمود ز رسوا گریستن

در عیش بیقرارم و در غم به پیچ و تاب   خنده بدم شبیه بود با گریستن

دل را همیشه خنده گم می خون کند چو گل   بشگافدم جگر قلم آسا گریستن

موجی بزن که ترکنم ابر بهار را   ای دیده تا کجا بمدارا گریستن

ای دل ضبین مباش بالفت که شمع وار   با خنده هم عنان بود اینجا گریستن

یارب نگاه بوالهوسم ده که شد مرا   در بزم او حجاب تماشا گریستن

سیراب تازمین غزل کرد گریه ام   بیهم که می رسد بکجا ها گریستن

ای دل بیا که خاک کنم ابر و برق را   از تو بخش تپیدن و از ما گریستن

اشعار تر درین غزل آمد که ربط داشت   چون چشم من قوافی آن با گریستن

آزرده خیز کامده عرفی و طالبا
از تو قصیده خواندن و زینها گریستن

غزل ریختہ

نالوں سے میں کب تہ و بالا جہان نہیں   کب آسمان زمین و زمین آسمان نہیں

مجھ سا بھی کوئی عشق میں ہے بدگمان نہیں   گلزار رشک دیکھ مجھے رنگ خزان نہیں

جاتے ہے دل فلک کا سری تیغ کا ملی   ان ناتوانیوں کو پہنچتی توان نہیں

قاتل کی چشم تر نہ ہو یہ ضبط آہ دیکھ   جوں شمع سوختہ پہ اٹھایاں دھوان نہیں

آنکھوں سے دیکھ کر تجھے سب مانا پڑا   کہتے تھے جو ہمیشہ چنیں ہے چنان نہیں

کہتا ہوں اس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہے کی زبان اور زبان نہیں

اے بلبلان شعلہ دم اک نالہ اور بھی   گم کردہ راہ باغ ہوں یاد آشیان نہیں

اٹھ کر سحر کو سجدہ مستانہ کے سوا   طاعت قبول خاطر پیر مغان نہیں

مہکا ہوا ہے بیت حزن دیکھنا کوئی   آیا نسیم مصر کا ہو کاروان نہیں

اس بزم میں نہیں کوئی آگاہ ورنہ کب   وان خندہ زیر لب ادھر اشک نہان نہیں

افسردہ دل نہ ہو در رحمت نہیں ہے بند   کس دن کھلا ہوا در [illegible] پیر مغان نہیں

لب بند ہو تو پوزش سجدہ کو کیا کروں   تھمتا تو مجھ سے نالۂ آتش عیاں نہیں
اے دل تمام دفع ہے سودائے عشق میں   اک جان کا زیاں ہے سوا پیسا زیاں نہیں
اے جذبِ شوق رحم کہ مدنظر ہے یار   جاسکتی واں تلک نگہ ناتواں نہیں
کیا کچھ نہ کردکھائی پر اک دن کے واسطے   ملتا بھی ہم کو منصبِ ہفت آسماں نہیں
داز ونگہ روش سبھی لاکھوں جان کے   ہے لیکن ادا وہ تیری کہ جو جاودستاں نہیں
شب اس کو حال دل نے جتایا کچھ اس طرح   ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں
وہ شاخ نخل خشک ہیں میں کنج باغ میں   دیکھے ہے بھول کر بھی جسے باغباں نہیں
ملتا ترا یہ غیر سے ہو پھر مصلحت   ہم کو تو سادگی سے تری یہ گماں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہ حزیں کے ساتھ   اک قہر تھی بلا تھی قیامت تھی جاں نہیں
پیرانہ آئی دہر میں کیا شورشیں کروں   ہم پیر دہر ہیں کہ وہ بھی نوجواں نہیں

آزردہ نے پڑھی غزل اک بے مزے میں کل
وہ صاف ترکہ سبحۂ پیر مغاں نہیں

ولہ

شب جوش گریہ تھا مجھے یاد شراب میں   تھا غرق میں عصر آتش سے آب میں
کیا جانو جو اثر ہے دم شعلہ تاب میں   یہ وہ ہے برق آگ لگادے سحاب میں
قسمت تو دیکھ کھولی گرہ کچھ تو رہ گئے   ناخن ہمارے قرض کے بند نقاب میں
یارب وہ خواب حق میں مرے خواب مرگ ہو   آئے وہ مست خواب اگر مرے خواب میں
حال اس نگہ کا اس کی سراپا میں کیا کہوں   موشمیت پھنس گئی جا شہد تاب میں
ہر وقت آرزوئے عذاب جحیم ہے   ہاتھوں سے ہجر کے ہیں میں کیا کیا عذاب میں
یارب یہ کس نے چھین سے الٹا نقاب جو   سوختہ اب نکلنے لگے آفتاب میں
ذکر وفا وہ سنتے ہی مجلس سے اٹھ گئے   کچھ گفتگو بھی ٹھیک نہ تھی ایسے باب میں
خورشید زار ہوئے زمیں دے جھنگ ذرا   سو آفتاب ہیں تری گرد نقاب میں
کیا عقل محتسب کی ہے لایا ہے کھینچ کر   سودا زدوں کو محکمۂ احتساب میں
کیا پوچھتے ہو چارۂ از خویش رفتگاں   سوجا سے چاک جامہ ہے سوزن خلاب میں
پیراہن الماں مری ظرف تنگ سے ہیں   تھا نقش کچھ نہ جوہر صہبائے ناب میں
ہم جان و دل کو دے چکے موہوم اسیر   اب ہو رہو ڈبودی یہ کشتی شراب میں
آواز صور تھی شہیدوں کی روز حشر   لگتی تھی اک بھنک سی جو کانوں کو خواب میں
اٹھتے ہیں صبح کے یہ کہاں سرگرانیاں   زاہد نے مے کا جلوہ یہ دیکھا ہے خواب میں

کچھ بھی لگی نہ رکھی ڈبوئی رہی سہی
دل کو نہ ڈالتا تھا سوال و جواب میں

جو دیکھتے ہیں اس سے یہ گذر کبھی نہیں
یعقوب کے خیال و زلیخا کے خواب میں

تحقیق ہو تو جادو کہ میں کیا ہوں قیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

الفت میں ان کی اب تو ہے جانوں کی پڑ گئی
دل کس شمار میں ہے جگر کس حساب میں

ہر ہر روش سے خرقہ کی میری ہے مے چکاں
خوبی تو سود ہے اسے زمزم کے آب میں

مے اور ذوق بادہ کشی لے گئی مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

تھی [جو] جہان میں روز ازل جائے درد کی
آیا پسند دل میرا اس انتخاب میں

اس چشم اشکبار کے کیوں کر ہو سامنے
رونے کا مادۂ ہی نہیں ہے سحاب میں

امداد چشم کیا ہو لگی دل کو آگ جب
جلنے کے بعد خوں نہیں رہتا کباب میں

ہیں دونوں مثل شیشہ یہ سامان صد شکست
چھپا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں

انوار فکر سے نہ ہوا کچھ بھی انکشاف
جتنا بڑھے ہم اور پڑے جا حجاب میں

یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہد شباب میں

ولہ

حسن کی شان سے ہے یہ رہے مستور نہیں
ورنہ ہوتا کبھو یوں جلوہ سر طور نہیں

عذر کرتے ہی بنی ان کو تجھے جب دیکھا
جو کہا کرتے تھے رسوا ترا معذور نہیں

ہیں تو ہم جنس فراہم نہ ہو سامان طرب
بزم ماتم سہی کو انجمن سور نہیں

لاکھ ہنگامۂ محشر دکھا دیں دم میں
برہم افشائے سرائر میں ہیں مامور نہیں

خانۂ غیر تجلی کدہ ہو اور عجب
ہم کو جز روئے سیاہ و شب دیجور نہیں

مژدہ اے چرخ کہ اب میری طرح سے رکھتا
طاقت اٹھنے کی ذرا نالۂ رنجور نہیں

چارہ اب کیا ہو جو ہو نشتر و مرہم یکساں
کون سا داغ ہے سینے میں جو ناسور نہیں

دل پر رخنہ ہی کو آگ لگا دی ہم نے
چارہ جز شعلہ بنے خانۂ زنبور نہیں

محتسب کو کیا بیکار تری آنکھوں نے
ایک بے خانہ بھی اس دور میں معمور نہیں

بڑے بڑے وہ کرو نامہ مرا یوں دیکھئے
یہ بھی چھاتی سے لپٹنا ہے کہ منظور نہیں

ہے دیا قاعدہ یہاں ذبح کا قاتل کی طرف
دیکھنا بھر کے کنکھیوں سے بھی دستور نہیں

دامن اس کا تو بھلا دور ہے ہاں دست جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

بھبتا یہ ہے کہ جیسے آیت محکم ہے صاف
معنی دور نہیں لفظ بھی مہجور نہیں

میں ہوں اور گوشۂ یثرب یہ تمنا ہے اب　　خواہش سلطنت قیصر و فغفور نہیں
مدد اے پرتو لطف نبوی گوشی عمل　　شمع تنہائی ظلمت کدۂ گور نہیں
آستاں ہے ترے در کا وہ تجلی پرتو　　پہنچے یا سنگ کو جس کی جبل طور نہیں
کبھی سا دن ہے کہ خورشید جہاں تاب سحر　　خاک در سے ترے دریوزہ گر نور نہیں
پایۂ عرش بڑھادا تھا وگرنہ یہ نام　　لوح پر عرش کی ہوتا کبھو مسطور نہیں
ہوں ادا نظم میں کس طرح مناقب تیری　　سلسلہ یہ متناہی ہے وہ محصور نہیں
ترک رہی خوش آزردہ محالات سے ہے
ہاں خدا کی تو خدائی سے ہے کچھ دور نہیں "(۱)

تعلیقات :

صدرالدین خاں نام ، آزردہ تخلص اور خاں بہادر خطاب تھا۔ دھلی میں صدرالصدور کے عہدے پر فائز تھے ۔ ۱۲۰۴ھجری مطابق ۱۷۸۹ع میں پیدا ہوئے ۔ لفظ " چراغ " سے ان کی تاریخ ولادت نکلتی ہے ۔ ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔(۲) والد کا نام لطف اللہ تھا۔ ان کے جد امجد شاہ ولی اللہ کے مخلص احباب اور تلامذہ میں سے تھے۔ (۳)

مولد و منشاء طفولیت اور مہد علمی دھلی ہے ۔ فقہ ، حدیث ، تفسیر وغیرہ کی تحصیل اصحاب ثلاثہ کی خدمت بابرکت میں کی تھی۔ معقولات کی کتابیں فضل امام خیرآبادی سے پڑھی تھیں اور حدیث کی سند انھوں نے شاہ اسحاق سے لی تھی۔ (۴) حامد حسن قادری نے فضل امام کی بجائے ان کے صاحب زادے فضل حق خیرآبادی

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید" ، محولہ بالا (اشاعت اول)، چوتھا باب، ص ۸۹-۷۳
(۲) احسان الحق فاروقی، محمد ذکاء مرتبہ " گلشن بے خار"، از نواب مصطفی خاں، شیفتہ، کراچی : آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۲ع، ص ۷۷
(۳) ہاشمی فرید آبادی، " مفتی صدرالدین آزردہ"، (مقالہ) ، " اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، ۱۹۷۳ع ،ج ۱ ، ص ۱۱۷
(۴) فقیر محمد جہلمی، " حدائق الحنفیہ"، لکھنو : نول کشور، ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ع ، ص ۳۸۱

سے استفادہ کا ذکر کیا ہے - (۱) قادری صاحب کو اس باب میں تسامح ہوا - کریم الدین پانی پتی نے بھی فضل امام اور شاہ عبدالعزیز سے معقولات و منقولات کی تحصیل کا ذکر کیا ہے - (۲) خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے - کلام پر اصلاح پہلے شاہ نصیر سے لیتے تھے پھر رحمت اللہ مجرم اکبرآبادی سے تلمذ اختیار کیا- اور آخر میں میر ممنون کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا- (۳)

تحصیل علمی سے فراغت کے بعد کمپنی کی ملازمت کرلی تھی- پہلے صدرامین کے عہدے پر فائز ہوئے - دلی، آگرہ ، اجمیر، جے پور وغیرہ میں خدمات انجام دیں- ۱۸۲۳ء میں جب مولوی عبدالقادر نے راج پوتانہ کا سفر کیا تو مفتی صاحب اسی علاقے میں تھے- جنرل سرڈیوڈ آکٹرلونی راج پوتانہ کے ریذیڈنٹ تھے- مولوی صاحب موصوف نے مفتی صاحب کو جنرل موصوف کی " کلید دانش" اور ان کا معتمد علیہ لکھا ہے -(۴) ۱۵ جون، ۱۸۲۴ء کو دلی میں صدرالصدور بنائے گئے -(۵)

شاہ ولی اللہ دہلوی کی خاص جماعت سے ان کا تعلق تھا- شاہ عبدالعزیز نے اس جماعت کو دو گروہوں میں تقسیم کردیا تھا- پہلا گروپ کے سربراہ جس کی ذمہ داری عملاً انقلاب برپا کرنا تھا، سید احمد شہید تھے اور دوسرا گروپ انھوں نے اپنے زیرقیادت رکھا تھا جس کے فرائض میں درس و تدریس ، اصحاب استعداد کی تیاری، پہلے گروپ کے کے زیادہ اقدام وسعی میں مرکز کو سنبھالنا، فداکاروں کی بھرتی، سرمایہ کی فراہمی، اور

---

(۱) حامد حسن قادری، " تاریخ داستان اردو"، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۲

(۲) کریم الدین پانی پتی و فیلن، " تذکرہ فرائدالدہر"، دہلی: مطبع العلوم مدرسہ، ۱۸۴۷ء، ص ۳۹۶

(۳) عسکری، مرزا محمد (مترجم) " تاریخ ادب اردو"، از رام بابو سکسینہ ، لاہور: س ن ، ص ۱۸۷

(۴) محبوب قادری، محمد (مرتب و مترجم) " وقائع عبدالقادر خانی) ،علم و عمل"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۷۲-۲۷۱

(۵) مختارالدین احمد ، ڈاکٹر(مرتب) " تذکرہ آزردہ" از مفتی صدرالدین خان آزردہ، کراچی: انجمن ترقی اردو(پاکستان) ، ۱۹۷۲ء، ص ۲

ہر طرح کی اخلاقی امداد شامل تھی ۔ اس گروپ میں مفتی صاحب شامل تھے۔ (۱) ۱۸۵۷ء میں انھوں نے بڑی دل چسپی لے کر تحریک کی امداد اور رہنمائی کی تھی۔ ۱۸۵۷ء کو پچاس سپاہیوں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر مفتی صاحب کے مکان پر حملہ کیا تو یہ دیکھ کر لوٹ گئے کہ ستر مجاہدین ان کے مکان پر موجود اور مقابلے کے لیے تیار ہیں۔ اس پر مولانا محمد میاں لکھتے ہیں " کہ جہادی مولانا مفتی صدرالدین سے خاص تعلق رکھتے تھے یہاں تک کہ ان کی حمایت و حفاظت میں لڑنے کو تیار ہوگئے ۔" (۲) مشہور مجاہد حریت مولوی احمد اللہ شاہ دہلی پہنچے اور انھوں نے مفتی صاحب سے حالات کے بارے میں رہنمائی چاہی تو مفتی صاحب نے انھیں تحریک کا مرکز دہلی کی بجائے آگرے کو بنانے کا مشورہ دیا اور وہاں کے رؤسا اور علما سے تعارف کے لیے آگرے کے مفتی انعام اللہ خان کے نام خط لکھ کر دیا۔ چناں چہ عظیم اللہ خان ان کا خط لے کر آگرے گئے۔ انعام اللہ خان سے اور ان کے ذریعے وہاں کے سربرآوردہ حضرات سے ملاقات کی ۔ (۳) فتوی جہاد پر مفتی صاحب نے بھی دستخط کیے تھے۔ ان کی بڑی ہمدردیاں تحریک آزادی کے ساتھ تھیں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ وقت کی بساط اولوالامر کی خواہش کے خلاف الٹ گئی ہے تو یہ مقصد تختہ دار پر چڑھ جانے کی بجائے مناسب سمجھا کہ حسن تاویل سے کام لیا جائے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے " کہ انھوں نے فتوے پر دستخط کرتے ہوئے " کتبت بالخیر" لکھوایا تھا۔ اور " خ " کا نقطہ نہیں دیا تھا۔ غدر کے بعد جب روبکاری ہوئی تو فتوی پیش کیا گیا تو انھوں نے کہا ٹھیک ہے مجھے

---

(۱) محمد میاں، مولانا: علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۹۷-۹۸

(۲) ایضاً، ج ۴، ص ۳۰۷-۸

(۳) ایضاً، ج ۴، ص ۲۳۷، ۲۹۷-۹۸، ۳۶۰

دستخط کرنا پڑا کہ مجبور تھا لیکن میں نے صاف لکھدیا تھا کہ جبر سے دستخط کردیا گیا ہے - (۱) لیکن مولانا محمد میاں اس بات کو نہیں مانتے وہ اسے محض افسانہ قرار دیتے ہیں - ان کا خیال یہی ہے کہ مفتی صاحب نے فتوے پر دستخط کئے تھے۔ [redacted] اس جرم میں پکڑے گئے اور سزا بھی ہوگئی - وہ اس جرم سے بری کہاں قرار دئے گئے -(۲) اس بات کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ فتوے کی جو نقل " صادق الاخبار" دھلی ، مورخہ ۲۷ جولائی، ۱۸۵۷ء میں چھپی تھی اس میں کتبت یا شہدت بالخیر کے الفاظ ہی نہیں ہیں-(۳) صاحب " نزھتہ الخواطر" نے فتوے پر دستخطوں کو ان پر محض اتہام قرار دیا ہے -(۴) لیکن یہ درست نہیں ہے - فتوے پر ان کے دستخط ہیں خواہ رضا سے ہوں خواہ جبر سے -

بہر حال وہ اس جرم میں گرفتار ہوئے - چند ماہ حوالات میں رہے - بلا شبہ وہ پھانسی سے بچ گئے لیکن ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا - جائداد ، مکان ، کتب خانہ ضبط کرکے نیلام کردیا گیا- پھر جب بہت کوشش کی تو نصف جائداد اور مکان واگزار ہوگیا تھا- حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام ۱۹ جنوری، ۱۸۶۲ء کے خط میں غالب لکھتے ہیں :

" جناب مولوی صدرالدین صاحب بہت دنوں حوالات میں رہے - کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا- روبکاریاں ہوئیں، آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا- نوکری موقوف ، جائداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے- فنانشل کمشنر اور لیفٹیننٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی

---

(۱) مہر ، مولانا غلام رسول (مرتب) : "نقش آزاد"، محولہ بالا ، ص ۳۱۷

(۲) محمد میاں، مولانا : "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۴، (حاشیہ)، ص ۲۵

(۳) مختارالدین احمد ، ڈاکٹر (مرتب) : "تذکرہ آزردہ"، محولہ بالا ، ص ۷

(۴) عبدالحی، مولانا سید : "نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۲۲۱

اب صرف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں کرایہ پر
معاش کا مدار ہے -" (۱)

قید سے رہائی کے بعد لاہور گئے اور پنجاب کے چیف کمشنر سرجان لارنس سے ملاقات کی جو اپنے زمانہ قیام دہلی سے حضرت مفتی صاحب سے واقف اور ان پر مہربان تھے - ان کی سعی و سفارش سے ایک مدت کے بعد صرف اتنا ہوا کہ نصف جائداد واگزار ہوگئی اور حویلی مل گئی - لاہور سے واپسی کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ بستی نظام الدین میں گزارا۔ پھر اپنی حویلی میں اٹھ آئے - جائداد کی ضبطی و نیلام کے ساتھ ان کا کتب خانہ بھی نیلام ہوگیا تھا۔ جس کی مالیت فقیر محمد جہلمی نے تین لاکھ بتائی ہے -(۲) زندگی کے آخری دور میں انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی اور صرف طلبہ کو پڑھانے کا شغل جاری رکھا تھا۔ مدرسہ دارالبقا کے بیچس طلبہ کو اپنے پاس سے وظیفہ دیتے تھے ، ان کی ضیافت کرتے تھے، ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے اور انھیں مختلف علوم پڑھاتے تھے- (۳)

مفتی صدرالدین اپنے عہد کے اکابر و افاضل میں ایک غیر معمولی فضیلت و جامعیت کے شخص تھے۔ نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں :

" اپنے زمانے میں یکتائے روزگار اور نادر عصر تھے - معقولات کی کتابیں پڑھانے میں بالخصوص دہلی کے مغربی و شمالی علاقوں کی فتوی نویسی میں ، مدرسوں کے امتحان اور صدارت ، حکومت و ایوان (عدالت) کے اعلا مدارج ان پر ختم تھے۔ تمام علوم صرف و نحو، منطق ، فلسفہ، ریاضیات ، معانی و بیان ، ادب و انشا اور فقہ ، تفسیر ، حدیث میں کمال رکھتے

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول (مرتب) " خطوط غالب"، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۲ء، ص ۳۲۹

(۲) فقیر محمد جہلمی، " حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا ، ص ۳۸۲

(۳) عبدالحی، مولانا سید ، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۲۲۱

تھے اور سب علوم پڑھاتے تھے۔" (۱)

عبداللطیف نے لکھا ہے کہ مفتی صاحب سنجیدہ گو، شگفتہ مزاج ، ذی علم اور بالحاظ آدمی تھے -(۲) مولانا عبدالحی نے انھیں نادر روزگار اور فنون ادب و معقولات وغیرہ میں بے نظیر شخصیت قرار دیا ہے -(۳)

اس زمانے کے اکابر اہل علم و ادب، اصحاب دعوت و ارشاد اور ارباب درس و تدریس سے حسب مراتب تعلقات تھے۔ شیفتہ اور مفتی صاحب کے مکانوں پر باری باری ہر ہفتے مشاعرہ ہوتا تھا اور دہلی کے نامی گرامی شعرا اس میں شرکت کرتے تھے۔ (۴) حالی کی ایک غزل ایک ایسے ہی مشاعرے کی یادگار ہے جس میں اس عہد کے تمام نادر شعرا جمع تھے ۔ اس مشاعرے میں آزردہ بھی رونق افروز تھے :

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز (۵)

ایک طرف تو آزردہ کے ان تمام اکابر شعر و ادب سے تعلقات تھے ، دوسری طرف مسند نشینان درس و تدریس اور اصحاب دعوت و ارشاد سے حسب مراتب تعلقات تھے۔ ان کی سخن فہمی اور نکتہ سنجی کا ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے اعتراف کیا ہے ۔ غالب ان کی رائے کا احترام کرتے تھے اور غالب کو سہل گوئی پر آمادہ کرنے والوں میں

---

(۱) صدیق حسن خان، نواب: "اتحاف النبلا المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین"، محولہ بالا، ص ۲۶۰

(۲) خلیق احمد نظامی (مترجم و مرتب): "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ" محولہ بالا، ص ۱۵۳

(۳) عبدالحی، مولانا سید: "نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، صص ۲۱-۲۲۰

(۴) عسکری، مرزا محمد (مترجم)، "تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا، ص ۲۷۷

(۵) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتب): "کلیات نظم حالی"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء، ج ۱، ص ۱۲۱

علامہ فضل حق کے ساتھ ان کا نام بھی آتا ہے - کریم الدین پانی پتی نے انھیں عربی کے شعرا کے سبعہ معلقہ کا ہم پایہ قرار دیا ہے اور فارسی شعر گوئی میں سعدی کو ان کے سامنے کچھ نہیں سمجھتے - (۱) کریم الدین نے " طبقات شعرائے ہند" میں بھی نہایت مداحانہ ترجمہ لکھا ہے -(۲) ان کا ذوق صرف اردو اور فارسی ادب تک محدود نہ تھا بلکہ عربی ادب کا ذوق بھی بہت اعلا تھا- مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے والد مولوی خیرالدین کی زبانی فرماتے ہیں " کہ ادب عربی کا ذوق ان سے بڑھ کر میں نے وقت کے کسی فاضل میں نہیں پایا- حماسہ کے سیکڑوں اشعار نوک زبان تھے- متنبی کا درس سب سے پہلے انھوں نے ہی دھلی میں دینا شروع کیا- ورنہ اس کا کلام درس کی چیزوں میں داخل نہ تھا-" (۳)

مفتی صدرالدین آزردہ جس طرح اپنے اقران و امثال میں علم و فضل ، درس و افتا، تفکر و تدبر، تہذیب و تمدن میں ممتاز تھے اسی طرح وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے- وہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے - سوسید نے ان کا ~~فارسی اور~~ اردو تینوں زبانوں کا نمونہ کلام دیا ہے جس سے ان کی قدرت کلام کا پتا چلتا ہے -

فارسی شاعری میں ایسا بلند مرتبہ رکھتے تھے کہ صہبائی نے کہا تھا :کہ

" چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی

بخاطر هیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید " (۴)

اردو فارسی شاعری کی عام روایت کے خلاف ان کی غزلیں بہت طویل ہیں - فارسی کی تین غزلوں میں اشعار کی تعداد ۱۳، ۲۱ و ۲۴ ہے اور فارسی کی تینوں

---

(۱) کریم الدین پانی پتی و فیلن، " تذکرہ فرائد الدھر"، محولہ بالا ، ص ۳۹۲
(۲) کریم الدین پانی پتی و فیلن، " طبقات شعرائے ہند"، محولہ بالا ، صص ۳۶-۳۳۵
(۳) مہر، مولانا غلام رسول ، " نقش آزاد"، محولہ بالا ، ص ۳۱۳
(۴) خلیق احمد نظامی(مترجم ومرتب) ، " ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ"، محولہ بالا ، ص ۱۹۵

غزلوں کی تعداد اشعار ۲۲، ۲۷، ۲۰ ہے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کے ذکر خیر میں ان کے یہ تین اشعار دیے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلام کا نچوڑ ہیں۔ اور ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے لیے چوتھے شعر کی ضرورت نہیں ۔

دامن اس کا تو بہت دور ہے اے دست جنوں

کیوں ہے بے کار؟ گریبان تو مرا دور نہیں

===xxx====

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی

کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

====xxx====

آزردہ مرکے کوچۂ جاناں میں رہ گیا

دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے (۱)

ان کے دیوان خانے میں شب کو مجلس جمتی تھی اور منتخب افراد کا مجمع ہوتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولوی خیرالدین جو مفتی صاحب کے ہم درس مولانا منورالدین کے نواسے اور خود مفتی صاحب کے شاگرد بھی تھے، فرماتے تھے :

" مفتی صاحب کا دیوان خانہ دھلی کے تمام منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی یہ مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ اگر کوئی نو وارد دھلی آتا اور چاھتا کہ دھلی کے سارے فضل و کمال کو یہ یک وقت و بہ یک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانے کا رخ کرتا۔" (۲)

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول، " نقش آزاد"، محولہ بالا، ص: ۳۱۳

(۲) ایضاً، ص: ۳۱۷

آخر میں فالج کا حملہ ہوا (۱) اور ایک دو سال علیل رہ کر جمعرات کے دن ۲۳ ربیع الاول، ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ جولائی، ۱۸۶۸ء کو انتقال فرمایا۔ درگاہ شاہ چراغ میں دفن ہوئے (۲) مولوی ظہیرالدین ظہور نے قطعہ تاریخ وفات کہا - "چراغ دو جہان بود" سے سال وفات (۱۲۸۵) برآمد ہوتا ہے - اور اس کے پہلے مصرع میں لفظ "چراغ" سے تاریخ ولادت بھی نکلتی ہے - یہ قطعہ کا آخری شعر ہے :

"چراغش" ہست تاریخ ولادت

کنون گفتم "چراغ دو جہان بود" (۳)

مفتی صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی - بیوی کا نام لاڈو بیگم تھا۔ محمد احسان خان کو جوان کی بیوی کے بھانجے تھے بیٹا بنا لیا تھا۔ وہی ان کے وارث ہوئے۔(۴)

سرسید نے مفتی صاحب کا تذکرہ جس عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے وہ اس کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے لیکن پورا تذکرہ پڑھ جانے کے باوجود مفتی صاحب کے نام کے سوا ان کے حالات و سوانح کے بارے میں ایک لفظ نہیں ملتا۔ البتہ "آثارالصنادید" سے دارالبقا کے اور ان کی حویلی کے زیر عنوان انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مفتی صاحب کی شخصیت اور سیرت کے ایک پہلو پر بھر پور روشنی پڑتی ہے - دارالبقا کے ذیل میں لکھتے ہیں :

"جامع مسجد کے جنوبی دروازے کی طرف مدرسہ دارالبقا ہے کہ اگلے زمانے میں اس میں طالب علم رہا کرتے تھے اور معقول و منقول پڑھا کرتے تھے۔

---

(۱) غالب، اسداللہ خان، "اردوئے معلی"، الہ آباد: رام نرائن پبلشر اینڈ بک سیلر، ۱۹۲۷ء، ص ۳۵۳

(۲) فقیر محمدجہلمی، "حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۳۸۲
مختارالدین احمد، ڈاکٹر، "تذکرہ آزردہ"، محولہ بالا، (مقدمہ)، ص ۸

(۳) فقیر محمد جہلمی، "حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۳۸۲

(۴) مختارالدین احمد، ڈاکٹر، "تذکرہ آزردہ"، محولہ بالا، (مقدمہ)، ص ۸

یہ مدرسہ بالکل خراب و برباد ہوگیا تھا اور بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا چوں کہ زمانہ اہل اللہ سے خالی نہیں اور ہروقت میں کوئی نہ کوئی صاحب ہمت عالی اور فطرت بلند ہوتا ہے اور یہ ہمت اور دل اور داد و سخا سوائے اس کے جس پر اللہ تعالی کا سایہ رحمت ہو اور کسی کو میسر نہیں ہوتا ۔ اس جزو زمانہ میں اللہ تعالی نے جناب مولانا مولوی محمد صدرالدین خان بہادر صدرالصدور شاہجہان آباد کو ہمت بلند اور فطرت ارجمند عنایت کی ہے کہ شاید اگلے زمانے میں بھی کسی کو نہ ہوگی ۔ جناب ممدوح نے اپنی عالی ہمتی سے اس " دارالبقا " کو زر خطیر صرف کرکر از سر نو مرتب کیا ہے اور شاہجہانی طور پر جو جو حجرے اس کے ٹوٹ گئے تھے ان کو نئے سرے سے بنایا ہے اور مدرس نوکر ہیں اور طالب علم پڑھتے ہیں ان کی خورکوری نان و پارچہ کی ان کی سرکار عالی سے ہوتی ہے ۔ سبحان اللہ غور کرو کہ یہ کیا چشمہ فیض ہے کہ ان کی ذات فیض آیات سے جاری ہے اور شجر ہائے بربار دین کو پانی دیتا ہے ۔ دنیا میں بجز نیک نامی کے کچھ نہیں رہتا اور عقبی میں بجز اعمال کے اور کچھ نہیں جاتا ۔ یہ دونوں باتیں اللہ نے انہیں کے لیے پیدا کی ہیں ۔ اللہم زد فزد " (۱)

جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے والی جس گلی میں مدرسہ " دارالبقا" ہے اس گلی میں آگے چل کر سیدھے ہاتھ کو مفتی صاحب کی حویلی تھی سرسید نے حویلی کے ذیل میں لکھا ہے کہ :

" جانب دست راست حویلی ہے جناب مولوی محمد صدرالدین خان بہادر کی کہ سابق میں لالہ ہزارہ بیگ کی حویلی تھی ۔ مولوی صاحب نے اس کو خریدلیا اور نئے سرے سے بنایا ۔ یہ حویلی بہت خوش قطع ہے اور نہریں و فوارہ اس میں جاری ہیں اور بسبب خانہ باغ اور نہر اور فوارہ کے نمونہ بہشت بریں ہے ۔ " (۲)

بشیرالدین نے مفتی صاحب کے حالات اور حویلی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے

---

(۱) سرسید احمد خان ، " آثارالصنادید" ، محولہ بالا ، ص ۱۲۷

(۲) ایضاً ، ص ۱۳

وہ " آثارالصنادید" کا خلاصہ ہے البتہ یہ جملہ زیادہ ہے " اب مکین کے ساتھ وہ رونق بھی گئی اور کچھ بھی نہ رہا ۔" (۱)

مدرسہ " دارالبقا" کے دو مدرسین حاجی محمد اور ~~ملا~~ سرفراز (ملا سرفراز) کا علم تو "آثارالصنادید" سے ہوجاتا ہے ۔(۲) مولانا قاسم نانوتوی نے بھی کچھ عرصہ مدرسہ " دارالبقا" میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے تھے۔ (۳)

مفتی صاحب کے تلامذہ میں بھی وقت کے متعدد اکابرشامل ہیں جن میں سے چند یہ ہیں :" نواب یوسف علی خان والی ریاست رام پور، سرسید احمد خان، نواب صدیق حسن خان بھوپالی، صاحب حدائق الحنفیہ فقیر محمد جہلمی ، شمس الشعرا مولوی ظہورعلی ظہور، مولوی خیرالدین والد مولانا ابوالکلام آزاد ، مولوی سمیع اللہ دھلوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولوی محمد مظہر نانوتوی، مولوی محمد منیر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوھی، مولوی ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولوی حکیم محمد حسن امروھوی، مولوی احمدحسن مرادآبادی، مولانا سید نواب مکی ، مفتی سعداللہ مرادآبادی قاضی محمد جمیل برھان پوری، (۴) کریم الدین پانی پتی،(۵)، مولانا سیدامیرحسن(۶)"۔

---

(۱) بشیر الدین دھلوی: واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۱۴۸

(۲) سرسید احمدخان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۴۷

(۳) ایوب قادری، محمد: مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۲۱۰

(۴) صدیق حسن خان، نواب، " ابجدالعلوم " محولہ بالا ، الجز الثالث، ص ۹۳۹
انوارالحسن شیرکوٹی، انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۸۳
محمد میاں، مولاناسید: علمائے ہند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۳۳۸
حامدحسن قادری، " تاریخ داستان اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۱۲
مہر، مولانا غلام رسول، (مرتبہ): نقش آزاد"، محولہ بالا ، ص ۳۱۲
رئیس احمد جعفری، " بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، (ادارۂ کتاب منزل، ۱۹۵۵ء) ص ۳۵۳
مختارالدین احمد ، ڈاکٹر(مرتبہ): تذکرہ آزردہ "، محولہ بالا ، ص ۱۲
عبدالحی، مولانا سید: نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸، ص ۱۷۰، ۳۶۶، ۳۵۵
ایوب قادری، محمد(مترجم و مرتبہ): تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۱۲۴، ۳۲۳
امداد صابری، " فرنگیوں کا جال"، دھلی: فاروقی پریس، ۱۹۳۹ء، ص ۲۸۵

(۵) کریم الدین پانی پتی و فیلن(مطفین) : تذکرہ فوائدالدھر"، محولہ بالا ، ص ۳۹۶

(۶) امداد صابری: فرنگیوں کا جال" ، محولہ بالا ، ص ۲۸۰

مفتی صاحب نے ایک بھرپور علمی زندگی گزاری تھی اس لیے وہ تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ نہیں دے سکے - پھر بھی ان کی چند تصانیف کی شہرت ہے:

۱- تذکرہ شعرا - انھوں نے ایک اردو شعرا کا تذکرہ بھی لکھا تھا - شیفتہ نے اس کا ذکر کیا تھا -(۱) لیکن یہ تذکرہ ابھی تک نایید سمجھا جاتا تھا لیکن اب اس کے ابتدائی چالیس صفحے کا مخطوطہ دستیاب ہوگیا ہے اس مخطوطے میں صرف ۱۰۲ شاعروں کے تراجم ہیں آخری شاعرقائم ہیں -

۲- مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے والد کے حوالے سے دیوان متنبی کی ایک شرح کا ذکر کیا ہے -

۳- مولانا آزاد نے امتناع نظیر خاتم النبین کے مسئلے میں بھی ان کی ایک تحریر کا ذکر کیا ہے -(۲) یہ رسالہ شاہ اسمعیل شہید کی کتاب ایضاح الحق الصریح کے حاشیے پر چھپ چکا ہے -

۴- انتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال عربی کا ایک رسالہ ہے-

۵- الدرالمنضود فی حکم امراۃ المفقود - گم شدہ شخص کی بیوی کے بارے میں شرعیت کے احکام میں عربی کا ایک اور رسالہ -(۳)

۶- فتاوی - ان کے فتووں کاکوئی مجموعہ تونہیں چھپا شائد دو ایک متفرق فتوے شائع ہوئے تھے - (۴)

---

(۱) احسان الحق فاروقی (مترجم) "گلشن بے خار"، محولہ بالا، ص ۲۰۲
(۲) مہر، مولانا غلام رسول (مرتب) "نقش آزاد"، محولہ بالا، ص ۳۱۳
(۳) ایضاً، ص ۳۰۹ اور ۳۱۳
(۴) ھاشمی فریدآبادی "مفتی صدرالدین آزردہ" (مقالہ) "اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۱۱۹
مختارالدین احمد، ڈاکٹر (مرتب) "تذکرہ آزردہ"، محولہ بالا، ص ۹
(۳) ایضاً، ص ۹

۷ و ۸ - ان کی تصنیفات میں حاشیہ قاضی قاضی مبارک اور صنائع بدائع میں ایک کتاب کے آغاز تصنیف کا ذکر کریم الدین پانی پتی نے کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" ان کی تصنیفات سے ایک حاشیہ قاضی مبارک کا ہے مگر وہ/شاید ایام طالب علمی کی تصنیف ہے - کیوں کہ ایسا ہی ان کی زبانی سننے میں آیا ہے .... ایک کتاب صنائع اور بدائع میں انھوں نے تصنیف کرنی شروع کی تھی مگر معلوم نہیں کہ تمام ہوئی یا نہیں-" (۱)

۹- مولانا عبدالحی نے نمبر ۳ تا ۶ کا ذکر کیا ہے - (۲)

اب یہ تمام رسائل نایاب ہیں- آخر صرف تذکرہ شعرائے دستیاب شدہ اوراق انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے چھاپ دیے ہیں- رسائل نمبر ۳ اور ۴ کے بارے میں موجودہ عہد کے علما میں صرف مولانا آزاد کا بیان ہے کہ یہ رسائل ان کی نظر سے گزرے ہیں- (۳)

=====XXX=====

جناب مولوی رشید الدین خان رحمۃ اللہ علیہ :

جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول یگانۂ روزگار یعنی نتیجۂ قرن دار دار، یکتائے زمان قدوۂ دوران، مولوی محمد رشید الدین خان، طالب ثراہ و جعل اللہ الجنۃ مثواہ - شاگرد رشید اور مخلص خالص المعتقدت جناب جنت مآب زبدۂ اکابر روزگار مولانا رفیع الدین رضوان اللہ علیہ کے تھے اور ان کی خدمت میں ایسا اخلاص وافر رکھتے تھے کہ حضرت موصوف آپ کی تربیت میں مادام الحیات ایسے مصروف تھے جیسے کہ باپ فرزند کی

---

(۱) کریم الدین پانی پتی و فیلن، " تذکرہ فوائد الدھر"، محولہ بالا، ص ۳۹۶
(۲) عبدالحی، مولانا سید، "نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۲۲۱
(۳) مہر، مولانا غلام رسول (مرتب) " نقش آزاد"، محولہ بالا، ص ۳۱۳

تربیت میں - اگرچہ کسب و کمال ان حضرت کے دونوں بھائی یعنی مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہما کی خدمت سے بھی کیا تھا - لیکن تکمیل جمیع فنوں انھیں کی خدمت میں انصرام کو پہنچائی - ہر چند سب علوم متداولہ میں یک فنی تھے، لیکن علم ہیئت اور ہندسہ میں علم یکتائی بلند کیا تھا - مدت العمر فرقۂ امامیہ سے مباحثہ و مناظرہ کیا اور باہم تحریر رہی، اس بحث میں رسالہ ہائے متعددہ فراہم ہوئے - طریق مناظرہ کا یہ دیکھا گیا کہ تقریر یا تحریر میں خصم کو بجز اعتراف عجز کے چارہ نہ تھا - تقوی اور زہادت اور تشرع اور عبادت کا بیان خامۂ بریدہ کی زبان کی مجال نہیں کہ ایک شمّہ اس کا لکھ سکے - ہرچند حکام وقت چاہتے تھے کہ ان کو عہدۂ قضا سپرد کردیں تاکہ ان کی نیک نیتی اور عدل و انصاف سے عباداللہ کی حق رسانی ہوتی رہے - لیکن از بسکہ اپنے اوقات کو بیشتر تربیت مستفیضان کمال میں مصروف رکھتے تھے ، قبول نہ کیا - جب تقاضائے مخواہیان مختلفہ میں حکام کی طرف سے وقوع میں آیا اور بجد ہوئے ، بسبب کمال قناعت کے ایک امر جزوی پر قانع ہوکر عہدہ مدرسی مدرسہ شاہجہاں آباد قبول فرمایا - از بسکہ ایثار و کرم جبلی تھا - سو روپیہ کی تنخواہ ان کو ہرگز کفایت نہ کرتی تھی اور خدمت فقرا و مساکین سے کسی وقت اپنے تئیں معذور نہ رکھتے تھے ، بقدمے و درمے و سخنے - میرزا بیدل علیہ الرحمتہ نے خوب کہا ہے - رباعی :

آثار سخا جلوہ بہ چندیں صورت ‌ ‌ ‌ ‌ بیدل وارد ز طبع اہل ہمت

باخوردان لطف و بابزرگان خدمت ‌ ‌ ‌ ‌ با ہم خرزاں بعد و بہ محتاجاں سیم

عمر آپ کی قریب ستر برس کی تھی اور آخر میں ارادہ بیت اللہ کا کیا ، چونکہ ہر ارادہ پر ارادۂ اللہ غالب ہے ، مرض صعب میں مبتلا ہوئے اور احرام کعبۂ معنی

یعنی دیدار فیض انوار شاہد حقیقی پاکر دار آخرت کو راہی ہوئے - آپ کی وفات کو تیرہ چودہ برس کا عرصہ گذرتا ہے - بسبب کثرت توغل علوم دینیہ اور مباحثات علمی کے انشا سے نظم کی طرف کبھو متوجہ نہ ہوتے تھے، مگر تکلیف خطاب اور بہانۂ جواب سے گاہ گاہ نثر عربی کا اتفاق ہوتا تھا، ازاں جملہ یہ رقعہ دستیاب ہوا کہ لکھا -

رقعۂ عربی

اسرب القطا هل من يعير جناحه   لعلى الى من قد هويت اطير

من جوی قدح البعد و شجی اکبدة الوجد ، الی جانب الحبیب الذی تنزه قدحه المعلی عن المعلی من القدح و الحسیب الذی استوجب نسبته صدوق المدح الذی اذا نظم خجل قلائد القلائد ، و اذا نثر غبط فرائد الفرائد ذوخلق عظیم و بحیح کریم ، و سجیته سریته و همته علیته - ماس علم الا اصاب مشکلا وماس فن الاغاص فی بحار تحقیقاته - اما الادب فقد شید ارکانه ، واماالفقه فقدابرم بنیانه واما المعقول فمنه و الیه و تعول ارباب الصناعة الیه - ذخرالفضائل فخرالاماثل صدرالافاضل - زین المحافل مولانا المولوی محمد صدرالدین لا زال ظل افادته علی روس المستفیدین - امابعدا اهداء هدایا السلام واداء مناسک الاحترام والاعظام، فهدی و رود مشرفه و مشرفه هبت عنه فتحها النسائم مضربة ، و تجلت کلمات بیض الوجوه الا انهادریته - فقبلتها مراراً و قابلتها بالاجلال اکثارا ، واستشقت منها روایح سحیق الصندل ، و نظرت الی معانیها فازاهی آلی رطبته وماسواهاس المعانی جندل - واماما فیها من الالفاظ فهو آنق من غمرات الالحاظ هذاثم ما اصعت من الزمان هذا مطلیت نیران الهجران - دعی الذی حبانا بحبک و جعلنا من صفوة احبتک ادنی مذفارقتک ، ما اطبقت مقلتی بالنوم و ما لاقت لیلتی من الیوم - یسرلنا الله لقاک و یسر للحسنی فی آخرتک و دنیاک - والسلام بالوف الاکرام -"(۱)

تعلیقات :

رشیدالدین اصحاب ثلاثہ کے تربیت یافتہ اصحاب درس و تدریس اور اہل قلم

---

(۱) سرسید احمدخاں، آثارالصنادید، محولۂ بالا ، چوتھا باب، ص ۹۲-۸۹

شخصیات میں ایک اہم اور نامور شخصیت تھے - والد کا نام امین الدین ابن وحیدالدین ابن عبدالسلام کشمیری تھا- رشید الدین خان کا مولد و منشاء طفولیت اور مہد علمی دہلی تھا-(۱) مفتی صدرالدین خان آزردہ کے عزیزوں میں سے تھے- محمد ایوب قادری نے ۱۲۴۹ھ میں ان کے انتقال کے وقت ان کی عمر ستر سال کی بتائی ہے-(۲) اس لیے خیال کرنا چاہئے کہ ان کی پیدائش ۱۱۷۹ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی - سرسید نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے ان کے کسب کمال اور شاہ رفیع الدین کی خدمت میں تکمیل جمیع فنون کا ذکر کیا ہے - (۳) ابتدا میں بعض کتابیں علی گوہر بنارسی سے پڑھی تھیں-(۴) شاہ رفیع الدین نے ان کی تعلیم و تربیت اپنے بیٹے کی طرح کی تھی - ہروقت ان کی اصلاح اور ترقی کی فکر اور کوشش رہتی تھی- شاہ صاحب کے علاوہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر نے ان کی تربیت اور تعلیمی ترقی کی طرف توجہ کی -(۵) مولانا عبیداللہ سندھی نے ان کے اساتذہ میں اصحاب ثلاثہ کے علاوہ مولانا عبدالحی کا نام بھی لیا ہے - مولانا فرماتے ہیں :

" شیخ رشید الدین شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے - آپ نے شاہ عبدالعزیز سے طریقہ تحریر سیکھا اور اس میں کمال حاصل کیا- نیز شاہ عبدالقادر اور مولانا عبدالحی سے بھی پڑھالیکن آپ بیشتر شاہ رفیع الدین کی خدمت میں رہے "(۶)

شاہ عبدالعزیز سے استفادے کے دوران میں مفتی صدرالدین اور مولانا منورالدین ان کے ہم درس تھے - (۷) علوم متداولہ میں یک فنی، علم ہیئت و ہندسہ میں یگانۂ عصر

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید: " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۱۷۷

(۲) ایوب قادری، محمد: (مرتب و مترجم) " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۱۹۱

(۳) سرسید احمد خان، آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۸۹

(۴) عبدالحی، مولانا سید: " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ج ۷، ص ۱۷۷

(۵) سرسید احمد خان" آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۸۹
خلیق احمد نظامی، "تاریخی مقالات" محولہ بالا، ص ۲۴۷

(۶) عبیداللہ سندھی، مولانا: شاہ ولی اللہ اوران کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۱۱۲

(۷) مہر، مولانا غلام رسول (مرتبہ): " نقش آزاد"، محولہ بالا، ص ۳۱۲

اور فن مناظرہ میں بے مثال تھے - زہد و ورع اور تقویٰ و عبادت اور استغنا و قناعت میں اپنے عہد میں ممتاز ہوئے اور سرسید نے خود اس کا اعتراف کیا ہے - (١) نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ علوم درسیہ کے فاضل و جامع تھے - حسن تحریر میں ان کی خوبی اور بہ مقابلہ روافض اہل سنت و جماعت کی حمایت میں ان کی مستعدی کی ذکر کیا ہے - (٢) کریم الدین پانی پتی نے ہیئت و ریاضی میں انہیں قدرت رکھنے والا اور معقولات کا امام لکھا ہے - (٣) خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ " گو وہ ہر فن میں دستگاہ رکھتے تھے لیکن علم ہیئت اور ہندسہ میں ان کو خاص مہارت تھی اور اس زمانے میں مشکل سے کوئی شخص ان فنون میں ان کا مقابلہ کرنے کی جرات کرسکتا تھا - مناظرہ اور مباحثہ میں جو ید طولی ان کو حاصل تھا وہ مشکل سے کسی کو نصیب ہوتا ہے - علما و فضلا آپ کے تبحر کا سکہ مانتے تھے -(٤) ان کا شمار دہلی کے اعیان علم و فضل میں ہوتا تھا - مدرسہ دہلی میں اعلا جماعت کو عربی پڑھاتے تھے - نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے :

" از طرف فرنگیان تدریس درجہ اول مدرسہ دہلی بایشان تعلق داشت " - (٥)

میرا خیال ہے کہ یہاں " درجہ اول " سے مراد پہلا ابتدائی درجہ نہیں ہے بلکہ اعلا جماعت مراد ہے - ابتدائی درجات کو ان کے نائبین مولانا مملوک علی اور مولوی سید محمد پڑھاتے ہوں گے - اس لیے محاورۃً " درجہ اول " کا ترجمہ " اعلا جماعت " کیا گیا ہے - مدرسہ

---

(١) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید "، محولہ بالا، ص ٥١

(٢) صدیق حسن خان، نواب، " ابجدالعلوم "، محولہ بالا، ج ٣، ص ٩١٧

(٣) کریم الدین پانی پتی و فیلن، " تذکرہ فوائدالدھر "، محولہ بالا، ص ٣٠٠

(٤) خلیق احمد نظامی، " تاریخی مقالات " محولہ بالا، ص ٢٢٧-٢٢٨

(٥) ~~صدیق حسن خان، نواب، " تاریخ قنوج " (قلمی)، بحوالہ محمد ایوب قادری، مولانا محمد احسن نانوتوی، محولہ بالا، ص ١٦٣~~

ایوب قادری، محمد (مرتب) تاریخ قنوج از نواب صدیق حسن خان، ١٢٨١ھ، مجلہ ... کراچی، بابت ماہ جون جولائی ١٩٦٥ء، ص ٦٥

ایوب قادری، محمد، " مولانا محمد احسن نانوتوی "، محولہ بالا، ص ١٦٣

دھلی میں ان کی تنخواہ سو روپے تھی - (۱)

صاحب "وقائع عبدالقادر خانی" سے ۲ و ۷ جولائی، ۱۸۲۳ع (۲) کو اور پھر ۱۸۲۵ع میں ان کی ملاقاتیں ہوئی تھیں - وہ لکھتے ھیں :

" ان سب بزرگوں کے شاگرد رشید الدین خان تھے - اگرچہ اتنے تیز فہم نہ تھے - مگر تعلیم و تعلّم کی خوب مشق تھی- ھر بات میں اساتذہ کی پیروی کرتے تھے- مگر مناظرے میں بہت جلد رنجیدہ ھوجاتے تھے- نمایش کے بہت زیادہ پابند تھے - عرفان کی بہت کچھ معلومات رکھتے تھے جو کچھ لکھتے بسط و تفصیل سے اور جو کچھ کہتے درازو تفصیل - بالخصوص مباحث اختلافیہ و دینیہ میں یہی طریقہ تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ اب مقابل میں رد و قدح کی گنجائش نہیں رھی - بندے پر بہت شفقت فرماتے تھے -" (۳)

رشیدالدین خان کے علم و فضل کے بارے میں یہ شہادت زیادہ قابل اعتماد ہے- اس لیے کہ یہ نہ صرف معاصر شہادت ہے بلکہ ایک ایسے شخص کی ہے جو ان سے متعدد بار مل چکا تھا اور ان کی شفقتوں اور محبتوں کا مورد رہا تھا- ان کی ایک فنی اور یکتائی کے بارے میں سرسید کا بیان مبالغے سے خالی ھے -

تحریک احیائے سنت کے زمانے میں محی السنت شاہ اسمعیل شہید سے وقت کے بعض علما سے جو اختلاف پیدا ھوگیا تھا اس میں مولانا رشیدالدین آبا و رسوم پرست علما کے ساتھ تھے اور ۲۹ ربیع الثانی ، ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۳ع) کو مباحثہ جامع مسجد دھلی میں ان کی تنگ مزاجی نے جو صورت حال پیدا کردی تھی بقول مولوی عبدالقادر ان کی

---

(۱) سرسید احمد خان، "آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۵۱

ایوب قادری ، محمد ، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۴۳-۱۷۱

(۲) ایوب قادری ، محمد (مرتب و مترجم) " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)" محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۱۸۵

(۳) ایضاً ، ج ۲ ، ص ۲۳۹

شریف وضع کے شایان نہ تھی۔ (۱) مولانا محمد میاں نے انھیں شاہ عبدالعزیز کی تربیت یافتہ علما، مفکرین اور مدبرین کی جماعت میں شامل کیا ہے جس کا مقصد تحریک کے اقدام و سعی عمل کے زمانے میں تحریک کے مرکز دہلی میں رہ کر مرکز کو سنبھالنا، ملک کی فضا کو اس تحریک کے لیے ہموار بنانا، رضاکاروں کی بھرتی اور مالیات کی فراہمی کی ذمہ داری تھی۔ (۲) لیکن انھوں نے اپنی اس رائے کی بنیاد اور اس کا ماخذ نہیں بتایا۔ حالاں کہ ان کے خیالات کی پرواز دوسری اور شاہ اسمعیل شہید سے ان کے تعلقات کا تقاضا مختلف تھا۔

علوم دینیہ کے شغل اور مباحثہ و مناظرے کی کثرت کی وجہ سے انھیں تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں ملی، اس کے باوجود کریم الدین پانی پتی کے بقول ان کے بہت سے مسودات اور مخطوطات ہیں۔(۳) سرسید نے بحث و مناظرے میں مولانا رشید الدین خان کے "رسالہ ہائے متعددہ" کا ذکر کیا ہے۔ (۴) لیکن کسی رسالے کا نام نہیں دیا۔ دوسرے مآخذ سے رد روافض میں "الصولۃ الغضنفریۃ، الشوکۃ العمریۃ، جواب بارتقہ شیعیہ، ایضاح لطافۃ المقال، اخراج من شرافۃ الال کے جواب میں، تفضیل الاصحاب سبحان علی خان لکھنوی کے ایک رسالے کے جواب میں اور راجہ رام موہن رائے کے کسی رسالے کے رد میں اعانۃ المرجفین واعانۃ الملحدین کا پتا چلتا ہے۔ (۵)

---

(۱) ایوب قادری، (مرتب)، "علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۱۸۵

(۲) ایوب قادری (مرتب) "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۱۲۹

(۳) محمد میاں، مولانا سید "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۲، صص ۳۹، ۹۸-۹۷
~~ایوب قادری (مرتب) "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۶۱~~ ایضاً ج ۲، ص ۶۱

(۳) کریم الدین پانی پتی "تذکرہ فرائد الدھر"، محولہ بالا، ص ۳۰۰

(۵) سرسید احمد خان "آثار الصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۵۱

(۶) صدیق حسن خان، نواب "ابجد العلوم"، محولہ بالا، ج ۳، ص ۹۱۷
عبدالحی، مولانا سید "نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۱۷۷
ایوب قادری، محمد (مرتب) "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۱۹۱
ایوب قادری، محمد (مرتب) "علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)"، محولہ بالا، ج ۱، صص ۵۰-۲۳۹
ایوب قادری، محمد "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، صص ۴۳-۱۷۱
ایوب قادری، محمد "خانوادہ ولی اللہ دہلوی کا تذکرہ" (مقالہ) "الرحیم"، حیدرآباد، اپریل، ۱۹۶۵ء، ج ۲، ش ۱۱، ص ۴۶۰

المکاتیب کے نام سے شیخ احمد شروانی اور مولانا رشیدالدین خان کی مراسلت دھلی سے شائع ھوچکی ھے - (۱) پروفیسر محمد ایوب قادری نے مولانا رشیدالدین خان کی ایک کتاب "شرح تشریح الافلاک" کا ذکر بھی کیا ھے - (۲) دراصل صحیح نام "تصریح فی شرح التشریح" ھے -" تشریح الافلاک" شیخ بہاء الدین عاملی کا نہایت مشہور رسالہ ھے - اس کی شرح امام الدین بن لطف اللہ مہندس لاھوری ثم دھلوی نے کی تھی- مولانا رشید الدین خان نے اس شرح پر" تصریح "کے نام سے ایک مختصر رسالہ لکھا جو اس کے آخر میں شامل ھے - ترقیمہ کے ان جملوں سے کتاب کا پورا نام ، موضوع ، سال طباعت اور مطبع کا علم ھوجاتا ھے -

" این رسالہ کاملہ و عجالہ نافعہ در علم ھیئات مسمی" بالتصریح فی شرح التشریح" در ۱۲۹۳ھجری بہ صحیح تمام و تنقیح مالا کلام از کمال جد و جہد در مطبع سید المطابع لباس انطباع پوشیدہ ظہوریافت ۰۰۰۰" (۳)

نہایت دل چسپ بات یہ ھے کہ یہ رسالہ " سید احمد" (سرسید) نے تصحیح کرکے نہایت اھتمام اور ایزادی اشکال کے ساتھ اپنے مطبع سید المطابع دھلی سے شائع کیا تھا-

شوکتہ العمریہ کے بارے میں مولوی عبدالقادر لکھتے ھیں کہ ان سے آخری ملاقات اجمیر سے واپسی پر (۱۸۲۵ع) میں) ھوئی - وہ اس زمانے میں لکھنو کے علما کے جواب میں متعہ کے متعلق ایک کتاب رکھ رھے تھے - اس کا مقدمہ کئی جزو ھوگیا تھا اور ابھی

---

(۱) عبدالاحد ، محمد (مرتب) " المکاتیب"، دھلی: ، مطبع مجتبائی ، ۱۳۳۵ھ، ص ۳۸

(۲) ایوب قادری، محمد " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۱۷۱

(۳) امام الدین ریاضی" تصریح فی شرح التشریح "، دھلی : مطبع سیدالمطابع، ۱۲۹۳ھ ص ۳۶

پورا نہیں ہوا تھا۔ مولوی عبدالقادر کو کتاب دکھاکر کہا :

"جب یہ کتاب اس شرح و بسط کے ساتھ جو میں چاہتا ہوں، پوری ہوجائے گی اور لکھنو پہنچے گی تو وہاں کے علما اس کے جواب کی فکر میں مرجائیں گے اور کلو گریبان سے سر نہ اٹھا سکیں گے ۔" (۱)

رحمان علی نے ان کے انتقال کا سال ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء لکھا ہے ۔(۲) سرسید کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔ "آثارالصنادید" کی تالیف کے وقت ان کے انتقال کو ۱۳، ۱۲ برس گزرچکے تھے ۔ ان کے انتقال کے وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی۔(۳)

اولاد میں سدیدالدین خاں اور مویدالدین خاں نامی ان کے دو بیٹوں کا پتا چلا ہے ۔ مولوی سدید الدین علوم میں ماہر اور عربی زبان و ادب میں کامل تھے ۔ دہلی کالج کے شعبہ عربی میں استاد تھے ان کا تقرر ۳۰ اکتوبر، ۱۸۳۰ء کو ہوا تھا۔(۴) بعد میں وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس اور ایف مدرسہ ہوگئے تھے۔ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء میں جب کہ نواب صدیق حسن خاں دہلی میں تھے تو سدید الدین کلکتے میں مدرسہ سرکاری و مدرسہ عالیہ میں مدرس و امین مدرسہ تھے اور ۱۸۵۷ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

"الحال بعد فتنہ ہندوستان معزول شدہ و خانہ نشین گشتند"۔(۵)

"الحال" سے مراد ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء ہے جب کہ نواب صاحب موصوف نے "تاریخ قنوج" تالیف فرمائی تھی۔ مولانا رشیدالدین کے دوسرے بیٹے مولوی مویدالدین خاں تھے۔

---

(۱) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب): "علم و عمل (وقائع عبدالقادرخانی)"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲۳۹

(۲) ایوب قادری، محمد (مرتب): "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۱۹۱

(۳) سرسید احمدخاں: "آثارالصنادید"، محولہ بالا، صص ۵۲-۵۱

(۴) ایوب قادری، محمد، "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۷۳
ایوب قادری، محمد (مترجم ومرتب): "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۵۷۱

(۵) صدیق حسن خاں، نواب "تاریخ قنوج"، بحوالہ رسالہ "سرحد" کراچی: بابت ماہ جون، ۱۹۷۳ء، ج ، ش ، ص ۶۵

نواب صاحب موصوف ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ توجہ بدرس و تدریس ندارند نوکر پیشہ هستند -(۱) غالباً اشارہ حیدرآباد دکن کی ملازمت کی طرف ہے - نواب سالار جنگ نے انہیں خاص طور پر حیدرآباد دکن بلایا تھا اور ریاست کے داخلی امور کا معتمد مقرر کیا تھا- (۲) ان کے تلامذہ میں یہ شخصیات علمائے ہند میں نہایت نامور گزری ہیں- مولانا مملوک علی خان، مولوی حیدر علی فیض آبادی، مولوی کریم اللہ دہلوی، مولوی محمد شکور مچھلی شہری (۳) مولانا محمد مظہر نانوتوی، قاری عبدالرحمن پانی پتی -(۴)

====xx====

جناب آخوند شیر محمد رحمتہ اللہ علیہ :

"عالم باعمل وارستۂ آزوامل، مہبط فیض ازل و ابد آخوند شیر محمد، طاب ثراہ و الجنتہ مثواہ - مولد آپ کا افغانستان تھا لیکن ایک عرصۂ دراز سے بارادۂ تحصیل علم و فضل کے وارد ہندستان جنت نشان ہوکر اطراف و جوانب میں علمائے کرام کی خدمت سے فیض علم و ادب حاصل کیا، اور جب شاہجہان آباد میں وارد ہوئے مولانا شاہ عبدالقادر قدس سرہ کی خدمت سراسر افادت میں علم حدیث کو تحصیل کیا اور مولانا بالفضل اولانا مولوی محمد اسمعیل رحمتہ اللہ علیہ کے ہم سبق رہے، چونکہ قناعت اور توکل ایک جامہ تھا کہ خیاط قضا نے انہیں کے قامت استعداد پر سیا تھا- حکیم غلام حسن خان مرحوم کے مکان پر سکونت اختیارکی اور مدت العمر ہرگز اخوان زمان اور ابنائے روزگار کی طرف رخ التفات

---

(۱) صدیق حسن خان، نواب "تاریخ قنوج" بحوالہ رسالہ "سرحد"، کراچی: جون، ۱۹۷۳ء، ج ، ش ، ص ۶۵

(۲) ذاکر اعجاز، سید، "عظمت اللہ خان"، (مقالہ)، "اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، لاہور: دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۶ء، ج ۱۳، ص ۳۸۷

(۳) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، صص ۱۷۵، ۲۶۱، ۳۹۷، ۴۳۶

(۴) ایوب قادری، محمد "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، صص ۱۵۳، ۱۸۵
عبدالحی، مولانا سید "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، صص ۲۳۵ و ۳۵۵

دہ لائے اور شب روز شغل ظاہری تدریس علوم عقلی و نقلی رہتے اور مشغلہ باطنی توجہ الی اللہ زبان خلق کے ساتھ گفتگو میں رہتے اور دل خدا کے ساتھ مشغول، یہ دو کام آن واحد میں اقوال سراسر اختلال حکیم فلسفی کے واسطے مہمل ہیں - سچ ہے :

پائے استدلالیان چوبین بود

پائے چوبین سخت بے تمکین بود

سوائے علوم ظاہری کے کسب و فیض باطنی خدمت حضرت بابرکت شاہ غلام علی صاحب قدس سرہ سے کیا اور مرتبہ خلافت کا پایا۔ اگرچہ سلسلہ پیری مریدی کا آپ نے جاری نہیں کیا لیکن استحقاق اس امر کا ہزار در ہزار مرتبہ میں رکھتے تھے - اور آخر میں سکونت ہندوستان سے دل برداشتہ ہوکر بارادۂ ہجرت اور ارادے حج کے بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے - اثنائے راہ میں پندرہویں ماہ صفر، ۱۲۵۷ ہجری میں نقد حیات کو [redacted] متقاضیان اجل کے سپرد کیا۔ اس واقعہ کو چھ برس کا عرصہ ہوتا ہے -" (۱)

تعلیقات :
=======

اخوند شیر محمد کے حالات میں [redacted] "آثارالصنادید" پہلا و بنیادی ماخذ ہے - سرسید نے جو کچھ ان کے بارے میں لکھ دیا ہے ابھی تک اس پر بہت کم اضافہ ہوا ہے- مولانا عبدالحی نے ان کا ترجمہ لکھا ہے لیکن خود ان کے بقول" کما فی آثار الصنادید"(۲) پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ان کا مکمل ترجمہ لکھا ہے - اس سے سرسید کے ایک بیان کی تصحیح بھی ہوجاتی ہے کہ سلسلہ مریدی کا آپ نے جاری نہیں کیا حالاں کہ وہ شاہ غلام علی کے مرید اور خلیفہ مجاز تھے - (۳) مولوی محمد حسن نے لکھا ہے کہ

---

(۱) سرسید احمدخان، " آثارالصنادید" محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۲۹-۱۲۸

(۲) عبدالحی، مولانا سید " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۲۱۵

(۳) خلیق احمد نظامی، " تاریخی مقالات" محولہ بالا ، ص ۲۵۶

حضرت شاہ (غلام علی) صاحب قبلہ کی خدمت میں ان کو اس قدر ذهول علم ہوگیا تھا کہ علم نحو میں سہل سی ترکیب بھی نہ ہوسکتی تھی پھر علم ظاہر کی طرف رجوع کیا کہ مبادا ضائع ہوجائے ۔ شاہ عبدالغنی مجددی نے بھی ان کے ذہول اور تحصیل علم کی طرف دوبارہ توجہ کا ذکر کیا ہے ۔ (۱) محمد حسن لکھتے ہیں :

"جب بہت ضعیف ہوگئے تھے درس و تدریس کو ترک کرکے سوا تلاوت قرآن مجید و صلوۃ مفروضہ اور کچھ کام نہ کرتے ۔ آخر الامر ہندوستان کو دارالحرب خیال کرکے یہاں کی سکونت کو مکروہ جانا اور حالت مرض ہی میں متوجہ حرمین شریفین بہ نیت ہجرت ہوئے ۔ راستے میں بمقام ملتان انتقال فرمایا ۔" (۲)

شاہ عبدالغنی مجددی اور مولوی محمد حسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ :

" صدہا آدمی آپ سے علم میں بہرہ یاب ہوئے ۔ اپنے شاگردوں کو تقوی اور اعمال خیر کی تاکید فرمایا کرتے تھے اور جو کوئی آپ کی مجلس میں غیبت کرتا اس پر جرمانہ کردیا کرتے تھے ۔" (۳)

بعض ضمنی ماخذ سے چند مزید معلومات حاصل ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ افغانستان میں قندھار کے رہنے والے تھے اور شاہ اسمعیل شہید کے ساتھ شاہ عبدالقادر سے صحیح بخاری اور بیضاوی پڑھی تھی ۔ (۴) ۱۲۴۳ھ /۲۸-۱۸۲۷ء سے چند سال قبل مفتی سعد اللہ مرادآبادی نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا ۔ (۵) اخوند صاحب کے تلامذہ میں مولوی عبدالجلیل علی گڑھی بھی تھے ۔ انھوں نے مولوی صاحب سے شمس بازغہ

---

(۱) عبدالغنی مجددی، شاہ "ضمیمہ مقامات مظہری"، دہلی : مطبع احمدی، ۱۲۹۹ھ، ص ۱۸۰
(۲) محمد حسن نقشبندی مجددی "مشائخ نقشبندیہ"، محولہ بالا، ص ۲۸۱
عبدالغنی مجددی "ضمیمہ مقامات مظہری"، محولہ بالا، ص ۱۸۰
(۳) ایضاً، ص ۱۸۰
محمد حسن نقشبندی مجددی "مشائخ نقشبندیہ"، محولہ بالا، ص ۲۸۱
(۴) فضل حسین بہاری، مولوی "الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا، ص ۳۹ اور ۴۹
ابویحیی امام خاں نوشہروی، تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۱۳۷
(۵) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۲۱۲

پڑھی تھی ۔ اس زمانے میں مولوی صاحب مسجد فتح پوری میں رہتے تھے۔ (۱) شیخ الکل میاں نذیر حسین محمد عرف شاہ دھلوی نے کٹرہ پنجابیان کی اورنگ آبادی مسجد کے مدرسے میں اپنے تین سالہ قیام و تعلیم کے زمانے میں مولوی شیر محمد سے بھی پڑھا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں اسی مسجد میں پڑھاتے تھے۔ میاں صاحب نے ان سے شافیہ ، اصول اکبری، شرح کافیہ ، ملا جامی مع حاشیہ عبدالغفور ، زواھد ثلاثہ ، صغرا، شمس بازغہ پڑھی تھیں۔(۲) حکیم عبدالحکیم معروف بہ ابوعلی نے بھی کتب درسیہ کی تحصیل آن موصوف سے کی تھی ۔ (۳) مولانا شیر محمد کا نام قاضی محمد جمیل برھان پوری کے اساتذہ کے سلسلے میں بھی آیا ھے ۔(۴) " نزھتہ الخواطر" سے ان کے ایک شاگرد مولانا فرید الدین دھلوی کا علم ھوتا ھے ۔ (۵) بشیرالدین دھلوی نے ان کا صرف نام اور تاریخ وفات لکھنے پر اکتفا کیا ھے ۔ ان کا ماخذ " آثارالصنادید" ھے ۔ عیسوی تقویم کے مطابق آخوند صاحب موصوف کی تاریخ وفات ۱۱ اپریل ، ۱۸۳۱ع ھوتی ھے ۔ ان کی تاریخ ولادت کا علم نہیں ھوسکا لیکن وہ چوں کہ مختلف مقامات سے تحصیل علم کے بعد دھلی پہنچے تھے اور شاہ اسمعیل کے شریک درس تھے اس وقت ان کی عمر بیس سال سے کسی طرح کم نہ ھوگی ۔ شاہ صاحب ۱۷۹۴ع میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ھوئے تھے اس لیے یہ قیاس بے جا نہ ھوگا کہ آخوند صاحب ۱۷۷۰ع کے لگ بھگ پیدا ھوئے ھوں گے ۔

======XXXX======

جناب مولانا عبدالحی غفراللہ لہ :

" افضل الفضلا اکمل الکملا قامع بنیان بدع واھوا ، بادی زھد و تقوی ، فضائل دستگاہ

---

(۱) اشرف علی تھانوی (مرتب) ، " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۱۲۹
(۲) فضل حسین بہاری ، مولوی ، " الحیات بعد المماۃ"، محولہ بالا ، صص ۳۸ ، ۳۹ و ۳۹
(۳) ابویحیی امام خان نوشہروی ، " تراجم علمائے حدیث ھند"، محولہ بالا ، صص ۳۷-۱۳۶
(۳) سرسید احمد خان ، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، ص ۳۹
(۴) ایوب قادری ، محمد (مرتب ومترجم) ، " تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا ، ص ۳۲۳
(۵) عبدالحی ، مولانا سید ، " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۳۷۳

فولاد پناہ، جامع صفات جلال و جمال ، قامع اساس کفر و ضلال ، مولانا عبدالحی صاحب غفراللہ لہٗ مولانا عبدالعزیز قدس سرہ کی خدمت میں نسبت دامادی اور شاگردی کی رکھتے تھے۔ ہر فن کے ساتھ نسبت خدا داد تھی کہ جس فن میں جس نے آپ سے بحث و مناظرہ چاہا اسی فن کو جانا کہ شاید دوسرا ان کا نظیر نہیں پیدا ہوا - ایک مدت درس و تدریس علوم میں صرف ہمت کی - اواخر میں زبدۂ سادات کرام اسوۂ اولیائے عظام سید احمد مغفور مبرور کی خدمت میں ، جن کا ذکر اس سے پہلے ذیل اولیا و صلحا میں ہوچکا ہے، پہنچ کر بیعت کی اور تادم زیست ان کے سایۂ عاطفت سے کبھی علاحدہ نہ ہوئے - سفر و حضر میں مثل سایہ کےان کی تبعیت میں حاضر رہتے، انھیں کی خدمت میں سفر بیت اللہ کو اختیار فرماکر فرض حج ادا کیا اور وہاں سے مراجعت فرماکر چندے بموجب ارشاد پیر طریقت کے وعظ گوئی میں اوقات شریف کو بسر کیا اور لوگوں کو نہایت ہدایت حاصل ~~ہوئی اور باتفاق شریعت کو بسر کیا اور لوگوں کو نہایت ہدایت حاصل~~ ہوئی اور باتفاق مولوی محمد اسمعیل صاحب کے جن کا ذکر بعد اس کے بہ تفصیل آتا ہے [1] ، ترغیب جہاد فی سبیل اللہ میں سرگرم رہے - جب سید صاحب مغفور اس ارادے پر کوہستان کی طرف تشریف فرما ہوئے اسی نواح میں چند سال تک رفیق رہے اور پھر مرض بواسیر کی شدت سے سفر ناگزیر اختیار کیا - انا للہ و انا الیہ راجعون [2] -

تعلیقات :

عبدالحی بڑھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے - ان کی تاریخ پیدائش کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزری - مولانا سید محمد میاں نے لکھا ہے کہ شاہ اسمعیل شہید

---

(۲) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۹۶-۹۷

(۱) اس تذکرے کی ترتیب کے مطابق حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کے تراجم اس باب سوم میں شامل ہیں۔
سید احمد شہید، ص ۲۰۳-۲۱۹
شاہ اسماعیل شہید، ص ۳۱۸-۳۹۶

دو برس بڑے تھے۔ (۱) اس لیے تقریباً ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں پیدا ہوئے ہوں گے - والد کا نام ہبۃ اللہ بن نوراللہ تھا۔ نوراللہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تربیت یافتہ تھے اور ان کی صاحب زادی شاہ عبدالعزیز کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ اس طرح شاہ عبدالعزیز مولانا عبدالحی کے رشتہ میں بھتیجا تھے۔ بعد میں عبدالحی نے شاہ عبدالعزیز کی شاگردی کے شرف اور دامادی کی نسبت سے بھی افتخار حاصل کیا۔ تحصیل علمی شاہ عبدالعزیز کے علاوہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر سے کی - انھیں شاہ عبدالعزیز سے بیعت و خلافت بھی حاصل تھی - (۲) صاحب " نزہتہ الخواطر" نے انھیں شاہ عبدالقادر کا مرید بتایا ہے اور اساتذہ میں شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز دونوں شامل ہیں۔ (۳)

تحصیل علمی کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے تھے۔ وہ کچھ عرصے تک میرٹھ میں مفتی عدالت کے عہدے پر بھی فائز رہے تھے۔(۴) لیکن حضرت سید احمد شہید سے بیعت (۱۸۱۸ء) کے بعد وہ اس منصب سے سبک دوش ہوکر پھر درس و تدریس اور دعوت اصلاح میں منہمک ہوگئے -

مولانا عبدالحی غیر معمولی علمیت اور قابلیت کے شخص تھے - ان کے علم و فضل کا اعتراف خود حضرت شاہ عبدالعزیز نے کیا ہے - شاہ صاحب موصوف نے انھیں شیخ الاسلام تاج المفسرین، فخرالمحدثین، سرآمدعلمائے محققین اور علمائے ربانی میں لکھا ہے - لکھنو سے ایک خط و استفتا کے جواب میں لکھتے ہیں :

---

(۱) محمدمیاں، مولانا سید، " علمائے ہند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۹۹
(۲) ابویحیی امام خان نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۱۲۵
(۳) عبدالحی، مولانا سید، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۲۳۹
(۴) مہر، مولانا غلام رسول (مرتب)، " نقش آزاد"، محولہ بالا، ص ۳۱۳

مہر، مولانا غلام رسول، " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا، ص ۱۱۱

" تاج المفسرین ، فخر المحدثین ، سرآمد علمائے محققین مولوی عبدالحی صاحب و مولوی اسمعیل صاحب کا لکھا ہوا اور احادیث نبویہ اور اصول و فقہ کی معتبر کتابوں کے موافق ہے - چناں چہ ان کی مہر اور دستخط کے مقابل میں نے بھی اپنی مہر تصدیق ثبت کردی ہے - ایسی صورت میں کہ عزیزان موصوف کی مہر و دستخط موجود تھے ، اس استفتا کو میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہ تھی- اس لیے کہ یہ دونوں علم تفسیر و حدیث و فقہ اصول و منطق میں مجھ سے کم نہیں- ان کی مہر اور دستخط گویا میری مہر اور دستخط ہیں .... مولوی عبدالحی اور مولوی اسمعیل کو علمائے ربانی میں شمار کیا کرنا چاہیئے -" (۱)

شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ میں آپ کا مقام اول و افضل تھا اور فقہ حنفی و کتب درسیہ میں ماہر یگانہ تھے -(۲) سفر حج کے موقع پر قاضی امام محمد بن علی شوکانی نے آپ کی شہرت علم و فضل سن کر اپنی تمام تصانیف مع سند و اجازۂ حدیث از خود پیش کیں-(۳) وہ نہ صرف ایک بلند پایہ عالم دین، محقق حدیث اور بے مثال فقیہ تھے بلکہ ایک اعلا درجے کے مدرس اور شیریں بیان و سحر انگیز خطیب بھی تھے- ان کے بیان کی معنی آفرینی اور ان کے ذہن کی نکتہ رسی پر وقت کے بڑے بڑے علما سردھنتے تھے - صاحب نزھۃ الخواطر نے ان کی ذکاوت ذہن ، کمال حافظہ، بحث و مطالعہ کے انہماک شیریں کلامی، فصاحت نطق و بیان اور فیضان درس و افادہ کا اعتراف کیا ہے -(۴) مولانا

---

(۱) ابوالحسن علی ندوی، سید ، " سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۱۹-۲۱۸
حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کے اس خط کا مکمل فارسی متن حضرت علامہ شاہ اسمعیل شہید کے تعلیقات ترجمہ میں نقل کیا جاچکا ہے - اس لیے یہاں اصل متن دوبارہ نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھے-(ابوسلمان)

(۲) ابویحییٰ امام خان نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا ، ص ۲۷-۱۲۶
صدیق حسن خان ، نواب ، " ابجد العلوم"، محولہ بالا ، ج ۳ ، ص ۹۱۵

(۳) ابویحییٰ امام خان نوشہروی،" تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا ، ص ۲۶-۱۲۵

(۴) عبدالحی، مولانا سید ،" نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۲۳۹

سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھنؤ کی ایک ایسی مجلس کا حال لکھا ہے جس میں شیعہ اور سنی دونوں مذاہب کے لوگ موجود تھے ، مولانا لکھتے ہیں " انھوں نے سورۃ الانبیاء کا ایک رکوع (۲۱: ۵۱، ۵۲) پڑھ کر وعظ کہنا شروع کیا اور اس کے ضمن میں تعزیہ داری، عرس، محفل سرود ، قبرپرستی، پیر پرستی وغیرہ کو کھول کھول کر بیان کیا اور اس کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ۔ ہزاروں سنی اور شیعہ سنتے تھے اور سیکڑوں آدمی زار و قطار روتے تھے اور آپس میں کہتے تھے :" سبحان اللہ! اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا آج ہی قرآن مجید نازل ہوا ہے ۔ افسوس کہ ہم آج تک گم راہی میں مبتلا رہے ۔ کسی عالم و فاضل نے ہم کو متنبہ نہ کیا ۔"

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس محفل کے حالات اور وعظ کی تفصیل و اثرات پر تفصیل سے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ تمام حاضرین محفل سکتے کے عالم میں تھے ۔(۱) مولانا نے ایک اور مجلس وعظ کے بارے میں لکھا ہے " مولانا عبدالحی صاحب نے نواب معتمد الدولہ کی مجلس میں وعظ فرمایا۔ مولانا محمد اسمعیل صاحب فرماتے ہیں کہ ایسا وعظ ہم نے نہیں سنا۔ وعظ اس طرح شروع کیا کہ اے مومنو! معلوم ہونا چاہیے کہ ایمان کا نشان کیا ہے اور کفر کا نشان کیا ہے ؟ پھر اس دعوے پر عقلی و نقلی دلائل پیش کیے ۔ ایک گروہ کے نشان ایمان اور دوسرے گروہ کے نشان کفر کو بڑی خوش بیانی سے واضح کیا اور بڑی خوبی سے ان کو ہر گروہ پر منطبق کیا۔ معتمدالدولہ نے بڑی تحسین و آفرین کی اور کہا کہ آپ کے اوصاف حمیدہ جیسے سنے تھے، اس سے زیادہ ٹھیک پایا۔" (۲)

مولانا عبدالحی تحریک احیائے سنت ، دعوت تمسک بالکتب و الحکمۃ اور رسوم و

---

(۱) ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید ؛ سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۱۷۱-۷۲

(۲) ایضاً، ج ۱، ص ۱۹۰

محدثات کے خلاف جہاد میں شاہ اسمعیل شہید سے کامل درجہ متفق اور رفیق تھے - حتی کہ مسائل اختلافیہ میں بھی وہ ان کے شریک تھے - ١٢٣٠ھ کے مشہور مباحثہ جامع مسجد دھلی میں مولانا اسمعیل شہید اور مولانا عبدالحی نے بدعات و محدثات کے خلاف آولہ کتاب و سنت پیش کیے تو مولانا رشیدالدین مرحوم کا جواب یہ تھا کہ ہم سب نے شاہ صاحب سے فیض حاصل کیا ہے - ہم سب ان کے خدام اور حلقہ بگوشوں میں رہے ہیں- ان کا قول و عمل ہمارے لیے حجت قاطع ہے - مولانا عبدالحی نے کہا اولہ اربعہ میں آبا و مشائخ کا قول داخل نہیں- قرآن و سنت سے ثابت کیجئے-" (١) یہ چند جملے ان کے مسلک اور ان کے انداز فکر و رجحان کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں - سید احمد شہید سے بھی بیعت کرلی تھی اور اس کے بعد انھوں نے اپنی زندگی دعوت و اصلاح اور تحریک جہاد کے لیے وقف کردی تھی- وہ سید صاحب کے تمام واردات و اسفار دعوت کے علاوہ سفر حج و جہاد میں شریک رہے - اس کی تفصیل سید صاحب اور شاہ اسمعیل شہید کے تعلیقات میں گزرچکی ہے - مولانا عبدالحی سید صاحب کے نہ صرف مشیر خاص بلکہ تحریک جہاد کے لیے دماغ اور قلب کی حیثیت رکھتے تھے- (٢) مولانا سید صاحب سے عشق کی حد تک محبت کرتے تھے - آخری سفر ھجرت و جہاد میں ٹونک سے آگے جھلانا کے مقام سے سید صاحب نے انھیں بعض امور کی انجام دھی کے لیے ٹونک واپس کردیا تھا- (٣) اگرچہ مولانا کو سید صاحب کی مفارقت گوارانہ تھی لیکن حکم کی بنا پر ٹھیر گئے - تاھم ھروقت انتظار تھا کہ سید صاحب کب بلاتے ھیں- پانچ مہینے گذرجانے کے بعد سید صاحب کی طرف سے نامۂ طلب صادر ھوا- مولانا نے فوراً سفر کا سامان تیا کیا اور روانہ ھوگئے - اگرچہ بواسیر بیماریوں کے باعث بہت کم زور ھوگئے تھے لیکن سید صاحب سے ملاقات کے شوق نے سب کچھ بھلا دیا- راستے چلتے

---

(١) مہر، مولانا غلام رسول، "نقش آزاد"، محولہ بالا، ص ٣١٥
(٢) محمد میاں، مولانا سید، "علمائے ھند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ٢، ص ٢٧٢
(٣) ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید، "سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ١، ص ٣٠٩

رفیقوں سے الگ ہوجاتے - سید صاحب کا خط نکال کر پڑھتے تو فوراً رقت طاری ہوجاتی - پھر شوق کی گرم جوشی سے تیز چلنے لگتے- جو شخص سامنے آتا کہتے مجھے سید صاحب نے طلب فرمایا ہے - غرض اس حال میں لمبا سفر طے کیا- جیسے عاشق محبوب کی خدمت میں جاتا ہے - (۱) سید صاحب چار باغ میں تھے کہ مولانا عبدالحی بھی آپ سے جاملے- سید صاحب نے ان کا استقبال کیا- معانقہ فرمایا- مولانا نے آپ کا ہاتھ چوما - یہ واقعہ ذی قعدہ، ۱۲۴۲ھکے اواخر (اواخر مئی، ۱۸۲۷ء) کا ہے - یہیں آپ کو ذی الحجہ کا چاند نظر آیا تھا- (۲)

مولانا عبدالحی کی زندگی کا یہ آخری دور تھا- بواسیر کی شدید شکایت پیدا ہوگئی تھی - اسی میں اسہال و پیچش کا مرض بھی پیدا ہوگیا -(۳) کوئی دوا مفید نہ پڑتی تھی - بیماری بڑھتی جاتی تھی- یہاں تک کہ آخر وقت آ پہنچا - آپ بار بار بے ہوش ہوجاتے تھے - آپ کا حال سن کر سید صاحب تشریف لائے - مولانا کو ہوش آیا اور سید صاحب کو دیکھا توسید صاحب نے حال دریافت کیا تو فرمایا سخت تکلیف ہے آپ اپنا قدم میرے سینے پر دھردیں کہ اللہ تعالی اس کی برکت سے مجھے تکلیف سے نجات دے - سید صاحب نے فرمایا " مولانا ! آپ کا سینہ علوم قرآن و سنت کا گنجینہ ہے - یہ اس قابل نہیں کہ میں اس پر اپنا قدم رکھوں - " یہ کہہ کر آپ نے اپنا ہاتھ ان کے سینے پر رکھ دیا اس سے انہیں قدرے تکلیف کم ہوئی اور کئی بار زبان سے اللہ الرفیق الاعلی کہا اور اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی۔

مولانا عبدالحی کی وفات شیو کے مقام پر ۸ شعبان، ۱۲۴۳ھ / ۲۳ فروری، ۱۸۲۸ء کو ہوئی تھی - سید صاحب اور مجاہدین کو ان کے انتقال سے شدید صدمہ ہوا - سید صاحب

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول " [struck through] "، محولہ بالا، ص ۱۱۳ جماعت مجاہدین"

(۲) ایضاً، ص ۱۱۳
ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید " سیرت سید احمد شہید "، محولہ بالا، ص ۳۰۰

(۳) محمد میاں، مولانا سید " علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۱۸۹

نے فرمایا کہ مولانا دین کے ایک رکن تھے اور بڑی برکت والے شخص تھے۔ مولانا اسمعیل شہید ایک قریبی عزیز اور فاضل دوست سے محروم ہوئے تو سید صاحب اپنے قابل مشیر سے۔ انھوں نے اپنا بازو ٹوٹا ہوا محسوس کیا۔ یہ بے نظیر فاضل عجیب و غریب قابلیت کا تھا، شیریں کلامی اور برجستہ تقریر کرنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ سید صاحب نے ان کے غم میں آنسو بہائے - (۱) سید صاحب ہی نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، نماز میں تقریباً سات سو مجاہدین شریک تھے۔ شہر کے جنوب مشرق میں ایک تیر کے فاصلے پر قبرستان میں لشکر اسلام کے اس مایۂ ناز شیخ الاسلام کو سپرد خاک کیا گیا۔ آج کل یہ مزار " دلمی بابا" کا مزار کہلاتا ہے - (۲)

مولانا عبدالحی نے تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی شاہ عبدالعزیز کی صاحب زادی سے ہوئی تھی - ان سے ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی - شاہ صاحب کی زندگی ہی میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ دوسری شادی انھوں نے اپنی چچا زاد بہن سے کی تھی ان کی یادگار علامہ عبدالقیوم تھے - مولانا کا انتقال ہوا تو عبدالقیوم ساتھ تھے - سید صاحب نے انھیں واپس بھیج دیا تھا کہ ان کے قرب سے والدہ کو تسکین رہے - تیسری شادی انھوں نے شاہ اسمعیل شہید کی ہمشیرہ سے اس زمانے میں کی تھی جب آپ نے نکاح بیوگان کی تحریک شروع کی تھی - کہا کہ انتقال کے وقت آپ نے دو بیوہ اور ایک یتیم کو چھوڑا -(۳)

مولانا عبدالقیوم نے بڑے ہوکر علم و فضل اور فتوی میں بڑی شہرت حاصل کی زیادہ وقت بھوپال میں گزرا اسی لیے بھوپالی کے عرف سے مشہور تھے۔ ان کی شادی شاہ اسحاق کی صاحب زادی امۃ الغفور سے ہوئی تھی جو خود بھی عالم و فاضل خاتون تھیں - (۴)

---

(۱) حیرت دہلوی، مرزا " حیات طیبہ"، محولہ بالا، ص ۳۲۷

(۲) مہر، مولانا غلام رسول، " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا، ص ۱۵-۱۱۳

(۳) ابویحییٰ امام خاں نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۱۳۴
محمود احمد برکاتی، حکیم " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۵۵

(۴) مہر، مولانا غلام رسول، " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا، ص ۱۱۶
عبدالحی، مولانا سید " نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۹۰ اور ۹۸-۲۹۷

مولانا عبدالحی کی تصانیف میں نکاح بیوگان کے نام سے ایک رسالہ بیان کیا جاتا ہے- صراط مستقیم کے ابتدائی دو ابواب بھی آپ ہی کی قلم سے ہیں - اگرچہ اس کے مطالب سید احمد شہید کے بتائے ہوئے ہیں- مولانا نے صراط مستقیم کا عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا- مولانا رشیدالدین سے ۱۲۲۰ھ کے مباحثے کی روداد بھی مرتب کی تھی نیز متفرق فتوے اور خطوط ان کی یادگار ہیں- (۱) ٭

مولانا عبدالحی ایک مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہے تھے - ظاہر ہے کہ ان سے طلبہ کی ایک جماعت نے استفادہ کیا ہوگا لیکن کسی تذکرے میں ان کے تلامذہ کی کوئی فہرست نظر سے نہیں گزری البتہ ضمناً تین شاگردوں کے نام معلوم ہوگئے ہیں ان میں سے ایک قاضی علا الدین پھلروی تھے - وہ شعر بھی کہتے تھے اور انھوں نے ضروری دینی مسائل کے بیان میں سید صاحب کے حکم سے سادہ سلیس اردو میں ایک نظم بھی لکھنی شروع کی تھی لیکن تکمیل سے قبل ایک معرکہ میں شہید ہوگئے - (۲) دوسرے شاگرد مولوی سخاوت علی عمری جونپوری تھے - رحمان علی نے ان کا ترجمہ لکھا ہے[۳] اور ایک اور حدیث کے نامور استاد شیخ وجیہہ الدین سہارنپوری بھی تھے - (۴)

====XXX====

<u>جناب مولوی عبدالخالق سلمہ اللہ تعالی :</u>

٭ آپ کا شہرہ علم فضل کا اوائل حال سے آج تک شہر شاہجہان آباد میں ایسا

---

(۱) ابویحیی امام خان نوشہروی "تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۱۲۷
عبدالحئی، مولانا سید "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۲۵۰
ایوب قادری، محمد (مرتب) "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، صص ۸۷-۲۸٦
مہر، مولانا غلام رسول "جماعت مجاہدین"، محولہ بالا، ص ۱۱۷

(۲) مہر، مولانا غلام رسول "سید احمد شہید"، محولہ بالا، ص ۳۳٦

(۳) ایوب قادری، محمد (مرتب و مترجم) "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۲۰۷

(۴) احمد رضا بجنوری، سید "انوارالباری، اردو شرح البخاری"، محولہ بالا، (مقدمہ) ، حصہ دوم، صص ۲۱-۲۲۰

بلند ہے کہ اس سے گوشۂ فلک گز ہے - دین دار اور تقوی شعار ترویج ملت میں ساعی ہیں اور اعلا دین پر داعی بہت لوگ ان کے ارشاد ہدایت سے راہ راست پر آئے اور بہت شائقین تحصیل کمال کو ان کی خدمت میں فوائد علمی سے بہرہ حاصل ہوا - وضع بہت متین اور کلام بہت رزین اخلاق صاحی، امانت و دیانت جیسی ہی - اس جامعیت کے ساتھ کوئی کم نظر سے گذرا ہے - "(۱)

تعلیقات :

مولوی عبدالخالق کے والد کا نام مولوی خیر اللہ تھا - وطن مالوف پنجاب تھا -(۲) لیکن مولوی عبدالخالق کی ساری زندگی بچپن سے موت تک اور بعد میں ان کے خاندان کی زندگی بھی دہلی میں گزری اسی لیے دہلوی کی نسبت سے مشہور ہوئے - شاہ عبدالقادر سے علم حاصل کیا اور سند حدیث شاہ محمد اسحاق سے حاصل کی -(۳) بشیرالدین نے انہیں صرف شاہ اسحاق کا شاگرد لکھا ہے -(۴) اور صاحب "کمالات عزیزی" وغیرہ نے شاہ عبدالعزیز کے ارشد تلامذہ میں لکھا ہے - (۵)

تعلیم سے فراغت کے بعد پنجابی کٹڑے کی مسجد اورنگ آبادی کو درس و تدریس کا مرکز بنایا - وہ اس مسجد کے متولی بھی تھے - (۶) تھوڑے ہی عرصے میں ان کی شہرت

---

(۱) سرسید احمد خاں، "آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، عکس ۱۰۷

(۲) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، "مولوی نذیر احمد ـــ احوال و آثار"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ع، ص ۳۱

(۳) عبدالحی، مولانا سید، "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۲۵۱

(۴) بشیرالدین احمد، "واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ج ۲، ص ۲۵۷

(۵) ظہیرالدین احمد ولی اللہی، "کمالات عزیزی"، لاہور: اسلامی اکیڈمی، سن ندارد، ص ۹

محمد میاں، مولانا سید، "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۵۰
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، "مولوی نذیر احمد دہلوی ـــ احوال و آثار"، محولہ بالا، ص ۱۷۳

(۶) فضل حسین بہاری، "الحیاۃ بعد المماۃ" محولہ بالا، ص ۳۲

درس و تدریس دور دور تک پہنچ گئی اور ان کا مدرسہ شہر کے بہترین مدارس میں شمار کیا جانے لگا اور شاہ محمد اسحاق کے دہلی سے ہجرت کرجانے کے بعد تو صرف یہی مدرسہ ہندوستان میں کتاب و سنت کی تعلیم کا مرکز بن گیا - مدرسہ کا یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کا مایہ ناز محدث شیخ الکل مولانا نذیر حسین محدث نےمسند درس کو زینت بخشی تھی -

مولوی عبدالخالق کے فضل و کمال ، دین داری و تقوی شعاری نیز اعلائے دین کے لیے ان کی مساعی، ان کی متین و سادہ وضع ، خوش کلامی و دیانت کا اعتراف و تذکرہ تو سرسید نے بھی ان کے ترجمے میں کیا ہے - ڈپٹی نذیر احمد نے ان کی جامعیت و وسعت معلومات پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے ان کے ذوق کتب‌بینی اور ان کے ذخیرہ کتب پر بھی روشنی پڑتی ہے - انتقال ہوا تو صرف کتابیں ترکے میں چھوڑیں جو ان کے ورثا میں تقسیم کردی گئیں - ڈپٹی صاحب موصوف لکھتے ہیں :

" مولوی عبدالخالق مرحوم اپنے عصر میں دہلی کے ممتاز مولویوں میں تھے- وہ آخر میں بسبب ضعف پیری ایک مشت استخوان رہ گئے تھے - اس وقت کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے - مسجد کے ایک در میں اکڑوں بیٹھے ہیں ایک تپائی سامنے ہے ، اس پر کچھ کتابیں رکھی ہیں، ان کو دیکھ رہے ہیں اور کچھ ان پر لکھتے جاتے ہیں- مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو ان کا ترکہ یہی کتابیں ان کی اولاد ذکور و اناث میں تقسیم ہوا- کچھ کتابیں عبدالقادر مرحوم کے حصے میں آئیں جو ... میرے خسر تھے چوں کہ میں خانہ داماد تھا - مجھ کو ان کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو کوئی کتاب عربی، فارسی ، اردو کی نہ تھی جس پر مولوی عبدالخالق کا تحشیہ نہ تھا- یہاں تک کہ مثنوی بدرمنیر جس سے مولوی صاحب کی وسعت معلومات کا ثبوت ملتا ہے اور اس بات کا کہ اگلے بزرگ علم و علم کے لیے سیکھتے تھے - " (۱)

---

(۱) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر" مولوی نذیر احمد دہلوی— احوال و آثار"، محولہ بالا ، ص: ۳۲-۳۵

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے لکھا ہے " کہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کرلیا تھا۔" (١) پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ان کے مرتبہ علمی کے بارے میں لکھا ہے " کہ مولوی عبدالخالق صاحب کے علم و فضل ، تقوی و ریاضت کا تمام ملک میں شہرہ تھا۔" (٢) آخر عمر میں دمے کے مرض کی وجہ سے درس و تدریس سے کنارہ کش ہوگئے تھے اور مسجد میں گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔" (٣) ان کے مسلک پر مولانا محمد شاہ احسن نانوتوی کی ایک تحریر سے روشنی پڑتی ہے جو انھوں نے میاں نذیر حسین محدث دھلوی کے رد میں لکھی تھی ۔ اس میں وہ لکھتے ھیں :" مولوی عبدالخالق دھلوی منکر تقلید شخصی کو گم راہ کہتے تھے۔" (٣)

ان کی اولاد میں دو بیٹے اور ایک صاحب زادی کا پتا چلتا ہے ۔ بڑے بیٹے کا نام مولوی عبدالقادر تھا ۔ یہ محلات شاھی کے امام اور بیگم ولی عہد کے استاد تھے ۔ قلعے سے پنشن ملتی تھی طب سے بھی واقف تھے۔ مسز لی سٹس کا علاج انھیں نے کیا تھا۔ (٥) دوسرے بیٹے مولوی عبدالرب تھے جنھیں جنھیں خطابت میں کمال حاصل تھا اور تمام ھندوستان میں ان کے وعظ کی دھوم تھی۔ سہارن پور کی جامع مسجد کے بانی تھے ۔ دونوں بھائیوں کا شمار دھلی کے مشاھیر میں ہوتا تھا۔ (٦) لواحقین کی صاحب زادی کو شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دھلوی کی زوجہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ شاہ محمد اسحاق ،

---

(١) افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر ، " مولوی نذیر احمد دھلوی" ، محولہ بالا ، ص ٣١
(٢) خلیق احمد نظامی ، پروفیسر ، " تاریخی مقالات" ، محولہ بالا ، ص ٢٥٦
(٣) بشیرالدین احمد ، " واقعات دارالحکومت دھلی" ، محولہ بالا ، ج ٢ ، ص ٢١٣
(٣) ایوب قادری ، محمد ، " مولانا محمود حسن نانوتوی" ، محولہ بالا ، ص ١٥١
(٥) ایک انگریز خاتون جو ١٨٥٧ع میں تحریک جہاد آزادی کے زمانے میں زخمی ہوگئی تھی اور سڑک کے کنارے پر دم توڑ رہی تھی مولانا نذیرحسین اسے گھر اٹھالائے تھے ، اس کا علاج معالجہ کیا جب وہ صحت مند ہوگئی اور حالات ٹھیک ہوئے تو اسے انگریزوں کے حوالے کردیا۔ تفصیل کے لیے دیکھئے " الحیاۃ بعد المماۃ" ، ص ٣٣-١٢٧
(٦) بشیرالدین احمد ، " واقعات دارالحکومت دھلی" ، ج ٢ ، ص ١٣-٢١٣
افتخاراحمد صدیقی ، ڈاکٹر ، " مولوی نذیر احمد دھلوی" ، محولہ بالا ، ص ٣٦-٣١

شاہ محمد یعقوب اپنے تلامذہ کی ایک جماعت کے ساتھ نکاح میں شریک ہوئے رات بھر ابوداؤد کا درس ہوا صبح کو نکاح ہوا، ولیمہ کے بعد تمام حضرات اپنے مکانوں اور قیام گاہوں کو تشریف لے گئے - (١)

اگرچہ انھوں نے ایک مدت تک درس و تدریس کا شغل جاری رکھا تھا اور اس مدت میں بلاشبہ سیکڑوں شائقین علم و دین نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہوگا لیکن ان کے تلامذہ کی کوئی طویل فہرست ہمارے سامنے نہیں ہے - ڈپٹی نذیر احمد کے حالات میں آیا ہے کہ ان کے والد مولوی عبدالخالق کے شاگرد تھے اور وہ نذیر احمد کو بھی انھیں کے سپرد کر گئے تھے اور نذیر احمد نے دھلی میں ان کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا-(٢) اور میاں نذیر حسین محدث دھلوی کے اساتذہ میں بھی ان کا اسم سامی آیا ہے اور اسی سلسلے میں مولوی رحمت اللہ بیگ کا نام آیا ہے کہ وہ میاں صاحب کے ساتھ صحیح بخاری کے درس میں ان کے شریک تھے -(٣)

مولوی عبدالخالق کا تذکرہ مستقلاً "آثارالصنادید" کے سوا کسی دوسری کتاب میں نہیں - مولوی بشیرالدین دھلوی نے ان کے بارے میں سرسید کے بیان ہی کو نقل کردیا البتہ ان کی اولاد کے بارے میں تفصیلات زیادہ ہیں اس کی وجہ درحقیقت ان کا علم و فضل نہیں بلکہ یہ ہے کہ بشیرالدین کے والد ڈپٹی نذیر احمد مولوی صاحب موصوف کی پوتی (بنت مولوی عبدالقادر) کے شوہر تھے - اور حضرت شیخ الکل کے حالات میں اس لیے ان کا نام آیا کہ شیخ الکل ان کے داماد تھے اور جب تک عبدالخالق کی عظمت کا نقش اجاگر نہ کیا جائے تلامذہ کی عظمت و بلندی کا اعتراف کیوں کر کرایا جاسکتا تھا- حقیقت یہ ہے کہ ان کی

---

(١) فضل حسین بہاری، "الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا، ص ٣٤

(٢) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، "مولوی نذیر احمد دھلوی"، محولہ بالا، ص ٣٦

(٣) فضل حسین بہاری، "الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا، ص ٣٧ اور ٤٣

حیات جاوید کا دار و مدار " آثارالصنادید"، کی چند سطروں پر ہے اور ان کی شہرت کی بنا ان کے دو تلامذہ حضرت شیخ الکل میاں نذیر حسین اور ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے محاسن علم و فضل کی جہانگیری پر ہے - ان کے دونوں تلامذہ اور ان کے محققین و مصنفین کے نزدیک ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کسی نے ان کی تاریخ ولادت و وفات لکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں - تصانیف ان کی یادگار ہی نہ ہونگی - سرسید نے جو کچھ ان کے بارے میں لکھا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی جامعیت کا اصل راز ان کی سیرت کے محاسن میں پوشیدہ تھا اور ان کا فضل و کمال کتب درسیہ کی تدریس تک تھا -

ان کی تاریخ ولادت و وفات کا پتا نہیں چل سکا لیکن یہ بات قطعی ہے کہ وہ " آثارالصنادید" کے اشاعت (۱۸۴۶ع) تک حیات تھے - " آثارالصنادید" میں ان کے نام کے ساتھ مرحوم یا رحمۃ اللہ علیہ یا غفراللہ کے الفاظ کی بجائے دعائیہ کلمہ " سلمہ اللہ تعالی" شامل ہے - (۱)

=====xxx=====

جناب حضرت شیخ الشیوخ مولانا شاہ غلام علی قدس سرہ :

" میرا کیا مقدور ہے کہ آپ کے کمالات ظاہری اور مقامات باطنی کا حال لکھ سکوں کیوں کہ حالات آپ کے اس سے سوا ہیں جو بیان ہوسکیں اور مقامات اس سے بہت ہیں جو لکھنے میں آویں۔ سبحان اللہ علم اور عمل اور فضل و کمال اور تجرید و تجرداور حلم و کرم اور سخاوت اتم اور ایثار انکسار آپ کی ذات پر ختم تھے - جو کچھ آیا اور جس قدر ہوا سب

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۲۱

نام اللہ صرف کیا اور کبھی کل کا غم نہ کیا۔ دن رات اللہ اور اللہ کے رسول کے ذکر میں بسر کی اور دنیا اور مافیہا کی خبر نہ رکھی۔ میں آپ کے کس کس کمال کا ذکر کروں علم ایسا تھا کہ کاہے کو ہوتا ہے ۔ زہد اور مجاہدہ ایسا کہ بیان اس کا نہیں ہوسکتا۔ تقوی اور ورع اس درجہ پر کہ سوا اس سے ممکن نہیں اور پھر اس پر عجز ویسا ہی ، انکسار ویسا ہی ۔ اتباع سنت اس درجہ پر کہ اچھا اچھے لوگ وہاں قدم نہ رکھ سکیں ۔ آپ کی صحبت سے اس قدر فیض حاصل ہوتا کہ بیٹھ کر اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔ وطن اصلی آپ کا مجمع وتالہ ہے ۔ جو پنجاب کے ملک میں امرتسر کے پاس واقع ہے اور آپ سادات علوی سے ہیں ۔ والد ماجد آپ کے بھی بڑے زاہد اور عابد تھے، اور جنگلوں میں جاکر ذکر جہر کیا کرتے تھے اور مہینوں بھاس پتی پر قناعت فرماتے تھے۔ آپ کے پیدا ہونے سے پہلے ایک دفعہ آپ کے والد ماجد نے جناب امیرالمومنین علی ابن [ابی] طالب کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ تمہارے ہاں عنقریب لڑکا پیدا ہونے والا ہے اس کو میرے ہم نام کرنا۔ اور آپ کی والدہ ماجدہ نے کسی بزرگ کو دیکھا کہ انہوں نے عبدالقادر آپ کا نام رکھا۔ اور آپ کے عم بزرگ وار نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارت سراپا بشارت سے عبداللہ آپ کا نام رکھا اور اسی سبب سے آپ کا اصلی نام عبداللہ اور عرف غلام علی تھا۔ ١١٥٦ھ میں آپ نے اس عالم میں قدم فیض توام رکھا اور اپنے جمال جہان آرا سے عالم کو منور کیا۔ بعضے شعرا نے آپ کی ولادت باسعادت کی تاریخیں بھی منظوم کیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے :

چو نجم چرخ ہدی حضرت غلام علی

شدہ ظہور فگن در جہان ، جہان بشگفت

سن ولا و شریفش چو جست راقم دل

مہ سپہر ہدایت شدہ طلوع بگفت

غرض کہ آپ نے سولہ برس کی عمر تک تو اسی نواحی میں بسر کی ۱۱۷۳ھ میں آپ کے والد ماجد نے اس اران سے دہلی میں بلوایا کہ اپنے پیر شاہ ناصر الدین قادری سے جن کا مزار نئی عیدگاہ کے پیچھے ہے بیعت کرادی جائے - آپ کے پہنچنے سے پہلے شاہ ناصرالدین صاحب نے انتقال کیا ، اور چوں کہ اللہ تعالی کو اور ہی کچھ پردۂ غیب سے ظاہر کرنا تھا ، یہ بات نقاب خفا و حیزالتوا میں رہی - تب آپ کے والد ماجد نے اجازت و اختیار دیا کہ جس سے چاہو بیعت کرو- ۱۱۷۸ھ میں بائیس برس کی عمر میں آپ نے جناب مرزا جان جاناں مظہر علیہ الرحمۃ سے بیعت کی اور یہ شعر پڑھا :

از برائے سجدہ عشق آستانے یافتم

سر زمینے بود منظور آسمانے یافتم

بعد بیعت کے سالہا سال آپ کے پیر و مرشد اپنے کی خدمت میں اوقات بسرکی اور وہ زہد و مجاہدہ اور ریاضت کی کہ بیان نہیں ہوسکتا- دن بدن عروج کمال اور مشاہدۂ جمال شاہد بے زوال اور مکاشفہ اور ترقیات فائقہ ہوئیں ، یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور صاحب ارشاد ہوئے اور تلقین وارشاد (کا) سلسلہ روبرو اپنے پیر و مرشد کے جاری فرمایا- اگرچہ آپ نے بیعت سلسلۂ قادریہ میں کی تھی لیکن ذکر و اذکار و شغل و اشغال طریقۂ علیہ نقشبندیہ مجددیہ میں جاری کیا اور ہر طریقہ کی اجازت حاصل کی - اور اپنے پیر و مرشد کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور حقیقت میں یہی اعتقاد [کے] بموجب اپنے پیر پر بھی فوق لے گئے - سبحان اللہ کیا آزادی تھی کہ مطلق دنیا کا لگاؤ نہ تھا - اللہ اللہ کیا اطاعت سنت تھی کہ سرموبھی فرق نہ تھا- توکل اس درجہ پر تھا کہ کبھی کسی طرح کا خیال دل میں نہ آتا- امرا اور بادشاہ آرزو رکھتے تھے کہ ہم خانقاہ کے فقرا کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کریں ، ہرگز آپ منظور نہ فرماتے - ایک دفعہ نواب امیرالدولہ امیر محمد خان والئی ٹونک نے بہت التجا سے درخواست تقرر وظیفہ کی اس کے جواب میں آپ نے کلا صرف

یہ شعر لکھ بھیجا :

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم

بامیر خان بگوئے کہ روزی مقرر است

آپ کی ذات فیض آیات سے تمام جہان میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے آپکی بیعت اختیار کرلی ۔ میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہوکر بیعت کی اور خدمات خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے ۔ اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امڈ آئے تھے سچ ہے :

چو کعبہ قبلۂ حاجت شُد از دیار بعید

روند خلق بدیدارش از بسی فرسنگ

حضرت کی خانقاہ میں پان سے فقیر سے کم نہیں رہتا تھا ۔ اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا ۔ اور باوجودے کہ کہیں سے ایک حبّہ مقرر نہ تھا اللہ تعالی غیب الغیب سے سب کام چلاتا تھا ۔ اس پر فیاضی اورسخاوت اس قدر تھی کہ کبھی سائل کو محروم نہیں پھیرا ۔ جو اس نے مانگا وہی دیا ۔ جو چیز عمدہ اور تحفہ آپ کے پاس آتی اس کو بیچ کر فقرا پر صرف کرتے اور جیسا کوئی گاڑھا موٹا جھوٹا تمام فقیروں کو میسر ہوتا ویسا ہی آپ بھی پہنتے ، اور جوکھانا سب کو میسر ہوتا وہی آپ کھاتے ۔ بھلا غور کرو کہ بشر کی طاقت ہے کہ ایسی بات کرسکے اگر کوئی عرض کرتا کہ حضرت آپ اپنے لیے تو یہ کپڑا لے لیجئے اور یہ آرام کی چیز بنالیجئے تو آپ یہ قطعہ پڑھا کرتے ۔ قطعہ

خاک نشینی است سلیمانیم

ننگ بود افسر سلطانیم

ہست بسے سال کہ می پوشمش

کہنہ نہ شد جامۂ عریانیم

اگر کبھی کچھ اسباب اور سامان دنیا کا ذکر آتا تو ارشاد فرماتے :

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہان

ہرچہ ماداریم زان ہم اکثری [درکار] نیست

آپ کی اوقات شریف نہایت منضبط تھی ۔ کلام اللہ آپ کو حفظ تھا اور تحقیق قرات بھی بہت خوب تھی۔ نماز صبح اول وقت ادا فرماکر دس سپارہ کلام اللہ کے ختم فرماتے اور بعد اس کے حلقۂ مریدین جمع ہوتا اور تا نماز اشراق سلسلۂ توجہ اور استغراق جاری رہتا۔ بعد ادا کرنے نماز اشراق کے تدریس حدیث اور تفسیر کی شروع ہوتی ۔ جو لوگ اس جلسے کے بیٹھنے والے ہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ اس میں کیا کیفیت ہوتی تھی اور پڑھنے پڑھانے سننے سنانے والوں کا کیا حال ہوتا تھا۔ جہاں نام رسول خدا کا آتا آپ بیتاب ہوجاتے، اور اس بے تابی میں حاضرین پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی۔ سبحان اللہ کیا شیخ تھے باقی باللہ اور عاشق رسول اللہ ۔ علم حدیث اور تفسیر نہایت مستحضر تھا۔ اگر باعتبار علوم نقلی خاتم المحدثین والمفسرین تعبیر کیا جائے تو بھی زیبا ہے ۔ اور اگر باعتبار علوم عقلی سر آمد فلسفیان متقدمین اور متاخرین لکھا جائے تو بھی بجا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیا مجمع علوم پیدا کیا تھا کہ ہر ایک علم ظاہری اور باطنی میں درجہ کمال بلکہ انتہائے کمال حاصل تھا۔ بعد اس درس و تدریس کے آپ کچھ تھوڑا سا کھانا کہ عبادت معہود کو کافی ہو، تناول فرماکر بہ اتباع سنت نبوی قیلولہ استراحت میں آرام کرتے۔ تھوڑی دیر بعد اول وقت ظہر نمازِ ظہر ادا فرماکر پھر درس و تدریس حدیث و تفسیر و فقہ اور کتب تصوف میں مشغول ہوتے، اور بعد نماز عصر تا نماز مغرب حلقۂ مریدین جمع ہوتا اور ہر ایک آپ کی توجہ سے علو مدارج حاصل کرتا ۔ ہمیشہ تمام رات آپ شب بیداری فرماتے تھے شاید کہ گھڑی دو گھڑی بمقتضائے بشریت غفلت آجاتی ہو سو وہ بھی جا نماز

پر - پوستین آپ نے چارپائی پر استراحت نہیں فرمائی۔ اگر نیند کا بہت غلبہ ہوا بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کرتے پڑ رہے - آپ کی خانقاہ میں عجب عالم ہوتا تھا۔ بوریا کا فرش رہتا تھا اور اسی کے سرے پر ایک مصلی کبھی بوریا کا کبھی اور کسی چیز کا پڑا رہتا تھا اور وہیں ایک تکیہ چمڑے کا رکھا رہتا۔ آپ دن رات اسی مصلے پر بیٹھے رہتے اور عبادت معبود کیا کرتے، اور سب طالبین گرداگرد آپ کے حلقہ باندھے بیٹھے رہتے - اورہر ایک کو جدا جدا فیض حاصل ہوتا۔ اگر کبھی کچھ فرش فروش کا ذکر آتا تو آپ ارشاد فرماتے کہ :

لنگلے زیرو لنگلے بالا　　　نہ غم دُزد نے غم کالا

گرکی بوریا و پوستکی　　　دل کی پر ز دَرد دوستکی

این قدر بس بود جمالی را　　　عاشق رندلا ابالی را

حق یہ ہے کہ ایسا برشتہ جان شیخ دیکھنے میں نہیں آیا اور میں تو اس بات پر عاشق ہوں کہ باوجود اتنی آزادی اور از خود رفتگی کے سرمو احکام شریعت سے تجاوز نہ تھا اور جو کام تھا وہ باتباع سنت تھا۔ لقمۂ مشتبہ سے نہایت پرہیز کرتے اور مال مشتبہ ہرگز نہ لیتے جو شخص خلاف شرع اور سنت ہوتا اس سے نہایت خفا ہوتے اور اپنے پاس اس کا آنا گوارا نہ کرتے اور فرماتے - قطعہ :

باسرو پاپا رِا نزاق پوروشن　　　یا بہ کس پرخاستن انگشت دیل

یا مکس باپیل پادان دوستی　　　یا بہ کس خانۂ درخورد پیل

میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے کمال نہایت اعتقاد تھا، اور میرے جناب والد اور میرے بڑے بھائی جناب احتشام الدولہ سید محمد خان بہادر مرحوم کو آپ ہی سے بیعت تھی - اور آپ کی میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ میرے والد ماجد بھی آپ

کی صحبت کی برکت سے آزادہ مزاج اور وارستہ طبع تھے، کبھی کبھی بموجب اس مصرع کے:

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

کوئی بات گستاخانہ عرض کرتے یا کوئی حرکت آپ کے خلاف مرضی سرزد ہوتی تو آپ بارہا ارشاد فرماتے کہ اگرچہ میں نے اپنے تئیں غم زن و فرزند سے دور رکھا تھا لیکن اللہ تعالی کی مرضی یہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت اپنے فرزندوں سے سوا دے دی - جو چاہو سو کہو اور جو چاہو سو کرو۔ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلے پر بٹھالیتے اور نہایت شفقت فرماتے - لڑکپن میں کوئی تمیز تو ہوتی نہیں خصوصاً مجلس میں جو چاہا سو کیا، جوچاہتا سو کرتا، اور حرکات بے تمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے - میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا۔ آپ کے کمالات اور خرق عادات اس سے زائد کہ بیان میں آسکیں اس واسطے اس مختصر میں اس کی گنجائش نہیں دیکھتا اور میرے نزدیک ایسے شخص کی کرامت کا بیان کرنا اس کے رتبے سے کم ہے، کیوں کہ قطبی کا رتبہ اس سے آگے ہے - غرض کہ سالہائے سال تک آپ کی ذات فیض آیات سے یہ عالم معمور رہا۔ اور جو کہ ہر ایک کو اس دارالفنا سے دارالبقا کو چلنا ہے، آپ نے بھی ہفتے کے دن صفر کی بائیسویں ۱۲۲۰ھ میں اس جہان سے انتقال کیا، اور آپ کی خانقاہ میں آپ کے پیر کے پہلو میں دفن کیا انا للہ و انا الیہ راجعون - نوراللہ مضجعہ - آپ کے انتقال کی تاریخ ہے - آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ جس طرح خواجہ بزرگ نقشبند علیہ الرحمۃ کے جنازے پر یہ شعر پڑھے گئے تھے اسی طرح میرے جنازے پر بھی پڑھے جاویں اور وہ شعر یہ ہیں:

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو — شیئاً للہ از جمال روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما — آفرین بردست و بربازوئے تو

اور آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ دو شعر عربی اور فارسی بھی میری جدائی پر بہ الحان خوش پڑھنا۔ شعر عربی :

وفدت الی الکریم بغیر زاد   من الحسنات والقلب السلیم

فان الزاد اقبح من قبیح   اذا کان الوفود الی الکریم

اشعار فارسی

بوسوخاک من بیاخشد ز عشق بر سرا   کز جذبات عشق تو نعرہ زخاک برزنم

بعد ہزار سال اگر برلحد گذر کنی   مشک شود غبار من روح شود ہمہ تنم

جس وقت کہ یہ اشعار پڑھے جاتے تھے ہزارہا آدمی حاضر تھے اور سب لوگ ہائے ہائے روتے تھے اور عجب لطف اور فیض اور کیفیت تھی۔ آپ کے ملفوظات بھی بہت خوب ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ فقیری میں چار چیزیں چاہئیں دو ٹوٹی دو ثابت ہاتھ پاؤں تو ٹوٹے اور دین و یقین ثابت۔ (۱)

====XXX===

تعلیقات :

شاہ غلام علی کا ترجمہ سرسید نے نہایت مفصل اور جامع لکھا ہے جس میں شاہ صاحب کی ولادت، مولد و منشا، طفولیت، تعلیم و تربیت، بیعت رشد و ہدایت، خلافت، مرکزیت و مرجعیت خلائق، فیض روحانی، محاسن سیرت، اخلاق حمیدہ اور تاریخ ولادت تک سوانح و شخصیت اور کمالات کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے البتہ اساتذہ، تلامذہ،

---

(۱) سرسید احمد خان، "آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۲۳-۱۵

تالیفات کے بارے میں تفصیلی اس سے معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ اس لیے آپ کی شخصیت ، کمالات روحانی اور فضائل و محاسن پر مفصل نوٹ لکھنے کی بجائے چند متعلقات کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کردینا چاہتا ہوں -

۱- سرسید نے آپ کی تاریخ ولادت ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ع تحریر کی ہے -(۱) مولانا سید عبدالحی نے بھی ۱۱۵۶ھ سال ولادت لکھا ہے لیکن یہ ان کی اپنی تحقیق نہیں بلکہ بقول خود آں موصوف کے سرسید کا قول ہے " قالہٗ احمد ابن المتقی فی آثار الصنادید"(۲) لیکن سرسید نے جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اس سے ۱۱۵۸ھ نکلتی ہے - " مظہر جود" بھی آپ کی تاریخ ولادت ہے (۳) اس سے بھی سال ۱۱۵۸ھ برآمد ہوتاہے۔ نیز آپ کے خلفا و مریدین میں سے مولانا شاہ عبدالغنی(۴) اور شاہ رؤف احمد مجددی(۵) نیز صاحب تذکرہ نقشبندیہ مجددیہ نے (۶) جو بیک واسطہ شاہ غلام علی نہی مجددی حضرت شاہ صاحب کے مرید ہیں، آپ کی تاریخ ولادت ۱۱۵۸ھ ہی لکھی ہے - مولوی بشیرالدین دھلوی (۷) اور عبدالرزاق قریشی نے(۸) بھی ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ع سال ولادت لکھا ہے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ تاریخ ولادت کے اندراج میں سرسید سے سہو ہوا -

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثار الصنادید"، محولہ بالا ، ص ۱۲
(۲) عبدالحی، مولانا سید ،" نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۵۷
(۳) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، ص
رؤف احمد مجددی(مرتب) ،" مکاتیب شریفہ"، محولہ بالا ، ص ۱
(۴) عبدالغنی شاہ، "ضمیمہ مقامات مظہری"، محولہ بالا ، ص ۳۰
(۵) رؤف احمد مجددی شاہ،" (مرتب) ،" مکاتیب شریفہ"، محولہ بالا ، ص ۱
(۶) محمد حسن نقشبندی مجددی مظہری،" مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا ، ص ۳۰۵
(۷) بشیرالدین احمد دھلوی،" واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۵۳
(۸) عبدالرزاق قریشی، " مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام"، بمبئی : ادبی پبلشرز، ۱۹۶۱ع ، ص ۱۰۶

۲- سرسید نے شاہ صاحب کا مقام ولادت موضع " وٹالہ" امبرسر لکھا ہے جو

در حقیقت مشہور قصبہ بٹالہ ضلع امرتسر ہے - (۱) امرتسر کو امبرسر بھی بولتے ہیں -

۳- شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے -(۲)

۴- سرسید نے صرف مرزا مظہر جان جاناں سے کسب فیض اور آپ کے دست حق

پرست پر بیعت اور خلافت کا ذکر کیا ہے - لیکن شاہ صاحب نے مرزا صاحب کے علاوہ دوسرے

مشائخ سے بھی اکتساب فیض اور متعدد اساتذہ سے تحصیل علم کیا تھا۔ " آثارالصنادید"

اس باب میں خاموش ہے - بلاشبہ شاہ صاحب کے مشائخ میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں

کو ایک بلند مقام حاصل ہے (۳) لیکن حضرت جان جاناں سے قبل آپ نے شاہ ضیاء اللہ

شاہ عبدالعدل (خلفائے خواجہ محمد زبیر مجددی) ، برادر خواجہ میر درد اور فرزند

خواجہ شاہ ناصرالدین) ، مولانا فخرالدین محمد جہان دہلوی اور شاہ غلام سادات صابری

(والد سیدصابر علی شاہ) مشائخ دہلی کی صحبت میں حاضر رہ کر بہت کچھ استفادہ

کیا تھا -(۴)

شاہ صاحب کے اساتذہ میں اصحاب ثلاثہ کے علاوہ آپ کے پیر طریقت مرزا مظہر جانجاناں

---

(۱) عبدالغنی مجددی، شاہ : ضمیمہ مقامات مظہری"، محولہ بالا ، ص ۱۳۰
رؤف احمد مجددی، شاہ (مرتب) : مکاتیب شریفہ"، محولہ بالا ، ص ۱
محمد حسن نقشبندی مجددی ، مولوی، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا ، ص۳۰۵

(۲) ایضاً ، ص ۳۰۶
ایوب قادری ، محمد (مرتب ومترجم) : تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۶۵
عبدالرزاق قریشی ، " مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام"، محولہ بالا،ص ۱۰۷

(۳) محمدحسن نقشبندی مجددی : مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا ، ص ۳۰۶
ایوب قادری ، محمد (مرتب ومترجم) : تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۶۵
عبدالرزاق قریشی : مرزا مظہر جان جاناںاور ان کا اردو کلام"، محولہ بالا ، ص ۱۰۷

(۴) محمد حسن نقشبندی مجددی : مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا ، ص ۳۰۶
اختر دہلوی ، مرزا محمد : تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان"، محولہ بالا ، ص ۳۳۶

اور حاجی محمد افضل کا نام بھی آتا ہے - مولانا محمد میاں نے شاہ صاحب کو اصحاب ثلاثہ کے تربیت یافتہ علمائے دین میں شمار کیا ہے - (۱) عبدالرزاق نے اصحاب ثلاثہ کے ساتھ مرزا صاحب علیہ الرحمۃ کا نام بھی لیا ہے - فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب نے حدیث کی سند فرزندان حضرت شاہ ولی اللہ اور مرزا مظہر سے لی تھی -(۲) " ارواح ثلاثہ" کی روایت میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کا نام آیا ہے -(۳) " رود کوثر" میں ان کا شمار شاہ عبدالعزیز کے نامور اور صاحب علم و فضل تلامذہ میں آپ کا نام آیا ہے -(۴) خلیق احمد نظامی نے حدیث کا استاد حافظ محمد افضل سرہندی کو لکھا ہے - نظامی صاحب کہتے ہیں :" کہ شاہ صاحب نے حدیث کی سند امام المحدثین حافظ محمد افضل سے جو مرزا مظہر جان جاناں کے بھی استاد تھے ، حاصل کی تھی- (۵) شاہ صاحب کے یہ تمام اساتذہ حدیث اور درجہ تکمیل کے ہیں- ان حضرات کے علاوہ ان کے کسی استاد کا علم نہیں ہوتا کہ انہوں نے قرآن مجید اور عربی و فارسی کی ابتدائی درسی کتابیں کس سے پڑھی تھیں-

۵- شاہ غلام علی حافظ قرآن مجید(۶) اور حدیث کے بڑے زبردست عالم تھے-(۷) وہ اپنی خانقاہ میں حدیث و تفسیر کا درس بھی دیا کرتے تھے -(۸) آپ کے نامور خلیفہ

---

(۱) محمد میاں ، مولانا :" علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۵
(۲) عبدالرزاق قریشی ، " مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام"، محولہ بالا ، ص ۱۰۷
(۳) اشرف علی تھانوی ، مولانا ، " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۱۶۷
(۴) اکرام ، شیخ محمد :" رود کوثر"، کراچی: تاج آفس ، س ن ، ص ۳۹۰
(۵) خلیق احمد نظامی ، " تاریخی مقالات"، محولہ بالا ، صص ۱۷-۲۱۶
(۶) عبدالرزاق قریشی ، " مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام"، محولہ بالا ، ص ۱۰۷
(۷) خلیق احمد نظامی ، " تاریخی مقالات"، محولہ بالا ، ص ۲۱۶
(۸) عبدالرزاق قریشی ، " مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام"، محولہ بالا ، ص ۱۰۷

شاہ رؤف احمد مجددی لکھتے ہیں کہ " آپ نہایت پابندی کے ساتھ فجر اور ظہر کے بعد طلبہ کو تفسیر و حدیث کا درس دیتے تھے" - (۱) شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے" کہ تین کتابیں ایسی ہیں جن کی نظیر نہیں - کلام اللہ ، بخاری اور مثنوی مولانا روم -(۲)

۲- شاہ صاحب کے خلفا و مریدین کی تعداد کے بارے میں شاہ رؤف احمد مجددی کا بیان ہے کہ آپ کے ایک ہزار کے قریب خلفا اور لاکھوں مرید تھے -(۳) ان میں سے خاص خاص خلفا یہ ہیں :

" شاہ ابوسعید اور آپ کے دو بیٹے شاہ احمد سعید اور شاہ عبدالغنی اور آخری شہر مظہر کا تو سرسید نے خود ترجمہ لکھا ہے اوراس تذکرے کی شخصیات میں شامل ہیں- ان کے علاوہ شاہ رؤف احمد ، بشارت اللہ بہرائچی ، شیخ خالد کردی ، مرزا عبدالغفور بیگ خوریدوی ، مولانا عبدالرحمن شاہجہان پوری ، شاہ سعد اللہ ، مولانا محمدجان ، مرزا رحیم اللہ بیگ مسمی بہ محمد درویش ، مولانا غلام محی الدین قصوری کے نام تو " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" سے معلوم ہوجاتے ہیں-(۴) شیخ احمد کرد اور سید اسمعیل مدنی کا اضافہ " مکاتیب شریفہ" سے ہوتا ہے-(۵) صاحب" تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان" نے اسی فہرست میں شیخ احمد اصغر ، مولوی کرم محدث دھلوی ، ملا عبدالغفور اور مولانا محمد حسین کرادوی کے مزید ناموں کا

---

(۱) رؤف احمد مجددی ، مولانا شاہ محمد " جواہر علویہ " (ملفوظات حضرت شاہ غلام علی) لاھور : اللہ والے کی دوکان ، س ن ، ص ۳۲-۱۳۳

(۲) ایوب قادری ، محمد (مرتب) " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) " ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲۵۸

(۲) رؤف احمد مجددی ، " جواہر علویہ" ، محولہ بالا ، ص ۱۵۲

(۳) رؤف احمد مجددی ، مولانا شاہ محمد " جواہر علویہ" ، محولہ بالا ، ص ۲۳۱

(۴) محمد حسن نقشبندی ، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" ، محولہ بالا ، ص ۲۲۰ ، ۲۲۵ ، ۲۲۸ ، ۲۷۱ ، ۲۷۳-۷۹ و ۷۷-۲۸۲

(۵) رؤف احمد مجددی ، شاہ (مرتب) " مکاتیب شریفہ " ، محولہ بالا ، ص ۲۰۱

اضافہ کیا ہے -[1] آپ کے خلفا کے چند نام "تذکرہ علمائے ہند" میں بھی آئے ہیں۔ لیکن اس فہرست میں صرف قطب الہدیٰ کے نام کا اضافہ ہوتا ہے -(۲) سید ابوالقاسم ابن مہدی حسینی واسطی کا نام "نزہتہ الخواطر" میں ملتا ہے - (۳)

یہ تمام خلفا اپنے علم و فضل اور سلوک و طریقت میں اپنا بہت بلند مقام رکھتے تھے ان کی بدولت شاہ صاحب کا فیضان نہ صرف ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچ گیا بلکہ حجاز ، روم وغیرہ میں بھی آپ کی بزرگی کی دھوم مچ گئی - مولانا عبیداللہ سندھی نے انہیں تیرھویں صدی ہجری کا مجدد لکھا ہے - مولانا فرماتے ہیں :

"حضرت شیخ غلام علی عرف عبداللہ مجددی مظہری "مجدد مائتہ ثالث عشر" شمار ہوتے ہیں - دہلی کی خانقاہ مجددیہ انہیں کے نام سے آباد ہے - آپ کی ذات سے اس قدر فیض جاری ہوا کہ بقول شاہ عبدالغنی دہلوی شاید ہی اگلے مشائخ میں کسی سے اس قدر فیض ہوا ہو۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا شہر تھا جہاں آپ کا کوئی خلیفہ نہ ہو۔ صرف ایک شہر ادہالہ میں آپ کے پچاس خلفا تھے-" (۴)

مولوی محمد حسن نقشبندی مجددی نے آپ کے فیضان علمی و روحانی کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اس قدر فیض آپ کے حین حیات میں آپ سے جاری ہوا کہ شاید کسی مشائخ سے ان کی زندگی میں جاری ہوا ہو۔ ہندوستان ، کابل ، بلخ ، بخارا ، عرب ، روم سب جگہ آپ کے خلیفہ پہنچ گئے تھے اور طریقہ ان سے جاری ہوگیا تھا۔ حضرت مولانا غلام محی الدین قصوری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے

---

(۱) اختر دہلوی ، مرزا محمد ، " تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان" ، محولہ بالا ، ص ۳۵۲
(۲) ایوب قادری ، محمد (مرتب) " تذکرہ علمائے ہند" ، محولہ بالا ، ص ۳۹۳
(۳) عبدالحی ، مولانا سید " نزہتہ الخواطر" ، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۳۵۸
(۴) عبیداللہ سندھی " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک " ، محولہ بالا ، ص ۱۹۳

کہ ایک روز عصر میں حاضر تھا - حضرت شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمارا فیض دور دور تک پہنچ گیا ہے - حضرت مکہ معظمہ میں ہمارا حلقہ بیٹھتا ہے- حضرت مدینہ منورہ میں ہمارا حلقہ بیٹھتا ہے ، بغداد شریف اور روم و مغرب میں ہمارا حلقہ جاری ہے اور بطریق ہنسی فرمایا کہ بخارا تو ہمارے باپ کا گھر ہی ہے -" (۱)

۷- سرسید نے آپ کی تاریخ وفات ۲۲ صفر ، ۱۲۴۰ھ بروز ہفتہ بیان کی ہے -(۲) شاہ عبدالغنی مجددی اور شاہ رؤف احمد مجددی نے بعد " اشراق" وفات کا وقت بھی بتلادیا ہے - (۳) " نورالله مضجعه" سے آپ کا سال وفات برآمد ہوتا ہے - (۴) اس شعر سے آپ کی ولادت اور وفات دونوں کی تاریخ نکلتی ہے :

" سالِ تولید و حیات و فوت آں سلطان پاک

" مظہر جود" و امام " مظہر یزدان پاک" (۵)

شمسی تقویم کے حساب سے آپ کی تاریخ وفات ۱۶ اکتوبر، ۱۸۲۴ع ہوتی ہے - محمد عالم فریدی نے شاہ صاحب کی تاریخ انتقال ۱۲ صفر، ۱۲۴۰ھ (۶) لکھی ہے لیکن یہ غلط ہے - شاہ رؤف احمد مجددی خلیفہ حضرت شاہ صاحب اور سرسید کے مقابلے میں محمد عالم فریدی کا بیان قبول نہیں کیا جاسکتا- صاحب " نقشبندیہ مجددیہ" کے مطابق آپ

---

(۱) محمد حسن نقشبندی مجددی، مولوی، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا ، ص ۳۰۷
(۲) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۲۲
(۳) عبدالغنی مجددی، شاہ" ضمیمہ مقامات مظہری"، محولہ بالا ، صص ۵۸-۱۵۷
رؤف احمد مجددی، شاہ (مرتب) " مکاتیب شریفہ"، محولہ بالا ، ص ۱
(۴) محمد حسن نقشبندی مجددی" مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا ، ص ۳۳۹
ایوب قادری، محمد (مرتب و مترجم) " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۶۴
عبدالرزاق قریشی" مرزا مظہرجان جاناں اور ان کا اردو کلام"، محولہ بالا ، ص ۱۰۸
(۵) رؤف احمد مجددی، شاہ (مرتب) " مکاتیب شریفہ"، محولہ بالا ، ص ۱
ایوب قادری، محمد (مرتب و مترجم) " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲۵۸
(۶) محمد عالم شاہ فریدی" مزارات اولیائے دہلی"، دہلی : جید برقی پریس، ۱۳۴۲ھ ص ۱۲۷

کی نماز جنازہ جامع مسجد دہلی میں حضرت شاہ ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ نے پڑھائی - بعد ازاں حسب وصیت جنازہ کو آثار شریفہ میں لے گئے اور وہاں سے لاکر حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید کے پہلو میں دفن کیا گیا -(١)

٨- سرسید کے بیان کے مطابق نواب امیر محمد خان کے جواب میں جو شعر آپ نے لکھا تھا ، اس کے بارے میں یہ صراحت غیر ضروری نہ ہوگی کہ شاہ صاحب نے اپنے خلیفہ مولانا شاہ رؤف احمد مجددی سے فرمایا تھا کہ امیر موصوف کو جواب میں یہ شعر لکھ دو:

" ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم

باامیر خان بگوی کہ روزی مقرر است "(٢)

شاہ صاحب کا وقت کی سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انھوں نے کسی دربار سے ایسا تعلق بھی نہ رکھا تھا کہ کسی امیر کا کوئی نذرانہ قبول کریں لیکن انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو وہ بھی محسوس کرتے تھے اور ان سے تعلقات اور ان کی ملازمت کے ذریعہ معیشت کو وہ جائز نہیں سمجھتے تھے - اس باب میں خانقاہ والوں کا جو عمل تھا وہ ہم شاہ احمد سعید پر نوٹ میں بیان کیا جا چکا ہے - جو بات خاص شاہ غلام علی کے فکر اور سیرت کے بارے میں ہے - اس پر مولانا ابوالکلام آزاد کے اس بیان سے روشنی پڑتی ہے - مولانا لکھتے ہیں :

" جب انگریزی حکومت پر کچھ عرصہ گزرچکا تو انگریزوں کی کوششیں جو وہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی تالیف قلب کے لیے برابر کیے جارہے تھے بہت کچھ کام یاب ہونے لگیں - حتی کہ وہ وقت آگیا ، خود شاہ (عبدالعزیز)

---

(١) محمد حسن نقشبندی مجددی ، مولوی " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ "محولہ بالا ، ص ٣٣٩

(٢) رؤف احمد ، شاہ (مرتب) " جواہر علویہ (ملفوظات حضرت شاہ غلام علی) " ، محولہ بالا ، ص ١٣٦

خلیق احمد نظامی ، پروفیسر " اوراق مصور۔ عہد وسطی کی دلی " ، دہلی : دہلی یونی ورسٹی ، ١٩٧٢ع ، ص ١٠٣

صاحب تیار ہوگئے کہ اپنے داماد مولوی عبدالحی کو مرشد کے منتقل ہونے کی اجازت دے دیں اور مدرسہ عزیزی کی طرف سے ان کا نام پیش کریں۔ اس وقت شاہ غلام علی خانقاہ والے زندہ تھے - انھوں نے جوں ہی یہ بات سنی نہایت درجہ کبیدہ خاطر ہوئے اور شاہ صاحب کے نام خط لکھ کر اظہار تعجب کیا -" (۱) سرسید کو شاہ صاحب سے جو عقیدت اور ارادت تھی وہ شاہ صاحب کے ترجمے کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے - سرسید کی خواہش تھی کہ ان کی لائف میں اس تعلق کا اظہار خاص طور پر کیا جائے -(۲)

سرسید کے والد ، والدہ اور بڑے بھائی شاہ صاحب سے بیعت تھے -(۳) سرسید کا نام احمد اور ان کے بڑے بھائی کا نام محمد شاہ صاحب ہی نے رکھا تھا - سرسید شاہ صاحب کو دادا حضرت کہتے تھے اور سرسید کی تعلیم کی بسم اللہ شاہ صاحب ہی نے کی تھی۔ حالی نے ان تمام روایات کو جو انھوں نے سرسید سے سنی تھیں "حیات جاوید" میں مرتب کرایا ہے - حالی لکھتے ہیں :

" سرسید پیدا ہوئے تو ان کے والد نے شاہ غلام علی صاحب سے نام رکھنے کی درخواست کی - شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمد رکھا تھا اور ان کا نام احمد رکھا - سرسید کے دادا ان کے والد کی شادی ہونے سے پہلے انتقال کرچکے تھے اور ان کے بہن بھائی شاہ صاحب ہی کو دادا حضرت کہا کرتے تھے - سرسید کہتے تھے کہ شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی ہی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے - شاہ صاحب نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالی نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن متقی کی اولاد کی محبت ایسی دے دی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بے چین کردیتی ہے -" (۴)

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول: "نقش آزاد"، محولہ بالا، ص ۳۱۲

(۲) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب): "مقالات سرسید"، محولہ بالا، حصہ پانزدہم، ص ۱۸۱

(۳) حالی، الطاف حسین: "حیات جاوید"، محولہ بالا، حصہ اول، صص ۱۸، ۲۹، ۳۲

(۴) ایضاً، حصہ اول، صص ۳۵-۳۴

آگے چل کر سرسید کا بیان ان کی بسم اللہ کی تقریب کے بارے میں نقل کرتے ہیں۔
سرسید لکھتے ہیں :

" مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے - سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے - خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے مجھ کو لاکر حضرت کے سامنے بٹھادیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ھکا بکا سا ہوگیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم - مگر میں کچھ نہ بولا - اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انھوں نے اٹھاکر مجھے اپنی گود میں بٹھالیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور اول بسم اللہ پڑھ کر اقرا کی اول کی آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں - میں بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا۔ "

سرسید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انھوں نے کبھی کہا تھا ، پڑھا :

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی
ز فیض نقشبند وقت و جان جان جانانی

سرسید کہتے تھے کہ شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔ الاماشا اللہ - صرف میرے والد پر جو غایت درجے کی شفقت تھی اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔" (۱)

مولانا حالی نے ایک اور جگہ شاہ صاحب سے سرسید کی عقیدت کی نوعیت کا ذکر کیا ہے - مولانا حالی لکھتے ہیں کہ سرسید نے ایک دفعہ شاہ غلام علی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے سامنے یہ کہا تھا کہ :

" گو اس قسم کی عقیدت جیسی مُریدوں کو اپنے شیخ کے ساتھ ہوتی ہے ،

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید"، محولہ بالا ، حصہ اول ،ص ۲۱-۲۰

مجھ کو نہیں ہے لیکن نہایت قوی تعلق اور رابطۂ اخلاص میرے دل میں شاہ صاحب کے ساتھ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میری لائف میں اس کی تصریح کردی جائے۔

میں نے جو ایک رسالہ موسوم بہ "نمیقہ" بزبان فارسی تصور شیخ کے بیان میں ہے ، اسے شاہ احمد سعید صاحب کو دکھایا تھا ۔ انھوں نے اس کو دیکھ کر یہ فرمایا کہ جو باتیں اس میں لکھی گئی ہیں وہ اہل حال کے سوا کوئی نہیں لکھ سکتا۔ پس یہ اس توجہ کی برکت ہے جو شاہ صاحب کو تمہارے ساتھ تھی اور اب تک ہے ۔" (۱)

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی شاہ صاحب سے سرسید کی عقیدت اور وارفتگی کے ذکر جمیل کے بارے میں اپنا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں :

" سرسید کا بچپن بھی خانقاہ مظہری میں بسر ہوا ۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب کی صحبت کا اثر ان کے قلب و دماغ پر آخر تک قائم رہا۔ خود تجربہ ہے کہ آخری عمر میں بھی باوجود گوناں گوں مصروفیتوں کے جب شاہ صاحب کا ذکر چھڑ جاتا تو گھڑیوں اس میں محو رہتے ۔ ایک بار میں نے گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ پورے پینتالیس منٹ تک شاہ صاحب کا ذکر کرتے رہے تھے ۔" (۲)

جس زمانے میں سرسید سورہ یوسف کی تفسیر لکھ رہے تھے انھوں نے اپنے خواب بھی تحریر کیے تھے جو انھوں نے زندگی کے مختلف ادوار میں دیکھے تھے اور ان کے دل پر ان خوابوں کا کسی نہ کسی طرح اثر پڑا تھا۔ ان خوابوں سے بقول مولانا حالی" صاحب خواب کے نفس کی حالت کا کچھ سراغ لگتا ہے ۔" ان خوابوں میں متعدد خواب شاہ غلام علی کے بارے میں ہیں اور ان سے شاہ صاحب سے سرسید کی عقیدت کا حال معلوم ہوتا ہے۔"(۳)

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا ، ضمیمہ نمبر۳، " سرسید کے چند خواب"، ص۔ ۱۳-۱۲
اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، حصہ پانزدہم، ص۔ ۱۸۱

(۲) حبیب الرحمن خان شروانی،" سرسید کی تعلیمی جد و جہد" (مقالہ) ، " برگ گل"، کراچی: اردو کالج ، ۶۹-۱۹۶۸ء، "سرسید نمبر"، ص۔ ۶۸

(۳) حالی، خواجہ الطاف حسین،" حیات جاوید"، محولہ بالا ،ضمیمہ نمبر۳، ص۔ ۱۳-۱۰
اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید"، محولہ بالا ،پانزدہم، ص۔ ۸۱-۱۷۷

آپ کی علمی یادگار میں " مقامات مظہری" حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے ملفوظات کا مجموعہ بہت مشہور ہے ۔" مکاتیب شریفہ" مرتبہ شاہ رؤف احمد مجددی کے نام سے آپ کے ۱۲۷ مکاتیب کا مجموعہ/ اور " ذکرالمعارف" اور جواہر علیہ " کے نام سے آپ کے ملفوظات کے دو مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ یہ دونوں مجموعے بھی شاہ رؤف احمد نے مرتب کیے ہیں۔ " کلمات طیبات " میں بھی شاہ ابوسعید کے نام آپ کے تین خط موجود ہیں۔

سرسید نے آپ کو مشائخ عظام شمار کیا ہے اور اسی لیے کبار مشائخین میں سب سے پہلے آپ ہی کا ذکر کیا ہے لیکن یہ آپ کی شخصیت کا کل نہیں بلکہ نمایاں اور غالب پہلو ہے ۔ سرسید نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ نماز اشراق کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہوتے تھے اور یہ سلسلہ نماز ظہر تک جاری رہتا تھا۔ اور نماز ظہر کے بعد پھر درس و تدریس ، حدیث و تفسیر و فقہ اور کتب تصوف میں مشغول ہوتے تھے اور یہ سلسلہ نماز عصر تک جاری رہتا تھا۔ نیز سرسید لکھتے ہیں :

" علم حدیث اور تفسیر نہایت مستحضر تھا ۔ اگر باعتبار علوم نقلی خاتم المحدثین و المفسرین تعبیر کیا جائے تو بھی زیبا ہے اور اگر باعتبار علوم عقلی سرآمد فلسفیان متقدمین اور متاخرین لکھا جاوے تو بھی بجا ہے۔"(۱)

مولانا عبدالحی نے بھی ٹھیک انہیں معلومات اور خیالات کا اظہار کیا ہے ۔(۲) اس لیے ہم نے آپ کے ان کمالات کی بنا پر اصحاب درس و تدریس اور علمائے دین کے سلسلے میں شامل کیا ہے ۔

====xxx====

جناب مولانا سلمہ اللہ تعالی مخدومنا مولوی فضل حق :

مستجمع کمالات صوری و معنوی جامع فضائل ظاہری و باطنی ، نقاد بدائع

---

(۱) سرسید احمدخان:" آثارالصنادید"، محولہ بالا ، ص ۱۳-۱۲

(۲) عبدالحی ، مولانا سید :" نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۳۵۷

فضل و افضال بہار آرائی چمنستان کمال، ملکی ار ایک اصابت رائی مسندنشین دیوان افکار
رسائی، صاحب خلق محمدی مورد سعادات ازلی و ابدی، حاکم محاکم مناظرات فرمان روائی
کشور محاکمات، فکر آئینہ صافی ضمیری ثالث اثنین بدیعی و حریری، المعی وقت و لوزعی
آوان فرزدق عہد و لبید دوران، مبطل باطل و محقق حق مولانا محمد فضل حق - یہ حضرت
خلف الرشید ہیں جناب مستطاب مولانا فضل امام غفراللہ المنعام کے، اور تحصیل علوم عقلیہ
اور نقلیہ کی اپنے والد ماجد کی خدمت بابرکت سے کی ہے - زبان قلم نے ان کے کمالات
پر نظر کرکے فخر خاندان لکھا ہے اور فکر دقیق نے جب سرکار کو دریافت کیا فخر جہان
پایا - جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہیں کی فکر
عالی نے بنا ڈالی ہے - علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال
کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کرسکیں - بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانہ فن
سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا دعوئ کمال کو فراموش کرکے نسبت شاگردی کو
اپنا فخر سمجھے - با اینہمہ کمالات علم ادب میں ایسا علم سرافرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت
کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا
دست آویز بلندی مدارج ہے - سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایۂ خوش بیانی اور امراء القیس
کو ان کے افکار بلند سے دستگاہ عروج معانی - الفاظ پاکیزہ ان کے رشک گوہر خوش آب،
اور معانی رنگین ان کے غیرت لعل ناب - سرو ان کی سطور عبارت کے آگے پابہ گل اور گل
ان کی عبارت رنگین کے سامنے خجل - نرگس اگر ان کے سواد سے نگاہ کو ملا دیتی، مصحف
گل کے پڑھنے سے عاجز نہ رہتی، اور سوسن اگر ان کی عبارت فصیح سے زبان کو آشنا کرتی،
صفت گویائی سے عاری نہ ہوتی دل متردد ہے کہ اگر ان اوصاف نامحصور کا شمار بھی ہوسکا
تو ظرف تنگ سخن میں کیونکر گنجائش ہوگی، اور بالفرض اگر حوصلہ سخن میں بھی سمایا
قلم فرسودہ زبان اتنا طول لسان اور کاغذ بے چارہ اس قدر وسعت کہاں سے لائے - اور علاوہ

اس کے اندیشہ اپنی جان پر لرزان ہے کہ اس سرخیل سرکردگان روزگار کے اوصاف جمیلہ میں سے مثلاً بلندی شان کے مدح کے درپے ہو تو بالضرور تلاش معنی بلند میں منتہائے عالم بالا کی طرف صعود کرنا چاہئیے ، اگر خدا ناخواستہ ایسے مقام سے پاؤں رپٹا تو گو کہ جس جگہ گرے گا وہ بھی معنی بلند ہی ہوگا ، لیکن از بس کہ اس سے اس تک ہزار رسالہ راہ بالا ہے ، اس بے چارگی پا و سر کے خیریت کا کھٹکا نہیں لگتا ۔ ناگزیر عنان تفکر کو اس وادی بے منتہا سے پھیر کر کچھ حال سعادت اشتمال لکھتا ہوں۔ ولادت میمنت آمود آپ کا ۱۲۱۱ھ میں ہوا ہے۔ سبحان اللہ وہ کیا زمانہ سعید اور وقت سعید تھا۔ ایسے طالع پر عطارد کو غیرت ہے اور اس کی سعادت پر مشتری کو حسرت ۔ اب سن شریف آپ کا ساٹھ تک پہنچا۔ گو طبیعت کو ویسی ہی رسائی اور ذہن کو ویسی ترقی ہے ۔ اس ترقیات روزافزون کے ساتھ یہ آرزو ہے کہ ایسے صاحب کمال کے خزانۂ عمر میں بھی ترقی روز بہ روز عطا ہو ۔ آمین رب العالمین ۔ اگرچہ آپ کا کلام لطیف اور سخن پاکیزہ حد تحریر سے افزون ہے، لیکن ناظرین کتاب کے واسطے تھوڑے اس میں سے درج قرطاس کرتا ہوں ۔

نثر عربی

اما بعد فان الدنیا غرور مالہا قرور، بل قرورھا سرور و ظلہا حرور، لایوازی ھموھا سرورھا ولایوازن خیورھا شرورھا ، ولاتکافی معا فاتہا و آفاتہا ولا تنافی افراجہا و اتراحہا ، ولا محنہا و راحتہا۔ ولا یتلا فی سمومہا نعیمہا ولا سمومہا نسیمہا ، ولا شکہا رخاءھا ولا زعزعہا رخاءھا ، تر یاقہا ثمالہا و فصادہا کمال۔ عافیتہ عافیتہا اوصاب وحلیہا وسلبہا حلاقم اوشاب ، اولہا صبور و آخر ھا ثبور، وصفاتہا غبار و بقاءھا عبور، واھلو ھا بور و قصور ھم قبور، کل من فیہا موموس و کل ماعمر فیہا مطموس، وکل من الحی و ان ثری فان مصیرہ الی الثری، مبادیہا آمال و مقاد عواقبہا آجال ، مدانا فیہا من صفو عیش الآ و قد یکدرہ دوازل الاحداث،

وما عليها من ذي نفس و نفس الّا وحواة منازل الاجداث - الا ان البقاء مستحيلة فان الدنيا محال مستحيلة، لا يمضي من حوالها و تغير احوالها جهلة - فصبا و شباب و شيبة و تباب، واتراب ، واتراب و لهو و اتراب ثم فقر و ارتاب ثم فقر و اتراب - يقتضي ثم يمحون/ مايقتنون، فكل مايمتنون به انفسهم منون و كل مايتخذون بزيحيه العابنون، و ريب القاطن فانما للمحنى مايبنون، و للخراب مايبنون، وليترك اموالهم و البنون - لا يمضي فاننا عند فراقه بنفسه فواق ، ولا يقيه من فراقه ابداء ادمعه و انشارجدسه واق - ولا يجديه عند بلوغ التراق و حضور القاطن و الراق آس ولاراق - لايفيد المرء عند عمامه حميم ولا يزيد العمر عند تمامه تميم - والناس لاجل الامل للاجل ناسون و يحلّ الحلل يواسون، حولا يرتون ادياسون ثم عند الياس ماسون، ثم لايقاس مايقاسون، مايلون بانثلون خيالهم ولا يعلمون فسوف يعلمون - ارى الموت لقيام الكرام و يخصّ الخاصة بالاخترام - فكم اغتال مثلاً وعداً يعقب عديلا ، وكريما بدلا لم تخلف بديلا - "سنة الله التى قدخلت من قبل ولن تجد لسنة الله تبديلا" - كلّا بل السامّة طامّة ، عامّة غامّة ، والسامّة بل لا تذر هامّة ، وهامّة "كل من عليها فان" - فالنبات من ثبات ، ولا لحيوان من دوام - ولا تابيد للاّو ابد ، بل ليست الخوالد بخوالد - فما نشأ ناشئ الاهوى، وما انشاء بناءٌ الا خوى، وما زهرنجم الاهوى، وما نجم زهرالاذوى - ولعالم تدم بسايط العناصر على حال ، بل لايزال يستحيل بعضها بعضا كالنار هواءً والهواء ماءً والماء ارضا - فالمركبات التى منها تخلق بالبلى - والخلوقة اخلق واسرعها الى البوار، ما اتفق اجتماعه من مااختلف من المواد - واقربه الى الفناء ما خصّ بالتوليد والا نماء ، والاغتذاء من الارض والماء - واسبقه الرمس ما اعطى قوة اللمس - واخصّه باخترام المنيّة ، من خصّ الداخية المجرّدة السنية ، والبهيمة و الواهية ، المطرّوة الدنية - فالنفس متطلعة الى الاوصال ، والاثية مشروكة الى الانحلال ، فلابدّ له من التبدوالا ضمحلال و ماله بالاحتيال من الاغتيال مجهر و محيد ، فلن يجد عند مايفيد و مايفيد -

ولن يفيد مايتردى اذا تردّى ، فاذا جاء الردى لن تستطيع له ردّاً – فالقضاء حكم حتم لا يحوله حول و حزم ، فانّما سمى الموت يقيناً لانّه حق جزم – فليس امره لبشر مقدوراً ، و انما هو امر الله « وكان امر الله قدراً مقدوراً » – بل ما من صفو او تكدير اوقدراً و تقدير، الا وهو بتقدير عزيز قدير لا بتدبير و تقدير – واذا القضاء لا يرد ، فالرضا به اليق – والانسان ، كما قال عزّ من قائل ، « خلق هلوعاً ، اذا مسّه الشر جزوعاً و اذا مسّه الخير منوعاً » – لكنّه سبحانه خصّ خواص عباده بالاستثناء ، وكرمهم بذكرهم فى اثناء آيات كلامه بالاثناء ، واعد حسن الجزاء بازاء حسن العزاء – و عد الاجر الجزيل من اداء الصبر الجميل، واصاب من اداب الله و تاب عند خطب ناب ، فما اصاب من جزع بما اصاب ، فمن نحب نحباً لن يقضى نحبا ، ولن يدفع نحباً –

و من تجمل بالاصطبار و تحمل عند الاختبار، و تأسى بالاعتبار فقد تأسى بكبار الاخيار فى حسن الاختيار – والجزع ينقلب عجزاً و زعجاً و الصبر يستوجب فرجاً و يعلى درجا – و من تأسى و بالا و بيلا ، لم يجد سوى التجلّد سبيلا ، ومن لم يستطع جلداً عندما كابد كبداً لم يفلح ابدا – فاصبر صبراً جميلا و ان كان رزء اصابك جليلا – فان الوالد اذا ترك مولوده لا يترك له مجلوده –

و اذا تألم ازل مذ انقضت بحياته اشفق على مسماة و تدبى خير فراقه الى ان بصفاته – فيا الله أي خير ذهب به الوفاة فأي خير ذهب وفات ، وأي بار بار و أي سار سار وأي ضار ضار – فقد كان من الثقات الاثبات والدعاة الهداة يعامل بالصالحات و يحامل بالمواسات ، و يتعدى عن التعدى والمعادات ، متحليا باحسن العادات ، مترددا الى الالتفات والسعادات مواظبا على العبادات و الباقيات الصالحات – فلو اباح الشارع التوجع والتفجع مكروباً كان الندب الى ندب مثل ذلك/المندوب مندوبا – لكن الحمد لله على انه خلف خلفا اعلى منه زلفا واسنى منه شرفاً والاّ نجع الناس نفسهم عليه اسفا – فكيف يكون المولى الداهية فما اصابه من الداهية –

فالبشر على البشر مفطور وانه لذو صبور، لكن الحيوة الدنيا عند اهل الزهد، والزهد زور فزور، و انت تعلم يامولاي ان الصابر ماجور، و ان الجازع مازور، فلم الامر القادر المقدر ، و اصبر على

ما اصابك * ان ذلك لمن عزم الامور -* خلف الله عليك و خلف عليك بخير ابقاك دو ذاك كل ضرر و ضير والسّلام -

xxxx

قصيدة

لا تصبحّ بهوى بيض اماليد — والخمر الموت في اجفانها السود

في غمز الحاظها فتك الاسود وان — حاكين ريم الفلا بالطرف والجيد

قد خاب من غازل الغزلان كمأ مليها — و باد من رام انس الريم في البيد

دع المراشف و استعذ بهن ففي — تلك العذاب عذاب غير مردود

لا تنتظر نظرة من احور برح — ولا ترجّ سوى ابخل من الجود

كم في هوى الحور من حور و كم يهوى — دواعس الطرف من همّ و تسهيد

فلا يو و فتك لين في معا طفها — ان القلوب لعن اقسى الجلا ميد

يبكي المشوق بعبرات موردّة — ما في مباسمها من حسن توريد

بشر البشير نذير بالعذاب فلا — تشروك غرة غرس منهاً غيد

الظلم ظلم كما عدل القوام فكم — حبيب بجفوة عدل القد مقدود

ان المقاتل يقتلن المقاول ولا — يعشقن مقتوليهن المهلك الموذى

اشفار عنّ شفار بل احدّ ظباً — دمرسل الصدغ احبول التقيّد

فيهنّ قبل الصابى ذل [struck out] مبتهل — و بعد صهد المعنّى غرة الصيد

لا ضحو قطّ لطفين بصرعه — مالى ضيى الغشاوى من عرابيد

قد صاد في دابل يرمى بلا خطاء — ويلاه من عامد في قتل معمور

سود فمود بمحرور و بمتقضب — من صارم اللحظ في الاجفان مغمود

اللحظ فى الجفن مثل الظلمات ولا   تغضى القواضب الاعداء تجريد
لا يقضب السيف الا ازلتين وما   لقاضب اللحظ من [illegible] و تحديد
حسناء ضمت شتات الحسن لجمعه   فبدت شمل عقلى اى تبديد
قسيمة القلب والا عطاف لينة   جسم كماء له قلب كجلمود
اذا تجلت يخر المجتلى صعقاً   خرور موسى فريق الطور اذ نودى
سبت فوادى بخديها فليس له   فادوان كان يفدى اكل مصفود
هندية هند تعى ثم عكت اذ   سهاف خلطاً لقتلى اى تهديد
مالت على بقد عادل و جفت   و فترت بفتور الطرف مجلودى
لم انسها اذا لت بى بحج و جنى   كانها بدر تم فوق املود
متى نمت فوادى و اخلفت و شفت   مثت فتقت بانجاز المواعيد
عادت قلبى ثم عادت وهى عايدة   فعاد عيد سقامى موسم العيد
ماست تجرر شوى ذيلها مرحاً   فاودت حبيب صبرى اى تقديد
شفت سقامى من حمر الشقاوة من   عذب الرضاب بعتاب و تنديد
رشفت و ارتشفت خمر الرضاب كما   سقيتها و سقتنى ماء عنقود
ثم انتشينا فلا ندرى أ ذلك من   خمر المراشف ام من خمر را قود
و طبت روحاً بر ياها و ناظرة   بحسنها و سماعاً بالا ناشيد
ثلاثة هى طيب العيش ما جمعت   الا لمرء سعيد الجد محسود
وصل الغوانى و كاس البابلى وربما   ت الا غانى بضرب الوتر والعود
ما أ طيب العيش لولا ان موجده   حتماً قريب الى قبر و ملحود
صرفت ريعان عمرى فى هوى ورد   و ما لذلك من عذر و تمهيد
فلا ملاذ سوى خير الورى جمعاً   فى الخلق و الخلق والاحسان والجود

لذيا تجيد بمغناه الرحيب تلذ   فكم بمغناه من جود لمجود
جداه فقد لمن ياتيه معتفياً   فكم هنالك من قوهو لمفقود
ماضى الحدود مرا عيها يجود على   الحدود عفواً بعفو غير محدود
احمى الصناديد ماوى الناس مفزعهم   اذ يفزعون لا هوال الصناديد
هوالشهيد عليهم و الشفيع لهم   فى يوم هول شديد الهم مشهود
اى زاد آدم قدراً عنده مولده   فكم اب يعتلى قدراً بمولود
اختاره اللهه محبوباً وارسلهه   لرحمته والارشاد و تشديد
لامته قد تعفى الرسل لو حسبوا   علها على ماروى اهل المسانيد
فاق النبيين طراً فى الكمال و فى   الجمال و العزم والاجمال و السود
فلا بداينه موسى فى العروج ولا   فى اليمن عيسى وفى الملك ابن داود
ولا ابن يعقوب حسناً و الخليل قرى   و نوح عز ماً لدى نصح و تهديد
بزالمحاسن بل بحر و عترته   سفينته مستواها الجود لا الجودى
اصحابه بذلوا فى نصر ملته   ازجاً عند وافى الغازى كل مجهود
افديك يا خير مجداً و مضطجعاً   قد طرو ته المعاصى اى تطريد
حراً لشمس تدنوا فى القيامته ان   تظله تحت ظل منك ممدود
وان تبوأه تحت اللواوا غداً   يازا لواه بعز النصر معقود
انشدتك فاقبل مدحتى كرماً   حتى افوز باانشادى بمقصودى
اهدى اليك مدبحاً كله غرر   و تول ذلك بالتقصيد مقصودى
لاشك انك فوق الحق اجمعهم   ولا تبالى ابا طيل الطاكيد

عليك از كى صلوة الله ما صدحت

فى مخرق البان ورقاء بتغريد

قصيدة

فؤادي هائم والدمع هام ... وسُهدي دائم و الجفن دام
فقلب ما فتئ يجوى و لوع ... ولوع في اضطراب و اضطرام
ودمع بل دم صرف جرى من ... نهار طى ساجماً اى انسجام
وطرف ارمد يؤذيه غمض ... دليل سرمد ساجي الظلام
طويل لا يقاس به زمان ... فساعته كشهر بل كعام
كأنّ هم كواكب الجوزاء نيطت ... يا جفان دام بالدوام
حمامي حاضر والواجد باد ... و جسمي ذابل والشوق نام
يرادي الحب حتى لن ترادى ... فلولا انني جهلوا مقام
اذاب الشوق احشائي دأوي ... تقلّى في اضلعي و ابلى عظامي
اتهضمني هوى كشح هضيم ... و مال على معدّلة القوام
سري قيّ الغرام فصار غربا ... و ذاك الغرم من اوهى الغرام
مرامي نظرة من ذات لحظ ... مصيب ليس يخطئ في المرام
كلمت بعضب لحظ مالجرحى ... طباه من التحام و التئام
فهل سقيت مذار به بتيم ... فلا يلتام بالي من كلام
جروح السهم قد تلتام لكن ... طبا الا لحاظ غير طبا الحسام
فكم سهم له ثلم و دهو ... و ما لشبا اللحظا من انثلام
جراحات الجوارح غير جرح ... يخصّ به قلوب قبل هام
مرضت لا جل الحظاظ مراض ... و لكنّ الشفاه شفت سقامي
شفائي حين همّ السهم جسمي ... متى يفترشن بردٌ هام

تحاماني لحالاتي حُماتي … كما ندم الندام على ندامي

و صدّ عني الطبيب و صدّقني … حميمي و انتهى نوحي حمامي

يشمتني العداة و يزد ريحي … ارقّائي و يشمت بي خصامي

فمن زارٍ بين ادى خليج … ومن لاح رماني باتهام

وما يسعد هم اباى الآ … عبادة او قسّى او للتّطاسى

الامن مخبر عنّي عذولي … بأنّ ملامه يُريي هيامي

وان جرى الهوى في القلب نار … وقد حك فيه نفخ في الضرام

وَ انّي قد اخذت العشق دينا … و ملّكت المحبّة من زمامي

و انّي لست اعرف من دُبُر … قبيلاً او وراءً من امام

و انك لست اوّل من لحاني … و اني لست اوّل مستهام

فكم جاء كمثلك ظن جدّال … هوى هزلا مجدّا في ملامي

فما غالى مواعظ لقّوها … يتبين الحلال من الحرام

ولو عدلو لما عذلوا وانصفوا … وما عقلوا بعذلي مستهام

ولاقت لهم عذراء عقّت … فؤادي من معاذير اكتتام

لكنت في الهوى العذريّ عذري … لهم كشفت البراقع واللثام

ولو طلعت من الاخدار ليلا … طلوع الشمس من تحت الغمام

لما ارتابوا و تابوا عن ملامهم … و خرّوا للسّجود وللسّلام

وأصمتهم بقوسي حاجبيها … بارشاق بلا رشق السهام

يفنى الباهي صحوي من هواها … وهل متصحى الى لوم اللئام

فهي الصحو من ثمل سكر … كأنّ رضا به صفو المدام

رفيق ماتق عذب مُحَيّى زكى الحشو مسكّى الختام

يريحى فرعها فوق الضّحيا و جى ليل على بدر التمام

جمال ظاهر كالروض غضّ يخوّر بالاقاح لدى ابتسام

بنفسى من تلافى طول هجرى فوافى باختيال و احتشام

عتّى اصلى و جمّاً فوافى فمافى ما تقص بالتزام

شفى من كان قداشفى لفرط الا اسىُ واسى كلامى بالكلام

وبات به لنى بردا و بردا شفى لوعى و بسرّكى مدامى

تمالطنى و قد طفقت يداها به بعتّقدى و به بجام

و بات يدى لكشحيها و شاحا و بتنا فى التزام و اضطحام

يداُنا باعتناق و اشتياق وكان صبوحنا خير اختتام

فيتنا ثم صلّينا و لُذنا بجاه محمدٍ خيرِ الانام

شفيع الخلق احمد هم جميعا حميد الخُلق محمودِ الختام

ملاذ الناس اذلا ذواخلال لقاد بهم ولا جان و حام

و خيّهم ابوهم ثم نوح و ابراهيم من نيل المرام

و موسى والمسيح و من سواهم اذ ارتاعوا باهوال عظام

فجاؤا لائذين به فآوى و نجّاهم من الداء العقام

ابرّ الناس اقدمهم بيجاً و ابدا هم جميعاً بالتقدام

سماس فى السما والارض فخرا فليس له سمّى او مسامى

مشاع الفضل مقتسم العطايا وما للفضل فيه من انقسام

فليس له عديل فى اعتدالٍ و عدلٍ او كظيمٍ فى قسام
قسيم

محى و حمى ابا طهدٌ و حقّا فما اعلاه وه من ماح و حام

حمى و سما فما حام و سام ... يليه فى بنى حام و سام

تقدم آدماً خلقاً و موسى ... بمعراج و نوحاً باعتزام

و ابراهيم اكراماً و عيسى ... بمهده و يوسف بالوسام

و داوداً ثنا و وارثه بملك ... و حكم بين ارباب الخصام

و اقدام على الجلّى و جدٍ ... و جدّ فى المغازى باقتحام

محى الاديان طرّاً اذا ناها ... بدين كامل قيم مدام

كشمس كلها اشرقت ضحواً فضلّ ال ... كواكب فى انطماس و انضمام

و بحر لجّه الجمّاش طام ... فطم على الكواكب بالتطام

همام يستغاث لكل همّ ... فيكشف كل همّ باهتمام

يلوذ به العصاة غداً فتنجى ... شفاعته الاثيم من الاثام

اتى فهدى صراطاً مستقيماً ... عن موداخبارى فى سوامى

بشير منذر دين بشير ... حباه الله اسمى الاسامى

رحيم رحمة لك روف ... هدى هادٍ صلوح ذو انتظام

شواهد صدقه حجج رواها ... سلسلة امام عن امام

كلام بهائم و حنين جذع ... و نطق حصى و تسبيح الطعام

رمى ابطال كفار غزاهم ... بكفّ بحصباء فولّوا بانهزام

و انجم كل منطيق بذكر ... حكيم لا يعارض فى الخطام

بمولده دهى ايوان كسرى ... و اشرف ساباه على انهدام

فماد جمعه (إصطفاه) كسرى كسيرا ... والحق اخت كسرى بالرغام

بدا نور فهمر دين بصرى ... لاهل قاطنى البلد الحرام

الا يا عاصمى من كل هول ... و يا من حبل رافته عصامى

تصرم جلّ عمری فی الملاهی — وما لہوای بعد من انصرام

قد انفصمت عرای ورمّ عظمی — وما لعری ہوای من انفصام

فمال غیر لطفک من ملاذ — یکون بہ اعتمادی و اعتصامی

فسل ربّی لیودعنی شہیدا — بطیبة عند قربک الکرام

و یوزعنی تحجّ و اعتمار — فارغب فی الحطیم عن الحطام

و یدخلنی ازورک فی حیاتی — مزارک مستکفا باستلام

وکن لی فی ثری قبری انیسا — وکن لی شافعاً یوم القیام

انا الصادی فناولنی شرابا — طہوراً سائغاً یروی اوامی

الام احوم عطشاناً ہیماً — و بحر نداک غمر اللجّ طامی

علیک صلوٰة ربک ما تغنّت

علی ورق الغضا ورق الحمام ۔ (۱)

تعلیقات :

فضل حق عمری حنفی ماتریدی چشتی خیرآبادی، ان کا پورا نام ہے جو نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے ۔ (۲) اس کی لم یہ ہے کہ ان کا سلسلہ نسب ۳۲ واسطوں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے ۔ (۳) فقہ میں امام ابوحنیفہ کے پیرو تھے، معقولات میں ماتریدی نقطۂ نگاہ کے حامل اور تصوف میں حضرت چشت سے رشتۂ انسلاک رکھتے تھے ۔ خیرآباد (ضلع سیتاپور، یوپی، انڈیا) ان کا مولد و منشاء طفولیت تھا۔

---

(۱) سرسید احمد خان، "آثار الصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۲۵-۱۱

(۲) صدیق حسن خان، نواب، "ابجد العلوم"، محولہ بالا، ج ۳، ص ۹۲۳

(۳) عبدالشاہد خان شیروانی، "باغی ہندوستان"، لاہور: مکتبہ قادریہ، ۱۹۷۳ء، ص ۲۶

ان کا سن ولادت ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء ہے -

ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی - معقولات کی اعلا کتابوں کی تحصیل والد ماجد حضرت مولانا علامہ فضل امام خیرآبادی کی خدمت میں کی - نواب صدیق حسن خان کے قول کے مطابق " سماعت حدیث کا شرف شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی خدمت میں حاصل ہوا-" (۱) رحمان علی نے بھی صرف شاہ عبدالقادر سے حدیث پڑھنے کا ذکر کیا ہے-(۲) گل حسن شاہ پانی پتی نے شجرہ گوش میں شاہ عبدالعزیز دہلوی سے استفادے کا ذکر کیا ہے -(۳) مولانا محمد میاں اور محمد ایوب قادری نے حدیث میں بھی شاہ عبدالعزیز کو ان کا استاد بتایا ہے -(۴) ان کے اساتذہ میں ایک نام حافظ محمد علی خیرآبادی کا نام بھی آیا ہے جن سے وہ فصوص الحکم کا درس لیا کرتے تھے - (۵) سلوک و طریقت میں رہنمائی کے لیے دھومن شاہ دہلوی کا دامن پکڑا- تیرہ برس کی عمر میں تمام علوم عقلی و نقلی کی تکمیل کرلی اور چار ماہ اور چند روز میں قرآن مجید حفظ کرلیا- اس عمر میں تکمیل علوم و فنون اور اس مختصر مدت میں قرآن مجید حفظ کرلینے سے ان کی غیر معمولی ذہانت اور کمالِ حافظے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے - اصحاب فضل و کمال سے ان نسبتوں اور علوم و فنون میں استفادے کے بعد نواب صدیق حسن خان کے قول کے مطابق مولانا فضل حق منطق، حکمت، فلسفہ ، کلام ، اصول اور شعر و ادب میں یگانہ عصر بن گئے تھے -(۶) مولانا سید عبدالحی کا قول ہے کہ " فنون حکمیہ اور علوم عربیہ میں فی زمانہ ان کی نظیر ممکن نہیں"-(۷)

---

(۱) صدیق حسن خان، نواب،" ابجد العلوم"، محولہ بالا ، ج ۳، صص ۹۱۵ و ۹۲۳
(۲) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) :" تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۸۲
(۳) گل حسن پانی پتی:" تذکرہ غوثیہ"، محولہ بالا ، ص ۱۳۷
(۴) محمد میاں، مولانا سید :" علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۳، صص ۶۱ و ۳۸۷
(۵) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) :" علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) "، محولہ بالا ، ج ۱، ص ۲۵۲
(۶) خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت"، محولہ بالا ، ص ۲۷۶
(۷) صدیق حسن خان، نواب :" ابجد العلوم"، محولہ بالا ، ج ۳، ص ۹۲۳
(۸) عبدالحی، مولانا سید :" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۷۵

تکمیل علوم و فنون کے بعد درس و تدریس کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب ملازمت کے بعد وہ دہلی ، رام پور، لکھنؤ، وغیرہ میں مناصب جلیلہ پر فائز تھے۔ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں ملازمت کا آغاز ہوا - انھوں نے دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ریذیڈنٹ کے دفتر میں سررشتہ داری سے کیا اور تقریباً سولہ سال تک نہایت ذمہ داری اور خوش اسلوبی کے ساتھ فرائض منصبی کو ادا کیا۔ لیکن ان کا خاص ذوق علم و ادب کا ذوق تھا۔ ملازمت کا شغل والد ماجد کے حکم و خواہش پر اختیار کیا تھا لیکن ادھر قبلہ والد ماجد نے اس جہان فانی سے سفر آخرت (۱۲۴۴ھ) اختیار کیا ادھر انھوں نے ملازمت کی گراں باری سے سبک دوشی حاصل کی - ۱۲۴۵ھ/۱۸۳۱ء میں انھوں نے کمپنی کی ملازمت سے ترک تعلق کرلیا۔ (۱) ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۲ء میں وہ نواب فیض محمد خاں والی جھجر سے وابستہ ہوگئے - وہاں سے کچھ عرصے بعد والی الور نے انھیں بعد فخر و امتنان اپنی ریاست میں بلالیا - الور سے وہ تقریباً دو سال وابستہ رہے - اس کے بعد کچھ عرصے انھوں نے سہارن پور اور ٹونک میں بسر کیا پھر وہ رام پور آگئے - نواب صاحب رام پور نے ان کے ساتھ نہایت عزت و تکریم کا برتاؤ کیا اور محکمۂ نظامت اور مرافعہ عدالتیں کی صدارت دے کر ریاست کی شہرت اور نیک نامی میں اضافہ کیا۔ رام پور میں انھوں نے ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء سے ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء تک تقریباً آٹھ سال کا عرصہ گزارا۔ اس کے بعد اسی سال سے ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء کے اوائل تک تقریباً آٹھ سال تک وہ لکھنؤ میں کچہری حضور تحصیل کے مہتمم اور صدرالصدور کی حیثیت سے رہے - ۱۲۷۳ھ کے ابتدائی مہینوں میں وہ دوبارہ الور چلے گئے - جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا آغاز ہوا تو حضرت علامہ الور میں تھے - اگست ، ۱۸۵۷ء میں دہلی تشریف لے آئے - اس وقت سے دسمبر، ۱۸۵۸ء تک

---

(۱) محمود احمد برکاتی، حکیم، "فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون"، کراچی : برکات اکیڈمی، ۱۹۷۵ء، ص ۲۰

وہ دہلی اور اودھ کے مختلف اضلاع میں مجاہدین حریت کی رفاقت ، اعانت اور قیادت فرماتے رہے ۔ جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد حضرت علامہ کچھ عرصے تک بھیکن پور (ضلع علی گڑھ ، یوپی) اور بعض دوسرے مقامات پر روپوش رہے ۔ عام معافی کے اعلان کے بعد ظاہر ہوئے لیکن وہ جرم بغاوت کے ایسے مجرم نہ تھے کہ حکومت اعلان معافی کا لحاظ کرتی اور انہیں کچھ نہ کہا جاتا۔ اعلان معافی کے باوجود ۳۰ جنوری، ۱۸۵۹ء کو انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ خیرآباد سے لکھنو لے جایا گیا۔ مقدمہ چلا اور جہاد حریت میں شرکت و اعانت مجاہدین آزادی کے جرم میں تمام جائداد — ایوان خانہ ، حرم سرائے ، کئی دیہات اور مجموعہ نوادر کتب خانہ ضبط کرلیا گیا۔ اور ۳ مارچ ۱۸۵۹ء کو انہیں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا سنادی گئی۔ اکتوبر، ۱۸۵۹ء میں انہیں جزائر انڈمان بھیج دیا گیا۔ تحریک آزادی ناکام ہوچکی تھی ۔ عزیزوں نے ان کی برئیت کی کوششیں کیں اور پریوی کونسل سے ان کی رہائی کا پروانہ حاصل کرکے صاحب زادۂ محترم مولانا شمس الحق جزائر انڈمان پہنچے ۔ پتا پوچھتے ہوئے قیام گاہ جارہے تھے کہ راستے میں ایک جنازہ نظر پڑا ۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ اسی شہید ظلم و جبر کا جنازہ ہے جس کی رہائی کا پروانہ لے کر وہ یہاں پہنچے ہیں۔

ان کے عام تذکرہ نگاروں نے انہیں فتوی جہاد کا مستفتی و مفتی بتایا ہے ۔(۱) مولوی عبدالحی نے انگریزوں کے خلاف ان کے خروج کو بھی "اتہام" قرار دیا ہے ۔ (۲) یہ بھی حقیقت ہے کہ پریوی کونسل سے انہیں انگریزوں کے خلاف قیادت کے الزام سے "بری" قرار قرار دیا گیا تھا۔ یہ ان کے عقیدت مند اہل قلم کو بھی تسلیم ہے کہ فتوی جہاد پر ان کے

---

(۱) عبدالشاہد خان شروانی، "باغی ہندوستان"، محولہ بالا، ص ۱۳۱
ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، (مرتب): اسباب بغاوت ہند"، کراچی : اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء، ص ۵۹ و ۷۵

(۲) عبدالحی، مولانا سید: نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۷۵

دستخط نہیں اور کوئی دوسرا فتوی ابھی دستیاب نہیں ہوا ہے جس پر علامہ موصوف کے دستخط ہیں۔ اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انگریزوں کے جور و ستم کا نشانہ نہ صرف جہاد حریت کے مجرم ہی نہیں بہت سے بے تعلق اور معصوم بھی بنے تھے۔ انگریزوں کے پیش نظر قیام عدل سے زیادہ اہل ملک کے دلوں پر رعب و دہشت قائم کرنا تھا تاکہ آیندہ کسی بغاوت کا امکان باقی نہ رہے ۔ حضرت علامہ کے قلعہ سے تعلق ، ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے دوران میں دھلی اور اودھ کے بعض مقامات پر لوگوں کو انگریزوں کے خلاف اکسانے اور بغاوت اور قتل کی ترغیب دینے نیز بغاوت کے نظام پر مشی ، ۱۸۵۸ء میں بغاوت کے سرغنہ محمد خان کی مجلس مشاورت میں حصہ لینے کی شہرت تھی اور اسی جرم میں انھیں سزا سنائی گئی تھی۔(۱)

حضرت علامہ مرحوم اپنے دور کے نادر روزگار ارباب علم و فضل میں سے تھے۔ ان کے عہد میں مختلف دوائر علم و فن میں اتنی بڑی بڑی شخصیات جمع ہوگئیں تھیں کہ بقول چشم فلک نے ہندوستان خصوصاً دھلی کی سرزمین میں یک وقت ایسے نوادر روزگار ارباب علم علم و فن کا مجمع نہ دیکھا ہوگا۔ ہندوستان خصوصاً دھلی کے تمام اکابر فضل و کمال سے ان کے برابرانہ و دوستانہ تعلقات تھے ۔ ان میں خاص طور پر آزردہ، صہبائی، علوی، شیفتہ ، غالب ، دبیر، شاہ نصیر، ذوق، عیش ، احسان، تسکین، مومن خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (۲) مومن، شاہ اسمعیل اور مولانا عبدالحی سے بعض مسائل میں ان کے اختلاف تھے۔

ان کے فضل و کمال کے بارے میں دو رائے نہیں ہیں۔ معقولات میں انھیں مجتہد کا

---

(۱) محمود احمد برکاتی، "فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون"، محولہ بالا، ص ۹۰-۶۷
محمد میاں، مولانا سید، "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ج ۴، ص ۲۰۰-۱۸۳
ایوب قادری، محمد، "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء"، کراچی: پاک اکیڈمی، ۱۹۶۷ء، ص ۶۱-۳۰۲

(۲) عبدالحی، مولانا سید، "گل رعنا"، اعظم گڑھ (بھارت): دارالمصنفین، ۱۳۲۰، ص ۱۲۱

مقام حاصل تھا۔ نواب صدیق حسن خان نے انھیں اپنے زمانہ طالب علمی میں دھلی میں دیکھا تھا ۔ ان کا قول مختلف علوم و فنون میں ان کی یگانگی کے بارے میں گزرچکا ہے ۔ انھوں نے لکھا ہے کہ فضل حق خیرآبادی علوم حکمیہ و فلسفہ میں بلاخوف تردید اپنے وقت کے امام تھے ۔ (١) مولوی خیرالدین فرماتے تھے "کہ میں نے ایسا خوش تقریر انسان عمر بھر میں اور کوئی نہیں دیکھا ۔ مجلس کی تقریر اور درس و علم کی تقریر دونوں میں بے مثل تھے۔" ان کی ایک تقریر وحدۃ الوجود پر اس درجہ مشہور ہوئی کہ دور دور سے اہل علم اس کی سماعت کے لیے شدرحال کرکے آتے تھے ۔" (٢) مولوی رحمان علی نے ان کے کمال تدریس کا چشم دید واقعہ لکھا ہے :

" ١٢٦٣ھ/١٨٣٨ء میں ، میں ان کی خدمت میں لکھنؤ میں حاضر ہوا تو میں حقہ پیتے اور شطرنج کھیلنے کی حالت میں ایک طالب علم کو افق المبین کا سبق دے رہے تھے اور کتاب کے مطالب کو بہت خوبی کے ساتھ طالب علم کے ذہن نشین کرارہے تھے۔" (٣)

ان کے فضل و کمال کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی کا یہ بیان بس کرتا ہے ۔ سید صاحب لکھتے ہیں :

" فضل حق کے دم عیسوی نے معقولات میں وہ روح پھونکی کہ اپنی سیدائے وقت مشہور ہوئے ۔ دیار و اطراف سے طلبہ نے ان کی طرف رجوع کیا۔ انھوں نے منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا ۔" (٤)

ان کے مذھبی مسلک اور مشرب کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد رکھتے ہیں :

" جہاں تک مذھبی عقائد و اعمال کا تعلق ہے ان کا مشرب رسم پرستی

---

(١) صدیق حسن خان ، نواب، " ابجدالعلوم"، محولہ بالا ، ج ٣ ، ص ٩٢٣

(٢) مہر ، مولانا غلام رسول (مرتب) " نقش آزاد " ، محولہ بالا ، ص ٣٠٩

(٣) ایوب قادری ، محمد (مرتب و مترجم) " تذکرہ علمائے ھند " ، محولہ بالا ، ص ٣٨٣

(٤) سلیمان ندوی ، سید " حیات شبلی " ، [redacted] اعظم گڑھ (بھارت) : دارالمصنفین ، ١٩٤٣ء ، صص ٢٣-٢٢

و بدعت نوازی کا تھا اور اس باب میں نہایت غلو رکھتے تھے - مولانا اسمعیل شہید نے جب تحریک اصلاح شروع کی تو اس کے مخالفوں میں یہ سب سے زیادہ نامور ہوئے - مولانا شہید نے " تقویتہ الایمان" میں لکھ دیا ہے کہ اگر خدا چاہے تو ایک پل میں کروڑوں آنحضرتؐ کے امثال پیدا کردے- یہ بات ان کو بہت شاق گزری اور معقولات کی رنگ آمیزیوں سے ایک تقریر اس کے رد میں لکھی- دعوا یہ کیا کہ نظیر خاتم النبیین کا پیدا ہونا ممتنع بالذات ہے اور پھر قدرت اور مشیت کا فرق فراموش کرکے سارا معاملہ مشیت کے فعل میں لے گئے- ساری تقریر محض جدل و مکابرہ کا ایک لفظی گورکھ دھندا تھی-" (۱)

مومن نے اپنے ایک شعر میں ان کے لیے بدعتی کا لفظ استعمال کیا ہے :

" مومن وہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم" (۲)

نواب صدیق حسن خان نے بھی بدعت کی طرف ان کے میلان کا ذکر کیا ہے-(۳)

علامہ فضل حق نے ایک کامل درجہ کی مدبر، ساز زندگی ضرور گزاری لیکن درس و تدریس سے انھوں نے زندگی بھر ایک تعلق رکھا اور معروف و ممتاز اہل علم اور ارباب فکر و نظر کی ایک مقتدر جماعت ہے جس نے معقولات میں خاص طور سے ان سے استفادہ کیا ہے- ان میں سے مولوی حافظ عبداللہ بلگرامی، مولوی نورالحسن کاندھلوی، مولوی عبدالحق خیرآبادی، (حضرت علامہ مرحوم کے صاحب زادے) ، مولوی شاہ عبدالقادر بدایونی،(۴) نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خان رام پوری(۵) مولانا ہدایت اللہ خان جونپوری، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا جمیل احمد، مولانا سلطان احمد بریلوی، مولانا شاہ عبدالحق کانپوری،

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول(مرتب) " نقش آزاد"، محولہ بالا ، ص ۳۰۹

(۴) ایوب قادری، محمد (مرتب و مترجم) " تذکرہ علمائے ہند" ،صص ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۳۱۱

(۵) حامد حسن قادری، " تاریخ داستان زبان اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۲۵

محمد عسکری(مترجم) ، " تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، ص ۳۱۹

(۲) " کلیات مومن"، محولہ بالا ، ج ۱، ص ۱۳۳

(۳) صدیق حسن خان، نواب " ابجدالعلوم"، محولہ بالا ، ج ۳، ص ۹۲۳

مولانا ہدایت علی بریلوی، مولانا غلام قادر گویاموی(۱) مولانا خیرالدین (والد مولانا ابوالکلام آزاد (۲) ، مولوی عبدالرشید غازی پوری (۳) مولانا حکیم محمد حسن امروہوی(۴) خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

نواب صدیق حسن خان نے ان کی مندرجہ ذیل تصانیف کا ذکر کیا ہے :

" رسالہ العجل افعال فی شرح الجواہرالعالی، حاشیہ شرح السلم قاضی مبارک ، حاشیہ الافق المبین باقر داماد ، حاشیہ تلخیص الشفا ابن سینا ، الہدیتہ السعیدیہ فی الحکمتہ الطبیعیہ ، رسالہ تحقیق العلم و العلوم ، الروض المجود فی تحقیق حقیقتہ الوجود ، رسالہ تحقیق الاجسام، رسالہ تحقیق الکلی الطبعی ، رسالہ تحقیق التشکیک ، رسالہ تحقیق الاہیات ، تاریخ فتنۃ الہند کااور مجموعہ قصائد ، غزلیات وغیرہ مرتبہ و شرح جمیل احمد بلگرامی۔" (۵)

رسائل نمبر۹ تا ۱۱ کانام صدیق حسن خان نے اس طرح لکھا ہے :" رسالہ فی تحقیق الکلی الطبعی و فی التشکیک و فی الاہیات" اس سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ یہ ایک رسالہ ہے اور بعض نے نمبر ۹ کو ایک اور نمبر ۱۰، ۱۱کو دوسرا رسالہ سمجھ لیا ہے لیکن رسالہ نمبر۱۰ فارسی میں اور دوسرے عربی میں ہیں اس لیے یہ ایک یا دو نہیں بلکہ تین رسالے ہیں۔

" امتناع نظیر کے مسئلے میں ان کے رسالے کا ذکر مولاناآزاد کی تحریر کے اقتباس میں گزرچکا ہے ۔ الثورۃ الہندیہ جس کا ترجمہ باغی ہندوستان کے نام سے عبدالشاہد خان شروانی نے کرکے چھپوادیا ہے ۔ اس رسالے کا نام مولانا ابوالکلام آزاد کا تجویز کیا ہوا ہے۔

---

(۱) عبدالشاہد خان شروانی، " باغی ہندوستان"، محولہ بالا ، ص ۱۶۵
(۲) مہر، مولانا غلام رسول(مرتب) " نقش آزاد"، محولہ بالا ، ص ۳۰۸
(۳) اشرف علی تھانوی، مولانا " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۳۹۷
(۴) امداد صابری" فرنگیوں کا جال"، محولہ بالا ، ص ۲۸۵
(۵) صدیق حسن خان، نواب ، " ابجدالعلوم"، محولہ بالا ، ج۳ ، ص ۹۲۳

اس رسالے کے ساتھ علامہ مرحوم کے دو قصیدے ، قصیدہ ہمزیہ اور قصیدہ دالیہ بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب ان کی جزائر انڈمان میں زمانہ حبس دوام کی یادگار ہے ۔ میرا خیال ہے کہ نواب صاحب نے تاریخ " فتنۃ الہند" نامی جس کتاب کا ذکر کیا ہے وہ اسی رسالے اور قصائد کا مجموعہ ہے ۔ " رسالہ قاطیغوریاس اور " تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" (۱) مولانا سید سلیمان ندوی نے اس فہرست میں " شرح ہدایۃ الحکمۃ " کا اضافہ کیا ہے ۔(۲)

حضرت علامہ مرحوم ایک بلند پایہ مصنف ہونے کے علاوہ عربی و فارسی کے قادرالکلام شاعر بھی تھے ۔ صاحب " ابجد العلوم" نے ان کے اشعار کی تعداد چار ہزار سے زائد بتائی ہے ۔ ان کے بیشتر قصائد آنحضرت (صلعم) کی مدح اور کفار انسان کی ہجو میں ہیں ۔(۳) سرسید نے انھیں فروغ عہد و لبید دوران لکھا ہے ۔ " فرقتی " تخلص تھا ۔ علامہ کا ایک شعر ہے :

فرقتی در کعبہ رفتی بارہا تا مسلمان نامسلمانی ہنوز (۴)

امیرالروایات کے مطابق " آرزو" بھی انھی کا تخلص تھا (۵) مومن کی ایک غزل ہے

---

(۱) اختر راہی ، تذکرہ مصنفین درس نظامی"، لاہور : مسلم اکادمی ، ۱۹۷۵ء، ص ۱۸۱
رئیس احمد جعفری ، " بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، محولہ بالا ، ص ۸۵۶
عبدالشاہد خان شروانی ، " باغی ہندوستان"، محولہ بالا ، ص ۱۰۷
ایوب قادری ، محمد (مرتب و مترجم) " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۸۳
بزمی انصاری ، " فضل حق خیرآبادی"، (مقالہ) ، " اردو دائرہ معارف اسلامیہ" لاہور : دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۵ء، ج ۱۵ ، ص ۳۲۵

(۲) سلیمان ندوی ، سید " حیات شبلی"، محولہ بالا ، ص ۳۳

(۳) صدیق حسن خان ، نواب " ابجد العلوم"، محولہ بالا ، ج ۳ ، ص ۹۲۳
عبدالحی ، مولانا سید " نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۷۳

(۴) ریاض انصاری ، مولانا " علامہ فضل حق خیرآبادی"(مقالہ) ، " برہان" (ماہنامہ) ، دہلی : جولائی ، ۱۹۷۶ء ، ج ۷۷ ، ش ۱ ، ص ۵۹

(۵) اشرف علی تھانوی " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۱۱۵
فائق رام پوری ، کلب علی خان ، " مومن" لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۱ء ، صص ۳۲ و ۲۱۶

جس کا مطلع اور مقطع یہ ہیں :

مطلع: شادی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم

xxxx

مقطع: لے نام آرزدہ کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم (۱)

حضرت علامہ مرحوم نے دو شادیاں کیں جن سے ان کی چھ اولادیں ہوئیں۔ پہلی شادی منشی فضل احمد ابن حسین میاں کی صاحب زادی سے کی ۔ اہلیہ کا نام وزیرن تھا۔ ان سے چار اولادیں ہوئیں سعیدالنسا پڑھی لکھی خاتون تھیں ، شاعری کا شوق تھا حرمان تخلص کرتی تھیں ۔ مضطر خیرآبادی و بسمل خیرآبادی ان کے نامی فرزند تھے۔ نجم النسا ، ان کے صاحب زادے منشی ظہور علی ریاست جے پور میں فوج دار تھے۔ مخمورالنسا ، ان کی شادی خیرآباد کے منشی طفیل احمد سے ہوئی تھی۔ اور چوتھی اولاد عبدالحق خیرآبادی مشہور زمانہ ، لائق و فائق اور باپ داداکی وراثت علمی کے سچے جانشین ہوئے۔

علامہ مرحوم کی دوسری شادی دہلی میں ہوئی تھی ۔ ان سے مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق پیدا ہوئے ۔(۲)

بالاخر چھیاسٹھ برس کی زندگی کے لیل و نہار دیکھ کر اور گرم و سرد زمانہ سے گزر کر علم و فضل و کمال کا یہ آفتاب جہاں تاب غربت و مظلومیت کی حالت میں ۱۲ صفر ، ۱۲۷۸ھ/ ۲۰ اگست ، ۱۸۶۱ء کو جزائر انڈمان کی سرزمین میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

---

(۱) " کلیات مومن"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۳۳-۱۳۲
فائق رام پوری ، کلب علی خان ، " مومن"، محولہ بالا ، ص ۳۲

(۲) عبدالشاہد خان شروانی ، " باغی ہندوستان"، محولہ بالا ، ص ۱۶۳

مولوی کرامت علی سلمه الله تعالی :

خلف الرشید ہیں مولوی حیات علی خوش نویس علیہ الرحمتہ کے اور شاگرد رشید ہیں مولانا فضل امام صاحب کے ۔ فضل و کمال ان کا حد تقریر اور حیطۂ تحریر سے زیادہ ہے ۔ استحضار مسائل اس مرتبہ کو پہنچا ہے کہ حصولی ان کے ذہن میں حکم حضوری کا رکھتا ہے ۔ عرصہ چند سال کا ہوا کہ شہر شاہجہان آباد کو تلاش معاش کی تقریب سے چھوڑا اور حیدرآباد کی طرف راہی ہوئے ۔ چوں کہ " السفر وسیلۃ الظفر" حدیث مشہور ہے ، گردش فلک نے وہاں ان سے موافقت کی اور بالفعل ہزار روپے ماہوار کے منصب سے سرفراز ہیں۔ اس نواح میں مع قبائل اور عشائر کے بسر کرتے ہیں۔ نظم و نثر ان کا کچھ راقم کو بہم نہیں پہونچا ۔ (۱)

تعلیقات :

مولوی کرامت علی کے والد کا نام مولوی حیات علی تھا۔ خوش نویسوں کے سلسلے میں سرسید نے ان کے والد کا ذکر کیا ہے اور خط شکستہ میں ان کے کمال فن کا اعتراف نہایت شان دار الفاظ میں کیا ہے ۔ (۲) " آثارالصنادید" میں انھیں مولانا فضل امام کا شاگرد بتایا ہے اور " سیرت فریدیہ" میں سرسید نے اپنے دادا خواجہ فریدالدین احمد جو فن ریاضی میں وحید عصر تھے، کے نامور تلامذہ میں سب سے پہلے انہی کا ذکر کیا ہے۔

سرسید لکھتے ہیں :

" مولوی کرامت علی صاحب ابن مولوی حیات علی صاحب جو دلی کے مشہور

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ص ۲۷-۱۲۶

(۲) ایضاً ، چوتھا باب، صص ۲۲-۱۲۱

عالم تھے اور آخر کار کو حیدرآباد چلے گئے تھے۔" (۱)

مولانا سید عبدالحی نے ان کا مولد و منشا دہلی لکھا ہے اور ان کے اساتذہ میں مولانا فضل امام کے علاوہ شاہ رفیع الدین کی علم حاصل کرنے ، شاہ اسمعیل سے حدیث پڑھنے اور شاہ محمد اسحاق سے سند حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے ۔(۲)

مولوی کرامت علی کے ایک معاصر مولوی عبدالقادر رام پوری جنھوں نے مولوی صاحب موصوف کو دیکھا بھی تھا ۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ :

" مولوی کرامت علی علوم شرعیہ اور ادبیہ کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ اگرچہ کسی فن سے خالی نہیں۔ ان جیسا خوش تقریر اور زود تقریر میں نے نہیں دیکھا۔ اگر کوئی مانع پیش نہ آیا تو ممکن ہے بہت کچھ ترقی کرجائیں۔ ہر طرح کے علوم حاصل کیے ہیں۔ مگر تعلیم و تعلم کا طریقہ زیادہ تر خاندان عزیزیہ کے طرز پر ہے ۔" (۳)

مولوی بشیرالدین دہلوی نے ان کا ترجمہ لکھا ہے لیکن یہ سارا ترجمہ " آثار الصنادید" کے بیان کا خلاصہ محض ہے ۔ البتہ یہ جملہ زیادہ ہے :

" اب بھی ان کے خاندان کے لوگ حیدرآباد میں موجود ہیں۔" (۴)

مولوی فضل حسین نے میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے اساتذہ کے سلسلے میں ان کے بارے میں یہ چند سطور لکھی ہیں :

" (میاں صاحب نے) معقول، توضیح تلویح ، مسلم الثبوت ، تفسیر بیضاوی اور تفسیر کشاف سورۂ نساء تک مولوی کرامت علی اسرائیلی مولف سیرۂ احمدیہ

---

(۱) محمود احمد برکاتی (مرتب) ، " سیرت فریدیہ" از سرسید احمد خان، کراچی : پاکر اکاڈمی، ۱۹۶۴ع ، ص ص ۲۱-۱۲۰
حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا ، حصہ اول ، ص ۲۱

(۲) عبدالحی، مولانا سید، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۹۶

(۳) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب)، " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) "، محولہ بالا ، ج ۱، ص ص ۵۷-۲۵۶

(۴) بشیرالدین احمد ، " واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۳۱۵

سے پڑھی - یہ بزرگ فنون درسیہ میں فضل امام خیرآبادی اور مولانا شاہ رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے اور علم حدیث میں مولانا شاہ محمد اسحاق و مولانا محمد اسمعیل علیہما الرحمہ کے تلمیذ تھے۔" (۱)

ابو یحیی امام خان نے مولوی فضل حسین کی اس رائے پر ان سطروں کا اضافہ کیا ہے :

" ان کے والد کا شعار حنبلی تھا۔ مگر خود شافعی طریقے پر کاربند تھے - فقہ شافعی پر بہت عبور تھی اور شاہ عبدالعزیز کے مدرسے کے قریب ہی قیام تھا۔" (۲)

مرزا حیرت دہلوی نے شاہ اسمعیل شہید کے کمال حافظہ کے بیان میں انہیں شاہ شہید کے ایک شریک درس راوی کی حیثیت سے پیش کیا ہے - اس سے ان معلومات پر صرف اتنا اضافہ ہوتا ہے کہ " مولوی کرامت علی شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں شاہ شہید کے ہم سبق تھے -" (۳)

مولوی کرامت علی کے حالات میں یہی بنیادی ماخذ ہیں جن کا مستفاد حصہ اوپر پیش کردیا ہے - ان بیانات سے ان کے چھ نامور اساتذہ کا علم ہوتا ہے - خواجہ فرید الدین، مولانا فضل امام خیرآبادی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین ، شاہ محمد اسمعیل شہید اور شاہ محمد اسحاق - لیکن اگر کرامت علی اول الذکر چار حضرات کے تلمیذ تھے اور شاہ عبدالعزیز سے تحصیل علمی میں علامہ شاہ اسمعیل شہید کے شریک درس تھے تو پھر شاہ اسمعیل اور شاہ محمد اسحاق سے استفادہ اور تلمذ فی علم الحدیث مستبعد ہوجاتا ہے - اس لیے کہ شاہ شہید نے درسیات کی تکمیل ۱۴، ۱۵ برس کی عمر

---

(۱) فضل حسین بہاری، مولوی: " الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا، ص ۳۰
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب): " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۵۹۵

(۲) ابویحیی امام خان نوشہروی: " تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۱۳۶

(۳) حیرت دہلوی، مرزا: " حیوۃ طیبہ"، محولہ بالا، ص ۲۱

مین (۱۷۹۲ع) مین کی اور شاہ محمد اسحاق ۱۸۰۸ع مین تحصیل علمی سے فراغت کے بعد مسند نشین درس و تدریس ہوئے - پس اگروہ ۱۷۹۲ع سے قبل علامہ شہید کے ہم درس تھے تو چودہ، پندرہ سال کے بعد شاہ محمد اسحاق سے تلمذ بعید از قیاس ہوجاتا ہے - حالان کہ اس کے برعکس ممکن ہے - اور اگر وہ شاہ عبدالعزیز کی خدمت مین علامہ شہید کے ہم سبق تھے تو پھر خود علامہ شہید سے علم حدیث مین ان کا تلمذ مستبعد ہوجاتا ہے - میری ~~رائے~~ روایت کی روشنی مین مولوی صاحب موصوف نے اول الذکر چار اساتذہ سے تحصیل علوم و فنون کی ہوگی - علامہ شاہ اسمعیل شہید سے بھی دوران طالب علمی مین کسی کتاب کا پڑھنا اور ان سے استفادہ کرنا حیطۂ امکان سے باہر نہیں لیکن شاہ محمد اسحاق سے علم حدیث مین ان کا تلمذ خارج از امکان ہے - سرسید نے انہین خواجہ ~~ککک~~ فریدالدین اور مولانا فضل امام کا شاگرد بتایا ہے - اس سے بھی اندازہ کیاجاسکتا ہے کہ ان کے دوسرے اساتذہ بھی خواجہ و مولانا کے ہم عمر ہم رتبہ ہون گے نہ اخلق الاخلاف -

سرسید نے ان کے علم و فضل اور کمال استحضار کے بارے مین جو کچھ لکھا ہے اس کی تصدیق مولوی ~~مولوی~~ عبدالقادر اور دوسرے تذکرہ نگارون سے بھی ہوتی ہے - " الحیاۃ بعدالمماۃ " سے ان کے ایک نامور تلمیذ (شیخ الکل میان نذیر حسین محدث دہلوی) اور ان کی ایک تالیف " سیرۃ محمدیہ" کا علم ہوتا ہے - جو ۱۸۵۷ع سے قبل حیدرآباد دکن مین چھپ گئی تھی- سیرت نبوی مین ان کی عربی تصنیف " السیرۃ المحمدیۃ" ۶۰۰ صفحے کی ایک ضخیم کتاب ہے - جو غدر سے پہلے لکھی گئی ہے اور نظام حیدرآباد کے نام سے منسوب کی گئی ہے - یہ کتاب حیدرآباد دکن مین چھپ گئی ہے - اور کتب خانہ آصفیہ مین بھی اس کا ایک مخطوطہ موجود ہے -" (۱)

---

(۱) اخترجوناگڑھی، قاضی احمد میان (مرتب)، "تذکرہ اہل دہلی" از سرسید احمدخان، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۹ع، ص ۳۶-۱۳۵ (حاشیہ)
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب)، "علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی)"، محولہ بالا، ص ۲۵۷
محمود احمد برکاتی (مرتب)، "سیرت فریدیہ"، محولہ بالا، ص ۱۶۰
فضل حسین بہاری، مولوی، الحیاۃ بعد المماۃ، کراچی، ص ۵۰

کتاب کا ایک ایڈیشن ۱۳۱۹ھ/۲-۱۹۰۱ء میں افغانی پریس امرتسر سے بھی شائع ہوا تھا۔ (۱) "مملکت حیدرآباد" کے مؤلف نے بھی اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے لیکن اردو تصانیف میں "سیرۃ محمدیہ" - کرامت علی " لکھ کر چھوڑ دیا ہے - صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ مؤلف موصوف کی نظر سے کتاب نہیں گزری۔ اس لیے نہ عربی تصانیف میں ذکر کیا نہ اشاعت ، مطبع ، صفحات کے بارے میں معلومات ہیں۔ (۲)

مولانا کرامت علی کی ایک کتاب " قول ثابت" کا ذکر گارسین دتاسی نے اپنے ۱۸۷۷ء کے مقالے میں گزشتہ سال (۱۸۷۶ء میں) شائع ہونے والی کتابوں کے ضمن میں کیا ہے - یہ کتاب ۲۲۰ صفحوں کی بیان کی گئی ہے - (۳)

قاضی احمد میاں جوناگڑھی اور محمد ایوب قادری نے ان کا سال وفات ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء لکھا ہے -(۴) لیکن سرسید کے انداز بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ " آثار الصنادید" کی تالیف کے وقت (۱۸۴۵ء) میں زندہ تھے - عنوان ترجمہ میں بھی دعائیہ کلمہ " سلمہ اللہ تعالی" ہے اور ترجمہ میں بھی یہ الفاظ کہ " بالفعل ہزار روپے ماہیانہ کے منصب سے سرفراز ہیں" اور " اس نواح میں مجمع قبائل اور عشائر کے بسر کرتے ہیں-" ان کی حیات ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس لیے مذکورہ بالا تاریخ انتقال درست معلوم نہیں ہوتی - مولانا سید عبدالحی نے ان کا سال وفات ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء لکھا ہے (۵) اور میری رائے میں یہی درست ہے -

---

(۱) " قاموس الکتب۔ مذہبیات"، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۱ء، ج ۱، ص ۶۱۷

(۲) " مملکت حیدرآباد"، کراچی: بہادر یارجنگ اکادمی، ۱۹۶۷ء، ص ۴۲

(۳) اختر حسین رائے پوری (مترجم) " مقالات گارسین دتاسی"، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۵ء، ج ۲، ص ۳۷۳

(۴) اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں، " تذکرہ اہل دہلی"، محولہ بالا، ص ۳۶-۱۳۵
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲۵۷

(۵) عبدالحی، مولانا سید " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۹۶

جناب مولوی کریم اللہ سلمہ اللہ تعالی :

۔ جامع فنون ہیں، خصوصاً دینیات میں دست گاہ کامل ہے توکل و قناعت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے، باوجود عیال داری اور تأہل کے اہل دنیا کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ بیشتر اوقات گرامی کو تدریس طلبہ شائق میں مصروف اور عنان ہمت افادۂ طالبین کی طرف معطوف رکھتے ہیں۔" (۱)

تعلیقات :

مولوی کریم اللہ دہلوی ابن مولوی لطف اللہ فاروقی تقریباً ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ محلہ لال کنواں میں ان کا مکان تھا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے علاوہ مولانا رشید الدین خاں، اور مولوی محمد کاظم دہلوی کی خدمت میں رسمی علوم کی تحصیل کی اور حضرت آل احمد اچھے میاں مارہروی کے مرید ہوئے اور خلافت حاصل کی کثیرالدرس والتصانیف تھے۔ ۱۲۹۱ھ/ ۷۵-۱۹۷۴ء میں نوے سال کی عمر میں انتقال ہوا۔(۲)

صاحب " نزہتہ الخواطر" نے بھی ان کے اساتذہ میں مولانا کاظم، مولانا رشید الدین اور شاہ عبدالعزیز کے اسمائے گرامی لکھے ہیں -(۳)

صاحب " کمالات عزیزی" نے انہیں شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ میں شمار کیا ہے -(۴)

آں موصوف کے سوانح حیات کے بارے میں اس سے زیادہ حالات نہیں ملتے - محمد ایوب قادری نے ان کے دو بیٹوں کا تذکرہ کیا ہے - بڑے بیٹے مولوی محمد یعقوب دہلوی تھے۔

---

(۱) سرسید احمد خاں: " آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۱۰۹

(۲) عبدالحی، مولانا سید: " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۹۹-۳۸۹
قطب الدین، مولانا محمد: " تنبیہہ الضالین و ہدایتہ الصالحین"، لاہور: ہندوستان اسٹیم پریس، ۱۳۲۵ھ، ص ۱۱۰ (برحاشیہ " نظام اسلام ")
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب): " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۳۹۷

(۳) عبدالحی، مولانا سید: " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۹۸

(۴) سید احمد ولی اللہی، ظہیرالدین: " کمالات عزیزی، محولہ بالا، ص ۹

اور چھوٹے صاحب زادے کا نام مولوی محمد عمر دھلوی تھا۔ دونوں نے تحصیل علمی اپنے والد کی خدمت میں کی تھی اور درس و تدریس اور طلبہ کے افادے میں مشغولیت کا پتا چلتا ھے - (۱)

مولوی محمد یعقوب کا ترجمہ مولانا سید عبدالحی نے بھی لکھا ھے اور یہ بھی بتایا ھے کہ والد کی وفات کے بعد تدریس و تذکیر میں ان کے جانشین اور قائم مقام ھوئے تھے - (۲)

" ارواح ثلاثہ" کی ایک روایت سے معلوم ھوتا ھے کہ مسلکاً حنفی لیکن خوش عقیدہ اور بدعت نواز و رسوم پرست بزرگ تھے۔ امیر خان صاحب نے بعض مستند رواۃ کے حوالے سے بیان کیا ھے کہ ایک دفعہ قلعے میں کسی شاھزادے نے مولوی محمد اسحاق اور مولوی محمد یعقوب صاحب اور ان کے خاص لوگوں کی دعوت کی اور ان کے ساتھ ھی ان کے مخالفین جیسے حاجی قاسم اور مولوی کریم اللہ اور ان کے ھم خیال لوگوں کو بھی مدعو کیا۔ جب یہ سب لوگ دسترخوان پر بیٹھے اور کھانا سامنے رکھا گیا اور ان لوگوں نے کھانے کی طرف ھاتھ بڑھائے تو اس شاھزادے نے کہا کہ صاحبو! میں آپ کو اطلاع کرتا ھوں کہ یہ پیران کا بکرا ھے اب جس کا جی چاھے کھائے اور جس کا جی چاھے نہ کھائے - اس پر مولوی محمد اسحاق اور مولوی محمد یعقوب صاحب اور آپ کی جماعت نے ھاتھ کھینچ لیے۔ جب مخالف پارٹی نے یہ دیکھا تو انھوں نے بھی ھاتھ کھینچ لیے۔ اس پر شاھزادے نے کہا کہ مولوی محمد اسحاق صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب تو اس کو حرام کہتے ھیں - انھوں نے تو اس لیے ھاتھ کھینچے - آپ لوگ تو اسے جائز کہتے ھیں۔ آپ نے کیوں ھاتھ کھینچ لیے - آپ صاحب کھائیں

---

(۱) ایوب قادری، محمد مترجم و مرتب " تذکرہ علمائے ھند "، محولہ بالا ، ص ۹۲-۵۹۱

(۲) عبدالحی، مولانا سید " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص ۵۲۳

مگر کسی نے نہ کھایا۔ اس پر شاہزادے نے کہا کہ میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ یہ مہران کا بکرا نہیں ہے بلکہ میں نے یہ صرف امتحان کے لیے کہا تھا کہ دیکھوں کون اپنے خیال میں سچا ہے اور کون جھوٹا۔ اب مجھے معلوم ہوگیا ۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ صاحبان بے تکلف کھائیں ۔" (۱)

صاحب " حیاۃ بعد المماۃ" نے بھی ان سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا ہے ۔ اس سے بھی ان کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے ۔ ضمناً یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ان کا تعلق تھا۔ یہ واقعہ میاں نذیر حسین محدث دہلوی کی زبانی بیان کیا گیا ہے ۔ میاں صاحب فرماتے ہیں :

" ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نواب قطب الدین خان مرحوم نے اپنے کسی رسالے میں لکھا کہ " الو حلال ہے" ۔ مولوی کریم اللہ صاحب نے جو مخالف تھے وہ رسالہ بادشاہ کو دکھلایا اور کہا کہ مولوی قطب الدین " الو کو حلال" لکھتے ہیں ۔ بادشاہ کو بھی تعجب ہوا۔ بادشاہ نے کہا کہ اچھا میں ان کو مناظرے کے لیے بلاتا ہوں ۔ نواب قطب الدین خان کا ایک خط جو مضطربانہ حالت کا لکھا ہوا تھا نماز عشا کے بعد میاں صاحب کے پاس پہنچا کہ شام کو شاہی چوبدار آکر کہہ گیا ہے کہ کل صبح کو حضور میں طلبی ہے ، مناظرہ ہوگا۔

میاں صاحب نے جواب دیا کہ ان شاء اللہ میں سویرے پہنچوں گا ۔ خود فرماتے تھے کہ مسائل متنازعہ میں اٹھائیس کتابوں کی سند نکالی اور کتابوں کو چھکڑے پر لاد کر نواب صاحب کو لیتا ہوا دربار میں پہنچا۔ یاروں کو خبر لگ گئی ۔ اب کون آتا ہے ۔ نو بجے تک ٹھہرا۔ آخر بہادرشاہ نے چار روپے کی مٹھائیاں منگواکر ہمارے ساتھ کردیں ۔

---

(۱) اشرف علی تھانوی، مولانا (مرتب) " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص، ۱۲۸

طلبه
هم دونون آدمی سمیت بادشاه سے رخصت هوئے -

قلعے مین ایک شخص کے هان اس وقت دعوت تھی هم لوگ وهان گئے اور کتابون کا چھکڑا روانه کردیا - اتفاق سے تین کتابین ، عالم گیری ، برجندی اور طحطاوی طلبه کے هاتھون مین ره گئین - کھانا کھا هی رها تھا که چوبدار شاهی نے آکر کہا که حضور نے صرف نواب قطب الدین خان صاحب کو یاد کیا هے - نواب صاحب گھبرائے مین نے ترش روئی کے لہجے مین چوبدار سے کہا که کیا بادشاه نے یه بھی کہا هے که مین وهان نه جاؤن اچھا چلو مین حضور سے خود پوچھتا هون - چوبدار میرے اس کہنے پر کچھ گھبرایا مین سمجھ گیا که " صرف نواب قطب الدین خان" کا لفظ یارون کی چالاکی هے - قصه کوتاه هم اور نواب صاحب پہنچے - دیکھا که مولوی کریم الله صاحب مع اپنے اعوان کے دربار مین بیٹھے هین-

پہلی بات مولوی کریم الله صاحب نے پیش کی که " الو حلال هے یا حرام؟" مین نے تینون کتابین عالم گیری ، برجندی اور طحطاوی یکے بعد دیگرے نکال کر حکیم امام الدین خان صاحب طبیب شاهی کے سامنے رکھ دین که آپ پڑھ کر حضور کو مطلب سمجھادین- ان کتابون مین تو لکھا تھا که " البوم یوکل و الخفاش لایوکل"(۱) حکیم صاحب نے بادشاه کو سمجھایا - اس کے بعد مین نے کہا که مین اٹھائیس کتابین لایا تھا - اور حضور نے کتابون کا پشتاره ملاحظه بھی فرمایا تھا - مگر چون که اس وقت کوئی نهین آیا اور بعد انتظار بسیار حضور نے رخصت کردیا- اس لیے زیاده کتابین مین نے واپس کردین - یه تین کتابین اتفاقیه طور پر طلبه کے هاتھون مین ره گئین ورنه اٹھائیس کتابین پیش کرتا -

بهر کیف مین نے تو یه تین مشهور اور معتبر کتابین مین دکھادیا - اب میرے حریف

---

(۱) اس جملے کا ترجمه یه هے که " الو کھایا جاتا هے اور چمگادڑ نهین کھایا جاتا- (ابوسلمان شاهجهان پوری)

جو حرام کہتے ہیں وہ اپنی سند پیش کریں۔ مولوی کریم اللہ صاحب نے کہا کہ اس کو رسالہ "سبدیہ" میں حرام لکھا ہے ۔" میں نے پوچھا یہ کتاب کس زبان میں ہے اور مصنف اس کا کہاں کا رہنے والا ہے اور کس طبقے کا عالم ہے ۔ مولوی کریم اللہ نے کچھ جواب نہ دیا ۔ تب میں نے کہا کہ اچھا مجھ سے سنئے ۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے اور مصنف اس کا ولایتی ہے ۔ کوئی مشہور اور معتبر عالم نہیں ۔ میں نے جس پایہ کی کتابیں پیش کی ہیں اس کی ہم پایہ کوئی کتاب لائیے۔ حکیم امام الدین خاں صاحب نے بھی کہا کہ بے شک جیسی کتابیں انہوں نے پیش کیں ویسی ہی آپ کو بھی لانا چاہیے ۔ مولوی کریم اللہ صاحب نے جواب دیا کہ میں کیا جانتا تھا کہ الو کا مسئلہ وہاں پیش ہوگا ۔ میں نے جواب میں کہا تو کس الو نے اس کو پیش کیا۔

مولوی کریم اللہ صاحب کچھ برافروختہ ہوکر بادشاہ سے کہنے لگے کہ یہ " مولوی قطب الدین حضور کو کافر ~~کہتے~~ لکھتے ہیں" ۔ بادشاہ نے نہایت اخلاق سے نواب صاحب کی طرف خطاب کرکے کہا کہ کیوں بھائی قطب الدین! ہم کافر ہیں؟ نواب صاحب قسمیں کھانے لگے کہ نہیں حضور ہم نے ہرگز ایسا نہیں لکھا ہے ۔ میں نے کہا حضور مجھ سے اس کی حقیقت سنیں۔ حضور کو معلوم ہے کہ "فتاوی عالم گیری "آپ کے بزرگوں کی کتاب ہے ۔ اس ~~میں~~ میں ایک باب ہے " کتاب المردۃ"، جس میں لکھا ہے " اس زمانے کے بادشاہوں کو جو عادل کہے وہ کافر ہے ۔ کیوں کہ عدل شرعی کہاں متصور ہے ۔" اس باب کا ترجمہ مولوی قطب الدین نے کیا ہے ۔ تو کیا حضور "فتاوی عالم گیری" کی تالیف کے وقت موجود تھے ۔ حضور اگر اس وقت موجود ہوتے تو البتہ اس کے مورد ہوتے۔ بادشاہ نے کہا یہ تو دوسری بات ہے ۔ میں نے کہا کہ بات یہی ہے جس کا عنوان بدل کر حضور میں پیش ظاہر کی گئی ہے۔" (۱)

---

(۱) فضل حسین بہاری، " الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا، ص: ۲۲-۱۲۰

لیکن مولوی کریم الله صاحب کے کمال علم و فضل اور منطق میں مہارت اور ذہانت کے اصل جوہر ان کی اس تحریر میں کھلتے ہیں جو انہوں نے سرسید کے کفر و ارتداد کے اثبات اور "مدرسة العلوم علی گڑھ" کے معاملات میں ان سے تعاون کے عدم جواز میں ایک فتوے پر بطور تصدیق لکھی تھی - مولوی امداد العلی نے ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے علما سے علمائے ایک فتوی حاصل کیا تھا۔ انہوں نے اپنے استفتا میں پوچھا کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد اور اقوال وافعال ہوں وہ مسلمان ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ جو مدرسہ ایسا شخص فلاں فلاں اغراض سے قائم کرنا چاہے اس میں چندہ دینا اور اس کی اعانت کرنی مسلمانوں کو جائز ہے یا نہیں؟ مولوی کریم الله صاحب نے نہایت پر زور الفاظ میں سرسید کے کفر و ارتداد قطعی اور مدرسة العلوم میں ان سے عدم تعاون کے جواز میں مہر تصدیق ثبت کی ہے - انہوں نے نہ صرف مسلمانوں پر " بلکہ تمامی سنی و شیعی و خارجی وسوائے ہنود وتمامی سکنائے اہل زمین" پر اس فتوی پر عمل کو " واجب و متحتم" ٹھہرایا ہے-(۱) ظاہر ہے کہ اس کمال ذہانت و منطق اور حسن استدلال کا جواب سرسید غریب کہاں سے لاتا - حالی مرحوم بھی اپنے تمام فضل و کمال اور سرسید سے غایت درجے عقیدت کے باوجود اس کا توڑ نہ کرسکے -

خلیق احمد نظامی نے انہیں یگانۂ فن ارباب علم و فضل میں شامل کیا ہے -(۲)

اگرچہ نظامی صاحب کے بیان میں ان کے خاص فن کی کوئی صراحت نہیں ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کا خاص فن " تدریس" ہوگا - صاحب " تذکرہ علمائے ہند" نے انہیں کثیرالدرس و التصانیف لکھا ہے -(۳) لیکن ہمیں سوائے ان کے دو بیٹوں کے جو ان کے شاگرد بھی تھے،

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۲۸۲-۸۳

(۲) خلیق احمد نظامی، " تاریخی مقالات"، محولہ بالا، ص ۲۵۲

(۳) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب)، " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۳۹۷

نہ تو ان کے کسی شعبہ کا پتا چلا اور نہ ان کی کسی تصنیف کا علم ہوسکا۔ صرف صاحب "نزہۃ الخواطر" نے ان کے ایک شاگرد مولانا فریدالدین دہلوی کا نام لکھا ہے - (۱) ان کی دو تحریریں ہماری نظر سے گزری ہیں - ایک تحریر سرسید کے متعلق ہے اور اس وجہ سے تاریخ میں باقی رہ گئی - یہی تحریر ہم یہاں ان کی تحریر کے نمونے کے طور پر درج کرتے ہیں :

" در سنوح این سانحہ ایمان زدائے و وقوع این واقعۂ ہوش ربا و ظہور این معاملۂ فجیعت افزا و حدوث این حادثۂ الحاد افشائے تعمیر کرنا اور کرانا بقول و فعل اس قائل کے ایسے مکان کا اور معاونت کرنی ایسے طلبہ کی اور اپنے مال معصوم کو غیر معصوم کرنا اور ہم پائے ہونا اس خوش عقیدہ کے - کہ جس کا حال بدمآل اس سوال میں مذکور ہے - بالکل باطل، اور ایسے مکان ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محل تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرہ حیوانات میں داخل ہونا ہے - اعوذ باللہ من الحور بعد الکور - بل بالکل باطل بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم اور ایسے بے محل میں مساعی ہونا ہیمہ اور حطب بننا لازم۔ الحاصل معاونت ایسے غارتی ایمان اور مال کی اور اِلّیہہ سمجھنا اپنے مال کا خیال خام - نے نے بلکہ سمجھے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور اپنے اعمال صالحہ کو مٹاتا ہوں پس مرد دیندار بلکہ تمام سنی و شیعی و خارجی و سائر ہنود وتمامی سکنائے اہل زمین پر واجب اور متحتم ہے کہ ایسے کلام واہی اور ایسے واہی عقیدے والے پر عقیدہ اپنا جمادیں - بلکہ ہر فرد ہرمذہب کا اس شخص کو ہادم بنائے اپنے مذہب کا سمجھے اور اس امر پوچ پر دل نہاد نہ ہووے اور اپنے دل میں اس کا انجام سوچے کہ کیا جال بچھایا ہے -" (۲)

ان کی دوسری تحریر اہل حدیث کے رد میں ہے - نا مناسب نہ ہوگا کہ اسے بھی اس تذکرے میں محفوظ کردیا جائے - اگرچہ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ تحریر نہایت صاف

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید : "نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۷۳
(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین : "حیات جاوید"، محولہ بالا، حصہ دوم، ص ۱۸۳

اور سادہ ہے لیکن فکری طور پر وہ اس تحریر میں بھی جادۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اہل حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں :

" .... یہ لوگ اسمعیلی ہیں۔ مولوی اسمعیل کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی تھے ۔ مگر سچ یقین ہے کہ ان کا یہ گمان فاسد اور محض ظلم اور کذب ہے ۔ وہ ہرگز ایسے نہ تھے بلکہ انھوں نے نواح پشاور میں بعد مباحثہ علمائے حنفیہ کے رفع یدین چھوڑ دیا تھا ۔ اور عالم محقق تھے۔ ایسے لوگوں کو جو پاتے تو گور پرستوں سے زیادہ بد جانتے اور جیسا گور پرستوں کو رد کیا ان کو بھی مردود کر چھوڑتے ۔ یہ محض دغابازی اور فریب ہے لوگوں کا جو مولوی موصوف کو لامذہبوں میں گنتے ہیں اصول کا رسالہ ان کا موجود ہے [illegible] سراسر کرخی اور طحاوی کے طور پر اور ایک رسالہ تنویر العینین کو جو بعضے آدمیوں نے ان کی شہادت کے بعد انکار کرکے مشہور کیا۔ اگر وہ انکار ہو تو بھی بسبب اس کے کہ انھوں نے رفع یدین آخر عمر میں ترک کیا اس بات میں معتبر نہ رہا ۔ موافق مذہب اہل حدیث کے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے " العبرۃ بالخواتیم و انما الاعمر بالخواتیم ۔" (۱)

=====xxxxx====

جناب مولوی محبوب علی سلمہ اللہ تعالی :

" اجلۂ سادات کبار سے ہیں۔ علم حدیث و فقہ میں اقران و امثال سے بعض جہان دیدہ و سفر کردہ ۔ تحصیل علوم عقلیہ اور نقلیہ کی جناب مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ العزیز کے خاندان رفیع الارکان سے کی ۔ ان فنون میں ایسی مہارت رکھتے ہیں کہ مسائل جزئیہ مثل لوح محفوظ کے ان کے تختۂ حافظہ پر منقوش ہیں۔ جو کہ راقم کے والد ماجد مرحوم کے ساتھ اتحاد قدیم تھا۔ اسی نظر سے اس احقر کو بھی نظر الطاف سے منظور فرماکر بزرگانہ عنایت کرتے ہیں۔" (۲)

---

(۱) قطب الدین ، مولانا محمد : تنبیہ الضالین و ہدایۃ الصالحین "، محولہ بالا ، ص: ۱۱۰-۱۱ (برحاشیہ نظام اسلام)

(۲) سرسید احمدخان : آثارالصنادید "، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۱۰۸

تعلیقات :

مولوی سید محبوب علی یکم محرم، ۱۲۰۰ھ/ ۳ نومبر، ۱۷۸۵ء ، بروز جمعہ دھلی میں پیدا ھوئے - نسباً سید جعفری نقوی رضوی تھے۔ والد کا نام مصاحب علی ابن میر حسن علی خاں تھا- (۱) جو مغلیہ دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ مولوی عبدالقادر کے بقول "ان کے والد سرکار بادشاہ دھلی کے قدیم متوسلوں میں سے تھے - (۲) مولوی محبوب علی شاہ عبدالعزیز کے تلمیذ رشید اور اعاظم خلفا میں سے تھے۔ ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے شاہ صاحب سے ان کی تحصیل علمی اور اکتساب فیض کا اعتراف کیا ھے -(۳) لیکن سرسید اور مولوی عبدالقادر نے جو معاصر و واقف ترجمہ ذھیں ھیں ، انھیں شاہ عبدالعزیز کی بجائے ان کے خاندان رفیع الارکان کا شاگرد بتایا ھے -(۴) اس سلسلے میں نواب صدیق حسن خان کا بیان اس معاملے کو صاف کردیتا ھے - ان کے بیان کے مطابق مولوی صاحب موصوف نے شاہ عبدالقادر کی خدمت میں فقہ و حدیث کی تحصیل کی تھی ، انھیں سے بیعت بھی تھے اور

---

(۱) سید احمد ولی اللھی ، ظہیرالدینؒ ، " یادگار دھلی" ، محولہ بالا ، ص ۹۲

(۲) ایوب قادری ، محمد (مترجم و مرتب) ، " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) " ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲۵۲

(۳) سید احمد ولی اللھی ، ظہیرالدینؒ " یادگار دھلی" ، محولہ بالا ، ص ۹۲
بشیرالدین احمد ، " واقعات دارالحکومت" ، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۵۷۵
محمد عالم شاہ فریدی ، " مزارات اولیائے دھلی" ، محولہ بالا ، ص ۱۵
سید احمد ولی اللھی ، ظہیرالدینؒ " کمالات عزیزی" ، محولہ بالا ، ص ۹
محمد میاں ، مولانا سید " علمائے ھند کا شاندار ماضی" ، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۵۰
ابوالحسن علی ندوی ، سید " سیرت سید احمد شہید" ، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۵۳
خلیق احمد نظامی ، " تاریخی مقالات" محولہ بالا ، ص ۲۵۳

(۴) سرسید احمد خان ، " آثارالصنادید" ، محولہ بالا ، چوتھا باب ، ص ۲۷۸
ایوب قادری ، محمد (مترجم و مرتب " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) " ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲۵۲

بعض کتب میں شاہ عبدالعزیز سے بھی استفادہ کیا تھا ۔ نواب صاحب فرماتے ہیں :

" تحصیل علوم متداولہ از فقہ حدیث بخدمت حضرت شاہ عبدالقادر دھلوی قدس سرہ صاحب ترجمہ موضح قرآن کردہ اند و دست بیعت ہم بجناب دادہ و استفادہ بعض کتب بخدمت شاہ عبدالعزیز صاحب نیز کردہ اند ۔" (۱)

مولانا سید عبدالحی نے بھی شاہ عبدالقادر سے تحصیل علم ، شاہ عبدالعزیز سے سند حاصل کرنے اور سید احمد شہید سے بیعت کا ذکر کیا ہے ۔ شاہ عبدالقادر سے ترمذی پڑھنے میں شاہ اسمعیل بھی ان کے شریک تھے ۔ (۲)

مولوی عبدالقادر نے تفسیر و حدیث سے ان کی خاص دل چسپی ، ذھن رسا اور طرز مباحثہ و مناظرہ میں ان کی خوبی تقریر کا ذکر کیا ہے ، لکھتے ہیں :

" ان کی توجہ زیادہ تر تفسیر اور حدیث پر ہے اور ان کی ہمت حتی المقدور علم کے مطابق عمل میں مصروف ہے ۔ ہر معاملے میں ذھن رسا اور فکر درست رکھتے ہیں ۔ طرز مباحثہ اور طریق مناظرہ کو مختصر تقریر میں عمدہ ادا کرتے ہیں ۔" (۳)

اگرچہ مولانا حیدر علی رام پوری نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ " فہمید بقدر طالب علم مستعد ہم نمی دارند " ۔(۴) لیکن یہ رائے اختلاف فکر و مسلک میں شدت اور مبالغے سے خالی نہیں ۔ نواب صدیق حسن خان کی رائے خوب و درست ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" سلسلہ وعظ و تقریر ایشان دربیان معنی آیات و حدیث بسیار خوب است واز

---

(۱) ایوب قادری ، محمد (مرتبہ) " تاریخ قنوج " از نواب صدیق حسن خان ، (ص ۲۰۰) بحوالہ ماہنامہ " سرحد " ، کراچی : جون و جولائی ، ۱۹۷۳ء ، ص ۲۸

(۲) عبدالحی ، مولانا سید " نزھتہ الخواطر " ، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۳۰۶

(۳) ایوب قادری ، محمد (مترجم و مرتب) " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) " ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲۵۲

(۴) ایوب قادری ، محمد (مرتب) " تاریخ قنوج " (مکتوب مولانا حیدر علی رام پوری ، بنام نواب صدیق حسن خان) ، بحوالہ ماہنامہ " سرحد " ، محولہ بالا ، ص ۶۱

زمرۂ واعظان زمانہ موصوف بمزید خوش بیانی هستند۔"(۱)

اگرچہ نواب صاحب موصوف انهیں تقلید امام ابوحنیفہ میں" سخت متعصب و راسخ القدم" بهی لکهتے هیں۔(۲) سرسید نے حدیث و فقہ میں ان کے امتیاز و مهارت کاذکر کیا هے نیز ان کی صفات عالیہ میں " جہان دیدہ و سفر کردہ" تحریر کیا هے - محمد ایوب قادری کا خیال هے کہ اس سے سرسید کا اشارہ میوات کے تبلیغی اسفار کی طرف هے - وہ لکهتے هیں :

" مولانا محبوب علی دهلوی نے میواتیوں میں تبلیغ کا کام بہ اندازہ خاص کیا. . . . مولوی عبدالقادر نے " مصروفیت عمل" اور سرسید نے " سفر کردن" سے ممکن هے ان کی ان تبلیغی سرگرمیوں کی طرف هی اشارہ کیا هو -" (۳)

ان کی تبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں مولف" تاریخ میوات " لکهتے هیں :

" (مولانا محبوب علی) زبردست فاضل، غازی، متشرع عالم تهے۔ غدر سے پہلے آپ میوات میں تشریف لائے - آپ کی تعلیم کا طریقہ نرالا تها جو ان جاهل اکهڑ میواتیوں کو گرویدہ کرلیا کرتا تها۔ بہلی کرایہ کرکے گاؤں گاؤں دورہ فرمایا کرتے تهے - آپ هی کے وعظ و نصیحت سے میوات میں صوم و صلوۃ کا رواج هوا اور مسجدیں تعمیر هونے لگیں۔ ورنہ قبل اس کے (یہاں) مسجد بنانے کا دستور نہ تها۔" (۴)

مولوی محبوب علی سید احمد شہید سے بیعت بهی تهے -(۵) اور ابتدا میں

---

(۱) ایوب قادری، محمد (مرتب) :" تاریخ قنوج"، بحوالہ ماهنامہ "سرحد"، کراچی، محولہ بالا، ص ۲۸

(۲) ایضاً، بحوالہ ماهنامہ "سرحد"، محولہ بالا، ص ۲۹

(۳) ایوب قادری، محمد :" تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ"، کراچی : مکتبہ معاویہ ، ۱۹۷۱ء، ص ۵۸

(۴) عبدالشکور میواتی، مولانا ابومحمد :" تاریخ میوات " دهلی : [redacted] محبوب المطابع، ۱۹۱۹ء، ص ۸۷

(۵) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) :" علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) ، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲۵۲

تحریک جہاد و ہجرت کے سرگرم اور خاص ارکان میں سے تھے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :

" جن ہندوستانی علما و احباب کے نام سرحد سے خطوط اور اطلاعات جاتی تھیں ان میں مولوی محبوب علی صاحب بھی تھے - آپ نے سید صاحب کی ہجرت کے بعد ہندوستان میں جہاد و ہجرت کی دعوت جاری رکھی اور آپ کی ترغیب و تحریص سے مجاہدین کا ایک قافلہ آپ کی ہم راہی میں روانہ ہوا۔" (۱)

ان کے قافلے میں شامل افراد کی تعداد معلوم نہیں ہوسکی لیکن اس زمانے میں جو قافلے سرحد پہنچے۔ مرزا حیرت دہلوی نے ان کے افراد کی تعداد چھ سو بتائی ہے۔(۲) اور مولانا غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق قافلوں کی تعداد پندرہ ہے ۔(۳)

۱۸۲۷ء میں مولوی محبوب علی اپنے قافلے کے ساتھ سرحد جارہے تھے کہ کنڈوہ کے مقام پر انہیں تقریباً دو ماہ مجبوراً رکنا پڑا۔ اس کا ان کے قلب پر خاص اثر ہوا اور انہوں نے سید صاحب کو خط لکھا کہ کفار کو چھوڑ کر پہلے ان " کلمہ گو کافروں" (یعنی درانیوں) کا فیصلہ کیجئے - سید صاحب نے انہیں خط لکھ کر تشفی کی - پھر جب وہ پنجتار میں سید صاحب سے ملاقی ہوئے تو ان کے ذہن نے ایک فیصلہ کرلیا تھا اور وہ ایک ایک چیز سے غیر مطمئن تھے - سید صاحب کی امامت پر ، جہاد پر ، لباس پر، کھانے پر انہیں اعتراض تھا۔ اور بہترین مساعی اور دلائل کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوئے اور ایک روز شب کو مولوی صاحب اپنے بعض ساتھیوں کو لے کر جو صاحب" تواریخ عجیبہ " کے بقول کئی سو تھے سیدصاحب کی معیت چھوڑ کر واپس چلے گئے اور طویل و صبر آزما سفر کے بعد مقام جہاد پر پہنچ کر اس عظیم الشان کار حق کے ثمرات و برکات سے محروم کلو رہ گئے -

---

(۱) ابوالحسن علی ندوی، سید،" سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۵۳
(۲) حیرت دہلوی، مرزا محمد" حیات طیبہ"، محولہ بالا ، ص ۳۲۳
(۳) مہر، مولانا غلام رسول،" سید احمد شہید"، محولہ بالا ، ص ۳۳۰

مولوی محبوب علی نے واپسی کے بعد بھی خاموشی اختیار نہیں کی بلکہ دہلی پہنچ کر تحریک جہاد کے خلاف کام کرنا شروع کردیا۔ اس کا اثر یہاں سے سرمایے کی فراہمی اور مجاہدین کی قافلوں کی تیاری پر پڑا۔ اور جب سید صاحب نے دہلی کے ذمہ دار افراد کو خطوط لکھے اور مولوی محمد حسن کو بھیجا اور حقیقت واضح ہوئی تو یہ فتنہ رفع ہوا۔(۱)

سرحد سے واپسی کے بعد مولوی سید محبوب علی بقول نواب صدیق حسن خان ۱۸۶۱ء تک جب کہ آپ نے تاریخ "قنوج" تالیف فرمائی ایک مختصر وقفے کے سوا درس و تدریس حدیث میں مصروف رہے۔(۲)" وقفہ سے اشارہ غالباً ۱۸۵۷ء کی طرف ہوگا جب کہ دہلی کی پوری زندگی تہ و بالا ہوگئی تھی۔

سرسید نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے فتوی جہاد پر دستخط کرنے سے قطعاً انکار کردیا تھا۔ ان کے نزدیک جہاد کے لیے شرعی شرائط موجود نہیں تھیں۔(۳) ڈاکٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کی کتاب " ہمارے ہندوستانی مسلمان" پر تنقید کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں :

" مولوی وہی شخص تھے جن کو ۱۸۵۷ء میں باغیوں کے سرغنہ بخت خان نے

---

(۱) حیرت دہلوی، مرزا محمد، " حیات طیبہ"، محولہ بالا، ص ۳۲۲-۲۶

(۲) جعفر تھانیسری، مولوی محمد، " تواریخ عجیبہ موسوم بہ سوانح احمدی"، دہلی : فاروقی پریس، ۱۳۰۹ھ، ص ۸-۱۰۷

مہر، مولانا غلام رسول،" سید احمد شہید"، محولہ بالا، ص ۳۵-۳۳۰

ابوالحسن علی ندوی، سید،" سیرت سید احمد شہید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۵۶-۵۳

محمد میاں، مولانا سید،" علمائے ہند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۸۶-۲۸۵

(۲) ایوب قادری، محمد (مرتب و مترجم)،" تاریخ قنوج"، بحوالہ "سرحد"، کراچی، محولہ بالا، ص ۶۹

(۳) سرسید احمد خان، " ہنٹر پر ہنٹر"، لاہور : اقبال اکیڈمی، ۱۹۳۹ء، ص ۳۲

ذکاء اللہ، محمد،" تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ"، دہلی : شمس المطابع، ۱۹۰۳ء ج ۲، ص ۶۷۳

اشرف علی تھانوی، مولانا (مرتب)،" ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا، ص ۳۶-۳۳۵

محمد میاں، مولانا سید،" علمائے ہند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا، ج ۳، ص ۹۷-۱۹۵

میں ہنگامہ غدر میں طلب کیا اور ان سے درخواست کی کہ آپ اس زمانے میں انگریزوں پر جہاد کی نسبت ایک فتوی پر اپنے دستخط کریں ۔ مگر مولوی محبوب علی نے انکار کیا اور بخت خاں سے کہا کہ ہم مسلمان ہیں گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں ہم اپنے مذہب کی رو سے اپنے حاکموں سے مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اور طرہ برین یہ ہوا کہ جو ایذا بخت خاں اور اس کے رفیقوں نے انگریزوں کی میموں اور بچوں کو دی تھی اس کی بابت بخت خاں کو سخت لعنت ملامت کی ۔" (۱)

" ارواح ثلاثہ" کی ایک روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی طرف داری کی تھی اور مجاہدین آزادی کے ساتھ تعاون کرنے اور ان کا ساتھ دینے سے انکار کردیا تھا۔ اس لیے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی کامیابی کے بعد انگریزوں کی طرف سے ان کو گیارہ مسلّم گاؤں انعام میں پیش کیے گئے کہ انہوں نے وعظ و نصیحت کے ذریعے لوگوں کو اس ہنگامہ میں حصہ لینے سے روکا تھا۔ مولوی صاحب نے اس انعام کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اور کہا کہ " میں نے تمہارے لیے ایسا نہیں کیا تھا بلکہ میرے نزدیک شرعی حکم یہی تھا۔ اس لیے لوگوں کو منع کرتا تھا۔" (۲) لیکن ان دونوں روایتوں میں تاریخ کی صداقت موجود نہیں ہے ۔ اس لیے کہ " صادق الاخبار" دہلی میں یہ فتوی نقل ہوا تھا اس میں دوسرے مفتیان دین کے ساتھ " سید محبوب علی جعفری" کا نام بھی موجود ہے ۔(۳) اور غالباً یہی وجہ تھی کہ دہلی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد دہلی کی سرزمین ان پر بھی تنگ ہوگئی اور انہیں تقریباً ایک سال بھوپال میں رہنا پڑا تھا پھر غرۂ جمادی الثانی ، ۱۲۷۸ھ/دسمبر، ۱۸۶۱ء میں ہجرت کے ارادے سے حرمین شریفین کے لیے روانہ ہوگئے۔(۴)

---

(۱) سرسید احمدخاں: "ہنٹر پر ہنٹر"، محولہ بالا، ص ۳۲

(۲) اشرف علی تھانوی، مولانا (مرتب) : "ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا، صص ۳۶-۳۳۵

(۳) عتیق صدیقی (مرتب) : "۱۸۵۷ء — اخبار اور دستاویزیں"، دہلی: مکتبہ شاہ راہ، ۱۹۶۶ء، ص ۱۹۹

ایوب قادری، محمد: "جنگ آزادی"، محولہ بالا، ص ۳۰۵

(۴) ایوب قادری، محمد (مرتب) : "تاریخ الفوج"، ص ۲۹، بحوالہ ماہنامہ "سرحد"، کراچی، محولہ بالا، ص ۲۲

یہ بات نواب صدیق حسن خان نے بھوپال سے روانگی کے بارے میں لکھی ہے - ان کے حجاز جانے اور واپس آنے کا تذکرہ کسی اور جگہ نظر سے نہیں [illegible] گزرا۔

مولوی محبوب علی کا انتقال ۱۰ ذی الحجہ ، ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۵ع بروز شنبہ دہلی میں ہوا۔ چونسٹھ کھمبا بیرون ترکمان دروازہ بوچڑ خانے سے آگے سڑک کے بائیں طرف آپ کا مزار ہے - (۱)

قاضی محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری حدیث میں اور مولانا احسان علی بچھرری فقہ و حدیث میں ان کے شاگرد تھے۔ (۲) مولوی محبوب علی کی کسی مطبوعہ تصنیف کا علم نہیں ہوسکا۔ البتہ چند قلمی رسائل " اختصار الصیانتہ "، " صیانتہ الایمان " اور " رسالہ دربیان عدم جواز رفع سبابہ " نیشنل میوزیم آف پاکستان ، کراچی میں موجود ہیں۔(۳)

مولانا حیدر علی رام پوری کے حالات میں ہے کہ انھوں نے ایک رسالہ " صیانتہ الاناس من وسوستہ الخناس " اردو میں اور رسالہ " رفع یدین " فارسی میں لکھا تھا جو مولوی محبوب علی کے رسالے کے رد میں تھا۔ (۳) میرا خیال ہے کہ یہ رسالہ مولوی صاحب موصوف کے دوسرے رسالے کے جواب میں ہوگا۔ انھوں نے " تاریخ میوات " لکھنا بھی شروع کی تھی لیکن مکمل نہیں ہوسکی۔ مولوی عبدالشکور میواتی نے اپنی تاریخ میں اس کے بعض اجزا سے استفادہ کیا تھا جو انھیں ایک ذریعہ سے مل گئے تھے (۵) نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے:

---

(۱) سید احمد ولی اللہی ، ظہیرالدین: " یادگار دہلی "، محولہ بالا ، ص ۹۲
محمد عالم شاہ فریدی: " مزارات اولیائے دہلی "، محولہ بالا ، ص ۱۵

(۲) عبدالحی ، مولانا سید: " نزہتہ الخواطر "، محولہ بالا ، ج ۷ ، صص ۲۱ اور ۲۰۷

(۳) ایوب قادری ، محمد (مرتب): " علم و عمل (وقائع عبدالقادرخانی) "، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۳۵۲

(۳) ایوب قادری ، محمد (مرتب): " تاریخ فتوح " (ص ۲۹-۲۸ و ۳۰۵) ، بحوالہ ماہنامہ " سرحد "، کراچی ، محولہ بالا ، صص ۶۱-۶۰ و ۴۷

[illegible] صدیق حسن خان ، نواب ، " ابجد العلوم "، محولہ بالا ، ج ۳ ، ص ۹۲۸
ایوب قادری ، محمد (مترجم ومرتب): " تذکرہ علمائے ہند "، محولہ بالا ، ص ۳۹۰
ایوب قادری ، محمد (مترجم ومرتب): " علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) "، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۶۹

(۵) عبدالشکور میواتی ، ابومحمد: " تاریخ میوات " محولہ بالا ، ص ۸۷

"اکثر رسائل اردو و حواشی کتب دینی و بعض رسائل بعبارت عربی و در دفع رفع سبابہ وغیرہ تالیف نمودند"۔(۱)

لیکن مذکورۃ الصدر تالیفات کے سوا ان کے اکثر رسائل اردو و حواشی کتب دینی و بعض رسائل بعبارت عربی" کے بارے میں ابھی ہم تک تحقیق کی روشنی نہیں پہنچی ہے۔

سرسید نے مولوی سید محبوب علی کی تحریر کا نمونہ نقل نہیں کیا تھا۔ ہم یہاں ان کے ایک مختصر رسالے کو جو انھوں نے بطرز مکتوب لکھا تھا نقل کرتے ہیں :

" بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ کہ حق تعالی نے ہم مسلمان محمدی حنفی لوگوں کو معتزلہ اور خوارج اور نواصب اور روافض کے مذہب کی خصوصیت سے بچایا اور خاص اہل سنت و جماعت کا مذہب سکھایا اور درود اوسکے رسول مقبول پر جس نے خبردار کیا کہ جب اختلاف ہووے امت میں تو میرے خلیفوں ارشدین کی راہ دیکھ لو کہ کدھر کو ہے پس غلو تقلید اماموں کی کا اور غلو تقلید محدثین کی کا ہم سے دور کیا اور حسبنا کتاب اللہ کا مفہوم ہم کو سمجھا دیا پس جو لوگ کہ تقلید مولوی اسماعیل محدث کی قبول کرکے مذہب حنفی کو چھوڑتے ہیں اون کو اور جو لوگ مولوی مبتدع کہتے ہیں اون کو چھوڑ کر مذہب حنفی پر ہم مضبوط رہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کا اتباع سنت حسنہ اسلامیہ سے نہیں اور اوس کو بدعت اور تقلید حرام کہتے ہیں ان کو ہم نے اہل بدعت میں گنا اور جو ایسا کوئی مولوی کہا حضرت شاہ ولی اللہ کو آپ سا جانے اور کہے کہ وہ بھی ایسے تھے اوس کو گم راہ اور گم راہ کرنے والا جاننا چاہئے حافظ محمدی نے جو دو ورق تم کو لکھ کر دارجول میں بھیجے اور لے جانے والے نے کہا کہ یہ ترجمہ شاہ ولی اللہ کی کتاب کا ہے یہ سب جھوٹ ہے ۔ شاہ ولی اللہ پر رافضیوں نے تہمت اور بہتان کیا تھا کہ اوس نے رد شہادت حسین کا کہا ہے اب خارجیوں نے یہ بہتان کیا کہ اس نے رد مذہب اربعہ کا کیا ہے ہاں وہ رسالہ شاہ ولی اللہ کا جس میں ذکر

---

(۱) ایوب قادری ، محمد (مرتب) ، " تاریخ قنوج — ص ۲۰۱ " ، بحوالہ ماہنامہ " سرحد " کراچی ، محولہ بالا ، ص ۲۹

مذہبوں کی مضبوطی اور خوبی کا ہے دام اوس کا عقد الجید فی احکام الاجتہاد
والتقلید کی مذکور ہے اور ایک رسالہ انصاف فی حل الاختلاف ہی اوس میں ایسی
مبتدع لوگوں پر رد شدید ہے کہ جو بعد اجماع کی کچھ اختراع نکالیں اور اوس کو
دین سمجھیں پس جو موافق حضرت شاہ ولی اللہ کے فرماتے کہ جو لوگ بالفعل
حنفی اور شافعی ہونے سے انکار رکھتے ہیں وہ مبتدع اور گم راہ رہیں اور فی
مفسد ہیں کہ آپ کو مصلح سمجھتے ہیں اور مقلدین کو مفسد جانتے ہیں حال
ان کا مانند حال روافض و نواصب کے ہیں اللہ ہم کو مرجیہ معتزلہ کے
خصلتوں سے بچاوے اور ہم نے آج تک کوئی مسلمان نہیں دیکھا کہ وہ حنفی کہنے
کو مانند مسلمان کہنے کو جانتا ہو محض بہتان ہے کہ لوگوں کو تقلید پیغمبر کے
چھوڑ کر امام کی تقلید اختیار کرتے اوس احمق کو معنی تقلید کے سمجھ میں نہیں چ
آتے جو یہ بہتان لگایا ہے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع امتی پر
فرض ہے اور فرض کے تحقیق کے لیے مذہب حنفی ہم نے اختیار کیا کہ مثال اوس کا
یوں سمجھو کہ وضو کرنا فرض ہوا پس ہم نے پانی تلاش کیا پس پانی پاک و بے شبہ
بے شبہ نظر آتا ہے پانی پاک بے شبہ وضو میں استعمال کیا پس یہی پاک ہے واسطے ادا
کرنے فرض اقتدائے پیغمبر کے اتباع مذہب حنفی کا ہمارے حق میں اور تقلید پیغمبر
کے چھوڑنے جب ثابت ہوے کہ ہم کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم منع کریں کہ حنفی
مذہب مت اختیار کرو اور ہم پھر اختیار کریں اور جو شخص یہ چاہے کہ بخاری
کا کہنا اور حدیث کے علم والوں کا کہنا امام اعظم کی تحقیق سے بالا ہو وہ ابھی
حدیث صحیح اور فقہ معتبر کے معنی نہیں سمجھا برسوں چاہئے جو وہ اپنا
اسلام اور مذہب سے تحقیق نہ کریں وہ کیا جانیں کہ اطاعت اولی الامر کی کیا ہے
اور نزاع کس کو کہتے ہیں اور مخالف کس کو کہتے ہیں جتنی آیتیں اوس نے رد
تقلید میں لکھی ہیں وہ آیتیں تقلید شرک کو رد کرتی ہیں جس میں وہ خود
گرفتار ہے کہ مولوی اسمعیل کے کہے کو سارے اماموں کی اور علمائے امت کی تحقیق
سے باوجود دلیل ہونے کے مانتا ہے اور قرآن اور حدیث کو واسطے پیروی مولوی کے
ککجس جس نے آپ ولایت میں رفع الیدین اور جہر آمین کو چھوڑ دیا تھا چھوڑ تا ہے
اور اوسی پر صادق آتا ہے کہ حسبنا ماوجدنا علیہ آباءنا کہا اوسنے اور تقلید کو
بد میں ہمارے بدلے محمد اسحق صاحب اور حافظ محمد یعقوب صاحب نے درس میں
برملا پکار سے کہا ہے کہ ہم حنفی مذہب ہیں ہم پر کوئی بہتان کرے وہ گم راہ ہے

ملا اب خراب ہیں ایسی باتیں لکھ کر بیٹیوں کو ہنساتے ہیں اور آپ کو معتزلہ
کہلاتے ہیں کہ ہم محمدی ہیں اور حقیقت میں محمدی کے دشمن ہیں وہ جو طریق
خارجیوں کا اور معتزلہ کا تھا کہ آپ کو الامر بالمعروف اور اصحاب العدل اور
اصحاب التوحید ٹھہراکر اوروں کو ناقص العقل جانتے تھے وہ فرقہ ظاہر ہوا اور
پہلے سے جو غنی لوگ کہتے تھے کہ یہ لوگ معتزلہ ہیں وہ راہ کہلاکر انھوں
نے ان کے روبرو ایسی ایسی باتیں ہماری طرف کہتی ہوں گی ان گم راہوں کو
اللہ راہ پر لاوے یا سزادیوے اور وہ جو آیت " یا ایہاالذین امنوا اطیعوااللہ و اطیعواالرسول
و اولی الامر فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ و الرسول " پڑھتا اور مانند
گدھے کے سمجھتا ہی نہیں کہ مطلب اوسی آیت کا اوسی کے اوپر پڑتا ہے سمجھا
چاہئے کہ خداے تعالی نے ساری جماعت مسلمین کو فرمایا کہ یعنی سب مسلمانو تم
اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور صاحبان امر کی اپنے میں جو تنازع کرو تم سب
سے کسی چیز کے تو پھیرو اوسکو طرف اللہ کی اور رسول کی پس یہ حمقا لوگ
شارع اور تخالف کے معنی میں فرق نہیں سمجھی بلکہ تخالف جماعت مومنین سے
کرتے ہیں اور نام اوس کا تنازع شرعی کہتے ہیں حاصل یہ کہ اللہ اور رسول ہی
کی طرف پھیردا کا نام ہے اور یہ بات محض فریب اور دغا کی ہے اس لیے جو
روایت اجماع حنفیہ کے خلاف ہوگی اور منسوخ ہوگی اوس کو حنفی لوگ کہیں کر
خدا اور رسول کا فعل سمجھیں کے مثلاً رفع الیدین اور جہر آمین کا اور پانی
قلتین کے پاک ہونا وغیرہم ذلک کا جو منسوخ ہے کہیں کر روا جانیں کے اور اس
میں کہیں کر ان کے تنازع سے خلاف رسول کا اختیار کریں گے - پس حاصل یہ کہ
ان لوگوں کو اہل حدیث کی تقلید میں غلو حاصل ہوا ہے پس اوروں کو غالی
کہتے ہیں اور اپنی غلو اور افراط کی خبر نہیں لیتے اور یہ ہم حنفی لوگ
پیغمبر کی پیروی آپ کے مذہب حنفی میں سمجھ کر حنفی ہوئے ہیں اور اہل
حدیث کی جو روایتیں کہ حنفی اجماع سے مخالف ہیں ان میں ہم کو حدیثیں ہی ے
کے سبب شک ہے جس کا جی چاہے از روئے علم حدیث کے بھی سمجھ لیوے
اور جو منصف نہ ہوگا اوس کا علاج نہیں آتا قیامت میں سمجھ لے گا " اعلم
ان اطاعة اللہ ہی اطاعة الرسول و اطاعة الرسول ہی اطاعة اولی الامر و xxxxx
اطاعة المذاہب الحق الواضح و ہو عندنا مذہب الحنفیة الذین ہم غیر المرجیئة
و غیر المعتزلة والثابت المحقق علیہ ان اتباع المذہب الحنفی الخالص فرض مطلب

کلم و کل علم یخالفہ فھو باطل علی صاحبہ فمن اتبع المذھب الحنیفۃ وقال بہ صدق و من اتبع ظلم یقل بہ کذب والکذب بہ حرام فقط "۱۲۱۳۲۴۲۴۲۲ (۱)

==xxx===

زبدۃ المحدثین جناب مولانا محمد اسحاق غفراللہ لہٗ :

" مخدومی مخدوم الانامی افضل الکرام اکرم اشرف العظام ملک سیرت فرشتہ صورت جامع رموز حقیقت و طریقت مواظب اوامر شریعت فخر علمائے دین مسند المحدثین ، یگانہ آفاق زبدالفضل اولانا مولانا مولوی محمد اسحاق آپ نواسے ہیں مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم قدس سرہ کے ۔

علم حدیث کو شاہ صاحب مبرور مغفور کی خدمت میں حاصل کیا اور بیس برس کامل تک یہ فن شریعت اور علم حدیث ان کے حضور میں بیٹھ کر طلبہ جدید الفکر کو پڑھایا ۔ اتباع سنت سے کوئی کام آپ سے سرزد نہ ہوتا تھا کہ وہ فعل رسول مخلصانہ ہوتا ۔ چوں کہ حق جلّ و علا جلیل نے صورت اور سیرت دونوں عطا کی تھیں ، آپ کی صورت سے آثار صحابت ظاہر ہوتے تھے اور یقین ہوتا تھا کہ سید الثقلین صلوٰۃ اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صحبت کا فیض جنھوں نے پایا ہوگا ان کی یہی صورت و سیرت ہوگی۔ ع

" زہے امت خاتم المرسلین "

بعد وفات شاہ صاحب موصوف کے ان کا فرق مبارک دستار خلافت سے مزیّن ہوا اور تمام معتقدین صافی اعتقاد کی رجوع آپ کی طرف ہوئی ۔ ناز اور فخر کرنا چاہیے ایسی خدا جوئی پر کہ سب کچھ چھوڑ کر سفر حجاز اختیار کیا ۔ اور وہاں مع قبائل و عشائر پہنچ کر فرض حج ادا کیا اور تشریف لاکر مواعظ و نصائح سے خلق کو راہ ہدایت دکھاتے رہے بعد ایک مدت کے از بسکہ شعائر اسلام میں ضعف اور رسوم کفر و بدعات میں قوت آتی جاتی تھی ، نیت ہجرت کو مصمم کرکر تمام قبائل کو ہم راہ لے کر راہی مکہ

---

(۱) قطب الدین ، مولانا محمد (مؤلف) " رسالہ تنبیہہ الضالین و ہدایۃ الصالحین"، محولہ بالا ، تحریر محبوب بطور" مکتوب"، برحاشیہ " نظام اسلام"، صص: ۵٦-۱۵۲

معظمہ ھیں، اور باوصف کہ تمام سکنائے شہر اور سلطان وقت بہ سماجت تمام مانع آئے، چوں کہ شوق ماھوالحق غالب تھا ، آپ ممتنع نہ ھوئے اور مکہ معظمہ جاکر توطن اختیار کیا۔ اور بہ سبب کثرت کرم کے آپ کا کیسہ ھمیشہ خالی رھتا تھا ، خصوصاً ان لوگوں کی مراعات کے سبب جو ھندوستان سے ادائے حج کو وارد مکہ شریفہ ھوتے تھے ، وھاں کے لوگوں نے حضرت کے وجود مطہر کو از جملۂ مغتنمات سمجھا اور ان کا وھاں ھونا موجب برکت جانا۔ شاھجہاں آباد سے جدا ھوکر اس دیار میں چھ برس کامل تشریف رکھی - اب ایک برس کا عرصہ ھوتا ھے کہ اسی دیار میں جہان فانی کو وداع کیا اور عالم باقی کی طرف راھی ھوئے - چوں کہ حضرت بابرکت کو حدیث نبوی کی خدمت سے ایک لمحہ فرصت نہ تھی، نظم و نثر کی طرف ھرگز التفات نہ کرتے تھے - اس واسطے آپ سے اس قسم کا کلام کچھ یادگار نہیں -" (۱)

تعلیقات :
======

محمد اسحاق نام، ابوسلیمان کنیت اور الصدرالحمید لقب تھا۔ (۲) والد کا نام شیخ محمد افضل ابن احمد ابن محمد ابن اسماعیل ابن منصور ابن احمد ابن محمد ابن قوام الدین عمر تھا۔ اصلاً لاھور کے رھنے والے تھے۔(۳) شاہ محمد اسحاق کا مولد و منشا اور مہبط علمی دھلی تھا اس لیے دھلوی کی نسبت سے مشہور ھوئے - سن پیدائش ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء ھے۔

---

(۱) سرسید احمدخاں، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، صص ۵ - ۱۰۳

(۲) صدیق حسن خاں، نواب، " ابجد العلوم"، محولہ بالا ، ج ۳، ص ۹۳۰
عبیداللہ سندھی، مولانا ، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک "، محولہ بالا ، ص ۸۷

(۳) عبدالحی، مولانا سید ،" نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۵۱
فضل حسین بہاری، " الحیاۃ بعدالمماۃ " ، محولہ بالا ، ص ۳۵

(۴) ابویحیی امام خاں نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ھند"، محولہ بالا ، ص ۱۱۶
فضل حسین بہاری، " الحیاۃ بعدالمماۃ"، محولہ بالا ، ص ۳۵
مہر، مولانا غلام رسول، " جماعت مجاھدین" محولہ بالا ، ص ۳۱۲

شاہ ولی اللہ نے ان کی پیدائش کی پیشین گوئی کی تھی۔ شاہ عبدالعزیز کے نواسے تھے۔

صرف و نحو کی تحصیل مولانا عبدالحی بڈھانوی کی خدمت میں کی اور تمام کتب درسیہ شاہ عبدالقادر سے پڑھ کر ان میں تفقہ حاصل کیا، علم حدیث اور اس کی سند شاہ عبدالعزیز سے حاصل کی (۱) اور انہی سے بیعت اور انہی کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ کے دیگر اساتذہ میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر بھی تھے ۔ شاہ عبدالعزیز اپنے بھتیجے شاہ اسمعیل اور نواسے شاہ اسحاق کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور تحدیث نعمت کے طور پر قرآن کی یہ آیت پڑھا کرتے تھے :

" الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمعیل و اسحاق "

تحصیل علمی سے فراغت کے بعد مدرسۂ رحیمیہ میں تدریس کا آغاز کیا۔ شاہ عبدالعزیز کے انتقال کے بعد آپ کی مسند درس و تدریس کی جانشینی اور تحریک ولی اللہی کی رہنمائی کی ذمہ داری آپ ہی پر تھی ۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء میں فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حجاز تشریف لے گئے ۔ حجاز میں آپ نے شیخ عمر بن عبدالکریم مکی سے سند حدیث حاصل کی ۔ واپس آکر پھر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے ۔

شاہ محمد اسحاق کو اللہ تعالی نے علم و فضل کے محاسن کے ساتھ اخلاق وسیرت اور تقوی و صلاح کے خصائص و محامد سے بھی نوازا تھا۔ شاہ عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ میری تقریر شاہ اسمعیل کو، تحریر رشید الدین کو اور تقوی شاہ اسحاق کو ملا ہے ۔ (۲)
نے ان کے علم و سیرت و تقوی کے کمالات کا ذکر کیا ہے ۔(۳) سرسید
سرسید کے ایک اور بیان سے بھی شاہ صاحب کی مرجعیت ، ان کے وعظ کی مقبولیت، محتاجوں کی خبر گیری، مہمان نوازی، آپ کی سادہ زندگی اور توکل و استغنا پر روشنی پڑتی ہے ۔ بروایت نواب مصلح الدین احمد جو خواجہ شرف الدین احمد کے بیٹے، سید محمود

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید، " نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۵۱
(۲) ابویحیی امام خان نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۱۱۶
(۳) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۱۰۵

کے سالے اور سر راس مسعود کے حقیقی ماموں تھے ، سرسید فرماتے تھے :

" میں شاہ صاحب کے وعظ میں حاضر ہوتا۔ باہر مردوں کا ہجوم ہے، زنانے میں عورتیں جمع ہیں ، ڈولیوں کا شمار نہ پالکیوں کی گنتی۔ محلات شاہی کی بیگمیں تک حاضر ہوتیں۔ امرا کے ہاں سے مکلف کھانوں کی دیگیں کہاروں کے کندھوں پر لدی چلی آرہی ہیں۔ صاحب زادی حاضر ہوکر عرض کرتی ہیں: حضرت جی! کھانے آگئے ، فرماتے: تقسیم کردو۔ زنانہ حلقہ وعظ میں سے عورتیں اپنے اپنے برتن پیش کرتی ہیں - سب سے پہلے طلبہ کے لیے کھانا بھیجا جاتا۔ پھر عورتوں کو بٹتا - اس پر بھی بچ رہتا تو صاحب زادی عرض کرتیں : حضرت جی ! کچھ کھانا بچ گیا ہے - فرماتے : بیٹی! ہمارے لیے نہیں بچا ، اسے رہنے دو۔

شاہ صاحب خود معمولی چپاتی ، پھٹی کا سا شوربہ، گاڑھے کے دسترخوان پر رکھ کر تناول فرماتے - میں نے ان کا سا کھانا کسی کو کھاتے نہ دیکھا۔

گرد و نواح کی محتاج عورتیں آجاتیں اور اس بے فکری سے دولت کدہ پر ہفتوں رہی آتیں ، گویا ماؤں کے گھر میں آگئی ہیں۔ جب خود ہی جی چاہتا ، رخصت ہوتیں۔ محتاج عورتوں کی اس طرح کی مہمان نوازی مکہ معظمہ میں بھی رہی آتی -" (۱)

نواب صدیق حسن خان نے ان کے لیے " ولد علی التقوی " اور " کان معروفاً بالزھد و الصلاح " کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (۲) گویا کہ ان کی سیرت کا خمیر ہی تقوی کی مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ نواب صاحب نے ان کے زھد و ورع کی خود ہی گواہی نہیں دی بلکہ ان کے زھد و ورع کی شہرت عام اور شہادت خلق کا ذکر کیا ہے -

سید احمدشہید نے جہاد کے لیے سرحد کو ہجرت کی تو دھلی میں شاہ اسحاق ان اصحاب میں سے تھے جو مرکز میں رہ کر تحریک کی کام یابی کے لیے سروسامان کرنے کے ذمہ دار تھے - مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں :

---

(۱) ابویحیی امام خان نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ہند "، محولہ بالا ، صص ۱۸-۱۱۷

(۲) صدیق حسن خان ، نواب، " ابجدالعلوم " محولہ بالا ، ج ۳، صص ۹۱۲ و ۹۳۰

" .... باقی رہے امور داخلیہ مثلاً اموال کی فراہمی اور مجاہدین کی روانگی وغیرہ - ان کا مرکز دہلی تھا اور مولانا محمد اسحاق (صدر حمید) اس کے نگران تھے۔" (۱)

شاہ اسحاق نے اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ مولوی سید محبوب علی کی سرحد سے واپسی اور مخالفت سے تحریک کو جو نقصان پہنچا تھا اس کا سدباب آپ ہی کی کوششوں سے ہوا تھا۔ آپ سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی مجاہدین سرحد کی مالی امداد کرتے رہے لیکن تحریک جہاد کی ناکامی کے بعد ایک مدت کے غور و فکر کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ ہندوستان کو دارالسلام بنانے کی بہ ظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تو سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے ذی قعدہ ، ۱۲۵۷ھ/۱۵ دسمبر، ۱۸۴۱ء تا ۱۳ جنوری، ۱۸۴۲ء) میں اپنے بھائی شاہ محمد یعقوب اور خاندان کو لے کر ہجرت کرگئے -(۲) مومن خان مومن نے آپ کی تاریخ ہجرت کہی :

گفتم " وحید عصر اسحاق"   برحکم شہستہ دو عالم

بگزاشتہ دار حرب امسال   جاکردہ "بمکۂ معظم" (۳)

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا "شاہ ولی اللہ اوران کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا ، ص ۱۰۶
محمد میاں ، مولانا سید "علمائے ہند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۹۸-۹۷

(۲) محمد یعقوب نانوتوی ، مولوی ، " حالات مولوی محمد قاسم "، بہاول پور: صادق الانوار، ۱۲۹۷ھ ، ص ۱(حاشیہ)

(۳) بشیرالدین احمد ، " واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ، ص ۳۲۸
تاریخ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ " وحید عصر اسحاق" کے اعداد " مکۂ معظم" کے اعداد کے ساتھ جمع کردیجئے اور" دارحرب" کے اعداد کو ان کے حاصل جمع سے خارج کردیجئے - اس طرح ۱۲۶۰ھ سال نکلتا ہے - یہ قطعہ صاحب "واقعات دارالحکومت دہلی" نے نقل کیا ہے -"کلیات مومن"، مجلس ترقی ادب لاہور اور نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۲۸۳ھ میں ہمیں نہیں ملا - ہجرت کی تاریخ کے بارے میں محققین میں اختلاف ہے - غلام رسول مہر نے ۱۸۴۰ء/۱۲۵۶ھ لکھی ہے - (جماعت مجاہدین ، ص ۳۱۳) محمد ایوب قادری نے ۱۸۴۱ء/۱۲۵۷ھ تحریر کی ہے (تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی ، ص ۳۰۹) فضل حسین بہاری ، ابویحیی امام خان نوشہروی اور محمود احمد برکاتی نے ۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ھ رقم کی ہے - (" الحیاۃ بعدالمماۃ"، ص ۷۶ ، " تراجم علمائے حدیث ہند"، ص ۱۱۸ ، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ، ص ۱۶۸) اورمومن خان مومن کے قطعہ تاریخ ہجرت سے ۱۲۶۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔

ہندوستان سے شاہ محمد اسحاق کا ہجرت کرنا تحریک ولی اللہی کی ایک خاص ضرورت کے تحت تھا جو اس وقت پیش آگئی تھی ۔ حالات کی رفتار کو دیکھ کر انھوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ تحریک کا ایک مرکز بیرون ہند ہونا نہایت ضروری ہے ۔ اس کے بغیر آئندہ پیش آنے والے حالات میں تحریک کا زندہ رکھنا مشکل ہوگا۔ چنان چہ انھوں نے ہندوستان میں مولانا مملوک علی کو تحریک کی رہنمائی کے لیے چھوڑا اور خود حجاز ہجرت کرگئے ۔ مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں " کہ مولانا محمد اسحاق نے مکہ معظمہ پہنچ کر بڑی آزادی سے اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کا کام شروع کردیا تھا۔ اس پر دولت عثمانیہ کی وزارت خارجہ کو ان کے اخراج پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی ۔ اس بیرونی دباؤ کے مخمصے سے نجات حاصل کرنے کے لیے مولانا محمد اسحاق نے شیخ الحرم کو واسطہ بنایا اور ایک پناہ گیر کے طور پر حجاز میں رہنے کی اجازت حاصل کرلی۔ اس اجازت کی شروط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مولانا محمد اسحاق دولت عثمانیہ کی سیاسی رہنمائی پر کاملاً اعتماد کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے پیروؤں میں سے ان کی معاون دہلوی جماعت نے بھی اس فیصلے کو قبول کرلیا تاکہ انھیں اپنے کام سے ربط رکھنے میں آسانی ہو -(۱)

مکہ معظمہ میں بیٹھ کر آپ نے تحریک ولی اللہی کی رہنمائی کے علاوہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ۔ آپ کی وفات کا حادثہ رجب ۱۲۶۲ھ/جولائی، ۱۸۴۶ء میں پیش آیا۔ جنت المعلی کی خاک پاک آپ کی آخری آرام گاہ بنی ۔"اسحاق شیخ آفاق" مادہ تاریخ وفات ہے ۔ آپ کے انتقال پر مکہ معظمہ کے مشہور عالم شیخ عبداللہ سراج نے فرمایا :

> " خداکی قسم اگر یہ بزرگ کچھ مدت اور زندہ رہتے اور میں ان کی حدیث سناتا رہتا جب بھی ان کے مرتبے کو نہ پہنچتا۔" (۲)

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۵۲
عبیداللہ سندھی، مولانا" شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، صص ۱۲-۱۱۱

(۲) عبدالحی، مولانا سید " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۵۲
مہر، مولانا غلام رسول " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا، ص ۳۱۲

آپ نے تقریباً چالیس سال درس و تدریس کا شغل جاری رکھا - اس دوران میں ہزارہا طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا- شاگردوں کا شمار نہیں- اس تذکرے کا باب چہارم آپ ہی کے تلامذہ کے تراجم میں ہے اور یہ صرف وہ اساتذہ ہیں جن کا ترجمہ سرسید نے لکھا ہے - مولانا سید عبدالحی نے ان کے تلامذہ اجل میں مولانا عبدالغنی محدث، مولانا سید نذیر حسین دہلوی، مولانا عبدالرحمن پانی پتی، مولانا عالم علی مرادآبادی، مولانا عبدالقیوم بن مولانا عبدالحی بڈھانوی، مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا عبدالجلیل ، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا احمد اللہ امامی کا ذکر کیا ہے -(۱) " الحیاۃ بعدالمماۃ " کی فہرست میں یہ تلامذہ مزید ہیں : " مولانا شاہ محمد یعقوب (برادر خرد شاہ اسحاق) ، مولانا محمد عمر(ابن شاہ اسمعیل شہید) ، شیخ محمد انصاری سہارنپوری، مولوی صبغت اللہ ، مولوی یار علی، مولوی محمد ابراہیم عظیم آبادی، شیخ محمد تھانوی، مولوی علی احمد ، شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی، مولانا محمد حازمی، مولوی سبحان بخش شکار پوری، مولوی عبداللہ سندھی، مولوی گل کابلی ، مولوی نور علی، حافظ محمد فاضل سورتی، مولوی بہاء الدین دکھنی، مولوی حافظ کرم اللہ دہلوی، مولوی نصیر الدین"(۲) اس فہرست میں ابویحیی امام خان نوشہروی نے ان چند ناموں کا اور اضافہ کیا ہے :" مولوی عبدالرشید مجددی، حافظ مظہر علی کاکوروی، مولوی امداد العلی، مولوی احمد اللہ ، شیخ شاہ محی الدین عبداللطیف ، منشی (مولانا) جمال الدین ، مولانا محمد عرف جھاؤ" نوشہروی صاحب نے سرسید احمد کو بھی شاہ اسحاق کا شاگرد لکھا ہے -(۳) لیکن ان کے پاس اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے - سرسید آپ کے شاگرد ہوتے تو وہ نہایت

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید،" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۵۲-۵۱

(۲) فضل حسین بہاری،" الحیاۃ بعدالمماۃ"، محولہ بالا ، ص ۵۰-۴۹

(۳) ابویحیی امام خان نوشہروی،" تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا ، ص ۱۲۰

فخر کے ساتھ اس شرف کا دعوا کرتے اور خواجہ حالی بالصراحت اس نسبت کا ذکر کرتے۔

شاہ محمد اسحاق کی تمام تر توجہ طلبہ کی تعلیم و تربیت کی طرف تھی اور صبح سے شام تک درس و تدریس کی مصروفیت رہتی تھی۔ اس لیے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہ تھی - سرسید نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ چوں کہ حضرت بابرکت کو حدیث نبوی کی خدمت سے ایک لمحہ کی فرصت نہ تھی ، نظم و نثر کی طرف ہرگز التفات نہ کرتے تھے - اس واسطے آپ سے اس قسم کا کلام کچھ یادگار نہیں - (۱) بلاشبہ ان کا کلام بہت محدود ہے، شہرت بھی نہیں ہوئی ، لیکن ایسا بھی نہیں جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے ان کی متعدد تصنیفات کا پتا چلتا ہے - ایک تو آپ نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ کیا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں نے اس ترجمے کی خوبی " معروف و مرغوب" لکھی ہے - (۲) مولانا قطب الدین خاں دہلوی نے " مظاہر حق " کے دیباچے میں فرماتے ہیں :

" مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ عدیم النظیر میرے استاد مولانا محمد اسحاق نے بیچ زبان ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا۔" (۳)

پھر آپ کی ہدایت کے مطابق مولانا قطب الدین نے مشکوٰۃ کا ترجمہ کیا تو حضرت ممدوح نے اس پر کچھ فوائد تحریر فرمائے جنھیں مولانا قطب الدین نے تبرکاً اپنے ترجمے میں شامل کرلیا۔ نواب صدیق حسن خاں نے آپ کے بعض فارسی مولفات و رسائل کی اطلاع بھی دی ہے -(۴) بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے بعض رسائل کے نام بھی تحریر کئے ہیں - رحمان علی " افتائے ہندی" اور محمود احمد برکاتی نے " شعب الایمان" کا ذکر کیا ہے -(۵)

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۵۹

(۲) صدیق حسن خاں ، " ابجدالعلوم"، محولہ بالا ، ج ۳ ، ص ۹۱۶

(۳) قطب الدین خاں ، مولوی ، " مظاہر حق"، لکھنو : نول کشور، ۱۲۵۳ھ ، ج ۱ ، ص ۱

(۵) ایوب قادری ، محمد (مترجم و مرتب) " تذکرہ علمائے ہند" ، محولہ بالا ، ص ۳۰۹
محمود احمد برکاتی ، حکیم " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۲۸

(۴) صدیق حسن خاں ، نواب " ابجدالعلوم"، محولہ بالا ، ج ۳ ، صص ۹۱۶ و ۹۳۰

ان کے علاوہ "مسائل اربعین"، " ماۃ مسائل" ، " تذکرۃ الصیام" وغیرہ کوبھی آپ کی یادگار تصانیف بتایا گیا ہے ۔ لیکن محمود احمد برکاتی کا خیال ہے کہ یہ دعوا درست نہیں ہے۔(۱) " ماۃ مسائل" کے بارے میں مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کی تحقیق ہے کہ وہ مولانا نورالحسن کاندھلوی کی تصنیف ہے ۔(۲)

صلبی اولاد میں آپ کے ایک صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں تھیں۔ صاحب زادے کا نام کک سلیمان تھا جن کی نسبت سے آپ کی کنیت ابوسلیمان تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں انتقال کرگئے تھے۔ صاحب زادیوں میں سے ایک کی شادی مولوی عبدالقیوم ابن مولانا عبدالحی کے ساتھ ہوئی تھی ۔ مولوی عبدالقیوم ایک عرصے تک بھوپال میں رہے اور اسی لیے بھوپالی کی نسبت سے مشہور ہوئے ۔ آخر عمر میں بڈھانے چلے گئے تھے وہیں تقریباً ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ع میں انتقال ہوا۔ شاہ محمد اسحاق کی دوسری صاحب زادی کی شادی شاہ محتشم بن شاہ معظم بن مقرب اللہ بن شاہ اہل اللہ برادر شاہ ولی اللہ سے ہوئی تھی۔ اور تیسری شاہ رفیع الدین کے نواسے مولوی سید نصیرالدین کے گھر کی زینت بنیں ۔ مولوی سید نصیر الدین نے تحریک جہاد کے سلسلے میں بہت نیک نامی اور شہرت حاصل کی ۔ ستھانے میں وفات ہوئی ۔ (۳)

سرسید نے شاہ محمد اسحاق کی تحریر کا نمونہ نہیں دیا۔ یہاں شاہ صاحب کا ایک فتوی جو انھوں نے مذہب حنفی کی ترجیح اور امتیاز کے باب میں دیا تھا بطور نمونہ

---

(۱) ابویحیی امام خان نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا ، ص ۱۱۹
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب)، " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، صص ۱-۳۰۹
مہر، مولانا غلام رسول ، " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا ، ص ۳۱۲
محمود احمد برکاتی، حکیم، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۲۸
(۲) احتشام الحسن کاندھلوی، " حالات مشائخ کاندھلہ"، ص ۱۲۲
(۳) مہر، مولانا غلام رسول ، " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا ، صص ۹۳-۲۹۲ اور ۳۱۲

تحریر کے نقل کیا جاتا ہے :

" در کتاب اشباہ می نویسد ازاسئلنا من مذہبنا و مذہب مخالفینا فی الفروع یجب علینا ان نجیب بان مذہبنا صواب یحتمل الخطاء و مذہب مخالفینا خطاء یحتمل الصواب انتہی وقتیکہ کسے مذہب خود مذہب حنفی اختیار کرد لازم است کہ ترجیح خواہد داد و چون ترجیح مذہب خود را داد غیر مذہب خودرا مرجوح خواہد دانست و مذاہب اربعہ را مرجوح نمائید دانست اتباع ایشان اتباع کتاب و سنت بانداندانست و کسیکہ امتیاز ندارد و درمیان احادیث کہ صحیح است یا غیر صحیح پی برد لازم است کہ اتباع علما نماند و کسیکہ حقیقت مذاہب اربعہ نداندو انکار اتباع ایشان کند آنکس ضال است ـ واللہ اعلم ۱۲

(محمد اسحاق) " (۱)

===xxxx====

<u>جناب مولانا مولوی محمد یعقوب سلمہ اللہ تعالی :</u>

" صاحب خلق محمدی تابع شریعت احمدی جامع محامد صفات ہادی حمائد اوقات خالق کے محب اور خلائق کے محبوب مولوی محمد یعقوب کہیں برادر حقیقی مولوی محمد اسحاق مرحوم کے ہیں۔ علم و فضل میں اقران روزگار سے پایہ کم نہیں رکھتے ، آداخلق جمیل اور صفات جزیل اور قناعت اور استغنا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے ـ اکثر دیکھا گیا کہ جب کوئی بطریق پیش کش و ہدیہ کے کچھ لایا کبھی قبول نہ کیا ، جو سرمایہ اپنے پاس رکھتے ہیں اس میں اوقات بسر کرتے ہیں۔ خواہ بہ تنگی اور خواہ بہ وسعت ـ اور حسب استعداد اپنے مال کے زکوۃ نکالتے رہتے ہیں۔ اس کم استعدادی میں توفیق ایسی امور خیر کی ایسے ہی مردان خدا کا کام ہے ـ آپ نے بھی ہم راہ اپنے برادر مرحوم کے ہندوستان سے ہجرت کی اور مکۂ معظمہ میں توطن اختیار کیا ـ جب تک شاہجہان آباد میں رہے اپنے گوشۂ عزلت

---

(۱) قطب الدین ، مولانا ، " رسالہ " تنبیہہ الضالین و ہدایۃ الصالحین " ، محولہ بالا ، (برحاشیہ " نظام اسلام) ، ص ۲۰-۵۱

میں با بداس رہتے تھے اور ابنائے روزگار کی طرف کبھی رجوع نہ رکھتے تھے - اب بھی حال ہے اس بلاد میں بھی ہے کہ کچھ وجہ قلیل میں جو کسی کسب حلال سے بہم پہنچتا ہے اپنی اوقات گذارتی کرتے ہیں اور اوقات شبانہ روزی کو عبادت خالق زمین و آسمان میں بسر کرتے ہیں- حق جل و علا ایسے زبدۂ اہالی روزگار کو تادیر سلامت رکھے کہ اپنے خاندان عالی شان کی یادگار ہیں، آمین یا رب العالمین -" (۱)

تعلیقات :

محمد یعقوب نام اور چھوٹے میاں عرف تھا- شیخ محمد افضل فاروقی لاہوری کے صاحب زادے اور شاہ محمد اسحاق کے چھوٹے بھائی تھے- ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ/ ۲۲ستمبر، ۱۷۸۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے -(۲) تعلیم و تربیت کے تمام مراحل دہلی ہی میں طے ہوئے - شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان کی ولادت باسعادت کی پیشین گوئی کی تھی- نواب صدیق حسن خان شیخ محمد عاشق صاحب کی قول جلی کے حوالے سے لکھتے ہیں " کہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے فرمایا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ سب کے سب فرزند جو لطف الہی سے مجھے عطا ہوئے ہیں، نیک بخت ہیں اور ان میں پاک بازی اور نیکی ظہور پذیر ہوگی لیکن تدبیر غیبی کا تقاضا یہ ہے کہ دو شخص اور پیدا ہوں گے جو مدتوں مکہ اور مدینہ میں دینی علوم کی ترویج کریں گے اور وہیں سکونت پذیر ہوجائیں گے - یہ دونوں اپنی ماں کے رشتے سے مجھ سے متعلق ہوں گے - اگرچہ آدمی کو فطرۃ اپنے وطن مادری سے محبت ہوتی ہے اور جہاں والدہ متوطن ہو اسے چھوڑ نا بڑا گران گزرتا ہے لیکن بدرجۂ مجبوری یہ بھی کرنا پڑتا ہے -" قول جلی کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں :

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثار الصنادید"، محولہ بالا، باب چوتھا، ص ۲-۱۰۵

(۲) محمود احمد برکاتی، حکیم " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۶۹

" کہ شاہ ولی اللہ کی اس عبارت کے مصداق شاہ عبدالعزیز کے دونوں نواسے مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب ہی ہوسکتے ہیں - ان دونوں نے دہلی سے ہجرت کی اور مکہ میں اقامت پذیر ہوئے اور وہاں سالہا سال تک علم حدیث کا درس دیا اور عرب و عجم ان سے فیضیاب ہوئے -" (۱)

شاہ محمد یعقوب نے اصحاب (۲) ثلاثہ کے علاوہ اپنے برادر بزرگ سے بھی تحصیل علمی کی تھی۔ شاہ عبدالعزیز سے انہوں نے نہ صرف استفادۂ علمی کیا تھا بلکہ کسب فیض باطنی بھی آپ کی ذات بابرکات سے کیا تھا - وہ شاہ عبدالعزیز سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ محمود احمد برکاتی نے شیخ محمد محدث تھانوی کا ایک بیان نقل کیا ہے

" کہ شاہ محمد یعقوب کو جملہ طریقوں کے تمام اذکار و اعمال و اشغال کی اجازت شاہ عبدالعزیز سے ملی تھی۔" (۳)

فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس میں مصروف ہوگئے اور یہ سلسلہ دہلی سے حجاز تک اور مسند نشین درس و تدریس ہونے سے لے کر وفات تک جاری رہا اور بقول نواب صدیق حسن خان عرب و عجم ان سے فیض یاب ہوئے - شاہ محمد یعقوب شاہ عبدالعزیز کے تربیت یافتہ اور ولی اللّٰہی پارٹی کے خاص ارکان میں سے تھے اور تحریک جہاد کے جو امور مرکز دہلی میں ولی اللّٰہی پارٹی کے سپرد تھے ، ان میں اپنے بڑے بھائی شاہ محمد اسحاق کے ساتھ وہ بھی برابر شریک رہے - (۴) محمود احمد برکاتی کے الفاظ میں " شاہ محمد اسحاق کے صرف چھوٹے بھائی ہی نہیں ہم خیال و ہم مسلک تھے۔ زندگی بھر رفیق و

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۱۵-۲۱۳

(۲) عبدالحی، مولانا سید " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۵-۵۳۳

(۳) محمود احمد برکاتی، حکیم " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۷۱

(۴) محمد میاں، مولانا سید " علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۹ و ۹۸

شریک حال رهے" -(۱)

عام طور پر تذکرہ نویسوں نے شاہ محمد اسحاق کے تذکرے میں ضمناً ان کا ذکر کیا ہے اور بعض نے تو ان کے ذکر کو بالکل ہی نظر انداز کردیا ہے -(۲) لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بذات خود ایک متبحر عالم دین، بلند پایہ فقیہ اور فاضل ترین شخصیت تھے - سرسید نے لکھا ہے کہ "علم و فضل میں اقران روزگار سے کم پایہ نہیں رکھتے تھے -" (۳) استعداد ظاہر کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی آیت کے معنی بیان کرتے تو وہ مضامین عالی بیان فرماتے کہ سامعین حیران و ششدر رہ جاتے - پہروں وہی بیان چلا جاتا-(۴) مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں: "کہ علم و فضل و تقوی میں بھائی کا نمونہ تھے -" (۵) علم و فضل کے ساتھ محاسن سیرت اور نیکی، تقوی، توکل و استغنا میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے- ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے ان کے اخلاق حمیدہ اور فضائل و محاسن کا اعتراف کیا ہے - ان کی امانت داری کی ایسی شہرت تھی کہ یعقوب امین گویا کہ ان کا عرف ہوگیا تھا-(۶) غرض کہ شاہ محمد یعقوب اپنے عہد میں اپنے علم و فضل، اخلاق و سیرت اور توکل کلی و استغنا کی فضیلتوں کی بنا پر یگانہ و ممتاز تھے -

سرسید احمد خان نے کمال عقیدت کے ساتھ ان کا ترجمہ لکھا ہے اور ان کے علم و

---

(۱) محمود احمد برکاتی، حکیم، "شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۲۹

(۲) مہر، مولانا غلام رسول، "جماعت مجاہدین"، محولہ بالا، ص ۳۱۵ (شاہ محمد اسحاق کے تذکرے میں ضمناً آپ کا ذکر کیا ہے -)
امام خان نوشہروی، تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۱۲۱ (مختصراً آپ کا ترجمہ لکھا ہے -)
صدیق حسن خان، نواب، "ابجد العلوم"، محولہ بالا، ج ۳، ص ۹۳۰ (اپنے اساتذہ کے ذیل میں صرف نام لکھنے پر اکتفا کیا-)
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب)، "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص (نام لکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں فرمائی)

(۳) سرسید احمد خان، "آثار الصنادید"، محولہ بالا، چوتھا باب، ص ۲۰

(۴) محمود احمد برکاتی، حکیم، "شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۷۵

(۵) مہر، مولانا غلام رسول، "جماعت مجاہدین"، محولہ بالا، ص ۳۱۵

(۶) محمود احمد برکاتی، حکیم، "شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۷۵

فضل اور اخلاق و سیرت کے بارے میں نیازمندانہ قلم اٹھایا ہے - اس کے اعادے کی ضرورت نہیں البتہ ہجرت کی زندگی میں انھوں نے جس " کسب حلال" کی طرف اشارہ کیا ہے - حقیقت اس کی یہ ہے کہ فرصت کے اوقات میں گھر میں ریشم کھولا کرتے تھے-" (۱)

تقریباً نصف صدی تک حدیث و تفسیر کی تدریس میں مشغول رہے اس مدت میں ہزاروں طالبان علم نے آپ سے استفادہ کیا ہوگا لیکن جس طرح ان کی علمی شخصیت اور مدرسانہ حیثیت شاہ محمد اسحاق کی شخصیت کی ہمہ گیری سے متاثر ہوئی اسی طرح ان کے تلامذہ کی جامع فہرست مرتب کرنے کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی - مختلف کتب و تذکاروں میں ضمناً بعض تلامذہ کا ذکر آگیا ہے -(۲) اب تک ان تلامذہ میں سے نواب صدیق حسن خان، مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولوی عبدالعزیز جعفری، ملا عبدالقیوم بڈھانوی، حاجی امداد اللہ مہاجرمکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد زمان خان شاہجہان پوری، شیخ محمد محدث تھانوی، خواجہ احمد بن یاسین نصیرآبادی، مولوی محمد سعید عظیم آبادی، حاجی منیر خان، سکندر شاہ ، عبدالرحیم نگینہ ساز، نعمت خان، وغیرہ اصحاب کے نام تاریخ کے صفحات پر یک جا نظر آتے ہیں- (۳)

مولانا عبدالحی نے ان میں سے صرف نواب صدیق حسن خان اور خواجہ احمد نصیر آبادی کا ذکر کیا ہے - (۳)

---

(۱) محمود احمد برکاتی، حکیم، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۷۳

(۲) شوق، حافظ احمد علی، " تذکرۂ کاملان رام پور"، دھلی : ہمدرد پریس ۱۹۲۹ء، ص ۲۳۳

علی حسن خان، نواب، " مآثرصدیقی، موسوم بہ سیرت والا جاہی"، لکھنو : نول کشور پریس ۱۹۲۸ء ، ج اول، ص ۱۷

عبیداللہ سندھی، مولانا، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۲۱۵

ابویحیی امام خان نوشہروی، " تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا، ص ۱۲۱

(۳) محمود احمد برکاتی، حکیم، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا، ص ۱۷۰

(۳) عبدالحی، مولانا سید، " نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۵۳۵

اس فہرست میں علمی و باطنی فیض حاصل کرنے والی دونوں جماعتوں کے افراد شامل ہیں اگرچہ غالب تعداد اصحاب علم و فضل کی ہے ۔ اس فہرست سے شاہ محمد یعقوب کے علم و فضل کا پہلو اور علمی خدمات میں ان کا عظیم الشان حصہ خود بخود ظاہر ہوجاتا ہے ۔

ان کی اولاد میں گو ان کی ایک صاحب زادی کا پتا چلتا ہے جن کی شادی مرزا امیر بیگ سے ہوئی تھی جن سے ایک صاحب زادے مولانا خلیل الرحمن کا پتا چلتا ہے۔

شاہ محمد یعقوب اپنے برادر بزرگ کے ساتھ ١٢٦٠ھ میں ہجرت کرکے حجاز تشریف لے گئے تھے اور مکہ معظمہ میں توطن اختیار کرلیا تھا اور درس و تدریس اور اصلاح ہدایت مسلمین کا سلسلہ جاری تھا تقریباً ربع صدی کے بعد ٢٨ ذی قعدہ ، ١٢٨٢ھ ، بروز جمعہ مطابق ١٥ اپریل ، ١٨٦٦ء کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کے لیے سفر اختیار کیا۔ جنت المعلی میں اپنے برادر بزرگ کے پاس تدفین عمل میں آئی ۔ حافظ سورتی نے آیت کریمہ " الا ان اولیاء الله لا خوف علیہم ولاھم یحزنون" سے تاریخ وصال نکالی ہے ۔(١)

درس و تدریس کی مشغولیت ، ذکر و اذکار اور اوراد و وظائف کے انہماک ، طالبان حق کی تربیت و اصلاح و تہذیب اخلاق میں شب و روز کی ضرورتوں اور بحر " کسب حلال" کی طلب اور شوق نے ان کے اوقات عزیز کے ایک ایک لمحے کو اپنے دائرہ تصرف میں لے لیا تھا لیکن (اس لیے) تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہ دے سکے ۔

===xx====

جناب مولوی مخصوص الله سلمہم الله تعالیٰ :

" عالم با عمل مبّرا از حرص و امل ، زبدۂ فقہائے زمان ، اسوۂ صلحائے جہان ،

---

(١) محمد احمد برکاتی حکیم " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص: ٧٦-١٧٥

معارف دستگاہ مولوی مخصوص اللہ فرزند رشید مولانا رفیع الدین مرحوم و مغفور ہیں جن کا ذکر سابق میں ہوچکا ہے - علم و فضل میں گوئی سبقت اقران و امثال سے لے گئے ہیں- ایک مدت دراز تک تدریس و تعلیم طالبان کمال میں مصروف تھے اور علوم دینی اور یقینی کے مشاغل میں شب و روز اوقات گرامی کو خرچ کرتے چوں کہ بیس پچیس برس تک مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز کی خدمت میں روز وعظ و قرات کلام الہی و حدیث رسالت پناہی کے کرتے تھے اور تقاریر سراسر افادت مولانائے موصوف کو ذخیرہ گوش ہوش فرماتے تھے ، حدیث و تفسیر میں ایسا مایۂ کمال بہم پہنچایا کہ اس دونوں فن کے نکات جو ان حضرت کے سینہ بے کینہ میں ہیں اور کہیں نہیں- لیکن از بس (کہ) طبیعت عبادت دوست اور مزاج زہادت پرست واقع ہوا ہے، ایک عرصہ ہوا کہ سر رشتہ تدریس کو ہاتھ سے دے کر گوشہ نشین ہیں- اور اوقات آپ کی ایسی مجموع ہے کہ شاید سلف میں اولیا کرام کی اوقات ایسی ہی ہوگی- از بسکہ توجہ عبادت اور تقوی شعاری کی طرف مصروف ہے، نظم عربی اور انشائے تازی کی طرف میل نہیں اس واسطے کچھ کلام آپ کا اس کتاب میں مندرج نہیں ہوا- (۱)

تعلیقات :
=====

مولانا شاہ مخصوص اللہ شاہ رفیع الدین کے چھ صاحب زادوں میں سے تیسرے صاحب زادے تھے - ان کی تاریخ ولادت کا پتا نہیں چل سکا- نہ یہ تصریح کہیں نظر سے گزری کہ انتقال کے وقت ان کی کتنی عمر تھی - تحصیل علمی کے تمام مراحل اپنے والد ماجد اور عمین مکرمین کی خدمت میں طے کیے- تحصیل علمی سے فراغت کے بعد ایک زمانے تک درس و تدریس میں مصروف رہے - شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں ۲۰، ۲۵ برس تک ان کے وعظ کے دن قرآن مجید اور حدیث کی قرات فرماتے رہے - (۲) شاہ صاحب کے انتقال

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید "، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۹۵-۹۳

(۲) ایضاً ، ص ۵۳
فضل حسین بہاری ، مولوی ، " الحیاۃ بعد المماۃ "، محولہ بالا ، ص ۷۷

کے بعد خود بھی وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری کیا۔ شاہ محمد اسحاق کے ہجرت کرجانے کے بعد درس و تدریس کے ساتھ مدرسہ رحیمیہ کے اہتمام کی ذمہ داری میں بھی اپنے بھائی شاہ محمد موسی کے ساتھ شریک رہے - (۱)

مولانا شاہ محمد مخصوص اللہ

دہلی مرحوم کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی آخری بزم کے شب چراغوں میں سے ایک مولانا شاہ محمد مخصوص اللہ تھے -(۲) علم و فضل ، کمال درس و تدریس ، وعظ و تذکیر ، زہد و ورع ، اصلاح و تقوی میں اپنے خاندان عالی شان کی روایات کے حامل تھے۔(۳) صاحب " حیات ولی" لکھتے ہیں :" حدیث و تفسیر میں وہ کمال بہم پہنچایا تھا کہ ان دونوں فنون کے جو بیش قیمت اور انمول جواہر آپ کے خزادہ سینہ میں تھے وہ اور کہیں نہ پائے جاتے تھے۔ علاوہ حدیث و تفسیر کے فقہ و عقائد ، کلام ، اصول وغیرہ میں مجتہدانہ کمال رکھتے تھے اور ان علوم کو عروج کمال تک پہنچادیا تھا۔" (۴)

وہ ایسے جامع کمالات بزرگ تھے کہ حنفیہ اور سلفیہ دونوں جماعتوں نے انھیں اپنی اپنی جماعت میں شامل کیا ہے - مولانا عبدالحی لکھتے ہیں :

> " جب لوگ وہابی اور حنفی دو جماعتوں میں بٹ گئے تو انھوں نے کسی ایک جماعت سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ بعض ائمہ فقہ کے باب میں ان میں عصبیت موجود تھی۔" (۵)

ابوحیی امام خان نوشہروی نے خواجہ مصلح الدین کی روایت نقل کی ہے کہ آمین بالجہر کے عامل تھے ، رفع یدین کرتے تھے۔ خاندان مغلیہ کی خواتین انھیں حویلی میں تشریف لانے کی زحمت دیتیں ۔ مکلف خوان آپ کی خدمت میں پیش ہوتے آپ ان پر دعا

---

(۱) محمود احمد برکاتی ، حکیم ، " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۲۸

(۲) افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر: " مولوی نذیر احمد دہلوی"، محولہ بالا ، ص ۴۲

(۳) عبدالحی ، مولانا سید : " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۳۶۸-۶۹
خلیق احمد نظامی : " تاریخی مقالات"، محولہ بالا ، ص ۲۳۸

(۴) رحیم بخش دہلوی ، " حیات ولی"، لاہور، مکتبہ طیبہ ، ۱۹۷۲ء، ص ۶۲-۶۳ ~~ص ۳۴۹~~

(۵) عبدالحی ، مولانا سید : " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۳۶۹

(فاتحہ) پڑھتے۔ حالانکہ سلفیہ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے ۔ اور اسی لیے اس روایت کے مطابق طلبہ آپ پر اعتراض بھی کرتے تھے۔ آپ انہیں یہ کہہ کر چپ کردیتے تھے کہ میاں اس بہانے مساکین کو کھانا مل جاتا ہے ۔(۱) طلبہ کے اعتراض سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان کا یہ عمل ان کے ظاہر و معلوم مسلک کے خلاف تھا۔ لیکن انہوں نے شاہ اسمعیل شہید کی " تقویۃ الایمان " کے خلاف " تعیدالایمان " نامی ایک رسالہ بھی لکھا تھا ۔(۲) اور ۱۲۳۰ھ کے تاریخی مباحثہ میں مولانا عبدالحی اور شاہ اسمعیل شہید کے مقابلے میں مولانا رشیدالدین خان کے شریک و حامی تھے ۔(۳) مناظرے میں حصہ بھی لیا تھا اور مولف سیف الجبار کے بقول سوال و جواب میں مولانا عبدالحی کو ساکت کردیا تھا ۔ (۴)

ان کی عبادت دوستی ، تقوی شعاری اور زہادت پرستی کے بارے میں بھی سرسید کا بیان ہے جو مولوی رحیم بخش دہلوی اور مولوی بشیرالدین دہلوی نے نقل کردیا ہے ۔(۵) سرسید نے لکھا ہے :

" ایک عرصہ ہوا کہ سررشتہ تدریس کو ہاتھ سے دے کر گوشہ نشین ہیں "۔(۶)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ " آثارالصنادید " کی تالیف کے وقت (۱۸۴۵ع) سے ایک عرصہ قبل تدریس کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوکر گوشہ گیر ہوچکے ہیں۔ سرسید نے ان کا ترجمہ عقیدت کے ساتھ لکھا ہے ۔ اس کی وجہ صرف مذہبی عقیدت ہی نہیں بلکہ یہ وجہ بھی ہے کہ سرسید نے ان سے استفادہ کیا تھا اور بعض کتب کی باقاعدہ تحصیل کی تھی۔

---

(۱) ابویحیی امام خان نوشہروی : " تراجم علمائے حدیث ہند " ، محولہ بالا ، ص ۱۱۳
(۲) محمود احمد برکاتی ، حکیم : " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان " ، محولہ بالا ، ص ۱۷۹
(۳) اس مباحثے پر نوٹ مولانا رشیدالدین خان کے حالات میں گزرچکا ہے ۔
(۴) محمود احمد برکاتی ، حکیم : " شاہ ولی اللہ اور کا خاندان " ، محولہ بالا ، صص ۸۰-۱۷۹
(۵) رحیم بخش دہلوی : " حیات ولی " ، محولہ بالا ، ص ۳۳۹
بشیرالدین احمد دہلوی : " واقعات دارالحکومت دہلی " ، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۵۸۹
(۶) سرسید احمد خان : " آثارالصنادید " ، محولہ بالا ، چوتھا باب ، ص ۵۳

مولانا حالی لکھتے ھیں :

" (سرسید نے) مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے - حدیث پڑھنی شروع کی - مشکوۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی -" (۱)

ابویحیی امام خان نوشہروی نے خواجہ مصلح الدین احمد سے ایک روایت نقل کی ھے اس سے تو سرسید پر مولانا مخصوص اللہ کے فیض صحبت کے اثر کا پتا بھی چلتا ھے - ابو یحیی صاحب لکھتے ھیں :

" سرسید احمد خان آپ کے شاگردوں میں سے تھے اور یہ انھی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ وہ آخر دم تک آمین بالجہر اور رفع یدین کی سنن نبوی پر عامل رھے -" (۲)

سرسید نے ایک دل چسپ مضمون " مبارک باد عید " کے عنوان سے لکھا تھا اور " تہذیب الاخلاق " بابت یکم شوال ، ۱۲۹۳ھ ، جلد ۷ نمبر ۱ میں چھپا تھا - اس میں انھوں نے عید کے معانقے ، مصافحے اور عربی میں خطبے پر طنز کیا ھے - ضمناً اس سے معلوم ھوتا ھے کہ مولوی مخصوص اللہ قاضی واڑہ کی مسجد میں نماز عید پڑھایا کرتے تھے اور سرسید کبھی کبھی ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے - سرسید لکھتے ھیں :

" دلی میں جب تھا جب بھی کچھ التزام نہ تھا - کبھی عیدگاہ اور کبھی جناب مولانا مولوی محمد مخصوص اللہ مرحوم کے سبب سے قاضی واڑہ کی مسجد میں چلا جاتا تھا -" (۳)

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین : " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، ص ۵۳

(۲) ابویحیی امام خان نوشہروی : " تراجم علمائے حدیث ھند " ، محولہ بالا ، ص ۱۱۳
عبدالحی ، مولانا سید : " نزھتہ الخواطر " ، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص ۳۲
حامد حسن قادری ، " تاریخ داستان زبان اردو " ، محولہ بالا ، ص ۲۹۵
اکرام ، شیخ محمد : " رود کوثر " ، کراچی : تاج آفس ، س ن ، ص ۸۰
افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر : " مولوی نذیر احمد دھلوی " ، محولہ بالا ، ص ۱۷۲

(۳) اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد (مرتب) : " مقالات سرسید " ، محولہ بالا ، ج ۱۵ ، ص ۹

مولوی محمد جعفر تھانیسری اور ابویحیی امام خان نوشہروی نے شاہ مخصوص اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ آخر میں دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔(۱) لیکن محمود احمد برکاتی کا خیال ہے کہ یہ بات انھوں نے شاہ مخصوص اللہ کی قلبی و علمی سرگرمیوں کی توجیہ کے لیے فرمادی ہے ۔ حقیقت کا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔(۲) لیکن اس تردید کے لیے ان کے پاس کوئی علمی استدلال نہیں ہے ۔

نواب صدیق حسن خان نے ان کا سال وفات ۱۲۷۳ھ لکھا ہے ۔(۳) اور مولانا سید عبدالحی نے ان کی تاریخ وفات ۱۳ ذی الحجہ ، ۱۲۷۱ھ/۲۷ اگست، ۱۸۵۵ء لکھی ہے ۔(۴) یہی تاریخ حکیم محمود احمد برکاتی نے اختیار کی ہے اور میری رائے میں بھی درست ہے ۔ خاندانی قبرستان مہندیوں میں مدفون ہیں وہیں ان کی اہلیہ بھی دفن ہیں ۔(۵)

شاہ مخصوص اللہ کی اولاد میں صرف ایک صاحب زادی امۃ الغفار کا پتا چلتا ہے۔ ان کے بارے میں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ صحاح ستہ پڑھی ہوئی تھیں اور بڑی زاہدہ تھیں۔(۶) مولانا عبدالحی کے صاحب زادے مولانا عبدالقیوم بھوپالی سے ان کا عقد ہوا تھا۔ مولانا عبدالحی نے ان/مولوی عبدالقیوم کا مستقل ترجمہ لکھا ہے ۔ (۷)

شاہ مخصوص اللہ نے ایک عرصۂ دراز تک درس و تدریس کی زندگی گزاری لیکن ان کے تلامذہ میں صرف دو کا نام معلوم ہوسکا ہے ۔ ایک شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی ابن

---

(۱) جعفر تھانیسری، محمد: "سوانح احمدی"، محولہ بالا ، ص ۲۹۵
ابویحیی امام خان نوشہروی: "تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا ، ص ۱۱۵
(۲) محمود احمد برکاتی، حکیم: "شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۸۰
(۳) صدیق حسن خان، نواب، "ابجد العلوم"، محولہ بالا ، ج ۳، ص ۹۳۰
(۴) عبدالحی، مولانا سید: "نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۴۶۹
(۵) محمود احمد برکاتی، حکیم: "شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۸۰
(۶) ابویحیی امام خان نوشہروی: "تراجم علمائے حدیث ہند"، محولہ بالا ، ص ۱۱۳
(۷) عبدالحی، مولانا سید: "نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۹۰

شاہ ابوسعیدحسنی ، دوسرے مولوی عبدالرشید ابن شاہ احمد سعید مجددی برادر شاہ عبدالغنی مجددی دھلوی-(۱)

اگرچہ سرسید نے نظم و انشا سے شاہ مخصوص اللہ کی طبیعت کے عدم میل کا ذکر کیا ہے اور صاحب"حیات ولی"نے تو لکھا ہے کہ آپ کا کوئی کلام باوجود تحقیقات کے مجھے دستیاب نہیں ہوا-(۲) لیکن حکیم محمود احمد برکاتی نے " سیف الجبار" کے حوالے سے ان کے ایک رسالے " معیدالایمان " کی نشان دھی کی ہے -(۳)

====XXXX=====

جناب مولوی مملوک العلی سلمہ اللہ تعالی :

" شاگرد رشید مولوی رشیدالدین خان صاحب - علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہوجاوے تو ان کی لوح حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے - ان سب کمال و فضیلت پر خلق و حلم احاطۂ تقریر سے افزوں ہے - اگرچہ زی دنیا داروں کی ہے لیکن سیرت اور سریرت میں درویشانہ - اگرچہ چودہ پندرہ برس سے مدرسۂ شاہجہاں آباد میں عہدۂ مدرسی رکھتے تھے لیکن اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں کہ مدرسی اوّل اس سے عبارت ہے - انشا نظم و نثر کی طرف کم توجہ ہے - اگر ایسا فاضل اس طرف بھی متوجہ ہوتا تو یقین ہے

---

(۱) صدیق حسن خان، نواب،" ابجد العلوم"، محولہ بالا ، ج ۳ ، ص ۹۲۹
عبدالحی ، مولانا سید ،" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۳۶۹
ابویحیی امام خان نوشہروی،" تراجم علمائے حدیث ھند"، محولہ بالا ، ص ۱۱۵
ایوب قادری ، محمد (مرتب) ،" تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا ، ص ۳۱۰
صاحب تراجم نے مولوی عبدالرشید کو شاہ عبدالغنی کا برادر لکھا ہے حالاں کہ وہ برادر زادہ ہیں-

(۲) رحیم بخش دھلوی،" حیات ولی"، محولہ بالا ، ص ۳۴۹

(۳) محمود احمد برکاتی ، حکیم،" شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، محولہ بالا ، ص ۱۷۹

کہ اس فن میں اپنے اقران و امثال سے ممتاز ہوتا -"(۱)

تعلیقات :

مولانا مملوک علی ، والد کا نام شیخ احمد علی تھا۔ نانوتہ کے مشہور خاندان شیوخ سے تعلق تھا۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق سے جاکر ملتا ہے -(۲) ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء میں نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم نانوتہ میں ہوئی پھر دہلی چلے گئے -(۳) مملوک علی نانوتہ کے پہلے شخص تھے جو تعلیم کے لیے دہلی گئے تھے-(۴) ان کے اساتذہ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، مولانا رشیدالدین خان اور شاہ محمد اسحاق کے اسمائے گرامی آتے ہیں - " ارواح ثلاثہ" کی روایت کے مطابق شاہ عبدالعزیز سے" ہدایت النحو" کا صرف ایک سبق پڑھا تھا -"(۵) پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے کہ " کچھ اسباق پڑھے تھے "(۶) نواب صدیق حسن خان نے صرف مولانا رشیدالدین خان سے ان کے تلمذ کا ذکر کیا ہے -

" تلمذ ایشان در علوم درسیہ با مولوی رشیدالدین خان است"(۷)

مولانا سید عبدالحی کے مطابق رشیدالدین خان وغیرہ علما سے پڑھا -(۸) مولانا

---

(۱) سرسید احمد خان " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ۱۲۷
(۲) عبدالحی ، مولانا سید" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۴۸۷
محمد میاں ، مولانا سید" علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۴ ، ص۲۸۷
انوارالحسن شیرکوٹی ، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۸۴
(۳) عبدالحی ، مولانا سید " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۴۸۷
(۴) انوار الحسن شیرکوٹی ، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۶۲
(۵) اشرف علی تھانوی ، مولانا (مرتبہ)" ارواح ثلاثہ" محولہ بالا ، ص ۲۱۰
(۶) ایوب قادری ، محمد ، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۱۷۰
(۷) ایوب قادری ، محمد (مرتبہ)" تاریخ قنوج"، محولہ بالا ، ص ۱۰۰ (بحوالہ ماہنامہ " سرحد"، کراچی) محولہ بالا ، ص ۶۵
(۸) عبدالحی ، مولانا سید ، " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۴۸

سید محمد میاں نے انہیں شاہ محمد اسحاق کا خاص شاگرد لکھا ہے -(۱) شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق سے ان کی نسبت تلمذ سے انکار اور اختلاف کسی نے نہیں کیا لیکن تکمیل علوم و فنون کی نسبت مولانا رشیدالدین خان دہلوی سے کی تھی-(۲) " ارواح ثلاثہ" کی ایک روایت میں عبداللہ خان علوی کو بھی ان کا استاد بتایا گیا ہے -(۳)

تحصیل علمی سے فراغت کے بعد کچھ عرصے مدرسہ دارالبقا میں تدریس کے فرائض انجام دیے- (۴) اس کے بعد یکم جون ، ۱۸۲۵ء کو دہلی کالج میں مبلغ پچاس روپے مشاہرے پر مولانا رشیدالدین خان کے نائب کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا- ۸ دسمبر، ۱۸۳۱ء کو انہیں شعبہ مشرقی علوم کا صدر مدرس بنادیا گیا- اس ترقی سے ان کی تنخواہ سو روپے ماہوار ہوگئی -(۵) اور آخر تک اسی منصب پر فائز رہے - ان کی موت کا سبب مرض یرقان تھا- گیارہ دن بیمار رہ کر ۱۱ ذی الحجہ، ۱۲۶۷ھ/۷ اکتوبر، ۱۸۵۱ء کو اس جہان فانی سے دارالآخرت کا سفر اختیار کیا فرمایا-(۶) مہندیوں(دہلی کے مشہور قبرستان) میں

---

(۱) محمد میاں ، مولانا سید ؛ "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۲۸۲

(۲) سرسید احمد خان؛ "آثار الصنادید"، محولہ بالا ، ص ۷۰
ایوب قادری ، محمد (مرتب) ؛ "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۲۶۱
عاشق الہی میرٹھی ، مولانا ؛ "تذکرۃ الخلیل"، کراچی: بادہر آرٹس لمیٹڈ ، ۱۹۷۱ء، ص ۹
عبیداللہ سندھی ، مولانا ، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا ، ص ۲۱۶
محمد میاں ، مولانا سید ؛ "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۲۸۲
ایوب قادری ، محمد ؛ "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، صص ۷۲-۷۰ا
انوارالحسن شیرکوٹی ، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۸۳

(۳) اشرف علی تھانوی ، مولانا " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۹۸

(۴) عبدالحی ، مولانا سید ؛ "نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۸۷

(۵) ایوب قادری ، محمد (مرتب) ؛ "تاریخ قنوج"، محولہ بالا ، ص ۱۰۰ (بحوالہ ماہنامہ " سرحد"، کراچی ، محولہ بالا ، ص ۲۵)

(۶) ایوب قادری ، محمد (مرتب) ؛ "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ،صص ۷۲-۱۷۱ و ۱۷۲
کریم الدین پانی پتی ، " طبقات شعرائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۹۳

(۷) عبدالحی ، مولانا سید ؛ "نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۸۷
انوارالحسن شیرکوٹی؛ "انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۸۸
ایوب قادری ، محمد ؛ "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، صص ۸۰-۱۷۹

شیخ عبدالعزیز شکربار کے پائین ذرا الگ کو آپ کی کچی قبر ہے - (۱)

کوچہ چیلان میں انہوں نے ایک مکان خریدلیا تھا -(۲) مولانا مملوک علی غیر معمولی علم و فضل کے شخص تھے - معقولات و منقولات میں ماہر، اصول و فرع میں فائق، عربی ادب و فقہ کے عالم متبحر تھے - مولانا سید عبدالحی نے لکھا ہے کہ فقہ، اصول اور عربی ادب میں کمال حاصل کیا اور منطق و فلسفے میں بڑی مہارت پیدا کی -(۳) مولانا عبیداللہ سندھی نے انہیں "استاذ اساتذہ الہند" (۴) اور ثنا الحق صدیقی نے انہیں "استاذ العصر" لکھا ہے-(۵) ان کے فیضان کو دیکھتے ہوئے یہ دونوں خطاب انہیں زیب دیتے ہیں- ان کے مقام علمی پر ان کے ایک شاگرد مولوی کریم الدین نے نہایت جامع تبصرہ کیا ہے - اس سے ان کی خدمت و ذوق تدریس اور سیرت کے محاسن پر روشنی پڑتی ہے:-

" مولوی مملوک علی مدرس اول مدرسہ دہلی عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں- عہدہ میر مولوی بہ مشاہرہ سو روپے کلکٹ مدرسے میں مقرر ہیں - حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر چاہئے ویسی نہیں کیوں کہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں اور واقع میں بنائے مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے - فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں- ہر ایک علم اور فن سے جو ان زبانوں میں ہیں، مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اور زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے - اسی کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہوجاتا ہے - گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے اور جس کام پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور سرزد نہیں ہوا- مدرسے میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو - بڑے کے زعم

---

(۱) محمد عالم شاہ ، فریدی، "مزارات اولیائے دہلی"، محولہ بالا، ص ۱۰
بشیرالدین احمد، "واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۵۸۳

(۲) انوارالحسن شیرکوٹی، "انوار قاسمی"، محولہ بالا، ص ۱۳۵

(۳) عبدالحی، مولانا سید، "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۸۷

(۴) عبیداللہ سندھی، مولانا، "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۱۱۱

(۵) ثناء الحق صدیقی، "مولانا مملوک العلی نانوتوی"، (مقالہ) ، سہ ماہی "العلم"، کراچی: جنوری، ۱۹۶۲ع ، ج ۱۱، ش۲، ص ۳۱

میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا۔ اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہوں تو بجا ہے ۔ کیوں کہ وہ فاضل ایسا ہی ہے ۔ کوئی کتاب کسی فن کی مشکل ان کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھادیں گے گویا کہ اس کو حفظ کر رکھی ہے ۔ اس لیے رات دن سوائے مدرسے کے ان کے گھر پر طلبہ پڑے رہتے ہیں۔ ہروقت ان کو گھیرے رہتے ہیں اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کرسکتے ۔ سب کو پڑھاتے ہیں ..... بہت خندہ پیشانی اور عقل مند اور ذکی اور ذہین اور تیز فہم اور محقق اور مدقق ہیں۔" (۱)

مولانا مملوک علی نے پچیس سال تک خدمات تدریس انجام دیں ۔ گورنر جنرل نے انہیں ۱۷ دسمبر، ۱۸۳۵ء کے دربار کے موقع پر خلعت سہ پارچہ سے نوازا تھا۔(۲) لیکن سب سے بڑا اعزاز ان کے وہ سیکڑوں شاگرد ہیں جنہوں نے علمی و عملی زندگی کے مختلف میدانوں میں خدمات انجام دیں اور جس چیز نے انہیں "استاذ عصر" اور "استاذ اساتذۃ الہند" کے لقب و اعزاز کا حامل بنایا۔ سیکڑوں طلبہ نے ان سے ہمہ قسم کے علوم و فنون کی تحصیل کی اور زندگی کے مختلف گوشوں میں نہایت نامور ہوئے ۔ بقول مولوی کریم الدین :

> " صدھا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھاکر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہوکر گئے"۔ (۳)

ان میں سے مولانا محمد قاسم ، مولانا محمد یعقوب ، مولانا محمد مظہر، مولانا محمد احسن، مولانا محمد منیر ۔(ان پانچوں اصحاب کا تعلق نانوتہ سے تھا) ۔ مولانا رشید احمد گنگوہی ، قاری عبد الرحمن پانی پتی، مولانا احمد علی محدث سہارن پوری، شمس العلما ڈاکٹر شیخ ضیاء الدین ، مولوی سمیع اللہ خاں، کریم الدین پانی پتی، مولوی نذیراحمد دہلوی،

---

(۱) کریم الدین پانی پتی،" طبقات شعرائے ہند"، محولہ بالا، ص ۲۲-۳۲۳
(۲) ایوب قادری،محمد، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۲۶
(۳) کریم الدین پانی پتی، مولوی،" تذکرہ فوائد الدھر"، ص ۲۰۲

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمن دیوبندی، منشی جمال الدین ، مولوی عالم علی مرادآبادی، شیخ محمد تھانوی، منشی ذکا اللہ دہلوی بہت مشہور ہوئے - (۱) اور ہمارے لیے سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ایک روایت کے مطابق سرسید احمد خان کو بھی ان سے شرف تلمذ حاصل تھا-(۲) سرسید نے معقولات اور منقولات میں ان کی استعداد کامل کتب درسیہ کے استحضار اور ان کے کمال حافظہ کا اعتراف کیا ہے - سرسید لکھتے ہیں :

" علم منقول و معقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ علم خالی ہوجائے تو ان کی لوح حافظہ سے بجنسہ نقل ان کی ممکن ہے -" (۳)

مولانا مملوک علی کے کمال علم و فضل اور ان کی عظمت کے ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ برصغیر میں ملت اسلامیہ کے قیام اور نشئت ثانیہ کی دو عظیم الشان تحریکات جن کا سر عنوان دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ ہے ، کی بنا و کام یابی کا سہرا ان کے دو اجل تلامذہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خان کے سر ہے-

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا ، ص۲۱۲
انوارالحسن شیرکوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۸۷
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، " مولوی نذیر احمد دہلوی"، محولہ بالا ، ص ۵۱
ایوب قادری، محمد ، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، صص ۸۳-۱۸۳
ایوب قادری، محمد " مولانا مملوک علی نانوتوی"، (مقالہ) " الرحیم"، حیدرآباد : (سندھ) ، اگست، ۱۹٦۵ع ، ج ش صص ۲٧-۱۲۵
عباد الحق صدیقی " مولانا مملوک العلی نانوتوی"(مقالہ) محولہ بالا ،"العلم"، صص ۲۹-۳۱
محمد میاں، مولانا سید " علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۴ ، ص ۳۸٦

(۲) عبیداللہ سندھی، مولانا، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا ، ص ۱۱۲(حاشیہ) و ۱۱٦
محمد میاں، مولانا سید " علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۴، ص ۲۸٦
اکرام، شیخ محمد " موج کوثر" لاہور : فیروز سنز، ۱۹٦٦ع ، ص ۸۰
ایوب قادری، محمد " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۱۸۵
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، " مولوی نذیر احمد دہلوی"، محولہ بالا ، ص ۱۵۳

(۳) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، چوتھا باب، ص ٧۰

شاہ محمد اسحاق نے ہندوستان سے حجاز کو ہجرت ولی اللہی پارٹی کی ایک خاص ضرورت کے تحت کی تھی اور اپنے پیچھے ہندوستان میں کام کی نگرانی کے لیے مولانا مملوک علی کی نگرانی میں ایک بورڈ بنادیا تھا ۔ مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں :

"مولانا محمد اسحاق مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملاکر ایک بورڈ بنادیا جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کرکے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے اور یہی جماعت ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام چلاتی ہے۔"

مولانا سندھی آگے چل کر لکھتے ہیں :

" دیوبندی نظام اور اس کی سیاسی مصلحتوں کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو مستحضر کرلینا چاہیے کہ جس دیوبندی جماعت کا تعارف ہم کرانا چاہتے ہیں وہ اس دہلوی جماعت کا دوسرا نام ہے جو مولانا محمد اسحاق کی ہجرت کے بعد ان کے متبعین نے ان کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کے لیے بنائی تھی ۔ اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے "استاذ اساتذۃ الہند" مولانا مملوک علی صدر مدرس مدرسہ دہلی کالج کے لیے مخصوص رہی ۔ ان کے بعد مولانا محمد اسحاق نے مولانا امداد اللہ کو اس کام کے لیے مقرر کیا ۔" (۱)

دہلی میں مولانا مملوک علی کو تحریک کے کاموں کا نگران بنانے کا مقصد یہ تھا کہ مملوک علی انگریزی مدرسے کے ملازم تھے اور ان کی نگرانی میں یہ کام مشکوک و شبہات سے بالا رہ کر چل سکتا تھا۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں :

" مولانا اسحاق نے حزب ولی اللہ کے کام کو چلانے کے لیے دہلی میں جو انتظام کیا تھا اسے آپ کمپنی کے کارندوں سے مخفی رکھنا ضروری سمجھتے تھے اور

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" محولہ بالا، صص ۱۱-۱۱۰

اسی غرض کے پیش نظر انھوں نے اپنا مرکز مولانا مملوک علی کے حوالے کیا تھا جو ایک سرکاری ملازم تھے اور آپ نے اپنے خاص اصحاب کی جماعت کو ان کے تابع کردیا تھا۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

" مولانا مملوک علی سرکاری مدرسے کے ملازم تھے ۔ ان کی نگرانی میں گویا حزب دہلوی کا کام شبہات سے بالا رہ کر چل سکتا تھا ۔ ورنہ ریذیڈنٹ کی نظر نہایت تیز تھی۔" (۱)

ان کی حیات صالحہ کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ سالہا سال سرکاری ملازم رہنے کے باوجود انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ریذیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنے کو آئے تو مولوی مملوک علی سے بھی ہاتھ ملایا ، لیکن صاحب بہادر کے مدرسے سے جانے کے بعد ہاتھ کو کئی بار دھویا۔ (۲)

مولانا مملوک علی نے بڑی مصروف زندگی گزاری۔ مولوی کریم الدین نے " فوائدالدہر" میں لکھا ہے کہ مدرسہ کے طلبہ کو درس دینے کے علاوہ گھر پر بھی طلبہ کو ہر علم کی کتابیں پڑھاتے تھے یہ سلسلہ صبح نماز فجر کے بعد شروع ہوتا تھا اور نصف شب تک جاری رہتا تھا ۔(۳) حتی کہ مدرسے جاتے ہوئے راستے میں بھی تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے حیات النذیر کے حوالے سے مولوی نذیر احمد کی ایک روایت نقل کی ہے :

" خود کہا کرتے تھے کہ مولوی صاحب (مملوک علی) کو فرصت نہ تھی۔ میں نے بہ اصرار کہا التجا کی تو فرمایا ، اچھا جس وقت ہم مدرسے جایا کرتے ہیں

---

(۱) عبیداللہ سندھی ، مولانا ، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" ، محولہ بالا ، ص ۱۱۵
محمد میاں ، مولانا سید ، " علمائے ہند کا شاندار ماضی" ، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۱۱-۲۱۰

(۲) ایضاً ، ج ۲ ، ص ۲۸۷

(۳) ایوب قادری ، محمد ، " مولانا محمد احسن نانوتوی" ، محولہ بالا ، ص ۱۸۲

آجایا کرو۔ راستے میں چلتے چلتے جو کچھ پڑھ سکوگے پڑھادیا کریں گے - " مولوی صاحب (نذیر احمد) نے اس کو غنیمت جانا۔ مولوی مملوک علی پنس میں سوار ہوکر کالج کو چلتے یہ کتاب لے کر ساتھ ہولیتے - پنس کے ساتھ دوڑتے، ٹھوکریں کھاتے ، گرتے، مگر واہ رے شوق ! اس پر بھی سبق ہوجانے کو دوست سمجھتے۔" (۱)

تدریس کے اس انہماک اور مشغولیت کے باوجود تصنیف و تالیف و ترجمے کے کام سے ان کی زندگی کا علمی گوشہ خالی نہیں رہا - دہلی کالج کی طرف سے شائع ہونے والی کتابیں اکثر ان کی نگرانی میں ترجمہ ہوئیں اور ان پر انھوں نے نظر ثانی بھی کی - تین کتابیں ان کے ذوق ترجمہ کی یادگار ہیں۔ یہ تراجم مدرسہ کی نصابی ضرورتوں کے پیش نظر کیے گئے تھے۔

تحریر اقلیدس : - دہلی کالج کے پرنسپل کے ایما پر ۱۸۴۳ء میں تحریر اقلیدس کے ابتدائی چار اور گیارھویں اور بارھویں مقالے کا ترجمہ کیا۔ (۲) ان کی زندگی میں متعدد بار شائع ہوئی -

مولوی عبدالحق کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر اقلیدس کے آٹھ مقالوں کا ترجمہ کیا تھا - مقالہ ۱ تا ۶ و ۱۱ و ۱۲ (۳) لیکن محمد ایوب قادری کی نظر سے یہ نادر کتاب گزری ہے اور انھوں نے مقالہ ۱ تا ۴ و ۱۱، ۱۲ کی صراحت کی ہے -(۳)

ترجمہ سنن ترمذی :- چوں کہ یہ کتاب دہلی کالج کے نصاب میں شامل تھی اس لیے مولوی مملوک علی نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔

تاریخ یمینی :- یہ کتاب بھی چوں کہ دہلی کالج میں عربی کی دوسری جماعت کے نصاب میں شامل تھی اس لیے مولوی صاحب نے اس کا ترجمہ بھی اردو میں کیا۔

---

(۱) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر: " مولوی نذیر احمد دہلوی"، محولہ بالا، ص ۵۱

(۲) عبدالحق، ڈاکٹر مولوی: " مرحوم دہلی کالج"، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۴۵ء، ص ۱۲۷

(۳) ایوب قادری، محمد، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۸۷

ایک غیر منقولہ عربی خط جو بخط مولوی صاحب شہزادہ فیروز شاہ ~~کو لکھا تھا~~ [کے نام یادگار ہے] ۔

مولوی کریم الدین نے " تذکرہ فوائد الدھر" میں اسے نقل کیا ہے -(١)

مولانا مملوک علی کے دو صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں تھیں - بڑے صاحب زادے کا نام نامی مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے - آپ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس تھے اور علم و فضل اور تقوی و نیک نفسی میں اپنے والد گرامی کے سچے جانشین تھے- چھوٹے صاحب زادے مولوی حکیم محمد معین الدین تھے جو تشخیص امراض جسمانی میں صاحب کمال ہونے کے ساتھ نہایت متقی، متوکل اور منکسرالمزاج تھے- دونوں صاحب زادیاں شاہ احمد علی کے دو بیٹوں مجید علی اور انصار علی کو بیاہی تھیں - مجید علی کے صاحب زادے سہارن پور کے مشہور عالم دین مولانا خلیل احمد تھے اور انصار علی کے صاحب زادے علی گڑھ کالج کے ناظم دینیات مولانا عبداللہ انبیٹھوی تھے - جن کا تقرر خود سرسید نے کیا تھا - (٢)

*****

---

(١) تصانیف و تراجم کی تفصیلات کے لیے دیکھئے :
کریم الدین پانی پتی،" تذکرہ طبقات شعرائے ہند"، محولہ بالا، ص ٣٦٣
عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، مرحوم دھلی کالج"، محولہ بالا، صص ١٣٧، ١٥٣، و ١٢٠
اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں" تذکرہ اهل دهلی"، محولہ بالا، ص ١٣٦
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ٣٦١
ایوب قادری، محمد " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، صص ٨٨-١٨٧
انوارالحسن شیرکوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا، صص ٨٨ و ٩٦
ایوب قادری، محمد " مولانا مملوک علی نانوتوی"، (مقالہ) " الرحیم"، حیدرآباد : اگست، ١٩٦٥ع ، صص ٧٨-١٧٧

(٢) عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا " تذکرہ خلیل"، محولہ بالا، ص ٣٣
سید احمد ولی اللّٰہی، ظہیرالدین " یادگار دھلی"، محولہ بالا، ص ٩٨

فصل ـ دوم

شعرا و اطبا

جناب مولوی امان علی سلمہ اللہ تعالی :

" عامل اکمل ، فاضل اجل ، صاحب اطوار، صدق و صفا ، زبدۃ کملا و اسوہ اتقیا ، مولوی امان علی ، سادات صحیح النسب سے ھیں اور تحصیل علم خدمت فیض موھبت مولانا شاہ عبدالقادر قدس سرہ سے کی ھے ۔ بہ سبب قناعت و استغنا کے کبھی اھل روزگار کی طرف رجوع نہیں کی اور ھمیشہ بے پروایانہ زیست کرتے ھیں اور جو کہ رزاق انس و جان کے خزانۂ تقدیر سے وظیفہ روز شب ھے اسی پر قائم ھوکر اغراض دنیوی کو وسیلہ تملق و خوشامد اخوان زمان نہیں کیا ۔ جو کہ علم و عمل طب میں مہارت تامہ رکھتے ھیں اس بہانے سے لطف رب جلیل نے شفائے اسقام ان کے خامہ فیض علامہ کی زبان میں ودیعت رکھی ھے اور اس حیلے سے مثوبات ثواب اخروی ان کے گنجینۂ اعمال میں تودہ تودہ جمع ھوتے جاتے ھیں ۔ راقم کو ان کی خدمت میں نیاز و اعتقاد بدرجۂ کمال حاصل ھے ، اور ان کی طرف سے راقم پر بھی مراتب الطاف اندازہ سے زائد وقوع میں آتے ھیں ۔ غرض کہ ان کی صفات حمیدہ حوصلۂ اندیشہ میں نہیں گنجائش رکھتے لکھنے اور بیان کرنے کا تو کیا محل ھے ۔" (۱)

تعلیقات :

مولانا عبدالحی نے انھیں حکیم امان علی علوی دھلوی اور ان کا مولد و منشا دھلی لکھا ھے ۔ نیز شاہ عبدالقادر سے علم حاصل کرنے اور حدیث پڑھنے کا تذکرہ ھے ۔ مولانا عبدالحی نے " آثارالصنادید " سے استفادے کا اعتراف کیا ھے ۔ (۲) مولوی بشیرالدین دھلوی نے ان کا صرف نام " امان اللہ " دیا ھے ۔ (۳) لیکن جن دوسرے بزرگوں کا نام

---

(۱) سرسید احمد خان: " آثارالصنادید "، محولہ بالا ، باب چہارم ، ص: ۳۰-۱۲۹

(۲) عبدالحی ، مولانا سید: " نزھۃ الخواطر "، محولہ بالا ، باب ۷ ، ص: ۷۸-۷۷

(۳) بشیرالدین احمد دھلوی: " واقعات دارالحکومت دھلی "، محولہ بالا ، حصہ دوم ، ص ۳۱۲

اس موقع پر انھوں نے تحریر کی ہیں ان سب کا مآخذ " آثارالصنادید" ہے اس لیے یقین ہے کہ امان اللہ سہو قلم ہے ۔ صحیح نام امان علی ہے ۔ مولانا عبدالحی نے ان کے ترجمے کے عنوان میں ان کے نام کے ساتھ " حکیم " کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ نیز انھیں علم و فن طب میں فائق اور طبیب حاذق لکھا ہے ۔ (۱) سرسید نے بھی ان کی سب سے بڑی خصوصیت علاوہ ان کی سیرت کے کمالات کی یہی لکھی ہے کہ علم و عمل میں امتیاز کے ساتھ طب میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ (۲) اس لیے ہم نے انھیں اطبا کے زمرے میں شامل کیا ہے ۔

==xxx===

حکیم صادق علی خان :
==============

" حکیم حذاقت منش ، طبیب عیسوی روش، سرگروہ کملائے زمان، حکیم صادق علی خان ولد سرآمد حکمائے روزگار حکیم شریف خان۔ آج اس کمالات ظاہری و باطنی کا جامع عرصۂ روزگار میں جلوہ گرہ نہیں۔ علم عمل کے ساتھ اس بزرگ بلند فطرت کی ذات میں جمع ہے۔ ان کے والد ماجد اپنے عصر میں سرآمد حکما اور سر حلقہ اطبا تھے ۔ آج تک ان کے کمالات کا شہرہ گنبد دوار میں از بس بلند ہے ۔ جالینوس و ارسطو کا غلغلہ اس کے سامنے ایسا ہے جیسا طوطی کی آواز نقار خانے میں ، اور فی الحقیقت اس روزگار کے اکثر اطبا نے دامن انھیں کی نسبت شاگردی سے سرمایہ اعتبار کا رکھتے ہیں جو کہ اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں ، حضرت ممدوح بھی اپنے زمانے میں یکتا اور بے مثل ہیں۔ نہ ان کے علم کی صفت زبان قلم پر آسکتی ہے اور نہ عمل کی تعریف اندیشہ میں سماسکتی ہے ۔ سارے زمانے کے کملا کو جس کے خاندان کی نسبت شاگردی سے فخر ہو اس کی تعریف اسی قدر کافی ہے ۔ " (۳)

---

(۱) عبدالحی ، مولاناسید : نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ص ۷ ، ص ۷۸
(۲) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۷۱
(۳) ایضاً، باب چہارم، صص ۶۳

تعلیقات :

حکیم صادق علی خاں، حکیم شریف خاں کے بیٹے تھے۔ اور ان کے والد اکمل خان ابن محمد واصل خاں بن حکیم محمد فاضل خاں کے تھا۔ (۱) ان کے عربی، فارسی کے اساتذہ کا علم نہیں ہوسکا۔ طب انھوں نے اپنے والد سے پڑھی تھی -(۲) جو خاندان ولی اللہی کے خاندان کے ایک تلمیذ تھے۔ (۳) حکیم صادق علی خاں ۱۱۸۳ھ (۴) میں دھلی میں پیدا ہوئے وہیں پرورش ہوئی ، وہیں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور اپنے عہد کے نامور صاحب درس و افادہ اطبا میں سے ہوئے -(۵) مغلیہ دربار سے وابستہ تھے اور اکبر شاہ ثانی کے شاہی طبیب تھے - (۶)

۲۱ صفر ، ۱۲۶۳ھ ۶ فروری ، ۱۸۴۸ع ، بروز شنبہ ۸۰ سال کی عمر میں دھلی میں انتقال ہوا- (۷) ان کی اولاد میں حکیم غلام محمد خاں، حکیم غلام محمود خاں اور حکیم غلام مرتضا تین بیٹے تھے-(۸) حکیم غلام محمد خاں کے بیٹے حکیم غلام اللہ خاں تھے جو مسیح الملک حکیم اجمل خاں دھلوی کے خسر ہوئے - دوسرے بیٹے حکیم غلام محمود خاں وہی

---

(۱) عبدالغفار، محمد ، " حیات اجمل"، دھلی : ۱۹۵۰ع ، ص ۱۲
(۲) سرسید احمد خاں، " آثار الصنادید" ، محولہ بالا ، ص ۳۷
(۳) کوثر چاند پوری، حکیم " اطبائے عہد مغلیہ"، کراچی : ھمدرد اکیڈمی، ۱۹۶۰ع، ص ۱۰۸
(۴) "اطبائے عہد مغلیہ" نے ۱۸۸۴ع سال ولادت لکھا ھے - اس میں سیکڑے کا عدد اور سن عیسوی غلط ہے - ۱۲۶۳ھ میں انتقال کے وقت ۸۰ سال کے تھے اس لیے یہ سن ۱۱۸۳ھ ہوتا ھے - (ابوسلمان شاھجہان پوری)
(۵) عبدالحی، مولانا سید " نزھتہ الخواطر" محولہ بالا ، ج ۷، ص ۲۱۶
نصر، حکیم عبداللہ خاں طبیب، " خاندان شریفی کے دودمان عالی"، (مقالہ) ، " خبر نامہ"، لاھور : ستمبر، ۱۹۷۶ع ، ص ۷
(۶) ایضاً، " خبر نامہ طب"، لاھور: ستمبر، ۱۹۷۶ع ، ص ۷
(۷) ایضاً، ص ۷
عبدالحی، مولانا سید " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، کذ ج ۷، ص ۲۱۷
(۸) عبدالغفار ، محمد " حیات اجمل"، محولہ بالا ، ص ۱۲

محمود خان ہیں جن کا پردرد مرثیہ حالی نے لکھا ۔ حکیم اجمل خان آپ ہی کے نامور فرزند تھے ۔(۱)

حکیم صادق خان نے اپنے علم و عمل طب سے خلق کثیر کو فائدہ پہنچایا۔ (۲) اور درس و تدریس سے اصحاب علم و فن کی ایک جماعت تیار کردی کہ آج تک برصغیر پاک و ہند میں جو طب کے عالم پائے جاتے ہیں ان کا سلسلہ تلمذ آپ کے خاندان پر منتج ہوتا ہے ۔ وہ برصغیر میں طبی تعلیم کے بانی تھیں ۔(۳)

حکیم صاحب موصوف کے بعد نہ صرف ان کے نامور صاحب زادگان اور اکابر تلامذہ نے ان کے نام کو روشن کیا بلکہ انھوں نے متعدد رسائل و کتب بھی اپنی یادگار چھوڑی تھے جن کی بدولت علم و فن طب کی دنیا میں آپ کا نام زندہ ہے ۔ ان میں سے "شرح تشریح اعضائے مرکبہ " (تصنیف ۱۲۳۷ھ) ، " زاد غریب یا مخازن التعلیم " (فارسی) ، " طریق تعلیم طفلان "۔(۳) " کلیات خورد وکلاں "، " شرح معالجات "، " قانون چہ "، قانون " رسالہ در خواص ادویہ و اغذیہ "، " نسخۂ مرکبہ در طب " اور " رسالہ تقویۃ العقائد " بہت مشہور ہیں ۔(۵)

ان تصانیف سے فن طب میں اور عربی و فارسی میں ان کی اعلا قابلیت کا پتاچلتاہے۔(۶)

---

(۱) عبدالغفار، محمد،" حیات اجمل "، محولہ بالا ، ص ۱۳-۱۲
حالی، خواجہ الطاف حسین ،" کلیات حالی "، لاہور: مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۸ء ، حصہ -۱، ص ۳۹-۳۳۷
(۲) عبدالحی، مولانا سید،" نزہتہ الخواطر،" محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۲۱۶
(۳) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید "، محولہ بالا ، ص ۳۷
([illegible]) نصر، حکیم عبداللہ خان، " خاندان شریفی کے دودمان عالی "، محولہ بالا ، ص ۷
(۴) کوثر چاندپوری، حکیم، " اطبائے عہد مغلیہ "، محولہ بالا ، ص ۱۱۶
(۵) نصر، حکیم عبداللہ خان،" خاندان شریفی کے دودمان عالی "، محولہ بالا ، ص ۷
(۶) رئیس احمد جعفری،" بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد "، محولہ بالا ، ص ۱۵۱

حکیم غلام حسن خان :

" برادر حقیقی حکیم غلام حیدر خان موصوف بصفات کمال کتب طبیہ میں مہارت تام اور علاج معالجے میں دست گاہ تمام رکھتے تھے ۔ تحصیل فن طب حکیم شریف خان کی خدمت سے کی تھی اب عرصہ چند سال کا ہے کہ اس جہان سے عالم باقی کی طرف راہی ہوئے ۔"(۱)

تعلیقات :

حکیم غلام حسن خان ، حکیم نامدار خان کے بیٹے اور مومن کے چچا تھے۔

" نزہتہ الخواطر" میں ان کے بارے میں یہ معلومات زائد ہیں کہ مولد و منشا دہلی تھا۔ شاہ عبدالقادر سے پڑھا تھا۔ تدریس طب کا شغل بھی جاری تھا۔ ان کے علم اور فن سے لوگوں کو بہت نفع ہوا۔ (۱۲۵۰ھ / ۳۵-۱۸۳۴ء کے بعد ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء سے قبل) انتقال فرمایا۔(۲) " واقعات دارالحکومت دہلی" میں حکیم محمد یوسف خان اور حکیم عبدالحکیم عرف ابوخان کے ساتھ ان کا نام آیا ہے اور تینوں کے بارے میں صرف ایک جملہ درج ہے کہ " سب بڑے بڑے حکیم گزرے ہیں" ۔(۳)

حکیم صاحب موصوف کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ حکیم عبدالحکیم خان اور حکیم محمد یوسف خان ان کے بیٹے تھے ۔ سرسید نے ان کا ترجمہ لکھا ہے ۔ تیسرے بیٹے عبدالناصر خان تھے (۴) چوتھے بیٹے اور بیٹیوں کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوسکا۔

===xxx===

حکیم غلام حیدر خان :

" ارشد تلامذۂ حکیم شریف خان سے ہیں ۔ مقامات کتب طب موافق زعم راقم کے

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۶۸

(۲) عبدالحی، مولانا سید، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۵۰

(۳) بشیرالدین احمد دہلوی، " واقعات دارالحکومت دہلی" محولہ بالا ، ج ۲، ص ۳۰۷

(۴) فائق رام پوری، کلب علی خان، " مومن"، محولہ بالا ، ص ۲

جیسے ان کی خدمت میں حل ہوتے ہیں، غالب یہی ہے کہ اس جزو زمان میں اور کہیں نہ ہوتے ہوں۔ خدمت اساتذہ کرام مثل مولانا مخدومنا مولوی عبدالعزیز دہلوی اور مولوی رفیع الدین اور مولوی عبدالقادر صاحب ارفع اللہ درجاتہم سے سالہا سال استفادہ کیا اور انواع فیوض حاصل کیے۔ شفائے کامل ان کے دست حق پرست میں ودیعت ہے - راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے - " (۱)

تعلیقات :

حکیم غلام حیدر خان، حکیم نامدار خان کے دوسرے بیٹے اور مومن کے نامور چچا تھے۔ " آثارالصنادید " کے علاوہ مولانا سید عبدالحی نے " نزہتہ الخواطر" میں (۲) ، بشیرالدین احمد دہلوی نے " واقعات دارالحکومت دہلی" (۳) میں ، عرش گیاوی (۴) ، عبادت بریلوی (۵) اور فائق رام پوری (۶) نے مومن پر اپنی تصانیف میں اجمالاً آں موصوف کا تذکرہ کیا ہے لیکن سب کا ماخذ آثار ہے اور اسی کے بیان کا خلاصہ کردیا ہے - سرسید نے جب ان کا ترجمہ لکھا تھا تو وہ زندہ تھے لیکن دوسروں نے جب ان پر قلم اٹھایا تو چوں کہ ان کا انتقال ہوچکا تھا اس لیے ان کے لیے ضمائر اور افعال بدل دیے ہیں۔

سرسید نے آں موصوف سے طب پڑھی تھی - سرسید نے خود اس کا اعتراف کیا ہے:

" راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے۔" (۷)

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۶۵
(۲) عبدالحی، مولانا سید " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۵۳
(۳) بشیرالدین احمد دہلوی " واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۳۰۶
(۴) عرش گیاوی، ضمیرالدین، " حیات مومن"، دہلی: کتب خانہ علم و عمل، س ن، ص
(۵) عبادت بریلوی، ڈاکٹر " مومن اور مطالعہ مومن"،
(۶) فائق رام پوری، کلب علی خاں " مومن"، محولہ بالا ، ص ۷
(۷) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۳۷

حالی کے بیان سے اس اجمال پر کچھ مزید روشنی پڑتی ہے - ابتدائی تعلیم کے تذکرے کے بعد حالی لکھتے ہیں :

" اسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہوگیا- حکیم غلام حیدر خان سے جو ایک خاندانی حکیم تھے- طب کی ابتدائی کتابیں مثل قانون چہ اور موجز پڑھنے کے بعد معالجات سدیدی، شرح اسباب اور نفیسی امراض عین تک پڑھی اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب بھی کیا- پھر پڑھنا چھوڑ دیا- جب انہوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اس وقت ان کی عمر اندازہ انیس برس کی تھی-" (۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے ان سے ۳٦-۱۸۳۵ع میں پڑھا ہوگا- فائق رام پوری نے حکیم نامدار خان کے خاندانی شجرے میں حکیم غلام حیدر کے نام کے نیچے " چار بیٹے " لکھے ہیں لیکن انہوں نے نام ایک کا بھی نہیں لکھا -(۲) تلامذہ میں صرف سرسید کے نام پر تاریخ کی روشنی پڑی ہے - (۳)

مومن خان نے اپنے چچا غلام حیدر خان کی مدح میں ایک نہایت پر زور قطعہ کہا جو ان کی کلیات میں شامل ہے -(۴) آن ممدوح کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہوسکی- لیکن " آثارالصنادید" میں ان کے ترجمے کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴٦ع میں آثار کی تالیف کے وقت تک زندہ تھے -

==xxx===

حکیم فتح اللہ خان :

" کہین برادر حقیقی حکیم نصراللہ خان صاحب کے ہیں- تحصیل فن طب حکیم صاحب

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین : " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۳۲

(۲) فائق رام پوری، کلب علی خان : " مومن"، محولہ بالا، ص ۵

(۳) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چہارم، ص ۳۷

(۳) حالی، خواجہ الطاف حسین : " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۳۲
عبدالحی، مولانا سید : " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۳۱

(۴) مومن، مومن خان : " کلیات مومن"، محولہ بالا، ج ۲، صص ۲-۱۰۰

موصوف کی خدمت سے کی ہے اب اس فن میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں مدت مدید سے نواب اکبر علی خان رئیس پٹودی کی سرکار میں عہدہ طبابت پر مامور ہیں۔" (١)

تعلیقات :

حکیم فتح اللہ خان، حکیم ثناء اللہ حنفی دہلوی کے بیٹے اور حکیم نصراللہ خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ علوم حکمیہ کے نامور علما میں سے تھے - دہلی میں پیدا ہوئے اور پڑھے پلے - دہلی ہی ان کا مہبط علمی تھا اور یہیں کے علما کی خدمت میں علم حاصل کیا۔ انھوں نے اپنے بھائی سے بھی پڑھا تھا۔ ان کے دیگر اساتذہ کے نام معلوم نہیں ہوسکے - طبابت کے علاوہ درس بھی دیتے تھے۔ (٢) بشیرالدین نے " آثار الصنادید" کے بیان کا خلاصہ کردیا ہے - (٣)

===xxx===

جناب محمد مومن خان ، مومن سلمہ اللہ تعالی :

" زنگ زدائے آئینہ سخن دانی مصقل مرات نکتہ رانی، محی مراسم کمال ماحی کساد فضل و افضال ، جلوہ دہ عرش مضامین تازہ زیب و سادہ کمالات بے اندازہ سرمست نشہ سخن وری ، نظر باز شاہد معنی پروری، غواص محیط تدقیق آشنائے بحر تحقیق ، پیرائے محامد پسندیدہ حلیہ طراز اطوار گزیدہ ، غازہ پرداز ، چہرہ خلق محمدی مظہر آثار سعادت ازلی و ابدی، یگانہ جہان محمد مومن خان مومن تخلص۔ ان کے کمالات کا اندازہ ظرف شمار سے افزوں اور حیطۂ تعداد سے بیروں ہے - معنی تازہ سے قالب الفاظ میں جان ڈالنا اور انفاس عیسوی سے معنی پژمردہ کو تازہ تر از گل اور سیراب تر ازمل کرنا ایک شیوہ ہے ، خاصہ اسی سخن سنجی معانی پناہ کا - ان کے فروغ ضمیر سے الفاظ دری کوکب دری اور

---

(١) سرسید احمد خان، " آثار الصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ٦٦

(٢) عبدالحی، مولانا سید،" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ٧، ص ٣٦٧

(٣) بشیرالدین احمد دہلوی،" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ٢، ص ٣٠٦

ان کی متانت طبع سے سخن ریختہ ایوان ریختہ ۔ اگر یہ کہا جایے کہ شیرینی زبان حافظ
مُشک سخن سعدی اور متانت تراکیب انوری اور نشست الفاظ خاقانی اور آبادی عبارات
ابوالفضل هندی اور تازگی معانی کمال الدین اصفہانی اور سوا اس کے جو خوبی صفت شعرا
سے کسی کے ساتھ مختص ہے سب ان کے کلام معجز نظام میں صرف ہے ۔ حق شناسی اور
مرتبہ سے بہت بعید اور نہایت دور از کار ہے ۔ حق یہ ہے کہ قسام ازل نے سب کو انہیں
کے خوان استعداد سے منصب ریزہ چینی اور انہیں کے دیگ کمال سے وظیفہ چاشنی گیری عطا
کیا ہے ۔ زبان ریختہ میں وہ کمال مبداء فیاض سے حاصل ہوا ہے کہ سودا کو ان کے سخن
کے رشک سے جنون اور میر ان کے کلام کی خجلت سے مرقد میں سرنگوں ۔ سخن گوئی کو بحد
اعجاز پہنچایا اور شعر نے ان سے مرتبۂ حکمت کا پایا۔ نکات سخن اور دقائق فن ان کی
قلم سے اس طرح گرتے ہیں جیسے ابر سے باران لطافت ۔ ان کی طبیعت اور فروغ ان
کے ضمیر میں ایسی ہی ہے جیسے آئینہ میں صفا اور مشرق میں خورشید رخشاں۔ ابیات ان
کی مثل بیت ابرو سراپا انتخاب اور اشعار ان کے مانند مصرع زلف مجموعۂ آب و تاب ۔ سخن
ان کا باوصف پر گوئی کے رکاکت سے خالی اور فکر ان کا باوجود غور کے عالی۔ دیوان ریختہ
کا مشتمل ہے اصناف سخن اور شعب فن پر ۔ غزلیات سے لے کر تا مخمسات و مسدسات اور
فرد سے لے کر تا رباعیات و قطعات جس پر نظر پڑے اگر وہ عاشقانہ ہے ہر حرف اس کا گرہ
تصویر آہ ہے اور اگر انداز معشوقانہ کا بیان ہے تو ہر دائرہ اس کا ایک چشم سراپا ہے ۔
مستعد نگاہ الحاصل کلام بلاغت نظام ان کا حصر و شمار سے افزوں ہے ۔ چند مثنوی اور
قصائد متعدد اور انشائے نثر با عبارات متین و با مضامین رنگین ۔ اگر سب کو بتفصیل لکھا
جائے ایک دفتر ہوجائے ۔ اسی قدر پر کفایت کرکر کچھ نثر اور کچھ نظم لکھتا ہوں تاکہ ارباب
شوق کو اس سے استفادہ ہو ۔

رقعهٔ فارسی بخدمت حکیم

ای مرگ بدور چاره ات در آزار   جز چشم بتان کسی ندیدیم بیمار
دانم که شفاخانه شود گورستان   گر رنجه کنی قدم پئے استغفار

حال برادر نزار شنیده و تعلل اسباب رسیده ـ لبی به پرسش نگشادن این عقد کشاد و گامی بطریق عیادت نهادن رویراه تفهیم نهاد ـ چون راز پنهان/ نماند و باسر مکتوم سزای کتمان ، اگر ناله بیمارا نه سرکم زبان بوم است اگر چنین وصایا برلب آرم نفس واپسین صواب انجام ، ورنه مداوای مریض عشق به نسخهٔ معجز الیسر متقول نیست ، دعوی بیمار درد عقد محبت از لقمان مقبول نه ـ گویم که رائے اصابت قرین بجان داروئے وصال بی بود ، جانانه عاشق کش را بچشم خانه که تواند آورد ، درین حال هم شرح احوال و تفصیل ملال بیصرفه نخواهد بود ـ شغل دم شماری مفت نیست ، بعد مرگ هم بآگاهیدن و دست غم گساری توان نمود ـ فی الجمله گردن کشی اخلاط ستة ضرور به راشمان ، قارورهٔ تهی و رنگ کاهی دلیل گدازش تن بعذاب جرجیس است و نبض نملی از یاد آمدن حکایت سلیمان و بلقیس ـ افسانه شد لیلی باعث غلیان دم است و حکایت جوئے شیر شیرین سبب هیجان رطوبت و بلغم ـ شعله زدن آتش شوق را حمی لثقه نام برده ام و جگر سوزی حرارت عشق را به تشخیص تپ محرقه غلط کرده ام ـ صداع در اندیشه سرگرانی است و شقیقه بفکر رو گردانی ـ صابه آن که سر از [illegible] اطاعت بخت دنون ناتوان برداشت و قرانیطس از آن که روز گاری فارغ از حجر، و بعض غم خواران باید گذاشت ـ نسیان از واو خالی طبیبان ست و آفة التخیل چنان تقرب رقیبان دوار همه دم بهم گردش سپهر ناهنجار است و سدهٔ برهان حزن روز سیاه و شب تار ـ از یاران می گریزم قطرب همین باشد ، کمتر بر طالع دون می خندم داعنا الکلب چنین بود ـ سهر خواب برعاشق حرام است ، ثبات همان بی خودی مدام ، خیال طول امل ایلیمیا باشد و بجوش آمدن خون

مورث ابو بلقیسیا - کابوس در بی خودی هائی غیرت ملبوس، نعاس دوستی رسیدن عس - آئینهٔ
چشم جلوه گاه ذکر است سکته به شوخی رسیده و گردن از فرمان اطبا پیچیدن مثبت و تشنج
و کز از گردیده - لقوه بزبان کج از خم زلف سخن گفتن ، صداع روح حساس و از صحبت
اغیار بر آشفتن - رعشه بی اختیاری هائی اشتیاق خیالات بحسرت نگریستن ، صحبت دهان و عشاق
کمان یرقان از رنگ زرد ، برد اطراف از ضبط دم سرد - سبل از نظارهٔ غیر پرده برچشم گذاشتن،
شعر المنقلب تصور برگشته مژگان نگهداشتن - ظفره تخیل ناخن نگاربسته یار، سلاق تراوش پاره
هائی دل از دیدهٔ خونبار - نزول الماء بهم گریستن ، منهق النفس مژد بی یار زیستن - طنین
از مکالمت با تصور ناهید سرانهست جوش عطاس از سرگرمی یاد شمع لقائی زکام به تهیهٔ گلگشت
بهشت آفرین کوشی ، خرس لب گزیدن از دست ترش ابروئی - ثبور الشفه از گرمی تقریر، شقاق
اللسان از ناله هائی الماس تاثیر - بطلان الذوق از غم و غصه خوردن - خناق را از دل بر زبان
دعا بردن - سوال بهانهٔ جواب صحبت کر ، نفث الدم مغازیهائی دشنه اثر - عسر البلع فرو
فرو بردن جرعهٔ تبرید ، و قروح المری از ناگواری لقمه هائی ترید - علامت شوصه برهنیتی نمی توان
خفت ، جفاف اللسان باین تر زبانیهائی هیچ نتوان گفت - خارخاردشت گردیها باعث خفقان ،
تشنه کامی هائی وصال با عطش مفرط توامان - غشی از ضعف دل است ، و ضعف دل از
کشمکش شوق تاب گسل - سوء الهضم از کباب جگر بجوع کاذب خوردن ، جگ وجشاء حامض گله
ترش روئی بر لب آوردن - تهوع و غثیان از بی مزگی رشک افزاست ، و اختلاج معده در خواهش
نیم خورده ، دل بریا - لذع زهراب هجران است ، و دفع آن از کثرت حسرت خوردن - می
ترسم که تنگ ظرفی ما سارپقا بردات کیموس نکشد ، و از تخالف مذهب اندیشه ناکم که سر انشا
عشری بایلاوس نه انجامد - قولنج است که در هوای دل پهلو به پهلو می طپم، استسقائت است
که بصد سبوی آب همان تشنه لبم - از شکایت کدورت نفس بوسها برده ام - ریگ در مثانه

فراهم فراهم گردیده، وبامتلاے جدی اگر سنگ طفلان نخورده ام حماقت گلیتی از کجا بهم رسیده - سرکشی فریسموس بضرر حکته الرحم پاراست و برضود بالیدن فتق بارادهٔ کهن دردیدن انبار - وجع المفاصل از جریان ملاقات و عرق النسا با بر بازدن از التفات - اورام نوبت تا بدست و پاکشیده باقرار سلامت اعضا رئیسه رئیس الحمقایندرام ، حرارت غریبی قلب تا مغز استخوان رسیده افکار دق آخرین درجهٔ جهل مرکب افکارم - مادهٔ بحران هر روز رنج جلوه های بی هنگام است ، و علت غائی هذیان آهنگ خواب‌ادا هائے بی محل و بی مقام ، در چنین وقت که ملک الموت نشتر برگ جان سپرده ،و مسحا فریاد" ان تعذ بهم فانهم عبادک "از عرش برین بالاتر برده، غسال کا فور بگلاب آلوده و بخار تخت و تابوت درد ده ، خیاط گریبان کفن در بدچاره فرمایه هائے هائے نالیدنور آغوش تعنا باز کرد ، و نوحه گر زبان واویلا وراز - صلوة جنازه از جواب غفلت دل کشا تر است و دعاے مغفرت از صفیر نوم، جانفزا تر حاشاثم حاشا زینهار زینهار مهانگ ، لب به تلقین و استغفار بکشاد ، غفرالله لمن قال :

ز تاب رشک ملائک بدو زخ اندازند
تو بر جنازهٔ موس اگر نماز کنی

والسلام

اشعار فارسی

چسان بردالہ ام گوشے نهدبیدرد می داند
محبت هائے پنهان را شکایت هائے پیدا را

خوش نیست دوره چرخ و مه و آفتاب را　　از سر بنا نهید جهان خراب را
امشب عسس زکوی توام چون برد که دوش　　فریاد من زدیده شدوبرد خواب را
هم تاب وصل نیست من بی نصیب را　　خود دشمن خودم نشاسم رقیب را

====XXX====

خنده چه خوش شیوه ایست از پس خشم و عتاب
لذت دیگر بود زخم نمک سودا را

گریهٔ حال خودم آمد و طوفان آورد   کرده آئینه خراب این همه کاشاده ما

===XXX====

از کف دشمن گرفتم جام را   می شناسم گردش ایام را

===XXX===

سر بخشش اگر ای داور محشر داری   موجم موجم از گبر و مسلمان دریاب
وصل است اگر شمع کنم چهره می فروز   از مایهٔ خود نیز حذری کنم امشب

===XXX====

فزون ز زلف کشد خط سبز تو دل را   بدیده بهش خلد سبزهٔ که نوخیز است

===XXX====

دشمن فغان نکرده و اهم اثر نداشت   این نیلگون لباس فلک داد خواه کیست

==XXX====

با کفر و آستان کلیسا ترا چه کار   مومن بدین بهانه نشستن برای کیست

===XXX====

کار همت نه باندازهٔ طاقت باشد   مرغ بسمل شده راهم سر پر وازی هست
دم جان بردن تو هرچه که وارد وادیم   از ادب گرچه نگوئیم که اعجازی هست

===XXX====

دی شب که گوش در پس دیوار داشتم   گفتی حکایتی و شنیدم درین چه بحث

==XXX===

خواهم شب وصال تو خندیدن آن قدر   کاندر زمانه خنده نماند بر ای صبح

===XXX===

فریب لطف نهادی نخورده کس چون من   ز بزم راندو نشستم بر آستان گستاخ

==XXX===

مومن آهنگ حرم کرو زبیداد بتان   بس بجان آمده شاید دو سه منزل برود

===XXX====

باناتوانئی که کف از دست رفته بود   چاکی ~~کشتم~~ زدم بجیب که از کس رفو نشد

===XXX====

کو دست که یکبار گلو زدم بر دل دشمن   آن دشنه که صد بار زدم بر جگر خود
پامال ندامت شدم از طعنهٔ بلبل   دیگر نزنی گل بسر خود بسر خود

واعظ این کوچه صنم را نگذارد مومن　　یا خلدم به بروها بجهان حور بهار

===xxx====

جانم بلب رسیده و چشمم براه تست　　دارم ز عمر رفته امید وفا هنوز

==xxx====

آه از تیغ رشک و تیزی او　　آرزوی بریدنم که مپرس

===xxx====

تو خوش که دل بری زمن من خوش که از روز ازل
جان دشمنی در خانه ده بود از خانه بیرون کردمش

===xxxx====

یا فلک آدم کش نداند غیر را　　یا حدیث مردم آزاری غلط

===xxx====

از خدا خواری دشمن خواهم　　داغ از حسرت شداد چه حظ

==xxx====

اگر به پیش تو نالم زجور معذورم　　نگنجسم بدل آشتی شمار دوغ

===xxx====

مشتری کو مایه بیداد کو　　سر فروشم بر سر بازار عشق

===xxx====

صبر کوتاه داده اند مرا　　گو شب غم بود دراز چه باک

===xxxx====

بپای آن صنم آخرچه کرده ام مومن　　که پیش کعبه از از طوف و از نماز خجل

===xxx====

کشته مردم و مشکلش آسان کردم　　رحم بر بازوی جانان کردم

===xxx====

عصمتم طعنه بتقدیس ملائک میزد　　بتمنای قبولت همه تقصیر شدم

==xxx====

فرد احذر زنالهٔ
[illegible] محشر گداز کن　　امروز فکر کارمن ای کار ساز کن
گر پای نازنین تو رنجد میا میا　　از دور بر جنازهٔ مومن نماز کن

===xxx====

جذبه شوق الفتم یار مرا بتربتم　　میکشد و منفعلتم جان ز پی نثار کو

===xx===

جوش رحمت کا برہا تنگ کرد توبہ بر لب رفت باران آمدہ

===xxx====

ای چشم چہ دیدی از نگاہش بی وعدہ در انتظار چونی

===xxx====

اشعار ریختہ

مغشوش دل خلق ہے پرہیز کی خوبی کتنا ہی کرے ظلم وہ بدنام نہ ہوگا
خوشی ہجراں میں تڑپنے کی شب وصل گر چین ہو دل کو مجھے آرام نہ ہوگا

===xxx====

عشق کہیں درپے جان شوق ہے کہیں سینہ شگاف
دشمنی دل شکنی شیوہ احباب نہیں
گلہ چرخ عبث شکوہ جاناں بے جا یاس و حرماں کو میرے حاجت اسباب نہیں

===xxx====

گذرے ہیں مری خاک سے غیروں کے ساتھ وہ فتنہ اٹھا ہے گرد پس کارواں نہیں
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق واصح ہی کو لے آؤ کہ افسانہ خواں نہیں
اس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

====xxx====

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں بے چارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
کھولا جو دفتر گلہ اپنا زباں کیا گذری شب وصال ستم کے حساب میں
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دم و داع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں
ای آہ آسماں میں عبث رخنہ گر نہ ہو ڈرتا ہوں میں نزول بلا بیشتر نہ ہو

===xxxx====

لیوں یہ جان ہے ایسی بھی کیا ہے بیدردی نہ قرض دیتے ہو بوسہ نہ مستعار مجھے

===xxx====

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

==xxx===

کہا اوس بت سے مرتا ہوں تو مومن کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی " (۱)

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثار الصنادید"، محولہ بالا، باب چہارم، ص ۲۰۰-۱۹۲

تعلیقات :

مومن خاں نام ، مومن تخلص اور طبابت پیشہ تھا۔ اس لیے حکیم مومن خاں کہلاتے تھے - عرش گیاوی نے انھیں تذکرۃ الشعرا نواب صدیق حسن خان کے حوالے سے اور مصحفیؔ کے نواسے سید ناصر حبیب کی تصدیق سے انھیں نسلاً سادات علوی لکھا ہے -(۱) جب کہ مومن کے دوسرے نواسے عبدالحی انصاری کا بیان ہے کہ مومن پٹھان تھے، عبادت بریلوی نے انھیں پٹھان تسلیم کیا ہے -(۲) مومن کے دوسرے نامور محقق فائق رام پوری نے دو ٹوک بات نہیں کہی(۳) میرا خیال ہے کہ وہ سادات سے تھے اور خان صاحب سے مخاطب تھے - یہی عرش کی رائے ہے - (۴)

مومن کا خاندان فن طبابت میں اس عہدکا نامور خاندان تھا - ان کے دادا، دادا کے بھائی، باپ ، چچا سب طبیب تھے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی اور دادا کا نام حکیم نام دار خان تھا۔ ان کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ (۵) حکیم نامدار خان اپنے بھائی حکیم کامدار خان کے ساتھ شاہ عالم ثانی کے عہد میں تقریباً ۱۱۷۵ھ/ ۱۷۶۱ء میں دہلی آئے (۶) اور شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے - ان کا قیام کوچہ چیلاں میں حکیم آغا جان کے کے چھتے کے سامنے تھا۔ (۷) شاہ عالم نے انھیں موضع بلدیہ اور چند دیگر مواضع پرگنہ

---

(۱) عرش گیاوی، ضمیرالدین: "حیات مومن"، محولہ بالا ، ص ۳۵

فائق رام پوری، کلب علی خان، "مومن" ، محولہ بالا، ص ۱۲

(۲) عبادت بریلوی، ڈاکٹر : "مومن اور مطالعہ مومن"، (مقالہ) : "اردو دنیا" کراچی: ۱۹۶۱ء، ص ۱۵

(۳) فائق رام پوری، کلب علی خان: "مومن"، محولہ بالا، ص ۳

(۴) عرش گیاوی، ضمیرالدین: "حیات مومن"، محولہ بالا، ص ۳۵

(۵) آزاد ، محمد حسین: "آب حیات"، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۳ء، ص ۳۱۲

(۶) فائق رام پوری، کلب علی خان، "مومن"، محولہ بالا، ص ۱۲

(۷) ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر ، "مومن — فن اور شخصیت"، دہلی :دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء، ص ۸۳

نارنول میں جاگیر میں دے تھے - ۱۸۰۳ع میں جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خان کو دی تو [redacted] پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے ان کی جاگیر ضبط کرکے ایک ہزار روپے سالانہ پنشن مقرر کردی - حکیم نامدار خان کے بعد ان کی اولاد کو یہ پنشن ملتی رہی اور حکیم غلام نبی خان کے بعد مومن کو اس میں سے حصہ ملتا رہا -(۱)

مومن خان ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ع میں کوچہ چیلان دہلی میں پیدا ہوئے - شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ چوں کہ قریب تھا اور مومن کے والد کو چوں کہ ان سے عقیدت بھی تھی اس لیے شاہ صاحب نے آکر ان کے کان میں اذان دی اور مومن خان نام رکھا۔ اگرچہ گھروالوں نے نام بدلوانے کی کوشش کی اور حبیب اللہ نام تجویز کیا لیکن مومن خان کے نام ہی سے شہرت پائی -

ابتدائی تعلیم کے بعد شاہ عبدالقادر صاحب سے عربی کی ابتدائی شروع کی -(۲) عرش گیاوی کے بیان کے مطابق انھوں نے شاہ عبدالعزیز سے بھی پڑھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :

" تعلیم بھی ان کی اسی مدرسے میں ہوئی - کچھ کتابیں تبرکاً شاہ عبدالعزیز سے اور بقیہ علامہ شاہ عبدالقادر سے پڑھیں اور بعض سے عربی، فارسی، حدیث ، فقہ ، منطق ، معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی -" (۳)

غالباً اسی بیان کی بنیاد پر عبادت بریلوی نے لکھا کہ مومن نے شاہ عبدالقادر

---

(۱) آزاد ، محمد حسین ، " آب حیات" ، محولہ بالا ، ص ۴۱۲
بشیرالدین احمد ، " واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۴۲۳
عرش گیاوی ، ضمیرالدین ، " حیات مومن"، محولہ بالا ، ص ۲۵
فائق رام پوری، کلب علی خان ، " مومن"، محولہ بالا ، صص ۹-۸

(۲) آزاد ، محمد حسین ، " آب حیات" ، محولہ بالا ، ص ۴۱۲
بشیرالدین احمد ، " واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۴۲۵

(۳) عرش گیاوی ، ضمیرالدین ، " حیات مومن"، محولہ بالا ، ص ۲۷

جیسے استادوں سے درسیات کی تکمیل کی -(۱) اسی مدرسے سے اشارہ مدرسہ رحیمیہ کی طرف درست معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ کلب علی خان فائق رام پوری نے قیاس کیا ہے -(۲) بلکہ صاف اشارہ شاہ عبدالقادر صاحب کے مرکز تعلیمی " مسجد اکبرآبادی کے مدرسہ " کی طرف ہے - جہاں شاہ عبدالقادر پڑھاتے تھے اور جہاں سید احمد بریلوی شہید اور دوسرے بہت سے بزرگوں نے شاہ صاحب کے سامنے زانوے ادب تہ کیا تھا- مومن کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآن مجید بھی حفظ کرنا شروع کیا تھا لیکن تکمیل نہ ہوسکی-(۳) ان کے فارسی کے استاد کی حیثیت سے - عبداللہ خان علوی کا نام آیا ہے -(۴)

عربی فارسی کی تحصیل کے بعد انھیں طب پڑھنے بٹھایا گیا - فن طب کی تحصیل انھوں نے اپنے والد اور اپنے دونوں چچوں حکیم غلام حیدر خان اور حکیم غلام حسن خان کی خدمت میں کی اور انھیں کے مطب میں نسخہ نویسی سیکھی -(۵) ان کے حالات میں علم نجوم و رمل سے کامل درجے کی آگاہی کا پتا بھی چلتا ہے - محمد حسین آزاد نے لکھا ہے " کہ شاعری کے علاوہ انھوں نے نجوم کو اہل کمال سے حاصل کیا-"(۶) لیکن یہ اہل کمال کون تھے آزاد اور دوسرے تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں- شاعری میں شاہ نصیر کے سامنے انھوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا- آزاد لکھتے ہیں :

" انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا- مگر چند روز

---

(۱) عبادت بریلوی، ڈاکٹر، (مرتب) " کلیات مومن"، " کتابی دنیا"، کراچی: ۱۹۵۵ع ، مقدمہ ، ص ۱۰

(۲) فائق رام پوری، کلب علی خان، " مومن" محولہ بالا ، ص ۱۹

(۳) ایضاً ، ص ۲۰

(۴) سرخوش، شیر علی خان، " اعجاز سخن"، لاہور : ستم ظریف بک ڈپو، س ن، ج ۱ ، ص ۲۹۶

(۵) آزاد ، محمد حسین، " آب حیات"، محولہ بالا ، ص ۴۱۳
بشیرالدین احمد ، " واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۳۲۵
عبادت بریلوی، ڈاکٹر (مرتب) ، " کلیات مومن"، محولہ بالا ، مقدمہ ، ص ۱۰
فائق رام پوری، کلب علی خان، " مومن"، محولہ بالا ، ص ۲۱

(۶) آزاد ، محمد حسین، " آبحیات"، محولہ بالا ، ص ۴۱۳

کے بعد ان سے اصلاح لینی چھوڑدی اور پھر کسی کو استاد نہیں بنایا۔" (۱)

مومن کی فارسی میں استعداد، طب میں مہارت اور نجوم و رمل میں ان کی دقت نظر مسلم ہے اور ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے ان کے فضائل علمی، کمالات مذہبی و فنی اور ان کے حیرت انگیز حافظے کا اعتراف کیا ہے - ان کے حافظے کے بارے میں محمد حسین آزاد کا بیان ہے :

" حافظہ کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ (عبدالقادر) صاحب سے سنتے تھے ، فوراً یاد کرلیتے تھے۔ اکثر شاہ عبدالعزیز کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہ اسی طرح ادا کردیتے تھے۔" (۲)

ذہانت میں بجز شاہ اسمٰعیل شہید اور خواجہ محمد نصیر کوئی ان کا مثیل نہ تھا۔ (۳)

" ارواح ثلاثہ " میں مومن کی طباعی اور ذہانت کے بارے میں روایت ہے کہ مولوی سراج احمد خورجوی فرماتے تھے کہ مومن اور مولوی فضل حق صاحب شطرنج کھیلا کرتے تھے اور مومن ہمیشہ کھیل میں غالب رہتے تھے - ایک مرتبہ مرزا غالب نے مولوی فضل حق سے دریافت کیا کہ آپ کس قدر تیز طبع اور ذہین ہیں پھر بھی کیا بات ہے کہ مومن سے مات کھا جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا " کہ لڈ مومن خان بھونپا ہے - اسے اپنی قوت کی خبر نہیں - وہ عشق و عاشقی کے قصوں میں پھنس گیا۔ اگر علمی مشغلے میں پڑتا تو اس وقت اس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی۔ وہ فی الحقیقت نہایت ذہین آدمی ہے -" (۴)

---

(۱) آزاد ، محمد حسین ، " آب حیات"، محولہ بالا ، ص ۴۱۳

(۲) ایضاً ، ص ۴۱۳

(۳) عرش گیاوی ، ضمیرالدین ، " حیات مومن"، محولہ بالا ، ص ۳۸

(۴) اشرف علی تھانوی ، مولانا (مرتبہ) " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۴۴۷

صاحب " واقعات دارالحکومت دھلی"نے نواب مصطفی خان کا قول نقل کیا ھے کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا۔ ان کے ذھن میں بجلی کی سی سرعت تھی۔ (۱)

ان کی فارسی دانی کا اعتراف شیفتہ و آزردہ نے کیا ھے ۔ شیفتہ لکھتے ھیں : " کہ اردو و فارسی زبانوں کے اختلاف کے باوجود دونوں زبانوں میں ان کو ایسی دست گاہ حاصل ھے کہ اھل فارس معترف ھیں اور اھل ھند اسی اعتبار سے مفتخر ھیں۔" (۲)

۱۸۴۰ع میں جب دھلی کالج میں فارسی کے ایک قابل و مستند استاد کے تقرر کی تجویز ھوئی تو مفتی صدرالدین خان صدرالصدور نے کہا تھا کہ ھمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ھیں۔ ایک مرزا نوشہ (غالب) دوسرے حکیم مومن خان تیسرے امام بخش صہبائی ۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ھے :" کہ لفٹیننٹ گورنر مسٹر ٹامسن نے تینوں کو بلوایا لیکن غالب نے انکار کردیا ، مومن نے سو روپے ماھانہ کی شرط رکھی، صہبائی نے چالیس روپے قبول کرلیے ۔" (۳)

طب میں ان کی مہارت کے باب میں بھی تمام تذکرہ نگار متفق اللسان ھیں۔(۴) لیکن سرسید نے انھیں اطبا میں شمار کرنے کی بجائے شعرا کے ضمن میں ان کا تذکرہ کیا ھے۔ اس سے صاف ظاھر ھوتا ھے کہ وہ انھیں شاعر طبیب سے بڑا مانتے تھے۔ نجوم میں بھی ان کی کامل دست گاہ کے سبھی تذکرہ نگار معترف ھیں۔ محمد حسین آزاد ، عرش گیاوی ، عبادت بریلوی، فائق رام پوری ، وغیرہ ھم نے متعدد واقعات نجوم میں ان کی مہارت کے بیان

---

(۱) بشیرالدین احمد ،" واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۳۱۸
(۲) احسان الحق فاروقی، محمد (مترجم و مرتب) ،" گلشن بے خار"، محولہ بالا ، ص ۳۳۶
(۳) عبدالحق ، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی، " مرحوم دھلی کالج"، محولہ بالا ، صص ۲۱-۲۰
(۴) کریم الدین پانی پتی، " گلدستۂ نازنینان"، ص ۱۰۳
کریم الدین پانی پتی، " طبقات شعرائے ھند"، محولہ بالا ، ص ۳۴۳
نساخ ، عبدالغفور خان ، " سخن شعرا"، لکھنو : مطبع نول کشور، ۱۲۹۱ھ ، ص ۳۶۷
کلیم، نورالحسن ، " طور کلیم"، آگرہ : مطبع مفید عام، ۱۲۹۸ھ ، ص ۹۷

کیے ہیں-(۱)

مومن کو شطرنج ، موسیقی ، اور علمیات سے بھی دل چسپی تھی- آزاد کے بقول "شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی ... اور شہر کے ایک دو مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے-" (۲) ان کے ذوق موسیقی کے بارے میں فائق لکھتے ہیں :

" سید ناصر حبیب ناصر کہنہ مومن کی روایت ہے کہ مومن مرحوم کی رنگین مزاجی نے موسیقی کے فن لطیف کی طرف بھی توجہ کی تو وہ نام پیدا کیا کہ لوگ ان کے کمال کے معترف ہوگئے -" (۳)

عرش گیاوی نے مومن کی پوتی سے روایت نقل کی ہے کہ وہ عامل بھی تھے اور گنڈے تعویذ کی بھی ان کے دھوم تھی-(۴)

ان علوم میں مومن کی قابلیت اور مہارت اپنی جگہ لیکن تاریخ میں وہ ایک طبیب، نجومی یا موسیقی یا شطرنج کے ماہر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک شاعر کی حیثیت سے زندہ ہیں- (۵) وہ اردو اور فارسی کے ایک قادرالکلام شاعر تھے ، انھوں نے قصیدے کے سوا ہر صنف سخن میں کہا اور خوب کہا- ان کے کمال شعر گوئی اور مضمون آفرینی و معانی بندی کے خصائص مسلمہ ہیں- ان کے دور میں بڑے بڑے صاحب فن اور با کمال شاعر موجود تھے لیکن ان کا کلام اپنے محاسن کے لحاظ سے الگ پہچانا جاتا ہے - ان کا کلام حسن وعشق کے جذبات سے پر ہے لیکن ان کا عشق حقیقی نہیں مجازی ہے - البتہ اس فرسودہ رسم عاشقی

---

(۱) آزاد ، محمد حسین ، " آب حیات"، محولہ بالا ، صص ۱۲-۲۱۳
[illegible] عرش گیاوی ، ضمیرالدین ،" حیات مومن"، محولہ بالا ، صص ۳۲-۳۹
عبادت بریلوی ، ڈاکٹر" مومن اور مطالعہ مومن"، محولہ بالا ، صص ۲۷-۴۴
فائق رام پوری ، کلب علی خان ،" مومن"، محولہ بالا ، صص ۳۰-۲۵
(۲) آزاد ، محمد حسین ،" آب حیات"، محولہ بالا ، ص ۲۱۳
(۳) فائق رام پوری ، کلب علی خان ،" مومن"، محولہ بالا ، ص ۳۳
(۴) عرش گیاوی ، ضمیرالدین ، " حیات مومن"، محولہ بالا ، ص ۳۲
(۵) مہر ، مولانا غلام رسول ، " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا ، ص ۲۹۲

میں انھوں نے جدت پیدا کی ہے -(۱) ان کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرۂ آفاق ہے -(۲) نصر اللہ خان خویشگی نے ان کی زبان و کلام میں حلاوت ، نکتہ دانی، اور شیریں بیانی کا اعتراف کیا ہے -(۳) شیفتہ نے ان کی جادو بیانی اور ایجاز کلام کا ذکر کیا ہے -(۴) عبدالحی صاحب نے "گل رعنا" میں ان کے اسلوب کی نزاکت و لطافت(۵) اور سرسید نے ان کے کلام میں معنی کی تازگی، بیان کی شگفتگی، زبان کی شیرینی اور کمالات شعری کی جامعیت کا اعتراف کیا ہے -(۶) مومن کے کمال فن اور شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے لیے یہ بات کفالت کرتی ہے کہ غالب ؔ ان کے اس شعر کے بدلے میں —

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اپنا پورا دیوان دینے پر تیار تھے- (۷) غالب نے منشی نبی بخش حقیر کے نام خط میں مومن کے انتقال کی خبر کے ساتھ ان کی شاعری کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے - لکھتے ہیں :

" یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا- طبیعت اس کی معنی آفریں تھی-" (۸)

دوسرے شعرا کے مقابلے میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا یہ پہلو نہایت ممتاز ہے کہ انھوں نے کسی بادشاہ یا امیر، وزیر کی شان میں قصیدہ نہیں لکھا - راجہ رنجیت سنگھ

---

(۱) تنہا ، مولوی محمد یحیی، "مراۃ الشعرا"، لاہور: عالم الیکٹرک پریس، ۱۹۳۵ء ، ج ۱، ص ۳۸۹

(۲) عسکری، مرزا محمد (مترجم) ،" تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۷۶

(۳) اسلم فرخی ، ڈاکٹر محمد (مرتب) ،" گلشن ہمیشہ بہار"، از نصر اللہ خان خویشگی، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۷ء ، ص ۳۰۵

(۴) احسان الحق فاروقی، محمد (مترجم) " گلشن بے خار"، محولہ بالا ، ص ۳۳۵

(۵) عبدالحی، مولانا سید ،" گل رعنا"، محولہ بالا ، ص ۳۰۱

(۶) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید"، محولہ بالا ، ص ۱۰۶

(۷) رئیس احمد جعفری، سید ،" بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، محولہ بالا ، ص ۳۱۰

(۸) آفاق ، آفاق حسین، (مرتب) ،" نادرات غالب"، کراچی: ادارہ نادرات ، ۱۹۳۹ء ، ص ۲۳

ایک مرتبہ ان سے نہایت عزت و تکریم سے پیش آئے تھے اور اس بات کی خوشی میں کہ مومن نے ان کے مکان میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ انھوں نے مومن کو ہتھنی پر سوار کرکے ان کے گھر بھیجا تھا۔ اور ہتھنی بھی انھیں کو عنایت فرمادی تھی ، سو روپے نذرانہ بھی پیش کیا تھا۔ مومن نے شکریے میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ (۱) اس کے سوا نہ تو انھوں نے کسی دنیا دار کا قصیدہ لکھا اور نہ کسی کی ہجو سے اپنی زبان کو آلودہ کیا۔ حمد و نعت اور منقبت میں ان کے قصائد ہیں اور بڑے زور دار ہیں۔(۲) مشاعرے میں ان کے غزل پڑھنے کا انداز بھی تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کرلیا۔ بقول آزاد" ایسی درد ناک آواز سے دل پذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ اللہ اللہ! اب تک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے"۔(۳)

شاہ عبدالعزیز سے مومن کے خاندانی تعلقات تھے ۔ ان کے دونوں چچا اور کئی چچا زاد بھائی اس خاندان سے شرف تلمذ و رشتہ ارادت رکھتے تھے۔ مومن پیدا ہوئے تو شاہ عبدالعزیز نے ان کے کان میں اذان کہی، شاہ صاحب ہی نے ان کا نام رکھا ، شاہ عبدالعزیز اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر سے تحصیل علمی کی اور پھر اسی سلسلے کے ایک بزرگ حضرت سید احمد شہید بریلوی سے بیعت ہوئے اور تمام عقائد و افکار میں انھیں کے معتقد و پیرو تھے ۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :

" نوجوانی ہی میں مولانا سید احمد بریلوی کے مرید ہوئے کہ مولوی اسمعیل صاحب کے پیر تھے، خاں صاحب انھی کے عقائد کے بھی قائل تھے۔" (۴)

---

(۱) آزاد ، محمد حسین ،" آب حیات"، محولہ بالا ، ص ۳۱۵
فائق رام پوری ، کلب علی خاں ،" کلیات مومن"، محولہ بالا ، ج ۲ ، صص ۹۳-۸۳(مقدمہ)
عبدالحی ، مولانا سید ، گل رعنا"، محولہ بالا ، ص ۲۹۹

(۲) ضیا احمد بدایونی(مرتب) ،" دیوان مومن"، الہ آباد : مطبع شانتی، ۱۹۳۷ع ، ص ۲۹

(۳) آزاد ، محمد حسین ، آب حیات"، محولہ بالا ، ص ۳۱۵
عرش گیاوی ، ضمیرالدین ، " حیات مومن"، محولہ بالا ، ص ۶۱

(۴) آزاد ، محمد حسین ، " آب حیات"، احولہ بالا ، ص ۳۱۵

ایک روایت میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی سے ان کا بیعت ہونا بیان کیا گیا ہے -(۱) لیکن اس روایت کے نہ تو ماخذ کا پتا چل سکا اور نہ اس کی تائیدکسی اور روایت سے ہوتی ہے - اس لیے اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

شاہ عبدالعزیز کو وہ فقہ و دین، فضل و ہنر اور علم و عمل کے لیے باعث عزو شان سمجھتے تھے - شاہ صاحب کے نواسے شاہ محمد اسحاق کو وحید عصر اور محمد عمر ابن شاہ اسمٰعیل شہید کو شیخ زماں لکھتے تھے۔ حضرت سید احمد شہید سے آپ کی عقیدت کااندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ سید صاحب کو امام عصر مہدی، امام برحق وغیرہ القابات سے یاد کرتے ہیں - اس کے علاوہ اردو فارسی مثنویات ان کی عقیدت و ارادت کی آئینہ دار ہیں - (۲)

حضرت سید احمد شہید سے بیعت کے بعد ان کی زندگی میں بڑا انقلاب آگیا تھا اور شوق و رنگین مزاجی کی زندگی یکسر پلٹ گئی تھی - مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :

" خواجہ محمد شاہ امرتسری کے پاس حکیم مومن خان کی بہت عمدہ تصویر تھی۔ .... گردن پر زلفیں پڑی ہوئیں، سر پر نوک دار کلاہ، خش خاشی داڑھی، بھرپور چھیلے، کیا زمانہ تھا اور کیا لوگ تھے - غالباً یہ اوائل عمری کی تصویر ہوگی۔ ورنہ سید احمد صاحب بریلوی سے بیعت کرنے کے بعد تو متشرع ہوگئے تھے :

مومن وہ ہیں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم " (۳)

---

(۱) ضیا احمد بدایونی، (مرتب) " دیوان مومن"، محولہ بالا، ص ۳۰

(۲) عبادت بریلوی، ڈاکٹر، (مرتب) " کلیات مومن"، محولہ بالا، ج ۲، صص ۹-۱۰۶ اور ۳۶-۲۳۳
مہر، مولانا غلام رسول، " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا، صص ۳-۱۰۲
فائق رام پوری، کلب علی خان، " مومن"، محولہ بالا، صص ۵۷-۶۱
عرش گیاوی، ضمیرالدین، " حیات مومن" ، محولہ بالا، صص ۶۰-۵۸

(۳) مہر، مولانا غلام رسول، (مرتبہ) " نقش آزاد "، محولہ بالا، ص ۲۶۰

کریم الدین پانی پتی نے لکھا ہے :

" ابتدا میں تمام اوقات شعر گوئی اور لہو و لعب میں صرف کئے کرکے تمام مزے عیاشی کے اٹھاکر اب توبہ کی بلکہ شعر کہنا چھوڑ دیا ہے۔ اب پابندی روزے کی بھی بہ نسبت سابق کے بہت ہے -" (۱)

۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں سید صاحب جہاد کے لیے نکلے تو مومن نے دو قطعے کہے جو ان کی کلیات میں شامل ہیں۔ پہلا قطعہ دو شعروں کا ہے :

جو سید احمد امام زمان و اہل زمان کی ملاحدہ سے دین سے اراد جنگ

تو کہیں وہ صفحہ عالم پہ لکھے سال وغا خروج مہدی کفار سوز کلک تفنگ

۱۲۴۲ھ

دوسرے قطعے میں گیارہ شعر ہیں - اس میں " امام برحق مہدی نشان علی فر ہے" سے تاریخ ۱۲۴۲ھ نکلتی ہے -

وہ شاہ مملکت ایمان کہ جس کا سال خروج

امام برحق مہدی نشان علی فر ہے (۲)

مومن نے ایک مثنوی بہ مضمون جہاد ، بھی لکھی تھی - اس میں انتالیس اشعار ہیں اور نہایت اشتیاق کے ساتھ شہادت کی تمنا کرتے ہیں -(۳) اس کے علاوہ بھی انھوں نے متعدد اشعار میں سید احمد شہید سے اپنی عقیدت اور تمنائے شہادت کا اظہار کیا ہے۔ کلیات میں غزل نمبر ۱۰۱ کا مقطع ہے :

شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے

جلد مومن لے پہنچ اس مہدی دوران تلک (۴)

---

(۱) کریم الدین پانی پتی ، " طبقات شعرائے ہند "، محولہ بالا ، ص ۴۲۴

(۲) عبادت بریلوی ، ڈاکٹر (مرتبہ) " کلیات مومن "، محولہ بالا ، ج ۲ ، صص ۹-۱۰۷

(۳) ایضاً ، ج ۲ ، صص ۳۶-۴۳۳

(۴) ایضاً ، ج ۱ ، ص ۱۲۱

مہر ، مولانا غلام رسول ، " جماعت مجاہدین "، محولہ بالا ، ص ۱۰۴

کلیات کی پہلی غزل کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے ۔ اس کا ایک ایک شعر سید احمد شہید کی تحریک اصلاح جہاد کے جذبات صادقہ کا ترجمان ہے ۔ مقطع کا شعر ہے :

"زمانہ مہدی موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے تو کہیو سلام پاک حضرت کا" (۱)

یہ خانوادہ ولی اللہی کی تعلیمات کد حقہ کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے نام پر خدا اور رسوم کے سخت مخالف تھے۔ اور اہل بدعت و نفاق کے خلاف ان کے قلب سلیم میں یہ جذبات صادقہ پیدا ہوتے تھے :

"مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو
دل صدپارہ اصحاب نفاق و اہل بدعت کا " (۲)

بدعت کے خلاف ان کے جذبات حقہ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس قلب کو اپنے پہلو میں رکھنے کے روا دار نہیں تھے جو کسی بدعتی سے ربط و تعلق کا خواہاں ہو :

" بےدام آرزو کا توئل کو دکال نہیں   مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم" (۳)

اس کے باوجود کہ وہ سید صاحب سے بیعت تھے ، شاہ اسمعیل شہید سے خاص تعلق و ارادت رکھتے تھے۔ تمسک بالکتاب و السنت کو عزیز رکھتے تھے۔ وہ اپنے اشعار میں مقلدین اور اہل تشیع پر اکثر چوٹ کرگئے ہیں لیکن نہ متشدد اور متقشف بھی نہ تھے۔(۴)

مومن نے فارسی میں سید صاحب کی مدح میں دو قصیدے لکھے ۔ پہلے قصیدے میں اسٹھ شعر ہیں اور ؟؟ دوسرے میں ایک سو دس شعر ہیں۔ یہ دونوں قصیدے انھوں نے عرفی

---

(۱) فائق رام پوری ، کلب علی خان(مرتبہ): کلیات مومن"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۴ء ، ج ۱ ، ص ۳

(؟) مہر" مولانا غلام رسول ، " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا ، ص ۱۰۳

(۲) فائق رام پوری، کلب علی خان(مرتبہ): کلیات مومن"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲

(۳) ایضاً ، ج ۱ ، ص ۱۳۳

(۴) فائق رام پوری، کلب علی خان،" مومن"، محولہ بالا ، ص ۳۱

قصیدیوں پر لکھے تھے - چوں کہ ان کا فارسی دیوان نایاب ہے اس لیے ان قصائد کی نقل غلام رسول مہر کو امتیاز علی خاں عرشی نے رام پور سے مہیا فرمائی تھی اور مہر صاحب نے اپنی کتاب میں ان کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں -(۱)

ہم اس بات کے مخالف نہیں کہ تحریک جہاد سے ان کی دل چسپی اور وابستگی کو سیاست سے ان کی دل چسپی کا نام دیا جائے - سیاست سے ان کی دل چسپی صرف تحریک جہاد تک ہی نہ تھی بلکہ قلعے کی اندرونی سیاست سے بھی ان کی دل چسپی کا پتا چلتا ہے - وہ انگریزوں سے شدید نفرت کرتے تھے ، ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے اور انگریزوں کے نقصان پر خوش ہوتے تھے- لیکن ان کی یہ تمام دل چسپی شاعرانہ ہی رہی - (۲)

مومن کی تصنیفات میں کلیات اردو سب سے پہلے ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ع میں شیفتہ نے مرتب کیا تھا جو ۱۸۳۶ع میں مطبع رفاہ عام ، دھلی سے شائع ہوا- اس کا آخری ایڈیشن وہ ہے جو دو جلدوں میں کلب علی خاں فائق رام پوری نے مرتب کیا اور لاهور سے شائع ہوا- دیوان فارسی حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب کرکے مطبع سلطانی دھلی سے چھپوادیا تھا- انشائے مومن کے نام سے مومن کی منثورات کا مجموعہ بھی حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب کرکے مطبع سلطانی دھلی ہی سے ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ع میں چھپوادیا تھا- ان کی غیر مطبوعہ تصانیف میں جان عروض ،(فن عروض میں ایک رسالہ) شرح سدیدی و نفیسی ، خواص بان اور

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول ، " جماعت مجاہدین"، محولہ بالا ، ص ۳-۱۰۲

(۲) فائق رام پوری، کلب علی خاں(مرتب) ، " مومن"، محولہ بالا ، ص ۹۱-۸۷

کچھ ان کا غیر مطبوعہ کلام اور خطوط تھے ۔ ان میں سے بعض چیزوں کا اب صرف نام ہی باقی رہ گیا ہے ۔ (۱)

مومن کے تلامذہ پر عرش گیاوی اور فائق رام پوری نے اپنی تصانیف میں خاص ابواب کے تحت اپنی معلومات کو جمع کردیا ہے ۔ عرش نے مومن کے بائیس تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔(۲) لیکن اس سے زیادہ جامع فہرست اور زیادہ معلومات فائق رام پوری نے اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ انھوں نے مومن کے انتالیس تلامذہ کا ذکر کیا ہے (۳) ۔ ان میں سے شیفتہ و اکبر ان کے دو تلامذہ اس تذکرے کی شخصیات میں شامل ہیں۔ (۳) فائق نے مومن کے ایک شاگرد سکھا نند رقم کا ترجمہ تلامذہ کے باب میں نہیں کیا ، حالاں کہ وہ اسی کتاب میں نجوم و رمل کے سلسلے میں ان کا ذکر کرچکے ہیں۔ (۴) اسی طرح اس فہرست میں ناصر نذیر فراق کا نام بھی نہیں ہے جو مومن کے عزیز بھی تھے اور شاگرد بھی۔ (۵)

مومن پر آخری محققانہ تصنیف ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی ہے انھوں نے مومن کے تلامذہ کی تعداد کو چوالیس تک پہنچادیا ہے ۔(۶) البتہ ناصر نذیر فراق اور سکھانند رقم کا تذکرہ انھوں نے بھی نہیں کیا ہے ۔ اس طرح مومن کے شاگردوں کی واقعی تعداد چھیالیس ہوجاتی ہے ۔

مومن نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا تعلق سردھنہ کے ایک مغل خاندان سے تھا۔

---

(۱) فائق رام پوری ، کلبعلی خان ؛" مومن"، محولہ بالا ، صص ۳۲-۱۰۹
عرش گیاوی ، ضمیرالدین ؛" حیات مومن"، محولہ بالا ، صص ۲۶-۲۲

(۲) ایضاً ، صص ۸۰-۶۷

(۳) فائق رام پوری ، کلب علی خان ، " مومن"، محولہ بالا ، صص ۹۱-۱۲۵

(۴) ایضاً ، ص ۲۶
رئیس احمد جعفری ، سید ؛" بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، محولہ بالا ، ص ۳۱۵

(۵) عرش گیاوی ، ضمیرالدین ؛" حیات مومن"، محولہ بالا ، ص ۸۱
فائق رام پوری ، کلب علی خان ، " مومن"، محولہ بالا ، ص ۱۰۶

(۶) ظہیراحمد صدیقی ، ڈاکٹر ، " مومن — فن اور شخصیت"، محولہ بالا ، صص ۲۲۲-۵۲۷

لیکن ان سے ان کی طبیعت کو وابستگی نہ ہوسکی اس لیے دونوں میں ناچاقی ہوگئی اور کچھ عرصے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان سے ایک سے زیادہ لڑکیاں تھیں جن کو سلام، دعائیں اور خوشیوں کا اظہار مومن نے اپنے صاحب زادے احمد نصیر کے نام خطوط میں کیا ہے - مومن کی دوسری شادی خواجہ محمد نصیر کی صاحب زادی تھیں ان سے مومن کی کئی اولادیں تھیں۔ احمد نصیر خاں مومن کے بڑے صاحب زادے تھے۔ اور چھوٹے بیٹے کا نام عبدالوہاب تھا۔ صاحب زادیوں میں محمدی بیگم تھیں۔ ان کے علاوہ ایک بیٹی فاطمہ سلطان بیگم تھیں جو دو تین سال کی عمر میں انتقال کرگئیں - ان کے دو لڑکوں کا بھی پتا چلتا ہے جو پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد ہی انتقال کرگئے تھے۔ فائق رام پوری نے ان کے حیات و معلوم الاسم اور نامعلوم الاسم تین اولاد ذکور اور تین اولاد اناث کا پتا چلایا ہے۔ لیکن احمد نصیرخاں اور محمدی بیگم زندہ رہیں۔ ان کی شادیاں ہوئیں اور ان سے نسل بھی چلی جو ہندوستان اور پاکستان میں اب تک موجود ہے - (۱)

مومن کی عمر تقریباً اکیاون (۵۱) برس کی تھی کہ ایک روز مکان کی چھت پر کھڑے مزدوروں سے مرمت کروا رہے تھے کہ بے خیالی میں پاؤں پھسلا اور چھت سے گرگئے - اگرچہ چھت نیچی تھی پھر بھی دست و بازو ٹوٹ گئے - خود پیشین گوئی کہ پانچ ماہ زندہ رہوں گا - تاریخ وفات بھی کہہ دی " دست و بازو بشکست " پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور ٹھیک پانچ ماہ کے بعد ۲۳ رجب ، ۱۲۶۸ھ بروز جمعہ ۱۳/مئی، ۱۸۵۲ء کو انتقال ہوا۔

جامع مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور آپ کی وصیت کے مطابق مہندیوں کے مشہور قبرستان میں مولانا شاہ عبدالعزیز کے مقبرے کی شرقی دیوار کے باہر دفن کیے گئے - (۲) وفات

---

(۱) فائق رام پوری، کلب علی خاں، " مومن "، محولہ بالا ، صص. ۱۰۸-۹۱
ضیا احمد بدایونی (مرتبہ) " دیوان مومن "، محولہ بالا ، ص. ۲۷

(۲) عرش گیاوی، ضمیرالدین، " حیاتِ مومن "، محولہ بالا ، ص. ۸۱
فائق رام پوری، کلب علی خاں " مومن "، محولہ بالا ، صص. ۸-۱۰۵

کے بعد تقریباً ایک صدی تک ان کی قبر کچی رہی بالاخر مولانا شہاب احمد بدایونی کی تحریک پر ۱۲۶۳ھ/۱۹۴۳ء میں قبر کو پختہ کرکے کتبہ لگوادیا گیا ہے - (۱)

====xxx====

حکیم نصر اللہ خاں :

" علوم متداولہ مثل منطق اور معانی و فلسفہ و ہیئت وھندسہ کے حضرات ثلاثہ یعنی مولوی عبدالعزیز اور مولوی رفیع الدین اور عبدالقادر صاحب قدس سرہم العزیز کی خدمت سراسر برکت سے حاصل کیے اور علم طب کو احکم الحکما حکیم شریف خاں مرحوم و مغفور سے تحصیل کیا۔ کتاب دانی و حدس صائب اور مرض شناسی میں بے مثل و مانند ہیں۔ رسائل متعددہ بحران اور دریافت مزاج نسخہ مرکب وغیرہ میں تصنیف کیے ہیں، ان رسائل سے ان کے تبحر کا حال معلوم ہوتا ہے - اوایل حال میں نواب فیض محمد خاں رئیس جھجھر کی سرکار میں عہدۂ طبابت پر مامور تھے، بعد اس کے اور عمدہ ہائے روزگار کی سرکار میں منسلک رہے - اب پھر بہ نظر قدامت کے نواب عبدالرحمن خان رئیس جھجھر کی خدمت میں جو نواب مغفور کا دہیرہ اور جھجھر کا مسند نشین ہے ، اسی عہدے سے سرفراز ہیں۔" (۲)

تعلیقات :

حکیم نصر اللہ خاں دہلوی، ثنا اللہ حنفی دہلوی کے بیٹے تھے۔ والد کے نام کے اضافے کے ساتھ مولانا عبدالحی نے ان کے بارے میں معلومات میں یہ اضافہ کیا ہے کہ دہلی میں پیدا ہوئے اور بڑھے پلے۔ اور شاعر بھی تھے ، وصال تخلص تھا۔ نیز ۱۲۷۱ھ/۵۵-۱۸۵۴ء

---

(۱) ظہیراحمد صدیقی، ڈاکٹر" مومن — فن اور شخصیت "، محولہ بالا ، ص ۱۶۱

(۲) سرسید احمد خاں ، " آثارالصنادید "، محولہ بالا ، باب چہارم، صص ۶۶-۶۵

میں زندہ تھے۔ (۱) بشیرالدین نے آثار کے بیان کا خلاصہ کردیا ہے اور افعال و ضمائر بدل دی ہیں اس لیے کہ اس وقت ان کا انتقال ہوچکا تھا۔ (۲)

===xxx===

حکیم محمد یوسف خان :

"فرزند ارجمند حکیم غلام حسین خان کے کتب درسیہ سے فارغ اور فن طب میں مہارت تمام رکھتے ہیں - باوجود اس کمالات کے اخلاق پسندیدہ میں یگانۂ روزگار ہیں۔" (۳)

تعلیقات :

حکیم محمد یوسف خان، مولانا سید عبدالحی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی اور یہیں ماہر اساتذہ سے پڑھا - طب انھوں نے اپنے والد حکیم غلام حسن خان اور چچا حکیم غلام حیدر خان سے پڑھی -- پھر اپنا مطب قائم کیا۔ طلبہ کو پڑھاتے بھی تھے۔ (۴) سرسید نے یا مولانا عبدالحی نے ان کے اساتذہ کی تفصیل نہیں دی ان کے چھوٹے بھائی حکیم عبدالحکیم خان عرف ابوخان نے اخون شیر محمد قندھاری سے تحصیل کی تھی اس لیے ان حضرت نے بھی خانوادہ ولی اللہی کے ماہر اساتذہ سے پڑھا ہوگا - بشیرالدین نے ان کا نام ان کے والد اور بھائی کے ساتھ لکھا ہے اور تینوں کے بارے میں ایک جملہ لکھا ہے :" سب بڑے بڑے حکیم گزرے ہیں۔" (۵) فن طب میں ان کی مہارت اور ان کے اخلاق پسندیدہ کا اعتراف تو سرسید نے بھی کیا ہے -(۶)

***

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید،" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۹۹
(۲) بشیرالدین احمد، " واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۰۶
(۳) سرسید احمد خان، "آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چہارم، ص ۲۸
(۴) عبدالحی، مولانا سید،" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۵۳۶
(۵) بشیرالدین احمد،" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۰۷
(۶) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید"، محولہ بالا، ص ۳۹

باب ـ چهارم

تلامذهٔ مولانا شاه محمد اسحاق محدث دهلوی

علمائے

باب چہارم خانوادہ ولی اللہی کے گارہ طلبئے دین کے تراجم پر مشتمل ہے ۔ یہ تمام اصحاب علم شاہ محمد اسحاق دہلوی کے شاگرد ہیں اور اس طرح صرف دو واسطوں سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں ۔ اور اصحاب ولی اللہی کے طبقہ چہارم میں ان کا شمار کیا جانا چاہئے ۔ شاہ ساحق کا خانوادہ ولی اللہی اور تحریک ولی اللہی میں چونکہ ایک خاص مقام تھا اس لیے ان کے تلامذہ کو بھی ایک مستقل باب میں جگہ دینا مناسب معلوم ہوا۔

باب - چہارم

تلامذہ مولانا شاہ محمد اسحاق محدث دھلوی

جناب مولوی احمد علی مرحوم :

مولانا احمد علی محدث سہارن پور جو شاہ محمد اسحاق صاحب سے نسبت تلمذ کی بناء پر باب چہارم میں شمولیت کے مستحق تھے ان کا ترجمہ باب سوم ، مقالہ ھذا میں شامل ہوگیا ھے - دیکھئے صفحہ ۹۷-۳۸۹

===xx====

مولوی محمد رستم علی خان سلمہہ اللہہ تعالی :

" تحصیل سے فارغ اور کتب ھیئت و ھندسہ کا راقم کے نانا صاحب مرحوم نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خان بہادر مصلح جنگ سے اچھی طرح پڑھا اور حدیث و فقہ جناب مولوی اسحاق علیہ الرحمتہ سے اور طب میں مہارت معقول رکھتے ھیں اور مریض ان کے علاج سے شفا پاتے ھیں اور کتب فارسیہ کو بھی بہت تحقیق کے ساتھ پڑھاتے ھیں -غرض کہ عالم مستعد اور فاضل اجل ھیں- بالفعل خدمت وقائع نگاری پر حضرت بادشاہ جم جاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کی سرکار میں مامور ھیں اور خطاب مصلح الدولہ حکیم محمد رستم علی خان بہادر سے ممتاز ھیں- راقم سے بھی رابطہ محبت بکمال رکھتے ھیں - انشائے نظم و نثر کی طرف کم متوجہ ھوتے ھیں ، مگر اخبار سلطانی ھر ھفتے ان کی نثر طبع زاد کا نمونہ ھے - " (۱)

تعلیقات :

مولوی رستم علی خان کے باب میں " آثارالصنادید " واحد مستقل ماخذ ھے - مولانا

---

(۱) سرسید احمد خان ، " آثارالصنادید " ، دھلی : مطبع سیدالاخبار ، ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ع اشاعت اول ، چوتھا باب ، صفحہ ۳۲-۱۳۱

سید عبدالحی نے ان کا مستقل ترجمہ لکھا ہے لیکن انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ "کمافی آثار الصنادید"، (۱) ان کے حالات و متعلقات میں ایک حرف کا بھی اضافہ نہیں۔ بعض دیگر کتب میں ان کا ذکر ضمناً آیا ہے ۔ مثلاً "سیرت فریدیہ" میں سرسید نے اپنے دادا خواجہ فریدالدین سے ریاضی میں استفادہ کرنے والے چند نامور تلامذہ میں ان کا نام بھی لیا ہے ۔(۲) سرسید کے اس بیان کی روشنی میں حالی نے "حیات جاوید" میں یہ سطریں لکھی ہیں :

"بہت سے لوگوں نے ان سے (خواجہ فریدالدین احمد سے) ریاضی کی تحصیل کی اور اس میں کمال بہم پہنچایا اور نامور ہوئے ۔ ازاں جملہ مولوی کرامت علی، مولوی رجب علی خاں، خواجہ محمد ناصر جان اور حکیم رستم علی خاں ان کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔" (۳)

"حیاۃ بعد المماۃ" ، "سوانح قاسمی" اور "انوار قاسمی" میں شاہ محمد اسحاق کے تلامذہ میں ان کا نام آیا ہے ۔ (۴) اور "واقعات دارالحکومت دہلی" میں اس عہد کے بعض دوسرے علما کے ساتھ ان کا صرف نام آیا ہے ۔(۵) سرسید نے ان کی

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید: "نزہتہ الخواطر"، کراچی: ~~کارخانہ تجارت کتب~~ ، ۱۹۵۹ع ، ج ۷، ص ۱۷۵

(۲) محمود احمد برکاتی، حکیم(مرتب) ، "سیرت فریدیہ" از سرسید احمدخاں، کراچی: پاک اکیڈمی، ۱۹۶۳ع ، ص ۱۲۱

(۳) حالی، خواجہ الطاف حسین: "حیات جاوید"، کان پور: نامی پریس ، ۱۹۰۱ع، ج ۱ ، ص ۲۱

(۳) فضل حسین بہاری، "الحیاۃ بعد المماۃ"، کراچی: حافظ محمد شہید اینڈ برادرس ۱۹۵۹ع ، ص ۵۰

(۴) مناظر احسن گیلانی، مولانا: "سوانح قاسمی"، دیوبند: دارالعلوم، ۱۳۷۳ھ، ج ۱، ص ۲۲
انوارالحسن شیرکوٹی، "انوار قاسمی(سوانح عمری مولانا قاسم نانوتوی) "، لاہور: ادارہ سعدیہ مجددیہ ، ۱۹۶۹ع ، حصہ اول، ص ۷۹

(۵) بشیرالدین احمد دہلوی، مولوی: واقعات دارالحکومت دہلی"، ج ۲، ص ۳۱۲

وقائع نگاری کی طرف اشارہ کیا ہے -(۱) پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے ایک مضمون سے بھی ان کی وقائع نگاری پر روشنی پڑتی ہے -(۲) وقائع نگار کا نام " مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خان" درج ہے - مصلح الدولہ ان کا خطاب ہے جیسا کہ سرسید نے بھی لکھا ہے -(۳) اور ابوالقاسم ان کی کنیت ہے - " سید ابوالقاسم خان" کا جملہ سرسید کی معلومات پر اضافہ ہے - اس جملے سے ان کی سادات نسبی ، متاہلانہ زندگی اور صاحب اولاد ہونا ثابت ہوتا ہے -

" اخبار سلطانی" سے مراد " سراج الاخبار" ہے جو ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ دہلی کا روز نامچہ تھا- ۱۸۴۱ء میں جاری ہوا اور ہر ہفتے مطبع سلطانی سے شائع ہوتا تھا- (۴)

===xxx====

ملا سرفراز سلمہ :

" یہ بھی بڑے مستعد شخص ہیں کتب معقول و منقول و حکمت و ہندسہ و ہیئت بہت تحقیق سے پڑھاتے ہیں- حدیث و تفسیر جناب مولانا مولوی صدرالدین خان بہادر سے پڑھی ہے اور اب جناب ممدوح کی طرف سے مدرسۂ دارالبقا میں مدرس ہیں-"(۵)

تعلیقات :

مولوی سرفراز کے بارے میں " آثارالصنادید" واحد مستقل ماخذ ہے -(۶)

---

(۱) سرسید احمدخان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۳۲-۱۳۱

(۲) کیفی دہلوی، پنڈت برج موہن دتاتریہ ، " اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار"، (مقالہ) " اردو"، اورنگ آباد (دکن) : انجمن ترقی اردو ہند، اپریل، ۱۹۳۵ء ، ج ، ش ، ص ۲۰۱

(۳) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۳۲-۱۳۱

(۴) کیفی دہلوی، پنڈت برج موہن دتاتریہ ، محولہ بالا ، ص ۱۹۸ و ۲۰۱
اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں، " تذکرہ اہل دہلی"، کراچی : انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۵ء ، ص ۱۵۱

(۵) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، ۱۳۲

(۶) ایضاً ، ص ۴۷

" واقعات دارالحکومت دہلی" میں صرف ان کا نام آیا ہے - (۱) مولانا مناظر احسن گیلانی نے انہیں شاہ محمد اسحٰق کا شاگرد ، " مدرسہ دارالبقا" کا قابل ذکر "عالم دین" اور " ماہر ریاضیات " لکھا ہے -(۲) یہی بیان انوارالحسن شیر کوٹی نے اپنی کتاب میں نقل کردیا ہے -(۳)

====xxx====

جناب حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب سلمہ اللہ تعالی :

" آپ بھی جناب شاہ ابوسعید صاحب کے فرزند ارجمند ہیں اور حقیقت میں فخر خاندان ہیں آپ کا طور ہی جدا ہے اور رنگ ڈھنگ ہی نرالا ہے - آپ بھی حافظ کلام اللہ ہیں اور عالم احادیث رسول اللہ - ولادت آپ کی پچیسویں شعبان ۱۲۳۴ھ میں ہفتے کے دن عشا کے وقت ہوئی ہے خورد سالی ہی میں جناب حضرت شاہ غلام علی صاحب آپ کو توجہ دیا کرتے تھے- جب بڑے ہوئے اپنے والد ماجد سے بیعت کی اور طرح طرح کا فیض حاصل کیا بعد ان کے انتقال کے جناب مرزا شاہ غفور بیگ صاحب سے کہ بڑے خلفائے حضرت شاہ غلام علی صاحب سے تھے اور قوۂ نسبت بدرجۂ کمال رکھتے تھے ہزار در ہزار فیض حاصل کیے- اوقات آپ کی ایسی خوب ہے کہ اگلے زمانے کے اچھا اچھے دین دار لوگوں کی بھی شاید ایسی ہوتی ہوگی - مسجد میں بیٹھے رہنا اور طریقہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو برتنا دن رات آپ کا کام ہے - خوشا حال اس شخص کا کہ جو اپنے دین کے طریقہ کو برتے اور دنیا و مافیہا سے خبر نہ رکھے- اس قدر اتباع سنت اختیار کیا ہے کہ اگر آپ کو آسمان و زمین کے رہنے والے محی السنۃ وقامع البدعۃ کہہ کر پکاریں تو بجا ہے - ان کے

---

(۱) بشیرالدین احمد دہلوی، مولانا"، واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۲۱۶

(۲) مناظر احسن گیلانی، مولانا"، سوانح قاسمی" محولہ بالا، ج ۱، ص ۳۲

(۳) انوارالحسن شیرکوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا، ص ۷۹

نزدیک سوائے انحراف کم تر حکم شریعت کے سخت سے سخت کوئی معصیت نہیں - ارتکاب اس امر خلاف سنت کا جس کو ہم کم بخت لوگ بال سے کم جانتے ہیں ان کے نزدیک امر محال ہے - اس تقوی اور ورع کو خیال کرو کہ صرف اس خیال سے کہ ہندوستان میں جو طریق بیع و شرا بعض بعض فواکہہ وغیرہ کا جاری ہے وہ از روئے شرع شریف کے درست نہیں - ان چیزوں کے مزیتے سے واقف نہیں جب کوئی ایسا کہے تو معلوم ہو میری زبان نہیں جو میں آپ کی ادنا سے ادنا صفت کی تعریف کرسکوں - صرف اتباع سنت کے لیے ہزار ہا نکتے دکھائے دین پرلات ماری ہے اور گوشہ نشینی اختیار کی ہے - ملاقات اور مکالمات میں ہرگز پوری سنت کی نہیں چھوڑتے اور ادنا سنت کے ترک سے کسی چیز کو برا نہیں جانتے- فنا فی السنت اور محو فی الشریعت اور شہسوار میدان طریقت - اگر پوچھو تو فی آپ کی ذات فیض آیات ہے - پس جس شخص کا کوئی ادنا ادنا باتوں میں یہ حال ہو تو پھر خیال کرو کہ بڑی بڑی باتوں میں کیا درجہ احتیاط اور کیا رتبہ اتقا ہوگا - اللہم بارک فی عمرہ و ارفع درجتہ فی الدارین- آمین یارب العلمین- " (۱)

تعلیقات :

مولوی عبدالغنی، مولانا شاہ ابوسعید کے منجھلے بیٹے تھے- سرسید نے ان کی تاریخ پیدائش ۲۵ شعبان، ۱۲۲۳ھ ہفتے کے دن عشا کے وقت لکھی ہے - (۲) بشیرالدین احمد دہلوی نے بھی یہی تاریخ اختیار کی ہے -(۳) البتہ ایک اور مقام پر انھوں نے ۲۵ شعبان، ۱۲۳۵ھ

---

(۱) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، صص ۲۸-۲۶

(۲) ایضاً ، باب چہارم، ص ۱۷

(۳) بشیرالدین احمد دہلوی،" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۳۹۵

لکھی ھے -(۱) رحمان علی نے صرف ۱۲۳۵ھ سن لکھا ھے (۲) اور سید احمد ولی اللّٰھی ، مولوی محمد حسن اور محمد نذیر احمد نے ۲۵ شعبان ، ۱۲۳۵ھ تاریخ ولادت لکھی ھے-(۳) سید احمد ولی اللّٰھی اور محمد نذیر احمد نے یوم ولادت یعنی " ھفتہ" کی بھی صراحت کی ھے ، لیکن چوں کہ ۱۲۳۵ھ میں ۲۵ شعبان کو ھفتہ نہیں پڑتا بلکہ سہ شنبہ پڑتا ھے اس لیے ۱۲۳۵ھ سن غلط ثابت ھوتا ھے - اسی طرح سرسید کا مذکورہ سن ۱۲۲۴ھ میں بھی ۲۵ شعبان ، ھفتے کو نہیں ، پنج شنبہ کو پڑتا ھے - اس لیے سرسید کا بتایا ھوا سال بھی درست معلوم نہیں ھوتا- البتہ ۱۲۳۴ھ میں ۲۵ شعبان کو واقعی ھفتے کا دن پڑتا ھے - مجھے یقین ھے ۱۲۲۴ھ کتابت کی غلطی ھے اور اس سے مطلع ھوکر قاضی احمد میاں نے " تذکرہ اھل دھلی میں ۱۲۲۴ھ کی بجائے ۱۲۳۴ھ کردیا ھے - (۴) اس لیے ھماری رائے میں شاہ عبدالغنی کی صحیح تاریخ پیدائش ۲۵ شعبان ، ۱۲۳۴ھ ، بروز ھفتہ مطابق ۱۹ جون ، ۱۸۱۹ع ھے - مقام ولادت موضع مغل پورہ قریب سوی منڈی بیرون شہر دھلی تھا-(۵)

تعلیم کے مراحل دھلی میں طے ھوئے - اور بعض اساتذہ سے سفر حج کے موقع پر مدینہ منورہ میں استفادہ کیا تھا- پہلے قرآن مجید حفظ کیا ، اس کے بعد منقولات و معقولات کی تعلیم شروع ھوئی - ان کے اساتذہ میں مولوی حبیب اللّٰہ ، شاہ ابوسعید (والد) ، مولانا مخصوص اللّٰہ ، مولانا شاہ محمد اسحاق ، شیخ محمد عابد سندھی اور شیخ ابوزاھد اسمعیل رومی

---

(۱) بشیرالدین احمد دھلوی ،" واقعات دارالحکومت دھلی" ، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۱۵۴

(۲) ایوب قادری ، محمد (مرتبہ) ، " تذکرہ علمائے ھند" از رحمان علی ، کراچی : پاکستان ھسٹاریکل سوسائٹی ، ۱۹۶۱ع ، ص ۳۱۰

(۳) سید احمد ولی اللّٰھی ، ظہیرالدین ،" یادگار دھلی" ، ص ۹۰

محمد حسن نقشبندی ، مولانا ،" مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" ، لاھور : اللّٰہ والے کی دوکان ، س ن ، (اشاعت پنجم) ص ۳۳۵

نذیر احمد ، محمد ،" تذکرہ العابدین" ، علی گڑھ : تجارتی پریس ، ۱۳۱۷ھ/۱۹۶۷ع ، ص ۲۸۰

(۴) اختر جوناگڑھی ، قاضی احمد میاں ،" تذکرہ اھل دھلی" ، محولہ بالا ، ص ۳۵

(۵) محمد حسن نقشبندی ، مولوی ، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" ، محولہ بالا ، ص ۳۳۵

ایوب قادری ، محمد (مترجم و مرتبہ) ،" تذکرہ علمائے ھند" ، محولہ بالا ، ص ۳۱۰

انوارالحسن شیرکوٹی ، " انوار قاسمی" ، محولہ بالا ، ص ۱۰۹

کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں کی روایت کے مطابق انھوں نے اپنے والد سے حدیث کی کتاب موطا (محمد بن حسن شیبانی) اور مولانا مخصوص اللہ سے مشکوٰۃ (خطیب تبریزی) پڑھی - شیخ محمد عابد سندھی انصاری کی خدمت میں بخاری کے کچھ اجزا پڑھ کر اجازہ عامہ حاصل کیا اور شیخ ابو زاہد اسمعیل بن ادریس رومی ثم مدنی سے اجازۂ عامہ حاصل کیا۔ (١) نواب صاحب شاہ اسحاق سے تدریس کتب کی تفصیل نہیں دی۔ سید احمد ولی اللّٰہی نے لکھا ہے کہ شاہ اسحاق سے کتب حدیث کی تکمیل حج سے واپس آنے کے بعد کی تھی - سید احمد لکھتے ہیں :

" تحصیل علوم کا شروع ہی سے شوق تھا - قرآن شریف حفظ کرکے ابتدائی کتابیں مولوی حبیب اللہ سے پڑھیں - ١٥ برس کی عمر میں والد صاحب کے ساتھ حج کو تشریف لے گئے - وہاں شیخ محمد عابد سندھی مدنی سے علم حدیث اور حدیث مسلسل بالاولیت اور جمیع مرویات شیخ کی سند و اجازت حاصل کی - واپس آکر شاہ محمد اسحاق سے حدیث کی تکمیل کی -" (٢)

مولانا سید عبدالحئی نے لکھا ہے کہ مولانا حبیب اللہ دہلوی سے قرآن مجید حفظ کیا اور نحو اور عربی پڑھی پھر فقہ و حدیث کی طرف توجہ کی اور حدیث کی سماعت شاہ اسحاق کی خدمت میں کی - نیز اپنے والد سے موطا محمد بن حسن شیبانی اور مولانا مخصوص اللہ سے مشکوٰۃ پڑھی اور طریقت کی تحصیل اپنے والد سے کی - اور سفر حرمین کے

---

(١) صدیق حسن خاں، نواب، " ابجد العلوم"، بھوپال : مطبع صدیقی، س ن ، ج ٣، صص ٣٠-٩٢٩

(٢) سید احمد ولی اللّٰہی، " یادگار دہلی"، محولہ بالا، ص ٩٠
بشیرالدین احمد دہلوی، " واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا، ج ٢، ص ١٥٣
خلیق احمد نظامی، " تاریخی مقالات"، دہلی : ندوۃ المصنفین، ١٩٦٦ء، ص ٢٢٢
ایوب قادری، محمد، " مولانا محمد احسن نانوتوی" ، کراچی: مکتبہ عثمانیہ، ١٩٦٦ء، ص ٣٣

موقع پر شیخ محمد عابد سندھی اور زاہد اسمعیل سے حدیث کی سند حاصل کی۔"(۱) انوارالحسن شیرکوٹی کے بیان میں تحصیل علمی کی اتنی تفصیل ملتی ہے کہ کتب فقہ ، صحاح ستہ اور امام مالک کی موطا اپنے والد شاہ ابوسعید سے پڑھی تھی۔(۲) مولوی فضل حسین نے شاہ اسحاق کے تلامذہ میں صرف نام درج کیا ہے -(۳) مولوی رحمان علی نے بھی مولوی حبیب اللہ کے سوا ان کے تمام اساتذہ کے نام درج کیے ہیں۔(۴) سلوک و طریقت کی تعلیم انھوں نے اپنے والد ماجد کے علاوہ حضرت شاہ غلام علی سے حاصل کی - والد کے انتقال کے بعد شاہ غلام علی کے خلیفہ اعظم مرزا شاہ غفور بیگ سے فیض اٹھایا۔(۵) پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :

" شاہ عبدالغنی ، شاہ احمد سعید کے چھوٹے بھائی تھے اور ان کے بعد سجادے پر بیٹھے - ان کا علمی تبحر بے مثال تھا.... علم حدیث پر غیر معمولی نظر رکھتے تھے۔ اپنے عہد کے پانچ بڑے اساتذہ سے انھوں نے سند حدیث حاصل کی تھی - علمی تبحر سے قطع نظر ان کا زہد و تقوی بے مثال تھا۔" (۶)

تحصیل علمی اور تکمیل طریقت کے بعد درس و تدریس حدیث اور اصلاح و تربیت طالبان حق میں مصروف ہوگئے اور یہ سلسلہ ہندوستان سے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بھی وفات تک جاری رہا اور ہزارہا تشنگان علوم و طریقت نے آپ سے فیض اٹھایا۔ صاحب سوانح قاسمی نے محمد حسن بہاری کا قول نقل کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں سب سے زیادہ ثمر دار درخت آج کل وہی ہیں اور اس کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان تنہا محدث وہی ہیں۔(۷)

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید ؛" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۲۸۹

(۲) انوارالحسن شیرکوٹی، انوارقاسمی"، محولہ بالا ، صص ۱۰-۱۰۹

(۳) فضل حسین بہاری، مولوی؛" الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا ، ص ۳۹

(۴) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) ؛" تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۱۰

(۵) سرسید احمدخان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۱۷
سید احمد ولی اللہی، ظہیرالدین ؛" یادگار دہلی"، محولہ بالا ، ص ۹۰
انوارالحسن شیرکوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۱۱۱

(۶) خلیق احمد نظامی، " تاریخی مقالات" محولہ بالا ، ص ۲۲۲

(۷) مناظر احسن گیلانی، مولانا ؛" سوانح قاسمی"، محولہ بالا ، ج ۳، ص ۶۵

مولانا سید عبدالحی نے لکھا ہے " کہ ان کی دعا کی برکت ، انفاس قدسیہ اور صدق نیت سے علما اور مشائخ کی بہت بڑی جماعت نے فائدہ اٹھایا، اور ان کی بزرگی اور ولایت پر اہل ہند و عرب کا اتفاق ہے -" (۱) اور بقول شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا" علما کی جماعت نے ان سے بہت فائدہ اٹھایا"-(۲) مولانا محمد میاں نے شاہ عبدالغنی کو دھلی کے حلقہ درس میں شاہ محمد اسحاق کا جانشین قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ " حجاز میں (اپنی) متعلقین نے عظیم الشان خدمات انجام دیں اور ان کے نشانات اور باقیات الصالحات آج تک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں موجود ہیں-" (۳)

اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو ایک باپ اپنی اولاد صالح و سعید سے ایک استاد کی عظمت اس کے عظیم المرتبت تلامذہ کے دائرے سے اور ایک عالم کا مرتبہ اس کی علمی تصانیف سے پہچاننا چاہئے - ہمیں ان کی اولاد کا تو کسی تذکرے میں علم نہیں ہوسکا- البتہ ان کی مرجع ساز حیثیت اور ان کے فیضان علمی کے اندازے کے لیے کافی ہے کہ ان کے تلامذہ پر ایک نظر ڈال لی جائے - اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے تلامذہ و مسترشدین میں اگر وقت کے اکابر و اعاظم رجال موجود ہیں تو خود ان کا (رشتہ) پنداداہ، مدرسادہ اور مرشداده کیا مرتبہ اور کیا شان ہوگی - یہ تمام حضرات جو ان سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں اور درس و تدریس ، وعظ و ارشاد ، تصنیف و تالیف ، سیاست و تدبر کے مختلف میدانوں میں اپنے عرف و شہرت میں اپنی مثال آپ ہیں - تقریباً پینتالیس سالہ درس و تدریس کی زندگی میں ہزاروں تشنگان علوم نے اس سرچشمہ علوم و معارف سے سیرابی حاصل کی - ان میں سے چند نامور

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید،" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۲۸۹

(۲) انوارالحسن شیرکوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا، ص ۱۱۲

(۳) محمدمیاں، مولانا سید، " علمائے ہند کا شاندار ماضی"، دھلی: کتابستان، ۱۹۶۰ء، ج ۴، ص ۳۱۲

تلامذہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں :" مولانا احمد حسن امروہی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا احمد حسن قنوجی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی، مولانا عبدالسلام ساکن ہسوہ ، مولوی نعیم الدین، مولانا امیر حسن محدث سہسوانی، شاہ محمد معصوم (ابن شاہ عبدالرشید ابن شاہ احمد سعید) ، وغیرہم "-(۱) اگر ان کے تلامذہ میں صرف مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی ہوتے تب بھی ان کی عظمت کے لیے یہ کافی ہوتا۔

بقول مولانا عبیداللہ سندھی :" حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی چودھویں صدی ہجری کے مجددین میں سے تھے اور شیخ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہی فقہ حنفی کے ایک راسخ العقیدہ امام و مجتہد تھے-" (۲)

مولانا شاہ عبدالغنی چوں کہ نقشبندیہ مجددیہ سلسلے کے شیخ طریقت بھی تھے اس لیے وہ لوگوں کو مرید بھی کرتے تھے اور ان کے نامور تلامذہ میں سے بیشتر ان کے مرید بھی تھے-

مولانا شاہ عبدالغنی تحریک ولی اللہی کے خاص ارکان میں سے تھے اور تحریک کے

---

(۱) تلامذہ کی تفصیل کے لیے دیکھئے :

سید احمد ولی اللہی، ظہیرالدین:" یادگار دہلی"، محولہ بالا ، ص ۹۱-۹۰
محمد حسن نقشبندی، مولوی:" مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا ، ص ۳۵۸
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) :" تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۹۵، ۱۷۸، ۸۳، ۲۸۲، ۳۰۰، ۳۲۵، ۴۲۸، ۵۰۲، ۵۲۳، ۵۷۰
اشرف علی تھانوی، مولانا(مرتب) :" ارواح ثلاثہ"، لاہور : اسلامی اکادمی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۶۸، ۱۷۰
امداد صابری، " فرنگیوں کا جال"، دہلی : فاروقی پریس، ۱۹۳۹ء، ص ۳۸۰
ایوب قادری، محمد، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۵۹، ۱۵۷، ۱۸۹
ایوب قادری، محمد :" جنگ آزادی ۱۸۵۷ء "، کراچی : پاک اکیڈمی، ۱۹۷۶ء ، ص ۱۲۰ (حاشیہ)

(۲) عبیداللہ سندھی، مولانا :" شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، لاہور : سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۵۲ء ، ص ۲۰-۲۱۹

انقلابی دور میں جماعت کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو سید احمد شہید کی ہجرت سرحد کے بعد تحریک کے مرکز دہلی میں مجاہدین، سرمایہ وغیرہ کا ذمہ دار تھا۔ (۱)

اور شاہ محمد اسحاق کی ہجرت حجاز کے بعد تو آپ نے نہ صرف درس و تدریس حدیث میں ان کی جانشینی کے فرائض انجام دے بلکہ تحریک کی سیاسی رہنمائی میں بھی آپ نے شاہ محمد اسحاق کی نیابت و جانشینی کی ذمہ داریوں کو اٹھایا۔ مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں :

" دوسرے خاص شاگرد جن کو مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب نے اپنا جانشین بناکر مدرسہ شاہ عبدالعزیز ان کے حوالے کیا، وہ مولانا شاہ عبدالغنی صاحب تھے۔" (۲)

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

" حضرت مولانا عبدالغنی صاحب محدث دہلوی جو دہلی کے حلقہ درس میں حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب کے جانشین تھے۔" (۳)

پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں :" کہ شاہ عبدالغنی مجددی دہلی میں حدیث کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دے رہے تھے۔(۴) ان کا حلقہ درس بہت وسیع تھا اور ملک کے گوشے گوشے سے طلبہ آتے تھے ۔(۵)

مولانا عبید اللہ سندھی نے مولانا شاہ عبدالغنی کو تحریک ولی اللہی کی اس جماعت کا خاص رکن قرار دیا ہے جو شاہ اسحاق صاحب کی ہجرت کے بعد دہلی میں تحریک کے

---

(۱) محمد میاں، مولانا سید :" علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۹۸
(۲) ایضاً، ج ۲، ص ۲۸۷
(۳) ایضاً، ج ۲، ص ۳۱۴
(۴) ایوب قادری، محمد :" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۳۱
(۵) عبید اللہ سندھی، مولانا :" شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۱۴۰

کاموں کی ذمہ دار تھی - مولانا لکھتے ہیں :

" مولانا محمد اسحاق مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملاکر ایک بورڈ بنادیا جو نئے پروگرام کی اشاعت کرکے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے -" (۱)

۱۸۵۷ء کے فتوی جہاد پر شاہ عبدالغنی کے بھی دستخط ہیں-(۲) اسے اس پس منظر میں دیکھا جائے کہ دہلی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد آپ کے مریدین و مخلصین کا دہلی کو چھوڑ دینے کے لیے بار بار اصرار کیا معنی رکھتا ہے - چنان چہ جب آپ نے دیکھا کہ اب ہندوستان میں رہ کر تحریک کے وجود کو برقرا رکھنا بھی مشکل ہوگیا تو اپنے استاد شاہ محمد اسحاق کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے ہجرت کا ارادہ فرمالیا اور حجاز پہنچ کر تحریک کی رہنمائی شروع کردی، مولانا سندھی لکھتے ہیں :

" مولانا موصوف (شاہ اسحاق صاحب) نے جس گروہ کو اپنی نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیے تھے ، اس گروہ نے ۱۸۵۷ء میں سلطان دہلی کی طرف داری کی اور شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہنچ گیا- چنان چہ امیر امداد اللہ اور مولانا عبدالغنی ، مولانا محمد یعقوب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر ولی اللہی تحریک کی ہندوستانی تنظیمات کی رہنمائی کرتے رہے -" (۳)

شاہ عبدالغنی کے سبھی تذکرہ نگاروں نے ان کے اخلاق کریمانہ کا اعتراف کیا ہے -

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا، "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۱۰۰

(۲) عتیق صدیقی (مرتب) ، " ۱۸۵۷ء — اخبار اور دستاویزیں"، دہلی : مکتبہ شاہ راہ، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۹۵

ایوب قادری، محمد، " جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء " محولہ بالا ، صص ۳۰۵ و ۳۰۸

(۳) عبیداللہ سندھی، مولانا، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا ، صص ۲۰-۱۱۹

محمد میاں، مولانا سید ، " علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۳، صص ۵۹-۱۵۸

(۴)

مولوی محمد حسن نقشبندی لکھتے ھیں :

" آپ کے مزاج میں تواضع و شکست و شفقت و نفع رسانی بدرجہ غایت تھی۔" (۱)

مولانا عبدالحی نے ان کے علم ، عمل ، زھد ، حلم، صداقت ، امانت ، صیانت، حسن نیت ، اخلاص ، خوف و رجائے الہی، پابندی سنت ، حسن خلق ، نفع خلائق اور توکل و استغنا کا اعتراف کیا ھے - (۲)

سرسید نے کمال عقیدت کے ساتھ آپ کے محاسن اخلاق اور خصائص سیرت کا ذکر کیا ھے - سرسید کا یہ کتابی مطالعہ یا سنی سنائی بات نہیں بلکہ یہ ان کا ذاتی مشاھدہ اور تجربہ ھے اور اس لیے اس کی اھمیت تمام تذکرہ نویسوں کے افکار و آراء سے زیادہ ~~پر فوقیت~~ رکھتی ھے - سرسید مرحوم کی ان چند سطروں پر ایک نظر ڈال لینی چاھیے - سرسید لکھتے ھیں :

" اوقات آپ کی ایسی خوب ھے کہ اگلے زمانے کے اچھے اچھے دین دار لوگوں کی بھی شاید ایسی ھوتی ھوگی - مسجد میں بیٹھے رھنا اور طریقہ محمدیہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو برتنا دن رات آپ کا کام ھے - خوشحال اس شخص کا جو اپنے نبی کے طریقے کے برتے اور دنیا و مافیہا سے خبر نہ رکھے۔ اس قدر اتباع سنت اختیار کیا ھے کہ آپ کو آسمان و زمین کے رھنے والے محی السنتہ و قامع البدعۃ کہہ کر پکاریں تو بجا ھے - ان کے نزدیک سوائے انحراف کمتر حکم شریعت کے سخت سے سخت کوئی مصیبت نہیں۔ ارتکاب اس امر خلاف سنت کا جس کو ھم کم بخت بال سے کم جانتے ھیں ان کے نزدیک امر محال ھے - اس تقوی اور ورع کو خیال کرو کہ صرف اس خیال سے کہ ھندوستان میں جو طریق بیع و شری بعض بعض فواکہ وغیرہ کا جاری ھے وہ از روئے شرع شریف کے درست نہیں، ان چیزوں کے مزے سے واقف نہیں -" (۳)

---

(۱) محمد حسن نقشبندی، مشائخ نقشبند یہ مجددیہ"، محولہ بالا ، ص ۳۴۸

(۲) عبدالحی، مولانا سید" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، صص ۹۰-۲۸۹

(۳) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید "، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۱۷

سلوک ، تصوف کے انہماک اور درس و تدریس کے مشاغل نے انہیں تصنیف و تالیف کی طرف توجہ فرمانے کا موقع نہیں دیا۔ پھر بھی آپ کی دو تصانیف کا پتا چلتا ہے - ان میں سے ایک" ذیل انجاح الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ " ہے (۱) اور دوسرا رسالہ " تذکرہ حضرت شاہ غلام علی" ہے -(۲) آخر الذکر غالباً وہی تحریر ہے جو شاہ غلام علی کی تالیف " مقامات مظہری" کے آخر میں بطور ضمیمہ حضرت شاہ صاحب موصوف کے حالات میں، شامل ہے۔

۱۲۷۰ھ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مع اہل و عیال مدینہ منورہ کو ھجرت کرگئے تھے - زندگی کے آخری شب و روز اسی سرزمین پاک میں درس و تدریس حدیث نبوی اور اصلاح و تربیت مسلمین میں بسر ہوئے - مولانا عبدالحی کے مطابق ۲ محرم، ۱۲۹۲ھ/یکم جنوری، ۱۸۷۹ع کو منگل کا دن گزرنے کے بعد انتقال فرمایا۔ انوارالحسن نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے - چوں کہ انتقال ۲ محرم گزرنے کے بعد ہوا تھا اس لیے محمد نذیر احمد اور مولوی محمد حسن نے ۷ محرم تاریخ لکھی ہے - صاحب " ابجد العلوم" نے صرف سال وفات (۱۲۹۲ھ) لکھا ہے -(۳) جنت البقیع میں قبہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قریب اپنے بڑے بھائی شاہ احمد سعید کے پائین مدفون ہوئے -(۴) رحمان علی نے مندرجہ ذیل

---

(۱) صدیق حسن خان، نواب، " ابجد العلوم"، محولہ بالا، ج ۳، ص ۹۲۹
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب) " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۳۱۰
محمد حسن نقشبندی، مولوی، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا، ص ۳۳۶
(۲) عبیداللہ سندھی، مولانا، " شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۱۹۵
(۳) صدیق حسن خان، نواب، " ابجد العلوم"، محولہ بالا، ج ۳، ص ۹۳۰
عبدالحی، مولانا سید، " نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۲۹۰
محمد حسن نقشبندی، مولوی، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا، ص ۳۳۷
نذیر احمد، محمد، " تذکرۃ العابدین"، محولہ بالا، ص ۲۸۰
انوارالحسن شیرکوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا، ص ۱۱۳
(۴) محمد حسن نقشبندی، مولوی، " مشائخ نقشبندیہ مجددیہ"، محولہ بالا، ص ۳۳۷
سید احمد ولی اللہی، ظہیرالدین، " یادگار دہلی"، محولہ بالا، ص ۹۰

قطعہ تاریخ وفات نقل کیا ہے :

شاہ عبدالغنی وحید زمان — نازش علم و عارف باللہ

سال نقلش شنیدم از ماتم — بہترین محدثین اے آہ! (۱)

۱۲۹۶ھ

شاہ عبدالغنی حدیث کے بہت بڑے عالم اور مدرس تھے - مولانا سید عبدالحی نے انہیں " الامام العالم المحدث " کے لقب سے یاد کیا ہے (۲) پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :" کہ ان کا علمی تبحر بے مثال تھا- علم حدیث پر غیر معمولی نظر رکھتے تھے- انہوں نے اپنے عہد کے پانچ بڑے اساتذہ سے سند حدیث حاصل کی تھی" (۳) ان کے تلامذہ روقت کے بڑے بڑے علمائے دین اور محدث پیدا ہوئے - ان کی ذات سے جہاں ایک طرف اصلاح و تزکیہ کی تحریک پھلی پھولی، وہیں علوم دینی حدیث، فقہ، تفسیر وغیرہ کو فروغ ہوا اور تعلیم عام ہوئی سرسید نے ان کا ترجمہ مشائخ کبار کے ذیل میں لکھا تھا لیکن ہم نے ان کے تفقہ فی الحدیث اور تعلیم و تدریس علوم اسلامی میں ان کی عظیم الشان خدمات کی وجہ سے انہیں علمائے دین کے سلسلہ الذہب کا ایک حلقہ شمار کیا ہے -

"آثار الصنادید" ان کے نمونہ تحریر و کلام سے خالی ہے - ہم یہاں ضمیمہ مقامات مظہری سے چند سطریں نقل کرتے ہیں :

" میر اکبر علی صاحب کہ از خلص نیازمندان حضرت ایشان ہستند برائے بیماری زنی از اقارب خود عرض نمودند - از بسکہ سوال [redacted] مکرر نمودند حضرت ایشان فرمودند اکبر علی! زندگی او زیادہ از پانزدہ روز معلوم نمی شود بہ تقدیر الہی روز پانزدہم وفات نمود لیکن در ایام مرض او میر صاحب موصوف توجہ آن زن را نمودہ بودند چون بر جنازہ اش حضرت ایشان تشریف آوردند

---

(۱) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب)، " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۳۱۰

(۲) عبدالحی، مولانا سید، " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۲۸۹

(۳) خلیق احمد نظامی، پروفیسر، " تاریخی مقالات"، محولہ بالا، ص ۲۳۲

مو مودد ، اکبر علی ! مگر توجہ این زن را نمودی برکات معلوم می شود"(۱)

===xxx===

<u>جناب مولانا نواب قطب الدین خان سلمہ اللہ تعالی :</u>

" تحصیل علم و فضل ، خصوصاً فقہ و حدیث خدمت بابرکت مولانا اسحاق صاحب مرحوم مغفور مبرور سے کی - اتباع شریعت میں سب پیش روان مسلک دین سے آپ کا قدم آگے بڑھا ہوا ہے ، وضع و لباس میں اپنے استاد عالی نہاد سے ایسے مشابہ ہیں کہ جس نے ان کو نہ دیکھا ہو ان کو دیکھے۔ اخلاق وحلم علاوہ فضل و کمال علمی کے ایسا آپ کی ذات میں جمع ہے کہ اوروں میں بہت کم پایا گیا۔ ان دونوں فنون میں تو غل مکمل بہم پہنچایا۔ تقوا اور ورع کا تو حساب نہیں۔ آپ کے اجداد والاتبار عالی خاندان والا دودمان تھے۔ ہمیشہ پیش گاہ سلطنت سے مناصب جلیلہ رکھتے تھے۔ اب اس جزو زمان میں بھی آپ کو تقرب سلطانی سے وہ عزت و جاہ حاصل ہے جو چاہیے - چوتھے دن اپنے استاد کی پیروی اور خلق کی رہنمائی کے لیے مجلس وعظ منعقد فرماتے ہیں۔ اکثر رسائل زبان ریختہ میں واسطے فوائد عوام کے تحریر کیے اور اس میں مسائل ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے - اور حق یہ ہے کہ ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہوگیا۔ کتب حدیث سے مشکوۃ کا ترجمہ زبان اردو میں بہت صاف و شستہ و فائدہ مند کیا ہے - اور اکثر فوائد و کتب متداولہ وغیرمتداولہ سے اس پر بڑھایا۔ جب اس کتاب کا چھاپہ ہوا باوجود مبسوط ہونے کے خلق نے ہاتھوں ہاتھ خریدلیا اور ہر روز رواج دین اور تقویت شرع مبین میں مصروف رہتے ہیں۔ اللہم زد فزد - اب جو شخص راہ ہدایت پر چلے گا ثواب اس کا انہیں کے جریدہ اعمال میں مرقوم ہوگا۔ ان اللہ لا یضیع اجرالمحسنین۔" (۲)

---

(۱) عبدالغنی ، شاہ، " ضمیمہ مقامات مظہری" ، دھلی : مطبع احمدی ، س ن ، ص ۱۵۳

(۲) سرسید احمدخان ، " آثارالصنادید" ، محولہ بالا ، باب چہارم ، صص ۷-۱۰٦

تعلیقات :

* قطب الدین نام اور نواب فخرالاسلام اور خان بہادر خطابات تھے۔ جو بہادر شاہ نے ان کو عطا فرمائے تھے۔ والد کا نام نواب محی الدین خان بہادر اعوازمیؒ تھا۔ پشتینی نواب اور جاگیر دار تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ۲ نومبر، ۱۸۳۲ء کو تقریب ماتم کے موقع پر انھیں شش پارچہ کا خلعت عنایت ہوا تھا۔ (۱)

۱۲۱۹ھ/۵-۱۸۰۳ء میں دھلی میں پیدا ہوئے ۔(۲) شاہ محمد اسحاق سے انھوں نے فقہ و حدیث اور اصول حدیث پڑھی (۳) شاہ صاحب سے تلمذ کا اعتراف انھوں نے خود کیا ہے ۔(۴) ان کے اساتذہ میں ایک شاہ حسین تھے۔(۵) دھلی کے دیگر اساتذہ کے علاوہ آپ نے علمائے حرمین سے بھی حدیث کی سندیں حاصل کی تھیں۔(۶)

سرسید نے ان کے اخلاق و حلم، تقوا و ورع اور فضل و کمال علمی کا اعتراف کیاھے۔(۷) ان کے دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کی سیرت اور ان کے علم و فضل کےمحاسن کاذکرکیاھے۔(۸)

---

(۱) رئیس احمد جعفری، سید،" بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، لاھور: کتاب منزل، ۱۹۵۵ء ص ۳۱۰ بحوالہ " بہادر شاہ کا روزنامچہ "، ص ۸۹

(۲) فقیر محمد جہلمی، مولوی،" حدائق الحنفیہ"، لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۸۸۵ء، ص ۳۸۸
ایوب قادری محمد،" تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ۳۹۲

(۳) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چہارم، ص ۲۰
عبدالحی، مولانا سید،" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۸۸
فقیر محمد جہلمی، مولوی،" حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۳۸۸
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب)،" تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ۳۹۲

(۴) قطب الدین خان، مظاھر حق"، ج اول، ص ۲

(۵) بشیرالدین احمد دھلوی، " واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۲۳

(۶) فقیر محمد جہلمی، " حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۳۸۸
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب)،" تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ۳۹۲

(۷) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چہارم، ص ۲۰

(۸) ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتب)،" تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ۳۹۲
عبدالحی، مولانا سید،" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۸۸
بشیرالدین احمد دھلوی، " واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۲۳
اشرف علی تھانوی (مرتب)،" ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا، صص ۹۱-۳۹۰

صاحب "حدائق الحنفیہ" لکھتے ہیں :

"اپنے زمانے کے عالم اجل، فاضل اکمل، فقیہ، محدث، مفسر، جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول، قامع شرک و بدعت و متصوفین، عابد، متورع، مردود فرقہ غیر مقلدہ، صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔" (۱)

مولانا عبدالحی نے ان کے ان فضائل علمی اور محاسن اخلاق و سیرت پر یہ اضافہ کیا ہے کہ "علمی بحث و مذاکرات کے نہایت دل چسپی رکھتے تھے اور مذہبی مباحث میں مخالفین سے شدید تعصب رکھتے تھے۔" (۲)

صاحب "حدائق الحنفیہ" نے ان کی تصانیف کی جامع فہرست دی ۔ صاحب "نزھۃ الخواطر" نے اس میں صرف ایک کتاب "طب نبوی" کا اضافہ ہوا ہے ۔ (۳) ان کی تصانیف کی مکمل فہرست یہ ہے :

"احکام الضحی، احکام المہدیین، تحفہ الزوجین، تحفۃ العرب و العجم، تحفہ سلطانیہ، تذکرۃ الریا، تذکرۃ الصوم، تنبیہ الضال، تنویرالحق، توفیرالحق، جامع التفاسیر، جامع الحسنات، حقیقۃ الایمان، خلاصۃ النصائح، خلاصہ جامع صغیر، رسالہ مناسک، طب نبوی، ظفر جلیل (تصنیف ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ع)، فلاح دارین، گل زار جنت، مجموع الخیر، مرادالمعاد، مظاہرحق، (تصنیف ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ع) مظہر جمیل، معدن الجواہر، (شاہ ولی اللہ کی کتاب کا اردو ترجمہ)، وظیفہ مسنونہ، ہادی الناظرین" (شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے رسالہ آداب الصالحین کا اردو ترجمہ)۔" (۴)

---

(۱) فقیر محمد جہلمی، "حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۴۸۸
(۲) عبدالحی، مولانا سید، "نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۸۸
(۳) ایضاً، ج ۷، ص
(۴) فقیر محمد جہلمی، "حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا، ص ۴۸۸

ظفر جلیل شمس الدین محمود دمشقی کی مشہور تصنیف " حصن حصین" کا اردو ترجمہ ہے۔ ظفر جلیل سے تاریخ ترجمہ ۱۲۵۳ھ برآمد ہوتی ہے - " مظاہر حق " مشکوۃ کا ترجمہ ہے جو چار جلدوں میں دو ہزار سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہے - اردو زبان میں یہ سب پہلی جامع و مکمل حدیث کی کتاب ہے - مولانا حامد حسن قادری کے بقول " یہ مولانا قطب الدین کا نہایت عظیم الشان کارنامہ ہے۔" (۱) " مظاہر حق " سے اس کی تاریخ ترجمہ ۱۲۵۳ھ برآمد ہوتی ہے -

" قاموس الکتب " سے ان کی مزید تصانیف کا پتا چلتا ہے - جن کے نام یہ ہیں - قوسین میں تاریخ اشاعت ہے - " تحریم المسامر(۱۸۲۸ع) ، " تحفتہ الاحیا فی احکام تحریم النسا(۱۸۲۹ع) "، " تذکرۃ الجمعہ (ترجمہ زادالفقیر شرح اسما الحسنی(از الشیخ عبدالحق محدث دھلوی) "، " جامع الحسنات"، " چھل حدیث"، حقیقتہ الصلوۃ (۱۹۳۲ع "، رسالہ " مافضتہ الزنا"(۱۲۷۲ھ) "، " رفاہ المسلمین "(۱۳۲۲ھ) ، " زادالمعاقی فی بیان الکفر والارتداد" (۱۲۹۰ھ) ، " ضروریات دین" (۱۳۱۹ھ) ، " عروس المومنین"، " کنز المصلی ، ناشئتہ اللیل"، " نصیحتہ المسلمین"(۱۳۱۸ھ) -(۲)

سرسید کا یہ کہنا درست ہے کہ ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہوگیا۔ (۳)

صاحب " حدائق الحنفیہ" مولانا قطب الدین خان صاحب سے ۱۲۷۲ھ/ ۶۰-۱۸۵۹ع

---

(۱) حامد حسن قادری، مولانا"، "داستان تاریخ زبان اردو"، کراچی : اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ع ، ص ۲۱۰

(۲) عبدالحق ، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی "قاموس الکتب اردو"، کراچی : انجمن ترقی اردو، جون، ۱۹۶۱ع، ج اول ، ص ۱۶۷، ۱۹۵، ۲۹۳، ۳۲۲، ۳۷۳، ۳۷۷، ۳۹۸، ۱۰۷۱

(۳) سرسید احمد خان، "آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۶۰

میں دھلی میں ملے تھے۔ انھوں نے لکھا ھے کہ بے شک آپ صورت و سیرت میں آیات ربانی میں سے ایک آیت تھے۔ تیسرے چوتھے سال آپ حج کو جاتے رہتے تھے۔ آپ کی وفات بھی سفر حرمین کے موقع پر ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۳ع میں مکہ معظمہ میں ھوئی ۔ " مروج احکام شریعت" سے آپ کا سال وفات نکلتا ھے ۔(۱)

صاحب " حدائق الحنفیہ" نے انھیں " مرورِ فرقہ غیر مقلد" لکھا ھے اور صاحب " نزھتہ الخواطر" کے بقول میاں سید نذیر حسین محدث دھلوی کے رد میں ان کی کئی کتابیں ھیں ۔ اس کے باوجود میاں صاحب سے نواب صاحب کے ذاتی سطح پر تعلقات نہایت قریبی معلوم ھوتے ھیں۔ چنان چہ جب مولوی کریم اللہ سے الو کی حلت کے باب میں بہادر شاہ کے دربار میں بحث ھوتا طے پائی تو ان کی مشکل کو میاں صاحب ھی نے دور کیا تھا اور اٹھائیس کتابوں کی سند سے الو کی حلت ثابت کردی تھی ۔(۲) "ارواح ثلاثۃ" کی روایت سے بھی معلوم ھوتا ھے کہ ان کے اختلاف میں ذات اور نفس کا مطلق دخل نہ تھا۔(۳)

محلے بلبلی خانہ میں نواب صاحب کی حویلی تھی۔ اس کے برابر کی مسجد اور سامنے کی گلی نواب صاحب موصوف کے نام سے مشہور ھیں ۔ (۴) آپ کی اولاد میں صرف ایک صاحب زادے نصیرالدین کا نام معلوم ھوا ھے ۔ بشیرالدین لکھتے ھیں :

" آپ کے صاحب زادے نصیرالدین خان بھی گزرگئے اولاد نرینہ باقی نہیں رھی ۔ نواب صاحب کی دو پوتیاں تھیں بڑی خاکسار کی خوش دامن نے حال ھی میں انتقال کیا ھے ۔ چھوٹی مرزا ایوب بیگ و داؤد بیگ متولیان مسجد کی والدہ ھیں ، بقید حیات ھیں۔" (۵)

---

(۱) فقیر محمد جہلمی، " حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا ، ص۳۸۸

(۲) فضل حسین بہاری، " حیاۃ بعد المماۃ" ، محولہ بالا ، ص ۲۳-۱۲۱

(۳) اشرف علی تھانوی(مرتب) ، " ارواح ثلاثۃ"، محولہ بالا ، ص ۹۱-۳۹۰

(۴) بشیرالدین احمد دھلوی، " واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۳۲۳

(۵) فقیر محمد جہلمی، " حدائق الحنفیہ"، محولہ بالا ، ص ۳۸۸
ایضاً ج ۲ ، ص ۳۲۴

اقتباس کے پہلے جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب کی اولاد میں صرف نصیرالدین خان ہی دہ تھے دوسرے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کی کوئی بیٹی ضرور تھیں جو نصیرالدین خان کے انتقال کے بعد بھی زندہ رہی تھیں۔

سرسید نے مولانا قطب الدین کی تحریر کا نمونہ نہیں دیا تھا ، ہم یہاں " مظاہر حق" ترجمہ مشکوۃ کی ابتدائی سطریں نقل کرتے ہیں - اس سے ان کی تحریر کی صفائی، سادگی اور آسانی کا پتا چلتا ہے - تحریر یہ ہے :

" الحمد للہ الذی ارسل رسولہ الکریم لیہدینا الی الصراط المستقیم وصلی اللہ تعالی علیہ و علی آلہ و صحبہ اجمعین بعد اس کے مسکین محمد قطب الدین شاہجہان آبادی عرض کرتا ہے کہ کتاب " مشکوۃ شریف" علم حدیث میں عجب نافع کتاب ہے کہ ہر مضمون کی حدیثیں اس میں مندرج ہیں اس کا ترجمہ عدیم النظیر میرے استاد بزرگوار مولانا مخدومنا مکرمنا حضرت حاجی محمد اسحاق نواسۂ حضرت شیخ عبدالعزیز رحمہما اللہ تعالی کے نے بیچ زبان ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جاوے بہتر ہے اس لیے اس ہیچ مدان نے ترجمہ اس کا عبارت عربی سے علیحدہ کرکے لکھا اور فائدے مختصر مناسب مقام کے شروح مشکوۃ وغیرہ سے مثل مرقات شرح ملا علی قاری اور ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق اور حاشیہ سید جمال الدین رحمہم اللہ کے اور سوائے ان کے سے زیادہ کرکے خدمت عالی میں عرض کی اور جناب ممدوح نے بھی کچھ فائدے لکھے تھے۔ تھوڑا اس میں درج کیے اور نام اس کا " مظاہر حق " رکھا گیا کہ اس میں تاریخ اس کی نکلتی ہے یا اللہ اس کو مقبول فرما اور ہم سب کو اس سے دارین میں فائدہ مند کر۔"(١)

===xxx====

حاجی محمد سلمۃ ربہ :

" ساکن ہیں نواح جون پور کے اور بعد ادائے حج بیت اللہ کے ، شہر شاہجہان آباد میں وارد ہوئے اور مولانا محمد اسحاق صاحب سے کتب حدیث کو تحصیل کیا۔ اگرچہ اور فنون سے بھی آگاہ ہیں ، لیکن فن حدیث کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ ورع و تقوی میں مستثنی ہیں راقم نے جناب مستطاب مولانا مخدومنا مولوی صدرالدین خان بہادر کی خدمت میں ان کو حاضر ہوتے دیکھا اور ان کے جوہر سے مطلع ہوا۔ اس واسطے کہ حاجی صاحب موصوف

---

(١) قطب الدین خان ، مولانا ، مظاہر حق"، لکھنو : مطبع نول کشور، س ن ، ج اول ، ص ١

مولانائے ممدوح کی طرف سے مدرسہ " دارالبقا" میں مدرس تھے۔[1]

تعلیقات :
======

مولوی محمد مرحوم کے حالات میں " آثارالصنادید" واحد ماخذ ہے - " واقعات دارالحکومت دہلی" میں ان کا صرف نام آیا ہے -(۲) مولوی فضل حسین بہاری (۳) ، مولانا محمد مناظر احسن گیلانی، (۳) اور انوارالحسن شیرکوٹی(۴) نے شاہ محمد اسحاق کے صاہل ذکر تلامذہ میں ان کا شمار کیا ہے - " حیاۃ بعدالمماۃ" کے بیان سے اتنا اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شاہ عبدالخالق صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا اور شاہ اسحاق اور عبدالخالق سے استفادے پر شیخ الکل میاں نذیر حسین کے ہم درس تھے-(۵) آخر مدرسہ " دارالبقا" کا مدرس لکھا ہے - تمام حضرات کا ماخذ " آثارالصنادید" ہے - (۶)

===XXX====

مولوی محمد مظہر مرحوم :-
===============

" افسوس کہ مولوی محمد مظہر نے جو عربی مدرسہ سہارن پور میں مدرس تھے اور انہی کی ذات بابرکات سے اس مدرسے کو عزت اور رونق تھی- بروز شنبہ ، تیسری اکتوبر، ۱۸۸۵ع کو انتقال فرمایا- انا للہ و انا الیہ راجعون-

مولوی صاحب ممدوح بہت بڑے عالم تھے- جس زمانے میں دہلی میں طالب علم تھے اسی زمانے میں ان کی زہادت مشہور تھی، تقوی و ورع میں بھی نہایت اعلا درجہ رکھتے تھے بیس برس سے انہوں نے اپنے ہم قوموں کو علوم دینی کی فیض رسانی پر کمر ہمت باندھی تھی-

---

(۲) بشیرالدین احمد دہلوی،" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۳۱۶
(۳) فضل حسین بہاری، " حیاۃ بعدالمماۃ"، محولہ بالا ، ص ۵۰
(۳) مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد،" سوانح قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۲۲
(۴) انوارالحسن شیر کوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۷۹
(۵) فضل حسین بہاری،" الحیاۃ بعدالمماۃ"، محولہ بالا ، ص ۷۳
(۶) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۷۲

اور عربی مدرسہ سہارن پور میں یا شکستہ ہوکر بیٹھ گئے تھے۔ آمدنی مدرسے صرف پچیس روپیے ماھواری بقدر گزر اوقات لیتے تھے اور علوم کی تعلیم میں مصروف تھے ۔ بہت لوگ ان سے فیض یاب ہوئے ، مگر افسوس ہے کہ اجل نے لوگوں کو اس فیض سے محروم کردیا۔" (۱)

تعلیقات :

مولانا محمد مظہر ، نانوتہ کے صدیقی شیوخ کے خاندان سے تھے۔ والد کا نام حافظ مولوی لطف علی تھا۔ حافظ لطف علی، شیخ اسد علی (والد ماجدمولانا محمدقاسم نانوتوی) اور مولانا مملوک علی(والد ماجد مولانا محمد یعقوب نانوتوی) کا سلسلہ نسب چوتھی پشت میں شیخ ابوالفتح سے مل جاتا ہے ۔(۲) گویا کہ مولانا محمد مظہر ، مولانا محمد قاسم ، مولانا محمد یعقوب ایک ہی شجرہ طیبہ کی فروع تھیں۔ آپ کا مولد نانوتہ اور سال ولادت ۱۸۲۳ء ہے ۔ مولانا محمد احسن اور مولانا محمد منیر آپ کے چھوٹے بلکہ بھائی تھے۔ (۳)

پہلے استاد ان کے والد ماجد حافظ لطف علی تھے جن کی خدمت میں پہلے قرآن مجید حفظ کیا ، پھر فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔(۴) اس کے بعد دھلی چلے گئے اور اپنے بزرگ خاندان مولانا مملوک علی سے تحصیل علمی کی ۔ دھلی کالج میں بھی پڑھا۔ دھلی میں ان کے دیگر اساتذہ کے سلسلے میں صاحب " نزھتہ الخواطر" کے

---

(۱) مولانا محمد مظہر نانوتوی کے انتقال پر سرسید نے یہ تحریر بطور " شذرۂ تعزیت" لکھی تھی جو "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ " ، علی گڑھ میں ۱۰ اکتوبر، ۱۸۸۵ء کو ص ۱۱۴ پر شائع ہوئی تھی۔

(۲) ایوب قادری، محمد ،" مولانا محمد احسن نانوتوی"(مقالہ) ،" العلم"، کراچی: اکتوبر، ۱۹۵۸ء ، ص ۴۳
محمد میاں، مولانا سید ،" علمائے ھند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۴، ص ۳۳۴

(۳) ایوب قادری، محمد ،" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۱۵۴

(۴) محمدمیاں، مولانا سید ،" علمائے ھند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۴، ص ۳۳۴
ایوب قادری، محمد ،" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۱۵۴

مطابق صدرالدین خان آزردہ، مولانا رشیدالدین خان، اور شاہ محمد اسحاق (١) اور مولانا محمد میاں کے مطابق اول الذکر دو اصحاب (آزردہ و خان صاحب) کی بجائے مولانا احمد علی سہارنپوری اور شاہ عبدالغنی مجددی کے نام آئے ہیں-(٢) مولانا مملوک علی ، مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا رشیدالدین خان سے علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں، مولانا احمد علی لاھوری اور شاہ عبدالغنی مجددی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور شاہ محمد اسحاق سے بخاری شریف پڑھی اور حدیث کی سند حاصل کی -(٣) مولانا رشید احمد گنگوھی سے بیعت تھے -(٤)

تحصیل علمی سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ مطبع نول کشور میں مصحح کے فرائض انجام دیے -(٥) غالباً اسی تصحیح کے کام کو مفتی عزیز الرحمن نے " کتابت" لکھا ھے -(٦) محمد ایوب قادری نے اس بات کی تردید کی ھے کہ وہ مطبع نول کشور میں کتابت کرتے تھے-(٧) مطبع نول کشور کے بعد وہ اجمیر کالج میں ملازم ھوکر چلے گئے - وھاں سے آگرہ کالج میں تبادلہ ھوگیا- اور تقریباً ١٢، ١٣ سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رھے (٨) - ١٨٥٧ء میں جہاد آزادی کا آغاز ھوا تو مولانا محمد مظہر نے بھی اس میں عملاً حصہ لیا اور معرکہ

---

(١) عبدالحی، مولانا سید : " نزھتہ الخواطر"، ~~محولہ بالا~~ ، ج ٨، ص ٣٥٥
(٢) محمد میاں، مولانا سید : " علمائے ھند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا ، ج ٤، ص ٣٣٢
(٣) ایضاً، ج ٤، ص ٣٣٣
(٤) عبدالحئی، مولانا سید : " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ٨، ص ٣٥٥
اشرف علی تھانوی (مرتب) : " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ٣٢٢
(٥) عبدالحی، مولانا سید : " نزھتہ الخواطر" ، محولہ بالا ، ج ٨، ص ٣٥٥
(٦) عزیز الرحمن، مفتی : " تذکرہ مشائخ دیوبند"، کراچی : [illegible] ، زرین کتب خانہ، ١٩٥٨ء ، ص ١٢٣
(٧) ایوب قادری، محمد : " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ١٥٥ (حاشیہ)
(٨) محمد میاں، مولانا سید : " علمائے ھند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا ، ج ٤، ص ٣٣٣
ایوب قادری، محمد : " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ١٥٣
ایوب قادری، محمد : " جنگ آزادی ، ١٨٥٧ء " محولہ بالا ، ص ٢٠٣

شامل میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، قاضی عنایت علی تھانوی، اور اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد منیر کے ساتھ شریک تھے ۔ اس معرکے میں ان کے پیر میں گولی لگی تھی اور علاج معالجے کے بعد بھی اس کا نشان باقی تھا۔ (۱) جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد عام معافی کے اعلان تک روپوش رہے ۔ بعد میں وہ عام دار و گیر سے تو بچ گئے لیکن ملازمت سے قطع تعلق ہوگیا۔ (۲)

رجب ۱۲۸۳ھ / ۲، نومبر، ۱۸۶۶ء میں مولوی سعادت علی سہارن پوری نے ایک مدرسے کا آغاز کیا۔ پہلے تین مدرس مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولوی عنایت علی اور حافظ قمرالدین تھے۔ آغاز مدرسہ کے تین ماہ بعد شوال میں مولانا محمد مظہر کو صدر مدرس اور شیخ الحدیث بنایا گیا۔ (۳) قاری محمد طیب صاحب (۴) اور مولانا سید محمد میاں (۵) نے انہیں بانی مدرسہ " مظاہرالعلوم" لکھا ہے ۔ لیکن یہ دعوا محل نظر ہے ۔ مدرسے کے قیام کا شرف مولانا سعادت علی سہارن پوری کو حاصل تھا۔ (۶) صاحب" تذکرۃ الخلیل" کا کہنا ہے کہ " مظاہر العلوم" آپ کے نام پر مدرسے کا نام رکھا گیا تھا۔ (۷) اگر یہ درست ہوتا مدرسے کا نام " مظہرالعلوم" ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ " مظاہر العلوم" اس کا تاریخی نام ہے۔

---

(۱) محمد میاں، مولانا سید، " علمائے ہند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا، ج ۴، ص ۳۳۳

(۲) ایوب قادری، محمد، " جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء" محولہ بالا، ص ۲۰۳
ایوب قادری، محمد، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۵۵
ایوب قادری، محمد (مرتب)، " تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۱۲۳

(۳) امداد صابری، " فرنگیوں کا جال"، محولہ بالا، ص ۱۶۹
ایوب قادری، محمد، " مولانا احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۵۵

(۴) اشرف علی تھانوی، مولانا (مرتب)، " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا، ص ۳۳۲

(۵) محمد میاں، مولانا سید، " علمائے ہند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا، ج ۴، ص ۳۳۳

(۶) عبدالحی، مولانا سید، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۴۵۵
امداد صابری، " فرنگیوں کا جال"، محولہ بالا، ص ۱۶۹
ایوب قادری، محمد، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۵۵

(۷) عاشق الہی میرٹھی، " تذکرۃ الخلیل"، کراچی: پاکیزہ آرٹس لمیٹڈ، ۱۹۷۱ء، ص ۱۸۹

جس سے ۱۲۹۲ھ بر آمد ہوتے ہیں۔ (۱) یہ وہی سال ہے جب مدرسے کی ترقی کو کے بعد اسے ایک مستقل عمارت میں منتقل کیا گیا تھا۔ (۲) البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "دارالعلوم دیوبند" کے بعد "مظاہرالعلوم" کو برصغیر پاکو ہند کا سب سے بڑا دینی تعلیم کا مرکز بنانے میں مولانا محمد مظہر کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔

محمد ایوب قادری صاحب نے لکھا ہے کہ اس درس گاہ سے بڑے نامور علما فارغ التحصیل ہوکر نکلے اور برصغیر پاک و ہند میں دین و ملت کی خدمات میں مصروف ہیں۔(۳) لیکن ان کے فیضان درس و تدریس کے باب میں اس سے بڑی سند تو خود سرسید کا یہ اعتراف ہے کہ انہی کی ذات برکات سے اس مدرسے کو عزت اور رونق تھی۔ (۴)

مولانا مملوک علی نانوتوی کے انتقال کے بعد تحریک ولی اللہی کی مرکزی شخصیت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ذات گرامی تھی اور ان کے خاص احباب میں مولانا قاسم نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولانا محمد یعقوب اور مولانا محمد مظہر اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد منیر تھے۔ اور جب ۱۸۵۷ء کے بعد حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہجرت فرمائی تو اپنے خاص احباب کو نئے طریقہ کار کے مطابق کام کرنے کے لیے ہندوستان میں چھوڑا۔ (۵) نئے طریقہ کار کے مطابق کام کا آغاز "دارالعلوم دیوبند"

---

(۱) امداد صابری، "فرنگیوں کا جال"، محولہ بالا، ص ۱۸۰
عاشق الٰہی میرٹھی، "تذکرۃ الخلیل"، محولہ بالا، ص ۲۰۹

(۲) ایوب قادری، محمد، "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۵۵
امداد صابری، "فرنگیوں کا جال" محولہ بالا، ص ۱۸۰

(۳) ایوب قادری، محمد، "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، صص ۵۶-۱۵۵

(۴) سرسید احمد خان، "مولوی محمد مظہر"، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، محولہ بالا، ص ۱۴۴

(۵) عبیداللہ سندھی، مولانا، "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۱۲۲
محمد میاں، مولانا سید، "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۴، صص ۹۰-۲۸۹ اور ۱۵-۳۱۳

(آغاز : ۱۵ محرم، ۱۲۸۳ھ) ، " مظاہرالعلوم" سہارن پور (آغاز : یکم رجب ، ۱۲۸۳ھ)

اور جامعہ قاسمیہ (مدرسہ شاہی مسجد) مراد آباد کے قیام سے کہا گیا ہے۔ تحریک کے اس دور (۱)

جدید میں مولانا محمد مظہر نانوتوی کا خاص مقام ہے -

مولانا امداد صابری نے " دارالعلوم" کی ۱۲۹۳ھ کی روداد کے حوالے سے لکھا ہے

" دارالعلوم دیوبند" کی تعمیر کا پہلا پتھر مولانا احمد علی محدث سہارن پوری نے رکھا۔ اس کے بعد مولانا محمد قاسم ، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد

مظہر نانوتوی نے ایک ایک اینٹ رکھدی- (۲)

مولانا محمد مظہر نے ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۱ء اور ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں دو حج کیے- (۳)

مولانا محمد مظہر کے علمی کاموں میں صرف در مختار کے ترجمے کی تصحیح و تکمیل ہیں-

اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسن نانوتوی کے ساتھ شرکت میں نام آتا ہے - یہ ترجمہ

مولانا خرم علی بلہوری نے کیا تھا ، اس کی تکمیل و تصحیح میں مولانا محمد مظہر بھی بھی

شریک رہے جیسا کہ مولانا محمد احسن نانوتوی نے خود اعتراف کیا ہے -(۴)

مولانا محمد مظہر چوں کہ لاولد فوت ہوئے تھے اس لیے اولاد ذکور و اناث میں سے

آپ کی کوئی صلبی یادگار نہیں- (۵) ان کے علمی فرزندان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی

---

(۱) طیب ، مولانا قاری محمد ،" تاریخ دارالعلوم دیوبند"، کراچی : دارالاشاعت، ۱۹۷۲ء، ص ۱۳
محمد میاں ، مولانا سید ،" علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۴ ، ص ۳۳۲ (حاشیہ)
امداد صابری ، " فرنگیوں کا جال"، محولہ بالا ، ص ۱۸۹

(۲) ایضاً ، ص ۱۷۷

(۳) ایوب قادری ، محمد ، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۱۵۶

(۴) ایضاً ، ص ۱۳۰ اور ۱۵۶

(۵) ایوب قادری ، محمد ،" جنگ آزادی ، ۱۸۵۷ء"، محولہ بالا ، ص ۲۰۴
ایوب قادری ، محمد ، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۱۵۲

اور مولانا خلیل احمد انبیٹھوی کی نہایت نامور ہوئے (۱) - مولانا نانوتوی نے ان سے بعض ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں- (۲)

مولانا عبدالحی نے انھیں عالم متبحر، کثرت سے قرآن کی تلاوت کرنے والا، دائم الذکر، زاہد متقشف اور تکلف سے دور لکھا ہے -(۳) سرسید ان کے علم، ان کی زہادت اور تقوی و ورع کے مداح ہیں اور ان کی سادگی اور اخلاص و للہیت کے لیے یہ بات کفایت کرتی ہے- کہ گزر اوقات کے لیے مدرسہ سے صرف پچیس روپے لیتے تھے جیسا کہ خود سرسید نے لکھا ہے-(۴)

مولانا عبدالحی نے ان کے انتقال کی تاریخ یوم الاحد (شنبہ) ذی الحجہ ، ۱۳۰۲ھ (۵) سرسید نے شنبہ، ۳ اکتوبر، ۱۸۸۵ع (۶) اور مولانا محمد میاں نے ۲۴ ذی الحجہ ، ۱۳۰۲/ ۱۸۸۶ع ، آٹھ بجے شب لکھی ہے (۷) عربی حساب سے چوں کہ اگلے دن کی تاریخ شروع ہوجاتی ہے اس لیے ہمارا خیال ہے کہ ۲۳ ذی الحجہ کا دن گزارکر ۲۳ کی شام کو انتقال ہوا ہوگا- اور ۲۴ کو تدفین عمل میں آئی ہوگی - محمد میاں نے ۲۴ ذی الحجہ ، یک شنبہ شمار کی جب کہ سرسید نے ۳ اکتوبر، بروز شنبہ تاریخ وفات لکھی - اس طرح مولانا محمد مظہر کی صحیح تاریخ انتقال ۲۳ ذی الحجہ ، ۱۳۰۲ھ/ ۳ اکتوبر، ۱۸۸۵ع ، بروز شنبہ، ہوتی ہے - اور تینوں روایتوں میں تطبیق بھی ہوجاتی ہے - ان کی وفات کی تاریخ مولانا محمد سعید نے یہ کہی : " زیں جہان نقل مکان کرد بدارجنات" (۸)

---

(۱) ایوب قادری، محمد، " تذکرہ علمائے ہند" محولہ بالا، ص ۳-۵
عاشق الہی میرٹھی، " تذکرہ خلیل"، محولہ بالا، ص ۱۸۹

(۲) انوارالحسن شیرکوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا، صص ۳۳-۳۸ اور ۲۷۹

(۳) عبدالحی، مولانا سید، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۳۵۵

(۴) سرسید احمدخان، " مولوی محمد مظہرمرحوم"، " انسٹی ٹیوٹ گزٹ"، محولہ بالا، ص ۱۱۳

(۵) عبدالحی، مولانا سید، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۳۵۵

(۶) سرسید احمدخان، " مولوی محمد مظہر مرحوم"، محولہ بالا، ص ۱۱۳

(۷) محمدمیاں، مولانا سید، " علمائے ہند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا، ج ۴، ص ۳۳۲

(۸) عبدالحی، مولانا سید، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۳۵۵

جناب مولوی نذیر حسین سلمہ اللہ تعالی:

" زبدہ اہل کمال اسوۂ ارباب فضل و افضال مولوی نذیر حسین صاحب ، بہت صاحب استعداد ہیں خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد کامل بہم پہنچائی ہے کہ اپنے نظائر واقران سے گوئے سبقت لے گئے - روایت کشی میں آج بے نظیر ہیں باوجود اس کمال اور اس استعداد کے مزاج میں خاکساری اور حلم گویا کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ، باعتبار سن کے جو ان اور باعتبار طبیعت حلیم اور وضع متقی کے پیر -" (۱)

میں نے وہابیوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں :

" ایک وہابی، دوسرے وہابی کریلا ، تیسرے وہابی کریلا اور نیم چڑھا -"

میں اپنے تئیں تیسری قسم میں قرار دیتا ہوں اور بجز حق حق حق جو میرے نزدیک ہو ذرہ برابر دریغ نہیں کرتا -

کسی خیال سے حق بات کو ظاہر نہ کرنا گو وہ کیسی ہی ادنا ہو ، ٹھیک نہیں ہے - جناب مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی کو میں نے نیم چڑھا وہابی پایا ہے ۔وہ نماز میں رفع یدین نہیں کرتے تھے - مگر اس کو سنت ہدی جانتے تھے -

میں نے عرض کیا کہ جس بات کو آپ ٹھیک جانتے ہیں لوگوں کے خیال سے اس کو نہیں کرتے - جناب ممدوح میرے پاس تشریف لائے تھے، جب یہ گفتگو ہوئی - میں نے سنا کہ میرے پاس سے اٹھ کر وہ جامع مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے گئے اور اس وقت سے رفع یدین کرنے لگے - گو ان پر لوگوں نے بہت حملے کیے - مگر کلمۃ الحق ہمیشہ کلمۃ الحق ہوتا ہے -" (۲)

تعلیقات :

شیخ الکل مولوی سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے - مولد و منشا طفولیت موضع بلتھوا ، ضلع مونگیر (بہار) تھا - والد ماجد کا اسم سامی مولوی سید جواد علی تھا - میاں صاحب کا سلسلہ نسب ۳۲ واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے - (۳) میاں صاحب نے عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد

---

(۱) سرسید احمد خان ، " آثار الصنادید "، محولہ بالا ، باب چوتھا ، ص ۸-۱۰۷

(۲) اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد (مرتبہ) ، " مکتوبات سرسید "، لاہور : مجلس ترقی ادب ، س ن ، (مکتوب بنام مولوی ابومحمد ابراہیم) ، ص ۵۰-۲۴۹

(۳) فضل حسین بہاری ، الحیاۃ بعد المماۃ "، محولہ بالا ، ص ۱۲-۱۰ ؛ ~~ابراہیم سلفی~~، مولانا محمد ؛ " معیار الحق" (میاں سید نذیر حسین)" ، ص ۳۳۳ ؛ عبدالرحیم صادق پوری ، مولوی ؛ " تذکرہ صادقہ "، پٹنہ : ۱۹۶۳ء ، ص ۹۵-۳۹۳

سے پڑھیں۔ تکمیل کے شوق میں گھر سے چھپ کر نکلے اور صادق پور (پٹنہ) پہنچے اور شاہ محمد حسین کی درس گاہ میں داخل ہوگئے ۔ یہیں آپ نے ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء میں حضرت سید احمد شہید اور حضرت علامہ شاہ اسمعیل و مولانا عبدالحی کے مواعظ سے مستفیض ہوئے ۔ ان حضرات کے لقا و فیض بخشی نے دارالعلوم دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے استفادے کا شوق پیدا کردیا۔ صادق پور کے قیام کو چھ ماہ گذرے تھے کہ ایک روز دہلی کے سفر پر کمر ہمت باندھ لی۔ باوجودیکہ شوق کی سرگرمی اور طلب کا سرجوش کبھی آپ کو چین نہ لینے دیتا تھا لیکن موانع کی سنگینی بھی اپنی جگہ تھی۔ اس لیے راستے میں کچھ دنوں غازی پور میں قیام کیا اور مولوی احمد علی چڑیا کوٹی سے بعض کتابیں پڑھیں ۔ کچھ عرصے ٹھہر کر بنارس ہوتے ہوئے الہ آباد پہنچے اور دائرہ شاہ اجمل میں کچھ عرصے قیام کیا جہاں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور پھر دہلی روانہ ہوئے ۔(۱)

بنارس کے بارے میں " الحیاۃ بعدالمماۃ" کی رائے ہے کہ یہاں آپ نے اپنی ایک کتاب دو روپے میں فروخت کرکے ایک چھوٹا ٹٹو خریدا (۲) لیکن محمد حنیف یزدانی نے "معیارالحق" کے آخر میں میاں صاحب پر جو مضمون شامل کیا ہے اس میں اس روایت کو بالکل الٹ دیا ہے ۔ (۳) چوں کہ فاضل مضمون نگارکی معلومات کا ماخذ " الحیاۃ بعدالمماۃ" ہے اس لیے اسی کی روایت درست ہے ۔

صادق پور سے ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں آپ کے سفر کا آغاز ہوا تھا اور ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء میں دہلی پہنچے۔ مولوی فضل حسین بہاری نے لکھا ہے " کہ شاہ عبدالعزیز کی وفات

---

(۱) فضل حسین بہاری ، " الحیاۃ بعدالمماۃ"، محولہ بالا ، ص: ۳۱-۲۰
حنیف یزدانی ، محمد (مرتبہ) " معیارالحق"، از میاں سید نذیر حسین ، قصور: مکتبہ نذیریہ ۱۹۶۵ء ، ص: ۳۳۵

(۲) فضل حسین بہاری ، " الحیاۃ بعدالمماۃ"، محولہ بالا ، ص: ۲۷

(۳) حنیف یزدانی ، محمد (مرتبہ) "معیارالحق"، محولہ بالا ، ص: ۳۳۵

۷ شوال ، ۱۲۳۹ھ کے تین برس دو مہینے پانچ دن کے بعد میاں صاحب دہلی پہنچے تھے-(۱) اس حساب سے آپ ۱۳ رجب ، ۱۲۴۳ھ ، بروز بدھ / ۳۰ جنوری، ۱۸۲۸ء کو دہلی پہنچے ہوں گے - اس تاریخ کی تصدیق میاں صاحب کی ایک یادداشت سے بھی ہوتی ہے جس سے صاحب "حیاۃ بعدالمماۃ" نے استفادہ کیا ہے - (۲) دہلی میں آپ کے اساتذہ میں مولوی عبدالخالق ، مولوی اخوند شیر محمد ، مولانا جلال الدین ہروی ، مولوی کرامت علی اسرائیلی مولوی سید محمد بخش عرف تربیت خان ، مولانا عبدالقادر رام پوری ، محمد سعید پشاوری ، مولوی حکیم نیاز احمد سہسوانی ، اور الصدرالشہید شاہ محمد اسحاق دہلوی کے نام آتے ہیں-(۳)

مولوی بشیرالدین دہلوی نے تو میاں صاحب کے اساتذہ میں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے نام بھی لکھ دیے (۴) اور ان سے بہ روایت پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی اختیار کرلی ہے (۵) لیکن یہ درست نہیں ہے اس لیے کہ ہر دو صاحبان کا انتقال شاہ عبدالعزیز سے بھی پہلے ہوچکا تھا-

مولانا شاہ محمد اسحاق سے استفادے اور اجازہ کی نوعیت میں اختلاف ہے - لیکن بقول مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ اختلاف علمی نہیں جماعتی یعنی احناف اور اہل حدیث کا ہے - احناف کا کہنا ہے کہ شاہ اسحاق صاحب نے نواب قطب الدین خان کی سفارش پر آپ سے ایک ایک حدیث سن کر آپ کو سند حدیث دے دی تھی- (۶) جب کہ اہل حدیث ~~xxxxx~~ کا دعوا ہے کہ میاں صاحب نے شاہ اسحاق صاحب کے درس حدیث میں باقاعدہ شریک ہوکر

---

(۱) ~~[illegible]~~
فضل حسین بہاری، "الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا ، ص ۳۶

(۲) ایضاً ، صص ۳۲-۳۱

(۳) ایضاً ، صص ۵۳-۳۵
عبدالحی ، مولانا سید ، "نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸ ، صص ۹۸-۳۹۷

(۴) بشیرالدین احمد دہلوی، "واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۲۵۷

(۵) خلیق احمد نظامی (مرتب)، "۱۸۵۷ء ، کا تاریخی روزنامچہ"، از عبداللطیف ، دہلی : ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۶ء ، ص ۲۰۳
خلیق احمد نظامی، "تاریخی مقالات"، محولہ بالا ، ص ۲۵۳

(۶) اشرف علی تھانوی، (مرتب)، "ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۱۷۷
سلیمان ندوی، سید، حیات شبلی، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۴۳ء، ص ۴۶

سماعتاً اور قراۃً تحصیلِ حدیث کی تھی۔ اس دعوی کی بنیاد خود میاں صاحب کی تحریرات اور یادداشتیں ہیں۔(۱) احناف ان کی سند کو سند برکت اور اہل حدیث ان کی سند کو سند اجازت کہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا فیصلہ ہے کہ میاں صاحب نے شاہ اسحاق صاحب سے حدیث کی باقاعدہ تحصیل کی تھی لیکن اجازہ ۲ شوال ، ۱۲۵۸ھ کو حاصل کیا جب کہ شاہ صاحب سفر حج کو روانہ ہو رہے تھے۔(۲) اس فیصلے سے ہم بھی متفق ہیں لیکن ہم سید صاحب کی بنیاد کو تسلیم نہیں کرتے۔ سید صاحب کے فیصلے کی بنیاد نواب صدیق حسن خان کی ایک یادداشت ہے جو انھیں نواب صاحب کے کاغذات میں ملی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر میاں صاحب کے اپنے بیان کو اس باب میں رد کردیا گیا ہے اور یہ اختلاف احناف و اہل حدیث کے مابین ہے تو نواب صاحب کے قول و بیان کو کیوں کر تسلیم کیا جاسکتا ہے جب کہ وہ خود بھی اہل حدیث ہونے کی حیثیت میں ، اس مقدمے میں ایک فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک سید سلیمان ندوی کے فیصلے کے تسلیم و قبول کی بنیاد شاہ اسحاق صاحب کے تلامذہ میں حنفی پارٹی کے بزرگ اور احناف دیوبند کی قابل احترام شخصیت شیخ محمد تھانوی کا خط ہے (۳) اور ہمارے نزدیک اس اختلاف میں شیخ صاحب کا یہی خط فیصلے کی محکم و متفق علیہ بنیاد بن سکتا ہے ۔ خود شاہ اسحاق صاحب کی عطا کردہ سند سے ثابت ہوجاتا ہے کہ انھوں نے شاہ صاحب کی خدمت میں حدیث کی سماعت فرمائی تھی ۔ شاہ صاحب کے الفاظ ہیں " سمع منی الاحادیث الکثیرۃ" یعنی نذیر حسین نے مجھ سے بکثرت احادیث سنیں ۔(۴) احناف کی روایت میں ہے کہ :

---

(۱) فضل حسین بہاری ،" الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا ، صص ۵۳-۳۸
حنیف یزدانی ، محمد (مرتب) " معیار الحق"، محولہ بالا ، ص ۳۴۷

(۲) سلیمان ندوی ، سید ،" حیات شبلی"، اعظم گڑھ : دارالمصنفین ، ۱۹۴۳ع ، ص ۳۶

(۳) فضل حسین بہاری ، " الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا ، صص ۳۹-۳۷

(۴) ایضاً ، ص ۶۱

" جب شاہ صاحب ہجرت کرنے لگے نواب قطب الدین صاحب نے شاہ (اسحاق) صاحب سے سفارش کی کہ مولوی نذیر حسین صاحب کو حدیث کی سند دے دیجیے۔ شاہ صاحب نے ان کی سفارش سے ان سے ہر کتاب کے ابتدا کی کچھ کچھ حدیثیں سن کر ان کو قطب صاحب میں (جہاں وہ حج کی روانگی کے وقت ٹھہرے ہوئے تھے) حدیث کی سند دی ۔"(۱)

احناف کی ایسی روایت سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں میاں صاحب کو شاہ صاحب کے " بکثرت حدیثیں سننے" کا کوئی موقع پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ موقع شاہ صاحب کے درس حدیث کی وہ محفلیں تھیں جو مدرسہ عزیزیہ میں منعقد ہوتی تھیں اور جن میں میاں صاحب شرکت فرماتے تھے۔

میاں صاحب کے فضل و کمال اور تقوی و تدین کی شہرت طالب علمی کے زمانے سے تھی ۔ مولوی عبدالخالق نے ان کی فیروز بختی کا ستارہ آسمان کمال پر چمکتے دیکھ لیا تھا اپنی صاحب زادی کا عقد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کردیا۔ میاں صاحب کی صلبی اولاد میں مولانا سید شریف حسین اور ایک صاحب زادی آپ کی یادگار تھیں۔ دونوں صاحب اولاد ہوئیں ۔ (۲)

تعلیم سے فراغت کے بعد میاں صاحب نے اورنگ آبادی مسجد میں اپنا حلقہ درس قائم کرلیا تھا۔ آپ کے تبحر علمی کی شہرت کے ساتھ مدرسہ اورنگ آبادی مسجد کی شہرت بھی ملک میں پھیلتی گئی اور شاہ اسحاق صاحب کی ہجرت کے بعد تو اس مدرسے کو دھلی میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ میاں صاحب کامل ساٹھ سال تک خدمت درس و تدریس حدیث میں مصروف رہے ۔ سینکڑوں بندگان خدا نے آپ کی ذات فیض مآب سے استفادہ

---

(۱) اشرف علی تھانوی (مرتب) " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۱۷۷

(۲) فضل حسین بہاری " الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا ، صص ۵۳ و ۵۲-۵۳۹

کیا اور ملک کے طول و عرض اور بیرون ملک کشمیر، افغانستان، خراسان، نجد، یمن، کاشغر، اندلس سندھ، برما، جاوا وغیرہ ممالک میں آپ کے تلامذہ نے مدارس و مکاتب قائم کرکے کتاب و سنت کی شمعیں روشن کیں۔ (۱) "مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا سید نذیر حسین صاحب کے ذریعے سے اہل حدیث کے سلسلے کو بڑی ترقی ہوئی ۔ موصوف کے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ انہوں نے ملک کے گوشے گوشے میں پھیل کر اپنے طریقے کی اشاعت کی ۔" (۲)

"الحیاۃ بعد المماۃ" میں پانچ سو کے قریب آپ کے ارشد تلامذہ کے نام لکھے ہیں لیکن یہ فہرست مکمل اور قطعی نہیں کہی جاسکتی ۔ جیسا کہ "معیار الحق" کے مرتبہ نے کہا ہے "کہ یہ تعداد اسی حدتک محدود نہیں ہوسکتی ۔ مولانا عبدالحی کا اندازہ تو ایک ہزار تک کا ہے" ۔(۳) لیکن اس سے زیادہ جامع فہرست تلامذہ ابھی کوئی اور مرتب نہیں ہوئی ۔ میاں صاحب کے تلامذہ کے مجمع میں مختلف استعدادات و کمالات کے بزرگ تھے۔ ان میں محدث و مفسر، معلم و مدرس، مبلغ و مرشد، واعظ و مناظر، مصنف و محقق اور مبصر و مدبر پیدا ہوئے اور اپنے اپنے خاص میدانوں میں شہرت دوام کے مالک ہوئے ۔(۴)

میاں صاحب کا خاص ذوق درس و تدریس تھا۔ ان کا درس ان کے فیضان کا سرچشمہ تھا۔ ان کی جلالت علمی اور خدمات عظیمہ کی بنیاد یہیں تلاش کرنی چاہیے لیکن تصنیف و تالیف کا میدان بھی ان کے کمالات علم و فضل اور محاسن فکر و نظر کی جولاں گاہ بنا ہے ۔ انہوں نے ضرورت کے شدید مواقع پر بعض اہم موضوعات پر قلم اٹھایا اور ان کے

---

(۱) فضل حسین بہاری، "الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا، ص ۲۰۳-۲۶۲
حنیف یزدانی (مرتب)، "معیار الحق"، محولہ بالا، ص ۵۳-۳۵۱
خلیق احمد نظامی، "تاریخی مقالات"، محولہ بالا، ص ۲۵۳

(۲) سلیمان ندوی، سید، "حیات شبلی"، محولہ بالا، ص ۳۶

(۳) عبدالحی، مولانا سید، "نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۵۰۰
حنیف یزدانی، محمد (مرتب)، "معیار الحق"، محولہ بالا، ص ۳۵۱

(۴) ایضاً، ص (بعینہ لفظ)

فیضان نگہ فکر و نظر سے کتاب و سنت کے پھول کھلتے چلے گئے۔ ان کی تصانیف پر قرن گزرچکے ہیں لیکن ان کے فکر کی خوش بو آج بھی مشام روح اسلامی کو معطر کر رہی ہے ۔ مولوی فضل حسین نے آپ کے رسائل ، فتاوی اور تصانیف کی تعداد ۵۷ گنائی ہے ۔ لیکن اس میں بیشتر تعداد ان کے فتووں کی ہے جو اب " فتاوی نذیریۃ" میں جمع ہوگئے ہیں۔ ان کی مستقل تصانیف میں " دافعۃ البلوی" واقلۃ الفتی" ، " ثبوت الحق الحقیق " ، " فلاح الولی باتباع النبی"، " ابطال عمل المولد"، " آداب الشریعۃ" ، " معیارالحق" وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔(۱) ان میں سے اکثر کتابیں کئی کئی بار شائع ہوچکی ہیں ۔ ان کی ذات کی شرافت اور ان کے نطق کی نفاست ان کی تحریر میں بھی موجود ہے ۔ متعدد کتابیں ان کی تصانیف کے جواب میں بھی لکھی گئیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی افکار، علمی دلائل اور زبان و بیان کی صفائی اور متانت میں کوئی کتاب ان کی مصنفات کا پاسنگ بننے کے لائق بھی نہیں۔ میاں صاحب کی تعلیم و تربیت اور ان کے فیضان فکر و نظر نے جو اہل قلم پیدا کئے اور پھر انھوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں اور دینی مسائل پر گزشتہ ایک صدی میں جو کچھ لکھا ہے وہ تعداد و معیار اور موضوعات کے تنوع ہر لحاظ سے اتنا ہے کہ اس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے لیکن ہم اسے برصغیر میں مسلمانوں کی علمی، دینی ، تہذیبی تاریخ کا ایک عظیم الشان باب ہی تصور کرتے ہیں۔

سرسید نے میاں صاحب کی استعداد کامل ، فقہ میں ان کے تبحر اور روایت حدیث

---

(۱) فضل حسین بہاری، " الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا ، ص: ۲۰-۵۵۷
عبدالحی، مولانا سید ،" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج۸، ص: ۵۰۰
ایوب قادری،مرتبہ ،" تاریخ قنوج" از نواب صدیق حسن خان، ص ۳۰۷، بحوالہ ماہنامہ " سرحد"، کراچی :جون جولائی، ۱۹۷۳ء ، ص: ۶۵
بشیرالدین احمد دھلوی، " واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص: ۲۶۳
خلیق احمد نظامی، " تاریخی مقالات"، محولہ بالا ، ص: ۲۵۳
خلیق احمد نظامی، " ۱۸۵۷ء ، کا تاریخی روزنامچہ"، محولہ بالا ، ص: ۲۰۵

میں ان کے بے نظیر ہونے کا اعتراف کیا ہے -(۱)

عبداللطیف نے اپنے روزنامچے میں ۱۲ محرم ۱۲۷۴ھ / ۳ ستمبر، ۱۸۵۷ء کو لکھا ہے:

" حدیث میں انھوں نے مجتہد کا مرتبہ حاصل کیا ہے ، فقہ و اصول میں کافی کمال بہم پہنچایا ہے - علم تفسیر میں بے مثال ہیں- موجودہ زمانے میں علم و عمل میں بے نظیر ہیں- شب بیدار اور ذکرکار ہیں - بے شبہ عبادت الٰہی میں انھوں نے بزرگی حاصل کی ہے - معرفت خداوندی میں بھی عظمت پائی ہے-"(۲)

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے :

" مولانا سید نذیر حسین مرحوم ہندوستان میں درس حدیث کے آخری امام تھے-" (۳)

مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے"کہ وہ مولانا شاہ اسماعیل کی جماعت کے احیا کے سوا اور کوئی مقصد نہیں رکھتے تھے(۴) - گویا کہ ان کی زندگی کا نصب العین تعلیم کتاب و حکمت اور احیا سنت یا حیات مستعار کا سرعنوان " ادخلوا فی السلم کافہ " تھا-"

مولانا سندھی ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :

" حزب صادق پوری کے اکابر ائمہ میں سے ایک شیخ الاسلام سید نذیر حسین بہاری ثم دھلوی ہیں.... آپ نہایت ذہین اور ذکی تھے اور آپ کی ذات علوم نقلی، علوم عقلی اور ادبیات سب کی جامع تھی - آپ اپنے استاد مولانا اسحاق کے تتبع میں حنفی فقہ کے مطابق فتوے دیتے تھے- فتاوی عالم گیری پر آپ کی اتنی نظر تھی کہ گویا یہ آپ کو از بر یاد تھے - ... ۱۲۷۴ھ کے بعد آپ مستقل طور پر خود اجتہاد فرماتے اور اکثر معاملات میں شاہ اسمعیل شہید

---

(۱) سرسید احمد خان، آثار الصنادید"، محولہ بالا، ص۱۰۸-۱۰۷

(۲) خلیق احمد نظامی، " ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ "، محولہ بالا، ص ۱۷۰

(۳) آزاد ، مولانا ابوالکلام ، " آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی"، دھلی: حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۸ء ، ص ۱۰۲

(۴) عبید اللہ سندھی، مولانا، "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۱۱۷

کا تتبع کرتے۔" (۱)

علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی ان کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ " مولانا سید نذیر حسین صاحب کے ذریعے سے اہل حدیث کے سلسلے کو بڑی ترقی ہوئی۔" (۲)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی دلی ہمدردیاں مجاہدین آزادی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔ فضل حسین نے لکھا ہے کہ " فتوی جہاد پر میاں صاحب نے نہ دستخط کیا نہ مہر"۔(۳) لیکن یہ درست نہیں ۔ فتوی جہاد پر ان کے دستخط موجود ہیں۔ لیکن وہ تقسیم کار کے اصول کے سختی سے پابند رہے ۔ جہاد معرکہ کا میدان انہوں نے اصحاب عزم و ہمت کے لیے چھوڑ دیا اور خود مسجد اورنگ آبادی میں درس و تدریس کتاب و سنت کے انہماک سے سر نہ اٹھایا۔ جنگ آزادی میں میاں صاحب کے رویے کے بارے میں سرسید نے لکھا ہے:

" جن لوگوں کی مہر اس فتوے پر چھاپی گئی ہے ان میں سے بعضوں نے عیسائیوں کو پناہ دی اور ان کی جان اور عزت کی حفاظت کی ۔ ان میں سے کوئی شخص لڑائی پر نہیں چڑھا، مقابلے پر نہیں آیا، اگر واقع میں وہ ایسا ہی سمجھتے کہ جیسا کہ مشہور ہے تو یہ باتیں کیوں کرتے؟" (۴)

۔ سرسید نے اس میں میاں صاحب کا نام نہیں لیا۔ لیکن مولوی ذکا اللہ نے اس بات کو کھول دیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" جن مولویوں نے فتوے پر مہریں کی تھیں وہ کبھی پہاڑی پر انگریز سے لڑنے نہیں گئے ۔ مولانا نذیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا و پیشوا تھے ان کے گھر میں میم چھپی بیٹھی تھی۔" (۵)

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا:" شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص: ۲۲۲-۲۳

(۲) سلیمان ندوی، مولانا سید:" حیات شبلی"، محولہ بالا، ص: ۳۶

(۳) فضل حسین بہاری:" الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا، ص: ۱۲۵

(۴) سرسید احمد خان:" اسباب بغاوت ہند"، مشمولہ " آثارالصنادید"، محولہ بالا، ص: ۲۲

(۵) " تاریخ عروج عہد انگلشیہ "، ص: ۶۷۵

اسی بنا پر مولانا عبیداللہ سندھی نے انھیں شاہ اسحاق کی جماعت کے اس گروہ میں شامل کیا ہے جو ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں غیر جانب دار تھا۔ اور ان کا رشتہ شیخ محمد تھانوی سے جوڑ دیا گیا۔(۱) یہی رائے مولانا سید محمد میاں نے اختیار کرلی ہے۔(۲)

ذکا اللہ اور مولانا عبیداللہ سندھی کی رائے کی بنیاد سرسید کا بیان ہے جس سے میاں صاحب کی ۱۸۵۷ء میں غیر جانب داری کا اظہار ہوتا ہے ۔ لیکن سرسید کے بیان کو ان حضرات کا اپنی رائے کی بنیاد قرار دینا درست نہیں ہوسکتا ۔ اس لیے کہ :

اولاً سرسید اس فتوے ہی کو جعلی قرار دیتے ہیں ۔ اگر حقیقت یہی ہے تو ہم اس فتوے پر دستخط کرنے والوں کے رویے کے بارے میں اس بنیاد پر بحث میں اپنا وقت کیوں ضائع کریں ۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم نہ کریں تو سرسید پر کذب کا الزام آتا ہے ۔ اور ایک کاذب کی روایت کا وزن معلوم۔

ثانیاً سرسید نے مباشرہ واقعہ کا بیان اور خبر کی نقل نہیں کی بلکہ یہ بات انھوں نے بطور مفروضہ بیان کی ہے اور اس سے فتوے کے جعلی ہونے پر استدلال کیا ہے۔ یعنی سرسید کا منشا یہ ہے کہ اگر فتویٰ واقعی صحیح ہوتا اور مفتیان کرام نے بخوشی دستخط کیے ہوتے تو انگریزوں کو بچانے کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ہرگز نہ ڈالتے ۔ چوں کہ ان کا عمل فتوے کے مقتضا کے خلاف تھا اس لیے فتویٰ جعلی ٹھہرا ۔

اس صورت میں ہمارے لیے کیوں کر یہ جائز ہوسکتا ہے کہ ہم سرسید کے ایک مفروضے کو واقعہ سمجھ کر ۱۸۵۷ء میں ایک شخص کے رویے کے بارے میں دوٹوک فیصلہ کردیں۔ اس

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، بحولہ بالا، ص ۱۱۷ اور ۱۲۰

(۲) محمد میاں، مولانا سید "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۴، ص ۹۲-۱۹۳

بارے میں ~~ہمارا خیال~~ واقعات کا تجزیہ یہ ہے :

۱- سرسید نے جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا۔ ان کی رائے اس کے خلاف تھی وہ انگریزوں کے پوری طرح وفادار رہے ۔ وہ اپنی رائے اور عمل میں مخلص تھے۔ لیکن جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد وہ مسلمانوں کے دفاع و تحفظ اور ملت کی بہی خواہی کے جذبے سے مجبور ہوئے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ فتوی جعلی تھا تاکہ مسلمانوں پر سے الزام بغاوت رفع ہو ۔ سرسید کا فتوے کو جعلی کہنا مصلحت کی بنا پر تھا نہ کہ امر واقعہ کے طور پر۔

۲- فتوی کے جعلی ہونے کی بابت سرسید کے بیان کو آج تک ان کے کسی تذکرہ نگار اور کسی معتقد نے بھی تسلیم نہیں کیا۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ فتوی درست تھا اور مفتیوں نے اس پر دستخط اپنی خوشی سے کیے تھے۔

۳- مولانا سید نذیر حسین ایک عالم دین اور مفتی تھے جب ان سے فتوی پوچھا گیا تو انھوں نے اسلام کے حکم واضح پر اپنی مہر ~~تصدیق~~ صورت قانون شرع ثبت کردی ۔ وہ عملی آدمی نہیں تھے کہ میدان جنگ میں بھی اترتے اور پہاڑی پر انگریزوں سے مقابلے کے لیے چڑھتے ۔

۴- جہاں تک ایک زخمی انگریز عورت کو گھر اٹھالانے اور اس کی تیمارداری کا تعلق ہے تو یہ بات قابل تعریف ہے نہ کہ لائق تعریض ! غیر اسلامی اور قابل نفرین فعل ۔ اس انگریز کا زخمی کرنا تھا نہ کہ زخمی اور دم توڑتی عورت کی جان کی حفاظت ۔ اگر میاں صاحب کو کوئی الزام دیا جاسکتا ہے تو وہ انگریز کی طرف داری کا نہیں ، بلکہ نہایت پر خطر حالات میں اسلام کے ایک حکم کو بجالانے اور اپنی جان کی پروا نہ کرکے بھی احیاء و اتباع شریعت کا ہوسکتا ہے ۔ میاں صاحب نے جو کچھ کیا وہ زمانہ جنگ میں اسلام

کے قوانین کے عین مطابق تھا۔

انگریز عورت کو پناہ دینے کا واقعہ یہ ہے کہ اگست، ۱۸۵۷ء کی آخری تاریخیں تھیں اسلام و شرع کے احکام سے بے خبر کسی مجاہد آزادی نے ایک انگریز کو زخمی کردیا۔ وہ ایک سڑک کے کنارے پڑی دم توڑ رہی تھی۔ میاں صاحب نے اسے اٹھایا ، گھر لے گئے ، اس کا علاج کیا، اس کی تیمارداری و خبرگیری کی ۔ چند ماہ کے بعد جب وہ صحت یاب ہوگئی تو اسے انگریزی کیمپ میں بحفاظت پہنچادیا۔(۱) اس وقت تک دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوچکا تھا۔ اس بات کو احناف اہل قلم نے ان کی غیر جانب داری اور انگریز پرستی کا سبب سمجھ لیا اور تعریض کی بنیاد بنالیا۔

عبداللطیف نے اپنے روز نامچے میں ۱۲ محرم، ۱۲۷۴ھ/ ۳ ستمبر، ۱۸۵۷ء کے اندراج میں میاں صاحب کے مکان پر بعض شرپسندوں کے حملے اور انہیں تکلیف پہنچائے جانے کا ذکر کیا ہے ۔(۲) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زخمی عورت کو پناہ دینے کا واقعہ ۳ ستمبر کے چند قبل پیش آیا ہوگا۔

۱۲۸۰-۸۱ھ/۱۸۶۴-۶۵ء میں وہابیوں پر انگریزوں سے بغاوت کا ایک مقدمہ چلایا گیا جو انبالہ کا تاریخی مقدمہ کہلاتا ہے ۔ اس مقدمے کی دار و گیر میں میاں صاحب کو بھی چھ ماہ تک راولپنڈی کی جیل میں رہنا پڑا ۔(۳)

مولوی فضل حسین بہاری نے قید کی مدت ایک سال بتائی ہے ۔(۴) لیکن یہ محض اندازہ ہے ۔ ڈاکٹر قیام الدین کا بیان زیادہ اعتماد کے قابل ہے ۔

۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں آپ نے حج کیا ۔ اس سفر کے موقع پر حجاز میں آپ کو

---

(۱) فضل حسین بہاری، " الحیاۃ بعدالمماۃ" محولہ بالا، ص ۲۹-۱۲۷

(۲) خلیق احمد نظامی(مرتب) " ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ"، محولہ بالا، ص ۱۷۰

(۳) قیام الدین احمد، ڈاکٹر" ہندوستان میں وہابی تحریک"، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۴ء، ص ۳۱۵

(۴) فضل حسین بہاری،" الحیاۃ بعدالمماۃ"، محولہ بالا، ص ۳۵-۱۳۳

احناف کے رویے کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن آپ ان آزمائشوں سے بھی کام یاب گزرے اور سرخ رو رہے -(۱)

۱۸۹۷ع میں ہندوستان کے لاکھوں عوام کے دلوں میں میاں صاحب کی محبت و احترام کے شدید جذبات کو محسوس کرتے ہوئے انہیں شمس العلما کے خطاب سے نوازا گیا- (۲) لیکن در حقیقت انگریزوں کی مصلحت یہ ہوگی کہ انہیں خطاب سے نواز کران کے لاکھوں اہل حدیث معتقدین کی تالیف قلب کی جائے اور انہیں انگریزوں کے خلاف، انقلاب کی راہ پر جانے سے روکا جائے - میاں صاحب نے کبھی اس خطاب پر فخر نہیں کیا انہیں اس سے زیادہ یہ پسند تھا کہ لوگ انہیں میاں صاحب کے محبت لفظ سے مخاطب کرتے ہیں اور انہیں مسلم حنیف کے اس ~~لفظ~~ خطاب پر فخر تھا جو اللہ تعالی نے مسلمانوں کو عطا فرمایا ہے -(۳)

۱۰ رجب، ۱۳۲۰ھ بہ روز دو شنبہ، مغرب کے وقت ~~(۱۹۰۲ع)~~ دہلی میں آپ نے انتقال فرمایا- اگلے روز ۱۱ رجب / ۱۳ اکتوبر، ۱۹۰۲ع کو شیدی پورہ کے قبرستان میں آپ کے صاحب زادے میاں شریف حسین کی قبر کے برابر میں آپ کو دفن کیا گیا-(۴)

سرسید سے میاں صاحب کے قریبی تعلقات تھے - سرسید نے اپنے مکتوبات و مقالات میں متعدد مقامات پر میاں صاحب کا ذکر کیا ہے -(۵) سرسید نے میاں صاحب کے علم و فضل

---

(۱) فضل حسین بہاری، مولوی، "الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا، ص ۲۳-۱۳۸
آزاد، مولانا ابوالکلام، "آزادکی کہانی خود آزاد کی زبانی"، محولہ بالا، ص ۹-۱۰۲
(۲) فضل حسین بہاری، مولوی، "الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا، ص ۸۳-۱۸۰
(۳) ایضاً، ص ۱۸۲
(۴) ایضاً، ص ۲۱۷
بشیرالدین احمد دہلوی، "واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۲۶۳
(۵) "مکتوبات سرسید"، محولہ بالا، ص ۵۰- ۲۳۹ اور ۲۹-۳۲۸ (علی الترتیب ذیل):
خط بنام مولوی محمد ابراہیم آروی، مورخہ ۱۰ فروری، ۱۸۹۵ع اور
سید محمد بخاری، مورخہ ۲۵ اگست، ۱۸۸۸ع

اور اخلاق و سیرت کے محاسن کا جن شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے وہ آپ کی نظر سے گزرچکا ہے -

میاں صاحب بھی سرسید کی رائے کا لحاظ کرتے تھے اور اپنی تمام علمی و دینی عظمت کے باوجود انھوں نے سرسید کی رائے کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔ جیسا کہ محمد ابراہیم آروی کے نام سرسید کے خط سے ظاہر ہوتا ہے - لیکن جہاں وہ قبول حق میں اتنے اعلا ظرف کے مالک تھے - حق کے اعلان اور باطل کے رد میں وہ اتنے ہی بے باک تھے اور جب سرسید کے بعض افکار کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی گئی تو سرسید سے دوستانہ روابط اور قریبی تعلقات کے باوجود انھوں نے نہایت بے باکی کے ساتھ صاف صاف اپنی رائے ظاہر فرمادی -(۱) سرسید کے خلاف جس فتوی کا ذکر مولوی کریم اللہ دہلوی کے ترجمہ پر تعلیقات میں آیا ہے اس پر میاں صاحب کے بھی دستخط تھے - اگر سرسید کو ان کی یہ روش حق پسند نہیں آئی تو اس کے لیے انھیں معذور سمجھنا چاہیے۔ سرسید لکھتے ہیں :

" ان لوگوں (یعنی بعض علما) سے اس بات کی توقع ہے کہ جب کوئی شخص دلی ہمدردی اور محبت قومی اور حب ایمانی اور خالص عشق اسلامی سے اپنی قوم کی بھلائی میں کھڑا ہو جس کے خیالات بالضرور ان تاریک خیالات سے مختلف ہوں گے تو اس کی نسبت کفر کے فتوے دینے کو موجود ہوں گے جناب شمس العلما مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی بھی " سید احمد" (یعنی سرسید) کے کفر پر مہر ثبت فرمادیں گے - اور مولوی محمد سعداللہ صاحب بھی تکفیر کے فتوؤں پر مہریں کریں گے اور اس بات کو بھول جائیں گے کہ ان دونوں صاحبوں نے کیسے کیسے فتوؤں پر مہریں کی ہیں۔ جس سے سچے مسلمان کا ایمان کانپ جاتا ہے۔ تھوڑی سی دنیا کی توقع میں کس طرح خدا کے احکام کو تحریف کیا ہے - مگر ان بزرگوں کو خیال کرنا چاہیے کہ ان فتوؤں سے کیا ہوتا ہے - بقول مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے کہ گوز شتر کے برابر بھی کچھ وقعت نہیں رکھتے - پہلے وہ

---

(۱) اسماعیل پانی پتی ، شیخ محمد (مرتب) مقالات سرسید ، لاہور ، مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء ، ج ۲ ، ص ۲۸۶-۲۸۸

خود تو مسلمان ہولیویں جب دوسروں کی تکفیر کریں :

"او خویشتن گم است کرا رہبری کند"

... جو لوگ ہماری تکفیر کا فتوی دیتے ہیں ذرا ان کو شرم کرنی چاہئے اور اپنے گریبان میں منہہ ڈالنا چاہیے - کون سی لمبی پوزیشن کے مولوی صاحب ہیں جن کے حال اور کرتوت سے ہم واقف نہیں-" (۱)

"آثارالصنادید" میں اور مولوی محمد ابراھیم آروی کے نام کے خط میں حضرت شیخ الکل کے بارے میں سرسید نے جن بلند خیالات کا اظہار کیا ہے ، ان کے بعد اس تبصرے کی حیثیت معلوم - اس لیے بھی کہ یہ جملے سرسید کے قلم سے غصے اور اشتعال کی حالت میں نکلے ہیں- ہم انھیں اس سلسلے میں معذور سمجھتے ہیں - ان کی سنجیدہ اور قابل لحاظ خیالات وہی ہیں جو "آثارالصنادید" اور آروی مرحوم کے نام خط میں درج ہیں -

میاں صاحب ایک جامع کمالات بزرگ تھے- فقہ و اصول فقہ اور حدیث پر ان کی بڑی گہری نظر تھی لیکن اسی طرح ادب میں ، معقولات میں اور تفسیر میں بھی وہ اپنے عہد کے نامور علما میں سے تھے، ذوق شعرگوئی سے بھی بے بہرہ نہ تھے -(۲) حافظہ و استحضار بھی بے مثال تھا- اس پر ان کی سیرت کے محاسن نے ان کی شخصیت کو عوام اور اہل علم میں مقبول بنادیا تھا- مولانا سید عبدالحی لکھتے ہیں :"وہ ہندوستان بھر میں علم و تقوی اور حلم میں ان کا مثیل نہیں - وہ کتاب و سنت کے ہادی و مرشد اور معلم ہیں - کتاب و سنت کی موافقت میں وہ سلف کا عقیدہ رکھتے ہیں - ان کا شمار اس عہدکے بڑے علمائے محققین میں ہوتا ہے - " (۳)

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، (مرتبہ): "مقالات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ع حصہ ہفتم ، صص ۸۸-۲۸۲

(۲) فضل حسین بہاری، مولوی: "الحیاۃ بعد المماۃ"، محولہ بالا ، ص ۳۵۲

(۳) ایضاً، صص ۷۵-۳۷۰
دیکھئے "میاں صاحب کا تبحر"

عبدالحی، مولانا سید ، "نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج۸، ص ۴۹۹

جناب مولوی ضمیرالدین شافعی مذہب ، سلمہ اللہ تعالی:

" شاگردان جناب مولانا محمد اسحاق صاحب مغفور مرحوم سے ہیں۔ کتب درسیہ خصوصاً دینیات میں بہت اچھی مہارت رکھتے ہیں ۔ باوصف کہ بسبب علوم دینی مرجع عوام و خواص ہیں۔ خصوصاً تقریب بادشاہی سے سرفراز ہیں، لیکن امر حق کے اظہار میں کچھ پاس و لحاظ مطلقاً نہیں رکھتے ۔ بالفرض اگر اس کے اظہار میں اپنا ہی نقصان ہو، پرواہ کرکے کبھی امر واجبی کو کبھی نہیں چھپاتے ۔ اس امر میں گویا شمشیر برہنہ کا حکم رکھتے ہیں۔ ایسے زمانۂ ناپرسان میں اپنا حق کو پس غنیمت ہے اور پھر قناعت اور استغنا اور متانت وضع اور سلامت روی ایسی ہے کہ کچھ بیان میں نہیں آسکتی۔" (۱)

===xxx===

تعلیقات :

مولوی ضمیرالدین ۔ آپ کے حالات کے بارے میں بھی " آثارالصنادید" واحد ماخذ ہے ۔ بشیرالدین دہلوی نے آپ کے حالات لکھے ہیں لیکن حقیقت ہے کہ " آثارالصنادید" کے حالات کی نقل ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ " واقعات دارالحکومت دہلی" کی تالیف کے وقت چوں کہ انتقال ہوگیا تھا اس لیے صرف بعض ضمائر بدل دی ہیں مثلاً سرسید کے جملے ہیں " شاگردان جناب مولانا محمد اسحاق صاحب مغفور مرحوم سے ہیں۔ کتب درسیہ و خصوصاً دینیات میں بہت اچھی مہارت رکھتے ہیں۔" بشیرالدین کے یہاں یہ جملے اس طرح آتے ہیں :

> " مولانا محمد اسحاق صاحب کے شاگرد تھے ، کتب درسیہ خصوصاً دینیات میں بہت اچھی مہارت رکھتے تھے۔" (۲)

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۱۰۸

(۲) بشیرالدین احمد دہلوی، " واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۲۱۲

لیکن اس کے بعد کے جملوں میں انھوں نے یہ زحمت بھی گوارا نہیں کی ۔ لفظ بہ لفظ " آثارالصنادید" کی نقل ہے ۔

فضل حسین بہاری(۱) ، مولانا مناظر احسن گیلانی(۲) ، اور پروفیسر انوارالحسن شیرکوٹی(۳) نے انھیں شاہ محمد اسحاق کا شاگرد بتایا ہے ۔ مولانا گیلانی کا ماخذ " آثار الصنادید " اور شیر کوٹی کا ماخذ مولانا گیلانی ہیں۔

===xxx====

<u>مولوی نوازش علی سلمہ اللہ تعالیٰ :</u>

" شاہجہان آباد کے علما کی خدمت میں کتب تحصیلی کو حاصل کیا اور حدیث نبوی کو حضرت بابرکت مولوی محمد اسحاق محدث دہلوی غفراللہ سے پڑھا ۔ استعداد کامل رکھتے ہیں۔ از بسکہ طبیعت ، ہدایت و ارشاد کی طرف مائل ہے ۔ اکثر اوقات مجلس وعظ بھی ان کے ہاں منعقد ہوتی ہے اور ساکنین شہر شاہجہان[آباد] اکثر بشوق اشتدا
و استرشاد وعظ کہنے کے واسطے اپنے اپنے گھر میں ان کو تکلیف دیتے ہیں۔ خلق و حلم میں یگانہ روزگار اور قناعت و توکل میں شہرہ آفاق ہیں۔" (۴)

<u>تعلیقات :</u>

مولوی نوازش علی موضع ہاڑی(تحصیل کھتھل ، ضلع کرنال) کے رہنے والے تھے ۔(۵)
نواب صدیق حسن خان نے انھیں پانی پتی(۶) اور مولانا عبدالحی نے انھیں دہلوی لکھا ہے۔(۷)

---

(۱) فضل حسین بہاری، الحیاۃ بعد المماۃ" ، محولہ بالا ، ص ۵۰
(۲) مناظر احسن گیلانی، مولانا، " سوانح قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۲۲
(۳) انوارالحسن شیرکوٹی، پروفیسر، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۷۹
(۴) سرسید احمد خان، " آثار الصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۱۳۱
(۵) " تذکرہ حالی"، ص ۳۰
صالحہ عابد حسین، " یادگار حالی"، دہلی : انجمن ترقی اردو (ہند) ، ۱۹۷۵ع ، ص ۳۰
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتبہ) ، " کلیات نظم حالی"، لاہور : مجلس ترقی ادب، جولائی، ۱۹۶۸ع ، ج اول ، (ترجمہ حالی) ، ص ۵۰ (حاشیہ)
(۶) ایوب قادری، محمد (مرتبہ)، " تاریخ قنوج"، محولہ بالا ، ص ۱۱۳
(۷) عبدالحی، مولانا سید، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۵۰۹ اور ج ۸، ص ۲۲

فراغت تعلیم کے بعد ان کی بھی زندگی سوائے ایک سال کے دہلی میں بسر ہوئی دہلی میں انتقال ہوا اور دہلی میں پیوند خاک ہوئے۔ پانی پت، ضلع کرنال ہی کا ایک قصبہ ہے اور علمی شہرت میں ہانسی اور کیتھل تو کیا کرنال سے بھی زیادہ متعارف ہے۔اس لیے انہیں دہلوی کہنا غلط نہیں اور پانی پتی کہنے کا جواز موجود ہے - ہمیں ان کے خاندان ابتدائی زندگی اور ابتدائی کتب کی تحصیل کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں - دہلی کے حلقے میں شاہ اسحاق سے تلمذ فی الحدیث کی بنا پر متعارف ہوئے - اس کے بعد ان کی شہرت ایک مستعد مدرس اور واعظ کی حیثیت سے ہوئی - مولانا عبدالحی نے ان کا مستقل ترجمہ لکھا ہے لیکن یہ آثار کے بیان کا ملخص ترجمہ ہے - کوئی نئی اور زائد بات نہیں ہے - (۱)" واقعات دارالحکومت دہلی " میں ان کا صرف نام آیا ہے -(۲) اور صاحب " حیاۃ بعد المماۃ" نے شاہ اسحاق صاحب کے تلامذہ میں ان کا نام درج کیا ہے-(۳)

شروع میں اپنا آزاد حلقہ درس رکھتے تھے۔ چناں چہ ۱۸۵۰ء میں جب سرسید قائم مقام صدرامین ہوکر رہتک گئے تو مولوی نوازش علی مع اپنے طلبہ کے سرسید کے ساتھ گئے(۴) لیکن جب ۱۸۵۲ء میں حالی بغرض تعلیم دہلی گئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدرسہ حسین بخش سے وابستہ ہوگئے تھے - اس لیے کہ حالی نے اس مدرسے میں ان سے بعض کتابیں پڑھی تھیں -(۵)

مدرسہ حسین بخش ایک مسجد کے ساتھ ملحق تھا۔ مدرسے کے لیے دالان اور طلبہ

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید،" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۵۰۹

(۲) بشیرالدین احمد دہلوی،" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۲۱۶

(۳) فضل حسین بہاری، مولوی،" حیات بعد المماۃ"، محولہ بالا، ص ۵۰

(۴) حالی، خواجہ الطاف حسین،" حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۵۰۸

(۵) " تذکرہ حالی"، محولہ بالا، ص ۳۰
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر(مرتبہ)" کلیات نظم حالی"، محولہ بالا، ج اول، ص ۵
(حاشیہ)

اور مدرسین کے لیے حجرے بنے ہوئے تھے۔ یہ مسجد اور مدرسہ ایک پنجابی سوداگر حسین بخش نامی نے بنواکر وقف کیا تھا۔ پیش طاق پر " دارالہدی والوعظ ۱۲۶۸ھ، الوقف لابطلک" کندہ تھا۔ " دارالہدی والوعظ" سے تاریخ تعمیر ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ع نکلتی ہے ۔(۱) صاحب

" تذکرہ حالی" نے حالی کی تعلیم کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس زمانےمیں جامع مسجد دہلی کے قریب حسین بخش کا مدرسہ نیا نیا قایم ہوا تھا۔ مولوی نوازش علی اسی مدرسے میں درس دیا کرتے تھے۔ مولانا حالی بھی حسین بخش کے مدرسے میں داخل ہوگئے۔"

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حالات میں بھی نوازش علی کی مسجد اور ان کے طلبہ کا ذکر آیا ہے ۔ جس محلے میں مولانا مملوک علی رہتے تھے اسی میں مولانا نوازش علی کی مسجد تھی۔ مسجد کے قریب کے باعث مولانا قاسم اس میں نماز پڑھنے جاتے تھے۔ مسجد میں طالب علموں کا مجمع تھا۔ جب کسی مسئلے پر بحث چھڑ جاتی تو مولانا قاسم صاحب سب پر غالب آتے تھے۔ (۲)

صاحب " تذکرہ حالی" کے مطابق مولوی نوازش علی بڑے زبردست واعظ ، متبحر عالم و فاضل اور مشہور مدرس تھے۔ (۳) معلوم ہوتا ہے کہ اس رائے کی بنیاد مولانا حالی کے مندرجہ ذیل بیان کا آخری جملہ ہے ۔ حالی اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں :

" میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش مرحوم

---

(۱) بشیرالدین احمد دہلوی،" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲، صص ۲۷-۱۲۶

(۲) محمد یعقوب ، نانوتوی،" حالات مولوی محمد قاسم"، مطبع صادق الانوار، ۱۲۹۷ھ
مناظر احسن گیلانی، مولانا ، سوانح قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۲۸
انوارالحسن شیر کوٹی، پروفیسر، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، صص ۲۶-۲۵

(۳) " تذکرہ حالی"، محولہ بالا ، ص ۳۰

سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں"(۱)

سرسید نے ان کی استعداد کامل اور خلق و حلم اور قناعت و توکل میں ان کے یگانہ ہونے کا ذکر کیا ہے ۔(۲)

مولوی نوازش علی سرسید کے استاد بھی تھے ۔ سرسید نے ان سے ۱۸۵۰ء میں پڑھا تھا۔ حالی کے بیان کے مطابق مولوی نوازش علی سے تحصیل کتب کا زمانہ سرسید کے فتح پور سے بدل کر دلی آنے کے بعد کا اور دلی سے رہتک تبدیل ہوکر جانے سے قبل کا ہے ۔ نیز مقام رہتک کا زمانہ سرسید انھیں دلی سے ساتھ لے گئے تھے۔ سرسید فتح پور سے تبدیل ہوکر ۱۸ فروری، ۱۸۴۶ء کو آئے تھے۔(۳) اور ۱۸۵۰ء میں قائم مقام صدرامین ہوکر رہتک گئے تھے۔ (۴) لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۰ء تک سرسید نے ان سے پڑھا تھا۔ یہ بات اس لیے قرین قیاس نہیں کہ جو کتابیں سرسید نے ان سے پڑھیں اور جس رفتار سے پڑھیں وہ ۳، ۲ ماہ سے زیادہ تحصیل کی نہ تھیں ۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ سرسید کا ان سے تعلیم کا زمانہ ۱۸۵۰ء کی ایک مختصر مدت ہے۔ اور اگر ۱۸۵۰ء میں ان کے رہتک تبادلے کی قطعی تاریخ کا علم ہوجائے تو قطعی طور پر مولوی نوازش علی سے استفادے کی تاریخ متعین ہوسکتی ہے ۔

---

(۱) "مقالات حالی"، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۸۵۷ء (ترجمہ حالی) ج اول، ص ۲۶۳
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر(مرتبہ) ، "کلیات نظم حالی"، (ترجمہ حالی) ، محولہ بالا، ج اول، ص ۵
خلیل الرحمن داؤدی(مرتبہ) ، "یادگار غالب" از خواجہ الطاف حسین حالی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء ، (حالات مصنف) ، ص ۱۰
حمید احمدخان، پروفیسر، (مرتبہ) "ارمغان حالی، (خود نوشت سوانح حیات)" ، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۹ء، ص ۳
(۲) سرسید احمد خان، "آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۷۲
(۳) حالی، خواجہ الطاف حسین ، "حیات جاوید"، محولہ بالا ، ج اول ، ص ۵۲
(۴) ایضاً، ج اول ، ص ۵۲

اب اس پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے کہ سرسید نے آن موصوف سے کیا کتابیں پڑھیں اور ان کی رفتار تعلیم کیا تھی۔ حالی لکھتے ہیں " کہ جس وقت سرسید فتح پور سے بدل کر دلی آئے تھے، ان کو خیال ہوا کہ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیا ہوگئی تھیں ان کو از سر نو غور اور توجہ سے پڑھنا چاہیے۔ چنان چہ انھوں نے مولوی نوازش علی مرحوم سے جو دلی میں مشہور واعظ تھے۔ اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے، کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثل قدوری و شرح وقایہ اور اصول فقہ میں شاشی ، نورالانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی -" (۱) مولانا سید عبدالحی کے بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ سرسید نے فتح پور سے دلی آنے کے بعد مولوی نوازش علی سے قدوری، شرح وقایہ، اصول الشاشی، نورالانوار اور بعض دوسری کتابیں پڑھی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں:

" ثم دخل من فتح پور الی دھلی و سنحت له فرصته لِلأخذِ والقراۃ - قرا القدوری و شرح الوقایه و اصول الشاشی و نورالانوار و بعض کتب اخری علی مولانا نوازش علی الدھلوی" (۲)

حالی کے ایک اور بیان سے بھی مولوی نوازش علی سے سرسید کے استفادے ، آپس کے تعلقات اور تحصیل علمی کے زمانے پر روشنی پڑتی ہے - حالی لکھتے ہیں :

" جس زمانے میں سرسید مولوی نوازش علی مرحوم سے دلی میں پڑھتے تھے میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دھلی بھی ان کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب سید صاحب چند روز کے لیے قائم مقام صدرامین مقرر ہوکر رہتک جانے لگے تو انھوں نے مولوی صاحب سے کہا آپ بھی رہتک چلیے۔ مولوی صاحب ھنسنے لگے اور کہا کہ میں بھلا کیوں کر جاسکتا ہوں - ایک جماعت کثیر طلبہ کی مجھ سے پڑھتی ھے - ان کو کس پر چھوڑ کر جاؤں؟ انھوں نے کہا سب طلبہ کو بھی ساتھ لے چلیے۔ مولوی صاحب کو اور زیادہ تعجب ہوا کہ اتنے طالب علم کھائیں گے کہاں سے؟ سید صاحب نے کہا آپ ان کے کھانے کا تو فکر کیجئے نہیں - خدا

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین،" حیات جاوید "، محولہ بالا ، ج اول ، ص ۵۳-۵۲

(۲) عبدالحی، مولانا سید،" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص ۳۲

رازق ہے لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ اگر آپ نہ چلیں گے تو میں رہتک جانے سے انکار کردوں گا اور اس سے آئندہ میری ترقی رک جائے گی۔ آخر مولوی صاحب کو اس کے سوا کچھ بن نہ آیا کہ وہ مع طالب علموں کی جماعت کے ان کے ساتھ ہولیے اور جب تک رہتک رہنا ہوا سب کا خرچ سید صاحب کے ذمے رہا۔" (۱)

پہلے گزرچکا ہے کہ ۱۸۵۰ء میں سرسید دہلی سے رہتک تبدیل ہوکر گئے تھے اور مذکورہ الصدر روایت سے معلوم ہوتا ہے دہلی میں مولوی نوازش علی سے استفادے کا زمانہ رہتک جانے سے متصل قبل کا زمانہ ہے ۔ نیز میر محمد مرحوم کی روایت میں سرسید کے قیام رہتک کی مدت کے لیے" چند روز "کے الفاظ آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ چند روزہ مدت ایک دو ماہ سے زیادہ طویل نہ ہوگی جو صدرامین کی رخصت وغیرہ سے پیدا ہوئی ہوگی۔ مولانا میر محمد مرحوم کی روایت ہی سے سرسید کی تحصیل کتب کی نوعیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور مزید دو کتابوں کے بارے میں علم ہوتا ہے جو سرسید نے ان سے پڑھی تھیں۔ میر صاحب مرحوم بیان کرتے تھے :

" جس زمانے میں سید صاحب دہلی سے رہتک بدل کر گئے ، میں بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔ وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی سے جن کو دلی سے ہم راہ لے گئے تھے سبق پڑھتے تھے۔ بیس بیس ، بائیس بائیس صفحے شرح جامی اور قطبی کے وہ ہر روز پڑھ لیتے تھے ۔ میں بھی ان کے ساتھ پڑھنےکے لیے گیا تھا۔ مگر اس رفتار سے ان کے ساتھ نہ چل سکا اور واپس دلی چلا آیا۔" (۲)

اس بیان سے مدت قیام رہتک پر بھی ہلکی سی روشنی پڑتی ہے ۔ یعنی نہ چل سکنے کا فیصلہ ۱۰، ۱۵ دن کے تجربے اور کوشش میں ناکامی کے بعد کیا ہوگا اور سرسید سے پہلے اس لیے واپس چلے آئے ہوں گے کہ ان کا قیام مزید ایک آدھ ماہ تک طویل ہوگا۔

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولۂ بالا ، ج ۲، ص ۵۰۸

(۲) ایضاً، ج ۲، ص ۳۵۸

"تاریخ قنوج" سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد حکام کو مولوی صاحب نوازش علی کی تلاش تھی اور ان کی گرفتاری کے لیے اشتہار جاری تک ہوگیا تھا۔ لیکن عین وقت پر ان کے ایک شاگرد شیخ عبدالقادر ساکن کلکتہ کی دستگیری کام آئی وہ انہیں ٹونک لے گئے لیکن ٹونک میں ان کے لیے ایک نیا حلقہ دام تیار تھا اس سے بچانے کے لیے انہیں سید محمد زکریا نامی ایک صاحب کے مکان میں چھپادیا اور یہ سلسلہ دو تین سال تک طویل رہا۔ نواب صدیق حسن خان نے ان کا صرف یہی ایک واقعہ نقل کیا ہے :

" در وقتیکہ فتنہ ہندوستان افتاد۔ بنا بر بعض وجوہ حکام وقت مولوی نوازش علی صاحب منظور شد و اشتہار گرفتاری شان نفاذ یافت ۔ ایشان (شیخ عبدالقادر ساکن کلکتہ) بعلاقہ تلمذ سابق درآن وقت کہ عزیزان بیگانہ شدہ بودند ایشان نزد مولوی صاحب مذکور رسیدہ و حق تلمذ برآوردہ ، اوشان را بریاست ٹونک کشیدند ، چون درین جانیز ہنگامۂ دار و گیر اہل بغاوت از جانب رئیس گرم بود ، بناء " علیہ مولوی صاحب را بخانہ سید محمد زکریا صاحب مرحوم روپوش کردند۔ چنان چہ دوسہ سال ہم برین منوال درآن خانہ پنہان ماندند"(۱)

اس بیان سے ضمناً باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا تعلق مجاہدین آزادی سے تھا ، خواہ انہوں نے جنگ آزادی ، ۱۸۵۷ء میں کسی حیثیت سے اور کسی قدر بھی حصہ لیا ہو۔ الحمد للبیہ علی احسانہ کہ وہ انگریز سے بغاوت کے مجرم تھے۔ دوسری یہ کہ وہ ۱۸۵۷ء کے تقریباً تین سال بعد تک ضرور زندہ تھے۔

اوپر جو روایات و بیانات نقل کیے گئے ہیں ان سے ان کے چار شاگردوں کا بھی علم ہوجاتا ہے ۔ ان میں سے سرسید احمد خاں ، خواجہ الطاف حسین حالی ، مولانا میر محمد ،

---

(۱) ایوب قادری ، محمد (مرتبہ) ، " تاریخ قنوج " ، از نواب صدیق حسن خان ، محولۂ بالا ، ص ۱۱۲

امام جامع مسجد دہلی نہایت نامی گرامی ہوئے ۔ شیخ عبدالقادر ساکن کلکتہ کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ۔ لیکن ان کی سیرت کی عظمت کے یہ لیے یہ بات کفالت کرتی ہے کہ انھوں نے ایسے وقت میں حق تلمذ ادا کیا جب کہ بقول نواب صاحب " عزیزان بیگانہ شدہ بودند ۔"

===xxxx====

جناب مولانا مولوی محمد نورالحسن سلمہ اللہ تعالی :

" فضائل پناہ کمالات دستگاہ ، رنگ چہرہ فضیلت آب روی شریعت ، دقائق آگاہ حقایق و معارف پناہ خازن گنجینۂ اسرار ازل جامع شرائف علم و عمل ، ارسطو فطرت فارابی فطنت، بانی مبانی فضل و افضال ، موسس اساسی تکمیل و اکمال ، قطب سمائے ہدایت و ارشاد منطقۂ فلک راستی و سداد ، عضادۂ اصطرلاب دانش و حکم بہ نکتہ سنجی ہا معروف بدقیقہ فہمی علم موشگاف دقائق علم و فن مولوی محمد نورالحسن ، سلمہ اللہ تعالی، شاگرد رشید مولانا محمد فضل حق زادت فضلیتہ ۔ کمالات علم اور فضائل خلق و حلم میں یگانۂ روزگار حدت ذہن اور رسائی فہم میں یکتا ئے قرین داد دار ، فاضل اجل سرگروہ فضلائے کمل ، خلق جبلی سے بہین فرود افراد امت محمدی ، اور سعادات ذاتی سے سرگروہ عزد یکان بارگاہ صمدی ، اس جز و زمان میں معقول و منقول میں ایسی مہارت تامہ رکھتے ہیں کہ اگر موجودگی کے معدوم اور جائز کے ناجائز ہونے کا دعوا کریں تو خصم کو بدلیل عقلی و نقلی دل نشین کرسکتے ہیں۔ وجود ایسے فرد کامل کا ایسے روزگار نا پرسان میں دلیل قدرت کاملہ پروردگار ہے ۔ کمالات ظاہری تو آپ کی ذات بابرکات میں جس طرح مجتمع ہیں وہ تو نہایت ظہور اور بکمال غایت وضوح سے احتیاج بیان کی نہیں رکھتے جلائل باطنی اور شرایف معنی جس قدر ان کی طرف استعداد میں فراہم ہیں ، اگر خامۂ دو زبان ان کے بیان میں سرگرم ہوتو ایک قرن تک چاہیے کہ سوا اس ذکر کے اور کسی حرف کو زبان پر نہ لایے ، تو شاید اس

کے ایک حرف کے بیان سے عہدہ برآ ہوسکے ۔ سبحان اللہ کیا خلق مجسم، علم مصور، وقار متشکل۔ خلق ایسا کہ بندگان الٰہی کی دل شکنی آپ کے اعتقاد میں خانۂ خدا کی بنیاد گرانے سے کم جرم نہیں رکھتی۔ اور علم ایسا کہ اگر اس کو ایک جگہ فراہم لاکر فرق فلک نہم پر رکھدیں تو [illegible] بہ سبب گرانی بار کے طبقات کرات کو اس طرح توڑتا ہوا پستی کو مائل ہو اور محیط کے دوسری طرف سے گذر جائے کہ اوج سے حضیض تک نگاہ کو ایک جادۂ مستقیم محسوس ہو، اور وقار اس درجے میں کہ فلک دوار کی ہزار گردشیں ان کی تمکین کی ایک نشست میں سر مو تفاوت پیدا نہیں کرسکتیں ۔ اور ان کمالات پر مزید ہے تقوی و تاری و زہد شعاری، نقل کسی صحابی کی کہ وہ کہتے تھے۔ اگر مال تمام عالم کا مجھ کو دے کر چاہیں کہ ایک اذان دہ سنیں مجھ سے نہ ہوسکے گا۔ بے کم و کاست و بے اغراق مبالغہ ان کے حق میں صادق آتی ہے ۔ بمقتضائے اس کے کہ :

" بدان را بہ نیکان بہ بخشد کریم "

راقم آثم کے حال پر ان حضرات کی نگاہ توجہ کو ایسا مصروف کردیا ہے کہ بدرجہ غایت نظر تربیت استادانہ [illegible] سے منظور [illegible] فرماتے ہیں تاکہ شاید یہی نظر عنایت بارگاہ کریم میں اس احقر کی نجات کا سبب ہوجایے ۔ کوتاہ شب و فسانہ بسیار۔ زبان قلم قاصر ہے ، کہاں تک کہیے۔ اگر زمانہ مساعد ہوگا تو ایک دفتر علاحدہ ان سرگروہ کملائے دھر کے محامد میں لکھوں گا ۔" (۱)

<u>تعلیقات :</u>

مولانا نورالحسن ۲۶ ربیع الثانی، ۱۲۲۷ھ/ ۹ مئی، ۱۸۱۲ع کو کاندھلہ (ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام مولانا ابوالحسن اور جد محترم کا اسم گرامی

---

(۱) سرسید احمدخان، " آثارالصنادید "، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۲۶-۱۲۳

مفتی الٰہی بخش تھا۔ (۱) ان کا سلسلہ نسب امام فخرالدین رازی سے ہوتا ہوا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ (۲) ابتدائی کتابوں کی تحصیل اپنے والد اور دادا کی خدمت میں کی۔ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۲ء میں جب کہ ان کی عمر تقریباً بیس برس کی تھی دہلی گئے اس وقت تک وہ قرآن مجید کے حافظ ہوچکے تھے اور والد اور دادا کے سے کتابوں کی تحصیل کرچکے تھے۔ سرسید اور مولانا عبدالحی نے دہلی میں صرف مولانا فضل حق سے ان کے استفادے کا ذکر کیا ہے۔ (۳) لیکن مولوی احتشام الحسن کاندھلوی کی روایت کے مطابق انھوں نے شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی اور مفتی صدرالدین سے بھی علوم و فنون کا اکتساب کیا۔ (۴) فضل حق خیرآبادی سے معقولات کی اور خاتم المحدثین شاہ محمد اسحاق دہلوی سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ (۵) حضرت مفتی صدرالدین نے ابتداء میں وقت نہ ہونے کا عذر کیا لیکن ان کے اصرار پر کچہری جاتے اور آتے ہوئے راستے میں پڑھانے پر آمادہ ہوگئے۔ مولوی مظفرالحسن راستے میں پڑھتے ہوئے جاتے، کچہری کے اوقات میں انتظار کرتے اور کچہری سے واپس آتے ہوئے سبق مکمل کرتے۔ ان کے اس ذوق طلب اور

---

(۱) سفینۂ رحمانی، ص ۸۵

احتشام الحسن کاندھلوی، مولوی، "حالات مشائخ کاندھلہ" دہلی: ادارہ اشاعت دینیات، ۱۳۸۳ھ، ص ۱۲۷

(۲) عبدالحی، مولانا، سید، "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۷۰

(۳) سرسید احمد خان، "آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چہارم، ص ۷۰

عبدالحی، مولانا سید، "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۵۱۱

(۴) احتشام الحسن کاندھلوی، مولوی، "حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا، ص ۱۳۷

(۵) ایوب قادری، محمد (مرتب و مترجم)، "تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا، ص ۲۶۸

"سفینۂ رحمانی"، محولہ بالا، ص ۸۵

شوق علم سے مفتی صاحب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ۔ اب مفتی صاحب نے انھیں گھر پر پڑھانا شروع کیا اور ان سے بہت محبت کرنے لگے ۔(١)

مولانا نورالحسن اور ان کے خاندان کا شاہ ولی اللہ کے خانوادے اور ان کی تحریک سے خاص تعلق تھا۔ خاندان کے تقریباً تمام علمی افراد اسی خانوادۂ علم و ارشاد سے نسبت تلمذ اور بعض تعلق بیعت بھی رکھتے تھے۔ ان کے دادا مفتی الٰہی بخش شاہ عبدالعزیز کے نامور شاگرد اور خلیفہ مجاز بیعت و ارشاد تھے۔ (٢) ان کے بھائی مولانا امام الدین مولانا کمال الدین اور مولانا محمود بخش بھی شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ (٣) مفتی صاحب کے صاحب زادے مولانا ابوالقاسم (مولانا نورالحسن کے سگے چچا) سید احمد شہید سے بیعت تھے۔(٣) مولانا مظفر حسین ابن مولانا محمود بخش (مفتی صاحب کے بھتیجے) " نزهتہ الخواطر" کے مطابق مولانا شاہ محمد یعقوب کے شاگرد اور سید احمد شہید کے مرید تھے۔ جب کہ " حالات مشائخ کاندھلہ" کے مطابق شاہ محمد اسحاق کے شاگرد اور شاہ محمد یعقوب کے مرید تھے۔ (٥) میرا خیال ہے کہ مولانا مظفر حسین نے ان تمام بزرگوں سے اکتساب فیض کیا ہوگا۔ مولانا مظفر حسین اس بورڈ کے رکن تھے جو شاہ محمد اسحاق کی ہجرت کے بعد دھلی میں تحریک کی نگرانی

---

(١) احتشام الحسن کاندھلوی، مولوی: " حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا ، ص ١٣٧

(٢) عبدالحی، مولانا سید: " نزهتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ٧، ص ٧٠
سید احمد ولی اللهی، مولوی ظهیرالدین: " کمالات عزیزی"، لاهور: اسلامی اکیڈمی، س ن، ص ٩ و ٣٣
اشرف علی تھانوی، مولانا: " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ٢٢-٢١١

(٣) ایضاً، ص ٧٦
احتشام الحسن کاندھلوی، مولوی: " حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا ، ص

(٣) ایضاً، ص

(٥) عبدالحی، مولانا سید: " نزهتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ٧، ص ٣٨٣
احتشام الحسن کاندھلوی، مولوی: " حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا ، ص

اور کام کو جاری رکھنے کے لیے قائم کیا تھا۔ (۱) اور سب سے آخر میں خود مولانا نورالحسن شاہ محمد اسحاق اور خانوادہ ولی اللہی کے دو اور ارشد تلامذہ حضرت مفتی صدرالدین آزردہ اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ (۲)

سرسید نے مولانا نورالحسن سے جو کمال عقیدت و ارادت کا اظہار کیا ہے اس کی وجہ ان کے علم اور سیرت و اخلاق کے ذاتی خصائص کے علاوہ ان کے خاندان کے یہ امتیازات اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان رفیع الارکان سے ان کی یہ نسبتیں بھی تھیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ آگرے میں منصف مقرر ہوگئے تھے۔ یہ ۱۸۴۶ء سے قبل کی مدت ہے۔ (۳) اسی زمانے میں سرسید نے ان سے استفادہ کیا اور اپنے تین رسائل کی ان سے تصحیح و نظر ثانی کروائی۔

جنوری ۱۸۳۶ء میں انھیں دیوبند میں قائم مقام نائب تحصیل دار کی اسامی مل گئی۔ پھر کچھ عرصے کے بعد ضلع سہارن پور میں تحصیل دار مقرر ہوگئے۔ لیکن چوں کہ ان کا خاص ذوق درس و تدریس تھا اس لیے ملازمت کو خلاف طبیعت پاکر چھوڑ دیا اور ریاست الور میں ملازمت کرلی۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد جب آگرہ کالج میں عربی کی پروفیسری کی جگہ مل گئی تو اس ملازمت کو بھی چھوڑ دیا۔ لیکن وہ آگرہ کالج سے بھی زیادہ عرصے تعلق

---

(۱) عبیداللہ سندھی، مولانا، "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص: ۱۱۰ و ۲۱۷

محمد میاں، مولانا سید"، علمائے ہند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا، ج ۴، ص: ۲۱۰ اور ۲۸۸

(۲) سرسید احمد خاں، "آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چہارم، ص ۷۰

عبدالحی، مولانا سید، "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص: ۵۱۱

احتشام الحسن کاندھلوی، مولوی، "حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا، ص: ۱۳۷

(۳) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۵۳

قائم نہ رکھ سکے۔ ملازمت ترک کرکے کاندھلہ چلے آئے اور گھر پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔ جو ان کی وفات ۱۸۷۸ء تک جاری رہا۔ (۱)

مولوی احتشام الحسن کاندھلوی نے لکھا ہے کہ آگرہ کالج کے دوران قیام میں سرسید احمد خان نے حضرت مولانا موصوف سے تعلیم حاصل کی تھی۔ (۲) لیکن ان سے سرسید کے استفادے کا زمانہ آگرہ کالج کی مدرسی کا دور نہیں ہے۔ اس لیے کہ سرسید ۱۸ فروری ۱۸۴۶ء کو فتح پور سیکری سے تبدیل ہوکر دہلی چلے گئے تھے۔ (۳) اور مولوی صاحب موصوف ۱۸۴۷-۴۸ء میں آگرہ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ اس زمانے میں سرسید دہلی میں تھے۔ خواجہ حالی کے اس بیان سے مولوی احتشام الحسن کا نہ صرف سہو ظاہر ہوجاتا ہے بلکہ واقعہ کی تصحیح بھی ہوجاتی ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

> "مطالعہ کی عادت ابتدا سے ان کی (سرسید کی) رفیق رہی۔ جس زمانے میں وہ فتح پور سیکری میں منصف تھے۔ اس وقت مولانا نورالحسن مرحوم آگرہ میں منصف تھے۔ سرسید سے ان کی نہایت گہری دوستی تھی۔ مطالعہ کے وقت کتاب کے مشکل مقامات جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ان کے سمجھنے کے لیے وہ ہر اتوار کو، گھوڑے پر سوار ہوکر فتح پور سے آگرہ میں مولانا کے پاس آتے تھے۔ کئی برس تک بلا ناغہ ان کا یہی دستور رہا۔ وہ کہتے تھے کہ میرا گھوڑا رستے سے ایسا آشنا ہوگیا تھا کہ ایک بار آگرہ سے چھوٹ کر فتح پور اپنے تھان پر پہنچ گیا تھا۔" (۴)

حالی کے مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نورالحسن اور سرسید میں استادی شاگردی کا رسمی تعلق نہ تھا بلکہ سرسید کا ان سے دوستانہ استفادہ تھا۔ لیکن

---

(۱) احتشام الحسن کاندھلوی، "حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا، ص ۲۹-۱۲۷
(۲) ایضاً، ص ۱۲۸
(۳) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج اول، ص ۵۲
(۴) ایضاً، ج دوم، ص ۵۳-۲۵۳

" آثار الصنادید" سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ سرسید کے قلم سے ان کے کمالات کا اعتراف ایک شاگردانہ نذر ہے -(۱) اور استاد کی غایت نظر تربیت سے اس کے قبول کی امید رکھتے ہیں - لیکن سرسید نے ان سے تلمذ کا اعتراف استعارۃً میں نہیں صاف صاف الفاظ میں کیا ہے - اور ان کے ذکر میں "استاذی" اور "اپنے استاد" کے الفاظ سے یاد کیا ہے -
"جلاء القلوب بذکر المحبوب" کے خاتمے میں رسالے کی اصلاح کے بارے میں لکھتے ہیں :

" .... اور جناب استاذی اعلم العلما ، افضل الفضلا مولانا نورالحسن صاحب سلمہ اللہ تعالی کی اصلاح سے درست ہوا -" (۲)

سرسید نے یہ رسالہ ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء میں تالیف کیا تھا -

ایک اور رسالہ " تسہیل فی جرالثقیل" کے آغاز میں لکھتے ہیں :

" میں نے ۱۲۵۹ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مطابق ۱۸۴۳ء علی صاحبہا علیہ الصلوۃ والسلام ، میں اس رسالے کے قواعد کا اردو میں ترجمہ کیا اور اپنے استاد جناب مولوی محمد نورالحسن صاحب سلمہ اللہ تعالی کی اصلاح سے صحیح اور درست کیا اور اس رسالے کا نام تسہیل فی جرالثقیل رکھا -" (۳)

سرسید کا مشہور رسالہ "تحفۂ حسن" بھی مولانا نورالحسن کی نظر ثانی و اصلاح سے مزین ہوا تھا - سرسید لکھتے ہیں :

" اگرچہ ظاہر ہے کہ اس ہیچ مدان کو اتنی کہاں استعداد تھی کہ تحفہ (۴) کے ترجمے کا نام لیتا ، بلکہ اس کا خیال بھی دل میں لاتا - لیکن جب استادی اور ملاذی حضرت مولوی محمد نورالحسن کو اللہ تعالی سلامت رکھے اور دین و دنیا میں ان کا بھلا کرے کہ انھوں نے میرے دل کو تقویت دی

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۷۰
(۲) اسمعیل پانی پتی، (مرتب) ، " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، ج ہفتم، ص ۳۰
(۳) اسمعیل پانی پتی، (مرتب) ، " مقالات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء، ج شانزدہم، ص ۷۷
(۴) "تحفہ" سے مراد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مشہور تصنیف " تحفہ اثنا عشریہ" ہے جس کے ۱۰ ویں اور ۱۲ ویں باب کا ترجمہ سرسید نے تحفہ حسن کے نام سے کیا تھا - " حیات جاوید"، محولہ بالا ، ص ۵۱

اور سب طرح کی ذمہ داری لی جب میں نے اس پر ہاتھ ڈالا اور ترجمہ کا ارادہ کیا ۔ شکر خدا کا کہ یہ سارا ترجمہ ان کی اصلاح سے درست ہوا اور ان کے ملاحظے سے گزرا ۔ اب اللہ سے یہ امید ہے کہ سب کو پسند آوے اور اس کے سبب سے لوگوں کو ہدایت ہووے اور مجھے اور مولانا کو ثواب ملے۔" (۱)

سرسید نے سیرت میں ایک اور اردو رسالہ لکھ کر بھی مولانا نورالحسن کے پاس اصلاح کے لیے بھیجا تھا۔ مولوی احتشام الحسن کاندھلوی کے بیان کے مطابق یہ رسالہ سرسید کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے پاس موجود ہے - (۲)

ان اقتباسات کے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ سرسید نے ۱۸۴۲ء سے قبل مولانا نورالحسن سے تحصیل علمی کی تھی ، ۴۲ سے ۴۶ تک اپنی تین تحریروں پر اصلاح لی تھی اور یہ زمانہ قیام فتح پوری ان سے بعض کتب کے مشکل مقامات کو حل کیا تھا۔ اور انھیں تعلقات کا نتیجہ تھا کہ مولانا نورالحسن نے زمانہ طالب علمی کے بعد دہلی میں سکونت اختیار نہیں کی وہ " آثارالصنادید " کی تالیف کے وقت وہ دہلی میں موجود تھے۔ لیکن دہلی کے اکابر علما میں ان کا ذکر کیا ۔ یہ بات سرسید کی روا داری کی مثال ہے ، بلکہ نہ صرف " آثارالصنادید " میں نہایت تھاٹھ مداحانہ ترجمہ لکھا بلکہ بقول مولوی احتشام الحسن کاندھلوی نہ صرف سرسید نے بلکہ ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی مولانا نورالحسن کے خاندان کے ساتھ ان تعلقات رواداری کو بہت حسن و خوبی کے ساتھ نبھایا۔(۳)

مولانا نورالحسن کے تلامذہ میں سرسید احمد خان کے علاوہ وقت کے کئی مشاہیر اہل علم شامل ہیں۔ ان میں مولانا حافظ عبداللہ بلگرامی(۴) ، مولانا محمد سورتی ،

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، (مرتب) " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، (تحفہ حسن) ج شانزدہم، ص ۲۸۷

(۲) احتشام الحسن کاندھلوی ، " حالات مشائخ کاندھلہ" محولہ بالا ، ص ۱۳۹

(۳) ایضاً ، ص ۱۳۸

(۴) ایوب قادری ، محمد (مرتب و مترجم) " تذکرہ علمائے ہند "، محولہ بالا ، ص ۲۶۸

مولانا مملوک علی نانوتوی، مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولانا احمد حسن مرادآبادی اور آپ کے چاروں فرزند جن کے نام آگے آتے ہیں نہایت شہرت کے مالک ہوئے ۔(۱)

مولانا نورالحسن کے چار بیٹے تھے چاروں نے ان سے فیض علمی بھی حاصل کیا۔ سب سے بڑے مولانا محمد شہاب الحسن عرف محمد صادق تھے ، منجھلے بیٹے مولانا حکیم محمد ظہورالحسن عرف محمد ابراہیم تھے، تیسرے صاحب زادے مولانا محمد فیض الحسن عرف محمد اکبر تھے اور سب سے چھوٹے صاحب زادے کا نام مولانا محمد ریاض الحسن عرف محمد سلیمان تھا۔(۲) تیسرے صاحب زادے مولانا محمد اکبر علی گڑھ کالج میں استاد اور بورڈنگ ہاؤس کے مہتمم تھے۔ اور والد سے سرسید کے دوستانہ روابط کا لحاظ کرتے ہوئے سرسید کو عم بزرگ وار کہتے تھے۔(۳) بدرالحسن اور علاء الحسن مولانا محمد اکبر کے بیٹے تھے۔ دونوں نے علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی تھی ۔ بدرالحسن کالج کے ٹرسٹی بھی تھے ۔(۴)

۱۸۵۷ء میں مولانا نورالحسن کی ساری ہمدردیاں مجاہدین آزادی کے ساتھ تھیں۔ مولانا احمد اللہ نے تحریک کو کام یاب بنانے کے لیے جو مجلس قائم تھی اس میں مولانا نورالحسن کا نام بھی شامل تھا۔ (۵)

ان کی تصانیف و تحریرات میں " ہدایۃ اولیٰ " اور " دیوان متنبی پر حاشیہ" کے علاوہ

---

(۱) احتشام الحسن کاندھلوی، " حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا ، صص ۵۱-۱۵۰

(۲) ایضاً ، ص ۵۱-۱۵۰

(۳) ایوب قادری ، محمد ، " سرسید احمد خان کے رفقا خود ان کی نظر میں" ، " برگ گل" ، (میگزین) ، کراچی : وفاقی اردو کالج ، ۶۹-۱۹۶۸ء ، (سرسید نمبر) ، ص ۳۳۷

(۴) احتشام الحسن کاندھلوی، " حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا ، ص

(۵) شہابی، مفتی انتظام اللہ ، " غدر کے چند علما " ص ۹۲
محمد میاں ، مولانا سید ، " علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۴ ، ص ۳۶۱
احتشام الحسن کاندھلوی، " حالات مشائخ کاندھلہ"، ص ۱۲۲

ماتہ مسائل جو شاہ اسحاق صاحب کی طرف منسوب ہے ۔ درحقیقت آپ ہی کی تصنیف ہے۔ نیز عربی میں ایک بے نقط رسالہ ریاست الور کے حالات میں یادگار ہے ۔(۱)

دسمبر، ۱۸۶۰ء / ۱۲۷۷ھ میں مولانا نورالحسن حج کے لیے تشریف لے گئے ۔ اس سفر میں مولانا مظفر حسین کاندھلوی ، مولانا محمد یعقوب نانوتوی ، حافظ عابد حسین اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی انھیں ہم راہی حاصل تھی۔ ۱۸ دسمبر، ۱۸۶۱ء کو وہ واپس وطن پہنچے ۔(۲) حج سے واپسی کے بعد پھر درس و تدریس میں مصروف ہوگئے تا آں کہ ۱۱ محرم ، ۱۲۸۵ھ / ۳ مئی، ۱۸۶۸ء ، بروز سہ شنبہ ، بوقت شام پیام اجل آپہنچا اور اس دنیا ئے فانی سے دار آخرت کی طرف روانہ ہوگئے ۔ (۳)

۱۸۷۸ء میں جب سرسید اپنی تصانیف کو مرتب کر رہے تھے تو" تحفہ حسن" کے آغاز میں جہاں مولانا نورالحسن کی اصلاح اور دیگر تعاون کا اعتراف ہے ۔ اس پر سرسید نے ایک حاشیہ میں ان کے انتقال کی تاریخ ۱۱ محرم ، سن ۱۲۸۷ھجری لکھی ہے ۔(۴) لیکن یہ درست نہیں ہے ۔ کاندھلہ میں انتقال ہوا تھا اور وہیں دفن ہیں۔(۵)

سرسید نے ان کے حسن خلق اور کمال علم و فضل کا حد مبالغہ تک اعتراف کیا ہے ۔(۶) ، مولانا سید عبدالحی نے بھی انھیں حلیم و متواضع لکھا ہے اور ان کے

---

(۱) احتشام الحسن کاندھلوی، " حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا، ص ۱۶۲
(۲) ایوب قادری، محمد،" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، صص ۹۱-۱۹۰
احتشام الحسن کاندھلوی، " حالات مشائخ کاندھلہ"، صص ۲۰-۱۵۸
(۳) حیرت، حافظ عبدالرحمن " سفینۂ رحمانی"، محولہ بالا، ص ۸۶
احتشام الحسن کاندھلوی، " حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا، ص ۱۶۲
(۴) اسمٰعیل پانی پتی (مرتب) " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، ج شانزدہم، ص ۲۸۷
(۵) حیرت، حافظ عبدالرحمن " سفینۂ رحمانی" ، محولہ بالا، ص ۸۶
عبدالحی، مولانا سید " نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۵۱۱
(۶) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۷۰

کمال استحضار ، بلاغت کلام و فصاحت کلام، وضاحت عبارت اور منطق و حکمت میں ان کے تفرد کا اعتراف کیا ہے - (۱)

حافظ عبدالرحمن حیرت نے بھی ان کی متانت، ذہانت، شگفتہ تقریر ، فصاحت و بلاغت کلام اور جملہ علوم میں ان کی مہارت کا ذکر اور ان کی عبادت و ریاضت ، اور تقوی و ورع کا اعتراف کیا ہے -(۲)

***

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید ،" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۵۱۱

(۲) " سفینہ رحمانی" محولہ بالا ، صص ۸۲-۸۵

باب - پنجم

خانوادہ ولی اللٰہی کے دیگر تلامذہ

تذکرہ خانوادہ ولی اللہی کا پانچواں اور آخری باب - اس خانوادہ علمی کے بعض دیگر تلامذہ کے تراجم پر مشتمل هے - اسے علمائے دین، شعراء اطبا اور چند دیگر حضرات کے عنوان سے چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا هے - ان میں سے بعض دو واسطوں سے اور بعض تین اور چار واسطوں سے شاہ ولی اللہ محدث دهلوی سے نسبت شاگردی رکھتے هیں۔ اگر طبقات کے لحاظ سے ان کی ترتیب قائم کی جاتی تو بعض ان میں سے جو بعض واسطہ شاہ ولی اللہ محدث دهلوی سے نسبت تلمذ رکھتے هیں، طبقہ چهارم میں جگہ پانے کے مستحق تھے۔ لیکن تذکرہ کی ترتیب کا جو انداز شروع هی سے پیش نظر تھا، اس کے مطابق شاہ اسحاق کے تلامذہ کے سوا ان تمام اصحاب علم و فن کے تراجم پانچویں باب میں شامل هوئے تھے، جو بیک واسطہ اصحاب ثلاثہ سے اور بہ دو واسطہ شاہ ولی اللہ سے نسبت تلمذ رکھتے هیں۔

اس باب میں فصل دوم اور سوم کے تمام تراجم وہ هیں جو سرسید نے مستقل بالذات تحریر فرمائے تھے۔ فصل اول کا متن سرسید کی مختلف تحریروں سے تیار کیا گیا هے اور فصل چهارم کی شخصیات کے بارے میں سرسید کی ایسی تحریریں هی دستیاب نهیں هوسکیں جنهیں متن کی عبارت بنایا جاسکتا - لیکن سرسید نے چوں کہ ان کے بارے میں اظهار خیال کیا تھا اس لیے انهیں نظر انداز نهیں کردیا جاسکتا تھا۔ ان شخصیات پر سرسید کی تحریروں کی روشنی میں متصل نوٹس تیار کردیے هیں - اس طرح ان اهل علم کے بارے میں بھی سرسید کے افکار/ یکجا مرتب هوگئے هیں۔

باب - پنجم

خاندان ولی اللہی کے دیگر تلامذہ

(فصل اول)

علمائے دین

جناب حاجی حافظ مولوی محمد اکبر صاحب مرحوم :

" ہم نہایت رنج اور بے انتہا غم و الم سے اس خبر کو لکھتے ہیں کہ آٹھویں جولائی، ۱۸۸۶ع : روز پنج شنبہ، مطابق پانچویں شوال، ۱۳۰۳ھجری کو جناب مولوی محمد اکبر صاحب نے بارہ بجے دن کے بمقام کاندھلہ اپنے وطن میں دفعتاً انتقال کیا اپ کی دفعہ دورۂ بواسیر میں ان کو خون زیادہ آگیا تھا مگر قبل رمضان اچھے ہوگئے تھے۔ رمضان کے روزوں نے ان کو سخت مضرت پہونچائی - گھر میں بیٹھے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے ایک ھچکی آئی اور چند منٹ میں کام تمام ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون -

ھندوستان میں جو پرانے نامی شریف خاندان ہیں ان میں سے ان کا بھی خاندان تھا - زمانۂ دراز سے ان کے آبا و اجداد اہل علم ہوتے آئے ہیں - جناب حاجی حافظ مولوی محمد نورالحسن صاحب ان کے والد بزرگ وار تھے جن کا علم و فضل کیا علم حدیث و فقہ و تفسیر میں اور کیا منطق و فلسفے میں اور کیا علم و ادب میں اس نواح میں مشہور و معروف تھا۔ ان کے پر دادا مفتی الٰہی بخش صاحب تمام ھندوستان میں اپنے فضل و کمال میں معروف و مشہور تھے جس طرح کہ وہ علوم ظاھری میں شہرہ آفاق تھے اسی طرح علم باطن میں بھی اہل باطن میں مسلم تھے۔ مولوی روم صاحب نے اپنا ساتواں دفتر مثنوی کا نہیں لکھا اور یہ پیشین گوئی کی تھی کہ کوئی دوسرا شخص اس کو پورا کرے گا - مولانا روم کی روح نے وہ مطالب ان کو القا کئے اور ساتواں دفتر انھوں نے پورا کیا۔ اس کام سے ان کی قدر و منزلت مسلمانوں میں اور بالتخصیص اہل باطن میں بہت زیادہ ہوگئی -

مولوی محمد اکبر صاحب مرحوم فی الحقیقت نہایت بزرگ اور با خدا شخص تھے ۔ علوم عربیہ میں اس زمانے میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے ۔ تمام کتابیں معقول و منقول کی اپنے والد بزرگ وار سے پڑھی تھیں اور معقول کی تکمیل تحصیل مولوی فضل حق صاحب مرحوم سے کی تھی ۔ عربی زبان کے علم و ادب میں بہت بڑی دست گاہ رکھتے تھے۔ جو مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ میں ابتدا تقرر مدرسہ سے عربی اور تعلیم مذہب اہل سنت جماعت کے پروفیسر تھے اور انتظام بورڈنگ ہاؤس بھی ان سے متعلق تھا ۔ دان رات بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے ان کی صحبت و فیض برکت کا طالب علموں پر نہایت عمدہ اثر پڑتا تھا۔ پس ان کے انتقال سے مدرسۃ العلوم کو نہایت سخت صدمہ پہونچا ہے۔ مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو ایسے شفیق استاد بزرگ ذی علم حافظ حاجی منتظم بورڈنگ ہوس اور پروفیسر کے انتقال کا جو بہ شفقت پدرانہ ان کے ساتھ پیش آتا تھا اور کمیٹی مدرسۃ العلوم کو ایسے رفیق و شفیق مدرس کے انتقال کا جس قدر ماتم ہو سب بجا ہے خدا ان کی مغفرت کرے۔

تعلیقات :

مولانا محمد اکبر، مولانا نورالحسن کے تیسرے بیٹے تھے۔ دو بھائی ان سے بڑے تھے جن کے نام مولانا محمد ضیاء الحسن عرف محمد صادق اور مولانا حکیم محمد ظہورالحسن عرف محمد ابراھیم تھا۔ چھوٹے بھائی کا نام مولانا محمد ریاض الحسن عرف محمد سلیمان تھا۔ مولانا محمد اکبر کا نام محمد فیض الحسن تھا لیکن وہ اپنے عرف محمد اکبر سے مشہور ہوئے۔ مولانا نورالحسن کے چاروں صاحب زادے عالم دین اور خاندان کی دینی و علمی روایات کے امین تھے۔

---

(۱) سرسید احمد خان: "جناب حاجی حافظ مولوی محمد اکبر صاحب مرحوم— مدرس عربی و منیجر بورڈنگ ہوس ، مدرسۃ العلوم علی گڑھ" ، (مضمون) ، "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ،علی گڑھ : ۱۳ جولائی، ۱۸۸۶ع ، ص ۔
ج ۲۱، ش ۵۶، ص ۸۰۱

مولانا محمد اکبر ۲۶ ربیع الاول، ۱۲۵۳ھ / ۳ جون، ۱۸۳۷ء کو کاندھلہ میں پیدا ہوئے - پہلے قرآن مجید حفظ کیا پھر عربی و فارسی کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے - علوم دینیہ کی تحصیل اپنے والد سے کی اور منطق و فلسفے کی تکمیل کے لیے مولانا فضل حق خیرآبادی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا- اس طرح وہ بہ دو واسطہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے نسبت تلمذ رکھتے ہیں-

مولانا محمد اکبر کو عربی ادب، منطق اور فلسفے میں خصوصی مہارت حاصل تھی- سرسید کے چوں کہ استاد بھائی تھے اس لیے سرسید نے انھیں علی گڑھ کالج سے وابستہ کرلیا تھا- مولوی احتشام الحسن کاندھلوی رکھتے ہیں :

"آپ ابتدا سے لے کر اخیر تک علی گڑھ کالج کے عربی پروفیسر اور ناظم دینیات رہے -" (۱)

سرسید نے ان کے انتقال پر "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں جو تعزیتی شذرہ لکھا تھا اس کی دوسری سرخی "مدرس عربی و منیجر بورڈنگ ہوس مدرسۃ العلوم علی گڑھ" تھی- اس شذرہ کے اندر بھی انھیں "عربی اور تعلیم مذہب اہل سنت کا پروفیسر لکھا ہے - اسی طرح سرسید کے ایک خط سے بھی کالج میں ان کے منصب پر روشنی پڑتی ہے جس میں انھیں مدرسۃ العلوم میں مدرس اور بورڈنگ ہوس کا مہتمم بتایا گیا ہے - (۲) مولوی احتشام الحسن اس سے آگے مزید لکھتے ہیں :

" طلبہ کی دینی اور اخلاقی نگرانی بہت سخت کرتے تھے اور اولاد

---

(۱) احتشام الحسن کاندھلوی، "حالات مشائخ کاندھلہ"، ادارہ اشاعت دینیات، ۱۳۸۳ھ، ص ۱۹۰

(۲) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) "مقالات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء، ج دہم، ص

(۳) ایوب قادری، محمد (مرتب)، "برگ گل" (مجلہ)، کراچی: اردو کالج، ۶۹-۱۹۶۸ء (سرسید نمبر)، ص ۳۲۷

کی طرح سب کی تربیت فرماتے تھے۔ اس بارے میں اس قدر سخت تھے کہ سرسید کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔" (۱)

مولانا احتشام الحسن نے ان کی یہ خوبی بھی بیان کی ہے :

" اپنی دین داری ، خداپرستی، غربا پروری، علم نوازی میں مشہور اور ممتاز تھے۔ اور انتظامی امور اور فہم و تدبر اور علم و فضل میں یکتا سمجھے جاتے تھے۔" (۲)

ان کی زندگی کے شب و روز درس و تدریس اور طلبہ کی نگرانی و تربیت اور دیگر انتظامی امور کی انجام دھی میں بسر ہوئے اس لیے وہ تصنیف و تالیف کی طرف پوری طرح توجہ نہ دے سکے ۔ پھر بھی ان کی زندگی تصنیف و تالیف کے کاموں سے بالکل خالی نہیں رھی ۔ انھوں نے" دیوان حماسہ " اور " مقامات حریری" پر مختصر اور جامع حواشی تحریر فرمائے ۔ ایک رسالہ" مسجد میں جماعت کے بعد جماعت ثانیہ کی کراھت کے باب میں بھی ھے ۔ اس مسئلے میں مولانا رشید احمد گنگوھی سے ان کی طویل خط و کتابت ہوئی تھی۔ احتشام الحسن کاندھلوی کے بقول انھوں نے بعض اور رسائل بھی تحریر فرمائے تھے لیکن انھوں نے ان کے نام نہیں لکھے۔(۳)

ان کی صلبی اولاد میں دو صاحب زادیاں اور دو صاحب زادے تھے۔ دونوں صاحب زادیاں ، بڑے بھائی مولانا محمد ضیاء الحسن عرف محمد صادق کے دو بیٹوں مولوی شمس الحسن اور مولوی محمد رؤف الحسن کو بیاھی تھیں۔ احتشام الحسن کاندھلوی مصنف " حالات مشائخ کاندھلہ" محمد رؤف الحسن کے بیٹے یعنی مولانا محمد اکبر کے نواسے ھیں۔ صاحب زادوں کے نام مولوی بدرالحسن اور مولوی علا الحسن تھے۔ دونوں عالم دین تھے اور

---

(۱) احتشام الحسن کاندھلوی،" حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا، ص ۱۹۱
(۲) ایضاً، ص ۱۹۱
(۳) ایضاً، ص ۱۹۱

مشائخ کاندھلہ کے اکابر میں ان کا شمار کیا گیا ہے - مولانا محمد اکبر کی بڑی صاحب زادی بھی جن کا نام ہاجرہ تھا، باقاعدہ عالم دین تھیں- انھوں نے اپنے والد سے بھی "صحاح ستہ" اور "ہدایہ" و "درمختار" وغیرہ کی تکمیل کی تھی- (۱)

مولانا محمد اکبر نے ۸ جولائی، ۱۸۸۲ء کو کاندھلہ میں انتقال فرمایا- سرسید نے ان کے انتقال پر جو شذرہ لکھا وہ اصول تذکرہ نگاری کے لحاظ سے نہایت جامع ہے - اور اس میں خاندان، تعلیم، سیرت، خدمات وغیرہ کے تمام پہلو آگئے ہیں- سرسید نے اپنے ایک خط میں بھی ان کا نہایت لطیف انداز میں ذکر کیا ہے جس سے ان کے تعلق اور کالج میں ان کی ذمہ داریوں پر بھی روشنی پڑتی ہے - سرسید لکھتے ہیں :

" ایک اور ہمارے دوست حاجی حافظ مولوی محمد اکبر صاحب ابن جناب مولانا و مرشدنا حاجی حافظ مولوی محمد نورالحسن صاحب نور اللہ مرقدہ ہیں، جو مجھ ہیچ میرز کو غم بزرگ وار کہتے کہتے ہیں - مگر حقیقت میں ہندی محاورے میں چچا بتاتے ہیں اور مدرسۃ العلوم میں مدرس اور بورڈنگ ہوس کے مہتمم ہیں- یہ تو میں نہیں کہتا کہ مجھ کو کافر جانتے ہوں گے - مگر میری حال پر افسوس تو بہت کرتے ہوں گے - ان سے کہتا ہوں کہ اجی مولوی جی کوئی مضمون تو تم بھی " تہذیب الاخلاق" کے لیے لکھ دو- وہ کہہ اچھا تو ہونے کا نہیں- مولویانہ خیال کا ہوگا- بھلا " تہذیب الاخلاق" میں برکت تو ہوگی - ہاں ہوں کرتے ہیں - خدا نے چاہا تو کبھی ان کا مضمون بھی چھپے گا-" (۲)

===xxx====

<u>مولوی محمد سمیع اللہ خان صاحب :</u>

" ہمارے اخ مخدوم و افتخار برادران مولوی محمد سمیع اللہ خان صاحب ہیں-

---

(۱) احتشام الحسن کاندھلوی، " حالات مشائخ کاندھلہ"، محولہ بالا، ص ۱۷۳، ۱۷۷ اور ۹۷-۱۹۲

(۲) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ): " مقالات سرسید"، محولہ بالا، ج دھم، ص
ایوب قادری، محمد (مرتبہ): " برگ گل" (مجلہ)، محولہ بالا، ص ۳۳۷

جو بادی و حامی اور عقل کل مدرسۃ العلوم کے ہیں۔ اگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے حتی المقدور کوئی کام خلاف شرع نہیں کیا۔ تو غالباً وہی ہیں گے ۔ ان کی ذات صفات اور دلی نیکی سے جو واقف ہے وہی ان کی قدر کرسکتا ہے ۔ با این ہمہ محبت و یگانگت شاید ہمارے ایک خیال کو بھی صحیح نہ سمجھتے ہیں گے ۔ ایسے سخت متعصب ہیں کہ ایک بھی آرٹیکل " تہذیب الاخلاق" میں نہیں لکھا ان سے کہا کہ ہدائی یہی لکھ دو کہ خدا ایک ہے ، یہ لکھنا بھی گناہ سمجھا ۔

نعوذ باللہ منہا۔ (۱)

تعلیقات :

مولوی سمیع اللہ خان کے والد کا نام منشی محمد عزیز اللہ خان تھا۔ دہلی ان کا وطن اور پھول منڈی کے پاس ان کا مکان تھا۔ عمائدین شہر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مولوی سمیع اللہ خان دہلی میں ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے ۔ وہیں پرورش پائی ۔ اسی شہر کے نامور اساتذہ کی خدمت میں تعلیم کے مراحل طے کیے۔ ان کے اساتذہ میں مولانا مملوک علی مفتی صدرالدین آزردہ اور سید محمد دہلوی کے نام آتے ہیں۔ طریقت میں مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے بیعت تھے۔ (۲)

---

(۱) مولوی علی بخش خان بہادر نے اپنے بعض شبہات محسن الملک ،مولوی سید مہدی علی کو لکھے تھے۔ انھوں نے یہ خط سرسید کو بھیج دیا۔ سرسید نے ان کے شبہات کا مفصل جواب دیا۔ " تہذیب الاخلاق" بابت ۱۵ جمادی الثانی ، ۱۲۹۰ھ میں "مراسلات متعلق مدرسۃ العلوم مسلمانان" کے عنوان سے چھپا ، نیز دیکھئے :
اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، ج دہم، ص
ایوب قادری ، محمد (مرتبہ) " بزرگ گل" (مجلہ) ، محولہ بالا ، ص ۳۳۸

(۲) بشیر الدین احمد دہلوی " واقعات دارالحکومت دہلی"، ج ۲، ص ۵۸۳
عبدالحی، مولانا سید ، " نزہۃ الخواطر"، کراچی : کارخانہ تجارت کتب، ۱۹۷۶ء، ج ۸، ص ۱۷۰
سلیمان ندوی، مولانا سید " حیات شبلی"، اعظم گڑھ : دارالمصنفین ، ۱۹۴۳ء، ص ۱۲۱ (حاشیہ)
اکرام ، شیخ محمد ، " موج کوثر" لاہور : فیروز سنز، ۱۹۶۶ء ، ص ۸۸
ایوب قادری ، محمد ، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، کراچی روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی ، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۸۳

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصے دھلی میں درس و تدریس کا شغل جاری رکھا۔(۱) دسمبر، ۱۸۵۶ع میں منصفی اور وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۵۸ع میں پہلے کان پور میں منصف مقرر ہوئے - ۱۸۶۲ع میں تخفیف میں آکر هائی کورٹ آگرے کی صدر دیوانی اور صدر نظامت میں وکالت شروع کی - ۱۸۶۳ع میں صدرالصدور مقرر ہوئے اور علی گڑھ ، الہ آباد کٹ ، مراد آباد ، فتح گڑھ میں تعینات رہے۔

۲۴ مئی، ۱۸۷۵ع کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کا افتتاح ہوا۔ تو مدرسہ کا سارا کام آپ کو سنبھالنا پڑا۔ ۱۸۸۳ع میں لارڈ نارتھ بروک کے ساتھ ان کے مشیر اور عربی دان کی حیثیت سے ایک سیاسی مشن پر مصر تشریف لے جانا پڑا۔ مشن کی کامیابی سے خوش ہوکر انگریزی حکومت نے انھیں سی ایم جی کے خطاب سے نوازا۔ مصر سے واپسی کے بعد رائے بریلی میں ڈسٹرکٹ جج اور پھر سیشن جج مقرر ہوئے -(۲)

پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے :

" ۱۶ ستمبر، ۱۸۸۳ع کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹکل مشن پر مصر گئے اور وہاں انھوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلے میں ان کو سی ایم جی کا خطاب ملا -" (۳)

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید،" نزهتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج۸، ص ۱۲۰

(۲) مولوی سمیع اللہ خان کے سفر مصر واپسی، عطائے خطاب اور رائے بریلی میں تقرر و خدمات کے بارے میں تفصیل کے لیے دیکھئے :
ذکاء اللہ دھلوی، محمد (مرتبہ)" سوانح عمری مولوی محمد سمیع اللہ خان"، حیدرآباد دکن :مطبع الانوارالاسلام ، ۱۹۰۹ع، صص ۷۷-۳۸
عبدالحی، مولانا سید،" نزهتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج۸، ص ۱۶۱
بشیرالدین احمد دهلوی، " واقعات دارالحکومت دهلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۵۸۳
اکرام ، شیخ محمد ، " موج کوثر"، محولہ بالا ، ص ۳۸۹

(۳) ایوب قادری، محمد ، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۱۸۳

لیکن ~~حقیقی واقعے میں~~ حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب موصوف کی یہ حیثیت نہیں تھی کہ وہ مصر میں کسی تحریک کو نقصان پہنچاتے - ان کی حیثیت محض ایک عربی دان ترجمان یا زیادہ سے زیادہ مشیر کی تھی- یہ بھی محض بدگمانی معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے مفاد کو نظر انداز کرکے سید جمال الدین افغانی کی تحریک کو نقصان پہنچایا ہو -

سرسید کے ساتھ انھوں نے نہایت اخلاص اور بے نفسی کے ساتھ تعاون کیا- اس کا اعتراف خود سرسید نے اور حالی نے اپنی مختلف تحریروں میں کیا ہے - لیکن جب الفنسٹن کی تاریخ ہند کے ترجمے ، علی گڑھ کالج کے بعض اسٹاف کے اختیارات اور ٹرسٹی بل کے مسئلے پر انھوں نے سرسید کے خیالات ~~کے~~ اور عزائم سے اختلاف کیا اور حالات ناقابل برداشت ہوگئے تو اپنے خیالات کا نہایت واضح الفاظ سے اظہار کیا اور مدرسۃ کالج کے کاموں سے الگ ہوگئے- اور اپنی ساری توجہ الہ آباد میں مسلم ہوسٹل کے قیام اور اس کے اہتمام پر صرف کرنے لگے- مسلم ہوسٹل کا افتتاح [۱] ۱۱ مارچ ، ۱۸۹۲ء کو ہوا تھا-

دسمبر ، ۱۸۹۲ء میں انھوں نے ملازمت سے پنشن لے لی- ۱۸۹۳ء / ۱۳۱۰ھ میں انھیں حج کی ~~[illegible]~~ سعادت نصیب ہوئی - حج سے واپس آکر مستقل سکونت انھوں نے علی گڑھ میں

---

(۱) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید "، کان پور: نامی پریس ، ۱۹۰۱ء ، ج ۱ ، ص: ۹۰-۲۸۹ اور ج ۲ ، ص: ٦۹-۲٦۸
عبدالحی ، مولانا سید ،" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص: ۱۷۱
سلیمان ندوی ، مولانا سید ،" حیات شبلی"، محولہ بالا ، ص: ۲۲-۱۲۱ (حاشیہ)
اکرام ، شیخ محمد ،" موج کوثر"، محولہ بالا ، ص: ۸۹
ایوب قادری ، محمد ،"مولانا محمد احسن نانوتوی" محولہ بالا ، ص: ۱۸۳
شمس تبریز خاں ، مولوی ،" صدر یار جنگ ۔(سوانح حیات مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی)" لکھنو : مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلما ، ۱۹۷۳ء ، ص: ۳۰۹

اختیار کرلی تھی۔ ۱۸۹۵ع میں نواب سر وقار الامرا مدارالمہام نے سرسید سے ان کی صلح کرادی تھی۔ (۱) اس کے بعد وفات تک وہ پھر کالج کے کاموں میں دل چسپی لیتے رہے۔ وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے صدر بھی تھے۔ (۲)

۷ اپریل، ۱۹۰۸ع / ۵ ربیع الاول، ۱۳۲۶ھ کو علی گڑھ میں آن موصوف کا انتقال ہوا۔ نعش کو دہلی لے جاکر دفن کیا گیا۔ لفظ "مغفور" ان کی وفات کا مادہ تاریخ ہے۔ بشیرالدین احمد نے ان کے لوح مزار سے یہ قطعہ تاریخ نقل کیا ہے:

سمیع اللہ خاں شاداں و مسرور　　　بہ گل گشت جناں گشتہ خراماں

سروش غیب ناگہ گفت "مغفور" (۳)　　　بہ تاریخ وفاتش فکر کردم
۱۳۲۶ھ

مولوی سمیع اللہ خاں نے "مدرسۃ العلوم" کے بعض مسائل، مسلمانان ہند کی تعلیم اور الفنسٹن کی تاریخ ہند اور سرسید کے تعلق سے بعض مضامین ضرور لکھے لیکن ان کی کسی مستقل تصنیف کا پتا نہیں چلا۔ البتہ ان کی صلبی اولاد میں صرف دو بیٹے تھے۔ جن کا ذکر ذکا اللہ اور صاحب "سفینۂ رحمانی" نے کیا ہے۔ بڑے بیٹے کا نام حمید اللہ خاں تھا جو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے پہلے طالب علم تھے۔ اور چھوٹے بیٹے کا نام مجید اللہ خاں تھا۔ دونوں علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ حمید اللہ خاں اعلا تعلیم کے لیے لندن بھی گئے تھے۔ واپس آکر ریاست حیدرآباد میں ایک اعلا منصب پر فائز ہوئے اور

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲۹۳
اکرام، شیخ محمد، "موج کوثر"، محولہ بالا، ص ۸۹
(۲) ایضاً، ص ۸۹
(۳) بشیرالدین احمد دہلوی، "واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۵۸۳
اکرام، شیخ محمد، "موج کوثر"، محولہ بالا، ص ۸۹
ایوب قادری، محمد، "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۸۳

نواب سر بلند جنگ بہادر کے خطاب سے مخاطب ہوئے - (۱)

مولوی سمیع اللہ خان عربی کے فارغ التحصیل عالم، نہایت جید فاضل، بڑے قانون دان اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ (۲) ان کے علم و فضل اور تقوی و دین داری کا اعتراف خود سرسید نے کیا ہے - مولوی بخشش کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

" آپ کو مولوی سمیع اللہ خان صاحب کے علم و فضل و تقوی و دین داری میں .... کیا شبہ ہے کہ" (۳)

اسی طرح ۱۸۸۳ع میں بمقام پٹنہ تقریر کرتے ہوئے سرسید نے مولوی سمیع اللہ خان کی خدمات کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے :

" ہمارے باعث افتخار مولوی سمیع اللہ خان کا حال دیکھو کہ بورڈروں کے پیچھے کس طرح اپنی جان لگائے ہوئے تھے - کسی بورڈر کی بیماری میں ان کی بے قراری کو دیکھو اور اندازہ کرو کہ آیا باپ کو اس سے زیادہ ہوسکتی ہے ؟ خود اپنی آنکھ سے چل کر دیکھو جو محبت اور سرپرستی مولوی سمیع اللہ خان بورڈروں کی کرتے ہیں، آیا کوئی باپ اپنے بیٹے کی بھی کرتا ہے۔" (۴)

سرسید کے اس بیان کی تصدیق کہ طلبہ کے ساتھ ان کا برتاؤ نہایت شفقت آمیز اور مربیانہ تھا ، حافظ حیرت کے بیان سے بھی ہوتی ہے - حیرت لکھتے ہیں :

---

(۱) ذکا اللہ دھلوی، محمد (مرتب)، " سوانح عمری مولوی محمد سمیع اللہ خان"، محولہ بالا، صص ۱۲۲ و ۱۲۳
حیرت، حافظ عبدالرحمن، " سفینۂ رحمانی"، محولہ بالا، ص ۹۵
سلیمان ندوی ، مولانا سید، " حیات شبلی"، محولہ بالا، ص ۱۲۲

(۲) حیرت، حافظ عبدالرحمن، " سفینۂ رحمانی"، محولہ بالا،
عبدالحی، مولانا سید، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۱۶۱
سلیمان ندوی ، مولانا سید، " حیات شبلی"، محولہ بالا، ص ۱۲۱

(۳) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب)، " مقالات سرسید"، محولہ بالا، ج دھم، ص ۲۲۳
اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) ، " خطبات سرسید"، لاهور: مجلس ترقی ادب ، ۱۹۷۲ع ، ج ۱، ص ۱۶۳
حیرت ، عبدالرحمن، " سفینۂ رحمانی"، محولہ بالا، ص ۹۳

" طلبه مدرسه را از غایت فرط محبت و فراوان شفقت هم چو فرزندان
ے افکار انگارند و در تعلیم و تهذیب و درستگی و شستگی اوصاف و اخلاق
طفلان نظر مربیانه و گرامی نهاکانه دارند -" (۱)

سرسید نے مولوی سمیع اللہ خاں کا مستقل ترجمہ تو نہیں لکھا - لیکن انہوں نے اپنی تقریر و تحریر میں کئی جگہ ان کا ذکر کیا ہے - مولوی صاحب تعلیمی کاموں میں سرسید کے شریک اور دست راست تھے۔ عبدالرحمن حیرت لکھتے ہیں :

" در اجرائے مدرسة العلوم علی گڑھ جناب فضیلت مآب حضرت مولوی سید
احمد خان صاحب بہادر دام اقبالہ را حقِ شایان و اعانت بے پایان می فرمایند -
و مثل بانی عالی طبع بذل و جہد و کوشش از پردہ خفا بر روئے کار می آرند -" (۲)

سرسید اور مولوی سمیع اللہ خاں میں دوستی کا تعلق تھا لیکن انہوں نے جس طرح ان کے فضائل علمی اور محاسن سیرت کا ذکر کیا ہے وہ ایک معتقد کی طرح ہے - انہیں مدرسة العلوم کا بانی، حامی اور عقل کل کہا ہے - ان کے سیرت کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں :

" اگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے حتی المقدور
کوئی کام خلاف شرع نہیں کیا تو غالباً وہی ہوں گے -" (۳)

اس کے بعد کسی شخص کی اسلامی سیرت کے بارے میں کیا رہ جاتا ہے جو کہا جائے۔ شیخ اکرام آپ کے بارے میں لکھتے ہیں :

" آپ کی طبیعت کا رنگ نواب وقارالملک کا ساتھا۔ عمر کا ایک حصہ
سرسید کے ساتھ کام میں گزرا۔ ان سے کئی باتوں میں اختلاف کیا..... اور

---

(۱) حیرت، عبدالرحمن: " سفینہ رحمانی " ، محولہ بالا ، ص ۹۳
(۲) ایضاً ، ص ۹۳
(۳) اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد (مرتبہ): " مقالات سرسید " ، محولہ بالا ، ج دھم ، ص
ایوب قادری محمد (مرتبہ): " برگ گل " (سرسید نمبر) ، محولہ بالا ، ص ۳۲۸

سرسید کو آپ سے اکثر شکایتیں رہیں۔ لیکن آفرین ہے مولوی صاحب کی ہمت اور فرض شناسی پر کہ انھوں نے انصاف اور قومی بہی خواہی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں دیا اور علی گڑھ چھوڑنے کے بعد بھی سرسید اور علی گڑھ کی نسبت وہ معاندانہ روش اختیار نہیں کی جو بعض دوسرے بزرگوں کی ہوگئی تھی۔" (۱)

ان کے علم فضل اور تحریر و تقریر میں ان کے کمال کے بارے میں حافظ حیرت لکھتے ہیں :

" از تحریر و تقریرش سحبان خجل و از فر زہد و دانش چتودھی شان ارسطو منفعل ۔" (۲)

====xxx====

مولوی عبداللہ صاحب :

" مولوی عبداللہ صاحب فرزند ہیں مولوی انصار علی صاحب کے ، نواسے ہیں مملوک علی صاحب کے ، داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب کے اور ان سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت ہے ۔ اور امید ہے کہ ان بزرگوں کی صحبت کے فیض سے مولوی عبداللہ صاحب کی بھی ایسی ہی طبیعت ہے کہ دینی کاموں کو بہ لحاظ دین اور بہ لحاظ محبت اسلام انجام دیں اور اسی خیال سے میں ان کا مدرسہ میں تشریف لانا اور رہنا باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں" ۔ (۳)

تعلیقات :

مولوی عبداللہ نام اور میاں بورجی عرف تھا۔ والد کا نام مولوی انصار علی ابن

---

(۱) اکرام، شیخ محمد ،" موج کوثر"، محولہ بالا ، ص ۸۹

(۲) حیرت ، حافظ عبدالرحمن،" سفینہ رحمانی"، محولہ بالا ، ص ۹۳

(۳) اسمعیل پانی پتی،شیخ محمد ، (مرتب) ،" مکتوبات سرسید"، لاہور :مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۹ع ، " مکتوب بنام منشی حافظ سعید احمد"، ص ۶۱۹

شاہ احمد علی تھا۔ (۱) احمد علی، قطب علی ابن غلام محمد انصاری انبیٹھوی کے بیٹے تھے۔(۲) مولوی عبداللہ انبیٹھہ (ضلع سہارن پور) میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی، ابتدائی تعلیم انبیٹھہ میں ہوئی پھر دہلی چلے گئے۔ ان کے اساتذہ میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی تک (جو ان کے ماموں بھی تھے)، مولانا محمد قاسم دیوبندی (جو بعد میں ان کے خسر بھی ہوئے) سید عالم علی نگینوی، قاری عبدالرحمن پانی پتی اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری بھی اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی شامل ہیں۔ مولانا احمد علی سے سند حدیث حاصل کی تھی اور حضرت حاجی صاحب سے مثنوی کا درس لیا تھا۔ حاجی صاحب کے ہاتھ پر وہ بیعت بھی تھے۔ اور مجاز بیعت و ارشاد تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں آنے سے قبل حج کو تشریف لے گئے تھے۔ اور ایک عرصے تک حاجی صاحب کی خدمت سے فیض اٹھایا تھا۔(۳) ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔(۴) ۱۲۹۱-۹۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں عربی کے مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔(۵) ۱۳۱۱ھ/ میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس میں سنی طلبہ کی دینی اصلاح و تربیت کے لیے نگران کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔(۶) بعد میں وہیں استاد اور ناظم دینیات ہوگئے۔(۷) ان کا تقرر سرسید نے

---

(۱) محمد یعقوب نانوتوی، مولانا: "حالات مولوی محمد قاسم"، پھلول پور: مطبع صادق الانوار، ۱۲۹۷ھ، ص ۳۱

انوارالحسن شیرکوٹی، "انوار قاسمی (سوانح عمری مولانا قاسم نانوتوی)"، لاہور: ادارہ سعدیہ مجددیہ، ۱۹۶۹ء، ص ۲۲۸

عاشق الٰہی میرٹھی، "تذکرۃ الخلیل"، کراچی: ناشر آرٹس لمیٹڈ، ۱۹۷۱ء، ص ۳۳

(۲) عبدالحی، مولانا سید: "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۲۸۵

(۳) طیب، مولانا قاری محمد: "تاریخ دارالعلوم دیوبند"، کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۷۳ء، ص ۵۲

(۴) عبدالحی، مولانا سید: "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۲۸۵

(۵) طیب، مولانا قاری محمد: "تاریخ دارالعلوم دیوبند"، محولہ بالا، ص ۱۰۸

(۶) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب): "مکتوبات سرسید"، محولہ بالا، (مکتوب بنام منشی حافظ سعید احمد)، ص ۱۹-۲۱۸

(۷) انوارالحسن شیر کوٹی: "انوار قاسمی"، محولہ بالا، ص ۲۳۰

طیب، مولانا قاری محمد: "تاریخ دارالعلوم دیوبند"، محولہ بالا، ص ۵۲

عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا: "تذکرۃ الخلیل"، محولہ بالا، ص ۳۵

خود کیا تھا۔ بقول قاری طیب صاحب کے سرسید اس پر اظہار مسرت کیا کرتے تھے کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ بھی مولانا قاسم صاحب کی نسبت سے خالی نہیں ہے -(۱)

مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے ان کی وابستگی کی یہ صورت پیدا ہوئی کہ سرسید کو بورڈنگ ہاؤس میں سنی طلبہ کی دینی اصلاح و تربیت کے لیے ایک نگران کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے منشی حافظ سعید احمد نائب منیجر بورڈنگ ہاؤس نے مولوی عبداللہ کا نام پیش کیا تھا۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے مولوی صاحب سے آمادگی کا ایک خط بھی لکھوالیا تھا۔ منشی صاحب نے اپنے خط کے ساتھ مولوی عبداللہ صاحب کا خط بھی سرسید کو بھیج دیا ۔ اس کے جواب میں سرسید نے ایک مفصل خط لکھا ۔ اس خط میں انھوں نے ان کاموں کی تفصیل بھی لکھی جو مولوی عبداللہ صاحب کو بحیثیت نگران تعلیم و تربیت اسلامی انجام دینی تھیں۔ نیز ان مراعات کا ذکر بھی کیا ہے جو مولوی صاحب موصوف کو مدرسۃ العلوم میں قیام کے دوران میں حاصل ہونا تھیں ۔ اوپر متن میں ہم سرسید کی جو تحریر بطور ترجمہ مولوی عبداللہ صاحب درج کی ہے ۔ وہ اسی خط کا آخری حصہ ہے ۔ ابتدائی حصہ یہ ہے :

" مولوی عبداللہ صاحب کا خط جو آپ نے بھیجا ۔ میں نے نہایت خوشی سے پڑھا ۔ قبل اس کے کہ میں اس کا جواب دوں اپنے خیالات کا اظہار کرنا مناسب سمجھتا ہوں ۔

سب سے اول یہ بات کہ جس مقصد کے لیے ہم ایک بزرگ اور مقدس شخص کو بورڈنگ ہوس میں رکھنا چاہتے ہیں وہ ایسا خالصاً اللہ یہ ہو کہ مدرسۃ العلوم ایک ایسی جگہ ہے جہاں کثرت سے مسلمان نوجوان جمع ہیں۔ ان میں نیکی اور اخلاق محمدی اور محبت اسلامی اور پابندی فرائض مذہبی کو پھیلانا اور ان کے دلوں

---

(۱) طیب ، مولانا قاری محمد ، " تاریخ دارالعلوم دیوبند"، محولہ بالا ، ص ۵۲

کو نرمی اور اخلاق سے نہ تشدد اور سختی اور تعصب اور تقشف (۱) سے نیکی کی طرف مائل کرنا ایک مذہبی اور ثواب کا کام ہے - ہزاروں جاہلوں کے مجمع میں وعظ کہہ دینے سے ایسے لوگوں میں جو اس زمانے کے علوم کی تعلیم میں مصروف ہیں اور نوجوان ہیں - نیکی اور اخلاق محمدی کا پھیلانا اور فرائض مذہبی کی طرف مائل کرنا ہزار درجہ بہتر ہے اور اسلام اور قوم کے لیے زیادہ مفید ہے - پس یہ مقصد ایسے ہی شخص سے حاصل ہوسکتا ہے جس کی نیت اور ارادہ خالصۃً بلا کسی قسم کے لالچ اور دنیاوی طمع کے اس کام کے کرنے کا ہو اور یہ سمجھے کہ میں اسلام کی خدمت کرتا ہوں۔"

پس اگر مولوی عبداللہ صاحب اس نیت سے یہاں آنا چاہیں تو ہماری میں کمال خواہش ہے اور خوشی ہے -" (۲)

اس کے بعد خط میں وہ چند سطریں ہیں جو سرسید نے مولوی صاحب موصوف کے خاندان سے واقفیت کے بارے میں لکھی ہیں اور ہم نے بطور ترجمہ درج کی ہیں۔

۱۳۴۴ھ/ ۲۶-۱۹۲۵ء میں بمقام بمبئی مولوی عبداللہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ (۳)

قاری محمد طیب صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے مشاہیر علما میں آپ کو شامل کیا ہے ۔ (۴)

مولوی عبدالحئی نے ان کے لیے "العالم الفقیہ اور احد عباد اللہ الصالحین" کے الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ (۵)

مولانا محمد قاسم نانوتوی کی بڑی صاحب زادی بی بی اکرامن سے آپ کا عقد ہوا

---

(۲) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد، "مکتوبات سرسید"، محولہ بالا ، ص ۶۱۸
(۳) عبدالحی، مولانا سید، "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸، ص ۲۸۶
(۴) طیب ، مولانا قاری محمد، "تاریخ دارالعلوم دیوبند"، محولہ بالا ، ص ۵۲
(۵) عبدالحی، مولانا سید ، "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸، ص ۲۸۵
(۱) سرسید نے اس لفظ کو " تشقف " لکھا ہے ہمارا خیال ہے کہ یہ لفظ " تقشف " ہوگا جو سرسید کے سہو قلم سے یا کاتب اور کمپوزیٹر کی غلطی سے " تشقف" بن گیا۔ حالاں کہ یہاں پر اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ " تقشف " ، مذہب کی غیر ضروری پابندیوں اور ناروا اہتمام کے لیے عام طور پر استعمال ہوتا ہے -

ہوا تھا۔ (۱) انھوں نے اپنے پیچھے پانچ اولادیں چھوڑیں۔ مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری اور احمد میاں دو بیٹے تھے اور دونوں ریشمی رومال سازش کیس میں ماخوذ تھے۔ (۲) محمد میاں کا انتقال ۱۹۴۷ء کے شروع میں افغانستان میں ہوا۔ (۳) ہندوستان کے مشہور صحافی، مصنف اور عالم دین مولانا حامد الانصاری غازی آپ ہی کے صاحب زادے ہیں۔ (۳) صاحب زادیوں کے نام امۃ السلام، کلثوم اور امۃ المنان تھے (۵) آخر الذکر صاحب زادی کا نکاح مولانا محمد احسن نانوتوی کے صاحب زادے مولوی محمد ابراہیم سے ہوا تھا۔ (۶)

مولوی عبداللہ صاحب نے کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں پڑھایا پھر مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے عرصہ دراز تک وابستہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے بہت سے طلبہ نے اکتساب علم کیا ہوگا۔ لیکن ہمیں ان کے کسی خاص شاگرد کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے لکھا ہے کہ : "احقر نے بھی مولانا عبداللہ سے اجازت حدیث حاصل کی ہے۔" (۷)

====xxxx=====

مولانا محمد قاسم نانوتوی :

"افسوس ہے کہ جناب ممدوح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آیندہ بھی

---

(۱) محمد یعقوب نانوتوی، مولانا ، "حالات مولوی محمد قاسم"، محولہ بالا، ص ۳۱
(۲) انوارالحسن شیرکوٹی، "انوار قاسمی"، محولہ بالا، ص ۲۲۸
(۳) محمد میاں، مولانا سید، "تحریک شیخ الہند (ریشمی خطوط سازش کیس)"، لاہور: مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۷۵ء، صص ۳۵۵ اور ۳۸۰
(۴) طیب، مولوی قاری محمد، "تاریخ دارالعلوم دیوبند"، محولہ بالا، ص ۷۹
(۵) ایضاً، ص ۸۳
(۵) انوارالحسن شیرکوٹی، "انوار قاسمی"، محولہ بالا، ص ۲۳۳
(۶) ایوب قادری، محمد، "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۵۳
(۷) طیب، مولانا قاری محمد، "تاریخ دارالعلوم دیوبند"، محولہ بالا، ص ۵۲

بہتوں کو روئے گا - لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آئے نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے - ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علما میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقوے اور ورع میں معروف و مشہور تھے ایسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بے مثل تھے- لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی اسحاق کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقوے اور ورع اور مسکینی سے ثابت کردیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل ایک اور شخص کو بھی خدانے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے -

ابھی بہت سے لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے - انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب سے تمام کتابیں پڑھی تھیں- ابتدا ہی سے آثار تقوا اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع و اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا :

بالائے سرش ز ہوش مندی   می تافت ستارۂ بلندی

زمانہ تحصیل علمی میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے- ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کردیا تھا- اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت عالی رتبہ کا دل بنادیا تھا- خود بھی پابند شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابند سنت و شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے- بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا- ان ہی کی کوششوں سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید

"مدرسہ" دیوبند" میں قایم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی - علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے - وہ کبھ خواہش پیرومرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا و مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو ، خواہ کسی سے خوشی کا ہو کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کرسکتے - ان کا تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلا شبہ للہیت اور بہ ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے لیے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے۔ مسئلہ کہ حب اللہیہ اور بغض للہیہ خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام کہ خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو بلا شبہ نہایت محبت کے لائق ہے -

اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتی علم میں شاہ عبدالعزیز کے کچھ کم ہو الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا - مسکینی ، نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا وہ در حقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے آدمی کے وجود سے زمانے کا خالی ہوجانا ان لوگوں کے لیے جو

ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے -

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے - ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت اور افسوس کے کہہ کر خاموش ہوجائیں- یا چند آنسو آنکھ سے بہاکر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کرلیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں-

دیو بند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعے سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جمارہے- " (۱)

تعلیقات :
======

محمد قاسم نام ، ابوالہاشم کنیت اور حجۃ الاسلام اور قاسم العلوم لقب ہیں- نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے - پیدائش کی نہ صرف تاریخ بلکہ مہینے پر بھی اختلاف ہے - ۲۷ محرم، ۱۵ شعبان ، ۱۹ رمضان نیز ربیع الثانی و جمادی الاخر کے مہینے بیان کیے گئے ہیں - سال کے بارے میں سب متفق ہیں کہ ۱۲۴۸ھ ہے - " خورشید حسن" آپ کا تاریخی نام ہے - انگریزی سال ۱۸۳۲ع ختم ہوکر ۱۸۳۳ع شروع ہوجاتا ہے - والد کا نام اسد علی بن غلام شاہ تھا- ان کے جد امجد شاہجہاں کے مقرب تھے- ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق سے جاملتا ہے - تعلیم کا آغاز نانوتہ میں ہوچکا تھا-

---

(۱) سرسید احمدخان،" علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"، ۲۴ اپریل، ۱۸۸۰ع ،
(۲) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) ، " مقالات سرسید"، لاهور : ۱۹۶۲ع ، ج هفتم، ص: ۸-۲۰۵
اکرام ، شیخ محمد " موج کوثر"، محولہ بالا ، ص: ۶۸-۳۶۷(ضمیمہ)

اس کے بعد ان کی تعلیم دیوبند، سہارن پور اور دھلی میں ہوئی - ان کے اساتذہ میں نانوتہ میں مولانا محمد مظہر، دیوبند میں مولوی مہتاب علی کو سہارن پورمیں، مولوی شیخ نہال احمد، مولوی محمد نواز (جو آپ کے نانا بھی تھے) اور دھلی میں مولوی مملوک علی، شاہ عبدالغنی، مولانا احمد علی سہارن پوری اور مفتی صدرالدین آزردہ کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ان کے مربی اور مرشد طریقت تھے - انھوں نے کچھ عرصہ دھلی کالج میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن امتحان میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ (۱) دھلی میں ان کی تعلیم کا زمانہ محرم، ۱۲۶۰ھ سے لے کر شروع ہوتا ہے اور ذی الحجہ، ۱۲۶۷ھ /۱۸۵۱ء میں مولانا مملوک علی کا انتقال ہوا تو وہ تحصیل علمی سے فراغت کرچکے تھے۔ (۲)

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ آپ نے مدرسہ دارالبقا دھلی میں خدمات درس

---

(۱) خاندان، تعلیم اور اساتذہ کے لیے دیکھئے :
مناظر احسن گیلانی، مولانا، "سوانح قاسمی"، دیو بند : دارالعلوم، ۱۳۷۳ھ ج اول، صص ۱۸۲-۲۶۳
یعقوب نانوتوی، مولانا محمد، "حالات مولوی محمد قاسم"، محولہ بالا، صص ۹-۳
انوارالحسن شیرکوٹی، "انوار قاسمی"، محولہ بالا، صص ۷۹-۱۳، ۱۳۷ اور ۳۶۲
عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا، "تذکرۃ الرشید"، ص ۳۵
محمد میاں، مولانا سید، "علمائے ھند کا شاندار ماضی"، دھلی : کتابستان، ۱۹۶۰ء ج اول، ص ۷۰
ایوب قادری، محمد، (مترجم ومرتب)، "تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا، ص ۳۶۵
امداد صابری، "فرنگیوں کا جال"، دھلی : فاروقی پریس، ۱۹۳۹ء ص ۳۶۶
عبیداللہ سندھی، مولانا، "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، لاھور : سندھ ساگر اکیڈمی، ۱۹۵۲ء، ص ۲۱۹
ایوب قادری، محمد، "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، صص ۹-۲۰۷
عبدالحی، مولانا سید، "نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۸۳
"الفرقان" بریلی، (شاہ ولی اللہ نمبر) ص ۲۳۷
مختارالدین احمد، ڈاکٹر (مرتب)، "تذکرہ آزردہ" از مفتی صدرالدین، آزردہ، کراچی : انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۲ء، ص ۱۲
(۲) یعقوب نانوتوی، مولانا محمد، "حالات مولوی محمد قاسم"، محولہ بالا، ص ۹

تدریس انجام دی۔(۱) رحمان علی اور امداد صابری کا بیان ہے کہ یہ مدرسہ انگریزی واقع دھلی(۲) یعنی دھلی کالج تھا۔ لیکن ان کا یہ خیال درست نہیں ہے ۔ محمد ایوب قادری نے اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ یا تو رحمان علی سے غلطی ہوئی یا مفتی صدرالدین کے سرکاری تعلق کی بنا پر ان کے مدرسے کو بھی مدرسہ انگریزی لکھ دیا۔(۳) اس کے بعد ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۶ء تک آپ نے مولانا احمد علی سہارنپوری کے مطبع احمدی دھلی میں مصحح کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۸۵۶ء میں آپ نانوتہ تشریف لے آئے ۔ یہاں کے قیام کے دوران میں ۱۸۵۷ء کی " جنگ آزادی" شروع ہوگئی ۔ آپ نے اس جنگ میں عملی طور پر باقاعدہ حیثیت سے حصہ لیا اور جنگ میں شامل ہوئے اور انگریزوں کے خلاف مجاہدانہ حصہ لیا۔ جنگ کی ناکامی کے بعد آپ تقریباً تین سال تک روپوش رہے ۔ دسمبر ۱۸۶۰ء میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے ساتھ حج کو تشریف لے گئے ۔ ایک سال کے بعد ۱۸۶۱ء میں واپس تشریف لائے ۔ اس سفر کے دوران میں آپ نے قرآن مجید حفظ کرلیا۔ حج سے واپسی کے بعد آپ نے منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح کتب کی ملازمت اختیار کرلی ، یہ سلسلہ ۱۸۶۸ء تک رہا۔ ۱۸۷۰ء میں آپ نے دوسرا حج کیا۔ واپسی کے بعد آپ کچھ عرصے مطبع ھاشمی میرٹھ سے وابستہ رہے پھر مطبع مجتبائی دھلی میں چلے گئے اور جب مولوی ممتاز علی نے اپنا دوسرا مطبع مصطفائی دھلی میں قائم کیا تو پھر ان کے ساتھ کام کرنے لگے(۴) ۱۸۷۷ء میں آپ نے تیسرا حج کیا۔ انوارالحسن شیر کوٹی نے تیسرے حج

---

(۱) ایوب قادری ، محمد ،" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۲۱۰

(۲) ایوب قادری ، محمد (مترجم و مرتب) ،" تذکرہ علمائے ھند"، محولہ بالا ، ص ۳۶۵

[illegible] امداد صابری ،" فرنگیوں کا جال"، محولہ بالا ، ص ۳۶۶

(۳) ایوب قادری ، محمد ، " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۲۱۰

(۴) انوارالحسن شیرکوٹی ، " انوارقاسمی"، محولہ بالا ، ص ۲۲۲

عبدالحی ، مولانا سید ،" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ک‌ج ۷ ، ص ۳۸۳

کا سال ۱۸۷۷ء لکھا ہے - چوں کہ یہ سال ان کے مآخذ سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے درست نہیں ہے - (۱)

مولانا نانوتوی کا سب سے بڑا کارنامہ دارالعلوم دیوبند کا استحکام و ترقی اور اسے علوم و معارف ولی اللہی کی مرکزی درس گاہ کی حیثیت دینا ہے - یہ مدرسہ محرم، ۱۲۸۳ھ/ مئی، ۱۸۶۷ء میں قایم ہوا تھا- (۲) مدرسے کا تخیل دیوبند کے ایک دوسرے بزرگ شیخ حاجی عابد حسین کا تھا انھوں نے مولانا مہتاب علی کے مشورے سے مدرسہ کا آغاز بھی کردیا تھا- شیخ صاحب ہی اس کے پہلے مہتمم تھے ، لیکن مولانا نانوتوی شروع ہی سے مدرسہ کے کاموں میں شریک تھے- انھوں نے مدرسہ کے اصول اساسی تیار کیے ، ایک چھوٹے سے مکتب کو ان کی وسیع بنیادوں پر قایم کیا جن پر اس کی موجودہ عالی شان عمارت ہے - اور اسے ایک دارالعلوم کے درجے پر پہنچانے میں صرف مولانا قاسم نانوتوی کا ذہن اور مساعی کار فرما رہے ہیں- (۳) اسی لیے انھیں دارالعلوم دیوبند کا بانی کہا جاتا ہے -

مولانا نانوتوی تحریک ولی اللہی کے خاص افراد میں سے تھے- انھوں نے ولی اللہی حکمت و معارف کو اہل ہند کے لیے زمانہ حاضر کے لباس میں پیش کیا- مولانا عبید اللہ سندھی نے انھیں چودھویں صدی ہجری کے مجددین امت میں شمار کیا ہے -(۴)

---

(۱) مناظر احسن گیلانی، مولانا"، " سوانح قاسمی"، محولہ بالا، ج ۲، ۱۹۱ اور ج ۳ مطبوعہ ۱۳۷۶ع ، ص: ۲-۷۱

(۲) طیب، مولانا قاری محمد" تاریخ دارالعلوم دیوبند"، محولہ بالا، ص: ۱۳

(۳) محمدمیاں، مولانا سید" علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے"، مراد آباد : کتب خانہ فخریہ، ۱۹۳۶ع ، حصہ اول، ص: ۵۳، ۶۵، ۶۶، ۶۸

(۴) عبیداللہ سندھی، مولانا"، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، محولہ بالا، ص ۲۱۹

مولانا عبدالحی کی رائے میں وہ اپنےزمانے میں صحیح بخاری کی تصحیح میں مجتہدانہ مقام رکھتے تھے(۱) ان کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے ان کے کشف و ولایت اور جامعیت علوم ظاہری و کمالات باطنی کا اعتراف کیا ہے - "ارواح ثلاثہ" میں حضرت نانوتوی کے مراتب کے متعدد واقعات درج ہیں- (۲) تقوی، اور پرہیز گاری میں ان کا کوئی جواب نہ تھا - شریعت مطہرہ اور سنت نبوی کے ایسے پابند تھے کہ باید و شاید- صبر، قناعت اور استغنا کامل درجے کا تھا- جیسا ان کا بلند مقام سلوک اور روحانیت میں تھا علم و فضل میں بھی وہ ایک بے مثال اور بے ہمتا شخصیت تھے - سرسید نے خود ان کے فضائل علمی، محاسن سیرت اور علو مرتبت کا تذکرہ اعتراف کیا ہے -(۳) کہ یہ انھیں کا فیضان ہے کہ آج دارالعلوم ~~کہ~~ نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ دنیاکے چند بڑے تعلیمی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے - اور اس کے فیض یافتگان سے دنیا کا کوئی ملک خالی نہیں -(۴) ہاشمی فریدآبادی نے صرف دو جملوں میں آپ کی شخصیت پر تبصرہ کیا ہے لیکن یہ دونوں جملے آپ کے فضائل، محامد اور خدمات کے بیان میں حرف آخر ہیں- ہاشمی صاحب لکھتے ہیں :" مولانا کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی مگر اس مختصر مدت میں ان کی شخصیت کا نقش اسلامی ہند کی لوح تاریخ پر چھپ گیا-" (۵)

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید :" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص: ۳۸۳

(۲) اشرف علی تھانوی، مولانا (مرتب)، " ارواح ثلاثہ"، لاہور: اسلامی اکادمی، ۱۹۷٦ء، صص: ۹۵-۲۲۵

(۳) سرسید احمدخان(مدیر) :" اخبارسین ٹیفک سوسائٹی" علی گڑھ: ۱۲ اپریل، ۱۸۸۰ء

(۴) اسحاق کشمیری، محمد :" دارالعلوم کا فیض ملکوں ملکوں" (مقالہ)، " الرشید" لاہور: ۱۹۷٦ء (دارالعلوم دیوبند نمبر) صص: ۵۵-۳۵۰

(۵) ہاشمی فرید آبادی:" تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت"، کراچی: انجمن ترقی اردو، (پاکستان) ۱۹۵۲ء، ج ۲، ص: ۵۱۰

مولانا محمد قاسم نانوتوی اسلام کے زبردست عالم، فقہ حنفی کے خواص اور اپنے وقت کے زبردست متکلم اور مناظر تھے۔ ان کی تصانیف ان کے کمالات پر شاہد عدل ہیں۔ انھوں نے شاہجہان پور، رڑکی وغیرہ میں مناظروں میں حصہ لیا اور بڑے بڑے پادریوں اور آریہ سماجیوں کو ان کے دلائل و براہین کے سامنے ٹھہرنے کی جرات نہ ہوئی - ان کی اردو تصانیف میں اجوبہ اربعین" ، " اسرار قرآنی"، " الاجوبۃ الکاملۃ فی الاسولۃ الخامسۃ"، " الدلیل المحکم علی قرآۃ الفاتحۃ للمؤتم"، " انتصارالاسلام"، " آب حیات" ، " تحذیرالناس"، " تحفہ لحمیہ"، " تقریر دل پذیر"، " توثیق الکلام گدر مبحث خلف الامام"، " جواب ترکی بہ ترکی"، " حجۃ الاسلام"، " حق الفرع "، " حواشی بخاری شریف (آخری چند پاروں کے)"، " رد قول الفصیح " ، " قبلہ نما" ، گفتگوئے مذہبی (میلہ خداشناسی)"، " لطائف رشیدیہ"، " مباحثہ رڑکی "، کہ " مباحثہ شاہجہان پور"، " مجموعہ رسائل قاسم العلوم"، " مصابیح التراویح "، " ھدایۃ الشیعۃ"، یہ چھوٹے بڑے رسائل اسلام پر مخالفین کے اعتراضات یا بعض اختلافی مسائل وغیرہ میں ہیں۔ " تصفیۃ العقائد" (سرسید اور مولانا قاسم کی مراسلت)" ، " جمال قاسمی"، " فیوض قاسمیہ "، " لطائف قاسمیہ " اور " مکتوبات قاسمیہ " حضرت حجۃ الاسلام کے خطوط کے مجموعے ہیں - ان میں بے شمار مسائل و مباحث زیر غور آئے ہیں اس لیے یہ خطوط علوم و افکار اسلامی کا بہت بڑا خزانہ بن گئے ہیں۔

آریہ و نصاری کے رد میں ان کے رسائل کے بارے میں ھاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں :

" رد آریہ اور نصاری کے جواب میں چند رسالے ان کی علمیت اور منطقی استدلال کی یادگار ہیں۔"

ھاشمی صاحب کے بقول مولانا نانوتوی نے ۱۹۰۰ء کی ایک مجمل تاریخ " القرن التاسع عشر"، بھی تالیف کی تھی۔ (۱)

---

(۱) ھاشمی فرید آبادی، " تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۵۱۱

اگرچہ شاعری آپ کی شخصیت کا طرۂ امتیاز نہ تھی اور آپ کے لیے باعث فخر نہ تھی لیکن آپ قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ نعت میں آپ کا قصیدہ نہایت بلند پایہ ہے ۔ " قصائد قاسمیہ " کے نام سے آپ کے کلام کا مجموعہ چھپ گیا ہے ۔" انتباہ المومنین" فارسی میں آپ کا رسالہ ہے ۔(۱)

آپ چونکہ مسند نشین درس و تدریس ہونے کے علاوہ طریقت میں مولانا سید حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ اور مجاز بیعت و ارشاد بھی تھے اور اکثر آپ بہت کم لوگوں کو بیعت فرماتے تھے ۔ حضرت حاجی صاحب ہی کے پاس بھیج دیتے تھے ۔ اس کے علاوہ باوجود متعدد نامور حضرات آپ سے بیعت تھے اور آپ کے خلیفہ تھے۔ ان میں سے بعض حضرات کو آپ کی خدمت میں شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔ چند خاص اہل نسبت کے نام یہ ہیں :" حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ، مولانا احمد حسن امروہوی ، مولانا محمد نظر خاں ، مولانا محمد روشن خاں ، مولانا محمد صدیق مرادآبادی ، حکیم مشتاق احمد دیوبندی ، مولانا محمد یعقوب ، مولانا فخرالحسن گنگوہی ، مولانا منصور علی مرادآبادی ، مولانا عبدالعلی میرٹھی ، مولانا محمد اسمعیل علی گڑھی ، مولانا خلیل الرحمن ، مولانا شاہ عبدالغنی میرٹھی ، مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی ، مولانا عبدالکریم پنجابی ، حاجی محمد اسحاق خورجوی ، محمد یسین دیوبندی ۔" (۲)

مولانا قاسم نانوتوی کا نکاح ۱۸۵۳ء میں شیخ کرامت حسین کی صاحب زادی سے ہوا تھا۔

---

(۱) انوارالحسن شیرکوٹی ، " انوار قاسمی "، محولہ بالا ، صص ۳۰-۳۲۹ ، ۳۸۸
عبدالحی ، مولانا سید :" نزہۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۳۸۳
ایوب قادری ، محمد (مرتب و مترجم) :" تذکرہ علمائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۶۶
امداد صابری ، " فرنگیوں کا جال"، محولہ بالا ص ۲۲۹
ایوب قادری ، محمد :" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، صص ۳۹-۲۳۰

(۲) انوارالحسن شیرکوٹی :" انوار قاسمی"، محولہ بالا ، صص ۳۹-۲۱۵ (متعدد صفحات پر)
اشرف علی تھانوی ، مولانا (مرتب) ، " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، صص ۲۳۱ ، ۲۳۹ ،
۲۶۳ وغیرہ

ان سے آپ کے تین بیٹے اور سات بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بیٹوں کے نام " محمد احمد ، محمدھاشم، اور محمد میاں" تھے ۔ محمد ھاشم بچپن میں انتقال کرگئے ۔ محمد ھاشم نے جوانی میں مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ محمد احمد دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ہوئے ، قاری محمد طیب انھیں کے فرزند عظیم ھیں۔ اکرام النساء ، رقیہ ، خدیجہ ، مریم، عائشہ ، اور دو اور لڑکیاں تھیں ۔(۱)

۴ جمادی الاول ، ۱۲۹۷ھ، بروز پنج شنبہ بعد نماز ظہر /۱۵ اپریل ، ۱۸۸۰ع کو دیوبند میں آپ نے وصال فرمایا۔ (۲) " خزانہ خوبی" آپ کی تاریخ رحلت ھے ۔(۳) ایک مادہ تاریخ مولانا فضل الرحمن کے فکر کا یادگار نتیجہ ھے :

سر الم سے لکھی فضل نے سنین وفات

وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ھے (۴)

سرسید اور مولانا قاسم نانوتوی ایک ھی استاد مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ اس کے علاوہ مولانا نے جن اساتذہ سے تحصیل علمی کی ان سے سرسید عقیدت و ارادت کا رشتہ رکھتے تھے۔ دونوں میں واقفیت بھی مولانا کے قیام دھلی کے زمانے سے تھی۔ پھر ۱۸۵۷ع میں معرکہ شاملی کے مجاہد ہو بعد میں دارالعلوم کے بانی اور آریوں اور پادریوں کے مقابلے میں مناظرو متکلم اسلام کی حیثیت سے مولانا ھندوستان کے مطلع تاریخ پر جس طرح

---

(۱) انوارالحسن شیرکوٹی، مولانا " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۲۲۲، ۲۹-۲۲۸

(۲) یعقوب نانوتوی ، مولانا محمد " حالات مولوی محمد قاسم"، محولہ بالا ، ص ۳۰
انوارالحسن شیرکوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۵۸۰

(۳) یعقوب نانوتوی ، مولانا محمد " حالات مولوی محمد قاسم" ، محولہ بالا ، ص ۳۰
ایوب قادری ، محمد" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۲۲۳

(۴) انوارالحسن شیرکوٹی ، " انوار قاسمی" ، محولہ بالا ، ص ۵۸۳
مناظر احسن گیلانی ، مولانا " سوانح قاسمی"، محولہ بالا ، ج ۳، ص ۱۵۳

نمودار ہوئی وہ سرسید کی پسند و ناپسند سے قطع نظر بھلا دینے کی چیز نہ تھی۔ اس لیے شروع تعلقات سے قطع نظر سرسید نے ان کی عالمانہ بڑائی کا اعتراف کیا ہے اور جب کبھی [illegible] مخاطب کیا ہے تو ذہن میں یہ بات رہی کہ وہ وقت کے مشاہیر علمائے اسلام میں بہت بڑی حیثیت کے مالک ہیں۔ اگرچہ سرسید کو اس دور میں نہ انگریزوں سے نفرت بھاتی تھی نہ ان کے خلاف کسی سیاسی تحریک کو وہ پسند کرتے تھے۔ وہ اپنے خاص انداز فکر کے مطابق دینی اور عربی کے مدارس کے قیام کے بھی مخالف تھے۔ لیکن سرسید مولانا کی رائے کو ایک اہمیت دیتے تھے اور اسی لیے کالج کے لیے سمیع صاب کی کمیٹی میں انھوں نے مولانا قاسم اور مولانا یعقوب نانوتوی کا نام بھی تجویز کیا تھا۔ اور جب کسی غلط فہمی کی بنا پر ان ہر دو حضرات نے اس کمیٹی میں شامل ہونے سے انکار کردیا تھا تو سرسید کو اس سے تکلیف پہنچی تھی اور اپنے انتہا پسندانہ ورید کے مطابق ان پر سخت طنز بھی کیا تھا۔(۱) اسی طرح جب ایک مرتبہ بعض مسائل میں افہام و تفہیم کے لیے مولانا نے بذات خود علی گڑھ پہنچ کر سرسید سے ملنا چاہا اور اس کے لیے سرسید سے وقت مانگا تو انھوں نے جواب میں لکھا :

بزرگان سہارن پور نے جو نوازش و دل سوزی میرے حال زار پر کی جس کا ذکر آپ نے مجھ سے فرمایا، میں دل سے ان کا شکر ادا کرتا ہوں ۔ اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔" (۲)

لیکن سرسید مسائل متنازعہ فیہ پر چوں کہ سرسید اپنی رائے کے سوا کسی دوسری رائے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے ~~اس لیے تبادلہ خیال کرنے~~ اس لیے سننے کے لیے بھی آمادہ

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین،" حیات جاوید"، محولہ بالا، [illegible] ج ۲، صص ۹۵-۲۹۳

(۲) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب)،" مکتوبات سرسید"، محولہ بالا، (مکتوب بنام میر محمد عارف)، صص ۴۳

نہیں ہوتی - اس لیے اوپر کی سطروں کے بعد مسلسل لکھتے ہیں :

" مگر اس وقت مرزا غالب کا ایک شعر مجھے یاد آتا ہے :

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ

کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا"

لیکن یہ بات ایک خاص وقت سے تعلق رکھتی ہے - اسے اسی گرد و پیش میں دیکھنا چاہیے - یہ سرسید کی مستقل اور سوچی سمجھی رائے نہیں - ان کی سوچی سمجھی اور مستقل رائے کا اظہار بھی متعدد مواقع پر ہوا ہے مثلاً ۱۲۹۰ میں دارالعلوم دیو بند کی سالانہ رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے جہاں عربی مدارس اور ان کی تعلیم اور زمانے کے تقاضے کے بارے میں اظہار خیال کیا وہاں مولانا قاسم صاحب کی فرشتگی، ولایت اور ان کے کمال بزرگی اور اخلاص کا اعتراف بھی کیا ہے - سرسید لکھتے ہیں :

" حقیقت میں مسلمانوں پر نہایت افسوس ہے کہ ایسے مدرسے میں بھی جیسا کہ دیوبند کا عربی مدرسہ ہے اور جس میں جناب مولوی محمد قاسم صاحب سا فرشتہ سیرت شخص نگراں ہے اور مولوی محمد یعقوب سا شخص مدرس ہے ، کچھ مدد نہ کریں-" (۱)

اس تبصرے میں اگرچہ عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے انھوں نے اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے لیکن مولانا قاسم نانوتوی کے بارے میں جو کچھ انھوں نے لکھا اس کے بعد ایک عالم دین میں اور کون سی خوبی رہ جاتی ہے جس کی تلاش کی جائے- سرسید لکھتے ہیں :

" یہ مدرسہ خود اپنے پر یا مسلمانوں کی ہمدردی پر قائم نہیں ہے بلکہ صرف ایک شخص کی ذات پر اس کا مدار ہے - مولوی محمد قاسم صاحب درحقیقت

---

(۱) اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید"، محولہ بالا، ج ہفتم، ص ۲۷۹

نہایت بزرگ و نہایت نیک ، مادر زاد ولی ہیں۔ تمام ضلع سہارن پور اور میرٹھ و مظفر نگر میں لوگ ان کو مصداق اس حدیث کے کہ " علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل " سمجھتے ہیں۔" (۱)

اس تحریر کے تقریباً سات سال کے بعد مولانا نانوتوی کے انتقال کا سانحہ پیش آیا۔ اس سے نہ صرف دیوبندی مکتبہ فکر کے علما اور ان سے متاثرین میں بلکہ خانوادہ ولی اللہیہ سے نسبت و تعلق رکھنے والوں میں بھی صف ماتم بچھ گئی - چوں کہ سرسید اسی خانوادے کے فرزند تھے اس لیے حضرت نانوتوی کے انتقال سے جو عظیم صدمہ پہنچا - اس کا اظہار اس مضمون کے ایک ایک حرف سے ہوتا ہے جو انہوں نے " علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ " علی گڑھ میں بطور تعزیت کے لکھا تھا اور جسے ہم اوپر متن کا ایک حصہ بنا چکے ہیں۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے دل و کلہ جگر کے ٹکڑے ہیں جو سرسید نے صفحہ کاغذ پر پھیلا دیے ہیں - اس میں خوب صورت الفاظ میں صرف رسم تعزیت ہی نہیں ادا کی گئی اس میں ان کے کمال علم و فضل کا تذکرہ بھی ہے اور ان کے محاسن سیرت کا اعتراف بھی۔ اس میں سچے جذبات تعزیت ہیں اور اس کے ایک ایک لفظ سے ان کے سوز دروں کا اندازہ اور حضرت نانوتوی سے سرسید کی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے - ایسی تحریر کسی مخالف یا منافق کے قلم سے نہیں نکل سکتی - اسے صحافیانہ رواداری اور رسمی تعزیت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ تصور بھی نہ کرنا چاہیے کہ سرسید منافقت یا رسم یا رواداری کے طور پر اپنے قلم کو جنبش دے سکتے تھے۔ یہ چیز سرسید کک سے کوسوں دور تھی۔

===xxx====

---

(۱) اسمٰعیل پانی پتی ، شیخ محمد ،(مرتبہ) " مقالات سرسید " ، ج ہفتم ، ص ۸۰-۲۷۹

فصل ـ دوم

(شعرا)

نواب محمد اکبر خان بہادر سلمہ اللہ تعالے :

" نخل بند حدیقہ بخت مندی نونہال گلشن طالع بلندی ، عارج معارج اقبال صاعد مصاعد جاہ و جلال ، بہین نتیجہ ادوار فلک ، کارفرمائے ملک و ملک ، یگانۂ دوران نواب محمد اکبر خان اکبر تخلص ، کہین برادر نواب محمد مصطفی خان بہادر کے طبیعت نہایت رسا اور ذہن نہایت جودت کے رکھتے ہیں ہر چند فکر سخن کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں لیکن بہت خوش فکر ہیں۔ مشق سخن مومن خان مومن سے کی ہے ۔ ہر بیت اون کی مضمون رنگین سے دکان گل فروش ، مصرع اون کا نازکی کیفیت سے مینائے بادہ سرجوش لطف سخن سے خط خوبان خجل اور خوبی سطور سے سنبل جنت منفعل ۔ یہ چند شعر اون کے بطریق یادگار نذر احباب ہوتے ہیں :

اشعار ریختہ :

نہ تھا سارا جہان دشمن مجھ تجھے جہان پھونکا
جہان کو تونے کیون اے نالۂ آتش فشان پھونکا

اثر لیلی کو کیا ہو جب تری فریاد نے مجنون
جلا یا بائے ناقہ کو نہ دست ساربان پھونکا

===xxx====

جاکر فلک پہ نالۂ شور آفرین کے ساتھ سیر بہشت کرتے ہیں ہم حورعین کے ساتھ

اللہ ری سوز سینہ کو دامان چرخ میں شعلہ لپٹ گیا نفس آتشین کے ساتھ

ہم مرگئے اور اوس نے نہ جانا کہ مرگئے   ہر زخم پر جو ہلتے تھے لب آفریں کے ساتھ

وہاں رسم اختلاط سے انکار و عذر تھا   یہاں جان ہی نکل گئی اچی نہیں کے ساتھ

ط   طوفان نوح و دگر یہ اکبر میں فرق ہے

یعنی کہ آسمان کو ڈبو یا زمیں کے ساتھ" (۱)

<u>تعلیقات :</u>

اکبر علی خاں اکبر نواب مصطفی خاں کے چھوٹے بھائی اور نواب مرتضی خان کے بیٹے تھے۔ خاندانی حالات بہ ذیل شیفتہ ملاحظہ ہوں - مومن کے شاگرد تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا۔ ۱۸۸۰ء میں جب کہ ان کی عمر پینسٹھ (۶۵) سال کی تھی راولپنڈی میں انتقال ہوا۔

اکثر صفات حسنہ سے متصف تھے۔ شعر و سخن سے دلی لگاؤ تھا۔ کم مدت میں مشق سخن اور شاعری میں کمال حاصل کرلیا تھا۔ اگرچہ شعر کم کہتے تھے مگر اچھا کہتے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ مگر اب ان کا دیوان نایاب ہے -

ان کے بارے میں صرف یہی معلومات ہیں جو تذکروں سے حاصل ہوتی ہیں۔ شیفتہ نے " گلشن بے خار" میں لکھا ہے :

" اکبر خاں راقم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ بہت کم موقع ہوا کہ شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے - مومن سے استفادہ کرتے ہیں۔" (۲)

تمام تذکرہ نگاروں کے سامنے یہی چار جملے رہے ہیں۔ بیشتر تذکرہ نگاروں کے لیے

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، دہلی : مطبع سید الاخبار، ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء اشاعت اول، چوتھا باب، ص۔

(۲) احسان الحق فاروقی، محمد (مترجم) " گلشن بے خار"، از مصطفی خاں شیفتہ، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۲

شگفتہ و موزوں سے نسبت دل چسپی کا باعث رہی ہے -(۱) بعض نے صرف پہلے جملے کو لیا ہے -(۲) بعض نے تیسرے جملے سے بھی استفادہ کیا ہے -(۳) ایک تذکرہ نگار نے دوسرے جملے کو بھی شامل کرلیا ہے -(۴) ایک صاحب نے ان جملوں پر " مدت سے فکر شعر و سخن کا کرتے ہیں" کا اضافہ کیا ہے(۵) تین اصحاب تذکرہ نے ان کے " صاحب دیوان" ہونے کی خبر دی ہے -(۶)

---

(۱) مشفق خواجہ (مرتب) ، " خوش معرکہ زیبا" از سعادت خان ناصر، لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۷۲ع ، ج ۲، ص ۱۲۸

طفیل احمد (مرتب) " یادگار شعرا" از اسپرنگر، الہ آباد ، ہندوستانی اکیڈمی، ۱۹۴۳ع ، ص ۲۹

نساخ ، عبدالغفور، " سخن شعرا"، لکھنؤ : مطبع نول کشور، ۱۲۹۱ھ ، ص ۳۲

صفا بدایونی، عبدالحی، " شمیم سخن"، مرادآباد : مطبع امداد الہند و عین الاخبار : س ن ، ص ۹۶

کلیم ، نورالحسن، " طور کلیم"، آگرہ : مطبع مفید عام ، ۱۲۹۸ھ، ص ۱۲

آزاد ، محمد حسین، " آب حیات"، لاہور : شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۴ع ، ص ۳۱۵

(۲) شہدا ، عبدالشکور، " بیاض سخن" حیدرآباد (دکن) : ۱۳۵۵ھ، ص ۷۱

محسن، محسن علی، " سراپا سخن"، لکھنؤ : مطبع نول کشور، س ن ، ص ۲۸۲ (حاشیہ)

شہابی، مفتی انتظام اللہ ، " آخری بزم"، کراچی : جناح لٹریری اکیڈمی، ۱۹۵۹ع، ص ۹۶

(۳) سلیم ، علی حسن خان، " بزم سخن"، آگرہ : مطبع مفید عام، ۱۲۹۸ھ، ص ۱۲

اسلم فرخی، ڈاکٹر (مرتب) ، " گلشن ہمیشہ بہار"، کراچی : انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۲ع ، ص ۲۸

(۴) کریم الدین پانی پتی، و ایف - فیلن ، " طبقات الشعرائے ہند"، دہلی : مطبع العلوم مدرسہ ۱۸۴۸ع ، ص ۳۵۲

(۵) ایضاً، ص ۳۵۲

(۶) نساخ ، عبدالغفور، " سخن شعرا"، محولہ بالا ، ص ۳۲

صفا بدایونی، عبدالحی، " شمیم سخن"، محولہ بالا ، ص ۹۶

محسن، محسن علی، " سراپا سخن"، محولہ بالا ، ص ۲۸۲(حاشیہ)

ایک تذکرہ نگار نے والد کا نام بھی لکھا ہے اور ان کی امارت بھی اس کے لیے وجہ کشش بنی ہے - لکھتے ہیں : " خلف نواب مرتضیٰ خان، بڑے باپ کے امیر" (۱) اسی طرح اس جملے کی بنیاد " حسن قیاس" پر ہے کہ شعر و سخن سے دلی لگاؤ ہے -(۲) دو تذکرہ نگاروں نے ان کے کلام کے بارے میں بھی رائے دی ہے - ناصر نے خوش سخن ہو" اور سری رام نے " اچھا کہتے ہیں" کے الفاظ لکھے ہیں -(۳)

محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ چار سال ہوئے راولپنڈی میں انتقال ہوا-(۴)

صاحب " خم خانۂ جاوید" نے سال اور عمر کی صراحت کردی ہے - یعنی ۱۸۸۰ء میں ۶۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا-" (۵)

اکبر کے بارے میں بنیادی معلومات ہیں- ان سے بعض نتیجے بھی نکالے گئے ہیں- مثلاً سال انتقال اور اس وقت کی مصرحہ عمر سے تاریخ [سال] پیدائش ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء کی تخریج (۶) یا شیفتہ کے جملے" کچھ دنوں سے شعر سے رغبت کرتے ہیں" سے یہ نتیجہ کہ " ان کی شاعری ۱۲۴۴ھ کے قریب شروع ہوئی ہوگی-(۷)

---

(۱) شہابی، مفتی انتظام اللہ، " آخری بزم"، محولہ بالا، ص ۹۶
(۲) ایضاً، ص ۹۶
(۳) مشفق خواجہ (مرتبہ)، " خوش معرکہ زیبا"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۱۷۸
(۴) آزاد، محمد حسین، " آب حیات"، محولہ بالا، ص ۳۱۵
(۵) سری رام، لالہ، " خم خانۂ جاوید"، لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۹۰۸ء، ج ۱، ص ۳۷۵
(۶) ظہیرالدین صدیقی، ڈاکٹر، " مومن — فن اور شخصیت"، دہلی: دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء، ص ۵۳۱
(۷) فائق رام پوری، کلب علی خان، " مومن" لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۱ء، ص ۱۳۱

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ان کے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں :

" اکثر ان کی غزلوں میں مومن کی صدائے باز گشت سنائی دیتی ہے ۔ مگر انھوں نے استاد کا رنگ اپناتے ہوئے اپنی انفرادیت کو بھی قائم رکھا ہے ۔" (۱)

حالی نے " حیات جاوید " میں جہاں سرسید کی ابتدائی زندگی کے احوال بیان کیے ہیں اور سرسید کی زبانی اس زمانے کے تیراکی کے جلسوں اور تیراکی سیکھنے کا ذکر کیا ہے ۔ وہاں اکبر خان کا نام بھی آیا ہے ۔ سرسید بیان کرتے تھے :

" میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اس زمانے میں بھک تیس چالیس آدمی اور والد کے ساتھ ہوتے تھے ۔ انھیں دنوں میں نواب اکبر خان اور چند اور رئیس زادے بھی تیراکی سیکھتے تھے ۔" (۲)

اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ سرسید کی اکبر خان سے بچپن سے واقفیت اور تعلقات تھے اور فن تیراکی میں وہ سرسید کے والد کے شاگرد تھے ۔

===xxx=====

جناب نواب محمد مصطفی خان بہادر حسرتی و شیفتہ سلمہ اللہ تعالی :

" مسند آرائے جاہ و جلال ، زیب و سادۂ مکنت و اقبال ۔ عمدۃ ارکان دولت ، اسوۂ اساطین حشمت ۔ بادی ایوان رفیع البنیان ایوان خاقانی ، موسس اساس بلند پایۂ والا سلطانی ۔ چمن آرائے طالع بلند ، حدیقہ طراز مدارج ارجمند ۔ شراب زلال سرچشمۂ بلند اقبال خدیو درجۂ والا و صاحب مرتبۂ عالی ، مہبط انوار سعادت ازلی ، مورد انظار مراحم لم یزلی ۔

---

(۱) ظہیر احمد صدیقی ، ڈاکٹر ، " مومن ــــ فن اور شخصیت " محولہ بالا ، ص ۵۳۳

(۲) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " حیات جاوید " ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۳۸-۳۷

دہن شناس شخص، سخن فہمی و سخن دانی، قانون دان پردۂ نکتہ سنجی و نکتہ دانی۔ حاتم کرم عطا ر صورقم رکککک رستم توان نواب محمد مصطفی خان بہادر۔ ریختہ مین شیفتہ اور فارسی مین حسرتی تخلص کرتے ہین۔ اگر ان کے جاہ و جلال و حشمت و اقبال کی مدح لکھون کبریا اس بارگاہ کے اندیشہ کو مانع بار ہے، اور اگر ان کی شجاعت ذاتی اور جرات جبلی کے اوصاف ذکر کرون اس تہمتن توان کی ہیئت مشعری سے فکر لرزۂ دہشت مین بے اختیار - اور اگر بالفرض ان سب چیزون سے ہاتھ اٹھاکر چاہون کہ مناسبت مقام سے ذکر سخن دری و معنی پروری کا کرون تاکہ بسبب فی الجملہ عبارت کے خامہ قاصر البیان کچھ طی لسان کرسکے۔ جب اس جگہ قدم رکھا ہر مضمون پست کو اوس درجۂ بلند پر دیکھا کہ کنگرہ عرش بایں ہمہ سربلندی اس زینہ سے ہزار پا پہ نیچے تھا، اور طائر بلند پرواز سدرہ سو برس کی پرواز کے بعد وہان تک پہونچ نہ سکتا تھا۔ اندیشہ کوتاہ اس بلند پروازی سے عاجز اور اس بالا روی سے زبون ہوکر ایک سیدھے رستے پر پڑ لیا، یعنی کچھ احوال سعادت اشتمال اس حضرت کا لکھ کر چاہتا ہے کہ اپنے تئین روشناس اہل سخن کرے - یہ زبدۂ اراکین روزگار خلف الرشید اعظم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضی خان بہادر مظفر جنگ مرحوم کے، اور باعتبار کمالات ظاہری اور جلالات باطنی کے فخر خاندان اور شرف دودمان ہین۔ خاک ان کے دروازہ کی معدن زر اور سنگ اون کے آستان کا کان گہر اگر ابرنیسان کو ان کے بحر کف سے ایک دم حاصل نہ ہوتی گوہر بار نہ ہوتا، اور اگر آفتاب کو ان کے چہرۂ شگفتہ کا فیض نہ ملتا عالم اس کے اثر سے گل زار نہ ہوتا، بہار ان کے خلق سے نکہت آمیز اور موج کککو گوہر ان کے بحر عطا سے طوفان خیز - زہے شجاعت کہ اگر مصور طراحی کے وقت ان کا نام لے تصویر رستم مین لرزہ پڑ جائے۔ اور عجب عدالت کہ اگر ان کی مدح کے وقت نوشیروان کے نام لینے کا ارادہ کرین زبان کو اس حرف سے ننگ آیے۔ بلند پایگی حشمت و جاہ کا وہ عالم کہ صاید روزگار ان کے خاک آستان کو بہ از تاج دارا جانتے ہین، اور ہزار سلام بے جواب

کو بدتر خلعت دارائی سے سمجھتے ہیں اور خلق و حلم کا وہ حال کہ احوال ہر خاکسار جب تک نظر شفقت سے نہ گذرے نسخۂ مراحم کو ناتمام اور دفتر لطف کو ابتر تصور کرتے ہیں۔ سبحان اللہ انک لعلی خلق عظیم کا مظہر اس سے زیادہ ہونا محال ہے ۔ نہ تخلق باخلاق اللہ اس سے بڑھ کر ہونا وہم و خیال ۔ باوجود ناز و نعم ثروت کے مشق سخن کو اس مرتبہ پر پہنچایا۔ کہ قلم تردد سے نہیں آسودہ ہوتا اور فکر تلاش سے بلبل کی سجع خوانی اور قمری کی فصیح بیانی انہیں کی نستعلیق گوئی سے مستفاد ہے ۔ الحق یہ پایہ فصاحت کا اور یہ سرمایہ بلاغت کا خدا داد ہے ۔ اگر رنگینی مضامین کے گل کو رنگ اور نمک عبارت کی لطافت گو ہر کو آب نہ دے، بلبل کا عشق کامل اور تاج سلاطین کی زیب تمام نہ ہو۔ مصرع غزل شعلۂ آہ عشاق اور بیت مثنوی ابروی خوبان آفاق ۔ انتخاب ان کے کلام بلاغت نظام کا اس مقام پر سرمایۂ فرحت ارباب نظر ہے اور مشغلۂ اہل ہنر۔

رقعہ بنام جناب مرزا اسد اللہ خان غالب
++++++++++++++++++++++++++

ای از نفس خامۂ مشکیں رقم تو

عنبرین کدہ در جیب و بغل بادصبا را

بہ ورود والا نامۂ دلا آمود بانثر نثار و اشعار شعری شمار، اندازۂ اعتبار خویش برگرفتم حد مرتبہ نظم و نثر دانستم ، آں سینہ را بیک ایمان دہر از اشاشدت و این دل را بیک سحر فروغ شہد کی ساخت ۔ آں پی خود شوق نمود و این مشتی دادش افزود۔ بران سرم کہ پارۂ از وقت هما بچون نظم و خجستہ نثر رقم کنم کہ عرصۂ سخن فراخ است و طبع من چالاک یک دوسہ جولان شوخ را وقت است ولی ترسم کہ بیکش اغراق گوید و دیگریش غلو خواند ، و ندانند کہ اگر مہر را مہر و ماہ را ماہ گفتہ شود چہ غلو و کدام اغراق تواند بود۔ گل را رنگینی و بوئی هست و مل را اثری و ذوقی ۔ اگر انچہ در آنست بر لب آید چرا شگفت نماید۔

بالجمله از طرز شاعرانه میگریزم که چنین دیرنگی احتمال ها با اوست ، سخن ساده و بی رنگ می گزارم که دربار نامهٔ راستان نخستین بجام او تو شیح یافته - وهان وهان طرفه ارج و جا هے - دربار گاه مهد فیاض صهیب بخت بلند که حضرت است که نه همین یک ره که صدره دیده ام تشریف تان دیگر است و تشریف دیگران دیگر، عرفی مطالب را درین زمین نظمی است و هم شمارا نظمی ، این دیگر است و آن دیگر - سیرابی معنی درسخن عرفی مسلم است ولی لفظ شگفته کو، شادابی الفاظ در گفتار طالب بجاست اما معانی تازه کجا ، همانا چنین نغز گوئی و نادره سنجی در بخش صاحب افتاده است و بس خوبش گفته آن که گفته :

" کم افتد چنین نکته بود از کم
که نازند از و لفظ و معنی بهم

نازم بدم گیر او نفس با اثر که افسردهٔ طبع مرا گرم گفتار ساخت ، تا این خوش انگیز سخن از دیده بدل رفت ، دل چنان فعل در آتش گشت که کلک نادیدهٔ هنگامهٔ گریستن بلند آوازه نکرد و مژه را ه و رسم ابر بهاری تازه کلکو نکرد- از بی قراری نه نشست و از برنخاست - بی خبران چشمک می زنند میدانم در مجلس اعجاز دم از افسون باطل زدن نه رواست ، اما چه کنم چکیده دل است و تراو دیده جگر- نهفتن نیز دوهی از جفاست ، لا جرم عنان ادب رها میکنم و لب به تکلم آشنا می کنم - "

رقعهٔ دیگر
+++++++

خورشید با به صاحبا ! شبی اندیشهٔ جهان بها افراز فلک حرامید تا نظری بر خوب و زشت گیتی تواند افکند ، از ذره تا مهر و از خاک تا فلک همه را سربسر در نگریست ، نه نگریستنی بی حضور بلکه بدیهی را در لباس نظری جلوه گرساختند ، نظار گی آمد- هر چند اگر برعکس رفتنی هم به نیروی حدس خدا داد بیراهه نشافتی و بی جا وحرام

دیهقانی، اما پاس زبان بندی کوتاه نگاهان و بجا آورد فرمان حزم بایکدریق چالش فرمود،
خشکیده عرق درختی نماند که برنگ سبزهٔ خرم مطرح صد نظر نشد، دیوزکه دریادیهفته خز فی دهود
که گوهر یک دانهٔ نمط خوشی دیدش بدل دربین نه بپیچید، چون امیر خسایس این پایه
دریافتی که دیدهٔ‌زم هیکل یکرشمه شاهد نازنین و آتشیزه بلمعهٔ اسپهدار بود، چه پرسی
از شرائف و جلائل که هر یکی ازان بنگاه فتح و دلال یوسفی داشت، و هر کدام بنظر فریبی
و دل آرائی حوری بود، از فردوس فرود آمده، با بی نقاب از رخ بر گرفته ولی ازین مبادله
متاعی که بادوستی هم ارزش و کالائی که با محبت هم بها باشد مشهود نشد - گوهری باین
تابانی و اختری باین رخشانی منظور نگشت، خورشید پیش قرهٔ دوشب تیره شناس و از ماه کمتر
پرین محیط در جذب جز ر ومد طغیانیش شبنم گیر و از عمان کمتر - گوشیکه اگر پرتوی از فروغش
دریابدهد شعلهٔ آذر کمان دود جهنم بود، و بلبل اگر لمعهٔ ازان تجلی کسب کند آتش گل
را هم جلوهٔ انگشت شناسد، تا ازین نافهٔ شمیمی مشکین نه یافت، اگر همه مجنونستی خود را
در چشم لیلی نوفل شمار و تا ازان شکرستان ذوقی بکام نرسیدست - گو همه پرویزستی شیرین
را ازان حریف بندار - فذلکهٔ سخن چون نگاه بخود افتد، دریافت پیش ازان که روز نه از
سیستان
سیدستان آگهی کشاده گردد - مهبط این دو مورد این تجلی بود - بسجده افتاد و بسپاس
رفت و ترانهٔ شادمانی برکرد و زمزمهٔ نشاط بلند آوازه گردانید و افزونی ورزش این فرخ شیوه از
خدائی درخواست و پیش آورد ضوابط و رسوم آن را بحدی تمامتر خواهند آمد روشنی پذیرفت
که علاوه علاقهٔ معنوی مراسم صوری را در افزایش مدارج اتحاد دوستگاهی دیگر است، لا جرم بنگار
شمامه گستاخ گشت، می داند که مراتب عطوفت را سرمایهٔ والاست حضرت مخدوم باین بوکده بگرت
زلت خواهد بخشود - دل از در و طبع حریص است که لختی گله از درد دوری سردهد
و ولی خالی کند، اما بس بی نسبت است چه آنجا که مجرد رقم سنجی در بیم و امید دادگر

این مایهٔ جرات را دبود از کجا خیزد و بهت :

حسرتی

xxxxx تو نامه آرائی و من پاسخ طلب

زده بر بال کبوتر بند مکتوب مرا

والسلام

اشعار فارسی

+++++++++

خوش آمدم کو هجوم شکوه طفلی زیر لب گریان

تو برخیزی زناز و حسرتی در دامن آمیزد

======

پهلوی غیر به بزمش نکنم جای که هست   چشم آنم که نگاه غلط انداز کند

===XXX===

جای رحم است برآن بسمل مسکین که هنوز

نیم جانی به تنش باشد و قاتل برود

بی قراری اگر اینست چه قاصد چه ندیم   آسمان از پی آوردن محمل برود

===XXX====

بسخان تو هوسناک فرستد پیغام   بکمند تو سلام از دل آزاد رسد

===XXX====

خاکم بسر که عاشق کار افتاده ام   دانم که بارقیب بخلوت چها رود

===XXX====

بیاد طاعت مقبول را بیشمار   خلل بکار دعا هائی مستجاب انداز

===XXXX=====

شب فراق بمهتاب و گل ستیزه کنم   بروز وعده بهاران و بادزین دارم

جواب طعنهٔ حرمان و طنز ناکامی　　　همین بس است که معشوقه نازنین دارم

===XXX==

نی سجودم را قبول و نی سلامم را جواب

رایگان بود این که می جا بران در داشتم

ظلمت شب برقرار و صبح ناپیدا هنوز　　　حسرتی بیجا سر از خواب عدم برداشتم

===XXX====

مرا بخشید و گاهی جز بدی نیکی ندید از من

نمی دانم کدامین جرم ایزد بر گزید از من

سخن بے ربط گوئی حسرتی لیکن نمی گیرم

همین روداد من هم بود و چون یارم برید از من

====XXXX====

اشعار ریخته
+++++++++

ای مرگ آ کہ میری بھی رہ جائے آبرو　　　رکھا ہے اس نے سوگ عدو کی وفات کا

ہائے اس برق جہان سوز پر آنا دل کا　　　سمجھے جو گرمیٔ ہنگامہ جلانا دل کا

شکل مانند پری اور یہ افسوں وفا　　　آدمی کا نہیں مقدور بچانا دل کا

نقش تسخیر غیر کو اس نے　　　خون لیا تو مری کبوتر کا

میری ناکامی سے فلک کو حصول　　　کام ہے یہ اسی ستم گر کا

====XXXX====

خوبی بخت کہ پیمان عدو　　　اس کو ہنگام قسم یاد آیا

===XXXX====

اس سے میں شکوہ کی جا شکر ستم کر آیا   کیا کروں تھا میرے دل میں سو زبان پر آیا

آپ مرتے تو نہیں پر جیتے ہی بن آئے گی   شیفتہ ضد یہ جو اپنی وہ ستم کر آیا (۱)

===xxx====

کوئی گلچیں جہاں میں نہیں جیتا لیکن   تیرے مہجور کو جیتے ہوئے بے جان دیکھا

اس طرف کو بھی نگہ تا سر مژگاں آئی   ہائے کچھ کچھ اثر گریۂ پنہاں دیکھا

===xxx====

وہ لکھتا تھا غم ناکامی عشق   جواب نامۂ بے مدعا کیا

===xxx====

کب طالع خفتہ نے دیا خواب میں آنے   وعدہ بھی کیا وہ کہ وفا ہو نہیں سکتا

===xxx====

گور میں یاد قد یار نے سونے نہ دیا   فتنۂ حشر کو رفتار نے سونے نہ دیا

شب ہجراں نے کہا قصۂ گیسوئے دراز   شیفتہ کو بھی دل زار نے سونے نہ دیا

===xxx====

بسکہ آغاز محبت میں ہوا کام اپنا   پوچھتے ہیں ملک الموت سے انجام اپنا

تاب بوسہ کی کسے شیفتہ وہ دیں بھی اگر (۲)   کرچکی کام یہاں لذت دشنام اپنا

===xxx===

کیا ہوسکے کسی سے علاج اپنا شیفتہ   اس گل پہ غش ہیں جس میں محبت کی بو نہیں

دشمن کہیں گیا نہ ہو آنکھوں سے شیفتہ   اس کی گلی میں آج نشان قدم نہیں" (۳)

---

(۱) شوق مردن توڑے پر جینے سے بن آئے گی (~~گلشن بے خار، ص ۲۴۸~~)
شیفتہ ضد یہ جو اپنی ستم کر آیا (گلشن بے خار ، ص ۲۸۹)

(۲) تاب بوسہ کی کسے دیں بھی وہ اب شیفتہ گر   ص ۲۸۷

(۳) سرسید احمد خاں،" آثار الصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، ص ۲۰۵-۱۹۷

تعلیقات :

* مصطفی خان نام ، شیفتہ و حسرتی تخلص اور عظیم الدولہ خطاب تھا۔ جو بہادر شاہ ظفر نے عطا کیا تھا۔ خاندانی رئیس و جاگیر دار تھے۔ اس لیے نواب مصطفی خان کہلاتے تھے۔ والد سرفراز الملک نواب مرتضی خان بہادر خلف ولی داد خان، نواب محمد خان بنگش رئیس فرخ آباد کے ہم جد تھے۔ نواب مرتضی خان مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر کی فوج میں ملازم تھے ۔ آپ ہی کے حسن تدبیر سے لارڈ لیک اور ہلکر میں صلح ہوئی تھی۔ لارڈ لیک ان کی شخصیت ، ذہانت اور معاملہ فہمی کی صلاحیت سے متاثر ہوا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انگریزی حکومت نے ۱۸۰۳ء میں ہوڈل پلول کا علاقہ ان کی زندگی کے لیے جاگیر میں دے دیا تھا۔ انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ اس کا انتظام چلایا۔ اور جہانگیر آباد (ضلع میرٹھ) کا علاقہ نیلام میں خرید لیا۔ ہوڈل پلول کی جاگیر تو نواب مرتضی خان کے انتقال کے بعد ضبط ہوگئی ۔ البتہ ان کی اولاد کے لیے بیس ہزار روپے سالانہ پنشن مقرر تھی ۔ جہانگیر آباد کا علاقہ ان کی اولاد کے پاس باقی رہ گیا۔(۱)

چھتا مہم کے چھتے میں سیدھی طرف کو ان کا بہت عالی شان مکان تھا جو ۱۸۵۷ء میں ختم ہوگیا۔ البتہ کوچہ چیلاں میں اب بھی ان کی شان دار حویلی موجود ہے۔ اور آپ ہی کے نام سے مشہور ہے ۔(۲)

---

(۱) بشیرالدین احمد دہلوی،" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۸۰۲
ظہیر احمد صدیقی ڈاکٹر، " مومن — فن اور شخصیت " محولہ بالا ، ص ۵۷۰
عسکری ، مرزا محمد (مترجم) ،" تاریخ ادب اردو"، از رام بابو سکسینہ ، لاہور : کتب خانہ علمیہ ، س ن ، ج ۱ ، ص ۲۷۷
رئیس احمد جعفری ، سید ،" بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، لاہور : کتاب منزل ، ۱۹۵۵ء ، ص ۳۸۲

(۲) بشیرالدین احمد دہلوی،" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، صص 151 اور ۱۷۲

شیفتہ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے ۔ کلب علی خان فائق کی رائے میں ١٢١٨ھ/١٨٠٣ع ، عندلیب شادانی کی رائے میں ١٢٢٤ھ/١٨٠٩ع اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کی رائے میں ١٢٢١ھ/١٨٠٦ع تاریخ ولادت ہے۔ مولانا سید عبدالحی ، محمد یحییٰ تنہا اور رام بابو سکسینہ نے بھی ١٨٠٦ع سال ولادت لکھا ہے ۔ اور میری رائے میں بھی یہی صحیح ہے ۔ ١٨٦٩ع میں انتقال کے وقت تریسٹھ (٦٣) سال کی عمر کی صراحت بھی موجود ہے ۔(١) دہلی میں پیدا ہوئے ، وہیں نشو و نما پائی ، تعلیم کے مراحل بھی دہلی میں طے ہوئے ۔ اور ١٨٥٧ع تک زیادہ تر دہلی ہی میں ان کا قیام رہا۔

انھوں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں دہلی کے مشہور معلم میاں جی مالا مال سے پڑھیں ۔ حدیث و تجوید میں مولانا محمد دو سے استفادہ کیا۔ مولانا کرم اللہ محدث خلیفہ حضرت شاہ غلام علی سے بھی علوم کی تحصیل کی تھی۔ ١٢٥٥ھ میں حج کے لیے حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ اس موقع پر آپ نے مکہ معظمہ میں شیخ عبداللہ سراج حنفی سے اور مدینہ منورہ میں شیخ محمد جان سندھی سے حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ (٢)

---

(١) فائق رام پوری ، کلب علی خان ، " مومن " ، محولہ بالا ، ص ١٥٣
ظہیر احمد صدیقی ، ڈاکٹر ، " مومن ـــ فن اور شخصیت " ، محولہ بالا ، ص ٥٧٠
شمس الدین صدیقی ، ڈاکٹر ، " نواب مصطفیٰ خان ، شیفتہ " (مقالہ) " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند " ، لاہور : پنجاب یونی ورسٹی ، ١٩٧١ع ، ج ٨ ، (اردو ادب ، حصہ سوم) ، ص ٢١٦
عبدالحی ، مولانا سید ، " گل رعنا " ، اعظم گڑھ : دارالمصنفین ، ١٣٣٠ھ ، ص ٣٣٠
تنہا ، محمد یحییٰ ، " مراۃ الشعرا " ، لاہور : عالم گیر الیکٹرک پریس ، ١٩٣٥ع ، ج اول ، ص ٥٦٩
عسکری ، مرزا محمد ، (مترجم) " تاریخ ادب اردو " ، محولہ بالا ، ج ١ ، ص ٢٧٧

(٢) بشیرالدین احمد دہلوی ، " واقعات دارالحکومت دہلی " ، محولہ بالا ، ج ٢ ، ص ٨٠١
مناظر احسن گیلانی ، مولانا ، " سوانح قاسمی " ، محولہ بالا ، ج ١ ، ص ٣٣٥
رئیس احمد جعفری ، سید ، " بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد " ، محولہ بالا ، صص ٣٨٦-٨٧

مولانا شاہ محمد اسحاق سے بیعت تھے۔ اور ان کے انتقال کے بعد شاہ ابوسعید اور شاہ احمد سعید مجددی کی خدمت میں حاضر ہوکر فیوض باطنی حاصل کرتے رہے آخر میں شاہ عبدالغنی نے انھیں اپنا خلیفہ اور مجاز بیعت اور ارشاد بھی بنادیا تھا۔ ان کا شمار شاہ صاحب کے اجل خلفاء میں ہوتا ہے - (۱)

۱۸۵۷ء میں جہانگیر آباد پر بھیم سنگھ اور اس کے ساتھی ٹھاکروں نے قبضہ کرلیا تھا اور املاک کو لوٹ کر کوٹھی کو آگ لگادی تھی۔ جس میں ان کا نہایت قیمتی کتب خانہ بھی جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ اگرچہ ریاست پر نواب یوسف علی خان والی رام پور نے قبضہ دلا دیا تھا لیکن نواب صاحب پر صرف یہی الزام عاید نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنے علاقے کو بغیر انتظام و بندوبست کے کیوں چھوڑا اور باغیوں کا مقابلہ کیوں نہ کیا بلکہ ان پر بغاوت کا الزام بھی تھا۔ انھوں نے استخلاص وطن کی امنگ میں اپنے آپ کو نواب ولی داد خان رئیس مالا گڑھ سے وابستہ کردیا تھا۔ (۲) عبداللطیف کے روز نامچے میں یکم ذیقعدہ ، ۱۲۷۲ھ کا یہ اندراج موجود ہے :

"نواب ولی داد خان کی عرضی سے ظاہر ہوا کہ مصطفی خان ولد مرتضی خان سرکار انگریزی کے تعلق سے سبک دوش ہوکر دربار میں حاضری کے مشتاق ہیں اور شرف ملازمت کے شیدائی ہوکر یہاں بے قرار ہیں۔ حکم ہوا کہ چاہیے کہ اپنے جرگے کے ساتھ ان کو دارالخلافہ میں پہنچادیں۔" (۳)

---

(۱) بشیرالدین احمد دھلوی، "واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۸۰۱
مناظر احسن گیلانی، مولانا "سوانح قاسمی"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۳۳۵

(۲) بشیرالدین احمد دھلوی، "واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۸۰۱
ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر، "مومن --- فن اور شخصیت"، محولہ بالا، ص ۵۷۱
رئیس احمد جعفری، سید، "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، محولہ بالا، ص ۳۸۱

(۳) خلیق احمد نظامی (مترجم و مرتب)، "۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامچہ" از عبداللطیف دھلی : ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۲ء، ص ۱۳۱

جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد انہیں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ بغاوت کا ان پر الزام تھا اور غلط نہ تھا۔ سزائے موت متوقع تھی لیکن حکومت نے مصالح کی بنا پر صرف سات سال کی قید کا حکم سنایا البتہ جاگیر تمام ضبط کرلی گئی۔ (۱) اپیل پر قید سے رہائی مل گئی لیکن جائیداد کی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی نصف سے زیادہ واگزار نہیں ہوسکی۔ ان کوششوں میں سب سے زیادہ حصہ نواب صدیق حسن خان کا تھا۔ (۲)

نواب مصطفیٰ خان کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ وہ اردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص استعمال کرتے تھے۔ پہلے مومن خان مومن کو کلام دکھاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد غالب کو اپنی غزلیں دکھانے لگے۔ ان کا عشق ذوق نہایت پاکیزہ اور تنقیدی شعور بہت بلند تھا۔ ان کی سخن فہمی اور سخن سنجی کے کمال کا اعتراف غالب نے بھی کیا ہے:

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل
چون او تلاش معنی و مضمون نہ کردہ کس

سرسید نے بھی ان کی ککک سخن فہمی ، سخن دانی اور نکتہ سنجی کا اعتراف کیا ہے ۔ حالی نے ان سے فیض اٹھایا۔ اور تسلیم کیا ہے کہ غالب سے وہ فیض انہیں نہیں پہنچا جو شیفتہ کی صحبت سے ملا ۔ ان کے کلام میں الفاظ کی خوبی و نشست ،

---

(۱) بشیر احمد دہلوی، "واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۸۰۱
خلیق احمد نظامی (مترجم و مرتب)، "۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ"، محولہ بالا، ص ۲۰۳
ظہیر ککک احمد صدیقی، ڈاکٹر، "مومن — فن اور شخصیت"، محولہ بالا، ص ۵۷۱

(۲) مہر، مولانا غلام رسول، (مرتب)، "نقش آزاد" (مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد)، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۹ء، ص ۱۱–۲۱۰
محمد میاں، مولانا سید، "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۴، ص ۲۵۸
ظہیر احمد صدیقی ڈاکٹر، "مومن — فن اور شخصیت"، محولہ بالا، ص ۵۷۱
رئیس احمد جعفری، سید، "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، محولہ بالا، ص ۳۸۱

انداز بیان کی شگفتگی ، اسلوب نگارش کی متانت اور اخلاق و نصیحت اور فلسفے کی رنگارنگی ہے۔(۱)

ان کی تصانیف میں سفر نامہ حج جس کا فارسی نام " رہ آورد " اور عربی نام " ترغیب السالک الی احسن المسالک " ہے - مجموعہ وقعات ورقعات موسوم بہ لحن عراق ، اپنے زمانے کے اکابر اہل علم و ادب کے نام پر تینتیس (۳۳) خطوط کا مجموعہ ، چھ سو اکتھر شاعروں کے تذکرہ " گلشن بے خار" اور دیوان فارسی میں یادگار ہیں۔ سفر نامہ اور تذکرہ کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے - اردو میں دیوان شیفتہ ہے - کلیات شیفتہ و حسرتی ان کے اردو اور فارسی کلام پر مشتمل ہے - ان کا ایک قلمی کلیات کتب خانہ رام پور میں ہے علامہ ابن جوزی کے مولد کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا- (۲)

شیفتہ نے دو شادیاں کیں پہلی بیوی سے محمد علی خان رشکی تھے اور دوسری سے دو بیٹیاں اور دو بیٹے نقشبند خان اور محمد اسحاق خان تھے- نقشبند خان نے ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۷ء میں عین جوانی میں انتقال کیا- نواب اسحاق خان بہت مشہور ہوئے - علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے- ۱۳۳۷ھ/۱۹-۱۹۱۸ء میں انتقال ہوا- (۳) ان کے صاحب زادے/جی - اے - مدنی کراچی میں مقیم ہیں-

-----

(۱) احسان الحق فاروقی، محمد(مترجم) ، " گلشن بے خار"، محولہ بالا ، ص ۳۸۵
شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر" نواب مصطفی خان شیفتہ"(مقالہ) ، محولہ بالا ، ج۸ ، (اردو ادب ، حصہ سوم) ، ص ۲۲۳
ظہیراحمد صدیقی، ڈاکٹر" مومن — فن اور شخصیت"، محولہ بالا ، صص ۷۵-۵۷۳
فائق رام پوری، کلب علی خان" مومن"، محولہ بالا ، صص ۵۸-۱۵۶
تنہا ، محمد یحییٰ" مراۃ الشعرا"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۵۷۱

(۲) شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر" نواب مصطفی خان شیفتہ"(مقالہ) ، محولہ بالا ، ج۸ ، (اردو ادب ، حصہ سوم) ، ص ۲۱۷
ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر" مومن— فن اور شخصیت"، محولہ بالا ، ص ۵۷۲
عبدالحی، مولانا سید" نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۸۳

(۳) بشیرالدین حامد دہلوی" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۳۳۳
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر(مرتبہ)" کلیات نظم حالی"، لاہور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء ، ج ۲، ص ۳۳۳
ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر" مومن — فن اور شخصیت"، محولہ بالا ، ص ۵۷۲

آخر عمر میں نواب مصطفی خاں سرطان کے مرض میں مبتلا ہوگئے تھے۔ ذیابیطس کی شکایت پہلے سے تھی۔ ہاتھ میں کالا دانہ بھی نکل آیا تھا ، جو ان کی موت کا سبب بنا۔ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں تریسٹھ سال کی عمر میں دہلی میں انتقال ہوا۔ درگاہ سلطان المشائخ میں جہاں ان کے والد اور دادا کی قبریں ہیں، مدفون ہوئے ۔(۱) حالی نے آیت قرآنی " وجزاهم بما صبروا جنة و حريرا" سے تاریخ وصال نکالی ہے ۔ اس سے ۱۲۸۵ھ برآمد ہوتے ہیں جب کہ انتقال ۱۲۸۶ھ میں ہوا۔ اس لیے حالی نے لفظ جنۃ کی بجائے جنات لکھا ہے ۔ کلیات نظم حالی میں ۱۲۷۷ھ درج ہے جو درست نہیں۔(۲)

نواب مصطفی خاں کی ابتدائی زندگی بڑی رنگین اور عیش و عشرت میں گزری تھی لیکن حج کے بعد ان کی زندگی میں بڑا انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔ تمام لہو و لعب سے توبہ کرلی تھی۔ البتہ گھوڑے پالنے اور شہ سواری کا شوق آخر عمر تک رہا ان کے اصطبل میں آخر تک نہایت عمدہ گھوڑے رہے ۔ زہد و ورع اور تقوا اور پرہیزگاری میں اپنی مثال آپ تھے۔ " ارواح ثلاثہ" کی متعدد روایات میں انھیں صاحب ولایت کہا گیا ہے ۔ اور کئی تذکرہ نگاروں نے ان روایات کو اختیار کیا ہے ۔ وہ صرف نماز پنج گانہ کے پابند تھے، اشراق و چاشت کے علاوہ تہجد گزار بھی تھے۔ ان کے بلند مدارج کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شاہ عبدالغنی ، مولانا رفیع الدین جیسے عالم کو نواب صاحب سے استفادے کا مشورہ دیتے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے کہ تم ان کی ریاست کو نہ دیکھو بلکہ ان

---

(۱) بشیرالدین احمد دہلوی،" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۲-۸۰۱
شمس الدین صدیقی ، ڈاکٹر ، " نواب مصطفی خاں شیفتہ"، (مقالہ) ، محولہ بالا ، ج ۸(اردو ادب ، حصہ سوم) ، ص ۲۱۷
رئیس احمد جعفری، سید ،" بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، محولہ بالا ، ص ۳۸۱-۸۲ و ۳۸۶

(۲) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر،" مرتبہ" کلیات نظم حالی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۳۳۲

کے قلب کو دیکھو۔ (۱)

نواب صاحب دلی کی تہذیب اور دہائے ادب کی ایک نادر روز گار شخصیت تھے۔ غالب ، آزردہ ، صہبائی ، علوی ، مہر ، مومن ، احسان ، نصیر ، جوش ، ذوق وغیرہ ان کے زمرۂ احباب میں داخل تھے۔ ان کے مکان کو ایک ادبی اور تہذیبی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے اور مفتی آزردہ کے مکان پر باری باری ہر ہفتے مشاعرے ہوتے تھے اور دلی کے تمام نامور شعرا ان مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے۔ (۲) ۱۸۵۷ء کے بعد یہ مشاعرے اور محفلیں بھولی بسری یادیں اور گزری زمانے کی باتیں ہوگئی تھیں:

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جان پہ بن جاتی ہے
مصطفی خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

حالی کی مشہور غزل

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ !
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

---

(۱) اشرف علی تھانوی ، مولانا (مرتبہ) " ارواح ثلاثہ" ، محولہ بالا صص ۹۲-۳۹۳
مناظر احسن گیلانی ، مولانا " سوانح قاسمی" ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۳۳۶
انوارالحسن شیرکوٹی ، انوار قاسمی" ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۱۳۸
شمس الدین صدیقی ، ڈاکٹر ، " نواب مصطفی خاں شیفتہ" (مقالہ) " ج ۸ ، (اردو ادب ، حصہ سوم) ، ص ۳۱۶
محمد میاں ، مولانا سید ، علمائے ہند کا شان دار ماضی" ، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۲۵۷
بشیر الدین احمد دہلوی " واقعات دارالحکومت دہلی" ، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۳۳۲
ظہیراحمد صدیقی ، ڈاکٹر " مومن --- فن اور شخصیت" ، محولہ بالا ، ص ۵۷۱
تنہا ، محمد یحیی ، " مرآۃ الشعرا" ، محولہ بالا ، کذج ۱ ، صص ۷۰-۵۶۹
رئیس احمد جعفری ، سید " بہادر شاہ اور ان کا عہد" ، محولہ بالا ، صص ۳۸۰ اور ۳۸۶

(۲) عبدالحی ، مولانا سید " گل رعنا" ، محولہ بالا ، صص ۳۱-۳۳۰
فائق رام پوری ، کلب علی خان " مومن" ، محولہ بالا ، ص ۱۵۵

بقول مولانا ابوالکلام آزاد دراصل دہلی مرحوم کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم اور بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اجالا تھا۔(۱)

===XXX====

جناب مولانا مولوی امام بخش صہبائی تخلص سلمہ اللہ تعالی :

" رنگ زدائے آئینہ سخن وری ، صیقل مرآت معنی پروری، نخل بند حدیقۂ کمالات صوری، پردۂ کشائے حسن جلائل معنی معجزہ طراز طرز تازہ بزم افروز محامد بے اندازہ ، ساقی خم کدہ سخن سرائی مولوی امام بخش متخلص بہ صہبائی ۔ نسب آپ کا والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک اور والدہ مشفقہ کی جانب سے حضرت غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے ۔کمالات ظاہری اور جلائل باطنی اور حسن خلق اور محامد اطوار میں پسندیدہ خالق و مقبول خلائق ہیں۔ خلق و خوش آپ کا آئینہ بہار اور اوضاع حمیدہ آپ کے محمود روزگار ۔ اس جزو زمان میں ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گزرا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ فنون متعارفہ سخن وری مثل تحقیق لغت و اصطلاحات زبان دری اور تدقیق مقامات کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ و استکمال فن معما وغیرہا میں ایسا کمال بہم پہنچایا ہے کہ ہر فن میں یک فنی کہنا چاہیے ۔ بیت :

" بدی برفتہ از ہر فنے روشنی
جداگانہ در ہر فنے یک فنی "(۲)

شروح کتب اور رسائل قواعد زبان فارسی اور رسائل علم عروض و قافیہ اور معما جو جو آپ کے رشحۂ قلم نزاکت رقم ہیں ایسے نفائس مقاصد اور جلائل مطالب پر مشتمل ہیں کہ

---

(۱) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتبہ) " کلیات نظم حالی"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۱۱۹
مہر، مولانا غلام رسول (مرتبہ) " نقش آزاد" محولہ بالا، ص ۳۱۶
خلیق احمد نظامی، (مرتبہ) " ۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامچہ "، محولہ بالا، ص ۲۰۳

(۲) یہ شعر نظامی گنجوی کا ہے۔

مشیمان فنون مذکور کو ان فوائد جلیلہ کا حصول بعد ایک عمر دراز کے بھی متعذر ہے، خصوصاً رسالہ گنجینۂ رموز کہ صنعت معما میں آپ کے خامۂ معنی طراز سے جلوہ پرداز ہوا ہے ہر چند رسائل متعددہ اس فن میں اساتذۂ سلف سے یادگار ہیں لیکن جو کہ :

ع "ہر کار رہینِ روزگارے است

حسن اس کمال کا اب تک گنجینۂ تقدیر میں سر بمہر امانت تھا اور ان پیشوایان فن کو دقیقہ یابی کو اس طرز و انداز سے سوائے آرائش سہل کے نصیب نہیں ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وہ رسالہ مشتمل ہے ایک معما کی شرح پر کہ شرح و متن دونوں آپ ہی کے نتائج طبع فیاض سے ہیں۔ وہ بیت باعتبار ظاہر کے سوائے چند کلمات معدود جو ظروف بحور متعارف میں گنجائش پذیر ہوسکتی ہیں اور کیا رکھتی ہے ، لیکن اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے وہ بیت ایک عالم ہے کہ جلوہ ہائے ہزار کو در ہزار سے دیدہ فریب اہل کمال ہے ۔ ارباب دانش و اہل خرد پر ظاہر ہے کہ فن معما اگرچہ اصول شانزدگانہ سے زائد نہیں رکھتا ، لیکن فروع منتشرہ اور شعب متوافرہ اس سے اس قدر متفرع اور منشعب ہیں کہ ظروف حصر و شمار اس کی گنجائش سے عاجز و زبون ہے ۔ اس بیت نے باوجود ایسی تنگ ظرفی کے اس دریائے زخار کو اپنے آغوش میں چھپایا ہے ، یعنی ذیل بیان اعمال میں یہ ہی ایک بیت مثال ہے اور اس سے تین سو ساٹھ مختلف اسامی مستخرج ہوتے ہیں۔ اور طرفہ تر یہ ہے کہ استخراج اس کا نہایت سہولت و بے تکلفی کے ساتھ ہے ۔ اگر انصاف یاران سخن فہم کی طبیعت سے گوشہ گیر نہ ہو تو ارشاد کریں کہ اس کیفیت کے ساتھ کوئی رسالہ عہد آدم سے اس دم تک کسی صاحب استعداد کے پردۂ فکر سے جلوہ گر ہوا ہے ؟ اور ایک رسالہ جواہر منظوم نام مشتمل رباعیات پر کہ ہر رباعی سے ایک نام نامہائے باری توشانہ کا مستخرج ہوتا ہے باوجود لطافت اعمال معمائی کے معنی شعری اس لطف کے ساتھ

ہےکہ ناز و انداز خوبان خلخ و نوشاد اس کے آگے طبائع عشاق سے ہزار کوس پرے رہتا ہے سوائے اس کمال کے نثر و نظم کک زبان دری سے بجزو خورد کبر ہائے متعدد ککامعلو ہیں۔ نثر ایسی کہ نثر کک ثریا اس پر نثار ہے ، اور نظم ایسے کہ نظم جواہر اس پر فدا۔ ایک نثر چار پانچ جزو کی مسمّیٰ بروزۂ جواہر سلطان عہد والی عصر محمد سراج الدین بہادر شاہ خلد اللہہ ملکہ و سلطانہ کی مدح میں اس آب و تاب کے ساتھ ریختہ قلم نزاکت رقم کی ہے کہ اگر رشک و حسد ہم عہدی چشم پوش نہ ہو تو اس کی کے جلوہ گاہ میں سہ نثر ملا نورالدین ظہوری کو ہرگز پردۂ خفا سے جلوہ گر نہ کریں، اور ظہوری کو اس کے عہد میں غاشی بدار ہیں۔ اور ایک انشائے مکاتیب نہایت متانت عبارت اور لطافت معانی کے ساتھ ہے کہ ککک اکثر اس کا بطرز نثر مرزا بیدل علیہ الرحمۃ ہے اور نظم میں غزلیات کثیرہ اور قصائد متعددہ بعضے بطرز متقدمین اور بعض بطرز متاخرین نہایت لطف عبارت و کمال حسن معانی کے ساتھ موجود ہیں۔ الغرض احاطہ آپ کے محاسن و محامد کا اندازۂ تقریر اور احاطۂ تحریر سے افزون ہے - ان کے نظم و نثر کے الفاظ لآلی شاہوار اور معانی یاقوت آب دار کی برابری کرتے ہیں۔ قلم کو انھیں کی عبارت انتساخ سے دستعلیق کرشی میسر اور صفحہ انھیں کے معنی رنگین کے فیض سے بساط گل کا ہمسر۔ ہر دائرہ طراوت معانی رنگین سے ساغر مل اور ہر سطر رنگینی مضامین سے شاخ گل - ان کمالات پر حلم ایسا ہی خلق ویسا ہی - زبان ان کی عرق نسخہ اخلاق اور سینہ ان کا صندوق خزائن وفاق - ہر چند اس سرگروہ ارباب وفاق اور اس سر جملہ نیکو کاران آفاق اور راقم میں سر رشتہ محبت و اخلاق ایسا مستحکم ہے کہ گویا دو قالب میں ایک جان جاری و ساری ہے - اور یہ امر دال ہے اس بات پر کہ ذکر اوصاف حمیدہ اس یگانۂ روزگار کا شاید نتیجہ افراط محبت کا ہو، لیکن راقم نے مراتب دوستی و مدارج اتحاد کو اس ککا امر میں کچھ مدخل نہیں دیا اور جو کچھ بیان واقعی تھا اسی کو

لکھا ، ورنہ محبت کا اقتضا یہ تھا کہ جس وقت ان کی محامد و اوصاف میں زبان کھولتا اور تحریر مناقب قلم کو ہاتھ میں لیتا شاید سوالات محشر کے جواب کی تقریب ہی ایک دو لمحے کے واسطے زبان کو اس ذکر سے باز رکھتی ، اور صدمۂ زلزلہ قیامت قلم کو ایک دو دفعہ ہاتھ سے گرا دیتا - چو نکہ اوصاف نفس الامری بھی غیر متناہی ہیں اور ان کا حصہ ظرف اعداد نا متناہی میں بھی محال ہے ، بالفرض اگر ہمت ان کے بیان سے عاجز نہ ہو زبان کوشش کا درماندہ اور قلم چوبین کا فرسودہ ہونا ممکن ہے - ناگزیر انہیں ایک دو کلمہ پر قناعت کر کر قدرے ان کے کلام بلاغت نظام سے بطریق یادگار کے درج کتاب کرتا ہوں -

نثر از ریزۂ جواہر

تواضع را بانهادش چون موج و دریا هم آغوشی و بزرگی را با سرش چون رفعت و آسمان گرم جوشی- فیض در طبیعتش چون ریزش در سحاب و صفا در ضمیرش چون پرتو در آفتاب: او امر قضارا بانشایعت امرش اندیشه با برتر نیفتادن و اندازۂ قدر را بر مقابلۂ تفهیمش سرنگ رشته حساب از دست دادن- رفعت از سربلندیش با فلک همدوش ، و فروغ از ضمیرش بآفتاب هم آغوش ، مهابت را از پشتیبانی جلالش جرات شیر افگنی و سیاست را از دستیاری قهرش اقدام در گردن زنی، حیا در پیشانیش چون صفا در آئینه و مروت در دلش چون می در آبگینه ، در یارا از کوشش گوهر در گنجینهٔ و معادن را از جوشش زر در خزینه ، از ریزش بی فاصله اش موج دریا دست دراز کرده دُر فراهم آوردن گوهر نا صبور است ، و از انعام متواترش محیط فراخ دامن در تنگی حوصله آز و مجبور ، صبح از خورشید آتش در دل افروخته ، غیرت ضمیر انوار دفینه اش ، و شام از شفق خون در جگر انداخته رشک را ز داغهای سینه اسرار گنجینه اش گل باشگفتگی خاطرش جگر خوار تر از بلبل و گلشن

با رنگینی طبعش افسرده تر از بزم بی مُل ، ظفرآوازهٔ موکب سعادت کوکبش دو سه منزل پیشتر در انداز استقبال و صورت متوجه رایات شرف آیاتش مهمای پیشکشی تحائف اقبال ، مجملات خوبی گل را در صحف رخسارهٔ شاهدان مفصل تفسیر نمودهٔ و مبهات موزونی سرخط مصرع قامت خوبان مصرح تقریر فرموده ، وقت فکرش دریافته که کوتی چشم نرگس از پاس عصمت ابکار چمن جاهز داشته اند ، و گرفتگی زبان‌سوزن بلحاظ بی دماغیهائی بلبل ناتوان واجب پنداشته، نی قلم در کش فواره معمهای رنگین ، و سادگی کاغذ در پیش چشمش عینک دوربین بالطف کلامش سجع بلبل نالهٔ زاغ ، و با خوبی رقمش خط خوبان پائی کلاغ ، نظم اصناف را حرف شمشیرش مقطع ، و قصیدهٔ عدل را سخن تدبیرش مطلع، تیر آرش در برابر خدنگش چون سهم نگاه اعمی از ترکش برنیاید ، و کمان رستم که در جنب کباده اش چون حلقهٔ قامت ضعیفان زورین نه نماید ، تک تیغ ابرو رانیش شمشیرش در نیام بیکاریها زنگار خورده، و سلسلهٔ زلف را در عهد کمندش از بی قدری یاد برده ، جنگ آزمائی که تهمتن قواعد رزم را از کمترین چاکرش یاد کرده و بختیاری که سکندر کوس فتح را چرم از تعلیمش برده، شهستانش از ساغر کلک طرب غیرت گلشن ، و ایوانش از میناتی عشرت رشک چمن ، اهل وفاق را چهره از زعفران زار عهدش ارغوانی ، و ارباب نفاق را رخ از ارغوان‌کار تیغش زعفرانی لمعهٔ تیغش بر خرمن هستی اعدا برق ، و نالهٔ رعد باطنطنهٔ کوسش زرق ، در هوای عرصهٔ جنگش از رنگ پریده ، دشمنان صدشهاب ثاقب جلوه گر ، شیر فضای رزمش از جان رمیده ، اسد اقالیم ارواح در نظر از خدمهٔ گرزش گا و آسمان را اندیشه جستن شیر مضطرب می گرداند که و از احاطهٔ کمندش ماهی دوبین رابیم گزاشتن شست برخود می جنباند ، خدنگش آنسوی فلک گذران تر از نظر تیر آه ، و کمندش پیچیدا تر از مدنگاه ، بلندی مراتبش قبه منار جلال ، و رفعت مدارجش سلم بام کمال فلک را از مرتبهٔ بخشش معراج بلند پایگی ، و محیط را از دستگاه جودش

اعتبار گران مایگی، وصف عمیم فیضش ذکر یاوری، و سخن سربلندیش حرف سدرة المنتهی ، از رفعت سده بارگاهش فرق کمترین چاکر فلک سا، و از بلندی پایۀ آستانش پای ادنی خادم عرش پیما ، بصلای غریب نوازش مضیفهای نادر اهل سخن در تردد جادۀ نفس بی تاب ، و از آوازه تعمیم سخایش مضامین بیگانه شعرا اردو کافر منشیهای شارع قلم سراپا فک اضطراب ، توانائی را از هیبت سر پنجه اش در بودن نام شیر رو در هم کشیدن و خجستگی را از انتساب ذاتش در تصور بال هما بر خود پیچیدن -

شهنشاهی که از بس ارجمندی | گذارد پای بر فرق بلندی
فلک جاهی که از والائی قدر | نکا در راهده بر پیشانی بدر
ملک قدری که ازوی دوش شاهی | طرازش جسته از فضل الهی
نهیبش گر زند بر سنگ خاره | رگش در جنبش آید چون شراره
شرر را قهر او گر بر فروزد | چوکاغذ سنگ خارا را بسوزد
چو شیر از صیت عزمش رفته از هوش | گریز آورد در سوراخ خرگوش
فلک گفتی سپر خودرا ندیدش | هلال از نعل توسن زد [illegible] بروش
بسطر تیغ بیم زینت حرف | ز خون دشمنانش رنگ شنجرف
ز تیغش زخم اعدا تا دم صور | برنگ چشم عاشق گشته ناسور

هنوزش تیغ بر کف نارسیده
بفرق دشمنش صدآ رسیده

اشعار فارسی

یارب آن کی بجنون دل دیوانه ما | که شود بال پری دانۀ مستانۀ ما
حسن برخود غلط و عشق نظر باز غیور | شمع داغ است ز خود داری پروانۀ ما

نصیحتی اهل فنا وقت شتاب دگر است

هستی اهل فنا وقت شتاب دگرست　　　رفتن رنگ بود شمع بکاشانهٔ ما
طرفه کان بت به رخ کعبه روان هم خندد　　　دست در گردن غیر است زجاجانهٔ ما

===XXX===

کی آشنای لب دوسه حرف عتاب را　　　از بهر ما دو آتشه ساز این شراب را
رنگ رخم چوگل پر پرواز میزند　　　دارم خزان رسیده بهار شباب را
دارد اثر ز چین جبین موج خنده ات　　　یک رنگ کرده ناز تو لطف و عتاب را
امروز تا کرشمهٔ لطفش چه می کند　　　رحمت فکنده است بفردا حساب را
چون شمع آرمیدن عمرست اضطراب　　　دارد سرور رنگ بهارم شباب را
وحدت هزار جلوه فناشست دیده ام　　　دردیر و کعبه رنگ عذاب و ثواب را
صهبا بیا به وسعت رحمت نگاه کن　　　یکسو بنه شمار گناه و ثواب را

====XXX====

آرامها ز طبع جهان شد ز درد ما　　　خیز و خزان عالمی از رنگ زرد ما
عشق جنون نه کرده بوادی قدم مزن　　　ای گرد باد بادل صحرا نورد ما
صبحیم ضعف ما منگرو از اثر بترس　　　آتش نهفته زیر بغل آه سرد ما
چون صبح بار خاطر عالم نبوده ایم　　　تمکین نداشت جز نفسی رنگ گرد ما
صهباشی از جفای فلک دم نمی زنیم　　　ای کاش پر حذر شدی او آه سرد ما

====XXX====

چه گل که در کف پا نشکند ز خطر مرا　　　جنون بفصل خزان می کند بهار مرا
چنان که باده دراتگور نیست باده بجام　　　بهرکجا که توئی نیست اعتبار مرا

3

برنگ لاله در آغوش نوبهار نه هشت — ز دست داغ دل آسوده روزگار مرا
قبول خاطر کو نیز را نمی ارزم — ز بیکسی لحد آورد در کنار مرا
هر آنکه دید مرا دید خویش را درمن — بحیرتم که بدل نیست غیر یار مرا
فلک به ماتم یاران رفته صهبائی — سپرد داغ دل و چشم اشکبار مرا

====XXXX=====

شد دلم جلوه گه حسن قد وجانم سوخت — آتش از خانهٔ من سوزده سامانم سوخت
آتشی بود که جز کعبه نه باشد سنگش — برق آن کفر که در خرمن ایمانم سوخت
بوی پیراهن اگرچاره گر آید وقت است — دل به بیتابی غمدیده کنعانم سوخت

===XXX====

هم چوشبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم — محرم خورشید گشتم باخسان کم ساختم
مردم و درچشم مردم عالمی تاریک شد — من مگر شمعم چورفتم بزم برهم ساختم
عیش عالم نیست باب من درماتم زدهم — در خورم نبود نشاط دهر باغم ساختم
رنج وراحت هر دو بی درد سرمنت نبود — بی نمک بودم بزخمم و نی بمرهم ساختم
کفر در چشم سپاس نعمت دیدار اوست — جلوه در هر رنگ دیدم گردنی خم ساختم
نیست صهبائی چو جام جم نسیم گوبهاد — می زخون دل کشیدم خویش را جم ساختم

===XXX====

دارم ولی دیوانهٔ صد داغ هجران دربغل — چشمی و چندین نسخهٔ خواب پریشان دربغل
نازم به بکار کیشی زلف سیه کافرش کز او — هم راه دیان می زند هم کرده قرآن دربغل
درسینه آتش مشتعل دردیده دریا موجزن — هرشعله دوزخ آفرین هرموج طوفان دربغل

====XXX====

بحیرتم که چو ازمن بمرگ راضی نیست — بزندگانی دشمن چه گونه خرسند است

بکفر من منگر عذر اضطرارم نه　　　　که شوق در طلب و بت بدوست مانند است

====xxx====

یاد آورد زکه کس محرم اسرار نبود　　　　حسن را جلوه گه و جوش خریدار نبود
پرده برداشت که از پوست و گاهی زرخت　　　　عشق آن خانه خراب است که بیکار نبود
عشق و حسن اند غیرواینقدر افزود نزاع　　　　ورنه رنج من واو آن همه بسیار نبود
غفلت از جلوهٔ مطلوب نسازد محروم
دیدهٔ آئینه پوست شد و بیدار نبود

معمیات از جواهر منظوم

عزیز

خورشید بخویش داشت زین پیش گمان　　　　کاین چرخ نما ورده بخفتش بجهان
چون قصه آفتاب رویش گفتم　　　　کنکی کنج خوریافت رخ چو خویش رانام و نشان

خور عبارت از ع است خویش کنایه از آفتاب که درین مقام مراد ازان زراست و مثل آن زر بمعنی انگور و رخ آن رای مهمله و چون رای مهمله را نام بایددرون بزای معجمه گردد و زائی معجمه که در زر بود باقی است پس ریز سه و باغ عزیز گردید۔

ایضاً

بیگانه زمن نگار جادو فن من　　　　از حیله خصم دوست شد دشمن من
چون دیدهٔ غیر اشک بردامن ریخت　　　　دامن دیگر زد از پی کشتن من

دیده ع مهمله است و چون دیده ع معجمه چون غ معجمه غیر اشک بمعنی نقطه بر دامن که رای مهمله باشد بریزد بزای معجمه گردد و غ معجمه عین مهمله شود و چون اکنون دامن زائی معجمه باشد دامن دیگر عبارت از رائی معجمه دیگر خواهد بود و چون زای معجمه

دیگر خواهد بود و چون زای معجمه دیگر در اول یای تحتانی در آید عزیز صورت نماید و اول یای تحتانی در آمدن زای معجمه از بهر آنست که دامان زدن عبارت است از پیچیدن و دامن بر کمر ـ

خافض

حسنش که برنگ ماه انور بینی   چون خوربینی اگر مکرر بینی
آخر زان شوخ چین تمام اندازش   زانگونه که هردمش فزون تر بینی

آخر از شوخ حرف خ است وان تمام بود خاکر دو ازان گیند یعنی مثل آن ح مهمله است دوازان عدد آنست که هشت است و عددسه آن ۸ چون آنرا هردم فزون تر بینند اول آنرا هشتاد بینند که حرف ف باشد و دیگر بار آن را هشتصد بینند پس فض شود با اول خافض گردد ـ

رافع

چون رفت ز خلوتم سحر گه آن یار   بنمود خور از مطلع مشرق دیدار
دیدم از شوق تابدل گردد ازو   گردید چو او در آفتاب آخر کار

او در را دو جزو است از دو رو یعنی از او راست و چون بگردد را شود و در یعنی فی است رافی شد و آفتاب که عین مکتوبی باشد اخواست یعنی یای آن بدل با ع است رافع شد ـ

غفور

یارب گنهم ز بسکه از حد افزود   گفتی لا تقنطوا بیاسم فزود دو
آری داغی شد آنسکه کش از شرم   با عفو تو را ز دیده جز اشک نبود

را ز تحلیل یافته و حرف زی معنی از حاصل شده و یعنی باللفظ عفو حرف را است عفو رشد و از آن دیده که عین عفو راست اشک شود ظهور گردد.

مجیب

آن لعل اگرچه جای فزا ددل جوست | اما ز نقش سینه دل واقفی خوست
گر زلف دهد دهن نهادن بلبش | گیرم ز لب آن همه که آن زلف بروست

زلف جیم است و دهن اندر آن میم و لب آن حرف جیم است چون میم برج بماند مجی بیمرسید و و از لفظ لب انچه زلف براوست حرف ب است چه لام که تشبیهه بزلف دارد بر حرف ب است آن گرفته شود مجیب ظاهر گردد.

حق

عالم چو بعشق آن ستم گر آشفت | او خواست که جنس دل از و گیرد مفت
چون دیدهٔ خصم آن تمام عیاری | در ها زمیان شود و آخر بنهفت

دیدهٔ خصم صاداست و مثل آن صاداست یعنی مکتوبی و تمام آن صاداست ملفوظی و در هاے آن باعتبار عددسه ۵ آن که هشت صد است دواست بدین صورت ۸۰۰ و این نقطهٔ ها ازمیان صاد که الف است که دو پس هرگاه دو نقطهٔ بر الف آید صد گردد که قاف است و هشت صد هشت ماند و آن حرف ح است و آذر که دال است هفت اسم حق بنصه ظهور پیوست -

باطن

گرد ر شب ماه آن شه حسن و جمال | از پرده نماید رخ خورشید مثال
از بسکه ز خود تهی شود از شعش | از بام رباط مه نماید چو هلال

از بام رباط مه نماید چوهلال گفته و تبدیل حرف را که در اول رباط است بخی خواسته و از عبارت نماید چوهلال مراد آنست که آن نون در آخر رباط باشد چه هرگاه از بام به بیند هلال در مغرب نماید پس لفظ باطن صورت بندید -

مالک الملک

آنرا که زداغ عشق نقدی اندوخت　　در مکتب عقل نسخه ها باید سوخت
شد باهر لا ولم/اندر صد بحث　　آخر ز کتاب عشق حرفی آموخت

باقلب شد آب گردید مراد ازان ما است دهر یعنی کل قلب شد لک گشت ولا قلب شدال گردید و لم قلب شد مل گردید و آخر این همه حروف حرفی از کتاب که کاف باشد از مجموع مالک الملک صورت بست -

ذوالجلال والاکرام

آن دل که چو خورشید صفا دیدی　　از روشنی باده و صهبا دیدی
برگیر که و ده دل جلا گیرد اگر　　در دو ره مانده کار دل را بویدی

برگیر که و یعنی مثل دو که ذواست و ده که لاهست دل پس ال باشد ذوال شد و لفظ جلا اگر واگیر و یعنی دور ذوالجلال و شد و دیره ما ام است دران ده یعنی لا وکار که دل ان حرف راست که کرباشد پس الاکرام شده -

امام بخش اسم مصنف

در دورهٔ حسنت ای هلالین غب غب　　خورشید و قمر کشوده در دعویٔ لب
بربام تو مهر جلوه کن وقت سحر　　با آن رخ خود نما میان دل شب

با آن تیه باست و ازان تکرارام مراد است پس امام شود و درمیان مقلوب شب که

بش است حرف خائے معجمہ کہ رخ لفظ خود است در آید بخش گردد۔

صہبائی تخلص صدقہ

داغ دل تست لالہ کن صہبائی   چاک جگرت گل جنون صہبائی

دل دہ دردیدہ تا بہاری شگفد   آخر کن دل است خون صہبائی

چون بہ قلب شود ھَب گردد و آن در دیدہ یعنی صاد آید صہبا گردد و

آخر را کہ دال مسمی است لی بگوئی بہ لی بدل کن کہ صہبائی شود۔" (۱)

تعلیقات :

امام بخش نام اور صہبائی تخلص تھا۔ ان کے والد مولانا محمد بخش تھانیسر کے رہنے والے تھے لیکن ترک مکانی کرکے دہلی کو اپنا وطن ثانی بنالیا تھا۔ کوچہ چیلان میں مکان تھا۔ (۲) صہبائی دہلی میں پیدا ہوئے ، دہلی میں پرورش پائی اور وہیں کے استادوں سے علوم و فنون کی تحصیل کی - کریم الدین پانی پتی کا بیان ہے :

" عبداللہ خان فارسی خوان جو شاہجہان آبادمیں مشہور تھے ، ان سے تحصیل فارسی کی اور کتب عربیہ بھی مختلف جائے پڑھی -" (۳)

عبداللہ خان فارسی خوان سے مراد عبداللہ خان علوی ہیں۔(۴) عربی، طب وغیرہ

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چہارم، صص ۹۰-۱۷۷

(۲) صابردہلوی، مرزا قادر بخش، " گلستان سخن"، لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۲۹۹ھ، ص ۳۲۳
خلیل الرحمن داؤدی (مرتبہ) " گلستان سخن" از مرزا قادر بخش ، صابر دہلوی،
لاھور: مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۶ع ، ج ۱، ص ۱۳۷
محمد میان، مولانا سید " علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۴، صص ۶۱-۲۶۰

(۳) کریم الدین پانی پتی و فیلن (مرتبہ) " طبقات الشعراء"، محولہ بالا، ص ۳۱۳

(۴) عبدالحی، مولانا سید " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۷۳
ایوب قادری، محمد (مترجم و مرتبہ) " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) "،
کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۰ع ، ج ۱، ص ۲۷۳

میں انھوں نے کن اہل علم و فن کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، معلوم نہیں ہوسکا۔

کریم الدین نے ان کی عمر کے بارے میں ۱۲٦۱ھ میں تقریباً چالیس کا اندازہ لگایا ہوئے کیا ہے۔ اس لحاظ سے ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰٦ء میں پیدا ہوں گے۔(۱) دلّی کالج کے مشہور استاد اور عربی کے صدر مدرس تھے۔ مولوی عبدالحق نے ان کی تقرری کے بارے میں لکھا ہے ۱۸۴۰ء میں جب لیفٹیننٹ گورنر مسٹر ٹامسن کالج کے معائنہ کو آئے تو انھوں نے فارسی کے ایک مستعد مدرس کے تقرر کی سفارش کی۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے ان کے سامنے شہر کے تین مشہور فارسی دانوں کے نام پیش کیے۔ یہ نام غالب، مومن اور صہبائی کے تھے۔ مسٹر ٹامسن نے تینوں کو بلوایا لیکن غالب نے انکار کردیا، مومن نے سو روپے مشاہرے کی شرط رکھی، صہبائی بیکار تھے اور کسی ذریعۂ معاش کی انھیں ضرورت تھی۔ انھوں نے اس پیش کش کو قبول کرلیا۔ ابتدا میں چالیس روپے ملنا شروع ہوئے اس کے بعد حسب قاعدہ اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ آخر میں صہبائی شعبۂ فارسی کے ہیڈ ہوگئے۔(۲)

امام بخش صہبائی ایک کامل درجے کے استاد تھے۔ درس و تدریس سے کمال درجہ شغف تھا۔ مدرسہ کے علاوہ گھر پر بھی پڑھاتے تھے اور ابتدا میں سرسید مکان پر طلبہ کو

---

(۱) کریم الدین پانی پتی، "طبقات شعرائے ہند"، محولہ بالا، ص ۳۱۳

(فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء، ص ۳۱۳

(۲) ضیاء الدین برنی (مترجم)، "تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی" از سی۔ ایف۔ اینڈ ریوز، کراچی: تعلیمی مرکز، ۱۹۵۲ء، ص ۹٦

ذکا اللہ دہلوی، محمد، "تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ"، دہلی: شمس المطابع، ۱۹۰۳ء، ج ۱، ص ۷۰٦

عسکری، مرزا محمد (مترجم)، "تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا، حصہ نثر، ص ۸۰

عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، "مرحوم دہلی کالج"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان)، ۱۹٦۲ء، ص ۱٦۱

محمد میاں، مولانا سید، "علمائے ہند کا شان دار ماضی"، محولہ بالا، ج ۴، ص ٦۲-۲٦۱

درس دیا کرتے تھے۔ (۱) درس و تدریس کے علاوہ شعر و شاعری اور تالیف و ترجمہ میں اوقات سارے بسر ہوتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں میر حسین تسکین، قادر بخش صابر، ذکا اللہ دہلوی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، محمد حسین آزاد، پیارے لال آشوب، نیز دہلی کالج کے وہ طلبہ جن کے نام ذکا اللہ اور نذیر احمد کے حالات میں ان کے کالج کے ساتھیوں کی حیثیت سے کام آئے ہیں۔ ان سب نے کالج میں فارسی صہبائی ہی سے پڑھی تھی۔ شاعری میں بھی ان کے تلامذہ بہت تھے۔ قلعے کے اکثر شاہ زادے اور متوسطین شعر گوئی میں ان سے اصلاح لیتے تھے ۔ ان کے ایک رشتہ دار شاگرد رحمت علی کا ذکر گارسیں دتاسی نے کیا ہے ۔ (۲)

۱۸۳۲ء میں دہلی کالج میں اس کے فرنچ پرنسپل ایم فیلیکس بوترو کی نگرانی میں ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم ہوئی تھی۔ اس کے اصل کارپرداز صہبائی اور رام چندر تھے۔ (۳)

ان کی علمی لیاقت خصوصاً ادب و شعر میں ان کی قدرت اور فارسی دانی میں ان کے کمال کا سرسید اور ان کے علاوہ تمام تذکرہ نویسوں نے اعتراف کیا ہے ۔ ہم یہاں حافظ حیرت کے بیان کی چند سطریں نقل کرتے ہیں :

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین: "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲ ص ۲۲۵
(۲) شہاب الدین بردی (مترجم): "تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی"، محولہ بالا، ص ۹۲
عسکری، مرزا محمد (مترجم): "تاریخ ادب اردو" محولہ بالا، حصہ نظم، ص ۲۷۹
حصہ نثر، ص ۸۰
حامد حسن قادری، مولانا: "داستان تاریخ اردو"، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۶ء، صص ۹-۲۱۸
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری"، محولہ بالا، ص ۳۰۷
اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر (مترجم): "مقالات گارسیں دتاسی"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان) ۱۹۷۵ء، ج ۲، ص ۳۳۸ (مقالہ ۱۸۷۶ء)
(۳) حامد حسن قادری، مولانا: "داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا، ص ۲۱۷ (حاشیہ)

" در هر فن یکتا و در هر علم بی همتا۔ خصوصاً در فن معما و فارسی دانی علم خود در پردہ این کارگاہ کی فیکی نہ داشتند۔ و لوائے انا ولا غیری در اقلیم سخن گستری و کشور دقائق فہمی شاہانہ و دادرادہ می افراشتند۔ و از رسائی ذہن و جودت طبع در علوم گوناگون و فنون پر قلمون از ہمہ اقران و ہم عصران فرخاد بودند۔ و از نگاشش شروح کتب مروجہ فارسی ہمہ اناسی و اوادی را راہ چشمہ علم و محیط نثر فرانمودند . . . امام سخن سنجی و ستودہ دانش و معانی پروری شدہ اند و در ملک سخن آفرینی و انشا پردازی کوس بلند نامی نیکو نواختہ اند۔" (۱)

مولوی عبدالحق نے صہبائی کی ادبی خدمات کے بارے میں لکھا ہے :

" مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں ۔ ان کی تصانیف اب تک پڑھائی جاتی ہیں۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ علاوہ فارسی کی مشہور تالیفات کے اردو صرف و نحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی جس کے آخر میں بہ ترتیب حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں۔ " حدائق البلاغت" کا ترجمہ اردو میں کیا ۔ شعرائے اردو کا انتخاب بھی تیار کیا تھا جو اس زمانے میں طبع ہو کر شائع ہوا۔" (۲)

مولوی سید عبدالحی نے " سحرالبلاغت" ، دیوان فارسی، رسائل فی الانشاء ، شروح کتب درسیہ فارسیہ کو ان کی یادگار بتایا ہے ۔(۳) " سحر البلاغت" سے مولوی سید عبدالحی کی مراد " حدائق البلاغت " کا ترجمہ ہے ۔ مولوی عبدالحق کے بیان میں شعرائے اردو کے انتخاب سے مراد" انتخاب دواوین شعرائے اردو" ہے ۔ اس میں صہبائی نے ولی سے مومن تک اردو کے بارہ منتخب اساتذہ روزگار شاعروں کے کلام کا انتخاب مع مختصر حالات جمع کیا ہے ۔

---

(۱) حیرت ، حافظ عبدالرحمن،" سفینہ رحمانی"، محولہ بالا ، ص ۸۷

(۲) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی،" مرحوم دہلی کالج"، محولہ بالا ، ص ۱۲۰

(۳) عبدالحی، مولانا سید،" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۷۳

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں :

" صہبائی کی دو کتابیں اردو زبان و ادب میں خاص طور پر یادگار ہیں ایک شمس الدین فقیر کی " حدائق البلاغت " کا اردو ترجمہ دوسری انتخاب دواوین"-(۱)

ترجمہ " حدائق البلاغت" انھوں نے کالج کے پرنسپل بوترس(یا بوترو) کی فرمائش پر ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ع میں کیا تھا- (۲) اور اس کے بعد سے اب تک متعدد بار چھپ چکا ہے - اس کے بارے میں حامد حسن قادری لکھتے ہیں :

" (یہ) صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اردو میں منتقل کیا ہے - یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستند کتاب ہے -" (۳)

صہبائی کی ایک مثنوی " دمغ الباطل" ہے جو مطبع المطابع دہلی سے ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوئی تھی- یہ مثنوی انھوں نے خلیل شاگرد خواجہ آتش کی ایک مثنوی کے جواب میں لکھی تھی- (۴) ان کی شروح کے بارے میں حامد حسن قادری لکھتے ہیں :" کہ فارسی کی بعض نہایت ادق کتب درسیہ سہ نثر ظہوری وغیرہ کی شرحیں بڑی تحقیق کے ساتھ لکھی ہیں-" (۵) تصنیف و تالیف کے ان کاموں کے علاوہ قادر بخش صابر کا " گلستان سخن" صہبائی کی نگرانی میں لکھا گیا اور ان کی اصلاح سے مزین ہوا-(۶) مرزا قادر بخش صابر نے تحقیق دوائر میں ان کے ایک عجیب و غریب رسالے (غیر مطبوعہ)" کا ذکر کیا ہے - اور علم قوافی میں" کافی" نامی رسالہ اور اس کی شرح میں ایک رسالہ " وافی" کا ذکر کیا ہے-(۷)

---

(۱) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر" اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری"، محولہ بالا ، ص ۳۱۳
(۲) صہبائی، مولوی امام بخش (مترجم) " حدائق البلاغت"(اردو ترجمہ) ، لکھنو : مطبع نول کشور، س ن ، ص ۲۰
(۳) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۱۹
(۴) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، حیات جاوید"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۱۲-۱۱۳(حاشیہ)
(۵) حامد حسن قادری، مولانا " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۱۶
(۶) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، " اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری"، محولہ بالا ، ص ۱۱-۳۰۹
(۷) صابر دہلوی، مرزا قادر بخش ، " گلستان سخن"، محولہ بالا ، ص ۳۲۳
خلیل الرحمن داؤدی (مرتب) ، " گلستان سخن"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۱۳۸

سرسید نے بھی ان کی شروح کتب و رسائل قواعد زبان فارسی اور رسائل علم عروض و قافیہ و معما کا ذکر کیا ہے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

" شروح کتب اور رسائل قواعد و زبان فارسی اور رسائل علم عروض و قافیہ و معما جو جو آپ کے ریختۂ قلم نزاکت رقم ہیں۔ ایسے نفائس مقاصد اور جلائل مطالب پر مشتمل ہیں کہ متبعان فنون مذکور کو ان فوائد جلیلہ کا حصول بعد ایک عمر دراز کے بھی متعسّر ہے ۔ خصوصاً رسالۂ گنجینۂ رموز کہ صنعت معما میں آپ کے خامۂ معنی طراز سے جلوہ پرداز کتج ہوا ہے ۔" (۱)

گنجینۂ رموز کے علاوہ ان کی ایک کتاب جس کی ضخامت بقول سرسید کے بقدر چار پانچ جزو کے تھی ، صہبائی نے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں لکھی تھی ، " روزہ جواہر" کے نام سے تھی اور ایک کتاب "جواہر منظوم گریز" اور خطوط کا ایک مجموعہ " انشائے مکاتیب" کے نام سے تھا۔ " روزہ جواہر" اور " جواہر منظوم گریز" سے سرسید نے دو اقتباس بھی دیے ہیں ان کے علاوہ نظم میں ، غزلیات کثیرہ اور قصائد متعددہ" تھے۔" (۲) حافظ عبدالرحمن حیرت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیات صہبائی بھی شائع ہوچکی تھی۔ حیرت کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی جملہ تصانیف کو منشی دین دیال سنگھ نے چھپوادیا تھا۔ حافظ حیرت لکھتے ہیں :

" تصانیف این عالی تبار فخر روزگار بے شمار است و در نظم و نثر و رسائل و قصائد بیرون از گفتار است ۔ دریں زمان جملہ تصانیف اقدس را منشی دین دیال سنگھ سلمہ اللہ تعالی زیور طبع پوشانیدہ در آفاقہا شائع فرمودہ دگر بارہا گروہ مردم را اسیر زنجیر منت خود نمود ۔ کلیات صہبائی علمائے زمان و سخن گستران

---

(۱) سرسید احمد خاں،" آثار الصنادید"، محولہ بالا ، (اشاعت اول) ، باب چہارم، ص ۹۸

(۲) ایضاً ، ص ۱۰۳-۱۰۰

دوران هم چو روح و روان پیش نظر دارند"(۱)

صہبائی ایک مدرس، ایک شاعر اور ایک ادیب و انشا پرداز تھے۔ تدریس ان کا پیشہ ھی نہیں شوق بھی تھا۔ انھیں سیاست سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ ان کی ملازمت کا تعلق سرکاری مدرسہ یعنی دھلی کالج سے تھا۔ اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ سقوط دھلی کے بعد انھیں انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑتا لیکن ایک صبح کو وہ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں نماز فجر ادا کر رہے تھے کہ انگریزی فوج کے سپاھیوں نے ان کی ، مع ان کے بیٹے ، بھانجے اور دیگر نمازیوں کے مشکیں کس لیں اور جمنا کے کنارے لے جاکر گولی ماردی۔

معلوم ہوا کہ کوچہ چیلاں میں جہاں یہ رہتے تھے کوئی انگریز سپاھی کسی گھر میں گھسنا چاہتا تھا اور اس موقع پر حکیم فتح اللہ خان یا محمد علی خان ابن شہر جنگ خان کے ھاتھوں زخمی ھوگیا تھا۔ انگریز حاکموں نے حکم دے دیا کہ کوچہ چیلاں کے تمام مردوں کو مار ڈالو یا پکڑ لے آؤ ۔ چناں چہ اسی پر عمل کیا گیا تھا۔ اس حادثے میں امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹوں کے علاوہ کنبے کے کل اکیس فرد تھے۔ صہبائی کے بھانجے اور داماد وزیر الدین کا بیان ھے :

" دلی حشر کا میدان بنی ھوئی تھی ۔ میں صبح کی نماز اپنے ماموں (صہبائی) کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں ادا کر رہا تھا۔ پہلی ھی رکعت تھی ۔ امام کے صافے سے ھماری مشکیں کس لی گئیں ۔ ھمیں گرفتار کرکے دریا کے کنارے پر لے گئے۔ فتح دھلی پر ایک ھفتہ گزرچکا تھا ، ایک مسلمان افسر نے ھم سے کہا کہ موت تمھارے سامنے ھے ، دریا تمھاری پشت پر ۔ تم میں سے جو تیرنا جانتے ھیں وہ دریا میں کود پڑیں ۔ ماموں اور ان کے صاحب زادے سوز تیر نا

---

(۱) حیرت ، حافظ عبدالرحمن ، " سفینۂ رحمانی"، محولہ بالا ، ص ۸۷

نہ جانتے تھے۔ دل نے گوارانہ کیا کہ انھیں چھوڑ کر جان بچالوں۔ لیکن ماموں کے اشارے سے کود پڑا ۔ کوئی پچاس ساٹھ تر گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آواز میرے کانوں میں آئی اور صف بستہ لوگ گرگئے ۔" (۱)

یہ واقعات سقوط دہلی کے ٹھیک ایک ہفتے بعد راج گھاٹ کے دروازے کے سامنے جمنا کے کنارے پیش آیا تھا۔ چوں کہ دہلی پر ۲۰ ستمبر، ۱۸۵۷ء تک انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوگیا تھا۔(۲) اس لیے یہ واقعہ ۲۷ ستمبر یا اس کے ایک دو روز بعد پیش آیا ہوگا۔ یہاں پر یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ منشی ذکا اللہ نے صہبائی کے بھانجے کا نام وزیر الدین لکھا ہے جب کہ مولانا راشدالخیری نے اس کا نام قادر علی لکھا ہے ۔(۳) اس موقع پر جن لوگوں کو ظالمانہ قتل کیا گیا تھا ان کی تعداد راقم ظہیر دہلوی کی روایت کے مطابق چودہ سو بتائی جاتی ہے ۔ تمام لاشیں دریا میں پھینکوادی گئیں تھیں یا ایک روایت کے مطابق دریا کے کنارے کوٹھوں میں پھینک کر ان پر ریت ڈال دی گئی تھی۔ حافظ حیرت لکھتے ہیں :

"ہزار آہ کہ نعش پاکش بار احسان گور و کفن از پس ماندگان نہ کشیدہ نہ آں عالی طبع مشت کش زمین برائے خانہ واپسیں گردید ۔" (۴)

عورتوں اور بچوں پر جو مصیبت آئی وہ اس سے کم اندوہ ناک نہ تھی چیلوں کے کوچے کے تمام کنوئیں عورتوں اور بچوں کی لاشوں سے پٹ گئے تھے ۔ مفتی صدرالدین آزردہ کو صہبائی کی ظالمانہ موت کی خبر پہنچی تو انھوں نے کہا :

---

(۱) مہر، مولانا غلام رسول، "۱۸۵۷ء" لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۷ء ، ص ۸۱-۱۸۰

[illegible] محمد میاں، مولانا سید، "علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا، ج ۴، ص ۲۳-۲۲۲

(۲) ایوب قادری، محمد، "جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء" کراچی: پاک اکیڈمی، ۱۹۷۶ء ، ص ۳۳۸

(۳) مہر، مولانا غلام رسول، "۱۸۵۷ء"، محولہ بالا، ص ۱۸۱

(۴) حیرت، حافظ عبدالرحمن، "سفینۂ رحمانی"، محولہ بالا، ص ۸۸

کہیں وہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو

قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو (۱)

راج گھاٹ کے اس [illegible] شہید اکبر میں صہبائی اور ان کے بیٹوں کے علاوہ کنبے کے اکیس افراد نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ کوچہ چیلاں میں ان کے گھر کو کھود کر زمین کے برابر کردیا گیا تھا۔ (۲)

نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے :" کہ صہبائی کو پھانسی دی گئی تھی" اور مولوی سید عبدالحی کا بیان ہے :" کہ انہیں گھر میں قتل کردیا گیا تھا۔" لیکن یہ دونوں روایتیں درست نہیں ہیں۔(۳) مرحوم دہلی کو یاد کرتے ہوئے سرسید ایک جگہ لکھتے ہیں :

" یہ باتیں تو ان صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں - کجا وہ صحبتیں ، کجا وہ مجلسیں ، کہاں وہ آزردہ ، کہاں وہ شیفتہ اور کہاں وہ صہبائی ، کہاں وہ علما و صلحا ، صرف یاد ہی یاد ہے -" (۴)

صہبائی کی اولاد میں ان کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا پتا چلتا ہے - بیٹے مولوی عبدالعزیز اور مولوی عبدالکریم سوز تھے۔ یہ دونوں بھی اپنے والد کے ساتھ مقتول مارے گئے تھے۔ دونوں بیٹے شاعر تھے اور گلستان سخن (صابر) کے آخر میں دونوں کے قطعات تاریخ شامل ہیں۔(۵) صاحب زادی ان کے بھانجے وزیر الدین کو بیاہی تھیں جن کا

---

(۱) حیرت، حافظ عبدالرحمن،" سفینۂ رحمانی"، محولہ بالا ، ص ۸۸
محمد میاں، مولانا سید،" علمائے ہند کا شاندار ماضی"، محولہ بالا ، ج ۴ ، صص ۲۶۵-۶۶

(۲) ضیاء الدین برنی(مرتبہ)،" ذکا اللہ دہلوی"، محولہ بالا ، ص ۹۶
حامد حسن قادری، " داستان تاریخ اردو"، محولہ بالا ، ص ۲۱۹

(۳) رئیس احمد جعفری، سید،" بہادرشاہ ظفر اور ان کا عہد"، محولہ بالا ، ص ۳۲۱
عبدالحی، مولانا سید،" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۴۳

(۴) حالی، خواجہ الطاف حسین،" حیات جاوید"، محولہ بالا ، ج ۲، صص ۹۰-۳۸۹

(۵) صابردہلوی، مرزا قادربخش،" گلستان سخن"، محولہ بالا ، ص ۳۸۸
خلیل الرحمن داؤدی، (مرتبہ)،" گلستان سخن"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۵۰۰

نام ان کے آخری حالات زندگی کے سلسلے میں آیا ہے - ان کے ایک بیٹے یعنی صہبائی کے نواسے محمد حمید الدین تھے۔

صہبائی کے قتل کے بعد ان کی بیوہ ، بیٹی اور داماد زندہ بچے تھے جو دہلی چھوڑ کر تھانیسر اپنے آبائی وطن چلے گئے تھے۔ سرسید نے کوشش کرکے صہبائی کی بیوہ اور مصیبت زدہ و مظلوم خاندان کا وظیفہ مقرر کرادیا تھا۔ جب تک صہبائی کی بیوہ زندہ رہیں یہ وظیفہ انہیں ملتا رہا۔ (۱)

امام بخش صہبائی سے سرسید کے نہایت قریبی تعلقات تھے۔ فریقین میں نہایت اخوت اور بھائی چارہ تھا۔ حالی کے بقول :

" مولانا صہبائی سے ان کی (سرسید کی) دوستی اخوت کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔" (۲)

خود سرسید نے لکھا ہے " کہ صہبائی اور ان میں سررشتہ محبت و اخلاق ایسا مستحکم ہے کہ گویا دو قالبوں میں ایک جان جاری و ساری ہے -" (۳)

افتخار عالم مارہروی نے مولوی نذیر احمد دہلوی کی زبانی روایت نقل کی ہے :

" اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی کی جماعت میں ، منشی ذکا اللہ صاحب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں تھے - میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا۔" (۴)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے بھی اس روایت کو اخذ کیا ہے لیکن چوں کا ان کا

---

(۱) حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید "، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۵۰۷ (حاشیہ)
(۲) ایضاً، ج ۲، ص ۳۲۵
(۳) سرسید احمدخاں، " آثارالصنادید "، محولہ بالا ، باب چوتھا، ص ۹۹
(۴) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، " مولوی نذیر احمد دہلوی ـــ احوال و آثار"، لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۷۱ع ، ص ۲۸

مقصد مولوی نذیر احمد دھلوی کی تعلیمی زندگی تھا اس لیے انھوں نے اس روایت کے سرسید سے متعلق حصے پر غور نہیں کیا اس روایت سے دو باتوں پر روشنی پڑتی ہے - ایک یہ کہ سرسید دھلی کالج میں پڑھتے تھے - دوسرے فارسی کی جماعت کے استاد امام بخش صہبائی سے رشتہ تلمذ میں منسلک تھے- حالاں کہ روایت کا یہ جزو ہی اپنے اندر کوئی تاریخی صداقت نہیں رکھتا - صہبائی اور سرسید میں دوستی کا رشتہ تھا- اس کا اعتراف سرسید نے خود کیا ہے - سرسید نے کلہ صہبائی کے شاگرد مولانا فیض الحسن سے تلمذ کا اعتراف کیا ہے- اگر صہبائی سے ان کا یہ تعلق ہوتا تو وہ فخر کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے اور حالی کے معلومات میں بھی یہ بات ضرور آتی اور وہ سرسید کی لائف میں اس کا تذکرہ ضرور کرتے - صہبائی نے سرسید کو " آثارالصنادید" کی تالیف میں مدد دی تھی لیکن اس مسئلے پر ہم اس تذکرے کے پہلے باب میں بحث کرچکے ہیں - اس لیے اس کے اعادے کی ضرورت نہیں - سرسید نے ان کے ترجمے پر جو در حقیقت ترجمہ کم اور شاعری زیادہ ہے - ان کے فضائل و محامد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ تعریف ممکن نہیں ہے- صہبائی نے بھی " آثارالصنادید" کی تقریظ اور آئین اکبری کی تقریظ میں سرسید کے کلکہ بارے میں نہایت اعلا خیالات کا اظہار کیا-" (۱)

====XXXX====

جناب مولوی عبداللہ خاں، متخلص بہ علوی غفر اللہ لہ :

" رنگ زدائے آئینہ معنی معانی سخن رنگ افروز معانی تازہ و الفاظ کہن جلوہ دہ عرائس افکار بلند، آرایش گرائی ابکار معانی ارجمند ہم آغوش شاھد مضامین دور ہم کنار نگار

---

(۱) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر" مولوی نذیر احمد دھلوی۔ احوال و آثار"، محولہ بالا، ص ۲۸-۱۲۷

(کککم) حالی، خواجہ الطاف حسین" حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۶۵

لطائف حضور ساقی خم کدہ اسرار ابد و ازل واقف سرائر علم و عمل ناظر باز حسن صافی نہادی جلوہ طراز محفل پاک نژادی آئینہ دار کمالات صوری و معنوی مولوی عبدالشہید خان متخلص بہ علی سن شریف آپ کا چالیس سے اور کمال ظاہری و باطنی ہزار سے تجاوز تھا اگرچہ اصل وطن مولد شمس آباد تھا لیکن چونکہ ایام طفلی سے بود و باش حضرت شاہجہان آباد میں رہی تھی۔ گویا یہ ہی وطن ہوگیا تھا بہ سبب استعداد خدا داد کے ہر فن میں ید طولی رکھتے تھے خصوصاً نظم و نثر تازی و دری میں اور چونکہ فن فارسی میں خواہ باعتبار انشائے نظم و نثر کے خواہ بہ اعتبار درس و تدریس کے مزاولت بکمال اور مشغولی اوقات بہت رہی تھی اسی فن کی نسبت سے شہرت پائی تھی اگر اعتساف و کجی سے دور اور حسد و رشک سے خالی ہوکر اس زبدہ ارباب کمال کا حال دیکھا جائے اور رتبہ سخن پر نظر کی جائے تو معلوم ہو کہ ذات مقدس آیات اس صاحب استعداد خدا داد کی کیا جوہر قدسی تھی کہ پرکار دور فلکی بعد ہزار گردش کے بھی ایسا نقش پیدا نہیں کرسکتی اگر نظم ہے رنگین تر از گل ہے اور اگر نثر ہے مطبوع تر از مُل ہے کاغذان کی بیاض کا بسبب شگفتگی معانی کے گل سے خنداں تر اور قلم بسبب رفتار دل کش کے سرو سے خراماں تر سطور تازگی مضامین سے موج سبزہ سیراب اور نقاط بسبب کیفیت معنی کے قطرات شرابِ زبانِ قلم ترانہ ہائے شیرین سے بلبل اور اوراق سفید مضامین رنگین سے برگ گل۔ بلبل اگر ان سے تعلیم نہ پاتی شیوا بیان نہ ہوتی اور قمری اگر ان سے فیض نہ لیتی سجع خوان نہ ہوتی ان کے معنی نازک سے خوی دلبران خجل اور ان کے مضامین پاکیزہ سے مزاج لطیف طبعاں منفعل زبان جس کمال کو بیان کرے چاہیے کہ دفتر دفتر کہے اور فکر جس فن میں تکا تامل کرے خالب ہے کہ ایک عمر تک اوس میں الجھا رہے اور حال یہ ہے کہ جملہ سازی سے زمانہ بخیل مزاج روا نہیں رکھتا کہ ایک دم بھی ایسے کار شریف میں مصروف ہوکر تدارک مافات کی ایک مدت

گذرتی ہے کہ شاہجہاں آباد سے بامید تلاش معاش دل برداشتہ ہوکر پورب کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں کسی جلیل القدر انگریز نے کمال قدر دانی سے ان کی صحبت فیض موہبت کو مشتمات علمی سے جان کر التزام کیا کہ چندے اوقات کو اس صحبت میں صرف کرے اتفاقاً کئی مہینے کے بعد ان کو اوس سے مفارقت کا اتفاق پڑا اور چون کہ فن طبابت میں معجزہ مسیحا اور ید بیضا رکھتے تھے اوس نواح میں اکثر آدمیوں نے اون کے علاج کی برکت سے امراض صعب سے نجات پائی اور وہاں کے باشندوں نے ان کی بود و باش کو غنیمت سمجھا اور چاہا کہ کسی طرح یہ نعمت غیر مترقبہ ہاتھ سے نہ جانے اوسی طرف کے ایک رئیس نے ان کی خدمت میں رجوع کی اور بعد امتحان کے جب دیکھا کہ بہانہ جوئی لطف شافی حقیقی یہ چاہتی ہے کہ مرضائے جان بلب ادہیں کے انفاس فیض اقتباس کی برکت سے جان تازہ پاویں اصرار کیا کہ منظر بمروت ذاتی اگر اور جگہ دان توقع رکھی میں پڑے بہان کی دان جوین پر فضل نہ دیا جاے چون کہ خلق طبعی اور کرم جبلی ان کی طبیعت فیض موہبت میں مستقر تھا اوس رئیس کی رفاقت اختیار کی اور غربا و مساکین کو ان کی ذات کمالات سمات سے ایسا فیض ہوا کہ نفس عیسوی کو اگر اس پر رشک ہو تو کچھ عجب نہیں جو کہ فلک دوار نہیں چاہتا کہ ایسے افراد کامل صفحہ روزگار پر چندے موجود رہ کر موجب استفادہ خاص و عام رہیں ۱۲۶۲ھ میں عالم باقی کے طرف راہی ہوئے اور ان کی تاریخ وفات بعضے از کہانے یہ پائی تاریخ :

طبی کہ چو او نداد کس داد سخن چون او نرسیدہ کس بفریاد سخن

تا کہ ز جہان رخت اقامت بربست ہاتف گفتا فتاد بنیاد سخن

نظم و نثر ان سے صفحۂ عالم پر بہت یادگار ہے تفریحاً للناظرین کچھ نثر عربی اور کچھ نثر فارسی اس کتاب میں مندرج کرتا ہوں تاکہ ارباب انصاف کو معلوم ہو کہ نظم

عبارت اسی نظم سے ہے اور نثر اشارت اسی نثر سے ہے -

رقعہ عربی

یا اهل نجد اسمعوا القصتی　　نشرت منازل حتے النمائم

عذلت نفسی فی ما تفیهمت　　دقد الحیوة بکسب الذمائم

فالمتها بطوات لکعبة　　ار جو بذلک عفو الجرائم

هی ام رحم ودامی عکوفها　　بلغت لهم رحمته من کرائم

بیت عتیق و ماوی نخیلها　　احسی بسمع من ذکر صائم

قالت صدقت و لکن طالما　　عاد المحب [illegible] بفسخ العزائم

واللہ کیف اجازولواجد　　ان یترک الحب من لوم لائم

کلب الحبیب حبیب لعاشق　　ام ظبی بیت و صوت الحمائم

قصر فضل و براعتی و کلت لسانی براعتی لهلأ خصات الدیراس ، وخذت القرطاس لا شرح شهادتی و اعق تو قاتی الی البارع الکامل الہُد الحلاحل و اماد العلو سماء السمو، عقوب احرار الرجال یعقوب کنعان الجمال ، یحبوب میدان الکمال ، باسط الیدین عطاءٌ قامش العیفین حیاءٌ ابی النفس رضی الشمائل ، شدید الباس سدید الخصائل ، رائض العادات بالاحسان والسماحة واکفی را کفی العادیات فی رهان الشجاعة ، له سابقة فی الکیاسته و حاذقته فی الریاسته ، بهرالاتراب ذکراً ودهاءً وفاق الآ فاق ذکر أو ثناء -

قطعہ

لا زال هذبته سوطه متحر کا　　یوم العطا و یوم حرب القضب

و له سنان اللحظ دون کماته　　لو القیت لتری الحسود مترهب

قام البرایا حوله متداعیاً　　لجدویهم کا لصائمین لمشرب

و سعی کماش القوم حسین رکوبه　　ملقی الا یادی فی موفر فیقب

ومنّا
للہ دراالوا صفین لجان　　تدفقت معناً بالجواد المشرب

والقائلين بانه لما سرى   فالشمس لا تتميز من كوكب

شمع الجماع من مائدة نواله و سمى السماع من معين عونه و ينابيع افضاله ، على الجد فى الاعصار، ولى المجد فى الآثار، احد سخادا و لسان و اكد موثقاً و ضمان وجود مثله فى الجود اعز مين بيضة انوق - واما الحاتم فما هوالافغار بوا بك الحق - نجيب الطرفين سعيد الكونين ، حاجى الحرمين الشريفين ، صاحب السطوة والصلواة والفجر، نواب محمد مصطفى خان بهادر، رفع اللهه كعبه و سهل صعبه و اذهب هيثه و نصر جيشه ، نضر دمهمه وارغد عيشه مادام تملا كئوس السماء من صبوح الصبح و غبوق المساء ، و اصل الكلام الى ان ايها الاميرالمدعام، حياك السلام بالسلام، و نصرك على نيل المرام ، انك مذ تحريت زيارت الحرام، وجت الى السمت المحترم و تراكضت خيول الارادة ، وانتهضت اليها بالخير و السعادة حتى الفراق على المنية واجهت الهلاك بالامنية فادست، بسددتة بابها والقت اسحات الدنيا الى وجوه اصحابها ، فانت و سيرالنياق الرافلات فى البطحاء ، كان فى محاملها الليلى، و انا فى صقع هذا الصحرا كا لغريب الضال فى الظلماء، تجافى جنبى عن الهجوع و بلت عينى من الدموع ، ولايوس هذه الوصب اولاراحتة مين تلك النصب ، و ذروة سنام ماجرى من الالام ، خسران صفقتى بما ساقتى المقدور من محاريب الادبا و بعد فى من مجالس الارباء فادى بعد تو دبع الخدام الامجاد مكثت مدة ايام فى شاهجهان آباد ، ثم لما اصابتى من الدهر كلمتة و كربتة قدمت سنام العزيمة و تركت رباع الدهلى و دیار ها و نجويت الارض انجا دها و اغوارها ، حين يبكى السماء على حالى و يضحك البرق على بلبالى، فبرحت من اكل الجواد و اضوت مراكب الاجتهاد حتى نزلت فرخ آباد ، تعززنى اهل هذا البلاد ، وجادنى كل قار و بار اشرآبت الى احابيشها وحفت على تالهما و مجثيها ، وكرموا مثوى حتى نزعت

حفى والقيت عصالى، فلبثت بلداً و تجسست مكاناً عليا- و بعد زمان يسير تقربت الى الامير الكبير الطالب للخير و الثواب الراغب الى الحق والصواب ، المعروف بالدولة والشهامة ، الموصوف بالصولة والصرامة ، حسن الظهار و البطان رفيع المحل والمكان انفاسه مسك سحيق اخلاقه خمر عتيق صعد على ذروة العلا مذ استزل من حجر امه و افاح السماء و الشهراء بطوالع مافى جبينه و كمه ، قد خلق على فترة من الابرار فكان راساً على البعيد و الاحرار، الزهرة الخضرة فى الرياض المرتضوى السيد الامجد محمد على خان الصفوى الموسوى، لا زال دوحته فضله مثمراً بالاجلال و بعمته جوده هنيئاً سائغاً فى مذاق اهل الكمال ، فاستبقت البهر على جنابه - و كنت الى هذه الايام عاكفاً على سدة بابه هى مخزنة النعم ، ولكن لا احظ منها الا بالام- وحولى انفع لان الرشف انقع ، ازاح على معاناة الزمان الامعوننة هجران الاحباب والاقارب والاقران فانها تزيد يوماً بعد يوم و تشغلنى من الاكل و النوم و ملاك ذلك اضعاب و راس كل كلال و اتعاب بعدى من عتبتك الشريفة التى هى مهبط اهل الفضل و الدهاء مهبط اصحاب المجد والوجاهة ، فكلما قلبى يتذكرها و عند عينى تصورها - وافوزاه ثم وافوزاه ، طالت مقالتى ولم تخف ملالتى الآن ابين مالا يدور حوله شوائب التكلف و غوائل التصلف لان الناس عند الصيدين والافراق يتحمل الكذب والمين - وهوادى عهد المفتقر مقررا وردت دقيقة عودك من سفر- فشاورت الحلب و تفحصت الامكان و الساقة قال حسبك هذه البطاقة - فقط اعجل السفير حتى تلجلج اللسان فى التقرير و تحير القلم فى التحرير ، فالمسؤول من مثلك الجرالنحرير فقط و انا ارجوهن فذلك المهيم ان تسلم منى على المولى المفضال السيد المتعال البارع الباهر الحاذق الماهر - صعد على مدارج العلوم صعود اسعاد النجوم و نزل فى قفارالحكم نزول المطر من الغيم - بدرالملة صدرالشريعة بحرالجود برالامتنان نهر الفضل و ينبوع الاحسان مفتى محمد صدرالدين خان حرر فى العشرين من الجمادى الاولى -

نثر فارسی از صحبت نامه

در روز غسلش حمامی چرخ بافروختن گرما به صبح دوید ، و آفتابچی نوران آفتابه ازین خورشید با چلاحچی دائره افق در پیش کشید ، پیش کاران عرق خانهٔ گلشن پوست به تهیهٔ اسباب غسل برآوردند ، ارغوان غسول شبنم در پیاله گذاشت و گل پیاله سرخاب بدست برداشت ـ شمشاد شانه در آب کرد و چنار به ولا کی دست بر آورد ، پنجهٔ لاله کیسه از دست کشید و بهار آفتابی ابر بدوش رسید ـ تجلی باصلاح خط عارضش سوسی طلبید و موسی به شوق نوره مالیدن دست از بغل برکشید ـ خنک ازین شادی که بادای خدمت آب کشی آب خورا روشن ساخته آب بپوست انداخته ـ غنچهٔ آب از رائحه بدنش ببوسید ، و سنگ پا بشرف پابوس لعل راهم سنگ خویش ندید تا خرامان و دامن کشان بجامه خانه در آمد ، این رباعی از زبان ملهم غیب برآمد ـ

رباعی

ای جوهر توخلعت ره عریانی باش   زود آ و برون کن از برخویش لباس
از مهر تو آتش بدل حمام است   در شوق تو آب گشته دردیدهٔ طاس

آرایش گر بهار بقبا گردانی سهی قامتان گل زار دوید و خیاط نامیه قبای محرمات را برقامت سرو آزاد برید ، نسیم بهاری بقرطق دوزی اطفال چمن سوزن بنفشه از بقچهٔ زمین بر آورد و ابر آذری [illegible] نشستن جا چرک تاب نورسیدگان گلشن از گل کوزه صد کلیزه بر آب کرد ، آزاده دلان قید خلطهم و فارغبالان تشمیرلان تشمیرلباس از همه بریده بر خلاف یاران لباسی از ته دل بساط نشاط انداختند ، و مرغان خوش الحان در هر گوشه غلغل نوروزی بلند ساختند ، عندلیب راه جامه وران برنگی سرنکرده که گل جامه پوش دریده

سراپای خود راگوش سازد ، و قمری باصول فاخته شهدے بلند ساخته که صدور بانداز نگارش صد لخت دل از سینه بیرون ده اندازد ـ ساربان حتی غم گسار فقرات این زمزمه سیر رنگ را بآهنگ راست بگوش بینوایان دائره عشرت انداخت ـ

غزل

بحر کد باز برآتش گل باد صباز و دامن — باز برخاک چمن ریخت هوا در عدن
نامیه کرد دگر جامهٔ خورشید رفو — دوخت سه برتن اشجار دگر پیراهن
آب بگشاد چو از خدمت گل زار کمر — باد بشتافت زجنت که پرستارش من
صبح برخاست که گلهای چمن خنداند — ابر بهشت که بار بهوای گلشن
صبح آن قابله کانگشت زند برلب طفل — ابر آن دایه که بتراو دش از مهر لبن
وقت آن شد که کند نامیه چون رنگ رزان — که بتم بوسرکار آرد گاهے رضن
گر نه از فرط طرب تن بفزاید بر خویش — ورنه از فیض هوا روح بهالا درتن
چیست آخر که بآن لاغری و رنجوری — بید گردید چمن فربه‌ز نرگس بهکن
ای جریفان چمن عهد شباب است بلے — بوساز ماطلب از جام و ز مطرب تن تن
از پئی تهنیت عیش خرامان دوجان — بلبله سوے سبو رفت و سبو جانب دن
شیشه بندی کندش ساقی شیرین حرکات — بگذرد گریچمن زاهد شیشه گردن
بلبلان رنگ صدا به که بود بسته نگار — غنچه دیگر بچمن آمده انگشتک زن
خوش خوش آن آتش سیال که از تاثیرش — خشک دامن شده رندی و ورع تر دامن
بچ بچ آن دلبر رقاص کز افشاندن دست — پشت دستی بزند بر رخ اندوه و محن

و خامه طاؤس رفتار طوطی مقال بسریر دل پذیر این ترانه تازه را آویزه گوش عرب و عجم ساخت ـ

اشعار فارسی

نخواست غارت دست زمانه باغ مرا — درون سینه نهان داشت عشق داغ مرا
وفا پرست سرکا گل تمام مگذار — که بوی شک پریشان کند دماغ مرا

فلک نگر اختر بروین سپند بردوبسوخت　　　شبی که آتش هجران فروخت داغ مرا
ولی زگردش چشمش خدا نگهدارد　　　که گرد باد بود آستین چراغ مرا
اسیر عهد غم ای خزان عیش بود　　　که تهمت رنگ شکستن بهار باغ مرا
دلم ز کم نگهی های اوپر است مگر　　　خمار چشم تو خالی کند ایاغ مرا
اسیر قافلهٔ دشت و حشتم علوی　　　نمی زرنگ رخم می کند سراغ مرا

===XXXX====

اسیر تلخی فرصت جان بسمل ما　　　که زهر چشم بتان می تراود از دل ما
هزار قلزم خون می کشیم و تشنه لبیم　　　ز آب تیغ تو گویا سرشته شد گل ما
گزشت عمر در آمد شدو جود و عدم　　　قضا به گردش چشم که بست محمل ما
نصیب حاصل ما نیست گر همین جز برق　　　نصیب برق شود کاش جمله حاصل ما
به فتنه گرمی هنگامهٔ طرب داریم　　　فروزد از نفس صبح شمع محفل ما
دلم شکست ستم هائے زلف او یارب　　　شکسته تر شود آنکس که بشکند دل ما
ز سرشک قرارم دهد چو ریگ روان　　　بروی آب مگر ساخت عشق منزل ما
ستم ظریفی و علوی مزاج دان تو بود　　　وگرنه ننگ طپیدن نخواست بسمل ما

=====@@@====

اشکم رود از دیده و مقدار نداند　　　این دوقدم اندازهٔ رفتار نداند
گر جیب نماند است بزنجیر در آویز　　　آن کی که کسی بیند و بیکار نداند
دانم ز دل ساده که خوش کرده بهر خوب　　　ارباب تماشا ز خریدار نداند
یا قصهٔ زنجیر بگویا سخن زلف　　　واعظ دل من سبحهٔ و زنار نداند
که بوسه و که بر مژه خوب ترافتد　　　دیوانه نگاهم کهی کو گل از خار نداند
بی همرهی غیر نیاید بگلستان　　　این ساده تو گوشی ره گل زار اندازد
غیر آید و صد راز بپرسد ز نگاهت　　　پس بانگ باخت این حیلهٔ گفتار نداند
جان می طلبد ور بدل نیم نگاهے　　　نقصان خود و سود خریدار اندازد

دشوار که آئی تو به نعش دی و علوی
مردن بسر کوے تو دشوار نداند

تعلیقات :
======

عبدالله خان نام اور علوی تخلص تھا۔ والد کا نام قاسم علی خان افغانی تھا۔

---

(۱)　سرسید احمد خان، "آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چوتھا، ص، ۸۱- ۱۲۰

اصلاً شمس آباد (ضلع فرخ آباد) کے تھے۔ (۱) عام طور پر انھیں شمس آباد کا بتایا گیا ہے۔ لیکن غنی مئو فرخ آبادی جن سے صاحب ترجمہ کی رشتہ داری تھی ان کے ماموں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے، کا بیان ہے: "مولدش مئو قائم گنج ضلع فرخ آباد است" (۲) -

نواب صدیق حسن خان نے بھی صراحت کی ہے: "که دراصل باشندهٔ مئو قائم گنج ضلع فرخ آباد بود۔" (۳) لیکن وہ شمس آبادی تھے یا مئو کے رہنے والے تھے۔ یہ بیانات متعارض نہیں ہیں۔ مئو قائم گنج، شمس آباد سے قریب ایک قریہ ہے اور خوانین کی رشتہ داریاں قصبات و دیہات تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بہت سے خوانین زمینداریوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں دیہات ہی میں جاکر آباد ہوگئے ہیں۔ اس سے ان کی دو دو نسبت مکانی کا ہونا ~~کککک~~ تعجب انگیز اور قیاس مع الفارق نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے -

کم سنی میں والد کے ساتھ دہلی آئے - دہلی کے نامور علماء سے تحصیل علم کیا۔(۴) ان میں حضرت شاہ اسمعیل شہید اور وقت کے دوسرے علماء شامل ہیں۔ سید احمد شہید کے دست حق پرست پر بیعت جہاد کی تھی۔ (۵)

---

(۱) عبدالحی، مولانا سید: "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۰۲

(۲) غنی مئو فرخ آبادی، عبدالغنی خان، "تذکرۃ الشعراء"، علی گڑھ: مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۹۱۶ء، ص ۹۲

(۳) صدیق حسن خان، نواب: "شمع انجمن"، بھوپال: مطبع رئیس المطابع شاہجہانی، ۱۲۹۳ھ، ص ۳۱۸

(۴) غنی مئو فرخ آبادی، عبدالغنی خان: "تذکرۃ الشعراء"، محولہ بالا، ص ۹۲

(۵) صدیق حسن خان، نواب: "شمع انجمن"، محولہ بالا، ص ۳۱۸
عبدالحی، مولانا سید: "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۰۲
عقیل، ڈاکٹر معین الدین، "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان)، ۱۹۷۶ء، صص ۳۳-۳۳۲

تحصیل علمی سے فراغت کے بعد ایک عرصے تک دلی میں درس دیا تھا۔ مولوی امام بخش صہبائی ، محمد حسین ہجر اور نگ ملوی امین الدین خان امین دھلوی آپ ہی کے نامور شاگرد تھے۔ (۱)

کتب درسی پر انھیں عبور حاصل تھا۔ فارسی کی استعداد عمدہ تھی اور تدریس کا شوق تھا۔ علوم غریبہ اور فنون عجیبہ کا بھی خاص ذوق تھا اور ان پر ان کی ماھرانہ نگاہ تھی۔ مولانا عبدالحی کے بقول " ادب ، شعر ، انشا ، طب اور بعض دیگر فنون میں انھیں کمال حاصل تھا۔" (۲) فن طب کی بھی انھوں نے تحصیل کی تھی اور اس میں کمال رکھتے تھے۔ ان کے کمال طب کے بارے میں صاحب " گلستان سخن" لکھتے ھیں :

" یہ حدیقہ طراز کمال جب گل زمین طب کی باغ بانی کی طرف متوجہ ھوا۔ کیا کیا گل کھلائے ۔ معجزہ عیسوی کو اس کے انفاس فیض اقتباس سے جلوہ نمائی اور بیماروں کی صحت کو اس کے نسخہ کی نقاب سے چہرہ کشائی تھی۔ نبض شناسی سے چشم خوبان کی بیماری متعین اور تشخیص امراض سے زلف خوبان کا سودا متیقن" (۳)

نواب صدیق حسن خان نے بھی فن طب میں ان کے دم عیسوی کا اعتراف کیا ھے۔ لکھتے ھیں : " در فن طبابت دم عیسوی می‌زد" (۴) کریم الدین پانی پتی نے بھی لکھا ھے :" کہ طب میں بھی دست قدرت رکھتے تھے۔ " (۵)

---

(۱) فضیحو فرخ آبادی ، عبدالغنی خان " تذکرۃ الشعرا" ، محولہ بالا ، ص ۹۲
عبدالحی ، مولانا سید " نزھتہ الخواطر" ، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۷۳
صدیق حسن خان ، نواب ، شمع انجمن" ، محولہ بالا ، ص ۳۱۸
صابر دھلوی ، قادر بخش " گلستان سخن" ، محولہ بالا ، ص ۳۶۳
نساخ ، عبدالغفور خان " سخن شعرا" ، محولہ بالا ، ص ۳۳۴ (اضافہ قلمی برحاشیہ)

(۲) عبدالحی ، مولانا سید " نزھتہ الخواطر" ، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۳۰۶

(۳) صابر دھلوی ، قادر بخش " گلستان سخن" ، محولہ بالا ، ص ۳۶۳

(۴) صدیق حسن خان ، نواب ، " شمع انجمن" ، محولہ بالا ، ص ۳۱۸

(۵) کریم الدین پانی پتی و ایف ۔ فیلن ، " طبقات الشعرائے ھند" ، محولہ بالا ، ص ۳۱۴

انشائے نثر و ابداع نظم سے بھی طبیعت کو خاص میل تھا۔ اور اس ذوق کا نتیجہ نظم و نثر میں ان کی کئی تصانیف ہیں:

" انشائے صفیر بلبل"، متین و مغلق نثر میں ان کی تصنیف ہے اور " صحت نامۂ طبی" سلیس و شستہ عبارت میں ہے -

نظم میں ان کی ایک مثنوی دو تین جزو پر مشتمل " گل کشتی" میر نجات کے وزن میں ہے اور ایک دا تمام مثنوی سعادت آٹھ جزو کہیں -" تحفۃ العاشقین" کی بحر میں ہے - یہ تمام تصانیف فارسی زبان میں ہیں۔ صابر نے انہیں صاحب کتب کثیرہ نظم و نثر لکھا ہے-(۱) سرسید نے بھی ان کے بارے میں لکھا ہے :" کہ نظم و نثر ان کے صفحۂ عالم پر بہت یادگار ہے "-(۲) اور نثر فارسی کے لیے " صحبت نامہ" کا حوالہ بھی دیا ہے - انشائے سخن میں ان کے کمال اور خصائص کے سلسلے میں صابر لکھتے ہیں :

" فکر کی رسائی ، طبع کی بلندی، سخن کی سنجیدگی، ترکیب کی متانت، طرز کی تازگی، مضمون کی رنگینی ، نکات کی برجستگی ، اشارت کی شوخی، الفاظ کی آشنائی، معنی کی بیگانگی، کلمات کی تنگ دوزی، ربط کی چسپانی، جس قدر اس حضرت کے نظم و نثر میں دیکھی گئی ہے نہ خاقانی و انوری کے قصائد میں ہے نہ سعدی و حافظ کی غزل میں ۔ نہ نظامی و فردوسی کی مثنوی میں ، نہ رباعیات سحابی و افضل میں -" (۳)

نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں :" در نثرونظم دستانی بلند و ملکتی ارجمند داشت"(۴)

---

(۱) صابر دہلوی، قادر بخش ، گلستان سخن"، محولہ بالا ، ص ۳۶۳
صفا بدایونی، عبدالحی، شمیم سخن"، محولہ بالا ، ص ۱۷۳
غنی متوطن فرخ آبادی ،عبدالغنی خان،" تذکرۃ الشعرا"، محولہ بالا ، ص ۹۲
(۲) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چوتھا ، ص ۹۳
(۳) صابر دہلوی، قادر بخش، " گلستان سخن"، محولہ بالا ، ص ۳۶۳
(۴) صدیق حسن خان، نواب ،" شمع انجمن"، محولہ بالا ، ص ۳۱۸

غنی مثو فرخ آبادی نے بھی بایں الفاظ انشاء سخن میں ان کی قدرت کا اعتراف کیا ہے : " در انشا و سخن دری قدرت تمام داشت"(۱) مولانا عبدالحی نے بھی ادب ، شعر ، انشا ، طب اور دیگر فنون میں ان کے کمال کا ذکر کیا ہے ۔(۲)

آخر عمر میں شمس آباد چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ صابر لکھتے ہیں :

" اتفاقاً فرخ آباد کا سفر در پیش ہوا ... مرزا دولھا نامی رئیس آباد نے ....بکمال دلی گرمی سے نان بخشی پر قائم کیا اور اس طرح محبت و خدمت گزاری سے پیش آیا کہ رئیس مذکور کی رفاقت کا خیال اس حضرت کے دل میں مستحکم ہوگیا۔ اس عرصے میں کئی موزوں طبع اس کے مایۂ فیض سے پایۂ شاعری کو پہنچ گئے ۔" (۳)

یہیں وہ تپ محرقہ میں مبتلا ہوئے اور کئی مہینے صاحب فراش رہنےکے بعد ۱۲۶۲ھ/۱۸۳۶ء میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔ صہبائی نے اپنے نامور استاد کی تاریخ وفات میں ایک رباعی کہی :

طبعی کہ چو او نداد کس داد سخن   چون او نرسیده کس بفریاد سخن

ناگہ ز جہان رخت اقامت بربست   ہاتف گفتا "فتاد بنیاد سخن "(۴)

۱۲۶۲ھ

صاحب " شمیم سخن " اور نساخ نے ان کی تاریخ وفات ۱۲۶۳ھ لکھی ہے - (۵)

خود صابر نے تاریخ وفات میں صہبائی کی رباعی نقل کرنے کے باوجود سن بارہ سو اڑسٹھ ہجری

---

(۱) غنی مثو فرخ آبادی، عبدالغنی خان،" تذکرۃ الشعرا"، محولہ بالا ، ص ۹۲
(۲) عبدالحی، مولانا سید،" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۰۲
(۳) صابر دہلوی، قادر بخش ، " گلستان سخن"، محولہ بالا ، ص ۳۶۳
(۴) ایضاً ، ص ۳۶۳
صدیق حسن خان، نواب،" شمع انجمن"، محولہ بالا ، ص ۳۱۸
(۵) صفا بدایونی، عبدالحی،" شمیم سخن"، محولہ بالا ، ص ۱۶۳
نساخ ، عبدالغفور خان، " سخن شعرا"، محولہ بالا ، ص ۳۳۳

(۱۲۶۸ھ) لکھا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کتابت و طباعت کی غلطیاں یا سہو قلم ہیں۔ دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی تاریخ وفات ۱۲۶۲ھجری ہی لکھی ہے ۔(۱)

اوپر " گلستان سخن" کا ایک اقتباس نقل ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ علی مرزا دولھا نامی رئیس شمس آباد کے اصرار و محبت سے شمس آباد میں شہر گئے تھے۔ جب کہ نواب صدیق حسن نے لکھا ہے کہ " بعد مراجعت از دھلی بملازمت نواب سید محمد علی خان بہادر شمس آبادی داماد وزیر الدولہ صوبہ اودھ گزید و در سلک متوسلانش منخرط گردید ۔" (۲) مولانا سید عبدالحی نے بھی انہیں نواب محمد علی خان کے دامن دولت سے وابستہ بتایا ہے ۔(۳) التباس نہ ہونا چاہئے اس لیے کہ یہ ایک ہی مسمی کے عرف و اسم ہیں۔

مولوی عبداللہ خان علوی فارسی کے شاعر اور انشا پرداز تھے لیکن گاہ گاہ کسی مخلص قدیم کی تحریک سے دوچار شعر ریختی بھی موزوں کرتے تھے۔ (۴) صاحب شمیم سخن کا بیان ہے کہ فارسی شعرا اکثر اور اردو شعر کم تر کہتے تھے۔(۵) نساخ نے لکھا ہے کہ احیاناً کبھی اردو شعر بھی کہتے تھے۔ (۶)

علوی مرحوم ایک طبیب ، مدرس، انشاپرداز اور شاعر تھے۔ ان کی زندگی کے شب و روز درس و تدریس اور شعر و انشا کے ذوق سے معمور اور طبابت کے مشاغل میں مصروف نظر آتے تھے۔

---

(۱) صدیق حسن خان ، نواب ، " شمع انجمن"، محولہ بالا ، ص ۳۱۸
غنی مئو فرخ آبادی، عبدالغنی خان، " تذکرۃ الشعراء"، محولہ بالا ، ص ۹۲
عبدالحی، مولانا سید، " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۰۷
سرسید احمدخان، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چوتھا ، صص ۹۲-۹۳

(۲) صدیق حسن خان، نواب ، " شمع انجمن"، محولہ بالا ، ص ۳۱۸

(۳) عبدالحی، مولانا سید، " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۰۶

(۴) صابر دھلوی، قادر بخش، " گلستان سخن"، محولہ بالا ، ص ۳۶۴

(۵) صفا بدایونی، عبدالحی، " شمیم سخن"، محولہ بالا ، ص ۱۷۳

(۶) نساخ، عبدالغفور خان، " سخن شعرا"، محولہ بالا ، ص ۳۳۳

سیاسی زندگی سے عملاً ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن شاہ اسمعیل شہید سے تلمذ کے اثرات ان پر صاف نظر آتے ہیں۔ اور ذہناً و فکراً وہ بھی اسی تحریک اصلاح و جہاد سے وابستہ ہیں۔ جس میں تحریک کے رکن رکین حضرت علامہ شہید تھے۔ علی نے حضرت امیرالمومنین سید احمد شہید کے دست حق پرست پر بیعت جہاد کی تھی۔ (۱) اس تحریک اور اس کے قائد کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا تھا۔ مولانا سید عبدالحی نے حضرت سید احمد شہید کی مدح میں آپ کے سات شعر درج کیے ہیں ۔ جن سے نہ صرف سید صاحب سے آپ کی عقیدت اور نہایت ارادت کا پتا چلتا ہے بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تحریک جہاد و اصلاح کو کتنا اہم سمجھتے تھے۔ (۲)

ایک روایت کے مطابق مولانا علی شاہ اسمعیل کے ان خاص آدمیوں میں سے تھے جن کے سامنے انھوں نے "تقویۃ الایمان" کو پیش کیا تھا۔ اور اس کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی تھی ۔ علی نے اس میں ترمیم اور تبدیلی کے خلاف رائے دی تھی ۔ اس کمیٹی کے دوسرے ارکان کی حیثیت سے شاہ محمد اسحاق ، شاہ محمد یعقوب ، مولانا فریدالدین مرادآبادی، مومن خان مومنؔ، اور مولانا عبدالحی بڈھانوی کے نام آتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا علی کا تعلق ولی اللہی پارٹی کے طبقہ علیا سے تھا۔ (۳)

ڈاکٹر معین الدین عقیل نے تحریک مجاہدین کے ادیبوں اور شاعروں کے سلسلے میں مولانا علی کا استثنا کیا ہے اور لکھا ہے :

" کچھ اور شاعر جو اس تحریک میں شامل تو نہ تھے لیکن براہ راست اس تحریک یا اس کے شرکا سے متاثر رہے ، جیسے مولانا عبداللہ علی جنھوں نے شاہ اسمعیل شہید سے علم حاصل کیا اور سید احمد شہید کے ہاتھ پر جہاد کی

---

(۱) صدیق حسن خان، نواب، " شمع انجمن"، محولہ بالا ، ص ۳۱۸

(۲) عبدالحی، مولانا سید، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، کلوج ۷ ، صص ۷-۳۰۶

(۳) اشرف علی تھانوی، مولانا (مرتب) " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا ، ص ۹۸

بیعت کی ۔" (۱)

لیکن اگر کلام کی کوئی خاص مقدار تحریک مجاہدین کے ادبا شعرا کی صف میں شمولیت کے لیے معیار نہ ہو تو ظفر بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔

ایک صاحب زادی کے سوا جو مولوی احمد شیر خان کو بیاہی تھیں (۲) ان کی اولاد کا پتا نہیں چلتا۔

====XXXX====

میر نظام الدین مرحوم متخلص بہ ممنون :

" فرید عصر وحید آوان مصداق الشعرا تلامیذالرحمان - جلوہ طراز معانی بکر، زنگ زدائے آئینہ فکر ، نخل بند حدائق افکار بلند ، بزم افروز شبستان مضامین ارجمند۔ محک امتحان طبائع موزون ، میر نظام الدین متخلص بہ ممنون۔ خلف ملک الشعرا میر قمرالدین منت - پیش گاہ خلافت و بارگاہ سلطنت ، دارائے ہند سے مخاطب بخطاب فخر الشعرا - سخن میں ایک طرز تازہ کو ایجاد اور ابیات بلند کو معانی ارجمند سے آباد کیا۔ متانت کلام صفائی عبارت اور مضمون اور غرائب تشبیہہ اور نوی استعارات جیسے اس سرگروہ اہل کے سخن میں موجود ہے ، کسی اہل فن کے سخن میں متصور نہیں ہے - الحق ریختہ کو فارسی اور اردو کو دری کردیا۔ نہ ان کے قصیدے کے سامنے قصائد قدما کو رتبہ ہے اور نہ ان کی غزل کے آگے غزلیات متاخرین کو مرتبہ - ہر نقطہ ان کے سخن کا گوہر آب دار اور ہر لفظ ان کے کلام کا لولوی شاہوار۔ طبع بلند ان کی دریا ئے زخار ہے - اور خامۂ معنی طراز ابر گوہر بار - موہبت فیض حقیقی سے مرتبہ اس یگانۂ روزگار کا مستغنی ہے اس سے کہ قلم ان

---

(۱) منقول ڈاکٹر معین الدین، " تحریک آزادی میں اردو کا حصہ "، محولہ بالا ، ص۳۳۲-۳۳۲

(۲) شمس تبریز خان، " صدر یار جنگ (سوانح حیات مولانا حبیب الرحمن شیروانی)" محولہ بالا ، ص ۵۹

کی تعریف میں کچھ لکھے یا زبان ان کی توصیف میں کچھ کہے - بے تکلف تشریح بدن اشعار کے باب میں جالینوس اور نگہبانی چراغ معنی کے واسطے طبیعت ان کی فانوس - عرصہ تین برس کا ہوتا ہے کہ اس جہان ناپائدار سے رخت سفر کو باندھ کر راہی جنت ہوئے - کسی شاعر نے یہ دو شعر ان کی تاریخ وفات میں بائے :

میر سنجن از جہان بگذشت و نزد عالمی
زندگی را از ممات او بود حکم ممات
سر بجیب فکر بردم گفت ہاتف بہر سال
" شاعر شیرین زبان ہند " تاریخ وفات
۱۲۲۰ھ

یہ چند شعر ان سے بطریق یادگار لکھتا ہوں تاکہ معلوم ہو متانت عبارت اوسی سے ہے جو ان اشعار میں ہے اور صفا وہی ہے جو ان لآلی آب دار میں ہے -

اشعار

برا ماننے مت میں دیکھنے سے — تمہیں حق نے ایسا بنایا تو دیکھا

===xxx====

اڑے سو شہر محشر گرد ہو یہاں ایک جنبش میں
کیا تو نے غبار اے چرخ ہم کو کس کے داماں کا

قربان ناز نعش مری دیکھ کر کہا — گردن پہ کس کی خون ہے اس بے گناہ کا

===xxx====

ہاتھ میں جنبش محمل کے عناں ہے اپنی — ورنہ یاں کس کو ہے سر آبلہ فرسائی کا

===xxx====

غنچوں کی گو بہی بالیدگی ہے تو آخر — دل گرفتہ تمہیں سینہ میں سمانے کا

صبح تک کیا کیا نہ مجھکو تھی سماجتہای شوق

رات رکھ کر رو برو صفحہ تری تصویر کا

لے لیا بوسہ تو اوس نے دیں یہ کیا کیا گالیاں

ہاں گنہ سے بھی زیادہ ہے مزا تعزیر کا

====xxx====

بے تابی دل تپیں شہیدوں کی کہاں جائے

کچھ کم رگ بسمل سے نہیں تار کفن کا

===xxxx====

بدگمانی سے ذرا وہ لیا تیرا جو نام　　دیکھنا بوسہ کی خاطر میں لب لالہ ہلا

===xxx====

معنی قضانے ہم کو دیا کیا بغیر دل　　سو وہ بھی نذر کاهش و تشویش ہوگیا

===xxx====

نہیں دیتی دکھائی صورت زیست　　غضب صورت ہمیں آیا دیکھ کر آج

===xxx===

یوں تو ہے وہ فرشتہ خو لیکن　　ہے ذرا آدمی کشی کا شوق

====xxxx====

بس حنا زور آزمائی ہوچکی　　دل ہوں سے ہاتھا پائی ہوچکی

رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت　　صلح کیجے بس لڑائی ہوچکی

====xxxx====

تفاوت قامت یار و قیامت میں ہے کیا مؔنی

وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

---

(۱)　سرسید احمد خاں؛ "آثار الصنادید"، محولہ بالا، باب چوتھا، ص،

تعلیقات:

نظام الدین نام اور مفتون تخلص تھا۔ خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے عزیزوں میں سے تھے۔ اصل وطن سونی پت تھا۔ ترک وطن کرکے دہلی میں آبسے تھے۔ مفتون کے والد میر قمرالدین منت سید ناصرالدین مشہدی جن کا مزار سونی پت میں ہے ، انکی اولاد میں سے تھے۔ انھوں نے شاہ عبدالعزیز کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی تھی۔ اور تفسیر و حدیث کی تعلیم شاہ عبدالعزیز سے حاصل کی تھی۔ مولانا فخرالدین کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ (١) ١١٩١ھ/١٧٧٧ء میں لکھنؤ گئے اور وہاں انھوں نے مصالح دنیوی کی خاطر شیعیت اختیار کرلی تھی۔ ١٢٠٨ھ/٩٣-١٧٩٣ء میں ان کا انتقال ہوا۔ (٢)

مفتون منت کے منجھلے بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی میر شمس الدین احسان (ف ١٢٠٥ھ) اور چھوٹے میر صادق علی صفدری و شہادت ١٢٣٢ھ) تھے - منت کی اولاد کی یہ ترتیب محمد اکبر الدین صدیقی کی تحقیق کے مطابق ہے -(٣) ڈاکٹر محمد منشا الرحمن منشا نے مفتون کو ان کی سب سے بڑی اولاد بتایا ہے -(٤) ان کے اس خیال کی بنیاد غالباً کریم الدین کا بیان ہے جنھوں نے مفتون کو منت کا " بڑا بیٹا" لکھا ہے(٥)

---

(١) عسکری ، مرزا محمد (مترجم) ، " تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، حصہ نظم، ص ١٨٦
اکبر الدین صدیقی ، محمد (مرتب) " کلیات مفتون"، حیدرآباد (دکن) : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، ١٩٧٢ء ، ج ١ ، ص ٦
عبدالحی ، مولانا سید " گل رعنا"، محولہ بالا ، ص ٢٨٢
اسلم فرخی ، ڈاکٹر (مرتب) " گلشن ہمیشہ بہار"، محولہ بالا ، ص ٢٩٣

(٢) عبدالحی ، مولانا سید " گل رعنا"، محولہ بالا ، ص ٢٨٣

(٣) اکبرالدین صدیقی ، محمد (مرتب) " کلیات مفتون"، محولہ بالا ، ج ١ ، ص ٦

(٤) منشا ، ڈاکٹر منشاالرحمن خان ، " مطالعہ میر نظام الدین مفتون دہلوی"، حیدرآباد (دکن) : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، ١٩٧٣ء ، ص ٨

(٥) کریم الدین پانی پتی و ایف - فیلن ، " طبقات الشعرا ہند"، محولہ بالا ، ص ٣٨٨

ان کے بڑے بھائی کا انتقال ۵۵ برس قبل ۱۲۰۵ھ میں ہوچکا تھا۔ (۱) لوگوں نے انہیں نسیاً منسیاً کردیا ہوگا اور مصحفی ہی کو منت کا بڑا بیٹا سمجھتے ہوں گے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ "گلشن بے خار" میں انہیں منت کا چوتھا بیٹا لکھا ہے۔(۲) یہ غالباً اس لیے کہ اس وقت تک ان کے بڑے اور چھوٹے دونوں بھائی اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے اور ان کا انتقال بزرگی کی بنا پر مشہور کیا گیا ہوگا اور اس بنا پر انہیں برادر خورد سمجھ لیا گیا ہوگا لیکن مصحفی صرف تین ہی بھائی نہیں تھے ان کے ایک اور چھوٹے بھائی میر باقر علی جعفری بھی تھے۔ جعفری اور صفدری دونوں مصحفی کے شاگرد تھے۔ صاحب "گلشن بے خار" نے ان کا ترجمہ لکھا ہے۔(۳)

مصحفی دہلی میں پیدا ہوئے۔(۴) ان کی تاریخ پیدائش ان کے کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھی۔ ان کے بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں ان کے انتقال کے وقت ان کی عمر اسی (۸۰) برس کی تھی اس لیے خیال کیا جاسکتا ہے کہ تقریباً ۱۱۸۰ھ/ ۶۷-۱۷۶۶ء میں پیدا ہوئے ہوں گے۔(۵)

---

(۱) مشا، ڈاکٹر مشا الرحمن خان: "مطالعہ میر نظام الدین مصحفی دہلوی"، محولہ بالا، ص ۸
اکبرالدین صدیقی، محمد (مرتب)، "کلیات مصحفی"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۵

(۲) احسان الحق فاروقی، محمد (مترجم)، "گلشن بے خار"، محولہ بالا، ص ۳۲۸

(۳) ایضاً، ص ۱۵۵ اور ۳۰۵

(۴) طفیل احمد (مترجم و مرتب): "یادگار شعرا"، محولہ بالا، ص ۱۹۳
کلیم، دیوالحسن خان: "طور کلیم"، محولہ بالا، ص ۹۵
کریم الدین پانی پتی و فیلن، "طبقات الشعرائے ہند"، محولہ بالا، ص ۳۸۸
صہبائی، امام بخش، "انتخاب دواوین شعرا اردو"، مقام و سن اشاعت ندارد، ص ۱۶۸
مشا، ڈاکٹر محمد مشا الرحمن خان: "مطالعہ میر نظام الدین مصحفی دہلوی"، محولہ بالا، ص ۱۱
ایوب قادری، محمد (مرتب): علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)، محولہ بالا، ج ۲، ص ۲۰۲

(۵) اکبرالدین صدیقی، محمد (مرتب): "کلیات مصحفی"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲
مشا، ڈاکٹر محمد مشا الرحمن خان: "مطالعہ میر نظام الدین مصحفی دہلوی"، محولہ بالا، ص ۱۱
نظر، انصار اللہ (مرتب)، "تذکرہ قطعہ منتخب" از عبدالغفور نساخ، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۳ء، ص ۶۵

مفتون کا مولد و جائے تربیت دھلی ھے ـ ابتدائی تعلیم حضرت شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں ھوئی ـ(۱) چوں کہ اس وقت مسند نشین درس و تدریس شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر تھے اور شاہ ولی اللہ سے مفت کی رشتہ داری بھی تھی اس لیے ڈاکٹر محمد مختار الرحمن خاں مختار نے قیاس کیا کہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے مفتون نے تعلیم حاصل کی ھوگی (۲) لیکن یہ بات اس لیے قرین قیاس معلوم نہیں ھوتی کہ مفتون کی عمر زیادہ سے زیادہ گیارہ سال کی ھوگی جب وہ اپنے والد کے ساتھ لکھنو چلے گئے تھے ـ اس عمر میں وہ مبادیات سے بھی نہ گزرے ھوں گے چہ جائے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے استفادہ ـ محتاط بیان وھی ھے جو اوپر گذرا ھے ـ صاحب " گل رعنا" کا بیان ھے کہ درسی کتابیں والد ھی سے پڑھیں ـ(۳) اور جب ۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء میں ان کے والد لکھنو چلے گئے تو وھاں تعلیم کی تکمیل کی ـ شعر گوئی کے فن میں وہ صرف اپنے والد کی تعلیم و تربیت کے رھین منت ھیں:-

مفتون اک جہاں کو ھے اپنے سخن سے فیض
مفت کی تربیت سے ھوئے فیض یاب ھم (۴)

---

(۱) دساغ، عبدالغفور، سخن شعرا"، محولہ بالا، ص ۳۵۵
قادر، اصغر اللہ (مرتب) " تذکرہ قطعہ منتخب "، محولہ بالا، ص ۶۵
اکبرالدین صدیقی، محمد (مرتب) " کلیات مفتون"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲

(۲) مختار، ڈاکٹر محمد مختارالرحمن خاں" مطالعہ میر نظام الدین مفتون دھلوی"، محولہ بالا، ص ۱۱

(۳) عبدالحی، مولانا سید" گل رعنا"، محولہ بالا، ص ۲۸۳
اسلم فرخی، ڈاکٹر (مرتب) " گلشن ھمیشہ بہار"، محولہ بالا، ص ۲۹۲
صہبائی، امام بخش، " انتخاب دواوین شعرا اردو"، محولہ بالا، ص ۱۷۸
سرکار میر محمدخاں" قطعۂ منتخب " محولہ بالا، ص ۶۵
احسان الحق فاروقی، محمد (مرتب) " گلشن بے خار"، محولہ بالا، ص ۳۲۹

(۴) عبدالحی، مولانا سید" گل رعنا"، محولہ بالا، ص ۳۸۳
مختار، ڈاکٹر محمد مختار الرحمن خاں" مطالعہ میر نظام الدین مفتون دھلوی"، محولہ بالا، ص ۱۳
صبا بدایونی، عبدالحی، " شمیم سخن"، محولہ بالا، ص ۵۳
کریم الدین بانی پتی و ایف ـ فیلن" طبقات الشعرائے ھند"، محولہ بالا، ص ۳۸۸
مشفق خواجہ، عبدالحی، "(مرتب) " خوش معرکہ زیبا"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۱۶۷

" بہارالشعرا" سےمعلوم ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کے زمانے (۱۲۱۳ھ) میں وہ دہلی میں تھے۔ (۱) "تذکرہ عشقی" سے جو کہ ۱۲۱۵ھ کی تصنیف ہے ، ان کی لکھنو میں موجودگی کا پتا چلتا ہے کہ " الحال در شہر لکھنو استقامت دارد" ہے ۔(۲) لیکن ۱۲۱۸ھ میں انھیں شاہ عالم ثانی (ت ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ع) کے دربار سے " فخر الشعرا" کا خطاب ملا (۳) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۱۵ھ(سال تصنیف تذکرہ عشقی) کے بعد جلد ہی وہ پھر دہلی آگئے تھے ۔ اسی بنا پر اکبر الدین صدیقی نے لکھا ہے کہ منون ۱۲۰۰ھ کے بعد دہلی آگئے اس کے بعد لکھنو اور دہلی کے انھوں نے کئی سفر کیے۔ رام بابو سکسینہ نے انھیں شاہ عالم ثانی کی سرکار کے دعاگو شاعروں میں لکھا ہے ۔ شاہ عالم ثانی کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت سلطنت پر بیٹھے، وہ منون کے شاگرد تھے اس لیے منون ان کے دربار کے شاعر مقرر ہوئے ۔ (۴) اس باب میں اختلاف ہے کہ انھیں خطاب کس بادشاہ کے دربار سے ملا۔ اصحاب" طور کلیم" ، "بیاض سخن"، "تاریخ ادب اردو"، "قطعہ منتخب" اور گل رعنا کے بیان کے مطابق انھیں اکبر شاہ ثانی نے خطاب دیا تھا۔ (۵) لیکن صاحب " قطعہ منتخب" نیز اکبرالدین صدیقی

---

(۱) ذکا ، خوب چند ،" بہارالشعرا"(قلمی) ، فوٹواسٹیٹ مملوکہ کتب خانہ خاص،انجمن ترقی اردو، کراچی، در حرف " م "

(۲) کلیم الدین احمد ،" دو تذکرے (تذکرہ شورش و تذکرہ عشقی)"، پٹنہ : ناشر و سنہ ندارد ، ص ۲۶۸

(۳) اکبرالدین صدیقی ، محمد (مرتب) ،" کلیات منون"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۲
منشا ، ڈاکٹر محمد منشاالرحمن خان ،" مطالعہ نظام الدین ممنون دہلوی"،محولہ بالا ،ص۱۲

(۴) عسکری، مرزا محمد (مترجم) ،" تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، حصہ نظم، ص۱۸۵ و ۱۸۷
کریم الدین پانی پتی و ایف ۔ فیلن ،" طبقات الشعرائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۸۸

(۵) شیدا ، عبدالشکور ،" بیاض سخن"، محولہ بالا ، ص ۸۹
کلیم ، نورالحسن ،" طور کلیم"، محولہ بالا ، ص ۹۵
عسکری، مرزا محمد (مترجم) ،" تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، حصہ نظم، ص ۱۸۷
سرور، میر محمد ،" قطعہ منتخب"، محولہ بالا ، ص ۲۳
عبدالحی، مولانا سید ،" گل رعنا"، محولہ بالا ، ص ۲۸۳

اور ڈاکٹر منشا کی تحقیق کے مطابق منون اکبر شاہ ثانی کے استاد بھی تھے اس لیے قرین قیاس ہے کہ اکبر شاہ ثانی نے انھیں خطاب سے سرفراز کیا ہوگا۔ لیکن آخر الذکر ہر دو محققین کی رائے ہے کہ خطاب انھیں شاہ عالم ثانی کے دربار سے عطا ہوا تھا۔ (۱) اس لیے کہ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء کے لگ بھگ منون نے دربار سے علاحدگی اختیار کرکے (۲) ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ اس ملازمت میں ترقی کرکے صدرالصدور کے عہدے پر پہنچ گئے تھے۔ (۳) اسی ملازمت کے زمانے میں ۲۸ فروری، ۱۸۲۳ء کو مولوی عبدالقادر نے اجمیر میں ان سے ملاقات کی تھی۔ (۴) وہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء تک اس علاقے میں ان کے قیام و وجود کا پتا چلتا ہے۔ (۵) آخر میں ضعف پیری کی وجہ سے دہلی آکر خانہ نشین ہوگئے تھے۔ (۶)

منون کا انتقال ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں دہلی میں ہوا۔ (۷) مولوی امام بخش صہبائی کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ وفات یہ ہے:

میر منون از جہاں بگزشت و نزد عالمے زندگی را از ممات او بود حکم ممات

---

(۱) سرور، میر محمد خان: "قطعہ منتخب"، محولہ بالا، ص ۶۳
اکبرالدین صدیقی (مرتبہ): "کلیات مومن"، محولہ بالا، کلکتہ ج ۱، ص ۲
منشا، ڈاکٹر محمد منشاالرحمن خان: "مطالعہ میر نظام الدین منون دہلوی"، محولہ بالا، ص ۱۳

(۲) ایضاً، ص ۱۲

(۳) سلیم، علی حسن خان، "بزم سخن"، محولہ بالا، ص ۱۸۶
کلیم، نورالحسن، "طور کلیم"، محولہ بالا، ص ۹۵
صابر، قادر بخش، "گلستان سخن"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۸۰
صہبائی، امام بخش، "انتخاب دواوین شعرا اردو"، محولہ بالا، ص ۱۷۸
صفا بدایونی، عبدالحی، "شمیم سخن"، محولہ بالا، ص ۵۴

(۴) ایوب قادری، محمد (مرتبہ): "علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)"، محولہ بالا ج ۲، ص ۲۰۰

(۵) منشا، ڈاکٹر محمد منشاالرحمن خان: "مطالعہ میر نظام الدین منون دہلوی"، محولہ بالا، ص ۱۸

(۶) صہبائی، امام بخش: "انتخاب دواوین شعرا اردو"، محولہ بالا، ص ۱۷۸
صابر، قادر بخش، "گلستان سخن"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۸۰

(۷) صفا بدایونی، عبدالحی، "شمیم سخن"، محولہ بالا، ص ۵۴

سر بجیب فکر بودم گفت ان کا پیر عقل " شاعر شیریں زبان هند" تاریخ وفات(۱)
۱۲۶۰ھ

یہ قطعہ تاریخ سرسید ، دساغ اور صابر گورگانوی دھلوی دونوں نے نقل کیا ھے۔ لیکن سرسید اور دساغ نے شاعر کا نام نہیں لکھا بلکہ " کسی شاعر" کا لفظ استعمال کیا ھے ۔ صابر نے شاعر کے نام کی صراحت کردی ھے - (۲)

صاحب " بیاض سخن" نے ان کی تاریخ انتقال ۱۲۶۶ھ/۱۸۳۸ء لکھی ھے -(۳) صاحب بیاض کو تسامح ہوا وہ اس سے چھ سال قبل انتقال کرچکے تھے۔ اس کا تطابق ۱۸۳۸ء بھی درست نہیں ۱۲۶۶ھ کی مطابقت ۱۸۵۰ء سے ہوتی ھے -

ممنون صاحب دیوان شاعر تھے۔ کتب خانہ آصفیہ میں خود ان کے ھاتھ کا لکھا ہوا دیوان موجود ہے ۔ اکبرالدین صدیقی نے دو جلدوں میں حیدرآباد دکن سے " کلیات ممنون" مرتب کرکے چھاپ دیا ھے -(۴) ممنون کی شاعرانہ عظمت ، استادانہ حیثیت اور محاسن شعری کا اعتراف ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ھے ۔ یہاں صرف چند افکار پیش کیے جاتے ھیں:

" سخن دل آویز و مرحبا راسزد .... شاعرشیریں زبان هند (سلیم)" (۵)

" ممنون از مشاھیر است و نیز کلام ھرکسے گواہ طبیعت اوباشد۔ حاجت ستائش نہ دارد -(کلیم)" (۵)

---

(۱) سلیم، علی حسن خان،" بزم سخن"، محولہ بالا ، ص ۱۰۶
کلیم ، نورالحسن،" طور کلیم"، محولہ بالا ، ص ۹۵
سرور، میر محمد خان،" قطعہ منتخب "، محولہ بالا ، ص ۲۵
ایوب قادری ، محمد (مرتب) ،" علم و عمل(وقائع عبدالقادر خانی) "، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۲۵۲

(۲) سرسید احمد خان ، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چوتھا ، ص ۱۲۲
دساغ ، عبدالغفور خان،" سخن شعرا"، محولہ بالا ، ص ۳۵۵(حاشیہ)
صابر، قادر بخش، گلستان سخن"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۳۸۰

(۳) شیدا ، عبدالشکور، " بیاض سخن"، محولہ بالا ، ص ۸۹

(۴) ایضاً، ص ۸۹
اکبر الدین صدیقی ، محمد (مرتب) ،" کلیات ممنون"، محولہ بالا ، ج ۱، ص ۱۴۸

(۵) سلیم ، علی حسن خان،" بزم سخن"، محولہ بالا ، ص ۱۰۶

(۵) کلیم، نورالحسن،" طور کلیم"، محولہ بالا ، ص ۹۵

" بڑے شعرا مشاہیر میں سے تھے ... شیریں کلام ، خوش گفتار ، تمام صفات سخن پر قادر۔ دیوان سے استعداد کا حال روشن ۔" (کریم الدین) (۱)

" اشعارش نہایت عذب و شیریں از نتیجۂ طبع اوست ۔"(خوشگی) (۲)

" کلام کی طرز دل چسپ اور شیریں ہے ۔"(صہبائی) (۳)

" شعر ان کے بہت خوب ہوتے ہیں۔" (صاغ) (۴)

" شاعری میں معاصرین سے برابر بلکہ برتر۔" (ناصر) (۵)

" لکھنو کے کہنہ مشق شعرا میں اس کا شمار ہوتا ہے ۔"(عبدالقادر) (۶)

" فقطہ اس کی غزل میں سوز و گداز کے اثر سے رنگ گل اور طراوت شبنم پیدا کی ۔" (صابر) (۷)

خود سرسید نے ان کے کلام کو تحسین و توصیف کے حسین زیورات سے آراستہ کیا ہے ۔ (۸) دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے کلام کی تعریف کی ہے ۔

اس شاعرانہ عظمت اور محاسن کلام کے علاوہ ان کی خوش گفتاری، سنجیدگی و فہمیدگی کی خوبیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ کریم الدین نے انھیں شیریں کلام کے ساتھ " خوش گفتار" بھی لکھا ہے ۔ خوشگی بھی لکھتے ہیں : " طرز گفتارش دل چسپ و دل نشین۔"(۹) مولوی عبدالقادر کے بیان سے وہ صرف ان کی سنجیدگی ، جہاں دیدگی اور فہمیدگی پر بلکہ

---

(۱) کریم الدین پانی پتی و فیلن، " طبقات الشعرائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۸۸

(۲) اسلم فرخی، ڈاکٹر(مرتب) " گلشن ہمیشہ بہار"، محولہ بالا ، ص ۲۹۲

(۳) صہبائی، امام بخش، انتخاب دواوین شعرا اردو"، محولہ بالا ، ص ۱۷۸

(۴) صاغ ، عبدالغفور، " سخن شعرا"، محولہ بالا ، ص ۲۵۵

(۵) مشفق خواجہ (مرتب) ، " خوش معرکۂ زیبا"، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۱۶۷

(۶) ایوب قادری ، محمد (مرتب) " علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) "، محولہ بالا ، کراچی ج ۲ ، ص ۲۰۲

(۷) صابر، قادر بخش" گلستان سخن"، محولہ بالا ، ص ۳۳۲

(۸) سرسید احمد خان" آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چوتھا ، ص ۲۱۲

(۹) اسلم فرخی، ڈاکٹر(مرتب) " گلشن ہمیشہ بہار"، محولہ بالا ، ص ۲۹۲

ان کے تشیع پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ان کا نظریۂ زندگی بھی معلوم ہوجاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" میر نظام الدین ممنون بھی قید سے آزاد ہیں - زندگی کے آرام کو سب کچھ سمجھتا ہے - مرد سنجیدہ ، جہان دیدہ، فہمیدہ اور زمانہ گرم و سرد چکھے ہوئے ہے - اس کی تحریر و تقریر مربوط ہے -" (۱)

مولوی عبدالقادر کے اقتباس کو اس روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ اس سے پہلے وہ ممنون کے والد کا ترجمہ لکھ چکے ہیں اور بیان کرچکے ہیں کہ سنت نے لکھنؤ میں اپنے آپ کو اثنا عشری ظاہر کیا تھا۔ اور مذہب اہل سنت کی راہ سے پھر گیا تھا۔" لیکن ممنون کے بارے میں اس اقتباس کے دو جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی آرام ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے اور اس کے مقابلے میں مذہب کی کسی قسم کی پابندی انھیں گوارا نہیں تھی۔ طبیعت کی آزادی کا ذکر ڈاکٹر منشا الرحمن منشا نے بھی کیا ہے - لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب امامیہ کے پیرو تھے۔"(۲)

ممنون کی اولاد صلبی میں صرف ایک بیٹے اور ایک بیٹی کا پتا چلتا ہے۔ بیٹے کا نام سید حیدر تھا۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ع میں انتقال ہوا۔ " کار پدر صیت خالی ہے" ت سے تاریخ نکلتی ہے - (۳) بیٹی کی شادی ان کے بھتیجے سید جعفر علی کے ساتھ ہوئی تھی۔ پانی پت میں مقیم تھے۔ حالی نے ان سے تحصیل علم کیا تھا۔ (۴)

---

(۱) ایوب قادری ، محمد (مرتبہ) ، " علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) "، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۲۰۲

(۲) منشا ، ڈاکٹر محمد منشاالرحمن خان ، " مطالعۂ میر نظام الدین ممنون دہلوی "، محولہ بالا ، صص ۲۱-۱۹

(۳) ایضاً ، ص ۲۳

(۴) حالی ، خواجہ الطاف حسین ، " اسمعیل پانی پتی (مرتب) ، " مقالات حالی "، کراچی : انجمن ترقی اردو (پاکستان) ، ۱۹۵۷ع ، حصہ اول ، ص ۲۶۳

سخن نے بڑی کام یاب علمی و شاعرانہ زندگی گزاری ۔ وہ دو بادشاہوں کے درباروں سے متعلق رہے، لکھنو ، دھلی کے امرا و نوابین سے تعلقات رہے۔ انگریز حکمرانوں میں انھیں رسوخ حاصل تھا۔ وہ خود بھی ایک بڑے عہدے دار تھے۔ انھیں شاہزادہ کمال کے ساتھ دنیاوی وجاہت بھی حاصل تھی۔ اُن سے تلمذ کے لیے اصحاب ذوق کا رجوع عام تھا اور فیضان شاعری دور تک پھیلا ہواتھا۔ اس لیے ان کے تلامذہ بے شمار تھے۔"گلشن بے خار" میں ان کے سترہ تلامذہ کے تراجم موجود ھیں ، حالاں کہ شیفتہ کا معیار انتخاب سخت اور پیمانہ نقد بہت بلند ھے ۔ ڈاکٹر محمد منشا الرحمن منشا نے گیارہ مزید تلامذہ کو دوسرے تذکروں میں دریافت کیا ھے ۔

===xxxx====

میر نثار علی نثار :

" ابن مولوی عبداللہ یہ بڑے خاندانی اور آبا و اجداد ان کے ھمیشہ صاحب اعتبار رھے ۔ چناں چہ مولوی رحمت اللہ کہ ان کے جد اعلا تھے استاد تھے محمد شاہ بادشاہ کے اور ان کے پرنانا مولوی اشرف صاحب استاد عالم گیر کے تھے۔انھوں نے تحصیل کتب فارسی اور مشق سخن مولوی امام بخش صہبائی سے کی ھے ۔ فکر خوش اور سلیقہ کتب دانی کا اچھا رکھتے ھیں علاوہ اس کے خط نستعلیق ایسا خوب لکھتے ھیں کہ ان کی کشش مدات کتابت سے ابروے شاھدان چین و چگل پر اشارت اور ان کے سر عین سے نرگس شمشاد قدوں پر ھے ، الف کی راستی کے آگے سرو کا قد خمیدہ اور نون کی خوبی کے آگے لب خوباں دندان حسرت سے گزیدہ ۔ چشمہ " ھے " کا آب حیات سے لبریز صفحہ تحریر کا رنگینی رقم سے گل خیز ۔ دندان سین رشک دندانۂ سین سے شرمندہ ، اور کاکل سنبل رشک دنبالۂ میم کا بندہ ۔ یہ کمال ان کا مقتضی تھا اس امر کا کہ ان کو خوش نویسی کے ذیل میں لکھتا ، لیکن سخنوری کی مناسبت سے شعرا کی ذیل میں انسب معلوم ہوا۔ یہ چند شعر

ان کی خوش فکری پر گواہ عادل ہیں :

اشعار

مانع گریہ شود حوصلۂ عشق ارنہ ہست در دیدۂ من مایۂ طوفانے چند

====xxx====

چساں بندم بمژگاں تند سیل چشم گریاں را

که سد راه نتواند شدن خس جوش طوفاں را

===xxx====

دراں وادی که رفتم کس نشاں من نمی داند

صبا خود گیست عنقا آشیاں من نمی داند

نگو بر زخمش گفتم آخر بد واکی سخت پیچیدش

چه دشوار است کاں هندو زباں من نمی داند

===xxx====

داغ ها بر سینه دارم لاله زار گیستم

خوں دل از چشم می ریزم بهار کیستم ۔ (۱)

تعلیقات :

مختار علی نام ۔ مختار تخلص ۔ سادات علوی سے تعلق رکھتے تھے۔ (۲) والد کا نام سید عبداللہ اور وطن دہلی تھا۔ (۳) صاحب " گلستان سخن" نے لکھا ہے :

" زبدۂ خاندان شرافت اسوۂ دودمان نجابت شریف نہاد عالی حسب" (۳)

---

(۱) سرسید احمد خاں ، " آثارالصنادید" ، محولہ بالا ، باب چوتھا ، ص ۹۲-۱۹۱

(۲) ساغر ، عبدالغفور ، " سخن شعرا" ، محولہ بالا ، ص ۵۰۲ (اضافہ قلمی برحاشیہ)

(۳) مظفر حسین ، مولوی محمد ، " روز روشن" ، بھوپال : مطبع شاہجہانی ، ۱۲۹۷ھ ، ص ۶۸۱

(۴) سرسید احمد خاں ، " آثارالصنادید" ، محولہ بالا ، باب چوتھا ، ص ۱۰۵

کریم الدین پانی پتی و ایف ۔ فیلن ، " طبقات الشعرائے ہند" ، محولہ بالا ، ص ۳۱۲

(۳) صابر دہلوی ، قادر بخش ، " گلستان سخن" ، محولہ بالا ، ص ۳۵۲

اس کی تفصیل سرسید کے بیان سے ہوجاتی ہے کہ مولوی رحمت اللہ ان کے جدا علا محمد شاہ بادشاہ کے استاد تھے اور ان کے پر دادا مولوی اشرف صاحب عالم گیر استاد تھے۔(۱)

مولوی عبداللہ علوی اور امام بخش صہبائی سے فارسی زبان و ادب کی تحصیل کی۔ شاعری اور اصلاح سخن میں صرف صہبائی کے کمال فکر و فن نے رہنمائی کی ۔(۲) خوش نویسی کا فن انھوں نے میر محمد امیر پنجہ کش سے حاصل کیا تھا۔(۳) فارسی دانی، شعر گوئی اور خوش نویسی میں اپنے زمانے کے ممتاز ارباب علم و فن میں شمار کیے جاتے تھے۔ صاحب " گلستان سخن" کے بقول فارسی میں کامل اور خوش نویسی میں یگانہ تھے۔ (۴) کریم الدین نے ان کے کمال شعر گوئی اور ہوش و عقل اور حسن ظرافت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے بیان سے ایک تاریخی مشاعرے کے انعقاد پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ لکھتے ہیں :

" شاہجہاں آباد میں رہتا ہے ۔ اس جائے مولوی امام بخش صہبائی اور مولوی عبداللہ سے فارسی تحصیل کرکے معلم گری کرتا رہتا ہے ۔ سواء ازیں کچھ اس کو شاید قلعہ سے بھی علاقہ ہے ۔مگر اکثر کوچہ و بازار میں مجھ سے ملاقات اس کی ہوتی رہتی ہے ۔ چودھویں تاریخ ماہ رجب ، ۱۲۶۱ھ (۲۰ جولائی، ۱۸۴۵ء ، شنبہ) کو میرے گھر پر مشاعرہ ہوا تھا۔ اس نے بھی غزل فارسی کی میرے سامنے پڑھی ۔ فارسی میں استعداد اچھی رکھتا ہے ۔ مرد ظریف ، عقل مند اور تیز ہوش ہے ۔" (۵)

---

(۱) سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چوتھا ، ص ۱۰۵

(۲) کریم الدین پانی پتی و ایف۔ فیلن،" طبقات الشعرائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۱۲
صابر دہلوی، قادر بخش،" گلستان سخن"، محولہ بالا ، ص ۳۵۳
سرسید احمد خاں، " آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چوتھا ، ص ۱۰۵
مظفر حسین ، مولوی محمد،" روز روشن"، محولہ بالا ، ص ۲۸۱
نساخ ، عبدالغفور، " سخن شعرا"، محولہ بالا ، ص ۵۰۲ (اضافہ قلمی بر حاشیہ)

(۳) صابر دہلوی، قادر بخش ،" گلستان سخن"، محولہ بالا ، ص ۳۵۳
نساخ ، عبدالغفور،" سخن شعرا"، محولہ بالا ، ص ۵۰۲ (اضافہ قلمی برحاشیہ)

(۴) صابر دہلوی، قادر بخش، " گلستان سخن"، محولہ بالا ، ص ۳۵۳

(۵) کریم الدین پانی پتی و ایف۔ فیلن،" طبقات الشعرائے ہند"، محولہ بالا ، ص ۳۱۲

قلعے سے تعلق کی وضاحت صاحب " گلستان سخن" کے بیان سے ہوجاتی ہے -

لکھتے ہیں :

" چند روز سے حضرت ظل الہی خلافت پناہی ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ عالم اقبالہ نے وقائع نگاری قلعہ معلی کے عہدے پر مامور کیا ہے - اس اشہار کی عبارت خصوصاً عنوان بیشتر وقائع نعمت خان عالی کے طرز سے ملوظ ہوتاہے اور اس طرز کو پسند کرنے والوں کو ایک لحظ اٹھتا ہے -" (۱)

" اشہار" سے اشارہ "سراج الاخبار"کی طرف ہے جو بہادر شاہ نے ۱۸۴۱ع میں جاری کیا تھا اور مطبع سلطانی سے نکلتا تھا- (۲) سرسید نے ان کے قلعے سے تعلق کا ذکر نہیں کیا- اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "آثارالصنادید" کی تالیف کے زمانے تک یہ تعلق نہیں ہوا تھا-

ان کے کمال انشا پردازی اور شعر گوئی کے بارے میں صاحب " گلستان سخن" کی رائے ہے کہ انشا پردازی اور شعر طرازی میں قدرت تمام حاصل ہے - سخن اس کا حسن اسلوب سے دل چسپ اور مرغوب ، شعر اس کا فروغ معانی سے شعرائے یمانی-(۳)

صاحب تذکرہ روز روشن لکھتے ہیں :

" در نظم جدت طبع و درحسن خط بہ تیز دستی مشہور است-"(۴)

---

(۱) صابر، قادر بخش، " گلستان سخن"، محولہ بالا، ص ۳۵۳

(۲) کیفی دہلوی، پنڈت برج موہن دتا تریہ " اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار" (مقالہ) " اردو" (سہ ماہی) ، اورنگ آباد (دکن) : انجمن ترقی اردو، (ہند) ، اپریل سجن، ۱۹۳۵ع ، ج ش ص ۲۰۱

اختر جوناگڑھی، قاضی احمدمیاں،" تذکرہ اہل دہلی"، کراچی : انجمن ترقی اردو، (پاکستان) ، ۱۹۶۵ع ، ص ۱۵۱

(۳) صابر دہلوی قادر بخش، " گلستان سخن"، محولہ بالا، ص ۳۵۳

(۴) مظفر حسین، مولوی محمد " روز روشن"، محولہ بالا، ص ۲۸۱

سرسید نے ان کی خوش فکری، سلیقہ کتب داری اور خط نستعلیق میں ان کے حسن قلم کا اعتراف کیا ہے - (۱)

تحصیل علمی کے بعد معلمی کو انھوں نے وجہ معاش بنایاتھا جیسا کہ کریم الدین پانی پتی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی تحصیل کرکے معلم گری کرتا ہے -(۲) لیکن بعد میں ان کا فن خوش نویسی ان کی وجہ معاش ثابت ہوا اور اسی فن کی بدولت "سراج الاخبار" سے ان کا تعلق ہوگیا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ قلعہ معلی کی وقائع نگاری کے علاوہ "سراج الاخبار" کے بعض خاص مضامین یا کم از کم سرخیوں کی کتابت بھی کرتے تھے۔

===xxxx====

مولوی محمد حسین ہجر :

"بلبل شاخسار سخنوری طوطی شکرستان معنی پروری مولوی محمد حسین ہجر شاگرد رشید مولوی امام بخش صہبائی تمام کتب نثر و منظوم فارسی انھیں کی خدمت میں تحصیل کیں اور مشق سخنوری بھی انھیں کے التفات سے بہم پہنچائی تحقیق مقامات اور تدقیق مقامات اور تدقیق رموز مکتومہ کتب متداولہ خوب طرح سے کی ہے - لغت و اصطلاح فارسی پر نظر اور زبان دری کا تتبع بکمال ہے انشائے نظم و شعر میں دست گاہ کامل رکھتے ہیں - یہ چند شعر بطریق یادگار لکھ کر ہدیۂ ارباب شوق کرتا ہوں :-

اشعار

درجواب شکوہ ہای کم نگاہی ہائے یار سرمۂ گویا می کند چشم ترانازم حیا

---

(۱) سرسید احمد خان، "آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چوتھا، ص ۱۰۵
(۲) کریم الدین پانی پتی و ایف۔ فیلن، "طبقات الشعرائے ہند"، محولہ بالا، ص ۳۱۲

ندارد تاب پیش دیده حسن حجابش را که باشد حیرت چشم نقابی آفتابش را

ز شوق صد تپش فرسوده دل اندر بغل دارم

رم آهو عنان در کف سپارد اضطرابش را

بروی ماه تابان رنگ در پرواز می آید نمی دانم که از رخ برکشید امشب نقابش را

نگه دزدیده نرگس می دمد از خاک تا محشر

شهید ناز چشم سحر ساز می خوابش را

کنم گر عرض حال این دل صد پاره در پیشش

بخاموشی سپارد هجر آن بد خو جوابش را

===xxx====

چنان ضعیف شد از غم تن نزار مرا که بار خاطر من می کند غبار مرا

تو نیز چاره حرمان نمی توانی کرد بجلوه آئی ز حیرت برد کار مرا

بیاد روی تو خلوت در انجمن دارم من و خیال تو با دیگر چه کار مرا

چنان ز خویش نفورم که خاکم از پس مرگ

وطن بیاد نخواهد بدل غبار مرا " (۱)

تعلیقات :
=====

" محمد حسین نام اور هجر تخلص تھا۔ والد کا نام قاضی غلام حیدر تھا۔ (۲)

صاحب " شمع انجمن " ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

" از شرفا ناصر و قاضی زادگان قصبہ جهجر ، ضلع بلند شهر از اولاد

---

(۱) سرسید احمد خان، " آثارالصنادید "، محولہ بالا ، باب چوتھا ، صص ۹۱-۱۹۰

(۲) صدیق حسن خان ، نواب ، " شمع انجمن "، محولہ بالا ، ص ۵۳۵

شیخ الاسلام ابواسمعیل عبداللہ انصاری هراتی است " (١)

صاحب " گلستان سخن" نے " قصبہ جے پور" (٢) اور " سخن شعرا" کے حاشیے پر قلمی اضافے میں " ساکن قصبہ پور" لکھا ہے +(٣)

ایام خورد سالی میں دهلی آگئے تھے- (٣) امام بخش صہبائی سے کتب نظم و نثر کی تحصیل کی تھی اور شعر گوئی میں بھی انھیں صہبائی هی سے شرف تلمذ حاصل تھا -(٥) غنی مئو فرخ آبادی نے انھیں مولانا عبداللہ علوی کے تلامذہ میں بھی شامل کیا ہے لیکن انھوں نے تخلص مہجور لکھا ہے:" محمد حسین مهجور ناظم اندور"(٦)

ناظم اندور کی صراحت سے یہ بات بالکل صاف هوجاتی ہے کہ یہ کوئی دیگر شخصیت نہیں بلکہ هجرهی هیں اور چوں کہ امام بخش صہبائی کو بھی مولانا عبداللہ علوی سے شرف تلمذ تھا اس لیے مولانا علوی هجر کے نہ صرف استاد بلکہ استاذ الاستاذ بھی تھے-

صاحب " گلستان سخن" نے صہبائی سے هجر کے اخلاص و محبت شاگردانہ و نیاز مندانہ اور صہبائی کی ان کے حال پر شفقت بزرگانہ و پدرانہ کا ذکر کیا ہے -(٧) استاد کے کمال التفات و توجہ کی بدولت کتب نظم و نثر فارسی اور فنون متداولہ میں انھیں

---

(١) صدیق حسن خان، نواب" شمع انجمن"، محولہ بالا، ص: ٥٣٥
(٢) صابر دهلوی، قادر بخش، " گلستان سخن"، محولہ بالا، ص: ٣٤٦
(٣) کدساغ، عبدالغفور، " سخن شعرا" ، محولہ بالا، ص: ٥٦٠(اضافہ قلمی بر حاشیہ)
(٣) صابردهلوی، قادر بخش، " گلستان سخن"، محولہ بالا، ص: ٣٤٦
نساخ ، عبدالغفور، " سخن شعرا"، محولہ بالا، ص: ٥٦٠
(٥) صابر دهلوی، قادر بخش،" گلستان سخن"، محولہ بالا، ص: ٣٤٦
صدیق حسن خان، نواب" شمع انجمن"، محولہ بالا، ص: ٥٣٥
نساخ ، عبدالغفور، " سخن شعرا"، محولہ بالا، ص: ٥٦١
سرسید احمد خان، " آثار الصنادید"، محولہ بالا، باب چوتھا، ص: ١٠٥
(٦) غنی مئو فرخ آبادی، عبدالغنی خان،" تذکرۃ الشعرا"، محولہ بالا، ص: ٩٢
(٧) صابر دهلوی، قادر بخش، " گلستان سخن"، محولہ بالا، ص: ٣٤٦

کمال مہر اور انشا کو نظم اور انشا کو نثر میں انہیں دست گاہ تام حاصل ہوگئی تھی- (۱)

رنجیت سنگھ کے انتقال پر جب راجہ شیر سنگھ نے مسند حکومت کو رونق بخشی تو ان کے لاہور جانے کی ایک "حسن تقریب" پیدا ہوگئی - چند سال لاہور میں رہنے کے بعد وہ پھر دہلی لوٹ آئے - چوں کہ ان کی فارسی دانی اور قابلیت کی شہرت دہلی سے لاہور تک پھیل چکی تھی اس لیے اندور کے سرکاری مدرسے کے صدر مدرس ہوگئے - ۷۰، ۸۰ روپے تنخواہ ملتی تھی- کچھ عرصے بعد وہ راجہ اندور کے مصاحب خاص و استاد کے اعزاز سے سرفراز کیے گیے- راجہ پر ان کی قابلیت اور دیانت کے جوہر کھلے تو انہیں نظامت دیوانی کے منصب جلیلہ پر فائز کردیا- ڈھائی ، تین سو روپے مشاہرہ تھا- انہوں نے اس نئی ذمہ داری کو اس خوش سلیقگی اور دیانت کے ساتھ پورا کیا کہ ان کی دل دہی اور انصاف پروری کی شہرت ہوگئی -(۲)

اس رتبے پر پہنچنے کے بعد بھی استاد سے نہایت نیازمندی سے پیش آتے تھے اور خطوط و رسائل لکھتے رہتے تھے اور مشورے حاصل کرتے رہتے تھے- (۳)

اللہ تعالی نے انہیں دنیاوی عزت و وجاہت کے ساتھ محاسن و مکارم اخلاق سے بھی متصف کیا تھا- نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں :

" بہ وفور اخلاق و مروت و فراوان مکارم و فضائل موصوف است" (۴)

---

(۱) صدیق حسن خاں، نواب، " شمع انجمن"، محولہ بالا، ص ۵۳۵
صابر دہلوی، قادر بخش،" گلستان سخن"، محولہ بالا، ص ۳۷۶

(۲) ایضاً، ص ۳۷۷
ساغ، عبدالغفور، " سخن شعرا"، محولہ بالا، صص ۲۱-۵۲۰
صدیق حسن خاں، نواب،" شمع انجمن"، محولہ بالا، ص ۵۳۵

(۳) صابر دہلوی، قادربخش،" گلستان سخن"، محولہ بالا، ص ۳۷۷
ساغ، عبدالغفور، " سخن شعرا"، محولہ بالا، ص ۵۲۱

(۴) صدیق حسن خاں، نواب،" شمع انجمن"، محولہ بالا، ص ۵۳۵

ہجر کی تاریخ وفات کا پتا نہیں چل سکا لیکن نواب صدیق حسن خان کے تذکرہ "شمع انجمن" کی تالیف کے وقت ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء تک زندہ ، اندور میں موجود اور عہدہ محکمہ مرافعہ ریاست اندور پر فائز تھے۔ نواب صاحب موصوف کو انھوں نے خود اپنے حالات اور کلام وہیں سے بھیجا تھا۔ (۱)

فصل ۔ سوم

(ج) اطبا

حکیم امام الدین :

"قطع نظر کمالات طبی سے جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول درس دیتا ہے نبض شناسی وہی ہے اگر بالفرض انقلاب روزگار سے تمام عالم سے نسخ معتبرہ کاؤ خورد ہو جاویں اور سارے جہان سے کتب سلف دریا برد ہوجاویں، اس گروہ ارباب فضل کی حافظہ کی مدد سے پھر کتب خانہ روزگار کا معمور ہوسکتا ہے ۔ حرکت نبض موج سے پیچش گرداب کو معلوم کیا اور رگ ابرنیسان سے استسقائے صدف کو دریافت کرتا ہو علاج خفقان کے واسطے ان سے رجوع لاتا ہے ، اور گل نرگس چارۂ یرقان ان سے چاہتا ہے ۔ ان کے بزرگان والا نژاد کو سرکار بادشاہی سے مناصب ارجمند اور مراتب بلند عطا ہوتے رہے ہیں اور یہ بھی حضرت جہان پادی کی طرف سے عہدۂ طبابت پر مامور ہیں۔" (۲)

تعلیقات :

حکیم امام الدین خان حکیم غلام رمضان خان کے بیٹے تھے۔(۳) وطن مالوف پاک پٹن تھا۔(۳)

---

(۱) صدیق حسن خان، نواب، "شمع انجمن"، محولہ بالا ، ص ۵۳۵

(۳) خلیق احمد نظامی، "۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامچہ"، محولہ بالا ، ص ۱۲۹

(۲) سرسید احمدخان، "آثارالصنادید"، محولہ بالا ، باب چوتھا ، صص ۶۵-۶۳

(۳) کوثر چاندپوری، اطبائے عہد مغلیہ"، کراچی : ہمدرد اکیڈمی، ۱۹۶۰ء، ص ۵۵

سرسید کے اس بیان سے کہ ان کے بزرگان والا نژاد کو سرکار بادشاہی سے مناصب ارجمند اور مراتب بلند عطا ہوتے رہے ہیں۔(۱) ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندان کئی پشتوں سے دہلی میں آباد تھا۔ مولانا عبدالحی نے دہلی کو ان کا مولد بتایا ہے اور علامہ فضل حق سے تحصیل علمی کا ذکر کیا ہے۔(۲) تحصیل کے بعد تحصیل طب کی طرف توجہ کی۔ اکبر شاہ ثانی (عہد حکومت ۵۳-۱۲۲۱ھ) کے زمانے میں انہیں شاہی طبیب مقرر کیا گیا۔ پانچ سو روپے تنخواہ تھی۔ لیکن جب حکیم احسن اللہ خان کو بھی شاہی طبیب مقرر کرلیا گیا تھا۔ تو حکیم امام الدین بد دل ہوکر کیپر تھلہ چلے گئے۔(۳) اس کے بعد کچھ عرصہ فرخ آباد کی سرکار سے وابستہ رہے۔ اپریل، ۱۸۳۶ء میں نواب زینت محل بیمار ہوئیں تو انہیں بلاوا بھیجا گیا۔ یکم مئی کو دہلی پہنچے۔(۴) اس کے بعد ۱۸۵۷ء تک برابر دربار سے ان کے تعلق کا پتا چلتا ہے۔ الوکی علت کے باب میں مولوی کریم اللہ اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے مباحثے سے دربار میں ان کی موجودگی کا علم ہوتا ہے۔(۵) بہادر شاہ کے دربار سے انہیں سو روپے تنخواہ ملتی تھی نواب زینت محل کے وہ معالج تھے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے زمانے میں بھی دربار سے وابستہ رہے۔ عبداللطیف نے ۱۰ محرم / یکم ستمبر، ۱۸۵۷ء کو لکھا ہے :

"نواب زینت محل کی عرض سے ظاہر ہوا کہ باغی فوج کی سرکشی اور جنون کاری اس حد تک پہنچی ہے کہ اس جانب بھی سازش کی بدگمانی ہے۔ .... بادشاہ نے غضب ناک ہوکر فرمایا کہ لشکر شاہی کی ایک جماعت توپ اور

---

(۱) سرسید احمد خان، "آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چوتھا، ص ۳۷

(۲) عبدالحی، مولانا سید، "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۷۵

(۳) کوثر چاندپوری، "اطبائے عہد مغلیہ"، محولہ بالا، ص ۵۵

(۴) نیر رخشاں، نواب ضیاءالدین خاں "صحیفہ زرین"، ص ۱۵۶

(۵) فضل حسین بہاری، "الحیاۃ بعد المماۃ"، کراچی: حافظ محمد شعیب اینڈ کمپنی برادرس، ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۳

بندوق لے کر نواب زینت محل کے دولت کدے پر پہرہ دے .... کچھ عرصہ تو وہ بادشاہ کی خدمت میں بھی حاضر نہ ہوسکیں اور انھوں نے اپنے طبیب خاص حکیم امام الدین خاں کو جو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کا پیام، حال اور خیریت پہنچاتے تھے ۔ پیغام کے ساتھ واپس کردیا۔ (۱)

دھلی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد جب لوگ شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے تو یہ بھی دھلی سے نکل کھڑے ہوئے ۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد یرن کے حکم سے اپنے مکان میں آگئے ۔ لیکن کچھ عرصے بعد جان منکاف نے انھیں شہر بدر کردیا۔ پہلے حکیم صاحب قطب صاحب میں رھنے لگے پھر بنارس چلے گئے ۔ ستمبر، ۱۸۵۸ء میں نواب صاحب ٹونک وزیر الدولہ کی طلبی پر ٹونک چلے گئے۔ اور اپنی وفات تک وھیں رہے۔ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں رحلت فرمائی۔ ٹونک ھی میں آسودۂ خاک ہوئے ۔ نواب ضیاء الدین خاں نیر ورخشان صاحب "صحیفہ زریں" نے تاریخ وفات کہی :

درجنت رفت چوں امام الدین خاں
تاریخ وفات هم ازاں عیاں (۲)

سرسید نے انھیں سرگروہ ارباب فضل اور جامع معقول و منقول لکھا ہے اور ان کے بے مثال حافظے اور کمال نبض شناسی کا نہایت شان دار الفاظ میں ذکر کیا ہے ۔ (۳)

مولانا سید عبدالحی نے ان کی حذاقت کی شہرت اور تشخیص امراض و ادویہ میں ان کی فوقیت کا اعتراف کیا ہے ۔(۴)

کوثر چاند پوری نے ان کی مندرجہ ذیل آٹھ تصانیف کا ذکر کیا ہے :

۱۔ مخزن اکسیر :۔ ۱۲۷۳ھ میں تصنیف ہوئی اور اس کی تالیف میں حکیم جواد بھی شریک رہے ۔

---

(۱) خلیق احمد نظامی، "۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامچہ" محولہ بالا، ص ۱۲۹
(۲) ایضاً، ص ۱۷۹
(۳) سرسید احمد خاں، "آثار الصنادید"، محولہ بالا، باب چوتھا، ص ۳۷
(۴) عبدالحی، مولانا سید، "نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۷۵

عطر مجموعہ ، تریاق الفرنج ، تریاق حافظ الصحت ، تفریح المفتوح

تفریح الحزنک ، تریاق استسقا ، میزان المزاج (تصنیف ۱۲۷۸ھ) اور رحم الاوہام۔

ان میں سے پہلی اور آخری تین کتابیں شائع بھی ہوچکی ہیں۔ (۱)

ان کی اولاد کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہوسکا البتہ ان کے دو شاگردوں پر تاریخ کی روشنی پڑتی ہے ۔ ایک مولانا حکیم محمد حسن صاحب ہیں جنھوں نے علامہ فضل حق خیر آبادی اور نواب صدرالدین خان آزردہ سے معقولات و ادب کی تحصیل کے علاوہ حکیم امام الدین سے طب پڑھی تھی۔ (۲) دوسرے عربی زبان و ادب کے مشہور فاضل علامہ فیض الحسن سہارن پوری ہیں جن سے سرسید نے بھی استفادہ کیا تھا۔ انھوں نے طب میں حکیم امام الدین سے استفادہ کیا تھا۔ (۳)

====XXX====

حکیم پیر بخش :
==========

" صاحب ذہن رسا خداپرور فطرت والا حکیم پیر بخش خان حضرت بادشاہ خلد آرام گاہ محمد اکبر شاہ کی پیش گاہ عنایت سے بخطاب حکیم دوران مخاطب ہیں۔ سلسلہ نسب کا ان کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے ، طرف والد ماجد سے اور حضرت غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ تک طرف والدہ معظمہ سے ۔ اگرچہ وطن آباؤ اجداد کا شہر تھانیسر تھے ۔ لیکن ان کا مولد و مسکن یہی خاک پاک ہے یعنی

---

(۱) کوثر چاند پوری ، " اطبائے عہد مغلیہ "، محولہ بالا ، ص

(۲) امداد صابری ، " فرنگیوں کا جال "، محولہ بالا ، ص ۲۸۵

(۳) عبداللہ قریشی ، " مولانا فیض الحسن "، (مقالہ) ، ماہنامہ " المعارف "، لاہور : ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۷ع ، ص ۳۹

حضرت شاہجہان آباد حرسہا اللہ عن الفساد۔ تحصیل علم طب حکیم شیر اللہ خان سے اور مشق نسخہ نگاری اور معالجہ مرضی حکیم احسن اللہ خان کی خدمت میں کی اور اس فن میں دستگاہ کامل بہم پہنچائی ۔ راقم کے ساتھ رابطہ محبت کا برادرانہ سلوک رکھتے ہیں۔ نہ ان کے خلق کی صفت بیان میں آسکتی ہے اور نہ کمال کی تعریف لکھی جاسکتی ہے ۔ ایک عرصہ دراز سے نواب بہادر جنگ رئیس بہادر گڑھ کی سرکار میں عہدہ طبابت پر مامور ہیں اور اس نواح میں ان کا وجود مغتنم ہے ۔ وہاں کے لوگوں کو ان کی ذات سے وہ منافع حاصل ہیں جو نفس عیسی سے بھی متصور نہ ہوں۔" (۱)

تعلیقات :

حکیم پیر بخش خان کے حالات کے لیے " آثارالصنادید" واحد ماخذ ہے ۔ مولانا عبدالحی نے ان کا مستقل ترجمہ لکھا ہے لیکن ان کا ماخذ " آثار الصنادید" ہے ۔ اسی کے بیان کی تلخیص کردی ہے اور عربی کے قالب بھی ڈھال دیا ہے ۔ ان کی تلخیص کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید نے لکھا تھا :

" وطن آبا و اجداد کا تھانیسر ہے لیکن ان کا مولد و مسکن یہی خاک پاک ہے یعنی حضرت شاہجہان آباد حرسہا اللہ عن الفساد۔"

عربی قالب اختیار کرکے یہ صرف چار لفظ رہ گئے ہیں یعنی " تھانیسری— مولدو منشا بدھلی" (۲)

اسی طرح بشیرالدین نے بھی آثار کے بیان کا خلاصہ کردیا ہے اور صرف افعال و ضمائر بدل دیے ہیں۔ (۳)

---

(۱) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چوتھا، ص ۶۷-۶۶
(۲) عبدالحی، مولانا سید،" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۱۰۳
(۳) بشیرالدین احمد دہلوی،" واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۷-۲۰۶

حکیم حسن بخش خان :

" سرگروہ کملائے شہر، بل زبدہ افاضل دھر اسوہ دانش مندان زمان حکیم حسن بخش خان وطن ان کے آبا و اجداد کا شہر تھانیسر اور مولد و مسکن ان کا شہر شاہجہان آباد جمیع فنون اور علوم میں مثل معقول و منقول و حکمت و ہندسہ [illegible] ہیئت مہارت رکھتے تھے اور کتب طبیہ بسبب کمال حافظہ کے قانون چہ سے قانون شیخ الرئیس تک بلا تشبیہ مثل عبارت قرآن مجید از بر و یاد تھیں۔ علم منطق کی ممارست سے کسی کو معاصرین سے ان کے ساتھ یارائے مناظرہ نہ تھا۔ بارہا مشاہدہ ہوا کہ جس مجلس میں اس زبدہ ارباب کمال کا ہنگامہ گفتگو گرم ہوا جمیع حضار مجلس مثل تصویر کے ساکت اور صامت رہ گئے۔ اوائل حال میں نواب فیض محمد خان رئیس جھجھر کی سرکار میں منسلک رہے اور اس رئیس کی وفات کے بعد چندے خانہ نشیں اور بعد اس کے حضور سراج الدین بہادر شاہ میں صاحب عالم مرزا فخرالدین بہادر کی سرکار میں عہدۂ طبابت پر مامور ہوئے۔ دو تین سال کا عرصہ گذرتا ہے کہ جہان فانی کو وداع کیا۔"(١)

تعلیقات :

حکیم حسن بخش خان۔ ان کے حالات کے لیے بھی " آثارالصنادید " واحد ماخذ ہے۔ صاحب " نزهتہ الخواطر" نے آثار ہی کے بیان کی تلخیص کردی ہے۔ اور صاف صاف بیان کردیا ہے کہ دہلی میں درس و افادہ کا ہنگامہ گرم تھا۔ فہم و ذکا، ذہانت و فطانت اور سرعت خاطر اور قوت حفظ نہایت درجے کی تھی۔ (٢) بشیرالدین نے بھی اپنی سابقہ

---

(١) سرسید احمد خان،" آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چوتھا، صص ٦٨-٦٧

(٢) عبدالحی، مولانا سید،" نزهتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ٧، ص ١٣٣

روایت کو دھرایا ہے اور افعال و ضمائر بدل کر آثار کے بیان کا خلاصہ کردیا ہے -(۱)

نام بھی حسین بخش خان لکھا ہے لیکن سیاق و سباق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

حکیم حسن بخش خان ہیں- سرسید نے لکھا کہ دو تین سال کا عرصہ گزرتا ہے کہ جہان

فانی کو وداع کیا-(۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم صاحب موصوف تقریباً ۱۸۳۲ء میں

انتقال فرمایا ہوگا -

====xx====

حکیم عبدالحکیم معروف بہ ابو خان :

" برادر حقیقی حکیم یوسف خان کے کتب درسیہ کو نہایت تحقیق و تدقیق سے آخوند

شیر محمد کی خدمت میں اور کتب طب اپنے والد ماجد سے تحصیل کیا- معالجہ ان کا اکثر

معاصرین پر فایق ہے اور باوجود کمالات ظاہری اور باطنی کے دست گاہ اخلاق کو کس قدر

وسیع کیا ہے کہ اس کا کچھ بیان نہیں- اللہ تعالی نے ان کو دست شفا ایسی عنایت کی

ہے کہ جن بیماروں کے علاج سے مسیحا بھی عاجز ہو وہ ان کے ہاتھ سے شفا پاتے ہیں"-(۳)

تعلیقات :

عبدالحکیم خان عرف ابوخان - حکیم غلام حسن خان بن حکیم نامدار خان کے چھوٹے

بیٹے تھے-(۴) دھلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی (۵) " نزھتہ الخواطر " میں آپ

کا تذکرہ " آثارالصنادید " کے بیان کا خلاصہ و ترجمہ ہے - " واقعات دارالحکومت دھلی" میں

ان کے، ان کے والد اور بھائی کے بارے میں صرف ایک جملہ ہے جسے ہم نقل کرچکے ہیں-(۶)

---

(۱) بشیرالدین احمد دھلوی؛ واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۰۷

(۲) سرسید احمد خان؛ آثارالصنادید"، محولہ بالا، باب چوتھا، ص ۳۹

(۳) ایضاً، باب چوتھا، ص ۲۸

(۴) فائق رام پوری، کلب علی خان، (مولف) ؛ موس"محولہ بالا، ص ۵

(۵) عبدالحی مولانا سید؛ نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۷، ص ۳۷-۳۶

(۶) بشیرالدین احمد دھلوی؛ واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۰۷

صاحب " حیات اجمل" نے انھیں حکیم محمود خاں ابن حکیم صادق علی خاں کا چچا زاد بھائی لکھا ہے ۔ چوں کہ حکیم نامدار خاں کے بیٹے صادق علی خاں نہیں اس لیے سگے چچا زاد بھائی نہیں ہوسکتے۔ صاحب " حیات اجمل" نے جو واقعہ نقل کیا ہے اس سے آں موصوف کی زندگی کے ایک سانحہ پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۸ء میں ضرور حیات تھے ۔ واقعہ یہ ہے :

" ۱۸۵۸ء کے آغاز میں عام معافی کا اعلان ہوا لیکن کسی نے شکایت کردی کہ حکیم محمود خاں کا مکان مسلمانوں کے لیے جائے پناہ بنا ہوا ہے اور ممکن ہے ایک دو باغی بھی ان لوگوں میں ہوں۔ چناں چہ ۲ فروری، سہ شنبہ کے روز حاکم شہر دستہ لے کر آیا اور صاحب خانہ کے ساتھ ساتھ آدمیوں کو پکڑ کر لے گیا۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات میں ہی رہنا پڑا لیکن حکیم صاحب کی عزت کا پورا لحاظ رکھا گیا۔ بالآخر حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں اور ان کے چچا زاد بھائی حکیم عبدالحکیم خاں کو واپسی کی اجازت مل گئی۔
۱۲ فروری کو کچھ اور لوگ چھوڑ دیے گئے ۔ ۱۳ فروری کو تین اور نے رہائی پائی ......" (۱)

---

(۱) عبدالغفار، محمد، " حیات اجمل"، دھلی: ۱۹۵۰ء ، ص: ۱۷

فصل - چہارم

(چند دیگر حضرات)

خواجہ الطاف حسین حالی (۱) :

الطاف حسین حالی کا سال ولادت ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء اور مولد و منشا طفولیت پانی پت ہے - والد کی طرف سے انصاری اور والدہ کی جانب سے سید تھے -(۲) حالی کے خاندان کے بزرگ خواجہ ملک علی ہرات سے آئے تھے- حالی کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا- حالی کی پیدائش کے بعد والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا- نو برس کے تھے کہ والد نے اس جہان فانی سے انتقال فرمایا-

تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا- پہلے قرآن حفظ کیا پھر فارسی اور عربی کی تعلیم شروع ہوئی - فارسی کی ابتدائی کتابیں مولوی سید جعفر علی سے اور عربی صرف و نحو کی کتابیں حاجی ابراهیم حسین انصاری سے پڑھیں - تقریباً ۱۸۵۴ء میں جب حالی کی عمر سترہ سال کی تھی، ان کے ماموں میر باقر علی کی بیٹی اسلام النساء سے ان کی شادی ہوگئی لیکن حالی کو تعلیم کا شوق تھا- اس لیے چھپ کر دلی چلے گئے- دلی میں ان کے اساتذہ میں سے مولوی نوازش علی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولوی امیر احمد، اور مولانا نذیر حسین محدث دھلوی کے نام معلوم ہوئے ہیں - حالی نے چند

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ)" مقالات حالی"، محولہ بالا، (ترجمہ حالی، خود نوشت) ، ج ۱ ، ص ۲۶۱-۲۷۰

(اس نوٹ کے بنیادی مطالب محولہ بالا ترجمہ حالی سے اخذ کئے گئے ہیں-)

(۲) حمید احمد خان، پروفیسر، " ارمغان حالی"، محولہ بالا ، ص ۳۵-۳۴

قصیدے غالب سے بھی پڑھے تھے ۔(١) نیز غالب سے انھوں نے اپنے اشعار میں اصلاح بھی لی تھی لیکن شاعری میں زیادہ فیض انھوں نے شیفتہ سے اٹھایا۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

دلی کالج میں انھیں ڈیڑھ دو سال تک قیام کرنے کا موقع ملا۔ ١٨٥٥ع میں انھیں اپنے عزیزوں کے اصرار پر پانی پت واپس ہونا پڑا۔ پانی پت میں بھی انھوں نے مولوی قاری عبدالرحمن ، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی سے منطق ، فلسفہ ، حدیث ، تفسیر وغیرہ پڑھیں ۔ ذوق تصوف کی تسکین اور سلوک و تصوف کی تکمیل کے لیے انھوں نے شاہ عبدالغنی مجددی کے دست حق پرست پر بیعت کرلی تھی۔ (٢)

١٨٥٦ع میں انھیں حکومت حصار کے دفتر میں ایک معمولی ملازمت مل گئی ۔ اس دوران میں ١٨٥٧ع کا حادثہ عظیمہ پیش آیا ۔ اور سارا نظام تہ و بالا ہوگیا۔ حالی اپنے گھر بیٹھ رہے ۔ ١٨٦٣ع میں حالی کا تعارف نواب مصطفی خان شیفتہ سے ہوگیا اور حالی

---

(١) صالحہ عابد حسین، "یادگار حالی" ، محولہ بالا ، صص ٣٠-٢٩
خلیل الرحمن داؤدی (مرتب) "یادگار غالب"، محولہ بالا ، ج ١ ، صص ١٠ و ١٢
اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) ، "مکتوبات سرسید"، محولہ بالا ، ص ٣١٠
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتب) ، "کلیات نظم حالی"، محولہ بالا ، ج ١ ، ص ٢
عبدالحق، مولانا سید "حالی، خواجہ الطاف حسین"، (مقالہ) ، "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" ، لاہور: دانش گاہ پنجاب ، ١٩٧١ع ، ج ٧، ص ٨٣٦
عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی "افکار حالی"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان) ، ١٩٧٦ع ، ص ٩٢

(٢) عبدالحی، مولانا سید "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ٨، ص ٦٦
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتب) "کلیات نظم حالی"، محولہ بالا ، ج ٢، ص ٣٣٢
اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد "مکتوبات سرسید"، محولہ بالا ، ص ٣١٠
سجاد حسین، "تعارف ، تذکرہ رحمانیہ از الطاف حسین حالی"، (مقالہ) "نقوش" (سہ ماہی) ، لاہور: اپریل ، ١٩٦٠ع ، ش ٧٩ و ٨٠ ، ص ٣٣

ان کے بچوں کے اتالیق کی حیثیت سے جہانگیر آباد میں ان کے ساتھ رہنے لگے۔ ۱۸۶۹ع میں شیفتہ کے انتقال کے بعد کچھ عرصے حالی کو پنجاب بک ڈپو، لاہور میں تراجم و تصانیف کے مسودات کی اصلاح و درستگی کے لیے ملازمت مل گئی ۔ اس ملازمت پر حالی تقریباً چار سال رہے ۔ اس دوران میں انھوں نے انجمن پنجاب کے متعدد مشاعروں میں شرکت کی اور محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر جدید شاعری کی بنیادیں استوار کیں۔ وہ کچھ عرصہ سررشتہ تعلیم پنجاب کے ماہوار جریدے "اتالیق پنجاب" کے نائب مدیر بھی رہے تھے۔ ۱۸۷۵ع کے اوائل میں انھوں نے دلی کے اینگلو عربک اسکول میں اپنا تبادلہ کرالیا اور وہ دلی چلے آئے ۔(۱)

جنوری، ۱۸۸۷ع میں انھیں ایچیسن کالج، لاہور کے بورڈنگ ہاؤس میں طلبہ کے اتالیق کی حیثیت سے ملازمت مل گئی ۔ لیکن لاہور میں ان کا جی نہ لگا اور تقریباً آٹھ ماہ کے بعد وہ پھر اپنی سابقہ ملازمت پر دلی چلے گئے ۔(۲)

۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ع میں ریاست حیدرآباد (دکن) کی جانب سے بہ صیغۂ امداد مصنفین حالی کا پچھتر روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ ۱۳۰۹ھ میں اس وظیفے میں پچیس روپے کا اضافہ ہوا۔ ۱۸۸۹ع میں حالی نے اینگلو عربک اسکول دلی کی ملازمت ترک کردی اور پانی پت کے گوشۂ خلوت میں بیٹھ گئے اور ہمہ تن تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگئے ۔

۱۹۰۴ع میں حکومت کی طرف سے انھیں شمس العلما کا خطاب عطا ہوا۔ دسمبر، ۱۹۰۵ع سے جون ۱۹۰۷ع تک حالی نظام دکن کے جشن چہل سالہ کی سال گرہ کی روداد لکھنے کے سلسلے میں حیدرآباد دکن میں مقیم رہے ۔ ۱۹۰۵ع میں انھوں نے پانی پت میں ایک

---

(۱) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر(مرتب) "کلیات نظم حالی"، محولہ بالا ج ۱، ص ۱۱
(۲) حمید احمد خان، پروفیسر "ارمغان حالی"، محولہ بالا، ص ۳۸
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر(مرتب) "کلیات نظم حالی"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۱۲

هائی اسکول قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے وسائل مہیا نہ ہوسکے تو ایک پبلک لائبریری قائم کی - ۱۸۹۳ع میں وہ پانی پت میں ایک مدرسہ قائم کرچکے تھے جو کچھ عرصے چلتا رہا - بعد میں ان کے ایما پر ان کے نامور صاحب زادے خواجہ سجاد حسین نے ایک ابتدائی مسلم اسکول قائم کیا جو ترقی کرکے ہائی اسکول بنا اور حالی کے نام سے منسوب ہوکر " حالی مسلم اسکول" کہلایا-

آخر عمر میں ان کی صحت بہت کم زور ہوگئی تھی ، متعدد امراض نے گھیرلیا تھا- ۱۹۱۳ع کے اواخر میں ان کے دماغ کے کسی حصے کو سے ٹالج کا کا حملہ ہوا- بالاخر اسی(۸۰) سال کی عمر میں ۳۱ دسمبر، ۱۹۱۴ع کو پانی پت میں فرشتہ سیرت حالی نے انتقال کیا اور درگاہ حضرت بو علی شاہ قلندر کے احاطے میں آسودۂ خاک ہوئے -(۱)

خواجہ الطاف حسین حالی کی چھ اولادیں ہوئیں - ان میں سے تین اولادیں زندہ رہیں - اور ان سے نسل چلی- ایک فرزند نے صرف چھ ماہ کی زندگی پائی- خواجہ امتیاز حسین نے سات آٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا- رقیہ خاتون دس گیارہ برس کی ہوکر فوت ہوئیں - خواجہ اخلاق حسین، عنایت فاطمہ اور خواجہ سجاد حسین کی شادیاں ہوئیں - اولادیں ہوئیں اور عمر طبعی کو پہنچ کر انتقال کیا- (۲)

حالی علم و فضل ، فکر و نظر کمال شاعری ، اخلاق و مروت ، شرافت و وضع داری میں اسلامی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے- سرسید نے ان کے لیے فرشتہ صفت ، فرشتہ صورت ، فرشتہ جسم اور اسلام پر آنکھیں بند کرکے یقین کرنے والے " کے الفاظ استعمال کیے-(۳)

---

(۱) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر(مرتبہ) " کلیات نظم حالی"، محولہ بالا ، ج ۲، صص ۱۹-۱۲
صالحہ ، عابد حسین، " یادگار حالی"، محولہ بالا ، صص ۷۵-۲۱
خلیل الرحمن داؤدی (مرتبہ) یادگار غالب"، محولہ بالا ، ج ۱، صص ۲۲-۲۳ و ۳۶

(۲) حمید احمد خان، پروفیسر،" ارمغان حالی"، محولہ بالا ، ص ۳۵

(۳) سرسید احمد خان، " سرسید کے رفقا خود ان کی نظر میں"(مضمون) ، "برگ گل"، کراچی: اردو کالج ، ۶۹-۱۹۶۸ع (سرسید نمبر) ، ص ۳۳۸

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ مسلمانان ہند کی عام بیداری میں حالی سرسید اور محسن الملک کے برابر کا شریک تھا۔ بقول اقبال :

آن لاله صحرا خزان دید و بیفسرد — سید دگر اوراقی از اشک سحر داد

حالی زنواهائی جگر سوز دیا سود — تالاله شبنم زده را داغ جگر داد (۱)

مولوی عبدالحق نے عمادالملک سید حسین بلگرامی کا ایک قول نقل کیا ہے کہ سرسید کی جماعت میں بہ حیثیت انسان حالی کا درجہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سرسید بھی انھیں نہیں پہنچتے تھے۔ (۲)

حالی کی تصنیفات میں سب سے پہلے اس رسالے کا پتا چلتا ہے جو کسی منطقی و نحوی مسئلے پر انھوں نے لکھا تھا۔ لیکن چوں کہ اس سے کسی مسئلے میں نواب صدیق حسن خان کی کسی رائے کی تائید و تصدیق ہوتی تھی ، ان کے استاد مولوی نوازش علی نے اسے چاک کردیا تھا۔ ان کا یہ رسالہ ان کے زمانہ طالب علمی کی کوشش تھی اور اب اس کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن صرف اتنی خبر سے بھی ان کے انداز فکر کا اندازہ ہوجاتا ہے - ۱۸۶۴ع میں انھوں نے مولود شریف کے نام سے ایک رسالہ لکھا - ۱۸٦۷ع میں " تریاق مسموم" اور " تحقیق الایمان" کی تصنیف کی ، ۱۸٦۸ع میں " اصول فارسی" کے نام سے فارسی صرف و نحو میں ایک بسیط اور مفصل کتاب لکھی ، جس کے بارے میں خیال تھا کہ شائع ہوگئی لیکن یہ کتاب دستیاب ہوگئی ہے - قیام لاہور کے زمانے کی ایک کتاب " مبادی علم جیولوجی" ایک عربی کتاب کا ترجمہ بھی ہے - ۱۸۷۱ع میں پادری عمادالدین کی کتاب " تاریخ محمدی" پر ایک تبصرہ لکھا جو " تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے " کے نام سے چھپی - ۱۸۷۲ع میں رسالہ

---

(۱) اکرام ، شیخ محمد ، " موج کوثر" ، محولہ بالا ، ص ۱۲۸

(۲) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی ، " حالی ، خواجہ الطاف حسین " (مقالہ) ، " اردو دائرہ معارف اسلامیہ" ، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۸۳۸

" شواهد الالہام " لکھا۔

۱۸۷۴ء میں" مجالس النساء" دو حصوں میں تصنیف ہوئی ، ۱۸۷۹ء میں ان کی معرکہ آرا تصنیف " حیات سعدی" وجود میں آئی - ۱۸۹۶ء میں انھوں نے اپنے استاد مولوی قاری عبدالرحمن پانی پتی کے انتقال پر" تذکرہ رحمانیہ" کے عنوان سے ایک اہم مضمون لکھا - ۱۸۹۷ء میں غالب پر ان کی بلند پایہ تحقیقی اور تنقیدی تصنیف " یادگار غالب" کے نام سے وجود میں آئی - سرسید پر ان کی انتقال (۱۸۹۸ء) کے بعد ۱۹۰۱ء میں " حیات جاوید" حالی کی سب سے زیادہ مفصل ، جامع اور معرکہ آرا تصنیف ہے جو بقول مولوی عبدالحق کے نثر میں حالی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے - ان کے علاوہ انھوں نے مختلف موقر رسائل میں پچاسوں علمی ، تاریخی ، سوانحی ، تنقیدی ، اصلاحی مضامین ، مختلف اہل علم اور اکابر کے نام سیکڑوں خطوط لکھے اور پچاسوں منظومات مختلف تقریبات اور تحریکات سے تخلیق ہوئیں - یہ تمام مضامین نظم و نثر اور خطوط ، "مضامین حالی" ، "مقالات حالی" ، "مکتوبات حالی" ، اور "کلیات نظم حالی" کے نام سے چھپ چکے ہیں - نظم میں ان کا دیوان اور متفرق نظمیں الگ الگ بھی شائع ہوچکی ہیں اور اب "مسدس مد و جزر اسلام" کے سوا ان کا تمام کلام "کلیات نظم حالی" (دو جلد) میں جمع کردیا گیا ہے - انھوں نے اپنے دیوان پر ایک معرکہ آرا مقدمہ بھی لکھا تھا جس میں اردو شاعری کے بارے میں نہایت تفصیل اور دلائل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے - یہ تحریر " مقدمہ شعر و شاعری" کے نام سے الگ بھی شائع ہوچکی ہے - (۱)

---

(۱) حمید احمد خاں ، پروفیسر " ارمغان حالی" ، محولہ بالا ، صص ۲۸-۳۰ و ۳۸-۳۶
افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر ، " کلیات نظم حالی" ، محولہ بالا ، ج ۱ ، ص ۱۵-۱۲ (حواشی)
خلیل الرحمن داؤدی (مرتبہ) " یادگار غالب" محولہ بالا ، ج ۱ ، صص ۳۱-۲۵
عبدالحق ، مولوی " حالی ، خواجہ الطاف حسین" (مقالہ) ، محولہ بالا ، ج ۷ ، صص ۸۳۷-۸۳۶
عبدالحق ، مولوی " افکار حالی" ، محولہ بالا ، ص ۹۵
اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد (پیش کنندہ) " اصل فارسی از الطاف حسین حالی ، [illegible] " نقوش" لاہور : اپریل ، ۱۹۶۰ء ، ش ۷۹ و ۸۰ ، صص ۳۳-۳۰

شاعری کا شوق انھیں زمانہ طالب علمی سے تھا - وہ شعر گوئی کا خاص ذوق اور ملکہ رکھتے تھے- ابتدا میں قدیم طرز کی غزل کی طرف دھیان تھا- نواب مصطفی خان شیفتہ کی صحبت کے اثر و فیضان نے حالی کی شاعری اور ان کے ادبی نقطہ نظر پر اثر ڈالا- لیکن سرسید سے تعارف نے ان کی زندگی کے رخ اور مقصد کو بدل ڈالا- حالی سے سرسید کی پہلی ملاقات ١٨٦٨ء میں نواب شیفتہ کے توسط سے ہوئی تھی- (١) لیکن ان کے ذہنی روابط کے آغاز کا پتا ان کے مضمون" سید احمد خان اور ان کے کام " مصنفہ ١٨٧١ء سے ہوتا ہے - (٢) حالی اگرچہ شروع سے سرسید کی تعلیمی تحریک میں شامل نہیں تھے لیکن شاید سب سے زیادہ مخلص سرسید کی تحریک اور ان کے کاموں کے بارے میں وہی تھے - اس لیے وہ بہت جلد سرسید کی تحریک کے ایک اہم رکن شمار کیے جانے لگے - انھوں نے سرسید پر ، مدرسۃ العلوم پر ، سرسید کی تعلیمی تحریک پر اور ان کے کاموں پر بہت سے مضامین اور نظمیں لکھیں - سرسید کی قومی اصلاحی تحریک کے سلسلے میں" مسدس مد و جزر اسلام" یعنی مسدس حالی ان کی معرکہ آرا نظم ہے - حالی نے اپنے ترجمے میں خود لکھا ہے:

" سرسید احمد خان نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزلی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی - چناں چہ میں نے اول مسدس مد و جزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں لکھیں -" (٣)

حالی کے سرسید سے نہایت استوار و مستحکم تعلقات تھے- اس میں سب سے بڑی وجہ تو حالی کا سرسید کی تحریک سے اتفاق اور اخلاص تھا جس کے سرسید سب سے زیادہ قدردان تھے- غالب و شیفتہ سے ہر دو بزرگوں کا تعلق بھی ان کے تعلقات میں استواری کا باعث

---

(١) عقیل ، معین الدین:" تحریک آزادی میں اردو کا حصہ "، محولہ بالا ، ص ٢٩٥

(٢) افتخار احمد صدیقی (مرتب): " کلیات نظم حالی"، محولہ بالا ، ص ١٢ (حاشیہ)

(٣) اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد (مرتب): " مقالات "، محولہ بالا ، (ترجمہ حالی ، خود نوشت) ، ج ٢ ، ص ٢٦٨

ہوا ہوگا - میاں نذیر حسین سے حالی کا تلمذ سرسید کے لیے اور سرسید کی میاں صاحب سے دوستی بھی حالی کے لیے وجہ کشش بنی ہوگی اور اس سے بڑھ کر دونوں کے مابین مضبوط رشتہ دونوں کا مولوی نوازش علی اور مولانا فیض الحسن سے تلمذ تھا۔ ایک وجہ دونوں کی ایک دوسرے سے وفاداریوں میں استواری کی یہ بھی رہی ہوگی کہ سرسید جس خانقاہ کے عقیدت کیش تھے ، حالی اسی خانقاہ کے ایک بزرگ شاہ عبدالغنی مجددی سے بیعت تھے۔ ان کئی رشتوں نے سرسید کو حالی کے لیے قابل احترام اور حالی کو سرسید کے لیے لائق عزت بنادیا تھا۔

دونوں بزرگوں نے آپس کے تعلقات کو خوب نبھایا۔ حالی نے سرسید کے حالات میں ایسی معرکہ آرا "حیات جاوید" تصنیف کی جس کا جواب پون صدی کے بعد بھی پیدا نہیں ہوسکا۔ سرسید نے حالی کے بارے میں اپنے خطوط و مضامین میں جن بلند خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں حالی کا کوئی شریک نہیں - سرسید کی ان تحریروں کا کیفیت ان کی کمیت سے بہت زیادہ ہے -

سرسید نے حالی کے شاعرانہ کمال ، ان کے اخلاص و ایثار ، قوم پر اور اردو شاعری پر ان کے احسان کا نہایت شان دار الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور انھیں فخر شعرا ، فخر علما ، فخر قوم کے خطابات سے نوازا ہے - سرسید نے ۱۸۹۱ء میں حالی کی شاعرانہ خدمات پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :

"مولوی خواجہ الطاف حسین حالی ، اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر ، محکمہ ڈائریکٹری پنجاب کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے - ان کی مثنوی "حب الوطن" اور مثنوی "مناظرہ رحم و انصاف" جو پنجابی اخبار میں چھپی ہیں ، در حقیقت ہمارے زمانے کے علم و ادب میں ایک کارنامہ ہیں۔ ان کی سادگی الفاظ ، صفائی بیان ، صدگی خیال ، ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے - وہ

مثنویاں آب زلال سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ بیان میں ، زبان میں ، آمد میں ، الفاظ کی ترکیب میں ، سادگی و صفائی میں ، ایسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ ہمارے ان با عث افتخار شاعروں کو ابھی نیچر کے میدان میں پہنچنے کے لیے آگے قدم اٹھانا ہے اور اپنے اشعار کو نیچرل پوشاکی کے ہم سر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے - مگر ان مثنویوں کے دیکھنے سے اتنا خیال خود پیدا ہوتا ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوتی ہے -" (۱)

حالی کی ایک اور نظم " متوسط طبقہ" جوانھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ میں دسمبر، ۱۸۹۱ء میں پڑھی تھی۔ سرسید نے اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :

" اے دوستو! آج یہ نظم جو مولانا حالی نے پڑھی ایک عجیب نظم ہے کہ شاید ایسی نظم فارسی، اردو اور عربی میں کسی شاعر نے نہیں لکھی. . . . جو طریقہ ہمارے مخدوم نے اختیار کیا ہے وہ ایسا مشکل ہے کہ اس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے - جذبات انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا - اس طرح کہ لوگوں کے کان پر پڑتے ہی دل میں کام کرجائے مولانا حالی کا کام ہے - ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک شخص پیدا ہوا۔ آیندہ زمانے میں جو کہا جائے گا کہ فخر قوم، فخر شعرا، فخر علما اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور ان سے نجات دلانے والا قوم کا کون ہے ؟ تو کہا جاوے گا کہ حالی۔" (۲)

مسدس حالی کو جو درحقیقت سرسید کے ایما پر لکھی گئی تھی، سرسید اُسے اپنے لیے توشہ آخرت خیال کرتے تھے - انھوں نے اس نظم کے بارے میں جن والہانہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے ایک خط سے ظاہر ہے - یہ خط انھوں نے مسدس حالی کی وصول یابی

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) " مقالات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء ج پنجم، ص ۱۲۱ (" اختتام سال ۱۲۹۱ھجری - شروع سال ۱۲۹۲ھجری") (مقالہ)

(۲) افتخار احمد صدیقی ڈاکٹر (مرتبہ) " کلیات نظم حالی"، محولہ بالا، ج ۱، ص ۲۶-۶۵

کی رسید کے طور پر لکھا تھا۔ سرسید لکھتے ہیں :

" عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی ۔ اور جب ختم ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے ۔ کس صفائی ، اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے ، بیان سے باہر ہے ۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ ، جھوٹ ، تشبیہات دور از کار سے جو مایہ ناز شعرا و شاعری ہے بالکل مبرا ہے ۔ کیوں کہ ایسی خوبی اور خوش اسلوبی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے ۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جاسکتے۔ حق ہے جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے ۔ شعر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے ۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے ۔ یا ادا کیا ہے ۔ میری نسبت جو اشارہ اس شعر میں ہے اس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں ۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں ۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے ۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں ۔.....

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جائے اور رجسٹری کرادی جاے ، میں دل سے شکر کرتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیاجاے جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گاویں ۔ قوال درگاہوں میں گاویں۔ حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں ۔ اسی قدر مجھے کو زیادہ خوشی ہوگی ۔

میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو "تہذیب الاخلاق" میں چھاپوں گا۔" (۱)

===xxx====

محمد ذکاءاللہ دہلی :

ذکاءاللہ دہلوی، ۲۰ اپریل، ۱۸۳۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے - والد کا نام حافظ ثنا اللہ ابن حافظ بقاءاللہ تھا۔ ان کا سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا ہے - حافظ ثناءاللہ دہلی بھر میں اپنی دین داری اور تقوی کے لیے مشہور تھے۔ وہ مرزا کوچک سلطان ابن بہادر شاہ کے اتالیق تھے۔ یہ ان کا خاندانی امتیاز تھا۔ ان کا خاندان کئی نسلوں سے تیمور کے شاہی گھرانے کے لیے قابل اعتماد اساتذہ مہیا کرتا تھا۔ (۲) حافظ عبدالرحمن حیرت کے بیان سے ان کے خاندان کی وجاہت و علو مرتبت کا اندازہ بھی ہوتا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" از نجبائے والا تبار و شرفائے ستودہ وقار و علمائے علمدار و مشاہیر روزگار حضرت دہلی است " (۳)

ذکا اللہ کی تعلیم دہلی میں ہوئی - ابتدائی فارسی کی کتابیں اپنے دادا اور والد سے پڑھنے کے بعد بارہ سال کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے - امام بخش صہبائی ان کے فارسی اور عربی کے استاد تھے۔ ریاضی کی تعلیم انھوں نے ماسٹر رام چندر سے حاصل کی تھی۔ مولانا مملوک علی اس زمانے میں عربی شعبہ کی مسند صدارت پر [illegible]

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) : "مکتوبات سرسید"، محولہ بالا، ص ۲۱۲-۲۱۳

(۲) [illegible] ضیا الدین احمد برنی (مترجم) : "تذکرہ مولوی ذکا اللہ دہلوی"، محولہ بالا، ص ۸۱-۸۳

(۳) حیرت، حافظ عبدالرحمن، "سفینۂ رحمانی"، محولہ بالا، ص ۱۰۷

رونق افروز تھے لیکن ذکاءاللہ کے اساتذہ میں ان کا نام نہیں آیا ہے - اس لیے خیال کرنا چاہئے کہ انھوں نے مولانا مملوک علی سے نہیں پڑھا ہوگا۔ لیکن وہ چوں کہ شعبہ کے صدر ہیں اس لیے انھیں بھی ذکا اللہ کے اساتذہ میں شامل کرنا چاہیے۔ ان کے کالج کے ساتھیوں میں نذیر احمد ، کریم بخش ، پیارے لال آشوب ، چندولال ، کنھیا لال ، میر پیر علی، شیخ ضیا الدین کے علاوہ محمد حسین آزاد ، مولوی شہامت اور پنڈت موتی لال بسمل کے نام بھی آئے ہیں۔ (۱)

ذکاءاللہ سترہ سال کے تھے اور ہنوز تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ریاضی پر اردو میں ان کی پہلی کتاب شائع ہوئی اور ایسی مقبول ہوئی کہ صرف چار دن میں پورا ایڈیشن فروخت ہوگیا۔ (۲) تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے دہلی کالج میں ملازمت اختیار کرلی - مولوی عبدالحق کالج کے اساتذہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

"مولوی ذکا اللہ بھی یہیں کے طالب علم اور سینئر پرشین اسکالر تھے۔ انھوں نے بھی ابتدا میں دہلی کالج ہی میں بیس روپے ماہانہ پر مہندس کی خدمت قبول کرلی تھی۔" (۳)

کچھ عرصے بعد وہ آگرہ کالج میں فارسی کے پروفیسر ہوگئے -(۴) اس کے بعد بلندشہر اور مرادآباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر ان کا تقرر ہوگیا۔ اس عہدے پر وہ دس گیارہ سال تک خدمات انجام دیتے رہے - پھر انھیں دلی نارمل اسکول کا صدر مدرس بنادیا گیا۔ ۱۸۷۲ء میں میور سنٹرل کالج الہ آباد میں پروفیسر ہوگئے -(۵) اور کامل سینتیس سال

---

(۱) ضیاالدین احمد برنی(مترجم) : "تذکرہ مولوی ذکا اللہ دہلوی"، محولہ بالا ، ص ۱۰۱-۹۷
افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر(مرتبہ) : "مولوی نذیر احمد دہلوی"، محولہ بالا ، ص ۵۸

(۲) ضیا الدین احمد برنی(مترجم) : "تذکرہ مولوی ذکا اللہ دہلوی"، محولہ بالا ، ص ۱۰۳

(۳) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی : "مرحوم دہلی کالج"، محولہ بالا ، ص ۱۲۲

(۴) عسکری ، مرزا محمد(مترجم) : "تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، حصہ نثر، ص ۲۱
اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد(مرتبہ) : "مکتوبات سرسید"، محولہ بالا ، ص ۵۸۹

(۵) عبدالحی ، مولانا سید : "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص ۱۳۹

تک انھوں نے یہ خدمت انجام دی - پنشن لینے کے بعد دھلی میں مقیم ہوگئے تھے۔ (١) رام بابو سکسینہ نے مدت ملازمت چھبیس سال لکھی ہے (٢) لیکن یہ صریحاً غلط ہے ۔حکومت نے ان کے حسن خدمات کے صلے میں انھیں شمس العلما کے خطاب سے نوازا تھا۔ ٧ نومبر، ١٩١٠ع کو دھلی میں انتقال ہوا۔

مولوی ذکا اللہ دھلوی پرانی وضع کے شخص تھے مزاج میں سادگی اور طبیعت میں انکسار تھا۔ ہر کس و ناکس سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ (٣) مولانا عبدالرزاق کان پوری نے لکھا ہے کہ میں نے بچپن سے جوانی تک بیس پچیس مرتبہ انھیں دیکھا اور ان سے ملا۔ ان کو ہمیشہ ایک ہی وضع میں پایا۔ قدیم طرز کی اچکن ، گول سیاہ ٹوپی ، اور دلی کا سادہ جوتا پہنتے تھے اور یہ وضع مرتے دم تک قائم رہی۔ (٤) وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے مغربی علم و ادب سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ مغربی تہذیب کے جوہر سے آشنا ہوچکے تھے لیکن انھوں نے اپنی مشرقی وضع کو نہیں بدلا اور مغربی علوم و تہذیب کا قدر شناس ہونے کے باوجود ان میں احساس کمتری پیدا نہیں ہوا۔ وہ اپنے معمولات میں وقت کے بہت پابند تھے۔ رواداری اور بے تعصبی ان میں اس درجہ تھی کہ لامذہب مشہور ہوگئے تھے۔ نہایت خوش گفتار بقول حالی کے بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے تھے۔ (٥)

---

(١) ضیا الدین احمد برنی (مترجم) "تذکرہ مولوی ذکا اللہ دھلوی"، محولہ بالا ، ص ١٣٧

(٢) عسکری ، مرزا محمد (مترجم) "تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، ج ٢ ، ص ٦١

(٣) بشیرالدین احمد دھلوی "واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا ، ج ٢ ، ص

(٤) عبدالرزاق کان پوری ، محمد ، "منشی ذکا اللہ دھلوی"، (مقالہ "نقوش"، لاھور : جون ، ١٩٦٤ع ، (آپ بیتی نمبر) ، ش ١٠٠ ، ج ١ ، ص ٣٣٣

(٥) ضیاالدین احمد برنی (مترجم) "تذکرہ مولوی ذکا اللہ دھلوی"، محولہ بالا ، ص ١٩٣
افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر ، "مولوی نذیر احمد دھلوی— احوال و آثار"، محولہ بالا ، صص ١٣٣ ، ١٣٦ ، ١٣٨ ، ٣٨٧

ان کے سوانح نگاری سی ایف اینڈریوز نے اپنی تصنیف " تذکرہ مولوی ذکا اللہ دہلوی" میں متعدد مقامات پر ان کے دو بیٹوں کا ذکر کیا ہے لیکن اس طرح کہ کسی روایت یا تذکرے میں ضمناً یا بطور راوی کے ان کا ذکر آگیا ہے -(۱) حافظ عبدالرحمن حیرت نے محمد عطا اللہ و عنایت اللہ ان کے دو بیٹوں کا ذکر کیا ہے - یہ دونوں تالیف سفینۂ رحمانی کے زمانے (۸۲-۱۸۸۰ع) میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں پڑھتے تھے-(۲)

ترجمہ اور تصنیف و تالیف کا شوق انھیں زمانہ طالب علمی سے تھا- زمانہ طالب علمی کی ان کی تصنیف کی کامیابی نے ان کا حوصلہ بڑھادیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے ریاضی، تاریخ ، جغرافیہ اور سیرت و سوانح میں اپنی زندگی میں تقریباً ایک سو ساٹھ کتابیں یا باون ہزار صفحات لکھے -(۳) ان کی تصنیفی خدمات کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

" مولوی ذکا اللہ نے ریاضی کی تمام شاخوں پر ابتدا سے اعلا درجے تک نیز تاریخ ، جغرافیہ ، اخلاق ، طبیعات وغیرہ پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں جو بجائے خود ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن سکتی ہیں-" (۴)

اس میں ان کے فارسی اور انگریزی ترجمے بھی شامل ہیں- ان میں سے تاریخ میں "تاریخ ہندوستان" (دس جلدوں میں) "تاریخ عروج عہد انگلشیہ " (دو جلدوں میں) اور محاورات ملهم ، سوانح میں آئین قیصری، سوانح عمری ملکہ معظمہ ، کرزن نامہ ، سوانح عمری سمیع اللہ خان، ریاضی اور اس کی مختلف شاخوں میں عجائب الحساب ، رسالہ علم تناسب،

---

(۱) ضیا الدین احمد برنی(مترجم) "تذکرہ مولوی ذکا اللہ دہلوی"، محولہ بالا ، صص۱۵۸ ۱۹۴ و دیگر صفحات -

(۲) حیرت، حافظ عبدالرحمن، " سفینۂ رحمانی"، محولہ بالا ، ص۱۰۸

(۳) عبدالحی، مولانا سید ، " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج۸ ، ص ۱۳۹

(۴) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی، " مرحوم دہلی کالج"، محولہ بالا ، ص ۱۶۷

اقلیدس ، ان کے علاوہ جغرافیہ اور دیگر علوم میں " فرہنگ فرنگ"، " تعلیم اللسان"، " فلسفہ"، امثال"، "منتخب الامثال"، شناسی اخلاق" ، " جغرافیہ طبعی" وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔(١)

مولوی ذکا اللہ سرسید کے دوستوں میں نہیں ان کے خردوں میں تھے۔ لیکن انگریز اور انگریزی حکومت کے بارے میں ان کا ذہن ٹھیک اسی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا جس سانچے میں سرسید کا ذہن ڈھلا تھا۔ جنگ آزادی، ١٨٥٧ء کے بارے میں ان کا خیالات ٹھیک ٹھیک وہی تھے جو سرسید کے تھے۔ وہ سرسید کی تعلیمی تحریک اور انگریزی حکومت کے بارے میں سرسید کے رویے کے بہت بڑے موید تھے ۔ انھوں نے اپنی کوشش بھر سرسید کی تحریک کو تقویت پہنچائی ۔ وہ اسے مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری خیال کرتے تھے۔ اور اس کی کامیابی کے لیے بہ دل و جان ساعی تھے ۔ افتخار احمد صدیقی رکھتے ہیں :

" سرسید کے رفقا میں نذیر احمد اور ذکا اللہ دو شخص ایسے تھے جو اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس جادۂ منزل سے آشنا ہوچکے تھے جس طرف علی گڑھ تحریک کا کاروان ایک مدت کے بعد روانہ ہوا۔" (٢)

البتہ وہ سرسید کے برعکس تمام علوم جدیدہ کے لیے اردو ذریعہ تعلیم کے حامی تھے۔ انھیں اصرار تھا کہ ذریعہ تعلیم طالب علم کی مادری زبان ہو ۔ سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز

---

(١) عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی ، " مرحوم دہلی کالج "، محولہ بالا ، ص ١٦٧
" قاموس الکتب"، کراچی : انجمن ترقی اردو (پاکستان) ، ١٩٧٥ء ، ج ٢ ، ص ٣٣٨ ، ٣٨٣ ، ٣٠٢ اور ٣٢٣
عسکری ، مرزا محمد (مترجم) " تاریخ ادب اردو" ، محولہ بالا ، حصہ نثر ، ص ٦٢
عصمت اللہ خان ، " سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ" (مقالہ) ، " برگ گل"، کراچی : اردو کالج ، ٢٩-١٩٦٨ء ، (سرسید نمبر) ، ص ١٩٢
عصمت اللہ خان ، " سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ " (مقالہ) ، " مجلہ " علم و آگہی"، کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج ، ٧٣-١٩٧٢ء ، (خصوصی شمارہ ــــ برصغیر پاک و ہند کے علمی ، ادبی اور تعلیمی ادارے) ، ص ٧٣-١٢٦

(٢) افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر ، " مولوی نذیر احمد دہلوی ــــ احوال و آثار"، محولہ بالا ، ص ١٣٨

نے لکھا ہے کہ ذکا اللہ کو سرسید احمد خان سے نہایت عقیدت اور محبت تھی - وہ انھیں اپنا ہیرو سمجھتے تھے اور علی گڑھ تحریک کے پرجوش مداح تھے- (۱)

حالی لکھتے ہیں :

" انھوں نے کالج کے چندوں کے سوا سوسائٹی کے مقاصد میں اپنے ترجموں سے بے نظیر امداد دی تھی-" (۲)

ذکاءاللہ نے " تہذیب الاخلاق" میں متعدد بلند پایہ مقالات لکھے- نیز مدرسۃ العلوم کے ابتدائی درجات کے نصاب کے لیے جغرافیۂ طبعی کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی- سرسید نے ان کے انھی خیالات و افکار اور خدمات و ایثار سے متاثر ہوکر انھیں کالج کا ٹرسٹی بھی مقرر کیا تھا- (۳)

سرسید نے ایک مضمون جو اپنے رفقا کے بارے میں لکھا تھا- اس میں چند سطریں ذکاءاللہ کے بارے میں بھی ہیں- وہ لکھتے ہیں :

" ایک ہمارے دوست ہمارے دلی والے بھائی منشی محمد ذکاءاللہ صاحب ہیں جو ہماری قوم کے لیے اپنے ان کمالات ذاتی و صفاتی و علمی کے لیے جوان میں خدا نے جمع کیے ہیں، باعث افتخار ہیں- ان کے خیالات ہمارے خیالات سے جدا ہی ہیں- وہ تمام چیزوں پر علوم ہی کو اعلا سمجھتے ہیں اور تمام چیزوں کو علم ہی کی روشنی سے روشن کرنا چاہتے ہیں-" (۴)

سرسید نے ان کی متعدد کتابوں پر تبصرے کیے لیکن یہاں ان کے صرف ایک تبصرے سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں - مولوی ذکا اللہ کی کتاب " جغرافیۂطبعی"، جو انھوں

---

(۱) ضیا الدین احمد برنی(مترجم) "تذکرہ مولوی ذکااللہ دہلوی"، محولہ بالا، صص۱۲۸ اور ۱۳۹

(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین "حیات جاوید"، ج ۲، ص ۵۰۲

(۳) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد،(مرتب) "مکتوبات سرسید"، (مکتوب بنام ذکا اللہ مورخہ ۹ جولائی، ۱۸۹۵ء) ، محولہ بالا، ص ۵۹۲

حالی، خواجہ الطاف حسین، " حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، ص ۳۲۵

(۴) سرسید احمد خان، " سرسید کے رفقاء خود ان کی نظر میں"، (مضمون) "برگ گل" کراچی اردو کالج، (سرسید نمبر) ، محولہ بالا، صص ۳۸-۳۲۷

نے مدرسۃ العلوم کے ابتدائی سلسلۂ خواندگی میں شامل کرنے کے لیے لکھی تھی - سرسید اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ہم اس ہندوستانی مصنف کی متعدد کتابوں کا ریویو اپنے مختلف اخباروں میں لکھ چکے ہیں- اور ہم کو یاد ہے کہ ہم نے ہمیشہ اس لائق شخص کے جوہر دماغی کی تعریف کی ہے اور جس قدر تعریف ہم نے اس کی کی ہے ، ہماری اس تعریف کے صحیح اور بلا مبالغہ ہونے پر نہایت مستحکم دلیل یہ ہے کہ جو مقبولیت اس شخص کی تصانیف نے حاصل کی ہے وہ بے انتہا ہے اور اس کے مفید ہونے میں کسی کو کلام نہیں .... اس لائق شخص کی تصنیف ہمیشہ ایک نئی خوبی پر مشتمل ہوتی ہے جس کے لحاظ سے بے تامل یہ اقرار کیا جاتا ہے کہ یہ لائق مصنف اپنے فن کا بڑا ماہر ہے - صرف ایک کتابی مدرس نہیں ہے جو اس کے حق میں نہایت بڑی تعریف ہے -" (۱)

===xxx====

علامہ شبلی نعمانی :(۲)

محمد شبلی نام ، نعمانی نسبت بہ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت اور شبلی تخلص تھا- ابتدا میں کچھ عرصے تسنیم تخلص بھی اختیار کیا تھا- ذیقعدہ ، ۱۲۷۳ھ/ مئی، ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک موضع بندول میں پیدا ہوئے - والد کا نام حبیب اللہ تھا- نسلاً نو مسلم راج پوت تھے- ابتدائی تعلیم حکیم عبداللہ ، مولوی شکر اللہ اور مولوی فیض اللہ سے حاصل کی - ان کے علاوہ مولانا عباس چڑیا کوٹی اور مولانا ہدایت اللہ سے پڑھا - لیکن مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی سے استفادہ و استفاضہ نے ان کے جوہر قابلیت

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، ج ہفتم، ص ۲۹۳-۹۵

(۲) اس نوٹ کی تیاری میں ان ماخذ سے مدد لی گئی ہے :
سلیمان ندوی، سید " حیات شبلی" ، محولہ بالا ،
سخی احمد ہاشمی، ڈاکٹر " ادبی آئینے"، کراچی: مکتبہ شاہد ، ۱۹۷۳ء ، ص ۲۵-۲۳۶
عبداللہ ، سید محمد " شبلی نعمانی" (مقالہ) ، " اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، لاہور: دانش گاہ پنجاب ، ۱۹۷۵ء ، ج ۱۱ ، ص ۵۳-۷۵۰
عبدالحی ، مولانا سید " نزھۃ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص
عسکری ، مرزا محمد (مترجم) " تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، حصہ نثر ، ص ۷۳-۶۴

کو علم و فکر کی سان پر چڑھوادیا۔ علم کی تشنگی بڑھی تو رام پور، لاہور، سہارن پور، وغیرہ کے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ رام پور میں مولانا ارشاد حسین سے لاہور اور سہارن پور میں مولانا فیض الحسن سے اور مولانا احمد علی محدث دہلوی سے ادب و حدیث کی تکمیل ۔ تعلیم کے یہ تمام مراحل ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء سے شروع ہوکر ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں تمام ہوئے ۔ فرانسیسی زبان انہوں نے قیام علی گڑھ کے زمانے میں ٹی ۔ ڈبلیو ۔آرنلڈ سے سیکھی تھی۔

۱۸۷۶ء ہی میں والد کے ساتھ حج کی سعادت نصیب ہوئی ۔ اس کے بعد ۱۸۸۲ء تک مولانا اعظم گڑھ اور اس کے اطراف میں رہے ۔ وکالت کا امتحان دیا، ملازمت اختیار کی۔ نیل کی تجارت اور زمین داری کے کام پر توجہ دی ۔ وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کے ساتھ شعر و شاعری ، تصنیف و تالیف اور قومی خدمت کے مشاغل بھی جاری رہے ۔

اکتوبر، ۱۸۸۱ء میں اپنے والد کے ساتھ علی گڑھ کا سفر اختیار کیا ۔ سرسید سے ملاقات کی ۔ سرسید کی شان میں انہوں نے عربی میں ایک پر زور قصیدہ لکھا تھا۔ سرسید نے اس جوہر قابل کا خواب اندازہ کرلیا۔ سرسید سے یہ تعارف فروری، ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج میں عربی فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ان کے تقرر کا موجب بنا۔ شبلی کی زندگی میں یہ تاریخ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اور در حقیقت سرسید کی صحبت ان کی لائبریری سے استفادے کی سہولت ، مرکز علمی علی گڑھ میں بلند پایہ علمی شخصیات سے شب و روز کی ملاقاتیں اور علمی ماحول نے مولوی شبلی کو علامہ اور مفکر و مورخ شبلی کے مقام پر پہنچادیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول" سرسید کے سلسلۂ رفقا میں شامل ہوکر انہیں ایک ایسا مشغلہ نصیب ہوا جو ان کی طبیعت اور صلاحیتوں کے عین مطابق تھا۔"(۱)

---

(۱) عبداللہ ، سید محمد "شبلی نعمانی" (مقالہ) معارف اسلامیہ، محولہ بالا، ج ۱۱، ص-۲۵

سرسید سے بعض تعلیمی، سیاسی اور مذہبی افکار میں اختلاف کے باوجود سرسید سے تعلقات کی بنا پر سرسید کی وفات تک کالج سے وابستہ رہے اور جب سرسید کا انتقال ہوگیا تو خود بھی استعفا بھیج دیا اور علی گڑھ کالج سے ترک تعلق کرلیا۔ دسمبر، ۱۹۰۰ء سے فروری، ۱۹۰۲ء تک وہ حیدرآباد دکن میں سر رشتہ علوم و فنون کے ناظم رہے - اس دوران میں ندوۃ العلما کی تعلیمی تحریک میں بھی انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور علمی و تصنیفی مشاغل بھی بھری طرح جاری رہے -

۱۹۰۲ء کے آغاز میں حیدرآباد دکن سے واپسی کے بعد ۱۹۱۳ء تک ان کا زیادہ وقت لکھنو میں اور ندوۃ (انتظام) کے کاموں میں بسر ہوا۔ مولانا شبلی اس وقت تک علی گڑھ اور حیدرآباد دکن میں بہترین تجربات حاصل کرچکے تھے - علم و ادب، تعلیم، مذہب، سیاست میں ان کے خیالات پختہ ہوچکے تھے - انھوں نے ہند اور بیرون ہند دنیا کی سیاحت کی تھی اور بڑے بڑے تعلیمی و علمی اداروں کو دیکھا تھا۔ انھوں نے ان مشاہدات تجربات اور علم و فکر کے بہترین سرو سامان کے ساتھ ندوۃ کی تعمیر میں حصہ لیا۔ لیکن آخر دور میں مسلسل ایسے واقعات پیش آئے کہ مولانا نے بے دل ہوکر جولائی، ۱۹۱۳ء میں ندوۃ کی معتمدی سے استعفا دے دیا۔

ندوۃ کی تعلیمی درس گاہ کے ساتھ ہی ان کے ذہن میں ایک علمی و تحقیقی ادارے کے قیام کا منصوبہ بھی تھا۔ ندوۃ کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوکر وہ پوری طرح اس کے قیام کے سر و سامان کی فراہمی میں لگ گئے - اب انھوں نے مدرسۃ الاصلاح - سرائے میر اور اعظم گڑھ میں اسکول کی ترقی کے لیے بھی راہیں تلاش کیں۔ سیاسی اور قومی کاموں سے انھیں اوائل زندگی سے دل چسپی رہی تھی - ۱۸۷۶ء میں روس و روم کی جنگ ۹۶-۱۸۹۵ء میں آرمینیا کا مسئلہ، ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ ۱۹۰۲ء میں شملہ ڈیپوٹیشن اور

مسلم لیگ کا قیام ، ۱۹۰۸ع میں ترکی میں دستوریت کا اعلان ، ۱۹۱۱ع میں طرابلس پر اٹلی کا حملہ ، ۱۹۱۲ع کا طبی وفد ، ۱۹۱۳ع میں مسجد کان پور کے انہدام کا حادثہ ان کی سیاسی اور شاعرانہ زندگی کے اہم عنوانات ہیں۔

شبلی نے سیرت ، سوانح ، تاریخ ، ادب ، تنقید وغیرہ میں بلند پایہ علمی و تحقیقی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے " سیرت النبی " (ایک جلد)، " شعرالعجم " (پانچ جلدیں) " الفاروق " ، " المامون "، " سیرت النعمان "، " الغزالی "، " الکلام "، " علم الکلام "، " سوانح مولانا روم "، " موازنہ انیس و دبیر "، " سفر نامہ روم و مصر و شام " ، وغیرہ ان کی مستقل تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے بہت سے علمی، تاریخی، سوانحی موضوعات پر نہایت مفصل اور جامع مقالات لکھے جن میں سے بعض بجائے خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ " مقالات شبلی "، " رسائل شبلی " ، " مکاتیب شبلی " اور نظم میں " دیوان شبلی " ، " دستہ گل " اور " کلیات شبلی " اردو آپ کی یادگار ہیں۔

۱۸۹۲ع میں مولانا نے مصر، شام ، روم وغیرہ کا سفر کیا چوں کہ اس سفر کا مقصد علمی و تعلیمی تھا اور ان کی زندگی اور علمی کاموں میں اس کے اثرات نمایاں ہوئے اس لیے اس سفر کا ان کے سوانح میں تذکرہ کرنا بہت ضروری ہے - جنوری ، ۱۸۹۴ع میں انہیں انگریزی حکومت نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں شمس العلما کے خطاب سے نوازا۔

مولانا شبلی کی زندگی کے آخری ایام اعظم گڑھ کے گوشہ خلوت میں بسر ہوئے - ۱۸ نومبر، ۱۹۱۴ع بروز چہار شنبہ انتقال فرمایا۔ اعظم گڑھ میں دفن ہوئے -

ان کی زندگی میں سیرت کا کام ادھورا رہ گیا تھا - آخری لمحوں میں مولانا سید سلیمان ندوی ان کے پاس تھے۔ سیرت کی تکمیل کے لیے وصیت کی اور شبلی کے اس نامور شاگرد نے استاد اعظم کی وصیت کے مطابق اس کام کو پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ " سیرت النبی " چھ

جلدوں میں ہے لیکن شبلی کی زندگی میں ایک جلد چھپ پائی تھی دوسری کا مواد جمع ہوگیا تھا اور زیر تالیف تھی کہ پیام اجل آپہنچا تھا۔

شبلی نعمانی ایک جامع جہات اور جامع حیثیات شخص تھے۔ وہ اردو، عربی اور فارسی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور فرانسیسی زبان سے بھی واقف تھے۔ وہ اردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے - عربی میں بھی ان کے قصائد یادگار ہیں۔ انھوں نے نظم و نثر دونوں اصناف ادب میں اپنی علمی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ جس طرح شاعری کے تمام اصناف ان کے ذہن و فکر سے مالا مال ہوئے اسی طرح ادب ، سوانح ، تاریخ ، سیاست ، تنقید ، تذکرہ ، مذہب ، فقہ ، علم کلام وغیرہ میں ان کی بلند پایہ تصانیف اور رسائل و مقالات سے اردو نثر کا دامن رشک کہکشاں بن گیا۔

شبلی نے نہایت کھلے دل سے سرسید اور ان کے کتب خانے سے استفادہ کیا اور نہایت فراخ دلی کے ساتھ اپنی زبان اور اپنے علم سے سرسید کی تحریک کو کام یاب بنانے کی سعی کی اور انھوں نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ سرسید کے کاموں سے اتفاق اور ان کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے - لیکن انھوں نے اپنی شخصیت کو سرسید کی ذات اور ان کے کاموں میں فنا نہیں ہونے دیا اور سرسید سے تعلق اور علی گڑھ کی ملازمت کے باوجود سرسید کی سیاسی روش ، ترکی اور اسلامی ممالک کے بارے میں سرسید کے خیالات اور بعض علمی کاموں مثلاً "الفاروق" کی تصنیف کے بارے میں سرسید کی خواہش کے برعکس اور بعض تعلیمی مسائل میں سرسید کی رائے کے برخلاف اپنے علم و مطالعہ ، رائے اور صواب دید کے مطابق اپنے علمی و عملی مشاغل کو جاری رکھا۔

اگرچہ سرسید کو بھی ان کے بعض خیالات سے اتفاق اور بعض مشاغل سے دل چسپی نہ تھی ، بلکہ وہ ان کے بعض علمی و عملی مشاغل کو ملت کے بہترین مفاد کے خلاف سمجھتے

تھے اور انھوں نے اس کا مناسب طریقوں سے اظہار بھی کیا۔ لیکن کبھی رکاوٹ نہیں بنے۔ اس میں بلا شبہ سرسید کی اعلا ظرفی اور وسعت قلب و نظر کا بڑا دخل تھا۔ لیکن دونوں میں ایک قوی رشتہ ، مولانا فیض الحسن سے تلمذ کا بھی تھا۔ سرسید نوازش علی اور مولانا فیض الحسن سے مستفید تھے۔ مولانا شبلی بھی خانوادہ ولی اللہی کے دو بڑے اہل علم مولانا فیض الحسن سے جو ادب میں اپنا مثیل نہ رکھتے تھے اور مولانا احمد علی سہارن پوری سے جو فقہ اور حدیث میں وقت کے امام تھے ، شرف تلمذ رکھتے تھے۔ سرسید کو یہ تعلق بھی عزیز ہوگا۔ اس لیے متعدد مسائل میں اختلاف کے باوجود ان کے تعلقات دو وسیع النظر اعلا ظرف اور اہل علم اور ارباب فکر و نظر کے تعلقات نظر آتے ہیں۔ سرسید اور شبلی کے تعلقات پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" شبلی پر سب سے زیادہ گہرا اور نسبتاً پائدار اثر مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی کے علاوہ سرسید احمد خاں ہی کا ہوا ، جن کی رفاقت شبلی کے لیے نہایت مفید رہی۔ شبلی نے سرسید کے کتب خانے سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کالج کے لائق استاد ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ سے (جن سے انھوں نے فرانسیسی پڑھی) تحقیق و تجزیے کا مغربی طریقہ سیکھا۔ غرض شبلی پر علی گڑھ اور سرسید کا اثر اتنا واضح ہے کہ اس کا انکار تاریخی واقعات کا انکار ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ بعد میں شبلی اور سرسید کے نقطہ نظر میں کچھ اختلاف رونما ہوگیا تھا مگر یہ اختلاف ذاتی نہ تھا اصولی قسم کا تھا ۔ درحقیقت ان کا اور سرسید کا اختلاف دو مختلف نظریوں کا اختلاف تھا ۔ دو اشخاص کی مخاصمت نہ تھی۔

شبلی بہرحال علی گڑھ تحریک کے اہم رہنما تھے۔ علمی لحاظ سے انھوں نے سرسید اور علی گڑھ تحریک سے بڑا فائدہ یہ حاصل کیا کہ انھیں سرسید کے زیر اثر (مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی سے حاصل کی ہوئی) معقولات پسندی کو معتدل بنانے کا اچھا موقع مل گیا۔ سرسید کے زیر اثر شبلی بھی سائنٹفک انداز نظر کے دل دادہ ہوگئے ۔ اسی سبب سے ان کے اور سرسید کے نظریات میں بہت

سی باتوں میں اتحاد نظر آتا ہے ۔ اگرچہ بعد میں شبلی سرسید کے نقطۂ نظر سے پیچھے ہٹتے گئے ۔ مگر یہ [redacted] انحراف دراصل کٹر سرسید کی حد سے بڑھی ہوئی سیاسی مصالحت پسندی اور غیر معتدل نیچریت کی وجہ سے تھا۔ ورنہ بنیادی طور پر شبلی اور سرسید ایک دوسرے سے کبھی الگ نہیں ہوئے ۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ شبلی جدید پسند ہونے کے باوجود کسی حال میں ماضی کی روایات سے منقطع نہ ہونا چاہتے تھے مگر سرسید بڑی حد تک روایات سے باغی تھے۔ ان کا نظریہ اجتہاد بھی خاصا انتہا پسندانہ تھا۔ شبلی اور سرسید کے تعلیمی اور سیاسی خیالات میں بھی اسی نوع کا اختلاف تھا جو سرسید کی زندگی میں تو دبا رہا مگر بعد میں بہت نمایاں ہوگیا۔" (۱)

سرسید نے علامہ شبلی کی کئی تصانیف پر تبصرے کیے۔ " المامون" پر تو انھوں نے دیباچہ بھی لکھا۔ ان تحریروں میں سرسید نے شبلی کے علم و فضل ، ان کی تاریخی و سوانحی خدمات اور ان کے فکر و نظر کے کمالات کا نہایت فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے اور ہمیں کسی ایک کے معاصد کی رائے کو دیکھنے کی بجائے سرسید کی ان تحریروں ہی کی روشنی میں دونوں کے تعلقات کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیے۔ سرسید " المامون" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

" ہماری تاریخیں اس زمانے کی لکھی ہوئی ہیں جس میں زمانے نے تاریخ نویسی کے فن کو بھی طرح پر ترقی نہیں دی تھی۔ اس لیے ہمارے بزرگوں کے کاموں کے گوہر آب دار کہیں بکھرے پڑے ہوئے ہیں اور کہیں کوڑے کرکٹ میں دبے ملے ہیں۔ ایک نہایت لائق شخص کا کام ہے جو ان کو چنے اور لڑی میں پرو کر سجادے ۔"

ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے دوست مخدوم اور ہمارے مدرسۃ العلوم کے پروفیسر مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور ایک سلسلہ ہیروز آف اسلام کا لکھنا چاہا ہے ۔ اس سلسلے میں کی ایک یہ کتاب ہے

---

(۱) عبداللہ ، سید محمد ؛ شبلی نعمانی" (مقالہ) ؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ؛ محولہ بالا ، ج ۱۱ ، ص ۲۵۲

جو "الماموں" کے نام سے موسوم ہے ۔ انھوں نے خلفائے بنو عباس میں سے مامون الرشید کو عباسی خلفا (کا) ہیرو قرار دیا ہے اور اس کے کام وہ کارنامے اچھے یا بری نہایت خوبی اور بے انتہا خوش اسلوبی سے اس میں لکھے ہیں۔"

تاریخانہ واقعات لکھنے چنداں مشکل نہ تھے، مگر وہ باتیں جن کے لکھنے کا اس زمانے کے مورخوں کو بہت کم خیال تھا یا ان کی قدر کرتے تھے اور اس زمانے میں انھی کی تلاش اور انھی کی قدر کی جاتی تھی تلاش کرنی نہایت مشکل تھی ، مولانا نے اس میں بھی یا جہاں تک ممکن تھی کام یابی حاصل کی ہے ......

یہ کتاب اردو زبان میں لکھی ہے اور ایسی صاف اور شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔" (۱)

" الفاروق " کے بارے میں سرسید کی رائے تھی کہ شبلی اسی موضوع پر قلم نہ اٹھائیں لیکن شبلی نے اس عظیم مہم کو سرکرلیا تو سرسید نے اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا اور انھیں ہمارے وحید العصر کے لقب سے ملقب فرمایا:

" اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت فائدہ اپہنچایا ہے ۔ " الماموں ، سیرۃ [redacted] النعمان ، کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ" بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں۔ اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ کہیں کہ " فاتو بسورۃ من مثلہ" تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔ [redacted] جزیہ کا ایسا بیجا اور غلط الزام مسلمانوں پر تھا جس کا آج تک کسی نے ایسی عمدگی سے حل نہیں کیا تھا۔ ان اجرہ الاعلی اللہ ۔ بایں ہمہ انھوں نے مثل علمائے متقدمین ...

... کوئی ذاتی فائدہ ان کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا۔ بلکہ بالکلیہ مدرسۃ العلوم کو دے دیا اور جب ان کی حالت معاش پر نظر کی جائے تو ان کی یہ فیاضی بھی بہت زیادہ اور اعلا درجے کی با وقعت ہوجاتی ہے ۔

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتبہ) " مقالات سرسید "، محولہ بالا ، ج ۷، ص ۳۱۰-۱۲

ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ اور جب ایسے شخص نے جو کیا بحیثیت علم اور کیا بلحاظ صدگی تالیف اور کیا بلکہ بنظر طریقہ ترتیب مضامین میں یادگار سلف ہے - .....

اگر اہل ملک مولوی شبلی کی لیاقت کو سمجھتے ہیں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی -" (۱)

تبصروں کے علاوہ سرسید نے اپنے متعدد خطوں میں بھی اپنے دوستوں کو شبلی کی علمی ترک تازیوں اور فتوحات کے بارے میں نہایت خوشی سے اطلاع دی - سید حسن بلگرامی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

" مولوی شبلی صاحب نے تاریخانہ مضمون گزشتہ تعلیم مسلمانان پر اختیار کیا ہے ... میں سمجھتا ہوں کہ نہایت عمدہ اور مفید چیز طیار ہوگئی -" (۲)

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

" جزیہ کے رسالہ پر مولوی شبلی صاحب نے نظر ثانی کی ہے اور کچھ اضافہ کیا ہے - اب وہ نہایت عمدہ اور مکمل ہوگیا ہے اور ہمارے سلسلۂ ال میں بنام الجزیہ چھپ رہا ہے -" (۳)

اسی خط میں شبلی کے ایثار کے بارے میں نہایت دل چسپ پیرائے میں تبصرہ کرتے ہیں :

" مولوی شبلی نے یہ کتابیں (۴) مع حق تصنیف وغیرہ کالج کی نذر کردی کردی ہیں ان کی قیمت یا منافع سے ایک حبہ کا فائدہ انہوں نے حاصل نہیں کیا

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید "، محولہ بالا، ج ۷، صص ۲۸-۳۲۵

(۲) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مکتوبات سرسید "، محولہ بالا، (مکتوب بنام سید حسن بلگرامی، مورخہ ۸ دسمبر ۱۸۸۹ع) ، ص ۳۳۹

(۳) ایضاً، ص ۳۴۳

(۴) اشارہ " المامون" اور گزشتہ تعلیم مسلمانان کی طرف ہے -

اور آئندہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں صرف کالج کے فائدے کے لیے لکھتے ہیں۔ اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں ۔ ایسے جاھل آدمی ہیں کہ انھوں نے چند نسخے العامین کے بلا قیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے ۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ جس قدر تمہارا دل چاہے لے لو، ہرگز نہ مانا۔ مجھ سے خرید کیں اور اپنے دوستوں کو بلا قیمت بھیج دیں۔" (١)

سرسید نے سید حسین بلگرامی کے نام خطوط میں اس کے علاوہ اور بھی شبلی کا ذکر آیا ہے ۔ اور ہرجگہ محبت کے ساتھ ذکر کیا ہے ۔

====XXXX====

مولوی نذیر احمد :

مولوی نذیر احمد کے والد کا نام مولوی سعادت علی خان تھا۔ وہ خاص بجنور کے رہنے والے تھے لیکن جائداد کی وجہ سے جو چند بیگھ سے زیادہ نہ تھی موضع ریہڑ پرگنہ افضل گڑھ ، تحصیل نگینہ ، ضلع بجنور میں رہتے تھے۔ یہی غیر معروف قریہ مولوی نذیر احمد کا مولد تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش ان کے صاحب زادے بشیر الدین احمد اور مفتی انتظام اللہ شہابی نے ٢٣ جمادی الاول ، ١٢٥٢ھ/٦ دسمبر، ١٨٣٦ء لکھی ہے لیکن خود مولوی نذیر احمد نے ڈپٹی کلکٹری کے لیے جو تاریخ ولادت سرکاری تختے میں درج کرائی تھی وہ ٢١ ستمبر، ١٨٣٣ء تھی ۔ رام بابو سکسینہ نے تحقیق (سن) ولادت ١٨٣١ء لکھا ہے ۔ نذیر احمد ابھی چار سال کے تھے کہ ان کے والد خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے موروثی زمین سے دست بردار ہوکر بجنور چلے آئے اور اپنے آبائی مکان میں رہنے لگے ۔

بجنور میں نذیر احمد کی تعلیم کا آغاز ہوا ۔ ابتداً ایک مکتب میں داخل کیے گیے جہاں انھوں نے قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ پھر والد نے انھیں خود فارسی پڑھائی شروع کی

---

(١) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) : مکتوبات سرسید" محولہ بالا ، ص ٣٢٣

اور فارسی کی بعض کتابوں کی تحصیل کے بعد عربی کا آغاز بھی کردیا۔ پھر انھیں نصراللہ خاں ڈپٹی کلکٹر کے زیر تعلیم و تربیت دے دیا گیا ۔ تقریباً پانچ سال ان سے عربی صرف و نحو، منطق اور فلسفہ کی کتابیں پڑھنے کے بعد ۱۸۳۸ء میں انھیں دھلی لے جاکر پنجابی کٹرے کی مسجد میں مولوی عبدالخالق کے سپرد کردیا گیا ۔ چند سال مولوی عبدالخالق سے پڑھنے کے بعد وہ دھلی کالج میں داخل ہوگئے ۔

دھلی کالج میں عربی انھوں نے مولانا مملوک علی سے ، فارسی امام بخش صہبائی سے اور ریاضی ماسٹر رام چندر سے پڑھی ۔ کالج میں ان کے ساتھیوں اور کالج کے اثرات کا ذکر مولوی ذکا اللہ کے سلسلے میں ہوچکا ہے ، کالج میں تعلیم کے زمانے میں انھوں نے میاں نذیر حسین سے بھی استفادہ کیا تھا۔ (۱)

گجرات میں بمقام کنجاہ مدرسی سے انھوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا ۔ پھر الہ آباد میں انسپکٹر مدارس ہوگئے ۔ اسی زمانے میں چند ماہ کے اندر انھوں نے انگریزی میں بھی اتنی قابلیت پیدا کرلی کہ تعزیرات ھند کا ترجمہ کردیا۔ الہ آباد کے بعد کان پور کے ضلع میں تحصیل دار اور پھر ڈپٹی کلکٹر ہوگئے ۔ بعد میں ریاست حیدرآباد دکن میں کمشنر اور بورڈ آف ریونیو کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے ۔ اس عرصے میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کرلیا۔ آخر عمر میں پنشن لے کر دھلی چلے آئے ۔ یہیں ۱۵ جمادی الاول ، ۱۳۳۰ھ/۳ مئی، ۱۹۱۲ء کو انتقال کیا۔ مولوی بشیرالدین نے فارسی میں تاریخ وفات کہی ۔

---

(۱) بشیرالدین احمد دھلوی ؛ واقعات دارالحکومت دھلی"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۲۶۸
یسین علی خاں، " حیات نذیر احمد (مقالہ) ؛ نقوش" لاھور : ادارہ فروغ اردو، جنوری-فروری، ۱۹۵۷ء ، ش ۶۱-۶۲، ص ۲۸۲
عسکری، مرزا محمد (مترجم) ؛ تاریخ ادب اردو، محولہ بالا ، حصہ نثر، ص ۵۵
شہابی، انتظام اللہ ، " سرسید احمد خاں کے رفقا" (مقالہ) ، " برگ گل" محولہ بالا ، ص ۲۵۹
رئیس احمد جعفری ، سید ؛ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، محولہ بالا ، ص ۵۵۵

لوح مزار پر ایک عربی اور فارسی قطع تاریخ کندہ ہے ۔ فارسی قطعہ یہ ہے :

علامۂ دین نذیر احمد　　　　به رحمت کبریا حیاتش

خواجہ زہشیر گفتہ بوخواں　　　واغفر لاہی سن وفاتش (۱)
۱۳۳۰ھ

مولوی نذیر احمد کی بکثرت تصانیف ان کی علمی یادگار ہیں۔ جس میں ترجمۂ قرآن سے لے کر ناولوں تک ہیں۔ ناولوں اور حکایتوں میں " مراۃ العروس "، " بنات النعش "، " توبتہ النصوح "، " ابن الوقت "، " محصنات ، رویائے صادقہ "، " منتخب الحکایات "۔ مذہبی و اخلاقی تالیفات میں ترجمہ قرآن شریف ، " ادعیتہ القرآن "، " الحقوق والفرائض "، " مطالب القرآن " ، " امہات الامہ "، " اجتہاد "، دیگر کتابوں میں صرف صغیر رسم الخط ، موعظۃ الحسنہ ، مصائب غدر، تاریخ دربار تاج پوشی ، نصاب خسرو، چند پند سود مند ، مبادی الحکمۃ ، مایظہر فی القرآن ، مجموعۂ لیکچرز اور قانون سے متعلق کتابوں میں " تعزیرات ہند "، "قانون شہادت "، وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ سات آٹھ چھوٹی چھوٹی کتابیں اور رسائل ہیں جو قیام حیدرآباد دکن کے زمانے میں وہاں کے عمال کے لیے بطور ہدایت نامہ لکھے تھے۔ مگر چھپے نہیں -

مولوی نذیر احمد اردو کے بلند پایہ انشا پرداز تھے۔ ان کی شہرت کا دار و مدار ان کی نثری تصانیف ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں

---

(۱) بشیر الدین احمد دہلوی " واقعات دارالحکومت دہلی "، محولہ بالا ج ۲، ص ۲۶۸-۷۳
یسین علی خان، " حیات ڈپٹی نذیر احمد "، (مقالہ) ، محولہ بالا ، ص ۲۸۷-۹۸
عبدالرزاق کان پوری ، محمد ، " حافظ مولوی نذیر احمد دہلوی" (مضمون) " نقوش"
(آپ بیتی نمبر) " ش ۱۰۰ ، ج ۱ ، ص ۳۳۳
عسکری ، مرزا محمد (مترجم) " تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، حصہ نثر، ص ۵۵-۵۲
شہابی ، مفتی انتظام اللہ ، " سرسید احمد خان کے رفقا" (مقالہ) " برگ گل "،
(سرسید احمد نمبر) ، محولہ بالا ، ص ۲۵۹-۶۰
رئیس احمد جعفری ، سید " بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد "، محولہ بالا ،
ص ۵۵۵-۵۲ و ۵۲۲

میں ظرافت کی ہلکی چاشنی سے ایک دل کشی پیدا ہوتی ہے - انہیں روز مرہ اور محاورے استعمال کرنے کا بہت شوق تھا - ترجمہ قرآن میں اس وجہ سے بعض جگہ ادبی متانت چاشنی باقی نہیں رہی - ان کا خاص میدان مسلمانوں کی مجلسی اور معاشرتی اصلاح ہے- وہ اسے مسلمانوں کی اجتماعی اصلاح و ترقی کے لیے نہایت ضروری خیال کرتے تھے- اس سلسلے میں ان کے ناول نہایت مفید ، سبق آموز اور نصیحت آمیز ہیں- (۱)

مولوی نذیر احمد نے شاعری کی طرف بھی توجہ کی - اردو، فارسی اور عربی میں اشعار ان کی قابلیت کی یادگار ہیں- سرولیم میور اور امیر حبیب اللہ خان افغانستان کی مدح میں ان کی عربی قصائد سے کچھ اشعار مولانا سید عبدالحی نے نقل کیے ہیں-(۲) لیکن شعریت سے ان کا کلام عاری اور تبرک کی حیثیت رکھتا ہے -(۳)

مولوی نذیر احمد نہایت سادہ مزاج ، مہذب اور نہایت ذہین و طباع اور ظریف الطبع بزرگ تھے- ان کی جزو رسی اور کفایت شعاری کا ذکر بھی ان کے تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے - علم و مطالعہ اور تعلیم و تدریس کے شوقین وہ زمانہ طالب علمی سے تھے- مرتے دم تک یہ شوق ان میں موجود رہا- ۱۸۹۷ء میں حکومت نے انہیں شمس العلما کے خطاب سے نوازا ، ۱۹۰۲ء میں یونی ورسٹی آف اڈنبرا نے ایل ایل ڈی کی اور ۱۹۱۰ء میں [illegible]

---

(۱) بشیرالدین احمد دہلوی: "واقعات دارالحکومت دہلی"، محولہ بالا ، ج ۲ ، ص ۷۳-۲۷۲
عسکری ، مرزا محمد (مترجم): "تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، حصہ نثر ، ص ۵۷-۵۲
عقیل ، ڈاکٹر معین الدین: "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ"، محولہ بالا ، ص ۳۰۲
افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر، "مولوی نذیر احمد دہلوی"، محولہ بالا ، ابواب پنجم تا ہشتم ، ص ۳۷۳-۲۰۱

(۲) عبدالحی ، مولانا سید: "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص ۹۷-۳۹۵

(۳) عسکری ، مرزا محمد (مترجم): "تاریخ ادب اردو"، محولہ بالا ، ، حصہ نثر ، ص ۲۰

پنجاب یونی ورسٹی نے ڈی او ایل (ڈاکٹر آف اورینٹل لرننگ) کی ڈگریوں کے اعزازات سے ان کی عزت افزائی کی -(۱)

مولوی نذیر احمد کا تعلق سرسید احمد خان کی تعلیمی اور قومی اصلاح و ترقی کی تحریک سے بہت گہرا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے سرسید کی تحریک کو عوام میں مقبول بنایا۔ اس سلسلے میں مالی ایثار کی سعادت سے بھی وہ محروم نہیں رہے۔ کسی شخص نے سرسید کے سامنے ذکر کیا کہ مولوی نذیر احمد نے باوجود مقدرت کے مالی طور پر کالج کی مدد نہیں کی ۔ حالی لکھتے ہیں :

" سرسید نے بدمزہ ہوکر ان کے چندوں کی تفصیل بیان کی جو وہ ابتدا سے مدرسے میں دیتے رہے ہیں اور جو مقبولیت اور رونق ان کے لیکچروں سے ایجوکیشنل کانفرنس کو ہوتی اس کا ذکر کرکے کہا کہ یہ شخص ہماری قوم کے لیے باعث فخر ہے ۔ اس کی نسبت پھر ایسا لفظ زبان سے نہ نکالنا۔" (۲)

مولوی نذیر احمد کے ایک خط سے جو انھوں نے اپنے اکلوتے صاحب زادے بشیرالدین احمد کو لکھا تھا ان کے چندوں کی تفصیل اور ایثار کی نوعیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" میں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس بنوایا ، دو کمرے ہیں ، دونوں میں چندہ دیا۔ اپنے سارے خاندان کے نام کی جالیاں احاطہ مدرسہ میں نصب کرائیں+" (۳)

مولوی نذیر احمد سرسید کی تحریک کے پرجوش رکن تھے ۔ اور سرسید کی تعلیمی

---

(۱) عسکری، مرزا محمد (مترجم) "تاریخ ادب اردو" محولہ بالا ، حصہ نثر، ص ۲۰
(۲) حالی، خواجہ الطاف حسین "حیات جاوید"، محولہ بالا ، ج ۲، ص ۵۰۲
(۳) نذیر احمد دہلوی شمس العلما ڈپٹی ، " موعظۂ حسنہ"،(خطوط کا مجموعہ) ، لاہور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ع ، ص ۱۹۹

تحریک میں شروع ہی سے ان کے مددگار تھے۔ مدرسۃ العلوم کو مسلمانوں کے لیے مفید اور اس کی تائید کو داخل مثوبات سمجھتے تھے ۔ انھیں سرسید کے خلوص پر کامل اعتماد تھا۔ ان کی تحریک کو بحیثیت مجموعی وہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور ان کی قومی خدمات کو وہ جہاد اکبر سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ "تہذیب الاخلاق" کے بھی قدردان تھے اور اسے وقت کی ایک ضرورت سمجھتے تھے ۔ وہ انگریزوں کے متعلق سرسید کے رویے اور نظریے سے متفق اور ہندوستان کے لسانی تنازعے میں سرسید کے ہم خیال تھے۔ وہ سرسید کی ارفع و اعلا شان کے بھی قائل تھے اور ہر کسی کا ان کی نسبت اظہار رائے پر مستعدد ہوجانا ان کے نزدیک داخل شوخ چشمی تھا۔ (۱) لیکن سرسید کے بعض مذہبی خیالات اور افکار نادرہ کے وہ سخت خلاف تھے۔ سود کے معاملے میں ان کا عمل علمائے دین کے مسلک کے کلیۃً خلاف تھا لیکن ربوا کے بارے میں سرسید کے خیالات پر ایک جگہ انھوں نے نہایت لطیف تنقید کی ہے اور اپنے عمل کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے ۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عمل خاص حالات کے تحت تھا۔ وہ لکھتے ہیں :

" مجھ سے سوائے نوکری کے دوسرا کام ہو نہیں سکتا اور سچ تو یہ ہے کہ برسوں سے پابندی خدمت بھی طبیعت پر شاق ہے ۔ سید احمد خان صاحب نے پرامیسری نوٹوں کے جواز کے دلائل جو جمع کیے ہیں اور ربوا کی حقیقت جو کچھ انھوں نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے اور جو مولوی شاہ عبدالعزیز اور مجتہد الثا عشریوں کے فتاوے مجھ کو سب معلوم ہیں۔ مگر با ایں ہمہ مجھ کو اندوختے کے لیے کوئی دوسرا محفوظ و مطمئن پیرایہ ملے تو میں آج پرامیسری نوٹوں کو الگ کردوں۔" (۲)

---

(۱) اسمٰعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب): "مقالات سرسید"، محولہ بالا، ج ۵، ص ۷۰
طفیل، ڈاکٹر محمد معین الدین: "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ"، محولہ بالا، صص ۲-۳۰۱
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر: مولوی نذیر احمد دہلوی ــــ احوال و آثار"، محولہ بالا، ص ۱۳۸
نذیر احمد دہلوی، شمس العلماء ڈپٹی: "موعظۂ حسنہ"، محولہ بالا، ص ۱۹۹

(۲) ایضاً، ص ۱۸۰

مولوی نذیر احمد سرسید کے تفسیری خیالات کے شدید خلاف تھے۔ ان کے نزدیک انھوں نے آیات قرآنی کے ایسے معانی بیان کیے جو نہ خدا کا مقصود تھے اور نہ جبرئیل علیہ السلام اور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیمات کا منشا و مفہوم تھے اور نہ صحابہ کرام سے لے کر جمہور علمائے اسلام تک کسی کو نہ سوجھے تھے۔ مولوی نذیر احمد کے نزدیک سرسید نے اپنے معنی کو قرآن پر زبردستی منڈھے اور چپکائے تھے اور قرآن کے مفہوم سے اس درجہ ابعد کہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل اور ان معنی کو ماننا مشکل نظر آتا ہے ۔ وہ صاف صاف لکھ دیتے ہیں کہ مجھ کو ان کے معتقدات بالسرہا تسلیم نہیں۔ نذیر احمد کا پورا بیان یہ ہے :

" مجھ کو ان کے معتقدات بالسرہا تسلیم نہیں۔ سید احمد خاں کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ میرے نزدیک وہ تفسیر " دیوان حافظ" کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے چوڑوں سے کان کاٹ کر سارے دیوان کو کتاب تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں نے متعلق آیات قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کیے، اور میرے نزدیک زبردستی منڈھے اور چپکائے ، قرآن کے منزل من اللہ ہونے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کو ماننا مشکل .... یہ وہ معنی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبرئیل حامل وحی کا ، نہ رسول خدا کا، نہ قرآن کے کاتب و مدون کا، نہ اصحاب کا، نہ تابعین کا، نہ تبع تابعین کا ، نہ جمہور مسلمین کا۔" (۱)

مولوی نذیر احمد نے ۱۸۸۸ء میں پہلی مرتبہ ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس منعقدہ ~~علی گڑھ~~ لاہور میں شرکت کی تھی۔ جب مولوی صاحب موصوف نے اجلاس میں شرکت کا وعدہ کرلیا تو اجلاس کے انعقاد کے فیصلے کے اعلان کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ذریعے لوگوں کو یہ خوش خبری بھی سنائی کہ اس اجلاس میں مولوی نذیر احمد بھی شرکت فرمائیں گے ۔

---

(۱) نذیر احمد دہلوی، شمس العلماء ڈپٹی، "موعظہ حسنہ"، محولہ بالا، ص: ۱۰۰-۹۹

سرسید نے ان کے لیے نہایت تعریف و مدح کے کلمات استعمال کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

" ہم نہایت افتخار سے ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبروں اور ان بزرگوں کو جو لاہور ایجوکیشنل کانفرنس میں تشریف لاویں گے یہ مژدہ سناتے ہیں کہ جناب افضل العلماء ، ادیب ، مولانا مولوی نذیر احمد نے مستحکم وعدہ فرمایا ہے کہ وہ لاہور تشریف لاویں گے اور مسلمانوں کی تعلیم پر کانفرنس کے اجلاس میں لیکچر دیں گے۔ کچھ شبہ نہیں کہ وہ لیکچر نہایت عمدہ اور مفید ہوگا۔ اور ان لوگوں کو جو مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے خواہاں ہیں ، اس کے سننے کی زاید از حد رغبت ہوگی۔" (۱)

مولوی نذیر احمد حسب وعدہ اجلاس میں شریک ہوئے اور ایک پر زور لیکچر بھی دیا۔ یہ لیکچر سرسید کی توقع سے کہیں زیادہ کام یاب ہوا۔ سرسید کو اس سے نہایت خوشی ہوئی اور جب انھوں نے اس کی روداد مرتب کی تو اس میں اس لیکچر کے بارے میں اپنے تاثرات اور اسی وقت کی کیفیات کا ان الفاظ میں اظہار کیا :

" جناب مولوی حافظ نذیر احمد صاحب نے مسلمانوں کی حالت تعلیم پر نہایت برجستہ اور عمدہ لیکچر دیا۔ ان کی آواز بلند اور خوش آیند تھی کہ ہر ایک متنفس کے پاس پہنچتی تھی اور بے انتہا دل پر اثر کرتی تھی۔ تمام مجلس کا عجیب حال تھا۔ کبھی تو سب کے سب مثل عالم تصویر مبہوت و خاموش تھے، کبھی بے اختیار ہنس پڑتے تھے اور نہایت زور سے چیرز دیتے تھے ۔ کہ خیمہ گونج اٹھتا تھا اور کبھی ہر ایک کی چشم پر نم تھی .... مولوی صاحب کے لیکچر کا ایسا سماں بندھا تھا کہ اس کی کیفیت کا بیان کرنا زبان قلم سے نا ممکن ہے ۔ تمام حاضرین کو انھوں نے منوادیا کہ ان من البیان لسحرا کا یہی لیکچر مصداق ہے۔"(۲)

اس کے بعد تو ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس اور نذیر احمد کا لیکچر گویا لازم و ملزوم ہوگیا۔ اگلے سال کے اجلاس کے بارے میں سید حسین بلگرامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

---

(۱) افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر؛ "مولوی نذیر احمد دهلوی" محولہ بالا ، ص، ۳۶-۲۳۵
(۲) ایضاً ، ص، ۲۳۶

" اس سال (۱۸۸۹ ع) جو جلسہ لاھور میں ھوگا اس میں مولوی نذیر احمد صاحب مسلمانوں کی تعلیم پر ایک لیکچر دیں گے ۔ بلا شبہ ایک لائق آدمی کے خیالات ، وہ کچھ بھی ھوں ، دنیا بھی موجود ھوجاویں گے۔" (۱)

مولوی نذیر احمد نے اس چوتھے اجلاس میں بھی شرکت کی ، لیکچر دیا اور اپنے کمال خطابت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھادیا۔ سرسید نے اس اجلاس کی روداد میں بھی ان کے کمال خطابت کو خراج تحسین پیش کیا ھے ۔ انھوں نے نذیر احمد کے لیکچر کے تاثرات کو موثر بنانے کے لیے اجلاس کی منظر کشی بھی کی ھے ۔ سرسید لکھتے ھیں :

" اس وقت کا وہ اجلاس جس کے لیے سب کے دل مضطر اور آنکھیں مشتاق تھیں۔ یعنی بہ ذات جناب مولانا مولوی نذیر احمد صاحب کے لیکچر کے لیے مقرر تھا۔ تمام ممبر اور وزیٹر ھال میں جمع تھے۔ پریذیڈنٹ اپنی کرسی پر جلوہ فرما تھے کہ اتنے میں مولوی نذیر احمد صاحب تشریف لائے اور مجلس کی زبان حال نے گویا یہ شعر پڑھا :

بیا شکر فشاں کن آں لب لعل شکر خارا
کہ احیامی کند لعل لبت طرز مسیحا را

غرض کہ مولانا نے اپنا لیکچر شروع کیا۔ جس خوبی اور عمدگی سے لیکچر دیا ھے اس کو بجز سحر حلال کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیا آدمی خیال کرسکتا ھے کہ ایک شخص اپنی فصاحت سے چار گھنٹے تک سینکڑوں لوگوں کو اپنی طرف ایسا متوجہ کرے کہ مثل تصویر ساکت اور خود اپنے آپ کو فراموش کرکے ھمہ تن گوش ھوجاویں غرض کہ ۱۱ بجے لیکچر ختم ھوا اور پھر مجلس کی زبان حال نے گویا یہ شعر پڑھا :

تو حرف زنی و بر لب تو
روح القدس آفریں دہد "

سرسید نے اس روداد میں صرف اپنے ھی تاثرات ھی نقل نہیں کیے بلکہ میر حامد شاہ اور مولوی بشیرالدین کے تاثرات کو بھی جو انھوں نے اپنے سفر کی روداد میں بیان کیے تھے

---

(۱) اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد (مرتب) " مکتوبات سرسید " ، محولہ بالا ، (مکتوب بنام سید حسین بلگرامی ، مورخہ ۸ نومبر ، ۱۸۸۹ ع) ، ص ۳۳۹

اپنی روداد میں سمیٹ لیا۔ مولوی بشیرالدین نے اپنے سفر کی روداد میں کہیں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ مولوی نذیر احمد نے سرسید کی جائز حد تک تعریف اور خوشامد کی "خوشامد" کا لفظ سرسید کو ناگوار ہوا۔ چناں چہ انھوں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :

"میں حقیقت میں ان کی پاؤں کی جوتیاں سیدھی کرنے کے بھی لائق نہیں ہوں وہ مجھ بے چارے کی کیا خوشامد کریں گے ۔" (۱)

مولوی نذیر احمد نے ایک مضمون "تہذیب الاخلاق" میں سرسید اور تہذیب الاخلاق کی حمایت میں لکھا تھا اس پر لوگوں نے لے دے کی ۔ سرسید اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"لو صاحب اور "تہذیب الاخلاق" نکلواؤ اور خیرالدنیا والاخرہ بنو! خواب ہوا کہ سب سے پہلے ہمارے مخدوم مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ہی پر لے دے ہوگئی ۔ گو "مولفۃ قلوب" بدکر ہی کیوں نہ جائیں مگر مولوی نذیر احمد نے کہا سچ ہے کہ ابھی "تہذیب الاخلاق" کے جاری رہنے کی بہت ضرورت ہے۔" (۲)

سرسید اور نذیر احمد میں مسلمانوں کی اصلاح و تعلیم کی تحریک ، سیاسی افکار وغیرہ میں اتفاق کے علاوہ ایک اور قدر مشترک بھی تھی بلکہ کہنا چاہئے کہ ایک زنجیر تھی جس میں دونوں جکڑے ہوئے تھے اور وہ زنجیر تھی خانوادہ ولی اللہی سے دونوں بزرگوں کا تعلق ۔ سرسید کے اس خانوادے سے تعلق پر ہم مقالے کے باب اول میں تفصیل کے ساتھ بحث کرچکے ہیں۔ نذیر احمد کے بارے میں یہ بات ہم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے حوالے سے کہنا چاہتے ہیں :

"نذیر احمد کا مذہبی شعور حضرت شاہ ولی اللہ کے مکتبہ فکر سے وابستہ تھا۔ ان کے استاد مولانا مملوک علی نانوتوی اپنے عہد میں" تحریک ولی اللہی کا دماغ"

---

(۱) افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر: "مولوی نذیر احمد دہلوی" محولہ بالا ، ص: ۳۲۶-۲۷

(۲) اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد (مرتب): "مقالات سرسید" محولہ بالا ، (ان ہذا لشی عجاب) ، (مقالہ) ، ج ۵ ، ص: ۷۰

مانے جاتے تھے اور انہیں کے واسطے سے نذیر احمد خانوادہ ولی اللہی کے دینی فیوض سے بہرہ مند ہوئے -" (۱)

====XXX====

مولانا محمد یعقوب :

اصل نام محمد یعقوب اور تاریخی نام منظور احمد ، غلام حسین اور شمس الضحی تھے- تخلص گمنام اختیار کیا تھا- ۱۲۴۹ھ میں صفر کی تیرہ تاریخ گزرنے کے بعد نانوتہ میں پیدا ہوئے - ان کے والد استاذ اساتذہ ہند مولانا مملوک علی نانوتہ کے شیوخ صدیقی سے تعلق رکھتے تھے- محرم ۱۲۶۰ھ/ مارچ ۱۸۴۴ء میں تعلیم کے لیے اپنے والد کے پاس دہلی گئے - ان کے ساتھ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی تھے جو رشتے میں مولانا مملوک علی کے بھتیجے ہوتے تھے - محمد یعقوب اس وقت تک نانوتہ میں قرآن مجید حفظ کرچکے تھے - علوم و فنون کی تحصیل اپنے والد ماجد کی خدمت میں کی - ابتدائی تعلیم کے دوران میں مولانا قاسم نانوتوی سے بھی استفادہ کیا تھا- حدیث وقت کے محدث مولانا شاہ عبدالغنی مجددی اور کچھ مولانا احمد علی سہارن پوری سے پڑھی تھی- ۱۸۵۷ء میں قیام نانوتہ کے زمانے میں بخاری شریف حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پڑھی تھی- سلوک و تصوف میں آپ کے استاد اور رہنما حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہیں-(۲)

تحصیل علمی سے فراغت کے بعد آپ تیس روپے مشاہرے پر اجمیر کالج میں ملازم ہوگئے- پرنسپل نے آپ کی ذہانت کے پیش نظر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے کے لیے سفارش کی لیکن آپ نے

---

(۱) افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر: "مولوی نذیر احمد دہلوی"، محولہ بالا ، ص ۳۳۰

(۲) انوارالحسن شیر کوٹی ، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۲۷-۳۱۶
عبدالحی ، مولانا سید: "نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص ۵۲۳
ایوب قادری ، محمد: "مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۸۹-۱۸۸

یہ عہدہ قبول نہیں کیا۔ بعد ازاں آپ کو بنارس بھیج دیا گیا۔ آپ کی تنخواہ بھی سو روپے ہوگئی۔ بنارس سے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوکر سہارن پور آگئے ۔ اسی زمانے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا واقعہ عظیمہ پیش آیا۔ اس زمانے میں آپ نے نانوتہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی ۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد گورنمنٹ نے آپ کی چھ ماہ کی تنخواہ یک مشت بھیجی لیکن آپ نے اس مدت میں کام نہ کرنے کی وجہ سے تنخواہ سے انکار کردیا۔ اور اس کے بعد ملازمت بھی ترک کردی ۔ اور منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی میرٹھ میں ملازمت اختیار کرلی۔(۱)

۱۸۶۱ء اور ۱۸۷۷ء میں آپ نے دو حج کئے - ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۷ء میں مدرسہ دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو آپ کو اس کا پہلا صدر مدرس بنایا گیا۔ مدرسہ دیوبند سے آپ کا یہ تعلق آپ کی وفات ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء تک قائم رہا۔ ابتدا میں فتوی نویسی کا الگ شعبہ نہ تھا اس لیےمولانا محمد یعقوب کو درس و تدریس کے علاوہ فتوی نویسی بھی کرنی پڑتی تھی۔ مدرسہ سے آپ نے صرف چالیس روپے مشاہرہ قبول کیا تھا(۲)۔ اور بقول سرسید کو صرف پچیس روپے مشاہرہ منظور کیا تھا۔(۳)

مولانا محمد یعقوب بلند پایہ محدث فقیہہ اور مفتی ہونے کے علاوہ حاذق طبیب بھی تھے ۔(۴) مولانا عبدالحی نے منطق، فنون و خصوصاً فقہ ، اصول ، حدیث ، ادب میں آپ کے تقدم و تفوق کا اعتراف کیا ہے اور آپ کو وقت کے اساتذہ کبار میں شامل کیا ہے۔ (۵)

---

(۱) انوارالحسن شیرکوٹی ، انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۳۸
عبدالحی ، مولانا سید " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص ۵۲۳
ایوب قادری ، محمد " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا ، ص ۱۸۹
(۲) انوارالحسن شیرکوٹی ، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۳۸
(۳) اسمعیل پانی پتی ، شیخ محمد (مرتبہ) " مقالات سرسید"، محولہ بالا ، ج ۷ ، ص ۲۸۰
(۴) انوارالحسن شیرکوٹی ، " انوار قاسمی"، محولہ بالا ، ص ۳۸
(۵) عبدالحی ، مولانا سید " نزھتہ الخواطر"، محولہ بالا ، ج ۸ ، ص ۵۲۳

" ارواح ثلاثہ " کی روایات اور صاحب " انوار قاسمی" کے بیانات سے آپ کا عارف باللہ مقرب بارگاہ الٰہی، صاحب کشف و کرامات ہونا بھی ثابت ہے - (۱)

اگرچہ چند تصانیف بھی آپ سے یادگار ہیں لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی آپ کی شہرت اور حیات جاوید کا سبب نہیں ہے - " حیات جاوید اور شہرت دوام آپ کو دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس نے بخشی ہے -

آپ نے ۱۲۸۳ھ سے ربیع الاول ۱۳۰۲ھ تک دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت تدریس کو رونق بخشی -(۲) اس دوران میں اور اس سے قبل اجمیر، بنارس وغیرہ میں بے شمار لوگوں نے آپ سے اکتساب علم کیا- دارالعلوم میں مولانا قاری محمد طیب صاحب کے مطابق ستتر(۷۷) طلبہ آپ سے حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے - اور بقول محمد ایوب قادری ۱۵۱ طلبہ نے آپ سے علوم دینیہ کی تحصیل کی - ان میں سے تمام فارغین کے نام تو ضبط تحریر میں نہیں لائے جاسکے ، البتہ ایک بڑی جماعت نے علمی و ملی زندگی کے مختلف شعبوں میں بعد میں نام پیدا کیا - ان میں سے چند یہ ہیں :

" حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا احمد حسن امروہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولوی عبدالحق، مولانا عبداللہ انبیٹھوی، مولانا فتح محمد تھانوی، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی، مولانا فخرالحسن گنگوہی، مولانا حکیم ومولانا منصور علی خان مرادآبادی، مفتی عزیز الرحمن دیوبندی، مولوی محمد یسین دیوبندی، مولانا حافظ محمد احمد، مولانا حبیب الرحمن عثمانی" متذکرہ الصدر اصحاب آپ کے نامور تلامذہ اور مستفیدین میں سے تھے- صاحب " انوار قاسمی" نے خود ان کے پیر طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کو بھی آپ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے -(۳)

---

(۱) اشرف علی تھانوی، مولانا(مرتب) " ارواح ثلاثہ"، محولہ بالا، صص ۳۱-۳۳۰

(۲) طیب ، مولانا قاری محمد " تاریخ دارالعلوم دیوبند"، محولہ بالا، صص ۹۷ و ۱۰۸

(۳) انوارالحسن شیر کوٹی " انوار قاسمی"، محولہ بالا، ص ۴۸
ایوب قادری، محمد " مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، ص ۱۹۳
طیب ، مولانا قاری محمد " تاریخ دارالعلوم دیوبند"، محولہ بالا، ص ۹۷

آپ کی تصانیف میں سب سے مشہور اور علمی یادگار مولانا قاسم نانوتوی کے سوانح میں" حالات جناب طیب مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم " ہے۔ یہ کتاب مولانا نانوتوی کے سال وفات ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ع ہی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ آپ کے مکتوبات و بیاض کے دو مجموعے شائع ہوئے - پہلا مجموعہ مکتوبات مولانا محمد یعقوب (حصہ اول) ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ع میں شائع ہوا - اس میں منشی محمد قاسم نیانگری کے نام تقریباً ستر خطوط ہیں اور بقول محمد ایوب قادری،" یہ خطوط بہت سے استفسارات کے جوابات پر مشتمل ہیں اور راہ سلوک کی دشواریوں کا حل، مسائل شرعیہ کا بیان اور طریقت و سلوک کا دستورالعمل ہیں۔" مولانا موصوف کے خطوط کا دوسرا مجموعہ " مکتوبات یعقوبی و بیاض یعقوبی " ہے - اس میں منشی محمد قاسم کے نام مولانا کے بقیہ خطوط بھی ہیں اور اس کے ساتھ مولانا اشرف علی تھانوی نے آپ کی بیاض کو بھی شامل کردیا ہے - اس میں چونسٹھ (۶۴) خطوط اور چند دوسری تحریرات کے علاوہ سفر حج کے متعلق مختلف یادداشتیں ، اسانید، منظومات، عملیات و تعویذات اور طبی نسخہ جات وغیرہ شامل ہیں۔ آپ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی کتاب " شمائم القلوب " کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا جو شائع ہوگیا۔(۱)

مولانا محمد یعقوب عربی، فارسی اور اردو کے شاعر بھی تھے - اگرچہ شاعرانہ حیثیت سے ان کا کوئی مقام نہیں لیکن ان کے کلام سے ان کی طبیعت و قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں نعت اور نعتیہ قصیدہ خاصے کی چیز ہیں۔ شاعری میں ان کا مسلک دیوبند کے مسلک حقہ کے خلاف ہے - انھوں نے شاعری کی عام روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے اور استعانت و امداد طلب کی ہے - ان کا کلام بیاض یعقوبی میں شامل ہے - جو چھپ گیا ہے - اس میں سے مختلف اہل قلم نے اپنی کتابیں اور

---

(۱) انوارالحسن شیر کوٹی، انوار قاسمی"، محولہ بالا، ص ۳۸
(۲) ایوب قادری، محمد، مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، صص ۵۳، ۱۵۴

مضمون میں نقل کیا ہے ۔ محمد ایوب قادری نے اردو اور فارسی کا کچھ کلام " مولانا محمد احسن نانوتوی" میں نقل کیا ہے ۔(۱) مولانا عبدالحی نے " نزہتہ الخواطر" میں ایک عربی نظم کے گیارہ ۱۱ شعر نقل کیے ہیں (۲) اردو کا ایک نعتیہ قصیدہ اور ایک فارسی نعت مولانا محمد اجمل نے اپنے ایک مضمون میں نقل کی ہے ۔ (۳)

مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے تین شادیاں کیں ۔ زوجہ اول شیخ کرامت حسین دیوبندی کی صاحب زادی صدۃ النسا تھیں۔ ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں ان سے عقد کیا تھا۔ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا ۔ دوسرا عقد ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں منشی عبدالحق کی بیوہ اکرامن سے کیا۔ ان خاتون کا انتقال بھی آپ کی زندگی ہی میں ۱۲ ذی الحجہ، ۱۳۰۱ھ/اکتوبر، ۱۸۸۴ء کو ہوگیا۔ تیسری شادی انھوں نے آمنہ بنت مولوی محمد احسن سے زوجہ ثانی کی حیات ہی میں کی تھی۔

پہلی بیوی سے حکیم معین الدین، قطب الدین، علاء الدین، جلال الدین چار لڑکے اور فاطمہ و خدیجہ دو لڑکیاں پیدا ہوئیں ۔ دوسری بیوی سے فریدالدین ایک لڑکا اور برکت اور ام سلمہ دو لڑکیاں پیدا ہوئیں ۔ تیسری بیوی سے ایک لڑکا نظام الدین تولد ہوا تھا۔ (۴)

صفر، ۱۳۰۲ھ/میں آپ دیوبند سے نانوتہ تشریف لے گئے یکم ربیع الاول کی رات کو آپ کو ہیضہ ہوگیا اور اسی مرض میں دو روز کے بعد ۳ ربیع الاول / ۲۱ دسمبر، ۱۸۸۴ء جمعہ گزار کر انتقال فرمایا۔ نانوتہ ہی میں تدفین عمل میں آئی ۔(۵)

---

(۱) ایوب قادری، محمد ؛" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، صص ۲۰۲-۱۹۹

(۲) عبدالحی، مولانا سید ؛" نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، صص ۲۵-۵۲۳

(۳) اجمل، قاری محمد ؛" عشق رسالت مآب اور اکابر دیوبند" (مقالہ) ؛" الرشید"، لاہور: فروری- مارچ، ۱۹۷۶ء، (دارالعلوم دیوبند نمبر) ج ۴، ش ۲، ۳، صص ۲۶-۵۲۵

(۴) انوارالحسن شیرکوٹی، " انوار قاسمی"، محولہ بالا، ص
ایوب قادری، محمد ؛" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، صص ۹۸-۱۹۷

(۵) انوارالحسن شیرکوٹی؛" انوار قاسمی"، محولہ بالا، صص
عبدالحی، مولانا سید ؛ " نزہتہ الخواطر"، محولہ بالا، ج ۸، ص ۵۲۵
ایوب قادری، محمد ؛" مولانا محمد احسن نانوتوی"، محولہ بالا، صص ۹۹-۱۹۸

سرسید نے ان کے بارے میں کوئی ایسی تحریر یادگار نہیں چھوڑی جسے جزو متن بنایا جاسکے لیکن متعدد تحریروں میں ان کا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ اس سے صرف نظر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان تحریروں میں سرسید نے مولانا محمد یعقوب کے علم و فضل، اخلاق و ایثار، اور آپ کے تقوی و پرہیزگاری کی تعریف بھی کی ہے اور آپ کے بعض افکار کا تعاقب بھی کیا ہے - لیکن سرسید کی تنقید کا انداز علمی نہیں ہے - انھوں نے مولانائے ممدوح کے رویے کو افہام و تفہیم سے بدلنے کی بجائے ان پر طنز و تشنیع کے تیر چلائے ہیں۔ جب مولانا نے سرسید کی اس پیش کش کو ٹھکرادیا جس میں انھیں کالج کی سنی اسلامیات کی نصابی کمیٹی میں شامل ہونے کو کہا گیا تھا تو سرسید نے ان کی غلط فہمی یا اعتراض کو رفع کرنے کی کوئی کوشش نہیں بلکہ تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں ان الفاظ میں انھیں اپنے طنز کا ہدف بنایا ہے -

" مدرسۃ العلوم میں تعلیم مذہبی بلا شبہ اہل سنت و جماعت کو موافق مذہب حنفی کے اور شیعہ کو موافق ان کے مذہب کے اصول مسلمہ کے ہوتی ہے ... .جناب مولوی محمدقاسم صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو ~~متعصبانہ~~ متعصبانہ جواب دیا - اس سے ہر شخص جس کو خدانے عقل اور محبت قومی اور جب ایمان دینی ہوگی، نفرت کرتا ہوگا۔ شیعہ مذہب کی تعلیم کا سلسلہ بالکل علاحدہ ہے جس سے اہل سنت و جماعت کو کچھ تعلق نہیں - بس یہ کہنا کتنا بیجا تعصب ہے کہ ہرگاہ اس مدرسہ میں شیعہ بھی ہوں گے - اس لیے ہم شریک نہیں ہوتے - خدا کرے کہ وہ یہ خیال فرماکر کہ ہندوستان میں بھی شیعہ رہتے ہیں، مکہ معظمہ کو سدھاریں - مگر افسوس ہے کہ میں سنتا ہوں کہ حج و طواف میں بھی شیعہ ہوتے ہیں۔" (۱)

قومی اہمیت کے معاملات میں کسی کے رویے کو بدلنے کے جس سنجیدگی طریقہ کار اور افہام و تفہیم کی ضرورت ہوتی ہے - سرسید کا یہ انداز اس مصلحت اندیشی سے بالکل عاری اور ان حضرات کو اور زیادہ دور کردینے والا ہے -

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) "مقالات سرسید"، محولہ بالا، ج ۵، صص ۱۲۴-۲۵
حالی، خواجہ الطاف حسین "حیات جاوید"، محولہ بالا، ج ۲، صص ۲۹۳-۹۵

ایک مضمون میں سرسید نے مولانا محمد یعقوب کی ایک تجویز پر سخت لے دے کی ہے ۔ اسلام میں مہر کی کوئی خاص حد مقرر نہیں ہے ۔ اس سلسلے میں شوہر کی مالی حیثیت اور زوجین کی باہمی رضامندی کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ لیکن ہندوستان میں رسماً لمبے لمبے مہر مقرر کیے جانے لگے اور یہ بات بالکل ذہن سے نکال دی گئی کہ یہ زوجہ کا حق ہے اور اسے ادا بھی کرنا ہے ۔ اس طرح زوجہ کا حق مار کر عام و خاص مسلمان ایک عظیم معصیت میں مبتلا ہوگئے ۔ اسلامی حکومت کے خاتمے کے بعد اس قسم کے قانون کے نفاذ کی بھی کوئی صورت نہیں رہی جس سے مسلمانوں کو اس معصیت سے روکا جائے ۔ ہندوستان میں نکاح ، طلاق ، وراثت وغیرہ کے تمام مقدمات میں فیصلے حکومت کی عام عدالتیں کرتی تھیں اور اس پر کسی کو اور سرسید کو بھی اعتراض نہ تھا ۔ مولانا محمد یعقوب نے مسلمانوں کو لمبے چوڑے مہر مقرر کرنے اور ادا نہ کرنے کی معصیت میں مبتلا ہوجانے کی معصیت سے روکنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت نکاح و طلاق اور وراثت کے تمام فیصلے کرتی ہے تو اسلامی شریعت کے منشا کے مطابق ایک ایسا قانون بھی بنادیا جائے جس میں ہر کسی کو لمبے چوڑے مہر مقرر کرنے کی چھوٹ نہ ہو ۔ سرسید نے اس تجویز کو اسلامی شریعت میں ترمیم کی درخواست فرض کیا اور اس پر ایک تیز و تند مضمون لکھا ۔ بلا شبہ یہ ایک اہم مسئلہ تھا اور سرسید کو ضرور اس مسئلے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے تھا لیکن ہم ان سے جس مدبرانہ اظہار رائے کی توقع کرسکتے ہیں وہ توقع ان کے جواب سے پوری نہیں ہوتی ۔ انھوں نے اس مضمون میں بھی طنز و تعریض سے کام لیا ہے ۔ سرسید لکھتے ہیں :

" خدا نے اور محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر کی کوئی حد معین نہیں کی ۔ ناکح اور منکوحہ کی رضامندی پر موقوف ہے ۔ وہ جو چاہیں مقرر کریں ۔ مگر ہمارے زمانے کے امام اعظم جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس مدرسہ

عربی دیوبند خدا کے اس حکم کو پسند نہیں فرماتے اور یہ چاہتے ہیں کہ نواب گورنرجنرل بہادر ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل سے کوئی قانون اس ترمیم کے لیے نافذ ہو تاکہ ہر قوم کی حسب حیثیت مہر کی ایک مقدار مقرر ہوجائے - چنانچہ جو خط جناب امام ہمام کا اس باب میں چھپا ہے اس کا وہ فقرہ جس میں وہ درخواست ہے بعینہ نقل کیا جاتا ہے - اور وہ یہ ہے :

" اب ایک مختصر مضمون اس رائے پر عرض کرتا ہوں - زیادہ مہر کی اصل غرض ملک ہند میں کچھ تو فخر اور تکبر کے باعث ہے - مگر اصل اس بات کی یہ ہے کہ زیادہ مہر کے وسیلے سے عورتیں بعد بیوہ ہونے کے دوسرا نکاح کرنے سے بچیں اور بنی اعمام اور رشتہ دار اس حیلے سے اپنے حق سے جو بحسب فرائض ان کے لیے مقرر ہیں ، محروم رہیں - مگر اس کے لیے کسی زمانے میں جیسی صورت ظاہری تھی ویسی مقدار مقرر ہوتی تھی - اب وہ صورت بھی نہیں رہی اور نہ وہ گنجائش - مگر مہر وہی کا وہی رہا ہے - کیا اچھا ہوتا کہ حکام ایسے بے ہودہ جھگڑے دیکھ کر ایسے بڑے امر سے کہ نہایت سی بری باتوں کی ہے [illegible] روک دیویں اور ہر قوم کی حسب حیثیت ایک مقدار مقرر ہوجاوے جس سے تجاوز نہ ہوا کرے - یا ہر جانب عمائد کو اس بات کی ہدایت کریں کہ وہ باہم اس تجویز کو فراہم ہوکر کرلیں تاکہ یہ بلائے عام رفع ہو - "

راقم

(محمد یعقوب ، مدرس مدرسہ عربی دیوبند ")

یہ سطریں خود سرسید نے نقل کی ہیں - ان میں پورا مقدمہ مع دلائل شرعیہ اور مصالح مذکورہ کے موجود ہے نیز اس میں ایک قانون بنائے جانے کے برعکس ایک متبادل تجویز بھی موجود ہے - سرسید نے اس مقدمہ ، پس منظر ، دلائل شرعیہ اور مصالح مذکورہ اور متبادل تجویز کے بارے میں تو کچھ نہیں لکھا - اوپر " ہمارے زمانے کے امام اعظم " ، " جناب امام ہمام " وغیرہ کے طنزیہ خطابات کے بعد آخر میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :

" ہم سمجھتے ہیں کہ جو حکم شریعت محمدی کا ہے وہ تو نہایت عمدہ ہے - اس میں تو کچھ ترمیم کی حاجت نہیں اور نہ کوئی نقصان اور آفت اس میں ہے - حالانکہ

اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ شریعت کی ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنا چاہتے ہیں ان کو بہت سی جوروں کھیولینے اور پرانی کو طلاق اور نئی سے نکاح کرلینے میں بہت آسانی ہوجائے گی اور ٹھیک یہ مثل صادق آجایے گی کہ کل جدید لذیذ"۔ (۱)

جب بقول سرسید" خدانے اور محمد رسول اللہ صلعم نے مہر کی کوئی حد معین نہیں کی " تو " شریعت محمدی کا حکم " کیسے ہوگیا؟ جس میں ترمیم اور تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ یہ امر کلیۃً مسلمانوں کے مصالح پر مبنی ہے - اگر مسلمان کسی وقت ضرورت محسوس کریں تو وہ حد بھی مقرر کرسکتے ہیں - اور جیسا کہ سرسید کو تسلیم ہے کہ " صورت ناکح اور منکوحہ کی رضامندی پر موقوف ہے ، - اگر انھیں کے مفاد میں کوئی ضابطہ بنالیا جائے یا عمائد کی کوئی جماعت مقرر کردی جائے جو اس باب میں فریقین کو مشورہ یا حکم دے سکے - تو یہ شریعت محمدی میں ترمیم کیوں کر ہوگئی - مختصر یہ کہ اگر حکم ثابت نہیں تو رسم میں رد و بدل کو شریعت اسلامیہ میں ترمیم و تنسیخ کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا۔

سرسید نے ایک اور جگہ مولانا محمد یعقوب پر شدید طنز کیا ہے اور ہم اس کا جواز تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس لیے کہ وہ یہاں کسی سیاسی یا مذہبی معاملے میں مولانا مرحوم کے خیالات کا رد نہیں کر رہے تھے - سرسید عید کے موقع پر مصافحہ و معانقہ اور عربی میں جمعہ و عیدین کے خطبے کی عدم معقولیت پر بحث کر رہے تھے - اس میں مولانا محمد یعقوب یا کسی اور شخص کا نام لینے اور اسے ہدف ملامت بنانے کا کوئی موقع نہ تھا - سرسید کے الفاظ ہیں :

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) " مقالات سرسید "، لاہور: مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ء ، ج ۱۳ ، (ترمیم احکام شریعت از سرسید احمد خان)، ص: ۵۶۱-۲۲

" مگر جناب مولوی محمد یعقوب آنحضرت خاتم النبیین پاس حضرت جبرائیل خدا کے پاس سے وحی لائے ہیں کہ وہ (یعنی سرسید) تو دجال ہے -" (۱)

ان تحریروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب کے بارے میں سرسید کا ذہن معاندانہ انداز میں سوچتا اور قلم سے متضادہ انداز میں اس کا اظہار ہوتا ہے - حالاں کہ مولانا کے موصوف سرسید کے استاد بھائی بھی تھے- انھوں نے اپنے استاد کے بارے میں نہایت بلند خیالات کا اظہار کیا ہے - نیز مولانائے ممدوح مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شریک کار، ہم خیال اور دوست تھے اور سرسید نے حضرت نانوتوی کے بارے میں بھی نہایت بلند خیالات کا اظہار کیا ہے -

لیکن ایسا نہیں ہے کہ سرسید نے مولانا ئے ممدوح کے ایثار اور قناعت و زہد کا اعتراف ہی نہ کیا ہو - مدرسہ دیوبند کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" مولوی محمد یعقوب صاحب ... جو مدرس اول اس مدرسہ کے ہیں اور انھوں نے صرف پینتیس (۳۵) روپے ماہواری مدرسہ سے لینا قبول کیا ہے- اور قناعت و زہد سے اس قدر قلیل آمدنی میں اوقات بسر کرتے ہیں- اگر وہ نہ ہوں تو کیا دوسرا شخص اس قلیل مشاہرے پر ان علوم کو پڑھانے کو ملے گا ، جو اس میں پڑھائے جاتے ہیں.... یہ مدرسہ صرف ان بزرگوں (مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب) کی دعا پر قائم ہے - جس دن یہ دونوں بزرگ خدا کے گھر یا خداکے پاس تشریف لے جاویں گے اسی دن مدرسے کا بھی خاتمہ ہوگا-" (۲)

دارالعلوم دیوبند کی ایک سو سال سے زیادہ کی تاریخ ہمارے سامنے ہے - سرسید کی یہ پیشین گوئی یا خواہش پوری نہیں ہوئی کہ ان دو اعاظم رجال کے نہ ہونے سے مدرسہ

---

(۱) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) "مقالات سرسید"، لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ع ، ج ۱۵ (مبارک باد عید از سرسید احمدخان) ، ص ۱۴

(۲) اسمعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) "مقالات سرسید"، محولہ بالا ، ج ۷، (مدرسہ دیوبند کی سالانہ رپورٹ پر تبصرہ از سرسید احمد خان) ، ص ۲۵۰

ختم ہوجائے گا - مدرسے نے اس کے بعد ہر لحاظ سے بہت ترقی کی ہے -

پچھلے ایک حوالے میں سرسید کے قلم سے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے بارے میں " ہمارے زمانے کے امام اعظم" اور " جناب امام ہمام" کے الفاظ نکلے ہیں - اگرچہ سرسید نے یہ الفاظ طنزیہ طور پر لکھے ہیں لیکن ان سے اتنا اندازہ ہوجاتا ہے کہ اگر کوئی اس عہد عہد امام اعظم کے لقب کا مستحق اور امام ہمام ہوسکتا ہے تو وہ مولانا محمد یعقوب ، صدر مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند ہی کی ذات گرامی اور ستودہ صفات شخصیت ہوسکتی ہے -

" تمت بالخیر "

کتابیات

(کتب و جرائد حوالہ و استفادہ)

نمبر شمار	تفصیل	صفحات

کتب

۱- ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر (مرتب)،
"اسباب بغاوت ہند" از سرسید احمد خاں،
کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء

۲- ابوالحسن علی ندوی،
"سیرت سید احمد شہید"، لاہور: خواجہ بک ڈپو، ۱۹۵۸ء، حصہ اول

۳- "سیرت سید احمد شہید"، لاہور: القادر ناشران کتب اسلامی، ۱۹۷۳ء، حصہ دوم

۴- ابوسلمان شاہجہان پوری (مرتب)،
"مکاتیب ابوالکلام آزاد"، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۸ء

۵- احتشام الحسن کاندھلوی،
"حالات مشائخ کاندھلہ"، دہلی: ادارہ اشاعت دینیات، ۱۳۸۳ھ

۶- احسان الحق فاروقی (مترجم)،
"گلشن بے خار" از نواب مصطفی خاں شیفتہ، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۲ء

۷- احسن مارہروی، "تاریخ نثر اردو"

۸- احمد ولی اللہی، سید ظہیرالدین،
"کمالات عزیزی"، لاہور: اسلامی اکیڈمی، س ن،

۹- "یادگار دہلی"، دہلی: س - ن

۱۰- احمد رضا بجنوری، سید،
"انوارالباری اردو شرح صحیح البخاری"، دیوبند: مکتبہ ناشرالعلوم، ۱۹۶۲ء، حصہ دوم

۱۱- احمد سعید مجددی دہلوی،
"سعیدالبیان فی سید الانس والجان"، حیدرآباد (سندھ): ۱۳۸۵ھ

۱۲- اختر الواسع ،

" ایجوکیشن آف انڈین مسلم "، نئی دھلی : پریس ایشیا انٹر نیشنل (پی) لمیٹڈ ، ۱۹۷۸ء

۱۳- اختر جوناگڈھی ، قاضی احمد میں (مرتب) ،

" تذکرہ اھل دھلی " از سرسید احمد خان، کراچی : انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۵ء

۱۴- " سرسید کا علمی کارنامہ "، کراچی : آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ،۱۹۱۳ء

۱۵- اختر دھلوی، مولانا محمد ،

" تذکرہ اولیائے ھند و پاکستان"، لاھور : ملک سراج الدین اینڈ سنز، ۱۹۵۷ء

۱۶- " تذکرہ مصنفین [illegible] درس نظامی"، لاھور : مسلم اکادمی، ۱۹۷۵ء

۱۷- اسلم فرخی، ڈاکٹر محمد (مرتب) ،

" گلشن ھمیشہ بہار" از نصراللہ خان خویشگی، کراچی : انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۷ء

۱۸- اسماعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب) ،

" خطبات سرسید"، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۷۲ء ، حصہ اول

۱۹- " مقالات حالی"، کراچی : انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۷ء ، حصہ اول

۲۰- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء ، حصہ اول

۲۱- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء ، حصہ دوم

۲۲- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۱ء ، حصہ [illegible] سوم

۲۳- " مقالات سرسید"، لاھور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء ، حصہ چہارم

۲۴- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء ، حصہ پنجم

۲۵- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء ، حصہ ششم

۲۶- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء ، حصہ ھفتم

۲۷- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء ، حصہ ھشتم

۲۸- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ء ، حصہ دھم

۲۹- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ء ، حصہ سیز دھم

۳۰- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۲ء ، حصہ چہاردھم

۳۱- " مقالات سرسید "، لاھور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ء ، حصہ پانزدھم

-۳۲ اسماعیل پانی پتی، شیخ محمد (مرتب)،

" مقالات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، حصہ شانزدہم

-۳۳ " مکتوبات سرسید"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۹ء

-۳۴ اشرف علی تھانوی، مولانا (مرتب)،

" ارواح ثلاثہ "، لاہور: اسلامی اکادمی، ۱۹۷۶ء

-۳۵ اعجاز سعید، سید،

" حیات محمود (حالات نواب محمد محمود علی خان رئیس ریاست چھتاری)"، دہلی: لالہ ٹھاکر داس اینڈ سنز، ۱۹۱۵ء

-۳۶ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر،

" مولوی نذیر احمد دہلوی — احوال و آثار"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء

-۳۷ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتب)،

" کلیات نظم حالی"، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء، جلد ۱

-۳۸ اقبال علی، سید (مرتب)،

" سفر نامہ پنجاب (سرسید احمد خان)"، لاہور: مجلس ترقی ادب، س ن

-۳۹ اکبرالدین صدیقی، محمد (مرتب)،

" کلیات مسدود"، حیدرآباد (دکن): نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۲ء، ج ۱

-۴۰ اکرام، شیخ محمد،

" رود کوثر"، کراچی: تاج آفس، س ن

-۴۱ " موج کوثر"، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۶۶ء

-۴۲ امام الدین ریاضی،

" تصریح فی شرح التشریح"، دہلی: مطبع سید المطابع، ۱۲۹۳ھ

-۴۳ امام الدین گجراتی و احمد بابا مخدومی لاہوری،

" آخری مضامین سرسید"، لاہور: اللہ والے کی قومی دکان، ۱۸۹۸ء

-۴۴ امام خان نوشہروی، ابو یحییٰ،

" تراجم علمائے حدیث ہند"، دہلی: جید برقی پریس، ۱۹۳۸ء

-۴۵ " ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات"، چیچہ وطنی: ساہیوال، مکتبہ نذیریہ، ۱۹۷۰ء

۴۶- امداد صابری،

* فرنگیوں کا جال"، دھلی: فاروقی پریس، ۱۹۳۹ع

۴۷- امین زبیری، محمد،

* تذکرہ شمس العلما خواجہ حالی"، آگرہ: شمسی مشین پریس، ۱۹۲۵ع

۴۸- انوارالحسن شیر کوٹی،

* انوار قاسمی (سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی)"، لاھور: ادارہ سعدیہ مجددیہ، ۱۹۶۹ء، حصہ اول

۴۹- ایوب قادری، محمد (مرتب)،

* تاریخ قنوج" از نواب صدیق حسن خان،

بحوالہ "سرحد" (ماھنامہ)، کراچی: جون جولائی، ۱۹۷۳ع

۵۰- * تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ"، کراچی: مکتبہ معاویہ، ۱۹۷۱ع

۵۱- * تذکرہ علمائے ھند" از رحمان علی، کراچی: پاکستان ھسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۱ع

۵۲- * جنگ آزادی، ۱۸۵۷ع" کراچی: پاک اکیڈمی، ۱۹۷۶ع

۵۳- * علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)" از عبدالقادر رام پوری، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۰ء، حصہ اول

۵۴- * علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی)، از عبدالقادر رام پوری، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۱ع، حصہ دوم

۵۵- آزاد، محمد حسین، "آب حیات"، لاھور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۴ع

۵۶- آزاد، مولانا ابوالکلام، "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی"، دھلی: حالی پبلشنگ ھاؤس، ۱۹۵۸ع

۵۷- * تذکرہ"، دھلی: ساھتیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ع

۵۸- آفاق، آفاق حسین (مرتب)،

* نادرات غالب" کراچی: ادارۂ نادرات، ۱۹۳۹ع

۵۹- بوخی، ضیا الدین (مترجم)،

* تذکرہ مولوی ذکا اللہ دھلی" از سی - ایف - اینڈریوز، کراچی: تعلیمی مرکز، ۱۹۵۲ع

-٦٠ بشیر الدین احمد دہلوی،

" واقعات دارالحکومت دہلی"، آگرہ : شمسی مشین پریس ، ١٩١٩ع ، جلداول

-٦١ " واقعات دارالحکومت دہلی"، آگرہ : شمسی مشین پریس ، ١٩١٩ع ، ج ٢

-٦٢ تنہا ، مولوی محمد یحیی،

" سیرالمصنفین "، غازی آباد : دارالاشاعت ، ١٩٢٣ع ، حصہ اول

-٦٣ " مرآة الشعرا"، لاہور : عالم گیر الیکٹرک پریس، ١٩٣٥ع

-٦٤ جعفر تھانیسری، مولوی محمد ،

" تواریخ عجیبہ موسوم بہ سوانح احمدی"، دہلی : فاروقی پریس ، ١٣٠٩ھ

-٦٥ حالی، خواجہ الطاف حسین ،

" حیات جاوید "، کان پور : نامی پریس ، ١٩٠١ع

-٦٦ حامد حسن قادری، مولانا ،

" داستان تاریخ اردو "، کراچی : اردو اکیڈمی سندھ، ١٩٦٦ع

-٦٧ حمید احمد خان، پروفیسر،

" ارمغان حالی"، لاہور : ادارہ ثقافت اسلامیہ ، ١٩٥٣ع

-٦٨ حنیف بن حسین سلفی بھوجیانی، عطاء اللہ (مرتب) ،

" الجزء اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف " از شاہ ولی اللہ دہلوی،
لاہور : مکتبہ سلفیہ ، ١٩٥١ع

-٦٩ حنیف یزدانی ، محمد (مرتب) ،

" معیارالحق " از میاں سید نذیر حسین ، قصور : مکتبہ نذیریہ ، ١٩٦٥ع

-٧٠ حیرت ، حافظ عبدالرحمن ،

" شفیقۂ رحمانی "،

-٧١ حیرت دہلوی، مولانا ،

" حیات طیبہ "، لاہور : مکتبہ السلام ، ١٩٥٨ع

-٧٢ خلیق احمد نظامی، پروفیسر،

" اوراق مصور— عہد وسطی کی دلی"، دہلی : دہلی یونی ورسٹی ، ١٩٧٣ع

-٧٣ " تاریخ مشائخ چشت "، اسلام آباد : دارالمولفین، ١٩٧٥ع

-٧٤ " تاریخی مقالات"، دہلی : ندوة المصنفین ، ١٩٦٦ع

۷۵- خلیق احمد نظامی، پروفیسر(مرتب) ،

" ۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامچہ "، از عبداللطیف ، دہلی : ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۶ء

۷۶- خلیل الرحمن داؤدی (مرتب) ،

" گلستان سخن" از مرزا قادر بخش صابر دہلوی، لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۶ء

۷۷- " یادگار غالب " از الطاف حسین حالی، لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ء

۷۸- ذکا ، خوب چند ،

" عیار الشعرا" (قلمی، فوٹو اسٹیٹ) مملوکہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

۷۹- ذکاء اللہ ،

" تاریخ اسلامیان ہند"

۸۰- ذکا اللہ دہلوی، محمد ،

" سوانح عمری مولوی محمد سمیع اللہ خان"، حیدرآباد(دکن) : مطبع انوارالاسلام، ۱۹۰۹ء

۸۱- " تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ "، دہلی : مطبع شمس المطابع ، ۱۹۰۳ء، حصہ اول

۸۲- " تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ "، دہلی : مطبع شمس المطابع ، ۱۹۰۳ء ، ج ۲

۸۳- رحیم بخش دہلوی، مولانا ،

" حیات ولی" ، لاہور : مکتبہ طیبہ ، ۱۹۷۲ء

۸۴- رؤف احمد مجددی، مولانا شاہ محمد ،

" جواہرعلویہ (ملفوظات حضرت شاہ غلام علی) "، لاہور : اللہ والے کی قومی دوکان، س ن

۸۵- " مکاتیب شریفہ " از غلام علی شاہ مجددی، استانبول(ترکی) : ۱۹۷۶ء

۸۶- رئیس احمد جعفری، سید ،

" بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"، لاہور : کتاب منزل، ۱۹۵۲ء

۸۷- سخی احمد ہاشمی، ڈاکٹر ،

" ادبی آئینے " ، کراچی : مکتبہ شاہد ، ۱۹۷۳ء

۸۸- سرخوش ، شیر علی خان،

" اعجاز سخن" ، لاہور : ستم ظریف بک ڈپو ، س ن ، ج ۱

۸۹- سرور، مہر محمد خان،

" قطعہ منتخب " ،

۹۰- سری رام ، لالہ ،

"خم خانۂ جاوید"، لکھنو : مطبع نول کشور ، ۱۹۰۸ع ، ج ۱

۹۱- سلیم ، علی حسن خاں،

"بزم خسن"، آگرہ : مطبع مفید عام ، ۱۲۹۸ھ

۹۲- سلیم عبداللہ ، محمد(مترجم) ،

"الفوز الکبیر" از شاہ ولی اللہ محدث دھلوی، کراچی : اردو اکیڈمی

سندھ ، ۱۹۶۰ع

۹۳- سلیمان ندوی، سید،

"حیات شبلی"، اعظم گڑھ (بھارت) : دارالمصنفین، ۱۹۴۳ع

۹۴- "مقالات شبلی"، اعظم گڑھ (بھارت) : دارالمصنفین، س ن

۹۵- سرسید احمد خاں،

"اسباب بغاوت ھندوستان"(مشمولہ) "حیات جاوید" از خواجہ الطاف

حسن حالی، کان پور : نامی پریس ، ۱۹۰۱ع ، (ضمیمہ نمبر ۳)

۹۶- "آثارالصنادید"، دھلی : مطبع سیدالاخبار، ۱۸۴۷ع (پہلا ایڈیشن)

۹۷- "آثارالصنادید"، دھلی : مطبع سلطانی، ۱۸۵۳ع (سرورق) ، مطبع

احمد ، ۱۸۵۴ع (متن) ، (دوسرا ایڈیشن)

۹۸- "آثارالصنادید"، لکھنو : نول کشور پریس ، ۱۸۷۶ع ، (تیسرا ایڈیشن)

۹۹- "آثارالصنادید"، کان پور : نامی پریس ، ۱۹۰۴ع ، (چوتھا ایڈیشن)

۱۰۰- "آثارالصنادید" ، دھلی : سنٹرل بک ڈپو ، ۱۹۶۵ع ، (پانچواں ایڈیشن)

۱۰۱- "آثارالصنادید"، کراچی : پاکستان ھسٹاریکل سوسائٹی ، ۱۹۶۶ع ،(چھٹا ایڈیشن)

۱۰۲- "تفسیرالقرآن"، آگرہ : مطبع مفید عام، س ن ، ج ۱(تفسیر سورۃ الفاتحہ والبقرہ)

۱۰۳- "تفسیر سورۃ آل عمران ال سورۃ المائدہ) ، آگرہ : مطبع مفید عام، ۱۳۲۰ھ ج ۲

۱۰۴- "تفسیر سورۃ الانعام و الاعراف "، آگرہ : مطبع مفید عام، ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ع ، ج ۳

۱۰۵- "تفسیر سورۃ الانفال و التوبہ "، علی گڑھ : مطبع انسٹی ٹیوٹ ، س ن ، ج ۴

۱۰۶- "تفسیر سورۃ یونس تالی سورۃ النحل " ، علی گڑھ : مطبع انسٹی ٹیوٹ ، ۱۸۹۵ع ج ۵

۱۰۷- "تفسیر سورۃ بنی اسرائیل "، علی گڑھ : مطبع انسٹی ٹیوٹ ، ۱۸۹۵ع ، ج ۶

۱۰۸- "ھنٹر پر ھنٹر"، لاھور : اقبال اکیڈمی، ۱۹۳۹ع

۱۰۹- سید احمد شہید ،
" مکتوبات " (عکسی) ، لاہور : مکتبہ رشیدیہ ،
۱۱۰- سیف ، محمد خالد (مرتب)
" کلام شاہ اسمعیل شہید "، لائل پور : طارق اکیڈمی، ۱۹۷۳ء
۱۱۱- شمس تبریز خان، مولوی ، "
" صدر یار جنگ (سوانح حیات مولانا حبیب الرحمن شروانی) " ،
لکھنؤ : مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، ۱۹۷۳ء
۱۱۲- شوق ، احمد علی خان،
" تذکرہ کاملان رام پور"، دہلی : ہمدرد پریس ، ۱۹۲۹ء
۱۱۳- شہابی، مفتی انتظام اللہ ،
" آخری بزم " ، کراچی : جناب لٹریری اکیڈمی، ۱۹۵۹ء
۱۱۴- شہابی ، مفتی انتظام اللہ (مرتب) ،
" تراجم الفضلا " از مولانا فضل امام خیرآبادی، کراچی : پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ، س ن
۱۱۵- شہابی، مفتی انتظام اللہ ،
" غدر کے چند علما "
۱۱۶- شیدا ، عبدالشکور،
" بیاض سخن"، حیدرآباد (دکن) : ۱۳۵۵ھ
۱۱۷- صابر دہلوی، مرزا قادر بخش ،
" گلستان سخن"، لکھنؤ : مطبع نول کشور، ۱۲۹۹ھ
۱۱۸- صالحہ عابد حسین،
" یادگار حالی"، دہلی : انجمن ترقی اردو(ہند) ، ۱۹۷۵ء
۱۱۹- صدیق حسن خان، نواب ،
" ابجد العلوم "، بھوپال(بھارت) : مطبع صدیقی، ۱۲۹۱ھ، ج ۳
۱۲۰- " اتحاف النبلا المتقین باحیا مآثر الفقہا المحدثین"، کان پور : مطبع نظامی، ۱۲۸۸ھ
۱۲۱- " شمع انجمن "، بھوپال : مطبع رئیس المطابع شاہجہانی، ۱۲۹۳ھ
۱۲۲- صفا بدایونی، عبدالحی،
" شمیم سخن"، مرادآباد(بھارت) : مطبع امدادالہند و عین الاخبار، س ن

۱۲۳- صہبائی، امام بخش (مترجم) ،

" حدائق البلاغت " (اردو) ، لکھنو : مطبع نول کشور، س ن

۱۲۴- صہبائی، امام بخش (مرتب) ،

" انتخاب دواوین شعرائے اردو" ، مقام اشاعت و سن ندارد

۱۲۵- ضیا احمد بدایونی(مرتب) ، " دیوان مومن"، الہ آباد: مطبع شانتی ، ۱۹۳۷ع

۱۲۶- طفیل احمد (مرتب) ،

" یادگار شعر"، از اسپرنگر ، الہ آباد : ہندستانی اکیڈمی، ۱۹۳۳ع

۱۲۷- ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر ،

" مومن ـــ فن اور شخصیت "، دہلی: دہلی یونی ورسٹی ، ۱۹۷۲ع

۱۲۸- عابدالرحمن صدیقی(مرتب) ،

" الخیر الکثیر"، از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، کراچی: قرآن محل، س ن

۱۲۹- عاشق الہی میرٹھی، مولانا ،

" تذکرۃ الخلیل "(مولانا خلیل احمد سہارن پوری کے سوانح)"،
کراچی : ناشر آرٹس لمیٹڈ ، ۱۹۷۱ع

۱۳۰- " تذکرۃ الرشید(سوانح مولانا رشید احمد گنگوہی) "، میرٹھ : ۱۹۰۵ع

۱۳۱- عالم شاہ فریدی، محمد ،

" مزارات اولیائے دہلی"، دہلی جید برقی پریس ، ۱۳۳۶ھ

۱۳۲- عبادت بریلوی، ڈاکٹر ،

" مومن اور مطالعہ مومن"، کراچی: اردو دنیا، ۱۹۶۱ع

۱۳۳- عبادت بریلوی، ڈاکٹر (مرتب) ،

" کلیات مومن"، کراچی: کتابی دنیا ، ۱۹۵۵ع

۱۳۴- عبدالاحد ، محمد (مرتب) ،

" المکاتیب "، دہلی: مطبع مجتبائی، ۱۳۳۵ھ

۱۳۵- عبدالحق حقانی، ابو محمد (مترجم) ،

" حجۃ اللہ البالغہ " از امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی،
کراچی: نور محمد کارخانہ تجارت کتب ، س ن ، ج اول

۱۳۶- عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی (مولف) ،

" افکار حالی"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان) ، ۱۹۶۷ع

-١٣٧ عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی(نگران) ،
" قاموس الکتب اردو(مذہبیات) "، کراچی : انجمن ترقی اردو، (پاکستان) ،
١٩٦١ع ، جلد اول -

-١٣٨ " قاموس الکتب اردو(تاریخ و سوانح)+" ، کراچی، انجمن ترقی اردو،
(پاکستان) ، ١٩٧٣ع ، جلد دوم

-١٣٩ عبدالحق ، ڈاکٹر مولوی(مولف) ،
" قدیم اردو"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان) ، ١٩٦٢ع

-١٤٠ " مرحوم دہلی کالج "، کراچی : انجمن ترقی اردو(پاکستان) ، ١٩٦٢ع

-١٤١ عبدالحی، مولانا سید ،
" گل رعنا"، اعظم گڑھ (بھارت) : دارالمصنفین ، ١٣٣٠ھ

-١٤٢ " نزہتہ الخواطر"، حیدرآباد (دکن) : دائرۃ المعارف ، ١٩٥٩ع ، ج٧

-١٤٣ " نزہتہ الخواطر"، کراچی: نورمحمد کارخانہ تجارت کتب ، ١٩٧٦ع ، ج٨

-١٤٤ عبدالرحمن صدیقی(مترجم) ،
" الخیر الکثیر" از شاہ ولی اللہ دہلوی، کراچی: قرآن محل، س ن

-١٤٥ عبدالرحیم صادق پوری، مولوی ،
" تذکرہ صادقہ "، پٹنہ : ١٩٦٣ع

-١٤٦ عبدالرزاق قریشی ،
" مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام "، بمبئی : ادبی پبلشرز، ١٩٦٨ع

-١٤٧ عبدالشاہد خان شروانی ، محمد ،
" باغی ہندوستان " ، لاہور : نکلکو مکتبہ قادریہ ، ١٩٧٣ع

-١٤٨ عبدالشکور میواتی، مولانا ابو محمد ،
" تاریخ میوات " دہلی : محبوب المطابع ، ١٩١٩ع

-١٤٩ عبدالغفار، قاضی محمد ،
" حیات اجمل"، دہلی : ١٩٥٠ع

-١٥٠ عبدالغنی مجددی، شاہ ،
" ضمیمہ مقامات مظہری"، دہلی : مطبع احمدی، ١٢٩٩ھ (مشمولہ مقامات مظہری)

-١٥١ عبیداللہ سندھی، مولانا ،
" شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک " ، لاہور : سندھ ساگر اکیڈمی، ١٩٥٢ع

۱۵۲- عتیق صدیقی،

" ۱۸۵۷ع — اخبار اور دستاویزیں"، دهلی :مکتبه شاه راه ، ۱۹۶۶ع

۱۵۳- عرش گیاوی، ضمیرالدین،

" حیات مومن"، دهلی :کتب خانه علم و عمل، س ن

۱۵۴- عزیز الدین مرادآبادی، مولوی،

" مطرق الحدید علی صاحب التحقیق الجدید"، دهلی :جید برقی پریس ،۱۳۵۱ھ

۱۵۵- عزیز الرحمن ، مفتی ،

" تذکره مشائخ دیوبند"، کراچی:زرین کتب خانه ، ۱۹۵۸ع

۱۵۶- عسکری، مرزا محمد(مترجم) ،

" تاریخ ادب اردو" از رام بابو سکسینه ، لاهور:کتب خانه علمیه ، س ن

۱۵۷- عقیل، ڈاکٹر معین الدین،

" تحریک آزادی میں اردو کا حصه "، کراچی :انجمن ترقی اردو(پاکستان) ، ۱۹۷۷ع

۱۵۸- علی حسن خان، نواب ،

" مآثر صدیقی — سیرت والا جاهی "، لکهنو :نول کشور :۱۹۲۸ع ، ج ۱

۱۵۹- غالب ، اسد الله خان ،

" اردوئے معلی" ، اله آباد(بهارت) :رام نرائن بهلی شر اینڈ بک سیلر، ۱۹۲۷ع

۱۶۰- غلام کله سرور لاهوری، مفتی ،

" خزینة الاصفیا"، لکهنو :مطبع نول کشور، ۱۸۱۳ع ، ج ۱

۱۶۱- غلام مصطفی خان، ڈاکٹر (مرتب) ،

" هدایت الطالبین و مرآة السالکین" از شاه ابوسعید دهلوی، کراچی :

اعلا کتب خانه ، ۱۹۵۸ع

۱۶۲- غلام مصطفی قاسمی، مولانا (مرتب) ،

" التفهیمات الالهیه " از شاه ولی الله دهلوی، حیدرآباد(پاک) ،

شاه ولی الله اکیڈمی، ۱۹۶۷ع

۱۶۳- غنی مثو فرخ آبادی، عبدالغنی خان،

" تذکرة الشعرا"، علی گڑھ :مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، ۱۹۱۶ع

۱۶۴- فائق رام پوری، کلب علی خان ،

" کلیات مومن"، لاهور :مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ع ،ج۱

۱۶۵- فائق رام پوری، کلب علی خان (مرتب)،
"کلیات مومن"، لاهور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ع، ج ۲
۱۶۶- فائق رام پوری، کلب علی خان،
"مومن"، لاهور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۱ع
۱۶۷- فراق، ناصر نذیر،
"لال قلعه کی ایک جهلک"، دهلی: ساقی بک ڈپو، س ن
"لال قلعه کی ایک جهلک"، دهلی: محبوب المطابع، ۱۹۲۳ع
۱۶۸- فرحت الله بیگ، مرزا،
"مضامین فرحت" لاهور: انار کلی کتاب گهر، س ن، حصه اول
۱۶۹- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر،
"اردو شعرا کے تذکرے اور تذکره نگاری"، لاهور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ع
۱۷۰- فضل حسین بهاری، کل
"الحیاة بعد الممات"، کراچی: حافظ محمد شعیب اینڈ برادرس، ۱۹۵۹ع
۱۷۱- فقیر محمد جهلمی، مولوی،
"حدائق الحنفیه"، لکهنو: مطبع نول کشور، ۱۹۰۶ع
۱۷۲- قطب الدین، مولانا محمد،
"تنبیه الغافلین و هدایة الصالحین" (رساله)، لاهور: کلکتو هندوستان
اسٹیم پریس، ۱۳۲۵ه (برحاشیه نظام اسلام)
۱۷۳- قطب الدین خان، مولوی،
"مظاهر حق"، لکهنو: مطبع نول کشور، ۱۲۵۳ه
۱۷۴- قیام الدین احمد، ڈاکٹر، "هندوستان میں وهابی تحریک"، کراچی: نفیس اکیڈمی،
۱۹۷۲ع
۱۷۵- کریم الدین پانی پتی،
"تذکره کلد فوائد الدهر"، دهلی: مطبع العلوم مدرسه، ۱۸۴۷ع
۱۷۶- "طبقات الشعرائے هند"، دهلی: مطبع العلوم مدرسه، ۱۸۴۸ع
۱۷۷- "گل دسته نازنینان"، تفصیل ندارد
۱۷۸- کلیم، نورالحسن،
"طور کلیم"، آگره: مطبع مفید عام، ۱۲۹۸ه

۱۷۹- کلیم الدین احمد (مرتب)،

" تذکرے (تذکرہ شورش و تذکرہ عشقی) "، پٹنہ : ناشر وسنہ اشاعت ندارد

۱۸۰- کوثر چاندپوری، حکیم،

" اطبائے عہد مغلیہ " کراچی: نرگس اکیڈمی، ۱۹۶۰ء

۱۸۱- گل حسن، مولوی،

" تذکرہ غوثیہ (حالات و کرامات شاہ غوث علی قلندر پانی پتی)"،

لاہور : اللہ والے کی قومی دکان، س ن

۱۸۲- محسن، محسن علی،

" سراپا سخن"، لکھنو : مطبع نول کشور، س ن

۱۸۳- محمد حسن نقشبندی مجددی، مولوی،

" مشائخ نقش بندیہ مجددیہ "، لاہور : اللہ والے کی قومی دکان، س ن

(اشاعت پنجم)

۱۸۴- محمد میاں، مولانا سید،

" تحریک شیخ الہند (ریشمی رومال خطوط سازش کیس)"، لاہور : مکتبہ

رشیدیہ، ۱۹۷۵ء

۱۸۵- " علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے"، مرادآباد (بھارت) :

کتب خانہ فخریہ، ۱۹۴۲ء، حصہ اول

۱۸۶- " علمائے ہند کا شاندار ماضی"، دھلی : کتابستان، ۱۹۵۷ء، ج ۲

" علمائے ہند کا شاندار ماضی"، دھلی : کتابستان، ۱۹۶۰ء

۱۸۷- محمد یعقوب نانوتوی، مولانا،

" حالات مولوی محمد قاسم" بہاول پور : صادق الانوار، ۱۲۹۷ھ

۱۸۸- محمود احمد برکاتی، حکیم (مرتب)،

" سیرت فریدیہ " از سرسید احمد خان، کراچی: پاک اکیڈمی، ۱۹۶۴ء

۱۸۹- " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان"، لاہور : تخلیق مرکز، ۱۹۷۶ء

۱۹۰- " فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون"، کراچی: برکات اکیڈمی، ۱۹۷۵ء

۱۹۱- مختارالدین احمد، ڈاکٹر (مرتب)،

" تذکرہ آزردہ (مفتی صدرالدین آزردہ)" کراچی : انجمن ترقی اردو

(پاکستان)، ۱۹۷۲ء

۱۹۲- مشفق خواجہ (مرتب) ،

" خوش معرکہ زیبا" از سعادت خان ناصر، لاہور : مجلس ترقی ادب ،

۱۹۷۲ء ، ج ۲

۱۹۳- مظفر حسین، مولوی محمد (مرتب) ،

" روز روشن "، بھوپال : مطبع شاہجہانی، ۱۲۹۷ھ

۱۹۴- معین الحق، ڈاکٹر (مرتب) ،

" آثارالصنادید"، از سرسید احمدخان، کراچی : پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی،

۱۹۶۶ء

۱۹۵- مناظر احسن گیلانی، مولانا ،

" سوانح قاسمی" ، دیوبند : دارالعلوم ، ۱۳۷۳ھ ، ج ۱

" سوانح قاسمی"، دیوبند : دارالعلوم ، ۱۳۷۳ھ ، ج ۲

سوانح قاسمی"، دیوبند : دارالعلوم ، ۱۳۷۶ھ ، ج ۳

۱۹۶- منشا، ڈاکٹر منشا الرحمن خان ،

" مطالعہ میر نظام الدین ممنون"، حیدرآباد (دکن) : نیشنل فائن پرنٹنگ

پریس ، ۱۹۷۳ء

~~[illegible]~~

۱۹۷- مہر، مولانا غلام رسول ،

" جماعت مجاہدین"، لاہور : کتاب منزل ، ۱۹۵۵ء

۱۹۸- " خطوط غالب "، لاہور : شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۲ء

۱۹۹- " سیرت سید احمد شہید" ، لاہور : شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۸ء

۲۰۰- " نقش آزاد" ، لاہور : کتاب منزل، ۱۹۵۹ء

۲۰۱- " ۱۸۵۷ء "، لاہور : کتاب منزل، ۱۹۵۷ء

۲۰۲- نذیر احمد ، محمد ،

" تذکرۃ العابدین" ، علی گڑھ : تجارتی پریس ، ۱۹۶۷ء

۲۰۳- نذیر احمد دہلوی، شمس العلماء ڈپٹی،

" موعظۂ حسنہ"(خطوط کا مجموعہ) ، لاہور : مجلس ترقی ادب ، ۱۹۶۳ء

۲۰۲- نساخ ، عبدالغفور ،

" سخن شعرا" ، لکھنؤ : مطبع نول کشور ، ۱۲۹۱ھ

۲۰۵- نظامی بدایونی ، "

" قاموس المشاہیر"، بدایون : نظامی پریس ، ۱۹۲۳ع

۲۰۶- نظر، انصار اللہ (مرتب) ،

" تذکرہ قطعہ منتخب "، از عبدالغفور نساخ ، کراچی : انجمن ترقی اردو (پاکستان) ، ۱۹۷۳ع

۲۰۷- نیردرخشان ، نواب ضیاء الدین خان،

" صحیفۂ زرین"،

۲۰۸- وحید قریشی ، ڈاکٹر ،

" اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں کی فہرست "، لاہور: یونی ورسٹی اورینٹل کالج ، ۱۹۷۰ع

۲۰۹- ہاشمی فرید آبادی،

" تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت "، کراچی : انجمن ترقی اردو (پاکستان) ، ۱۹۵۲ع ، ج ۲

بغیر اسم مؤلف، مصنف یامرتب والی کتب :

۲۱۰- " اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، لاہور : دانش گاہ پنجاب ، ۱۹۶۶ع ، ج ۲

۲۱۱- " اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، لاہور : دانش گاہ پنجاب ، ۱۹۷۱ع ، ج ۷

۲۱۲- " اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، لاہور : دانش گاہ پنجاب ، ۱۹۷۳ع ، ج ۱۰

۲۱۳- " اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، لاہور : دانش گاہ پنجاب ، ۱۹۷۳ع ، ج ۱۲

۲۱۴- " اردو دائرہ معارف اسلامیہ "، لاہور : دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۵ع ، ج ۱۵

۲۱۵- " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، لاہور : پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۱ع، ج ۸، اردو ادب ، حصہ سوم

۲۱۶- " تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند"، لاہور : پنجاب یونی ورسٹی ، ۱۹۷۲ع ج ۹، اردو ادب ، حصہ سوم

۲۱۷- " خطبات گارسین دتاسی"، اورنگ آباد (دکن) : انجمن ترقی اردو (ہند) ، ۱۹۳۵ع

۲۱۸- " دستاویزات و شجرہ جات خاندانی "(قلمی) ، مملوکہ پروفیسر ڈاکٹر سید یونس حسنی صاحب ، کراچی ، شعبہ اردو، جامعہ کراچی -

۲۱۹- " مقالات گارسین دتاسی"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان)، ج ۲

۲۲۰- " مکتوبات المعارف "، سہارن پور: مطبع الانوار، ۱۳۰۲ھ

۲۲۱- ملفوظات عزیزی"، میرٹھ: مطبع مجتبائی، س ن

۲۲۲- " مملکت حیدرآباد"، کراچی: بہادر یار جنگ اکیڈمی، ۱۹۶۷ع

جرائد

۲۲۳- ابوسلمان شاہجہاں پوری و ابوالاسلام صدیقی(مرتبین)،
" علم و آگہی" (مجلہ)، کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج، ۷۲-۱۹۷۳ع
(برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے)

۲۲۴- ارشد، عبدالرشید(مدیر)،
" الرشید"(ماہنامہ)، لاہور: فروری- مارچ ، ۱۹۷۶ع، ج ۴، شش ۲، ۳
(دارالعلوم دیوبند نمبر)

۲۲۵- اشرف، حکیم عبدالرحیم (مدیر)،
" شہر نامہ طب " (پندرہ روزہ)، فیصل آباد: ستمبر، ۱۹۷۶ع

۲۲۶- الطاف علی بریلوی، سید(مدیر)،
" العلم "(سہ ماہی)، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، اکتوبر
— دسمبر، ۱۹۵۸ع

۲۲۷- " العلم "(سہ ماہی)، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس،
جنوری- مارچ ، ۱۹۶۶ع، ج ۱۱، ش ۲

۲۲۸- ایوب قادری، محمد(مدیر)،
" سرحد"(ماہنامہ)، کراچی: جون و جولائی، ۱۹۷۳ع

۲۲۹- ایوب قادری، محمد(مرتب)،
" برگ گل"(میگزین)، کراچی: اردو کالج، ۶۹-۱۹۶۸ع (سرسید نمبر)
ج ۱، شش ۶-۵

۲۳۰- سرسید احمد خان(مدیر)،
" علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ "(ماہنامہ)، علی گڑھ: ۲۲ اپریل، ۱۸۸۰ع
ج ۱۵، ش ۳۳

۲۳۱- " علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ "(ماہنامہ)، علی گڑھ: ۱۰ اکتوبر، ۱۸۸۵ع

۲۳۲- سرسید احمد خان(مدیر)،

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ"، علی گڑھ: ۱۳ جولائی، ۱۸۸۲ع،

ج ۲۱، ش ۵۶

۲۳۳- سرور، محمد(مدیر)،

"الرحیم"، (ماہنامہ)، حیدرآباد(سندھ)، شاہ ولی اللہ اکیڈمی،

اپریل، ۱۹۶۵ع، ج ۲، ش ۱۱

۲۳۴- "الرحیم"، (ماہنامہ)، حیدرآباد(سندھ)، شاہ ولی اللہ اکیڈمی،

اگست، ۱۹۶۵ع، ج ۱، ش ۳

۲۳۵- "الرحیم" (ماہنامہ)، حیدرآباد(سندھ)، شاہ ولی اللہ اکیڈمی،

ستمبر، ۱۹۶۵ع، ج ۳، ۳

۲۳۶- "الرحیم"، (ماہنامہ)، حیدرآباد(سندھ)، شاہ ولی اللہ اکیڈمی،

فروری، ۱۹۶۶ع، ج ۳، ش ۹

۲۳۷- "الرحیم"، (ماہنامہ)، حیدرآباد(سندھ)، شاہ ولی اللہ اکیڈمی،

مارچ، ۱۹۶۶ع، ج ۳، ش ۱۰

۲۳۸- "الرحیم"، (ماہنامہ)، حیدرآباد(سندھ)، شاہ ولی اللہ اکیڈمی،

اپریل، ۱۹۶۶ع، ج ۳، ش ۱۱

۲۳۹- سعید احمد اکبر آبادی، مولانا(مدیر)

"برہان"(ماہنامہ)، دہلی: دارالمصنفین، جولائی، ۱۹۷۶ع،

ج ۷۷، ش ۱

۲۴۰- شبیر علی کاظمی، سید(مدیر)

"اردو"(سہ ماہی)، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، اپریل، ۱۹۷۵ع

جلد ۵۱، ش ۲

۲۴۱- طفیل، محمد(مدیر)

"نقوش" (سہ ماہی)، لاہور: ادارہ فروغ اردو، جنوری- فروری، ۱۹۵۷ع

ج ۰۰۰ شش ۶۲-۶۱

۲۴۲- "نقوش"(سہ ماہی)، لاہور: اپریل، ۱۹۶۰ع، ج ۰۰۰، شش ۸۰-۷۹

۲۴۳- "نقوش"(ساہ ماہی)، لاہور: جون، ۱۹۶۳ع، ج ۰۰۰ ش ۱۰۰

حصہ اول، (آپ بیتی نمبر)

۲۴۴- عبدالحق ڈاکٹر مولوی(مدیر) ،

" اردو" (سہ ماہی) ، اورنگ آباد (دکن) : انجمن ترقی اردو ، (ہند) ،

اپریل ، ۱۹۳۵ ع

۲۴۵- " اردو" (سہ ماہی) ، کراچی : انجمن ترقی اردو (پاکستان) ، اپریل ، ۱۹۵۳ ع

ج ۳۱ ، ش ۱۲ (حالی نمبر)

۲۴۶- عبداللہ قریشی ، (مدیر) ،

" المعارف " (ماہنامہ) ، لاہور : ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، جون ۱۹۷۷ ع ،

۲۴۷- " المعارف " ، ماہنامہ ، لاہور : ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، جولائی ، ۱۹۷۷ ع

۲۴۸- غلام مصطفی قاسمی ، مولانا (مدیر) ،

" الولی" (ماہنامہ) ، حیدرآباد (سندھ) : شاہ ولی اللہ اکیڈمی ، جنوری-

فروری ، ۱۹۷۶ ع ، ج ۴ ، شش ۱۱-۱۰

۲۴۹- " الولی" (ماہنامہ) ، حیدرآباد (سندھ) : شاہ ولی اللہ اکیڈمی ، مارچ ، ۱۹۷۶ ع

ج ۴ ، ش ۱۲

۲۵۰- " الولی" (ماہنامہ) ، حیدرآباد (سندھ) : شاہ ولی اللہ اکیڈمی ، اپریل ،

۱۹۷۶ ع ، ج ۵ ، شش ۳-۱

۲۵۱- " الولی" (ماہنامہ) ، حیدرآباد (سندھ) : شاہ ولی اللہ اکیڈمی ، جولائی ،

۱۹۷۶ ع ، ج ۵ شش ۲-۳

۲۵۲- فرمان فتح پوری ، ڈاکٹر (مدیر) ،

" نگار" (ماہنامہ) ، کراچی : نومبر ، دسمبر ، ۱۹۷۰ ع ، ج ۴۹ ، شش ۱۲-۱۱ ،

حصہ اول ، (سرسید نمبر)

۲۵۳- " نگار" (پاکستان کراچی : جنوری - فروری ، ۱۹۷۱ ع ، ج ۵۰ ، شش ۳-۱

حصہ دوم ، (سید نمبر)

۲۵۴- مشفق خواجہ (مدیر)

" قومی زبان" (ماہنامہ) ، کراچی : انجمن ترقی اردو (پاکستان) ،

یکم دسمبر ، ۱۹۶۰ ع ج ۰۰۰ ، ش ۰۰۰۰

۲۵۵- منظور نعمانی ، مولانا (مدیر) ،

" الفرقان" ، (ماہنامہ) ، بریلی : ۰۰ ، ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ ع (شاہ ولی اللہ نمبر)

(دوسرا مکمل تر این)